محمد حسن کے ڈرامے

(کلیات)

مرتب: انور پاشا

محمد حسن کے ڈرامے
(کلیات)

مرتب

انور پاشا

''آج کے ہندوستانی سماج کے پاس آدرش کی روشنی کم ہے اور عملی اور مادی آسودگی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی کمزوری بہت زیادہ۔ جھوٹی حقیقتوں کو ایک ملازمت، ایک وردی اور ایک جوڑا سفید کپڑے کو زندگی کو خوبصورت بنانے کے سارے تصورات سے اعلیٰ سمجھا جانے لگا ہے۔ ہمارے سماج نے انسان کو مکر کی کرسیوں، دفتر کی میزوں اور جگمگاتی جاگتی سڑکوں کی گرد گم کر دیا ہے۔ ہم سب آہستہ آہستہ روپیہ اور سستی آسودگی کی تلاش میں افتاں و خیزاں ہیں اور اس چاندی کے ٹکڑے کے گرد انسان کا ضمیر، اس کے خواب اور اس کی ساری جذباتی زندگی گھوم رہی ہے۔

مادی آسودگی کی خواہش گناہ نہیں لیکن مسرت دراصل انفرادی نہیں اجتماعی جذبہ ہے جب تک انسان کی آواز میں ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' کا لہجہ پیدا نہ ہو اس کی تگ و تاز محدود رہے گی۔ اگر واقعی مسرت چند مادی آسودگی کا نام ہے تو پھر اس انسان کے بارے میں کیا کہیئے گا جو دنیا کی آنے والی مسرت کے نام پر زہر کا پیالہ پی لیتا ہے۔ کبھی صرف زمین کی گردش ثابت کرنے کے لیے کلیسا کی گلخن میں جل جاتا ہے، کبھی آنے والی نسلوں کے لیے حسن اور عرفان کی شمع روشن کرنے کی لگن میں ہنستا ہوا صلیب پر چڑھ جاتا ہے۔ یہ انسانی وجود کی سب سے بڑی مسرت یہی فخر ہے کہ انسان آنے والی نسلوں کے لیے زندگی کو خوبصورت اور حسین بنانے کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ اس جدوجہد کا انجام کیا ہوگا۔ فتح یا ناکامی؟ شاید یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔''

(محمد حسن، دیباچہ، پیسہ اور پرچھائیں، 1955)

محمد حسن کے ڈرامے

(کلیات)

مرتب

انور پاشا

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

"اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی، پٹنہ کا مالی تعاون حاصل ہے۔"
"اس کتاب میں شائع مشمولات یا کسی قابلِ اعتراض مواد کے لیے
بہار اردو اکادمی، پٹنہ ذمہ دار نہیں ہے۔"

نام کتاب : محمد حسن کے ڈرامے (کلیات)
مرتب وناشر : انور پاشا
تعداد : 500
مطبع : گلوری لیس پرنٹرس، دہلی
سرورق : ٹیم عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
زیراہتمام : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

Mohammad Hasan Ke Drame
(Kulliyaat)
Edited by **Anwar Pasha**
Edition: 2019 ₹1000/-

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔6	011-23260668
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی	011-23276526
رائی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد	+91 9889742811
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	+91 9358251117
بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔4	+91 9304888739
کتاب دار، ممبئی	+91 9869321477
ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد	+91 9246271637
مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد	+91 9325203227
عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ	+91 9433050634
قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر	+91 9797352280

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

استادِ گرامی پروفیسر محمد حسن

ان کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر روشن آرا بیگم

صاحبزادی ڈاکٹر ثمینہ حسن

اور

صاحبزادے جناب نوید حسن

کے نام

''ہر ڈرامے میں کم سے کم تین قسم کی اقدار کی ترسیل ممکن ہے، فکری، جذباتی اور جمالیاتی۔ فکری اقدار سے مراد نئے افکار و خیالات ہیں۔ جو کردار اور واقعات کے نشیب و فراز سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جذباتی اقدار سے مراد یہ ہے کہ کرداروں کے تجربوں اور جذباتی سرگزشت میں ہم کس حد تک شریک ہوتے ہیں اور ڈراما کس حد تک ناظرین کو اپنے ساتھ بہالے جاسکتا ہے۔ اور کتنی قوت اور توانائی کے ساتھ ان کے جذبات کو متاثر اور مرتفع کر سکتا ہے۔ جمالیاتی اقدار سے مراد یہ ہے کہ اسٹیج پر روشنی اور سائے کا امتزاج، سنگیت، آوازوں کا زیر و بم، اداکاری، مختلف رنگوں کے تطابق یا تضاد، اسٹیج کے مختلف حصوں میں اداکاروں کا اجتماع اور ان حصوں کے درمیان ربط و آہنگ سے ناظرین کو کس طرح جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ڈراما پیش کرنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ڈرامے کے مرکزی تصور اور توجیہہ کا تعین کرنے کے بعد اس طرح اس ڈرامے کو پیش کرے کہ ہر نہج سے اسی مرکزی تاثر اور توجیہ کو تقویت حاصل ہو، اور ترسیل میں مدد ملے۔''

(محمد حسن، دیباچہ، نئے ڈرامے، انجمن ترقی ہند، ۱۹۷۵ء)

فہرست

☆☆☆

مقدمہ

دنیائے ادب و ثقافت میں ایسی شخصیتیں خال خال ہی ملتی ہیں جن کی ذات میں مختلف النوع صفات بیک وقت یکجا ہوں اور اُن میں سے بیشتر صفات میں انھیں درجۂ کمال بھی حاصل ہو۔ پروفیسر محمد حسن کا شمار ایسی ہی نابغہء روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جن کی ذات انجمن کی شکل میں ڈھل کر بیک وقت کئی حیثیتوں سے امتیازی شان کی حامل بن گئی تھی۔ پروفیسر محمد حسن کا نام آتے ہی ذہن میں ایک بیدار مغز دانشور، بلند پایہ ناقد، ممتاز ڈرامہ نگار، ادبی مورخ، ماہر لسانیات ، ناول نگار، شاعر اور صحافی کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ اور سیکولر و جمہوری اقدار کی بقا کے لیے ہمہ تن سرگرم انسان کا تصور کوند جاتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو نہ تو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی وقعت و اہمیت سے روگردانی ہی ممکن ہے۔

پروفیسر محمد حسن عام طور سے ادبی دنیا میں ایک منفرد و ممتاز ناقد کی حیثیت سے زیادہ معروف و مشہور ہیں لیکن اُن کے تخلیقی جوہر اور خلاقانہ صلاحیتوں کے تعلق سے خاص کر بطور ڈراما نگار ان کی خدمات اور قدر و منزلت کچھ کم نہیں۔ یہ لازم نہیں کہ بڑا ناقد بطور تخلیق کار بھی یکساں مقام و مرتبے کا حامل ہو، لیکن پروفیسر محمد حسن کی ذاتِ گرامی اس ضمن میں استثنا کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ بطور تخلیق کار ڈرامہ نگاری کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے نہ صرف ڈراما نگاری کی تاریخ میں ممتاز مقام حاصل کیا بلکہ اردو ڈرامے کو بھی اعتبار و معیار عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

پروفیسر محمد حسن نے اپنے تخلیقی سفر بالخصوص ڈراما نگاری کا آغاز ایک ایسے دور میں کیا جب ہندوستان کی ادبی و ثقافتی فضا پر ترقی پسند افکار و تصورات کا غلبہ تھا۔ لہٰذا اُن کی فکری تشکیل کے

پسِ پُشت ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ تصورات کا اثر کارفرما رہا۔ پروفیسر محمد حسن کے عنفوانِ شباب کا زمانہ عالمی و قومی دونوں سطحوں پر شکست و ریخت کے ساتھ تعمیر و تشکیل سے متعلق سرگرمیوں کا بھی زمانہ تھا۔ ولادت و بچپن کی نگہداشت اور ابتدائی تعلیم و تربیت گھر کے جاگیر دارو زمیندارانہ ماحول میں ہوئی۔ ماضی کے مثبت اقدار کے مٹنے کی روداد دادی اماں کی لوریوں کے ساتھ اُن کے کانوں سے ہو کر ذہن کے گوشے میں پیوست ہو چکی تھی۔ عالمی سطح پر جنگی فضا کی پیدا کردہ سیاسی اُتھل پُتھل، معاشی بحران اور قومی سطح پر تحریکِ آزادی کے بڑھتے زور کے ساتھ نئے انقلابی آہنگ کی صدائیں بھی ان کی ذہنی آبیاری میں مصروفِ کار تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے زمانے میں قیامِ لکھنؤ کے دوران کی علمی و تہذیبی فضا نے بھی پروفیسر محمد حسن کی ذہنی سمت کو متعین کرنے میں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لکھنؤ اس وقت ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس کی اسی مرکزیت کے پیش نظر ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس بے مثال ادبی اجتماع میں پریم چند، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین وغیرہ جیسی افلاطونی شخصیتوں کے علاوہ مختلف زبانوں اور ادبیات سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کی شرکت لکھنؤ کی ثقافتی و ادبی فضا کو نہ صرف علم و دانش کی روشنی سے منور کر رہی تھی بلکہ اسے سحر انگیز بھی بنا رہی تھی۔ اس فضا میں عالمی و قومی دونوں سطحوں کے تغیر خیز عوامل بیک وقت کارفرما تھے جو ثقافتی و ادبی سطح پر نئے افق کو تشکیل و ترتیب دے رہے تھے۔ پروفیسر محمد حسن کی فکری و ادبی تشکیل و ترتیب اس نئے اُفق کی ترتیب و تشکیل سے کما حقہ ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ اس ادبی و ثقافتی منظر نامے اور اس سے وابستہ عوامل و محرکات نے پروفیسر محمد حسن کی فکر و جمال کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس ثقافتی منظر نامے نے ان کے اندر اس شعور و وجدان کو پروان چڑھایا جس نے آگے چل کر ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز و منفرد مقام عطا کیا۔ روشن خیالی، وسیع النظری اور ترقی پسند نظریے کے سائے میں پروان چڑھتے پروفیسر محمد حسن کے شعور و وجدان کا رنگ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایسا گہرا ہوتا گیا کہ ان کی فکر بجائے خود ایک دبستان کا درجہ اختیار کر گئی۔ تنقید، تاریخ، لسانیات، ادبی سماجیات ان میں سے کوئی ایسا شعبۂ ادب نہیں جس میں پروفیسر محمد حسن کی انفرادیت کی نمایاں چھاپ موجود نہ ہو۔

پروفیسر محمد حسن نے 1950ء میں مشہور انگریزی اخبار ''روزنامہ پائنیر'' (Pioneer) کے نائب مدیر کی حیثیت سے بطور صحافی اپنے کریر کا آغاز کیا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ ریڈیو سے بھی وابستگی ہوئی اور ریڈیو فیچرز اور ڈرامے لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ یکے بعد دیگرے ان کے متعدد ریڈیو فیچرز اور ڈرامے لکھنؤ ریڈیو سے نشر ہوئے۔ ''یہ ہے لکھنؤ'' کے عنوان سے اُن کے فیچر کو بارہ قسطوں میں براڈ کاسٹ کیا گیا جو کافی مقبول ہوا۔ اس فیچر کی مقبولیت اور لکھنؤ ریڈیو سے اُن کی وابستگی نے اُن کے اندر موجود خلاقانہ جوہر کو جلا بخشنے اور ڈراما نگاری کی جانب ان کے رجحان کو مستحکم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ڈراما نگاری کے میدان میں قدم رکھنا پروفیسر محمد حسن کے لیے محض تفریح طبع کا وسیلہ نہ تھا، وہ ایک بیدار مغز نوجوان تھے اور عصری ادبی، ثقافتی، سماجی و سیاسی صورتِ حال پر نہ صرف گہری نظر رکھتے تھے بلکہ عصری حالات کو بدل کر ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کا خواب اور عزم بھی رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے ڈراما نگاری کو محض اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اُسے اجتماعی زندگی کا ترجمان اور عصری مسائل و بحران کا عکاس بنانے کی سعی کی۔ اسی لیے ان کے ڈراموں میں ایک فکری توانائی ملتی ہے جو ناظرین اور قارئین کو محض حظ عطا نہیں کرتی بلکہ اس کے ذہن کے دریچے کو بھی وا کرتی ہے اور اس کی حسیت کو خوابیدہ بنانے کے بجائے اُسے جھنجھوڑ کر جگاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پروفیسر محمد حسن کے لیے ڈراما نگاری محض اظہار ذات کا ذریعہ نہ تھی۔ وہ اس فن کو معاشرتی مسائل و معاملات کی ترجمانی کا اہم اور کارگر وسیلہ گردانتے تھے۔ وہ خود اپنی ڈراما نگاری کے آغاز کے محرکات و پس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ڈرامے لکھنے شروع کیے تو مرادآباد کے اس ٹوٹتے، بکھرتے، لڑکھڑاتے اور گرتے ہوئے تہذیبی ڈھانچے نے مدد کی۔ ان گرتی ہوئی چھتوں کے نیچے حسین، ذہین دوشیزائیں تھیں۔ مسکراتے ہوئے ہوش مند نوجوان تھے۔ مگر گرتے ہوئے تمدن کی چکی انھیں پیسے ڈال رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایک باغی کی طرح اپنا سر اٹھاتے تھے مگر کوئی پاٹ انھیں پھر سے اپنی طرف گھسیٹ لیتا تھا۔ اپنے ڈراموں میں میں نے انھیں گھرانوں کی تصویریں کھینچیں، خود اپنی تصویر کھینچی۔۔۔ یہ ڈرامے میری توقع سے کہیں زیادہ مقبول ہوئے۔ بار بار کئی اسٹیشنوں سے

براڈ کاسٹ ہوئے۔ اسٹیج کیے گئے اور اس طرح میں ڈراما نگار بن گیا پھر اس داستان نے طول کھینچا، اسٹیج ڈراموں کا شوق ہوا۔ اس کے بارے میں مطالعہ کیا۔ عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے ایک منڈلی بنالی۔ ہندوستان کے بعض اہم مقامات کا سفر کیا۔ تقریباً ایک ہزار روپے پاس سے خرچ کیے اور اب بھی یہ ارمان دل میں ہے کہ دو چار ایسے اچھے ڈرامے لکھ جاؤں جو اردو کو بین الاقوامی سطح پر آبرو دلا سکے۔''

بطور ڈراما نگار محمد حسن کی شناخت ۱۹۵۵ء میں اُن کے ڈراموں کے پہلے مجموعہ ''پیسہ اور پر چھائیں'' سے قائم ہوئی۔ اس وقت پروفیسر محمد حسن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہء اردو سے بطور مستقل استاد درس و تدریس سے منسلک تھے اور تنقیدی مضامین و تصانیف کے ذریعے اپنی ادبی و فکری ترجیحات کے توسط سے بطور ناقد اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ان کا تنقیدی شعور اور ان کی فنی بصیرت نے ان کے ڈراموں میں بھی فکری و جمالیاتی رنگ بھرنے کا کام کیا۔ اپنے ڈراموں کے پہلے مجموعے ''پیسہ اور پر چھائیں'' کے مقدمے میں اپنے تخلیقی سروکار اور ترجیحات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن خود فرماتے ہیں:

''آج کے ہندوستانی سماج کے پاس آدرش کی روشنی کم ہے اور عملی اور مادی آسودگی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی کمزوری بہت زیادہ۔ جھوٹی حقیقتوں کو ایک ملازمت، ایک وردی اور ایک جوڑا سفید کپڑے کو زندگی کو خوبصورت بنانے کے سارے تصورات سے اعلیٰ سمجھا جانے لگا ہے۔ ہمارے سماج نے انسان کو کمرکی کرسیوں، دفتر کی میزوں اور جگمگاتی جاگتی سڑکوں کی گرد گم کردیا ہے۔ ہم سب آہستہ آہستہ روپیہ اور سستی آسودگی کی تلاش میں افتاں و خیزاں ہیں اور اس چاندی کے ٹکڑے کے گرد انسان کا ضمیر، اس کے خواب اور اس کی ساری جذباتی زندگی گھوم رہی ہے۔

مادی آسودگی کی خواہش گناہ نہیں لیکن مسرت دراصل انفرادی نہیں اجتماعی جذبہ ہے جب تک انسان کی آواز میں ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' کا لہجہ پیدا نہ ہو اس کی تگ و تاز محدود رہے گی۔ اگر واقعی مسرت چند مادی آسودگی کا نام ہے تو پھر اس انسان کے بارے میں کیا کہیے گا جو دنیا کی آنے والی مسرت کے نام پر زہر کا پیالہ پی لیتا ہے۔ کبھی صرف زمین کی

گردش ثابت کرنے کے لیے کلیسا کی گلخن میں جل جاتا ہے کبھی آنے والی نسلوں کے لیے حسن
اور عرفان کی شمع روشن کرنے کی لگن میں ہنستا ہوا صلیب پر چڑھ جاتا ہے۔ یہ انسانی وجود کی
سب سے بڑی مسرت یہی فخر ہے کہ انسان آنے والی نسلوں کے لیے زندگی کو خوبصورت اور
حسین بنانے کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ اس جدوجہد کا انجام کیا ہوگا۔ فتح یا ناکامی؟ شاید
یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔" (محمد حسن، دیباچہ، پیسہ اور پرچھائیں، 1955)

اس اقتباس میں پروفیسر محمد حسن کی آگہی و عزم کے اظہار کے ساتھ ساتھ اُن کے فکری و نظریاتی سروکار اور انسانیت کے بلند اقدار کی فتح و نصرت کے لیے فن کو وقف کر دینے کا جذبہ نمایاں ہے۔ مجموعہ "پیسہ اور پرچھائیں" کے تقریباً تمام ڈرامے بقول پروفیسر محمد حسن "اس ایک مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں"۔ وہ اپنی تخلیقی کاوش کی داد کی تمنا رکھتے ہوئے ناظرین اور قارئین سے بس اتنی سی توقع رکھتے ہیں "اگر ان سے نئی نسل کو کچھ حوصلہ مل سکا، نئی سماجی حقیقتوں سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہونے اور اُنھیں بدلنے کا کس بل ملا یا اُس کی طرف ذہن متوجہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ ان ڈراموں نے اپنا مقصد پورا کر دیا۔"

پروفیسر محمد حسن فن کو انسان کی قلب ماہیت کا اہم ترین وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ وہ مداری کی طرح تماشا دکھانے کو فنکاری نہیں گردانتے بلکہ وہ فن کے بطن سے نئی کائنات کی تخلیق کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ کائنات جو گمشدہ ہے یا جس کی دریافت ہنوز باقی ہے۔ غرض کہ پروفیسر محمد حسن کی نظر میں موجودہ معاشرتی، سیاسی، تہذیبی و اخلاقی نظام سے عدم اطمینانی کا اظہار اور مثالی نظام کی خواب گری ہی فن کی روح ہے۔ اسی سے فن میں تابانی و تابناکی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ کام و دہن کی اسیری فن کو مجروح کرتی ہے۔ اسی لیے پروفیسر محمد حسن نے کج کلاہی اور باضمیری کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے اپنے تخلیقی سفر کو طے کرنے کا عزم و اظہار کیا۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آیا کہ پروفیسر محمد حسن نے ڈراما نگاری کی ابتدا ریڈیو ڈرامے سے کی اور 1955ء میں ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ "پیسہ اور پرچھائیں" شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل 9 ڈرامے شامل ہیں اور سبھی ریڈیو ڈرامے ہیں۔ اس کے بعد 1955ء میں اُن کے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ "مورپنکھی اور دوسرے ڈرامے" شائع ہوا۔ اس مجموعے

میں کل سات ڈرامے ہیں جن میں سے تین ریڈیائی ڈرامے اور چار اسٹیج ڈرامے ہیں۔1961ء میں اُن کے اسٹیج ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''میرے اسٹیج ڈرامے'' شائع ہوا۔جس میں کل چھ مختصر ڈرامے ہیں۔ان کے علاوہ 1969ء میں ''کہرے کا چاند'' اور 1975ء میں ''تماشا اور تماشائی'' اور 1980ء میں ''ضحاک'' یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے۔اُن کا ایک منظوم ڈراما ''عمر خیام'' کے عنوان سے بھی ہے جو ان کے شعری مجموعہ ''زنجیر نغمہ'' کے آخر میں شامل ہے۔''خون کے دھبے'' کے عنوان سے اُن کے ڈراموں کا آخری مجموعہ 2011ء میں شائع ہوا جس میں آٹھ ڈرامے شامل ہیں۔ان میں سے کچھ ڈرامے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔گرچہ اس مجموعے کی ترتیب اور ڈراموں کا انتخاب پروفیسر محمد حسن کی ایما پر پروفیسر ایم۔سعید الظفر چغتائی نے انجام دیا۔ لیکن یہ مجموعہ پروفیسر محمد حسن کے انتقال کے بعد 2011ء میں اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو سکا۔

پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں فکری و فنی سطح پر مسلسل ارتقا کا عمل موجود ہے۔''پیسہ اور پرچھائیں'' سے لے کر ''خون کے دھبے'' تک فکری ارتقا کے ساتھ فنی بلیدگی بھی شانہ بہ شانہ سفر کرتی نظر آتی ہے۔عصری منظر نامے کی تفہیم، تجزیہ اور ترجمانی میں وہ ماضی کے حوالوں سے خوب کام لیتے ہیں۔عصری تناظر میں تاریخی منظر نامے کو پیش کرتے وقت محمد حسن کا فن دو دھاری تلوار کی طرح اپنا جوہر دکھاتا ہے۔''ضحاک'' میں ایمر جنسی کا پس منظر ایرانی دیومالا کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دو آتشہ کا سا جادو جگاتا ہے۔ڈراما ''ضحاک'' میں محمد حسن نے ایک اساطیری واقعہ کو سیاسی تمثیل میں تبدیل کرنے کا کام بخوبی کیا ہے۔جس کے پس منظر میں 1975ء میں ایمر جنسی اور اس سے وابستہ واقعات موجود ہیں۔ ہر چند کہ ضحاک کا قصہ، ماقبل تاریخ دور کے ایرانی اساطیر کا حصہ ہے، جس کے متعلق مختلف ادبی روایات میں اختلاف و ترمیم اور اضافے موجود ہیں۔اس اسطور سے ادبی سطح پر حسب محل استفادے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔فردوسی کی شاہکار تصنیف ''شاہنامہ'' میں بھی اس روایت کا بیان موجود ہے۔پروفیسر محمد حسن نے بھی اپنے ڈرامے ''ضحاک'' میں اس ایرانی اسطور سے استفادہ کرتے ہوئے اُسے تخلیقی سانچے میں ڈھال کر عصری تناظر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔''ضحاک'' ہندوستان

میں ایمر جنسی کے دوران نظام وقت کی جانب سے جاری وساری ظلم واستبداد کے خلاف شدید احتجاج پر مرکوز ڈراما ہے جس میں بڑی فنکاری سے علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اس عہد کے ظلم واستبداد کو آشکار کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما اُس بے ضمیری کو بھی نمایاں کرتا ہے جس کے اسیر اس دور کے اہل علم و دانش، فن کار اور عدل کے نگہبان سبھی تھے۔ خود پروفیسر محمد حسن کے لفظوں میں:

''اور ایک موج تہ نشین کی طرح دانشوروں، فن کاروں، اہلِ علم اور اہلِ بصیرت کی خواری اور بے وقاری کا ماتم اس ڈارے کا مرکزی تصور فراہم کرتا ہے۔ استحصالی نظام صرف عوام کو لوٹتا کھسوٹتا ہی نہیں بلکہ ارباب فکر وفن کی اور ان کے سبھی مقدس اور اعلیٰ اداروں کی تذلیل بھی کرتا ہے۔ ضمیروں کی خریداری کا المیہ اس کا موضوع ہے۔ اس کے آخری سین میں تعلیم، فن، قانون ،علم اور مذہب کے ان رہنماؤں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جن کے لب سلے ہوئے ہیں اور جو آزادی کے بھیک مانگ رہے ہیں۔ استحصال نے انھیں اس حالت تک پہنچایا ہے اور زیر دستوں کی آقائی انھیں ان کی آواز اور وقار واپس دلا سکتی ہے۔''

(پروفیسر محمد حسن، دیباچہ، ضحاک)

''ضحاک'' کے یہ اختتامی مکالمے ڈرامہ نگار کے اس موقف کے ترجمان ہیں کہ کفر وایمان اور خیر وشر کی معرکہ آرائی روز ازل سے ہوتی آئی ہے اور باطل وشر خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو پسپائی وشکست بالآخر اس کا مقدر رہے۔

''ضحاک ہر جگہ اور ہر زمانے میں پیدا ہوں گے''

''جہاں بھی ضحاک سر اُٹھائے گا فریدوں کا یا اس کے کسی مظلوم بھائی بہن کا ہاتھ بھی ضرور اٹھے گا۔ ان لوگوں کے ٹانکے کاٹ دو۔ آؤ ہم نئے ضحاک کی تلاش میں چلیں۔''

ڈراما ''ضحاک''، تمثیلی واستعاراتی ہونے کے سبب تین سطحوں پر ترسیل وابلاغ کا تقاضا کرتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن خود ان تینوں سطحوں کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ڈراما ضحاک یہ کم سے کم تین سطحوں والا ڈراما ہے پہلی سطح جو ضحاک، فریدوں اور نوشابہ کی سطح ہے جس کا قصہ ہے یعنی ظلم وجبر کے خلاف دو بے بس انسانوں کا آواز اٹھانا اور آخر کار فتح یاب

ہونا یہ محض اتفاق نہیں کہ فریدوں محنت کش ہے اور نوشابہ کسان کی بیٹی ہے جسے اغوا کرلیا گیا تھا
یہ اس کی دوسری سطح ہے۔ یعنی طبقہ واری کشمکش کی سطح جو واضح طور پر یہ اشارہ کرتی ہے کہ ظلم
و جبر کو خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی اور نظریاتی۔ صرف محنت کش اور کسان طبقے کی رہبری ہی میں ختم
کیا جا سکتا ہے جو انقلاب اور سماجی انصاف کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ تیسری سطح یہ بھی ہے کہ
انسان نے صنعتی انقلاب کو نفع خوری اور استحصال سے جوڑنے کے بعد اپنے شانوں پر سانپ
اگا لیے ہیں اور یہ وہ کابوس ہے جو خود اس کا پیدا کردہ ہے اور خود اسی پر سوار ہے بوڑھا (جسے
میں نے گوئٹے کے فاؤسٹ سے مستعار لیا ہے) اس نظام کا نمائندہ ہے اور صنعتی نظام کے اس
تشنج سے بچنے کے لیے جس نے فن کا احترام، مذہب کا تقدس، عورت کی عزت اور قانون کی
حرمت کو تشدد و طاقت اور روپے کے اوپر قربان کرڈالا ہے۔ صرف محنت کش طبقے اور کسان کی
رہبری ہی ذریعہ نجات فراہم کرسکتی ہے۔'' (ایضاً)

پروفیسر محمد حسن کے فکر و فن پر مارکسی فلسفہء حیات کا گہرا عکس نمایاں ہے۔ وہ تاریخی و مادی جدلیات کے اصولوں کے قائل ہیں اور تبدیلی و ترقی کو فطری عمل کا حصہ تصور کرتے ہیں، سماجیاتی نقطہء نظر کو فن و تنقید میں رہنما اصول کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور ماضی حال و مستقبل کے مابین تواتر و تبدیلی کو سماجی، معاشی اور تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تاریخی ڈرامے ہوں یا عصری مسائل پر مبنی ڈرامے اُن کا زاویہء نظر بے حد معروضی اور منفرد ہوتا ہے۔

تاریخ میں پروفیسر محمد حسن کی خاص دلچسپی رہی ہے اور ادبی و ثقافتی تاریخ کے ساتھ ساتھ عمومی تاریخ کے حوالے سے ان کا شعور خاصا بالیدہ نظر آتا ہے۔ اردو ادیبوں اور ناقدوں میں شاید ہی کوئی ایسا دوسرا ہوگا جس کے یہاں تاریخ کا اتنا بالیدہ شعور ملتا ہے۔ قدیم دکنی ادب کی تاریخ ہو یا دہلی کا تہذیبی و سماجی پس منظر یا پھر اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ ان کی تحریروں میں تاریخی مو شگافیوں کے عمدہ نمونے ہر جگہ موجود نظر آتے ہیں۔ ان کی تاریخی بصیرت ڈرامہ نگاری میں بھی اپنے کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے متعدد تاریخی ڈرامے لکھے ہیں اور اپنے ڈراموں میں تاریخ کو بطور ایک اہم حوالہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کی عمومی تاریخ اور بالخصوص عہد وسطیٰ کی تاریخ اور اس سے وابستہ سماجی، سیاسی اور ثقافتی تناظر کو پروفیسر محمد حسن نے

اپنے اکثر ڈراموں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ڈرامے میں اکبر اعظم اور داراشکوہ جیسی اہم تاریخی شخصیتوں سے وابستہ واقعات وتصورات جس انداز سے ابھرتے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پروفیسر محمد حسن ہندوستان کی اس تہذیبی وثقافتی روایت کے نہ صرف دلدادہ ہیں بلکہ اس کے پرستار بھی ہیں جس کی بنیاد انسانیت دوستی، مذہبی رواداری، روشن خیالی اور عالم گیر اخوت پر رہی ہے۔ بطور مثال ان کے ڈرامے ''اکبر اعظم'' اور ''داراشکوہ'' سے یہ مختصر اقتباس ملاحظہ کریں:

''اس کی شخصیت ہماری تہذیب کا نشان ہے اور ہندوستان کی کلچرل برتری میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔اگر اشوک نے دنیا کے سامنے ہندوستان کا سر اونچا کیا تو اکبر نے اس سر بلند ہند کے سر پر رواداری، خلوص، عالم گیر اخوات اور بھائی چارے کا جگمگاتا ہوا تاج رکھا۔''

(اکبر اعظم، پیسہ و پرچھائیں)

اسی طرح ''داراشکوہ'' میں بھی ہندوستان کی اُس تہذیبی وثقافتی امتیاز کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جس کے تحت عالمی سطح پر ہندوستان کی ایک نئی شناخت قائم ہو رہی تھی اور جس تہذیب کی بنیاد مذہبی کٹر پن اور شدت پسندی والے اقدار پر ہونے کے بجائے رواداری، وسیع المشربی اور انسان دوستی کے اصولوں پر قائم تھی۔داراشکوہ کی زبان سے ادا کرایا گیا یہ مکالمہ ملاحظہ کریں:

''میں اس ملک میں رواداری، محبت اور ملاپ کی فضا چاہتا ہوں جو جد اعلیٰ شہنشاہ اکبر نے قائم کی تھی۔مذہب ملاپ کا ذریعہ ہونا چاہئے نفرت کا نہیں۔ ہمارے دیش میں رام اور رحیم کے ماننے والے ہیں۔ ہمہ اوست اور تت وام اسی میں اس کا جلوہ دیکھیں۔ میں تخت و تاج صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر سارے مذہبوں کو ایک دوسرے کے قریب لاسکوں۔ایک بار پھر ہندوستان ایک ہو جائے یہی میرا خواب ہے۔یہی میرا ارمان ہے۔''

(داراشکوہ، مورپنکھی اور دوسرے ڈرامے)

پروفیسر محمد حسن نے میر تقی میر، غالب، عمر خیام، نظیر اکبر آبادی، محمد حسین آزاد وغیرہ جیسی اہم ادبی شخصیات اور ان کے عہد کو بھی اپنے ڈراموں میں عصری تاریخ وتہذیب کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان ڈراموں میں عہد ماضی کی تاریخی، تہذیبی وثقافتی حوالے بہت

نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ان ڈراموں کے مطالعے سے قاری نہ صرف عہد گزشتہ کی اہم ادبی شخصیات اور ان کی ذات کے اہم گوشوں سے متعارف ہوتا ہے بلکہ اس دور کے سیاسی وثقافتی منظر نامے کو بالکل جیتے جاگتے انداز میں دیکھتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے اپنے ڈراموں میں ان شخصیات کی زندگی کے اہم واقعات کو عصری تناظر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے حقیقت نگاری کا بے حد دلکش نمونہ پیش کیا ہے جس میں نہ صرف بلا کی فن کاری پائی جاتی ہے بلکہ فکری ترفع بھی نمایاں ہے۔گرچہ ادبی شخصیات پر بالخصوص غالب وغیرہ پر دوسرے ڈراما نگاروں نے بھی ڈرامے لکھے ہیں لیکن ان ڈراموں میں تاریخ کا وہ ویژن اور شعور کی وہ بالیدگی نہیں ملتی جو محمد حسن کے تاریخی و نیم تاریخی ڈراموں کے امتیازات ہیں۔

غالب پر لکھے ڈراموں میں غالب کی شخصیت ،فکر اور عہد کے حوالے سے پروفیسر محمد حسن کا زاویہ نگاہ ایک بالغ نظر مؤرخ اور ثقافت شناس مفکر کا زاویہ نگاہ بن کر نمایاں ہوتا ہے۔جس میں اس عہد کے ہندوستان کا پُر آشوب منظر نامہ قارئین و ناظرین کو نہ صرف اپنی گرفت میں لیتا ہے بلکہ انھیں تاریخی وتہذیبی بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔غالب پر لکھے ان کے ڈراموں میں صرف غالب کی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلو ہی نمایاں نہیں ہوتے بلکہ ایک پُر شکوہ تہذیب وثقافت جس کی بنیاد مغلیہ سلطنت نے مستحکم کی تھی ،اس کے خاتمے کا کرب ہر جگہ عود کر آتا ہے۔اس طرح غالب پر لکھے محمد حسن کے ڈراموں میں غالب کے عہد کا کرب اور آشوب صرف غالب کی ذات کا المیہ بن کر نہیں ابھرتا بلکہ ہندوستان کی ہزار سال کی تہذیبی و تاریخی اثاثے کے زوال کا المیہ بن جاتا ہے۔وہ اثاثہ جو پروفیسر محمد حسن کی نظر میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کی شناخت کا جزو لاینفک ہے۔اس لیے یہ کہنا ہرگز مبالغے پر مبنی نہ ہوگا کہ غالب کی شخصیت ،عہد اور شاعری کے حوالے سے غالب پر لکھے گئے متعدد ڈراموں میں غالب کی ذاتی زندگی اور عصری آشوب کو جس دقیق اور باریک بین زاویے سے پروفیسر محمد حسن نے پیش کیا ہے اس کی مثال کسی اور کے ڈرامے میں نہیں ملتی۔یہی سبب ہے کہ غالب پر لکھے گئے پروفیسر محمد حسن کے ڈرامے دیگر ڈراما نگاروں کے برعکس ناظرین و قارئین کو زیادہ شدت سے متاثر کرتے ہیں اور ان کی فکری وحسی سطح کو بیدار و روشن کرتے ہیں

پروفیسر محمد حسن کے بیشتر ڈراموں میں دانشوری کی رمق لازمی طور پر موجود رہتی ہے جو

انھیں دوسرے ڈراما نگاروں سے ممتاز و ممیز بناتی ہے۔ پروفیسر محمد حسن کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں موضوع، کردار اور مکالمے کے ساتھ ساتھ ماحول، فضا اور تہذیب و معاشرت کی پیش کش کا عمدہ التزام ملتا ہے۔ چونکہ ان کی فکر پر مارکسی نقطۂ نظر کا اثر غالب تھا اس لیے وہ موضوع کے تعین سے لے کر فلسفۂ حیات کے اظہار تک اپنے ڈراموں میں ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں جن سے عصری سماجی، سیاسی و ثقافتی تناظر نمایاں ہو سکے۔

پروفیسر محمد حسن چونکہ بالیدہ فکری و فنی شعور رکھنے والے ایک ناقد بھی رہے ہیں اس لیے بطور ڈراما نگار اپنے ڈراموں میں انھوں نے ان تمام پہلوؤں کو بخوبی پیش نظر رکھا ہے جو ڈرامے کو فنی و فکری لحاظ سے کامیابی سے ہمکنار کرنے والے پہلو قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں تصادم کی کارفرمائی بہت عمدگی کے ساتھ ملتی ہے جسے ڈرامے کا ایک اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے اور تصادم کا یہ عمدہ التزام ان کے ڈراموں کو فکری و جذباتی اعتبار سے اس معراج کمال تک پہنچاتا ہے جہاں پہنچ کر قاری اور ناظر صرف تماشائی نہیں رہتا بلکہ اپنے آپ کو ڈرامے میں شریک بھی پاتا ہے۔

چونکہ پروفیسر محمد حسن ڈارمانگار ہونے کے ساتھ ساتھ ہیں ڈاما ساز اور ڈراما کار بھی تھے اس لیے وہ ڈرامے کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی تنقیدی تحریروں میں نہ صرف اس بات پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں کہ ڈرامے کو محض تحریری فن کے طور پر نہیں برتا جا سکتا بلکہ اس فن کی روح عملی پیش کش میں مضمر ہے۔ لہٰذا وہ اس پہلو کو ہر لمحہ پیش نظر رکھنے پر زور دیتے ہیں کہ ڈراما بنیادی طور پر ایک عملی فن ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ڈراموں میں پیش کش اور عملی اظہار کے تمام لوازم بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس بات کو ذہن نشین رکھنا بھی ضروری ہے کہ ڈراما نگاری کے ساتھ پروفیسر محمد حسن نے خود ایک ڈراما گروپ کی تشکیل بھی کی تھی اور ڈرامے کی پیش کش کے عمل سے ذاتی طور پر وابستہ بھی تھے۔ اسی لیے ان کے ڈرامے اردو کے کامیاب ترین ڈراموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ خواہ ان کے ریڈیائی ڈرامے ہوں یا اسٹیج ڈرامے دونوں میں ان کی فن کاری کی امتیازی شان موجود ہے۔ ڈرامے کے اس پہلو کو واضح کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

”ڈراما صرف مردہ الفاظ کا نام نہیں ہے اور عام طور پر صرف پڑھنے کے لیے نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ

لکھنے والا اُسے اسٹیج پر پیش ہوتے دیکھتا ہے۔اسٹیج ڈراما، مکالمہ، اداکاری، میک اپ اسٹیج سیٹنگ، لباس، روشنی اور سائے سب سے مل کر بنتا ہے۔اسی لیے ان سب کے مجموعی تاثر اور جمالیاتی اپیل کے بارے میں ماہرین اسٹیج نے سنجیدگی سے غور وخوض کیا ہے اور بعض نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔'' (نئے ڈرامے، مرتب محمد حسن)

محمد حسن نے اردو کے ممتاز ڈراما نگاروں کے ڈراموں کا ایک مجموعہ ''نئے ڈرامے'' کے عنوان سے ترتیب دیا تھا۔جس کے پیش لفظ میں انھوں نے کافی تفصیل سے ڈرامے کی تکنیک، اس کی تشریح وتعبیر اور اس کی پیش کش سے متعلق باریکیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ڈرامے کی تفہیم کے حوالے سے بطور ناقد، ہدایت کار اور ڈراما ساز انھوں نے ان تمام پہلوؤں کی طرف اشارے بھی کیے ہیں جن سے ڈرامے کی تشریح وتعبیر اور پیش کش کا تعلق ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''سب سے پہلا مسئلہ ڈرامے کی تشریح اور تعبیر کا ہے۔ہر ڈرامے میں وحدت تاثر کا ہونا لازمی ہے۔یوں تو متعدد خیالات، تصورات اور اقدار ہر ڈرامے میں ملتے ہیں لیکن ڈرامے کے ہر کردار، ہر واقعے اور ہر آویزش میں ایک خیال یا ایک تصور ضرور جاری وساری ہوتا ہے اور وہی تصور ڈرامے میں وحدت پیدا کرتا ہے۔اس تصور کے ماتحت ڈرامے کے ہر پلو کی تشریح وتعبیر کی جانی چاہئے۔مثلاً شیکسپیر کے ڈرامے ''میکبتھ'' کا مرکزی خیال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجرم آخر کیفر کردار کو پہنچتا ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ فوق فطرت عناصر سے رابطہ خطرناک ہے۔اور میکبتھ کے کردار کے مطالعے کی حیثیت سے بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔یہ بھی ضروری نہیں کہ جس طرح ایک تحقیقی متن پر کام کرنے والا محقق مصنف کے اصل عندیے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ڈرامے کو پیش کرنے والا مصنف مرکزی خیال کے تابع ہو، وہ اپنے طور پر اگر ڈرامے میں کوئی بنیادی تصوراتی معنویت اور آہنگ پیدا کرتا ہے اور ڈرامے کے مختلف عناصر اس تصور اس تعبیر یا تشریح کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو پروڈیوسر کو اختیار ہے کہ ڈرامے کی اس کے اندرونی تقاضوں کے مطابق نئی توجیہہ پیش کرے۔'' (ایضاً)

ڈرامے کا فن صرف تخیل یا تاریخی وحقیقی وقائع کی تمثیلی پیش کش سے عبارت نہیں ہے۔کسی بھی فن کی طرح ڈرامے میں بھی اقدار وافکار کی ترسیل لازمی ہے۔کیونکہ اقدار وتصورات کی

ترسیل ہی ڈرامے کو فکری اعتبار سے وقار عطا کرتی ہے اور فنی سطح کو بھی ترفع بخشتی ہے اور یہ صفت ہی ڈرامے کو قاری یا ناظر کے لیے با معنی بناتی ہے۔ پروفیسر محمد حسن ڈرامے کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر ڈرامے میں کم سے کم تین قسم کی اقدار کی ترسیل ممکن ہے، فکری، جذباتی اور جمالیاتی۔ فکری اقدار سے مراد نئے افکار و خیالات ہیں۔ جو کردار اور واقعات کے نشیب و فراز سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جذباتی اقدار سے مراد یہ ہے کہ کرداروں کے تجربوں اور جذباتی سرگزشت میں ہم کس حد تک شریک ہوتے ہیں اور ڈراما کس حد تک ناظرین کو اپنے ساتھ بہالے جاسکتا ہے۔ اور کتنی قوت اور توانائی کے ساتھ ان کے جذبات کو متاثر اور مرتفع کر سکتا ہے۔ جمالیاتی اقدار سے مراد یہ ہے کہ اسٹیج پر روشنی اور سائے کا امتزاج، سنگیت، آوازوں کا زیر و بم، اداکاری، مختلف رنگوں کے تطابق یا تضاد، اسٹیج کے مختلف حصوں میں اداکاروں کا اجتماع اور ان حصوں کے درمیان ربط و آہنگ سے ناظرین کو کس طرح جمالیاتی انبساط حاصل ہوتا ہے۔ ڈراما پیش کرنے والے کا کام یہ ہے کہ وہ ڈرامے کے مرکزی تصور اور توجیہہ کا تعین کرنے کے بعد اس طرح اس ڈرامے کو پیش کرے کہ ہر نہج سے اسی مرکزی تاثر اور توجیہ کو تقویت حاصل ہو، اور ترسیل میں مدد ملے۔" (ایضاً)

غرض کہ ڈرامے کے فن میں پیش کش کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بہتر سے بہتر ڈراما اگر پیش کش کی سطح پر نقص کا شکار ہو جائے تو اس کی مٹی پلید ہو جائے گی اور بسا اوقات کمزور تر ڈراما بھی پیش کش کی بدولت ناظرین کو متاثر کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن ان باریکیوں سے بخوبی واقف تھے اس لیے وہ پیش کش کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پیش کش کے طریقے کے بارے میں نقطۂ نظر، فضا اور اسٹائل کا تعین ضروری ہے۔ نقطۂ نظر سے مُراد یہ ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے ڈرامے کا وہ تصور پیش کیا جائے جو اس کی تمام تر تفصیلات کو مربوط، مرتب اور ہم آہنگ بنا سکے۔ مثلاً اپسن کے ڈرامے "معمارِ اعظم" کی توجیہہ ناروے کی زندگی کے ترجمان کی حیثیت سے کی جائے تو ہلڈا کا سارا کردار غیر موزوں ہو جائے گا اور دیکھنے والا اس قدر کم عمر لڑکی کا اس قدر معمر شخص سے رومان اور اس کی بہکی بہکی

باتوں کی رمزیت کو فراموش کر کے اسے غیر فطری سمجھنے لگے گا۔ اس لیے ڈرامے کی پیش کش اس زاویے سے ہونی چاہئے کہ اس کا منطقی آہنگ قائم رہ سکے۔ فضا کا تعین بھی اسی طرح ہوگا۔ اگر ڈرامے کو مزاحیہ، طنزیہ، ہلکا پھلکا کہا جائے تو اس کی پیش کش میں جداگانہ فضا ملحوظ رکھنی ہوگی اور یہ فضا مکالموں کی ادائیگی، اسٹیج کی ترتیب اداکاری کے اسٹائل اور ڈرامے کی رفتار بھی میں جھلکے گی۔ اسی طرح اگر ڈرامہ، المیہ، طوفانی، مہماتی یا کربناک ہے، تو بھی ان صفات کا اندازہ اس کی پیش کش کے ہر پہلو میں اُجاگر ہونا چاہئے۔ اسی کے مطابق ڈرامے کا ہکا پُھلکا پن یا وزن و وقار بھی متعین ہوگا اور اس کے اختتام میں قطعیت اور وحدتِ تاثر پیدا ہو سکے گی۔ اسی کے مطابق کسی ڈرامے کی حقیقت پسندانہ پیش کش، فارس یا میلوڈراما یا فنٹیسی کی حیثیت سے اسے پیش کرنے کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔ (ایضاً)

پروفیسر محمد حسن ڈرامے میں موجود فکری قدر کو جذباتی قدر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے ہنر کو ڈرامے کے فن کا عین لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ ڈرامے میں موجود یہ قدر ناظرین کو ڈرامے میں شریک بناتی ہے۔ ڈرامے میں ناظرین کا شریک ہونا ایک ایسا عمل ہے جو اسے دوسرے فنون سے ممیّز کرتا ہے۔ کرداروں کی باطنی کشمکش، کرب و نشاط اور جذباتی سرگذشت میں ناظرین کی شرکت نہ صرف انہیں کرداروں کے جذبات و اعمال کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہے بلکہ ان کے تصورات و احساسات میں ارتعاش پیدا کر کے انہیں اپنے سامنے اسٹیج پر موجود کرداروں کے ساتھ اس طرح مربوط کرتی ہے کہ وہ ان میں اپنا عکس دیکھنے لگتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''ڈراما صرف کوئی نیا خیال یا نیا تصور ہی پیش نہیں کرتا۔ وہ اس فکری قدر کو جذباتی قدر میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ اکثر ڈراموں میں کرداروں کے اپنے تجربات میں ناظرین خود تخیل میں شریک ہوتے ہیں اس لیے صرف مرکزی خیال تصور یا فکری قدر پر ناظرین نظریں جمائے اور ان سے لو لگائے نہیں بیٹھے رہتے بلکہ بعض کردار کی باطنی کشمکش، کرب و نشاط اور جذباتی سر گذشت میں شریک اور ان کی زندگی میں خود شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ ڈرامے کی مرکزی جذباتی قدر کون سی ہے۔ اسی بنا پر ڈراموں کو المیہ اور طربیہ

کے دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن یہ محض ظاہری اور سطحی تقسیم ہے۔ دراصل جذباتی قدر کا تصفیہ اس بنا پر کیا جانا چاہیے کہ انسان کے بنیادی جذبوں میں سے کس جذبے سے ڈرامے کا واسطہ ہے۔ سنسکرت شعریات میں انسانی جذبے کو ۹ رسوں یا نو ۹ بنیادی منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں بھگتی (مذہبی یا روحانی) ہاسیہ (مزاحیہ) شرنگار (رومانی) کرونا (ہمدردی جگانے والے) جذبات و تصورات اہم ہیں۔"

(محمد حسن، پیرایۂ اظہار، مور پنکھی اور دوسرے ڈرامے)

یوں تو افسانوی ادب ہو یا ڈراما کردار اُس میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں لیکن ڈراما افسانوی ادب سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ کردار کی موجودگی کے بغیر افسانوی ادب کا تو کسی حد تک تصور قائم بھی ہوسکتا ہے مگر ڈرامے کا کوئی تصور کردار کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ کردار ہی ڈرامے کی عملی پیش کش کے کُل پُرزے ہوتے ہیں۔ اسٹیج اور فضا سازی کے ساتھ کردار ڈرامے کی پیش کش کو اپنی اداکاری سے درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن ڈرامے میں کردار کی توجیہہ و تعبیر کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کرداروں کی توجیہ اور تعبیر کا کام بھی اسی دائرے کے اندر رہ کر کرنا ضروری ہے۔ ہر کردار یا تو کلیدی اور بنیادی ہوں گے یا معاندانہ یا بحث طلب یا ان کی حیثیت مشیر یا ہمزاد کی ہوگی یا مصنف یا کسی طاقت یا گروہ کے نمائندے کی، وہ کسی خاص قدر یا نظام یا اقدار کے علمبردار کی حیثیت سے سامنے آئیں گے۔ ان تمام حیثیتوں میں ان کی شخصیت کے دو پہلو برابر پیش نظر رہنے ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ہر کردار کی اپنی شخصیت میں کوئی بے ربطی اور غیر منطقی بات نہ پیدا ہو۔ ہر غیر منطقی پہلو یا غیر منطقی بات کی وجہ بیان کی جانی چاہیے یا اس کا کوئی منطقی سبب موجود ہونا چاہیے۔ دوسرے اس کردار کی شخصیت اور اس کا ارتقا نشو و نما یا زوال کا رشتہ ڈرامے کے مجموعی تاثر اور مرکزی خیال سے کس طرح قائم ہوتا ہے۔ یعنی ہر کردار ایک فرد بھی ہے اور ایک ڈرامے کی اجتماعی زندگی کا ایک جزو بھی۔" (ایضاً)

ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت سے بھلا کیونکہ انکار ممکن ہے۔ برمحل اور موزوں مکالمہ نگاری ڈرامے میں جان پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے اور اس کے تاثر کو دوبالا کرتی ہے۔ ایک ماہر ڈراما نگار

ڈرامے میں مکالمے سے سحر جگانے کا کام کرتا ہے۔ اس ضمن میں محمد حسن کے یہ الفاظ ایک ماہر فنکار اور ہدایت کار کی فنی بصیرت کے غماز ہیں:

''مکالمہ دراصل صرف لکھے ہوئے یا بولے ہوئے لفظ کا نام نہیں اور الفاظ اسٹیج ڈرامے میں محض لغوی معنی ظاہر نہیں کرتے بلکہ بلیغ خاموشی اور بلیغ تر لہجے سے مختلف ٹکڑے یا ٹکڑوں پر زور دینے سے مفہوم ادا کرتے ہیں۔ آپ کسی مکالمے میں کس نقطہ پر زور دیں گے اور اس کا کیا مفہوم متعین کریں گے، اس کا تعلق ڈرامے کی اس مجموعی توجیہہ سے ہے جو آپ کے ذہن میں ہے اور اس کے بعد ڈرامے کے سیاق و سباق سے۔ ٹیلس نے ایک سادہ جملے کی مثال سے یہ بات واضح کی ہے'' آپ کیسے ہیں؟'' تین چھوٹے سے بظاہر واضح الفاظ ہیں، لیکن ان کے معنیٰ لہجے اور زور سے کچھ سے کچھ ہو سکتے ہیں۔ یعنی'' آپ کیسے ہیں'' سے یہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ پوچھنے والا آپ کی صحت کے متعلق پریشان تھا، اور اب استفسار حال پورے خلوص اور تشویش سے کر رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں بہت دنوں بعد ملے ہیں، اور صرف ملاقات پر اظہار مسرت مقصود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پوچھنے والا صرف اپنی برتری کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ میں تم کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوں۔'' (ایضاً)

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ پروفیسر محمد حسن محض بطور ڈراما نگار اس فن سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ وہ بطور ہدایت کار ایک ڈراما گروپ کے سربراہ بھی تھے اور ہدایت کار اور اسٹیج ساز کی حیثیت سے ڈرامے اسٹیج کرنے کا کام بھی انجام دیتے رہے تھے، اس لیے وہ ڈرامے کی تحریری و تخلیقی باریکیوں کے ساتھ پیش کش کے لحاظ سے اسٹیج کے تمام لوازمات، اداکاری کے ہُنر اور مکالمے کی ادائیگی سے متعلق ایک ایک جزو پر گہری نگاہ رکھتے تھے، پروفیسر محمد حسن ڈرامے میں استعمال ہونے والے مکالموں کی صرف تحریری Perfection کو کافی تصور نہیں کرتے بلکہ اُسے اظہار کے حوالے سے ڈرامے کی روح تصور کرتے ہیں۔ ڈارامے میں مکالمے کی ادائیگی کو وہ کتنا سنجیدہ عمل تصور کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کی اُن تحریروں سے بخوبی ہو جاتا ہے جو انھوں نے مختلف مواقع پر ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت کے ضمن میں لکھی ہیں، ایک موقع پر مکالمے کی ادائیگی کے سلسلے میں تلفظ کی باریکیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''عام طور پر لوگ پوری طرح منہ کھولے اور پوری طرح لب ہلائے بغیر بولتے ہیں۔ یہ بات بظاہر عیب معلوم ہوتی ہے، مگر اہل زبان بالخصوص حرف کی صحیح آواز کو لب کھول کر پوری طرح منہ سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیتے، کیونکہ وہ عادت کے مطابق ذرا سے اشارے سے پوری آواز تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسٹیج کے نقطۂ نظر سے یہ مناسب نہیں۔ سننے والے صرف ہماری آواز سے نہیں بلکہ ہمارے ہونٹوں کی جنبش سے بھی بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ اور اُنھیں اس کا موقع دینا چاہئے کہ اس کے علاوہ آواز صرف معنی اور مافی الضمیر کے اظہار اور ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اس کی جمالیاتی قدر و قیمت بھی ہے، اس کا مد و جزر، اس کا حجم، اس کا ترنم خود ایک کیفیت رکھتا ہے اور اس کی پوری رنگا رنگی اور بوقلمونی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر لفظ صحیح مخزن سے ادا ہو۔ ہماری آواز میں تنوع ہو اور ہر آواز کو ہم حلق تک محدود نہ رکھیں بلکہ سینے اور پھیپھڑے کی بھی مدد حاصل کریں۔ ہر ایک اچھا مکالمہ آواز کے تنوع اور اُتار چڑھاؤ کی ایک خاص ترتیب کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے مختلف حصے، مختلف انداز سے ادا ہونے چاہیں اور آہستہ آہستہ نقطۂ نظر عروج پر پہنچنے چاہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ لہجے کے تنوع اور آواز کی رنگارنگی کی مدد سے اور آواز اور تلفظ کے حسن اور بوقلمونی سے پوری طرح کام لیا جائے۔ یہ حسن اس صورت میں اور بھی زیادہ نمایاں ہو سکتا ہے جب مصنف اور اداکار دونوں کے ذہن میں یہ بات واضح ہو کر ہر جملے کا کلیدی لفظ کون سا ہے، باقی تمام الفاظ اس کے تابع یا معاون ہوں گے اور اس لفظ پر زور صرف ہو سکے گا، اس شکل میں آواز کی لہریں اور لہجے کا زیر و بم ایک مخصوص نقطۂ عروج پر مرکوز ہو سکیں گے۔ اسی کے ساتھ گفتگو کی رفتار، لفظوں کے درمیان فصل اور تیزی یا ٹھہراؤ کے مسائل بھی قابل غور ہیں۔''

(محمد حسن، پیش لفظ، نئے ڈرامے، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، فروری 1975)

اس اقتباس پر ہم اگر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ پروفیسر محمد حسن ڈرامے میں مکالمے سے متعلق پہلوؤں پر کتنی باریکی سے غور و فکر کرتے ہیں اور ان تقاضوں کی تکمیل کا خاکہ تیار کر کے ان باریکیوں کی جانب اداکاروں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ باریکیاں ہیں جن کو نظر انداز کر کے ڈرامے کے تأثر اور اس کی کامیابی کو ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔ ان باریکیوں کی وضاحت

اس لیے ضروری ہے کہ عام انداز گفتگو اور ڈرامے میں ادا کیے جانے والے مکالمے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عام گفتگو میں ہم عموماً اپنے خیالات کی ترسیل اور وہ بھی عمومی ترسیل پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ جملے اور الفاظ کو ادا کرتے وقت اس کی صحیح ادائیگی کے اصولوں کو زیادہ قابل توجہ تصور نہیں کرتے۔ ہم ان کی جمالیاتی پہلوؤں کی جانب سے بھی بے نیاز رہتے ہیں۔ آواز کے تنوع اور اتار چڑھاؤ کی ترتیب پر دھیان کم دیتے ہیں۔ حتٰی کہ صحیح مخزن سے آواز کی ادائیگی، آوازوں کے مدوجزر، اس کے حجم اور اس کے اندار پوشیدہ ترنم سے متعلق باریکیوں کی جانب سے عموماً بے اعتنائی برتتے ہیں۔ لیکن ایک ڈرامہ نگار اور ڈرامے کے پیش کار یا ہدایت کی حیثیت سے پروفیسر محمد حسن ان باریکیوں کو حد درجہ ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ ڈرامے میں مکالمے کی ادائیگی مخصوص صورت حال کی ترجمانی کا وسیلہ ہوتی ہے۔ جس میں الفاظ اور جملے کے زیر و بم، مخزن اور منہ یا لبوں کی حرکت غرض کہ ہر پہلو اس صورت حال سے متعلق تاثر کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ ڈرامے کے مکالمے بظاہر اسٹیج پر دو یا چند افراد کے درمیان، باہم ادا کیے جا رہے ہوں مگر ناظرین و سامعین کے طور پر اس مقام پر یا تھیٹر حال میں بڑی تعداد میں موجود افراد و اشخاص ہوتے ہیں جو صرف ان مکالموں میں موجود پیغام کی ترسیل کے متمنی نہیں ہوتے بلکہ وہ اس صورت حال (Situation) میں خود شریک بھی ہوتے ہیں اور جن کے لیے اس صورتِ حال سے متعلق تاثر کا ایک ایک عنصر اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی لیے پروفیسر محمد حسن یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ڈراما بطور ایک عمل مرکوز فن یعنی Performing Art پیش کش کی سطح پر جن لوازم کا تقاضا کرتا ہے ان کا پاس رکھے بغیر نہ تو کامیاب ڈراما لکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی کامیاب پیش کش ممکن ہے۔

پروفیسر محمد حسن ڈراما نگار کے لیے بھی اسٹیج کے لوازمات سے واقفیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اسٹیج کی ترتیب یا اسٹیج کمپوزیشن (Stage Composition) کو ڈرامے کی کامیابی کا ضامن قرار دیتے ہیں۔ جس میں اسٹیج سازی اور اسٹیج پر موجود ایک ایک شئے اور ان کے مابین ہم آہنگی، ان کی سیٹنگ یعنی متعینہ مقام پر ان کی موجودگی اور ان کے سیاق وسباق میں کرداروں کی حرکات وسکنات اور ان حرکات وسکنات کے لیے متعینہ اصول وضوابط غرض کہ اسٹیج کے تناظر میں کرداروں کی عملی کارکردگی کسی بھی ڈرامے کی پیش کش میں انتہائی اہم ہوتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''ڈرامے کا ہر منظر ایک تصویر ہے اور اس تصویر میں رنگ، اسٹیج کے سیٹ، اداکاروں کی انفرادی یا مختلف گروہوں کی شکل میں موجودگی، فرنیچر، روشنی اور سائے، میک اَپ، لباس اور سینری وغیرہ، سبھی کا حصہ ہے۔ ایک اچھا ڈائرکٹر اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ اسٹیج کے مختلف رقبوں میں ایک جمالیاتی توازن، تنوع اور ہم آہنگی قائم رہے۔ اس تصویر کو مکمل کرنے کے لیے ہر ڈائریکٹر ایک طرف گوان لکیروں، توسوں یا اُفقی خطوط سے کام لیتا ہے جو اس نے سیٹ یا فرنیچر کی ترتیب سے حاصل کر لیے ہیں۔ دوسری طرف وہ مختلف ٹھوس اور سہ جہتی اشیا اور شکلوں سے بھی کام لیتا ہے۔ تیسری طرف وہ رنگوں سے بھی مناسب فضا پیدا کرتا ہے۔ اور یہ رنگ، لباس سے لے کر میز پر رکھے ہوئے گلدان کے پھولوں تک سب اشیاء سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان اشیاء کی شکل، ان کی رنگت، ااور رنگ کی نوعیت، شدت یا لطافت سب مل کر ایک مجموعی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ چوتھی طرف وہ کرداروں کی آمد و رفت اور ان کے بدلتے ہوئے فاصلوں اور قربتوں سے بھی اس تصویر میں رنگ بھرتا رہتا ہے جو اسٹیج کی اصطلاح میں Grooping کہلاتا ہے۔'' (ایضاً)

ڈرامے کی پیش کش میں اسٹیج کمپوزیشن اور اداکاروں کی ترتیب کی اہمیت مسلم ہے اور اسٹیج کمپوزیشن یا اداکاروں کی ترتیب کی سطح پر کسی بھی قسم کی کوتاہی ڈرامے کے تاثر کو زائل کر سکتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن فرماتے ہیں:

''اداکاروں کی ترتیب اور گروہ بندی سے کئی فائدے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس طرح ڈرامے کا عمل پورے اسٹیج کے کم و بیش ہر رقبے پر محیط ہو جاتا ہے اور اداکار کی حرکت میں تنوع اور پھیلاؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے مختلف کرداروں کے ایک دوسرے سے باہمی تعلق (معاندانہ یا ہمدردانہ) کو بھی اس ترتیب کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے۔ دو دشمن قریب قریب کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن دونوں کے کھڑے ہونے کا انداز، ان کے رشتے کی اس نوعیت کو ظاہر کر سکتا ہے۔ تیسرا اہم مقصد اس سے یہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان گروہوں کی ترتیب نو سے محاکات کی نئی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اور نئی تصویریں بنائی جا سکتی ہیں۔ یہ گروہ بندی ڈائرکٹر کے لیے ہی نہیں ڈراما نگار کے لیے بھی حسن کاری کے نئے ذریعے پیدا کر سکتی ہے اور

اس کے مکالمے کی نوعیت پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔" (ایضاً)

غرض کہ ڈرامے کی پیش کش سے متعلق لوازمات سے بے نیازی کو پروفیسر محمد حسن ڈراما نگار اور ہدایت کار دونوں کے لیے مضر تصور کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے اندر ڈراما نگاری کے جوہر کے ساتھ ساتھ ہدایت کاری اور اسٹیج سازی کا گُر بھی بدرجۂ اتم موجود تھا اس لیے وہ اپنے ڈراموں میں ان لوازم کو برتنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے بیشتر ڈرامے اسٹیج کے تمام تر تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن جب ڈرامے پر اظہار خیال کرتے ہیں تو اس کی پیش کش سے متعلق پہلوؤں کو مرکزیت عطا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا ہدایت کار پورے آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ ڈرامے کی پیش کش کو ایک نگار خانہ اور اس کی آرائش سے تعبیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری خواہش ہے کہ ان ڈراموں کو صرف ہمارے دور اور سماج کی تصویریں ہی نہ سمجھا جائے بلکہ ایک ایسا نگار خانہ سمجھا جائے جس میں نت نئی تصویر سجانے اور بنانے کی گنجائش ہے۔ ان کا ہر منظر ایک تصویر ہے اور ہر تصویر پورا جمالیاتی شعور، پوری فن کارانہ بصیرت اور ریاضت چاہتی ہے۔ جن کاموں کو عام طور پر سب سے آسان سمجھا جاتا ہے، وہ سب سے مشکل ٹھہرتے ہیں۔ بولنا ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن آواز کا صحیح استعمال، تلفظ، لفظوں کے درمیان فاصلے کا احساس، رفتار، لفظوں پر زور دینا، اور آواز میں مناسب تنوع، حسن اور حجم قائم رکھنا بڑی ریاضت کے بعد آتا ہے۔ یہی حال اسٹیج پر موجودگی کا ہے۔ یوں تو کھڑا ہونا یا چلنا ہر ایک کو آتا ہے مگر در حقیقت اسٹیج پر کھڑے ہونے کے لیے بھی مشق اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ ہم میں سے اکثر اپنے دونوں پاؤں پر یکساں وزن نہیں ڈالتے، یہی صورت کاندھوں، شانے اور سینے کی ہے، اکثر لوگ سینے کو اس طرح سکیڑ کر چلتے ہیں کہ ان کا سر اونچا اور ان کا جسم صحیح قامت اختیار نہیں کرتا۔ اسٹیج پر قدم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اداکار دونوں ٹانگوں پر اپنا وزن کم وبیش برابر بانٹ سکتا ہو اور اس کے دونوں گھٹنے سیدھے، سر بلند اور سینہ نمایاں اور تنا ہوا رہ سکے اور جسم کے کسی حصے پر غیر ضروری دباؤ نہ پڑے۔ جس سے اس کی اداکاری میں زیادہ خوبصورتی اور اس کی حرکات و سکنات میں زیادہ حسن پیدا ہو سکے۔" (ایضاً)

پروفیسر محمد حسن اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اردو میں ڈراما نگاری کی روایت کو استحکام حاصل نہیں اور وہ اس کی وجہ اسٹیج کے فن سے اردو والوں کی بے نیازی کو قرار دیتے ہیں۔ وہ اسٹیج کو صرف انبساط کا وسیلہ تصور نہیں کرتے بلکہ اُسے ضابطہ اور ڈسپلن سے تعبیر کرتے ہیں:

"ہمارے ادب میں اچھے ڈراموں کی کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسٹیج کے فن سے ہمیں شغف نہیں رہا۔ اسٹیج صرف انبساط کا ذریعہ نہیں، وہ دراصل پورا ضابطہ اور ڈسپلن ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ڈرامے صرف مطالعے تک محدود نہ رہیں گے بلکہ پڑھنے والوں کو اسٹیج کے فن سے بھی دلچسپی پیدا ہوگی۔" (ایضاً)

پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں میں فنی لوازمات کی تکمیل کے ساتھ زبان کی سطح پر بھی ایک خاص قسم کی چاشنی ملتی ہے۔ عموماً ناقدین کی زبان خشک اور سپاٹ ہوا کرتی ہے اور اس کا اثر ان کی غیر تنقیدی تحریروں پر بھی نمایاں رہتا ہے۔ لیکن پروفیسر محمد حسن کی تخلیقی تحریروں میں زبان واسلوب کی سطح پر تخلیقی رچاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز بطور ایک تخلیق کار ہی کیا تھا اور تخلیقیت ان کے فطری میلان کا حصہ تھی، لہٰذا ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی زبان کی سطح پر تخلیقیت کی آمیزش کارفرما نظر آتی ہے۔ خواہ ان کے ڈرامے ہوں، ان کے ناول یا ان کی شاعری، ان کی تخلیقات میں ان کا تخلیقی جوہر ہر جگہ نمایاں ہے۔ بطور مثال ان کے ڈراما 'ضحاک' کے یہ مکالمے ملاحظہ کریں:

"ضحاک: ہم نے کیا گناہ کیا ہے، ملکہ کہ یہ سانپ ہمارے شانوں پر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیئے گئے کہ یہ ہماری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کردیں۔ کون سا پاپ ہے جس کی بھیانک سزا ہمیں رات دن بھگتنی پڑ رہی ہے؟ کیا تیرا شہنشاہ گناہ گار ہے؟ کیا ہمارے چہرے پر پاپ کا کوئی نشان ہے؟ رب اعلیٰ کی قسم ہمیں بتاؤ، کیا ہم پاپی ہیں؟

نوشابہ: ہم گناہ کی طرف نہیں جاتے مالک، گناہ ہمیں تلاش کر لیتے ہیں۔

ضحاک: ہم نے جمشید کے ملک کو فتح کیا اور اُسے زندہ آروں سے چروادیا۔ ملکی انتظام کے لیے یہ قربانی ضروری تھی۔ ہم نے اپنے مخالفوں کے منہ بند کردیے کہ ملک نظم وضبط

کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ قلم کاروں کے ہاتھ کاٹ دیئے کہ مادرِ وطن کو ان کی ضرورت تھی، ملک کو ایک سرکاری زبان دینے کی خاطر ہم نے دوسری زبانیں بولنے والوں کی زبانیں کھچوالیں۔ کافر اور ملحد قبیلوں کو فرقہ وارانہ فساد میں قتل کرانا پڑا کہ دین کی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔ کم کام کرنے اور اجرت مانگنے والے مزدوروں اور کاہل کسانوں کو گورخر کی کھال میں زندہ سلوادیا کہ دوسروں کو عبرت پیدا ہو۔ پیداوار کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آبادی کا کم کرنا ضروری ہوا تو مردوں کو آختہ کرایا، عورتوں کے رحم نکلوا کر پھینکوادیئے، انصاف اور قربانی پر مبنی اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے کون سا فرض تھا جو ہم نے پورا نہیں کیا۔ کون سی ذمہ داری تھی جس سے ہم نے منہ موڑا اور کون سا سخت امتحان تھا جس پر اپنے محبوب عوام کی خاطر ہم پورے نہ اترے ہوں۔" (ضحاک)

"کہرے کا چاند" کے یہ مکالمے غالب کی زندگی کے ذاتی کرب اور عصری آشوب دونوں کا احاطہ کرتے ہوئے کس درجہ تخلیقیت سے لبریز ہیں:

"بیگم: آخر کام کیسے چلے گا۔ قرضہ اور سود جدا، شاگرد پیشہ، چوکیدار چوبدار، نوکرانی، یوسف مرزا کی دوادارو کھانا پینا، مکان کا کرایہ، آخر یہ سب کہاں سے آئے گا؟

غالب: کہاں سے گنجائش نکالوں، سنو، صبح کی تبرید موقوف، رات کی شراب وگلاب موقوف، چاشت کا گوشت آدھا۔

بیگم: اس طرح پیٹ کاٹ کر کیا مل جائے گا؟

غالب: جو ملے غنیمت ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

بیگم: خدا جانے میری قسمت کا سکھ چین کہاں چلا گیا ہے؟ اس گھر میں نہ اچھا کھانے کو نہ اچھا پہننے کو، نہ اولاد کا سکھ چین ہے نہ دل کو اطمینان۔

غالب: میں جس عالم میں ہوں، وہاں تمام بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں، یہ دریا نہیں سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ مجھ سے وہ نہ مانگو جو میرے اختیار سے باہر ہو۔ تمہاری یہ

دنیا، یہ کائنات اتنی بھی وسعت نہیں رکھتی کہ ایک ذرہ جی بھر کر بازو پھیلا کر بے تابانہ ناچ لے۔ پھر میں تو انسان ہوں امراؤ بیگم! انسان۔ اور میرے دل میں وہ غم چھپے ہیں کہ پتھر پر پڑیں تو اس کی رگوں سے خون کی ندیاں جاری ہو جائیں۔ جاؤ بس اب جاؤ۔۔۔ میں نے تو دنیا سے اقبال و دولت، جاہ و حشمت کچھ نہیں چاہا۔ کچھ نہیں مانگا، صرف اتنی مہلت چاہی تھی کہ جی کی بات کہہ سکوں اور وہ بھی میسر نہ ہوئی۔ کون اس محرومی کو سمجھے گا، کون اس بے بسی کو جانے گا۔" (کہرے کا چاند)

آخر میں شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ڈرامے کے فن اور پیش کش سے متعلق پروفیسر محمد حسن کے ان گراں قدر تصورات کی روشنی میں اگر ان کے ڈراموں کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ ان کے قول و عمل میں تضاد کے بجائے ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ بطور ڈراما نگار ان کا تخلیقی عمل اُن کے تنقیدی آرا سے کافی حد تک مماثلت رکھتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اُنھوں نے ڈرامے صرف برائے تکمیل شوق نہیں لکھے بلکہ اس فن کو شعوری طور پر اختیار کیا اور ایک پختہ کار ڈراما نگار کی حیثیت سے اس کے تمام فنی نکات و رموز سے آگہی کو اپنے ڈراموں میں بروئے کار لانے کی کوشش بھی کی۔ اُن کی دانشورانہ بصیرت نے اُن کے ڈرامے کو فکری لحاظ سے ترفع عطا کرنے میں سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ اِن خوبیوں کی بنا پر ڈراما نگاری کی تاریخ میں پروفیسر محمد حسن کا نام ہمیشہ روشن اور تابناک رہے گا۔

گرچہ پروفیسر محمد حسن کو بیسویں صدی کے ایک ممتاز ڈراما نگار کے طور پر تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بطور ڈراما نگار ان کے صحیح مقام و مرتبے کا تعین ہنوز توجہ طلب ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں کے بعض مجموعے بشکل دستیاب ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر محققین اس ضمن میں نہ صرف دشواریوں کا سامنا کرتے رہے ہیں بلکہ بیشتر نوجوان ریسرچ اسکالرز پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں کے مجموعوں کی تعداد اور ان کی اشاعت کے متعلق گمراہیوں کا شکار بھی ہوتے رہے ہیں۔ لہذا مجھے یہ ضروری معلوم ہوا کہ پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں کے مجموعوں کو تاریخی ترتیب کے اصولوں کے تحت مرتب کر کے کلیات کی شکل میں مکمل تفصیلات یعنی سن اشاعت، مقام اشاعت، ناشر وغیرہ کے ساتھ یکجا کر دیا جائے۔ اس کلیات کی اشاعت سے

یقیناً پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں پر تحقیقی کام کرنے والوں کو مستند اور معتبر معلومات وتفصیلات حاصل ہوسکیں گی۔ علاوہ بریں پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں کے کئی مجموعے جو عرصہ دراز پہلے شائع ہوئے تھے اور اب ان تک رسائی کار محال ہے۔ اس کلیات کی اشاعت سے قارئین و محققین اور ڈرامے کے شائقین کو اس ضمن میں آسانیاں ہوں گی۔

اس کلیات کی ترتیب میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جن مجموعوں میں محمد حسن کے لکھے ہوئے دیباچے یا مقدمے ہیں ان کو بھی مجموعے کے ساتھ من وعن شامل کرلیا جائے تاکہ عمومی طور پر ڈرامے کے فن اور اس کی پیش کش سے متعلق پروفیسر محمد حسن کے افکار وتصورات اور خصوصی طور پر اس مجموعے کے ڈرامے سے متعلق جو بنیادی اشارے ان کے مقدمات اور پیش لفظ میں موجود ہیں وہ بھی کلیات میں محفوظ ہو جائیں اور ان ڈراموں کے پڑھنے والوں یا اُنھیں اسٹیج کرنے والوں کو ان اشاروں سے ان کے ڈراموں کی تفہیم اور پیش کش میں مدد مل سکے۔ مجھے امید ہے کہ آنے والے دنوں میں پروفیسر محمد حسن کے ڈراموں پر خصوصی توجہ ہوگی اور ناقدین ادب وفن ان کی ڈراما نگاری کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر توجہ مرکوز کرسکیں گے۔

5/مارچ 2019

انور پاشا

پروفیسر اینڈ سابق چیئرپرسن
سینٹر آف انڈین لنگویجز
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
110067

پیسہ اور پرچھائیں

محمد حسن

شائع کردہ

ادارہ فروغ اردو، ۳۷ امین آباد پارک، لکھنؤ

سول ایجنٹ

انوار بک ڈپو امین آباد پارک لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتا

مبارک بک ڈپو، بندر روڈ مقابل ڈینسو ہال کراچی۔۲

قیمت

مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ

1955

فہرست

انتساب

لکھنؤ کی شاہراہوں کی نذر

جو اِن ڈراموں کے "درد وداغ"

جستجو و آرزو کی رازداں ہیں

دیباچہ

انسانی زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جو ہر انسان سے زندہ رہنے کا جواز طلب کرتے ہیں، آخر یہ ''کارگہِ شیشہ گری'' یہ نفس کی آمد و شد کیوں ہے اور کس لیے ہے؟ ہر شخص زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس فیصلہ کُن سوال کی گونج ضرور سنتا ہے۔ یہ لمحے شاہراہوں کے دوراہے پر بس کی قطار میں کھڑے ہوئے خواب گاہ کے دریچوں میں اور دفتر کی میزوں پر کسی جگہ بھی مل جاتے ہیں اور نظروں میں نظریں ڈال کر پوچھتے ہیں ''آخر تم کیوں زندہ ہو... آخر کس لیے زندہ ہو؟''

یہ ڈرامے میرے ہی کمزور لمحوں کی داستانیں ہیں جب میں اپنی زندگی کے کشکول کی تلاشی لینے کے لیے مجبور ہوا ہوں اور کسی ایسے بہانے کو ڈھونڈنے نکلا ہوں، جس کے سہارے زندگی گزاری جا سکے۔ اس کے ایک کردار نے کہا ''ہم سب کو زندہ رہنے کے لیے ایک نہ ایک جھوٹ کی ضرورت پڑتی ہے'' اور بقول جمیل مظہری: ''اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا''

پھر کسی کا یہ مقولہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی فلسفۂ حیات ضرور ہوتا ہے، کچھ ایسے ہیں جو غیر شعوری طور پر اسے اختیار کرتے ہیں، کچھ شعوری طور پر۔ یہ ڈرامے اسی زندگی بخش جھوٹ یا حوصلہ نواز خیال کی جستجو میں لکھے گئے ہیں۔

میری یہ تخیلی اور جذباتی زندگی کی روداد ہے، اس تخیل میں صرف داخلی حادثات ہی نہیں، فکری حادثات بھی شامل ہیں۔ جس طرح شکستِ دل کا تجربہ داخلی تاثر پیدا کرتا ہے اسی طرح پشکن کے عظیم فن پارے ''حکم کی بیگم'' یا گوگول کے ''انسپکٹر جنرل'' سے ملاقات بھی ذہنی اور جذباتی واقعات ہیں۔ کیونکہ یہ فن پارے یکا یک اس تجربے کو روشن کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو

زندگی کے ہزار ہا بکھرے ہوئے نقوش سے مل کر بنا ہے۔

چیخوف نے کہا ہے "مسرت ہمیشہ ہماری پیٹھ پیچھے ہوتی ہے، ہم اسے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے۔" یہی حال غالباً حقیقت کا ہے جو ہزار ہا تجربوں، واقعات، روزمرہ کے معمول اور سسکتے اور لاشوں سے زیادہ سرد "سلسلۂ شب و روز" میں کھوئی رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس مینارۂ بابل سے غیر معمولی اور ہم آہنگ صدا بھی آجاتی ہے۔ کبھی کبھی ان نقابوں سے ایک ایسی پرچھائیں بھی جھلک اٹھتی ہے کہ انسان "ارشیڈلیس کی طرح پکار اٹھتا ہے۔" "میں نے اسے پالیا، میں نے حقیقت کو پالیا۔" زندگی یہی ہے۔ یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔

یہ سروش غلط آہنگ بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس میں داخلی تاثر کی روشنی ہے تو خلوص اور جذباتی، شدت اس میں ہوشربا رنگ بھر دیتی ہے۔ یہی لمحۂ گریزاں دراصل ڈرامے کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایک ثانیہ میں ہم زندگی کے بکھرے ہوئے رنگوں کو وحدت تاثر کی شکل میں دیکھ لیتے ہیں اور ہزار ہا بے ربط، یکا یک ہم آہنگ ہو کر ایک سنگیت، ایک تاثر، ایک تصور حیات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اگر یہ ڈرامے میں نے صرف ریڈیو کے لیے لکھے ہوتے تو میں انھیں چھپوانے کی جرأت نہ کرتا، انھیں چاندی کی نہیں، بصیرت کی چاندنی کی تلاش ہے اور اس رہ نوردی میں آپ کو ہمراہ لینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اس مجموعہ میں مختلف ڈرامے ہیں۔ "معمار اعظم"، "انسپکٹر جنرل" اور "حکم کی بیگم" بیرونی ادبیات سے لیے گئے ہیں۔ دو ادبی شخصیتوں کی سرگذشت ہیں۔ دو کردار تاریخ سے لیے گئے ہیں اور دو طبع زاد، سماجی ڈرامے ہیں۔ لیکن اس اختلاف اور تنوع کے باوجود ان میں ایک فکری وحدت تلاش کی جاسکتی ہے۔ "معمار اعظم" کے ہیرو سول نس میں زندگی کو خوبصورت بنانے اور صرف انسانوں کے رہنے کے لیے مکان تعمیر کرنے کی وہی لگن ملتی ہے جس کے فقدان پر گوگول نے "انسپکٹر جنرل" میں طنز کی ہے۔ یہاں سارا سماج صرف پیسہ کے گرد گھومتا ہے، وہی پیسہ جو "حکم کی بیگم" میں ہرمان کو تاریک سایوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہی پیسہ جو "پیسہ اور پرچھائیں" میں عذاب اور پستی کی پرچھائیں ہو کر رہ جاتا ہے۔

نظیرا کبر آبادی دربار کی نوکری کے مقابلے میں تاج محل کے مدہوش کن نظارے کو پسند کرلیتے ہیں، غالبؔ بسترِ مرگ پر بھی حسرت تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں اورا کبر تاریخ میں ایک ایسے حکمراں کی شکل میں آتا ہے جونئی زندگی کی داغ بیل ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ''سرخ پردے'' کی بیگم صاحبہ اس تقاضے کو اپنا خون دے کر پورا کرتی ہیں۔ اس طرح ہر جگہ وہی ایک استفہامیہ مختلف شکلوں میں سامنے آتا ہے۔

اس سوال کا جواب دینے کی جتنی ضرورت آج ہے اس سے پہلے شاید ہی کبھی رہی ہو۔ آج کے ہندوستانی سماج کے پاس آدرش کی روشنی کم ہے اور عملی اور مادی آسودگی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کی کمزوری بہت زیادہ۔ چھوٹی حقیقتوں کو۔ ایک ملازمت ایک وردی اور ایک جوڑا سفید کپڑوں کو۔۔۔ زندگی کے خوبصورت بنانے کے سارے تصورات سے اعلیٰ سمجھا جانے لگا ہے۔ ہمارے سماج نے انسان کو مکر کی کرسیوں، دفتر کی میزوں اور جگمگاتی جاگتی سڑکوں کی گرد میں گم کر دیا ہے۔ ہم سب آہستہ آہستہ روپیہ اور سستی آسودگی کی تلاش میں افتاں وخیزاں ہیں اور اس چاندی کے ٹکڑے کے گرد انسان کا ضمیر، اس کے خواب اور اس کی ساری جذباتی زندگی گھوم رہی ہے۔

مادی آسودگی کی خواہش گناہ نہیں لیکن مسرت دراصل انفرادی نہیں اجتماعی جذبہ ہے جب تک انسان کی آواز میں ''تو شب آفریدی چراغ آفریدم'' کا لہجہ پیدا نہ ہو اس کی تگ و تاز محدود رہے گی۔ اگر واقعی مسرت چند مادی آسودگیوں کا نام ہے تو پھر اس انسان کے بارے میں کیا کہئے گا جو دنیا کی آنے والی مسرت کے نام پر زہر کا پیالہ پی لیتا ہے، کبھی صرف زمین کی گردش ثابت کرنے کے لیے کلیسا کی گلخن میں جل جاتا ہے، کبھی آنے والی نسلوں کے لیے حسن اور عرفان کی شمع روشن کرنے کی لگن میں ہنستا ہوا صلیب پر چڑھ جاتا ہے۔ انسانی وجود کی سب سے بڑی مسرت یہی فخر ہے کہ انسان آنے والی نسلوں کے لیے زندگی کو خوبصورت اور حسین بنانے کی جدوجہد میں حصہ لے سکے۔ اس جدوجہد کا انجام کیا ہوگا۔ فتح یا ناکامی؟ شاید یہ اس کے اختیار سے باہر ہے۔

یہ ڈرامے عموماً اور ''پیسہ اور پرچھائیں'' خصوصاً اس ایک مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں۔ اگر ان سے نئی نسل کو کچھ حوصلہ مل سکا نئی سماجی حقیقتوں سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہونے اور انھیں بدلنے کا کس بل ملا یا اس کی طرف ذہن متوجہ ہوا تو میں سمجھوں گا کہ ان ڈراموں نے اپنا

مقصد پورا کردیا۔

ظاہر ہے ان ڈراموں میں فنی حد بندیاں ہیں۔ ریڈیو کے لیے لکھے جانے کی وجہ سے یہ رب، واز، مکالمے اور سلیت ہی سے اپنا مفہوم اور فضا ظاہر کر سکتے ہیں۔ رفتار و رنگ ان کی پہنچ سے باہر ہیں لیکن اگر اس حلقے میں رہ کر یہ اپنی بات کہہ سکے تو یہی کامیابی ان کے لیے بہت ہے۔

یہ ڈرامے میں نے ریڈیو کے لیے لکھے ہوئے اپنے تین درجن ڈراموں سے انتخاب کیے ہیں۔ ان میں اکثر آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے بار بار براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں اور عام طور پر پسند کیے گئے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے ان اداکاروں اور پروڈیوسروں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے ان کو کامیاب بنایا خصوصاً رمیش پال اور عیاذ انصاری صاحبان نے ان کی کامیابی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو دہلی کا شکریہ ادا کرنا ہے جس نے ''پیسہ اور پرچھائیں'' کو چھاپنے کی اجازت دی۔ یہ ڈرامہ ان سے ہندوستان گیر مقابلے میں پہلا انعام حاصل کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اور محمد حسین صاحب شمس صاحب مالک ادارۂ فروغ اردو کا شکریہ بھی ضروری ہے۔ جن کے تعاون کے بغیر یہ مجموعہ پیش نہ کیا جا سکتا تھا۔

محمد حسن

شعبۂ اردو

مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ، ۲۹ر اگست ۱۹۵۵ء

پیسہ اور پرچھائیں

رامو: اُپن کا نام رامو ہے۔ انسپکٹر صاب۔ اُپن صفا صفا بولتا ہے۔ جھوٹ جعل فریبی اپنے کو نہیں آتا۔ تم نے ہم کو پکڑا سو تو ٹھیک ہے۔ ہم پاکٹ مارتو ہے۔ جیب کاٹنے سے تو اپنا دھندا چلتا ہے۔ چکا چک شہر بمبے میں ہر کوئی یہ بولتا ہے تو پاکٹ مار ہے تو جیب کاٹ ہے''۔ پر کوئی ایسا نہیں بولتا کہ ''رامو سالے تو جیب کیوں کاٹنا مانگتا ہے''۔

جب ہم پہلے پہل بومبے (بمبئی) میں آیا۔ مل میں کام کرتا تھا۔ دھرم دھرم سے بولتا ہے انسپکٹر صاحب خوب ڈٹ کے کام کرتا تھا۔ پر چھٹنی میں صاحب لوگ ہمیں نکال دیا۔ ہم بہت دکھی تھا۔ انسپکٹر صاحب۔ اپنا ایک سالا یار تھا رگھو، اپنی چال کے آس پاس کے لوگوں میں بس ہم اسی کو جانتا تھا، ہم روتا ہوا اس کو بولا تھا۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

رامو: رگھو رگھو، رگھو دادا۔

رگھو: اوہ تو ہے رامو۔

رامو: (چیخ کر) نوکری چھوٹ گئی رگھو دادا۔ ہم بمبے میں مر جاوٗں گا۔ ماں جی بیمار ہے وہ مر جائیں گا۔ ہم کیا کروں گا۔ اب ہم کیسے، جیوں گا۔ رگھو دادا۔

رگھو: پگلا کہیں کا۔ لے بیڑی پی۔

رامو: تم نہیں جانتا۔ رگھو دادا۔ اُپن بہت غریب ہے۔ ماں کی دارو بھی نہیں کر پائیں گا۔ دادا نوکری چاہیے۔ اپن کو نوکری ملنی چاہئے۔

رگھو: ہشت چھوکرا ہو کے چھوکری کی طرح روتا ہے۔ ایسا نامردی کی بات بولتا ہے۔

رامو: اپن کی سمجھ کام نہیں کرتی دادا۔ یہاں تو کوئی اپن کو جانتا بھی نہیں۔

راگھو: سن رے چھوکرا۔ جو تجھ سے پوچھوں ویسا بول۔ تو جوان ہے؟

رامو: برابر۔

رگھو: مضبوط ٹانٹھا ہے؟

رامو: ہاں دادا۔ مل میں کل ہی اپن نے دو من پکا بورا اٹھا کے ایک طرف ڈال دیا تھا۔

رگھو: بمبے بہت بڑا شہر ہے نا؟

رامو: ہاں دادا چکا چک ہے۔

رگھو: پھر تجھے چنتا کیا، فکر کس بات کا۔ کوئی تو دھندا لگیں گا۔ ضرور لگیں گا۔

رامو: ایسا بولتا ہے دادا۔ تو لا ہاتھ پر ہاتھ مار۔ کام دلائے گا نا؟

رگھو: ضرور دلائیں گا، تو نے کھانا کھایا ہے؟

رامو: نہیں۔ اب جا کے کھائیں گا۔

رگھو: تو ٹھہر میرا کھانا ابھی رکھا ہے۔ اِسے تو کھائے گا۔

رامو: نہیں دادا۔

رگھو: ہم دونوں کھائیں گا۔ چل تھال اٹھا لا۔ اور ہاں تجھے ماں کی دوا دارو کے لیے آج پیسہ چاہئے تو ایسا بول۔

رامو: ہاں دادا، چاہئے تو۔

رگھو: تو سن۔ یہ پانچ روپے کا نوٹ رکھ لے۔ جب خلاص ہو جائے تو بولنا تجھے اور دے دیں گا۔

رامو: دادا تجھے تو تکلیف ہو جائے گی۔

راگھو: چل ہٹ۔ جیب میں رکھ۔ تھالی ادھر بڑھا۔ پانی کا گلاس بھی اٹھا تا لا۔

رامو: کھانا مزے دار بنا ہے دادا۔

رگھو: ابے جا، تو بھی یوں ہی رہا۔ یہ بھی کوئی مزے دار ہے۔ تو میرے کی بات سنے تو تجھے سچ مچ مال کھلاؤں، فسٹ کلاس مال۔

رامو: بول نہ دادا۔ اچھی سی نوکری ہے نا؟

رگھو: بہت اچھی فسٹ کلاس نوکری۔ اور پتا ہے کس کی نوکری ہے؟

رامو: کس کی بھلا؟ کپڑا بننا ہوگا۔ کاٹن مل کی ہے کیا؟

رگھو: نہیں بے، کپڑا کاٹنے کی ہے۔

رامو: کونسا مل مالک ہے دادا۔ مجھے تم لے چلو گے نا۔

رگھو: ہاں کپڑا کاٹنے کی نوکری ہے۔ اور — میں تجھے نوکر رکھوں گا میں۔

رامو: تم؟ دادا تم کتنا اچھا ہے۔

رگھو: سن رامو، میں پاکٹ مار ہوں۔

(پس منظر میں موسیقی ایک دم بہت تیز ہو جاتی ہے)

رامو: رگھو دادا؟ پاکٹ مار؟ دادا!

رگھو: کھانے سے کیوں ہاتھ روکتا ہے بے۔ ہم تو تیری فائدے کی بات بولتا ہے۔

رامو: کیسا بولتا ہے تم؟

رگھو: سن ہمارے اوپر پولیس کو شبہ ہو گیا ہے۔ اپن کا دھندا ایک دم مندا پڑ گیا۔ تیرے میں بل ہے۔ جوان ہے۔ سمجھدار ہے۔ ہم تجھے سکھائیں گا۔ ایک ذرا سے میں (چٹکی بجاتا ہے) اتنی دیر میں جیب صفا کیا اور لے آیا۔ کوئی لفڑا نہیں۔ نہ کوئی مل مالک نکال سکتا اور نہ چھٹنی کر سکتا۔

رامو: (حیرت میں) دادا؟

رگھو: بول کرے گا نوکری چھوکرے۔ یا ایسا ہی بمبئی کے فٹ پاتھ پر مریں گا اور اپنی ماں کو بھی ماریں گا۔

رامو: دادا۔ اپن کی ماں جی کو پتا چلے گا تو وہ دکھ سے مر جائیں گا۔ وہ بچے گا نہیں دادا۔

رگھو: ہونہہ۔ اسکو ایسا کیوں بولیں گا۔ ماں جی سے بول کہ ہمارا نوکری والا سیٹھ ہمیں پیسا دیتا ہے۔

رامو: اور جیل خانہ کون جائے گا۔ نہیں ہم سے یہ لفڑا با جی نہیں ہوگا۔ یہ لے اپنا پانچ روپیہ۔

رگھو: (بات کاٹ کر) چھوکرا ہو کے جیل سے ڈرتا ہے۔ تھو (تھوکتا ہے) جا۔ تجھ سے کچھ نہیں

ہوگا۔ (ہنستا ہے) بھنڈی بازار سے عورتوں کا چوڑیاں لے اور کھولی کے اندر بیٹھ جا۔ بھاگ۔ تیری اماں تجھے یاد کرتی ہوگی۔ ہت تیری کی۔ (دروازہ بند کرنے کی آواز)

(گنگناتا ہے) انکھیاں ملا کے جیا برما کے چلے نہیں جانا۔

ہو چلے نہیں جانا

ہو چلے نہیں جانا

(رامو کی ماں بیمار آواز میں آرتی اتار رہی ہے۔ سنکھ کی آواز آتی ہے اور اس کے بعد گیت شروع ہوتا ہے)

سنی ہو میں ہری آون کی اواج

محلوں چڑھے چڑھی جاؤں بجنی

کب آوے مہاراج

سنی ہو میں ہری آون کی اواج

دادر مور پپیہا بولے

کوئل لدھر ساج

سنی ہو میں ہری آون کی آواز

ایگو اندر چھوں دس برسے

دامنی چھوڑے لاج

سنی ہو میں ہری آون کی آواج

رامو: ماں جی۔ ماں جی۔

ماں: (گاتے ہوئے) سنی ہو میں ہری آون کی آواج۔

رامو: ماں جی۔

ماں: آج بہت جلدی چلے آئے بیٹا۔

رامو: اپن تو جلدی آیا۔ پر تم کھاٹ سے کیوں اٹھ بیٹھی پھر کھانسی پر زور ہو جائیں گا۔ ڈاکٹر بولتا ہے۔ بہت خطرے کا بیماری ہے تم مانتی نہیں۔

ماں: اے دیکھ رامو: مجھ سے یہ بمبیّا بولی، تو بول مت۔ ٹھیک ٹھیک اپنے دیس کی بولی، کیوں نہیں بولتا۔

رامو: ماں۔ تم کھاٹ سے کیوں بار بار اٹھتی۔

ماں: پگلے کہیں پربھو کے درشن میں بھی کسی کو دکھ پہنچتا ہے۔ میں تو ہری پوجا کر رہی تھی۔ اچھا، اب سمجھی۔ تو میری دوا دینے آیا ہے۔ اسی لیے مل سے چھٹی لے کر جلدی چلا آیا۔ (کھانسی اٹھتی ہے)

رامو: آج ذرا جلدی کام خلاص ہو گیا ماں۔

ماں: دوا لیتا ہوا آیا ہے نا۔

رامو: نہیں ماں۔ ڈاکٹر بولتا، آج دوکان بند ہے۔ کل دوا دیں گا۔

ماں: اچھا رے۔ اچھا۔ (کھانستی ہے)

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

رامو: کون ہے۔

آواز: رامو رامو رے۔

رامو: اوہو، منیم جی۔ نمستے۔ بندگی۔ آیئے منیم جی۔

منیم: رامو چار مہینے کا بھاڑا ابھی تک نہیں ملا۔ آج کا وعدہ تھا، کچھ ملیں گا نا؟

رامو: پیسہ؟ آج تو گھر میں کچھ نہیں ہے، منیم جی۔

منیم: ایسا نہیں چلیں گا رامو۔ تم کان کھول کر سن لے۔ کرایہ دے گا، نہیں تو کھولی خالی کریں گا۔

رامو: منیم جی۔ اپن کا ماں جی بہت بیمار ہے۔ دوا دارو میں بہت خرچہ پڑتا ہے۔

منیم: بے کار بات کاہے کو بولتا۔ شکروار کو کرایہ دیگا؟

رامو: ایک مہینے کا ٹائم دے دیجئے منیم جی۔

منیم: جانتا نہیں ہے۔ شالا کس سے بات کرتا ہے۔ ہری چند منیم نے شالا اپنے باپ کو ٹیم نہیں دیا۔ تجھ کو ٹیم دے گا؟

رامو: ہم مر جائیں گے، منیم جی۔

منیم: ضرور مریں گا۔ پرسوں بھاڑا دیں گا۔ پھر مریں گا سمجھا۔ زیادہ بولنا نہیں مانگتا۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

ماں: کون تھا رامو؟

رامو: کھولی والا۔ بھاڑا مانگتا تھا۔

ماں: پھر کیا ہوا؟ (کھانسی کی آواز)

رامو: بولتا ہے، پرسوں بھاڑا نہیں دے گا۔ تو کھولی خالی کرنا مانگتا۔

ماں: ہے رام! اب کیا ہوگا۔

(دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

رامو: کون ہے؟

آواز: (سختی سے) تمہارا باپ۔

رامو: خان بابا۔

پٹھان: خو اس مہینے کا نہ اصل نہ سود۔ تم ہم کو جانتا نہیں ہے۔ رامو۔ تم سے۔ بہت شرافت سے پیش آتا۔ واللہ۔ ایمان سے کہتا ہے۔ دوسرا ہوتا تو تم سالے کا کھال کھینچ کر اپنا پیسہ لے لیتا۔ خون پی جاتا۔ ملعون کا۔

رامو: خاں۔ جلد، روپیہ کا انتظام کریں گا۔ اپن جلد دیگا تمہیں۔

پٹھان: تم سمجھتا نہیں ہے رامو۔ ہم اپنا دیس چھوڑ کر بمبئے میں پڑا ہوا ہے۔ تو حرام کا پیسہ تو نہیں ہے نا۔ ہم تو قبر سے وصول کرتا۔ زمین سے لاٹھی مار کر اپنا پیسہ نکال لیتا۔ لاؤ سود تو نکالو۔ اس دفعہ کا۔ اصل پھر دے دینا چلو۔

رامو: نہیں خان۔ آج تو ہم بالکل پھوکس ہے۔ پیسہ خلاص ہے۔ پہلی کو ضرور دے گا۔

پٹھان: خنزیر کا بچہ۔ بہانے بناتا ہے۔ خبر ہم بھی دیکھ لے گا۔ اچھا پہلی کو اصل اور سود دونوں نکال کر دے گا نہیں تو ہم سامان گھر سے اٹھا کر لے جائے گا۔ ہمارے پیسے کا بندوبست فوراً کرے گا سمجھا؟

رامو: برابر کرے گا۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

ماں: اب کون تھا رامو۔

رامو: تونے نہیں سنا۔ ماں۔ سارے مالے والوں نے تو سن لیا۔ خان پیسہ لینے آیا تھا بولتا تھا۔ اپنی کھال کھینچ لیگا۔ پیسہ کہیں سے لانا ہی پڑے گا ماں۔

ماں: (کھانسی اٹھتی ہے) ہاں رے۔ آج تو کھانسی بہت ستا رہی ہے۔

رامو: ہاں ماں تیری دوا بھی لانا ہے (جیسے جی ہی جی میں سوچ رہا ہو) پیسہ کا تو کہیں ٹھکانہ کرنا ہی پڑے گا۔ ہر کوئی یہی بولتا (بلند آواز میں) پیسہ۔ پیسہ۔ پیسہ۔

ماں: کہاں، چلدیئے رامو (کھانستی ہے)

رامو: اپن تیری دوا لے کرابھی آتے ہیں۔ ماں جی تو دروازہ بند کرلینا میں ابھی آیا۔

(آندھی کا شور اور بجلی کی کڑک سنائی دیتی ہے۔ تھوڑی دیر تک مائکروفون پر یہ شور قائم رہتا ہے۔ کواڑ آندھی سے ٹکرا رہے ہیں۔)

رامو: (چلاتے ہوئے) رگھو دادا۔ میں آگیا رگھو دادا۔

رگھو: ارے تو رامو: چلا آ۔ اندر چلا آ۔ میں تجھے بول دیا تھا کہ تجھے آنا ہوگا۔ ماں جی اچھی ہے۔

رامو: نہیں دادا اس کو آج دوا نہیں ملا۔

رگھو: خیر خیر۔ اب تجھے پیسے کی تکلیف نہیں ہوگی۔ لے عیش کر ماسٹر پانچ کا نوٹ جیب میں ڈال۔ اب ماجی کا فسٹ کلاس علاج کرانا۔

رامو: اچھا دادا۔ اچھا۔

رامو: اس موافق اپن جیب کاٹ ہوگیا۔ اپن کو رگھو نے سارے گر بتائے۔ ان لوگوں کو بڑا سا گروہ تھا اور سب کے کام بٹے ہوئے تھے۔ اپن کو ایک دفع ایک جنٹلمین کو تاڑے رکھنے کو بولا گیا۔ یہ جنٹلمین فورٹ کے ایک ہوٹل میں لکھنؤ سے آکر ٹکا ہوا تھا۔ اپن دن رات کو جب بھی موقعہ پاتے اس کے دروازے کے پیچھے کان لگا کر سنا کرتے۔

نوجوان: لے جاؤ یہ کھانا لے جا کر اس منیجر کے بچے کے سر پر دے مارو۔

بیرا: جی بہت اچھا۔ کھانا لیے جاتا ہوں۔ مگر اس بل کے بارے میں کیا حکم ہے۔

نوجوان: ٹھہرو بیرا۔ تم اس منیجر کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ میں یعنی کہ مرزا بیدار بخت بی اے (آنرز) پاس ہوں۔ لکھنؤ کے مشہور تعلق دار نواب ثریا بخت کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ اس کے پیسے مارے نہیں جائیں گے۔

بیرا: کچھ یہاں کا قائدہ ہی یہ ہے کہ بھاڑا اور کھانے کے دام ہر دو دن بعد وصول کر لیتے ہیں۔

نوجوان: یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ یہ مسافروں کو پریشان کرنے کی ترکیب ہے۔ اور کچھ نہیں میں دس روز سے یہاں ٹھہرا ہوا ہو۔ جتنا روپیہ لایا تھا تم لوگوں کو دے چکا۔ اب جب تک میرا منی آرڈر نہیں آتا، میں تم کو کچھ نہیں دے سکتا۔

بیرا: منی آرڈر کی انتظاری میں تو بہت دن ہو گئے سرکار۔

نوجوان: کون کہتا ہے۔ بہت دن ہو گئے۔

بیرا: منیجر صاحب کہتے ہیں۔

نوجوان: اچھا بیرا۔ کھانا یہیں رکھ دو۔ اور تم جاؤ۔

(دروازہ پر ہلکی سی دستک ہوتی ہے)

ایک نسوانی آواز: میں اندر آسکتی ہوں۔

نوجوان: آؤ ریحانہ آؤ۔

ریحانہ: آپ کھانا کھا رہے تھے۔

نوجوان: اسے کھانا کہتی ہو۔ اسے من وسلویٰ کہو۔ جو حضرت موسیٰ کی امت کے لیے آسمان سے اترا کرتا تھا۔ سچ کہتا ہوں۔ ریحانہ اگر مجھے تمہاری محبت کا سہارا نہ ہوتا تو اب تک کبھی کا اس شہر پر سات بار تھوک کر چلا جاتا۔

ریحانہ: دیکھئے نا۔ ہم آئے اور آپ نے یہ بھی نہ کہا کہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

نوجوان: کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ریحانہ: کمال کر دیا نا ہم نے بھی کہ اس طرح آپ کے ہوٹل چلے آئے۔

نوجوان: اس میں کیا شک ہے ایک لکھ پتی تاجر کی لڑکی ریحانہ بیگم اپنے ایک غریب ہم جماعت

سے ملنے ہوٹل کے اس پھٹیچر سے کمرے میں چلی آئی۔ مگر مائی ڈیر یہ تو بتاؤ کہ میں کب تک اس طرح انتظار کروں گا۔ میرے سوال کا جواب لائی ہو؟

ریحانہ: کس سوال کا جواب؟

نوجوان: بھئی یہ بھی خوب رہی۔ بی اے میں مرزا غالب کا شعر پڑھا تھا۔ وہ کیا شعر تھا ریحانہ:

کہاں تک اے سراپا ناز، کیا کیا؟

ریحانہ: تمھارے ساتھ یہی دشواری ہے۔ بیدار بخت تم ابھی تک اپنے کالج کے دنوں سے آگے نہیں بڑھے۔

نوجوان: یعنی؟

ریحانہ: یعنی تم ابھی تک غالب کے شعر پڑھتے ہو۔ اور ایسے سوالوں کے جواب پوچھتے ہو جو ایک بچہ بھی اچھی طرح جانتا ہے۔

نوجوان: میں نے تم سے یہی تو کہا تھا۔ ریحانی۔ تم مجھ سے شادی کرسکو گی یا نہیں؟ یہ کوئی سوال تو نہیں ہے۔ یہ تو ایک وعدہ ہے۔ جو ہم نے کالج کی زندگی میں ایک دوسرے سے کیا تھا۔

ریحانہ: کالج کی زندگی؟ اچھا لو سگرٹ پیو۔ میں اپنے ہاتھ سے جلاؤ گی۔ ہاں اب ٹھیک ہے، کیا خیال ہے۔ بیدار۔ یہ میرا جارجٹ کا دوپٹہ کیسا ہے؟

نوجوان: بہت حسین، تمہارے چہرے کی خوبصورتی کے ساتھ کھل اٹھا ہے۔

ریحانہ: اور سلک کے غرارہ اور جامہ دانی کے اس کرتے کے بارے میں کیا خیال ہے۔

نوجوان: تم ان کپڑوں میں۔ ان خوبصورت ہیروں کے جڑاؤ آویزوں کے ساتھ سچ مچ کسی مصور کا خواب معلوم ہو رہی ہو۔ بھکی ہوئی زلفیں مرمریں گردن احمریں لب اور مدہوش آنکھیں۔

ریحانہ: اوہ ہو ہو۔ بس کرو۔ بھئی تم تو واقعی شاعری کرنے لگے۔

نوجوان: شاعری نہیں حقیقت ہے۔

ریحانہ: اب ایک بات اور بتاؤ۔ بیدار بخت۔ کیا تم سے شادی کرنے کے بعد مجھے یہ سب کچھ حاصل رہے گا۔ کیا میں سچ مچ خوش رہ سکوں گی۔

نوجوان: میں محنت کروں گا۔ مزدوری کروں گا۔ لیکن تمھیں ہمیشہ شہزادی بنائے رکھوں گا۔

ریحانہ: وہم نرا وہم۔ تم خوابوں کی وادی میں چل رہے ہو۔ اور سوتے میں چلنا خطرناک ہوتا ہے، بیدار۔

نوجوان: تو کیا سچ مچ محبت روپیہ سے بھی حقیر شے ہے۔

ریحانہ: یہ میں نہیں کہتی مگر تم جانتے ہو۔ مجھے کالج سے لے کر اس وقت تک زندگی کی حسین چیزوں سے محبت رہی ہے۔ میں نے فطرت کے نظاروں کی پوجا کرنے کے لیے ہمیشہ پچھمڑی، اوٹاکمنڈ اور کشمیر کی زیارتیں کی ہیں۔ مصوری اور سنگیت سے پیار کیا ہے اور حسین ترین کپڑوں اور زیوروں سے خود کو سجایا ہے۔

نوجوان: تو پھر تم نے وعدہ کیوں کیا تھا ریحانی۔

ریحانہ: جب تم سرکاری مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھ رہے تھے۔ بیدار مجھے یقین تھا۔ تم ضرور کامیاب ہو گے اور پھر ایک کلکٹر کی بیوی بن کر میں اپنی خوش مذاقی کو قائم رکھ سکوں گی مگر اب.....

نوجوان: (بات کاٹ کر) اب کیا ہو گیا ہے؟

ریحانہ: اب تم بے کار ہو۔ نوکر ہو بھی جاؤ تو دو تین سو روپے کے۔ میں اپنے سارے شوق، آرٹ، حسن مطالعہ اور سیر و تفریح سب کو دفن کر کے صرف تمہاری محبت کا وظیفہ پڑھوں گی۔ تم اسے پسند کرو گے؟

نوجوان: (بیزاری سے) میری بات چھوڑو ریحانی۔ میں سوچتا ہوں کالج کے خواب بھی کتنے موہوم تھے۔ جس کی تعبیر ڈھونڈنے میں میں نے آدھی عمر گنوائی ہے۔

ریحانہ: خوابوں کی تلاش؟

نوجوان: آخر اسی خواب کے لیے تو میں اپنے ماں باپ سے لڑ کر بمبئی آیا تھا۔ ان بچاروں نے بھی تو خواب دیکھا ہو گا۔ کہ ان کا لڑکا پڑھ لکھ کر ان کے لیے کچھ کر سکے گا۔ میری بہن ناہید نے بھی تو جھولے پر بیٹھ کر گایا ہو گا۔ اماں میرے بیرن کو بھیجوری کہ ساون آیا اور بیرن نے ریحانی کا دامن پکڑنے کے لیے ان سب سے دامن چھڑا لیا بچارا بیدار بخت!

ریحانہ: مجھے تم سے پیار ہے۔ بیدار مگر دنیا سے تو آنکھیں بند نہیں کی جاتیں۔ میرے ڈیڈی بھی

بھی اس شادی کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

نوجوان: ٹھیک ہے۔ میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔

ریحانہ: مگر ——!

نوجوان: کیسے بھی ہو۔ میں کل ضرور چلا جاؤں گا۔ چاہے مجھے بلا ٹکٹ ہی جانا پڑے۔

(دروازے پر دستک)

مردانی آواز: حاضر ہو سکتا ہوں۔ مرزا صاحب۔ بہت بہت شکریہ کہ کل آپ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

نوجوان: آیئے منیجر صاحب آیئے۔

منیجر: میں نے بل آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اسے سیدھے سبھاؤ چکا دیجئے۔

نوجوان: مگر آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ میرے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔ میں گھر سے منی آرڈر کا انتظار کر رہا ہوں۔

منیجر: اور کل اسی لیے گھر جا رہے ہیں آپ؟

نوجوان: آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کا روپیہ دیے بغیر کیسے جا سکتا ہوں؟

منیجر: دیکھئے میاں صاحبزادے۔ میں نے بڑے بڑے چتر قناتئے دیکھے ہیں سیدھے سبھاؤ اسی وقت میرے بل کے دام بائیں ہاتھ سے ادھر رکھ دیجئے گا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔

نوجوان: زبان کو لگام دیجئے منیجر صاحب۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ میرے مہمان کے سامنے آپ میری توہین کر رہے ہیں۔

منیجر: معاف کیجئے گا خاتون (نوجوان سے) مگر تمھارے سب مہمان جانتے ہیں کہ تم میرا روپیہ لے کر بھاگ رہے ہو۔

نوجوان: زبان سنبھالیے۔

منیجر: ورنہ کیا کر لیجئے گا میرا۔ توپ لگا دیجئے گا۔ اپنے دام مانگ رہا ہوں۔ کوئی خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔ ایسے ہی ناک والے ہیں تو اسی وقت دوسرے ہوٹل میں انتظام کر لیجئے ہونہہ۔

(دونوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور لڑنے لگتے ہیں)

رامو: اَپن اپنے من میں بولا کہ سالا پھوکس ہے۔ اس کی جیب کاٹی کر کے کچھ بھلا نہیں۔ پر ایک بات ہے کہ جب جی میں آئے اس کی جیب اپن صفا چٹ کر سکتے ہیں۔ رات کو رگھو دادا کی کھولی جا کر ان لوگوں کو سارا کچا چٹھا بولنا تھا۔ (ہنستا ہے) بڑی مسخری رہی۔ میں پہنچا تو رات ہوگئی تھی۔ نو بجے تھے۔

رامو: (کھانس کر آہستہ سے پکارتا ہے) رگھو دادا۔

رگھو: کیا ہے رامو، بول کچھ ہاتھ لگا۔

رامو: ارے ایک دم خلاص۔ ایک دم پھوکس۔ وہ جنٹلمین تو نرا بنڈل نکلا۔ بالکل بنڈل۔ بھگوان جانے کون تم کو الٹی سیدھی رپورٹ دیتا ہے۔

راگھو: جانے دے یار۔ لے یہ بیڑی پی۔

رامو: اس کی دشا تو اپنے سے بھی پتلی ہے بالکل قلانچ ہے۔ اوپر سے یہ ترق برق ٹیم ٹام مانو کہیں کا گورنر۔ جب میں دھیلا نہیں۔ ہم تو اپنے جی میں ایسا بولا کہ اپن ہی اس کو کچھ دے کے اپنے دھندے میں لگا لے۔ (ہنستا ہے)

رگھو: تو یہ دن بے کار رہا۔ ایک دم خالی۔

رامو: پھر اب ——؟

رگھو: کل ایک فسٹ کلاس معاملہ پھنسا ہے۔ رہے اس میں اگر ہاتھ دکھا گیا بیٹا۔ تو بہت دنوں کی چھٹی ہو جائے گی۔

رامو: کوئی بڑی آسامی ہے کیا؟

رگھو: جاگیر پور والی رانی صبح ۵ بجے والی گاڑی سے جبل پور جا رہی ہے۔ آدھی پاگل عورت ہے۔ بہت بوڑھی ہوگئی ہے مگر ہے بہت چالاک۔

رامو: پکی بات ہے نا۔ ہم ایسا بولتا دادا کہ جو اس کا بیگ بھی خلاص نکلا تو اپن گردن ناپے گا۔ بھگوان قسم ایسا بولیس گا۔

ا۔ سبزی۔ بمعنی بھنگ

رگھو: چل۔چل مگر بڑی ہوشیاری کا کام ہے۔

رامو: پہچان نشانی بولے گا ہمیں؟

رگھو: ہاں؛ بوڑھی سی ہے کوئی ۶۰ برس کی ہوگی۔ سونے کی عینک لگاتی ہے۔ ہونٹوں پر بہت سرخی ملتی ہے۔ بک بک بک بک بہت بولتی ہے مگر چالاک بہت ہے۔ ہر وقت روپیہ کو آئینہ کے موافق سامنے رکھتی ہے۔

رامو: اوہو۔اس کی فکر نہ کر بادشاہو۔اپن بھی کوئی اناڑی نہیں چٹکیوں میں کام کر کے نہ آئیں تو بولنا (چٹکی بجاتا ہے) بس اس موافق۔ روپیہ کتنا ہے؟

رگھو: پچاس ہزار۔

رامو: پچاس ہزار؟ وہ مارا ہاتھ لا استاد۔

رگھو: تو پھر پکی رہی بات۔ ففٹی ففٹی۔

رامو: بالکل پکی۔ یار لوگ پانچ بجے پہنچ کر ہاتھ کی صفائی دکھائیں گا۔ بوری بند رہی سے سوار ہوگی نا؟

رگھو: ہاں، اچھا تو بس تو کام پر جا۔

رامو: رات بہت ہوگئی۔ ماں جی میری راہ تکتی ہوگی۔ اچھا گڈ نیٹ۔

(کھانسی کی آواز)

رامو: ماں۔ماں۔

ماں: (کھانستے ہوئے) راموتو آگیا۔ راموآج بڑی دیر ہوگئی رے۔

رامو: ماں جی تمہیں تو بخار ہے۔ارے تم تو بخار میں جل رہی ہو۔

ماں: تیری راہ تک رہی تھی۔

رامو: تو نے دوا نہیں پی۔

ماں: نہیں رے۔اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں یہ تو بتا اتنی دیر کہاں لگا دی۔

رامو: کچھ نہیں ماں۔ وہ اُدھر۔

ماں: یہ کیا۔ تو مجھے بتاتا کیوں نہیں۔ کہیں دارو پینے جاتا ہے۔ یا کہیں بیاہ سادی کا (کھانسی

اٹھ آتی ہے۔ جملہ نامکمل رہ جاتا ہے)

رامو: نہیں ماں۔ کل میں تجھے سب کچھ بتادوں گا۔ بس اب سوجا۔

ماں: نہیں رے۔ مجھے ابھی بتادے۔

رامو: تجھے بہت بخار چڑھ رہا ہے ماں۔ اب تو سوجا۔ بہت رات آگئی۔ بارہ بج گئے۔

ماں: رامو۔

(شہر کا گھنٹہ بارہ بجانا شروع کرتا ہے)

رامو: ہاں ماں۔

ماں: ایک بات کہوں تجھ سے۔ تو نے کبھی جو ایسی ویسی بات کی دارو پی یا مجھ سے چرا چھپا کے کوئی برا کام کیا تو میں دکھ سے مرجاؤں گی۔ (کھانسی اٹھتی ہے) میں نے تجھے بڑے پیار سے پالا ہے رے۔

رامو: (گھبرائی ہوئی آواز میں) ماں جی۔ ایسا نہ بولو۔ ایسا نہیں بولو۔

ماں: سمجھا۔ اور میں مر بھی جاؤں گی۔ تو میری آتما دکھ سے بے چین رہے گی۔

رامو: میں کل سے کچھ نہیں کروں گا ماں۔ میں جلدی گھر آجاؤں گا۔

ماں: میرے پاس آ میرے لال۔ میں تجھے سینے سے لگالوں میرا رامو۔

رامو: (رونی آواز میں) ہم ٹھیک بولتا ہے۔ انسپکٹر صاحب۔ اس کی آواز میں بڑا پیار تھا۔ اپن بھی جی میں بولا کہ اپن صبح ۵ بجے والے معاملے کے بعد پھر اس سالے کالے دھندے کو ہاتھ نہیں لگائیں گا۔ ایک دم جی میں ٹھان لیا کہ صفا صفار گھوددادا سے بولے گا کہ اپن سے نہیں چلے گا۔ پچیس ہزار روپیہ لے کر ماں جی کی دوادارو کریں گا اور بمبئی شہر پر تھوک کے اپنے گاؤں چلا جائیں گا۔ رات کروٹیں لیتے لیتے خلاص ہوگئی۔ پانچ بج گئے۔

(پانچ بجتے ہیں اسٹیشن کا شور۔ خوانچے والوں کی آوازیں مسافروں اور خوانچے والوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں)

ایک آواز: اخبار والا۔ بمبئی کا تازہ سماچار۔ تازہ خبریں بمبئی کی بالکل گرما گرم خبریں۔

دوسری آواز: گرما گرم چائے۔ گرم، چائے گرم۔

تیسری آواز: پان سگرٹ، بیڑی پان سگرٹ، سیٹھ پان سگرٹ۔

عورت کی آواز: اے قلی، قلی سیکنڈ کلاس میں نہیں چاہیے۔ انٹر میں سامان رکھیں گا۔ انٹر میں جبل پور والی گاڑی ہے نا۔ ٹھیک ہے۔ بس یہیں رکھو۔ نہیں لیڈیز والا ڈبہ نہیں چاہیے۔ دماغ کیوں چاٹتا۔ تم سے جو کہتا ہے وہ کریں گا۔ یہ لو پیسے لو۔ ٹھیک دے دیے ہیں پیسے۔ بابا ۔ کیوں پریشان کرتا ہے۔ ہمارا بیگ کہاں ہے ٹھیک ہے۔ (بڑے اخلاق کے ساتھ نرم لہجے میں) میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں جنٹلمین۔

نوجوان: ضرور ضرور۔ شوق سے تشریف رکھیے۔

رانی: آپ کہاں تک جارہے ہیں؟

نوجوان: مجھے تو دراصل لکھنؤ جانا ہے۔ اس گاڑی کو چھوٹنے میں ابھی دیر ہے۔ اس لیے اس ڈبے میں بیٹھ گیا۔

رانی: افوہ سفر کرنا تو آج کل عذاب ہوگیا ہے۔ اب دیکھیے جبل پور تک جانا ہے میرا تو اس انٹر کلاس میں دم نکل جائے گا۔ دیکھتے ہیں آپ کتنا رش ہے اومائی گاڈ۔ میں تو سوچتی تھی۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ بنوا لیتی لیکن آج کل چوراچکے بدمعاش سیکنڈ کلاس پسنجر کو خاص طریقے پر پریشان کرتے ہیں۔

نوجوان: یہ ٹھیک ہے۔ معاف کیجئے گا۔ پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔ مجھے بیدار بخت کہتے ہیں۔ لکھنؤ سے آیا تھا۔ آج واپسی کا خیال ہے۔

رانی: بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ یہ سامنے کوٹ کس کا لٹکا ہوا ہے۔

نوجوان: میں نے لٹکا دیا تھا۔ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ڈبہ میں کافی گرمی معلوم ہورہی تھی۔

رانی: مگر دروازے کے اتنے قریب لٹکا دیا ہے۔ آپ نے کہ کوئی جیب کترا ہاتھ صاف کرلے گا۔

نوجوان: (ہنستا ہے) مگر بیگم صاحبہ اس میں صرف جیبیں ہیں ان جیبوں میں کچھ ہے ہی نہیں کہ غم کریں۔

(رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو)

ا۔ ٹھگی کے اصطلاح میں کسی جانور کی آواز جو مبارک شگون مانی جاتی ہے۔

رانی: تو آپ شاعر بھی ہیں؟

نوجوان: کبھی تھا۔اب کیا ہے، وہ وقت گیا، وہ موسم وہ ہنگام گیا۔

رانی: معاف کیجئے گا۔ میں ذرا روج لگالوں۔ پسینے سے سارا چہرہ خراب ہوا جارہا ہے۔اوہ کتنی گرمی ہے۔ میرا بیگ۔ ہاں ٹھیک ہے۔آج کل تو کسی کے پاس روپیہ ہونا بھی ایک مصیبت ہے۔آپ ہی اچھے ہیں کہ مزے میں کوٹ اتا کر لٹکا دیا ہے۔کوئی فکر نہیں۔

نوجوان: سچ تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کہ میں اپنے ہوٹل کے منیجر سے چھپ کر لکھنؤ جا رہا ہوں۔ وہ میرا ایسا گہرا دوست ہے کہ کسی صورت سے جانے ہی نہیں دیتا تھا اور مجھے آپ جاییے احسان لینے کی عادت نہیں۔

رانی: جی ہاں، شریفوں کی یہی پہچان ہے۔

نوجوان: آخر کب تک بمبئی میں ٹھہروں۔ جیسے ہی اس کو پتا چلے گا فوراً اسٹیشن دوڑا ہوا آئے گا۔ اسی لیے جبل پور والی گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا ہو کہ وہ لکھنؤ جانے والی ٹرین کو دیکھ کر لوٹ جائے گا۔ بڑا پرانا یار ہے اپنا۔ بس اپنا ہی ہوٹل سمجھیے۔

رانی: افوہ۔ دیکھئے کتنی بھیڑ اس ڈبے میں سوار ہونے چلی آرہی ہے۔

(شور اور لوگوں کے قدموں کی چاپ قریب آتی ہے)

اب دیکھئے نا ان سب لوگوں کے پاس تو انٹر کلاس کا ٹکٹ ہو نہیں سکتا۔ سب کے سب تھرڈ کے مسافر معلوم ہوتے ہیں۔

نوجوان: کہاں چڑھے چلے آتے ہو جی۔

رامو: جنٹلمین۔ اپن نے بھاڑا بھرا ہے۔ ہم سب نے بھاڑا دیا ہے۔ فری نہیں چڑھتا۔

نوجوان: انٹر ہے۔ ڈیوڑھا درجہ ہے ڈیوڑھا۔

رامو: سیٹھ۔ ڈیوڑھا بھاڑا بھرا ہے۔

نوجوان: تو بابا کوئی دوسرا ڈبہ دیکھ لو نا۔

رامو: تمھیں کوئی دوسرا ڈبہ کیوں نہیں دِکھتا۔ سیٹھ ہم تو سب کے سب یہیں بیٹھیں گا۔

رانی: مائی گاڈ ——

نوجوان: کیا مصیبت ہے۔

رانی: میرا بیگ۔ میرا بیگ کہاں گیا۔ یہ بیگ زمین پر کس نے پھینکا (زور سے چلاتی ہے) وہ دیکھو۔ وہ آدمی بیگ سے روپے لے کر بھاگا ہے پکڑو۔

نوجوان: پکڑو، پکڑو جانے نہ پائے۔

سب لوگ چلاتے ہیں پکڑلو، پکڑلو، چور ہے، لینا، دوڑنا۔

رانی: ہائے میرے روپے۔ ہائے میرے روپیے۔

رامو: بھگدڑ مچ گئی۔ قریب تھا کہ اپن پکڑ جاؤں۔ ٹھیک اس وقت اپن کو دھکا لگا۔ پاس ہی کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ اپن نے جھٹ سارے نوٹ اس کوٹ کی جیب میں ڈالدیے اور چھلانگ لگا کر ڈبے سے باہر کود گیا۔ اپن کے پیچھے پیچھے لوگ دوڑ رہے تھے پر (ہنستا ہے) اپن صاف نکل گئے۔

(شور پھر بڑھنے لگتا ہے)

نوجوان: (ہانپتے ہوئے) نکل گیا، کم بخت بچ کر نکل گیا۔

دوسری آواز: پولیس میں رپٹ لکھوایئے صاحب۔

تیسری آواز: شرم نہیں آتی۔ بچاری بڑھیا کے روپیے پر ہاتھ ڈالتا ہے۔

رانی: ہائے میں لٹ گئی۔ میری ساری عمر کی کمائی لٹ گئی۔

نوجوان: آپ گھبرایئے نہیں، میں ابھی پولیس میں رپورٹ لکھاتا ہوں جا کر۔

منیجر: میں نے کہا آداب عرض۔ بیدار بخت صاحب۔ خاکسار دل نواز ہوٹل کا منیجر۔

نوجوان: (جلدی سے) اوہو منیجر صاحب۔

منیجر: ذات شریف۔ اس طرح چھپ کر بھاگئے گا!!! ایسے تو نہیں جانے دوں گا جناب!!

نوجوان: جی چلتا ہوں۔ دیکھئے نا بیگم صاحبہ میں نے کہا تھا کہ یہ منیجر صاحب میرے پرانے دوستوں میں ہیں۔

منیجر: بڑے آئے دوست کے بچے۔ میں ایسے قلاش آدمیوں کا دوست نہیں بنتا۔ سچ کہتا ہوں۔ ہوٹل کے بھاڑے کی کوڑی کوڑی دیے بغیر بچہ تم کو بمبئی سے باہر پاؤں نہیں رکھنے دوں گا۔

نوجوان: یار۔ ہر وقت مذاق مت کیا کرو۔ ذرا زبان سنبھال کر بات کیا کر۔ بس بے تکلفی کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ.........

منیجر: (بات کاٹ کر) بہت سنبھالی زبان۔ سیدھے سیدھے چلتے ہو یا۔

نوجوان: (جلدی سے) چلتا ہوں، ذرا کوٹ تو پہن لوں۔

منیجر: یہ لو میں خود اتار کے دیتا ہوں۔

نوجوان: شکریہ (رانی صاحبہ) اچھا مجھے افسوس ہے۔ خاتون میں آپ کی کچھ بھی مدد نہ کر سکا۔ برا ہو اس کمبخت منیجر کا۔ اسے بھی اسی وقت مرنا تھا۔ کس موقع پر پکڑا ہے ظالم نے۔ اچھا خدا حافظ۔

(اسٹیشن کا شوروغل آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا جاتا ہے)

رامو: یہ قصہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اپن اس کوٹ کی کھوج میں کئی دن مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک دن پھر دل نواز ہوٹل پہنچا۔ تو جنٹلمین کو وہی کوٹ پہنے دیکھا۔ اب میری ساری فکر دور ہوگئی۔ اپن موقعے کی تاک میں لگے رہے (ہنستا ہے) دروازے کے پیچھے چھپ کر دو دن اپن نے بڑے بڑے تماشے دیکھے۔ جنٹلمین کے تو ٹھاٹھ ہی نرالے تھے۔

منیجر: یہ کھانا خاص آپ ہی کے لیے تیار کرایا تھا۔ مرزا صاحب۔

نوجوان: او شکریہ۔ منیجر صاحب۔ آپ کو بل کی پوری رقم مل گئی ہے نا؟

منیجر: (خوشامد کے لہجے میں) جی۔ اس کی فکر نہ کیجئے، ہم لوگ آپ کے خادم ہیں۔ کھانا حاضر ہے۔

نوجوان: لے جاؤ (تھالی کو ہاتھ مار کر گرا دیتا ہے۔ برتن چھناکے کے ساتھ فرش پر گر پڑتے ہیں) لے جاؤ اس کھانے کو۔ تم سمجھتے ہو میں تمہارے چیڑ قناتیے ہوٹل کا کھانا کھاؤں گا۔ اور منیجر صاحب۔

منیجر: جی سرکار۔

نوجوان: ٹھہرو۔ مجھے تم سے ایک بات اور کہنی ہے۔

منیجر: فرمایئے۔

نوجوان: تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے کہ اس طرح وقت بے وقت میرے کمرے میں آدھمکتے ہو۔

مجھے تمہاری بکواس سننے کی فرصت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں چلے جاؤ میرے کمرے سے آئندہ میری اجازت کے بغیر آنے کی ضرورت نہیں۔

منیجر: بہت اچھا سرکار۔

نوجوان: ایک بات اور۔

منیجر: جی۔

نوجوان: ریحانہ بیگم کو ٹیلیفون کیا؟

منیجر: جی ہاں، ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ فوراً ہوٹل چلی آئیں۔ وہ آتی ہی ہوں گی۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔

نوجوان: ٹھیک ہے۔

منیجر: معاف کیجئے گا۔ مجھے پھر آنا پڑا۔

نوجوان: اوہو، کیا بات ہے۔ منیجر صاحب آپ پھر آ گئے۔

منیجر: جی۔ یہ تار آیا ہے۔

نوجوان: پڑھو کیا لکھا ہے؟

منیجر: بہت اچھا۔

نوجوان: تم سمجھتے نہیں کہ مجھے بال روم جانا ہے۔ جلدی کرو، کیا لکھا ہے اس تار میں۔

منیجر: آپ کے والد کا تار ہے لکھنو سے۔

نوجوان: کس کا تار ہے؟ کیا کہا؟

منیجر: جی بڑے نواب صاحب کا تار ہے لکھنو سے۔

نوجوان: کیا لکھا ہے؟

منیجر: آپ کو مبارکباد دی ہے اور لکھا ہے کہ وہاں سب آپ کا بے قراری سے انتظار کر رہے ہیں۔

نوجوان: اس تار کو پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دو۔ آئندہ اس قسم کے فضول تار میرے پاس مت لایا کرو۔ (طنزیہ ہنسی مگر زیرلب) ''بے قراری سے انتظار ہے'' بڑے نواب صاحب؟ یہی تو تھے جنھوں نے مجھے حویلی سے باہر نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اور کڑک

کر فرمایا تھا۔ یہاں جو کما کے لائے گا۔ اسی کا حکم چلے گا۔ ہونہہ آج انھیں بے قراری سے میرا انتظار ہے۔ منیجر۔

منیجر: جی سرکار۔

نوجوان: کیا نیچے بال روم میں ناچ شروع ہو گیا۔

(ناچ کی دھن دور سے سنائی دیتی ہے)

منیجر: ابھی شروع ہوا ہے۔

نوجوان: ریحانی ابھی تک نہیں آئی۔

(دروازے پر ہلکی سی دستک)

ریحانی: بڑی عمر ہے میری بھی تم نے یاد کیا اور میں آئی۔

منیجر: اچھا تو مجھے اجازت دیجیے سرکار۔

نوجوان: اچھی بات ہے۔ دروازہ بند کرتے جانا۔ (دروازہ بند ہونے کی آواز)

نوجوان: ریحانی اچھا ہوا تم آ گئیں ۔ یہ دیکھتی ہو، روپیے روپیے اور روپیے میں یہاں میز پر تمھارے آگے اس ساری دولت کو انبار کیے دیتا ہوں ۔ پچاس ہزار روپیہ۔ بولو اب تو میں تمھیں پا سکتا ہوں۔ اب تو میں ان ستاروں کو چھو سکتا ہوں جو تمہاری —— زلفوں میں کہکشاں کی طرح چمک رہے ہیں۔

ریحانی: (ہنستی ہے) یہ بھی کوئی سوال ہے بھلا میں تم سے کالج ہی کے زمانے میں زندگی بھر ساتھ دینے کا وعدہ کر چکی ہوں ڈارلنگ۔

نوجوان: آج تمھارے ساتھ میں بھی ہنسوں گا ریحانی۔ (طنز کی ہلکی سی ہنسی) عجیب بات ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ دنیا کے سارے سائنس داں بیوقوف ہیں۔ طاقت بجلی میں نہیں ایٹم اور برقی لہروں میں بھی نہیں کاغذ کے ان پرزوں میں اور چاندی کے ان سکوں میں ہے جنھیں روپیہ کہتے ہیں۔

ریحانی: تم پھر شاعری کرنے لگے۔ ڈارلنگ۔ چلو بال روم چلیں۔

نوجوان: آخر کار میں نے بھی اتنا روپیہ پا ہی لیا کہ شاعری کرنے کا حق رکھ سکوں۔ تم تو بڑی پرانی

رفیق ہو ریحانی ۔ خدا کی قسم ان ہونٹوں ان زلفوں اور ان ابروؤں پر میں ہزار بار اپنی زندگی قربان کر چکا ہوں مگر۔

ریحانی: ہٹو، لگے خوشامد کرنے۔

نوجوان: مگر تم نے اس دولت کو بہت سستا بہادیا۔ تم میری پرانی رفیق ہو نا۔ تمھیں یہ راز بتا ہی دینے چاہئیں۔

ریحانی: کون سے راز۔

نوجوان: پہلا راز۔ یہ کہ روپیہ کا یہ انبار تمھاری ان مسکراہٹوں اور عنایتوں کو خرید سکتا ہے۔ جن کا میں نے تمام عمر کی عبادت سے سودا کرنا چاہا تھا اور ناکام رہا۔ اور آج جب تمھارا حسن میرے سامنے ایک بکنے والا مالِ تجارت ہو گیا ہے اور ایک بھکاری کی طرح سجدہ ریز ہے۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ وہ پاک جذبہ مر چکا ہے۔ جو ہمارے لیے پھولوں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ وہ ریحانی جو میرا خواب تھی، آج مر گئی۔

ریحانہ: بیدار بخت۔ یہ میری توہین ہے۔

نوجوان: اور دوسرا راز؟ —— یہ کہ زندگی میں ایسی بھی کچھ قدریں ہیں ریحانی جو روپیہ سے خریدی اور بیچی نہیں جاسکتیں ۔ محبت ؟ نہیں تم نے اسے بیچ دیا۔ ماں اور باپ کی شفقت؟ نہیں، وہ بھی فریب ہے لیکن انسان کا یہ فخر کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے زندگی کو خوبصورت بنا رہا ہے۔ ایسی انمول مسرت ہے جسے کوئی نہیں خرید سکتا۔

ریحانہ: مجھے تمھاری تقریریں سننے کا شوق نہیں۔ مجھ سے بھی کچھ بات کرو گے۔

نوجوان: تمھیں سے کہہ رہا ہوں ریحانی ۔ یہ دولت میری نہیں۔ یہ اتفاق سے میری جیب میں آگئی ہے۔ میں اسے اس کے اصل حقدار کو واپس کر دوں گا۔

ریحانہ: کون ہے وہ؟

نوجوان: کوئی بھی ہو، لیکن اس کے ان سکوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ یہ سکے اور نوٹ عظیم نہیں ہیں۔ (آواز بلند ہو جاتی ہے) وہ حقیر سے حقیر انسان عظیم ہے۔ جو اس کرۂ زمین کو اپنے لہو سے سینچتا ہے۔ وہ آدمی وہ محنت کرنے والا فن کار عظیم ہے۔ جو حیات میں

مسرت کے خزانے بکھیرتا ہے اور عمل کی یہ ان تھک مسرت سونے چاندی کے ترازوں میں نہیں تلتی۔

ریحانہ: خوب پریشان کرلو مجھے۔آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔

نوجوان: اور اب مجھے جانا ہے۔ ریحانی! مجھے یہ روپیہ واپس کرنا ہے۔ (تلخی سے) اب چاہو، تو تم جاسکتی ہو۔

ریحانہ: (ڈرامائی انداز میں) نہیں میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں زینے تک۔

(سیڑھیاں اترنے کی آواز)

نوجوان: (گھبرا کر) مگر روپیہ کہاں ہے۔ (چلا کر) روپیہ۔

ریحانہ: تم نے جیب ہی میں رکھے تھے۔

نوجوان: اوہ جیٹ کاٹ۔ جیب کاٹ لی کسی نے۔روپیہ؟ (زور سے) روپیہ!!

رامو: (ہنستا ہے) اور روپے اپن کے ہاتھ میں تھے۔ ہزاروں روپے کے چکا چک کرتے ہوئے نوٹ (آواز دھیمی ہوتی ہے) اپن خوشی سے پاگل ہوا تھا۔اوہ۔وہ۔انسپکٹر صاحب۔ اپن بھاگتا ہوا گھر پہنچا۔اپنی جان قسم سے اتنا تیز زندگی بھر میں نہیں بھاگا۔اپن جی ہی جی میں بولا۔اب کبھی یہ کالا دھندا نہیں کریں گا۔بس اب ماں کو لے کر گاؤں جائیں گا۔گھر پہنچا۔

رامو: (دوڑتے دوڑتے ہانپ رہا ہے) ماں جی، ماں جی، آج ہم تجھے سب کچھ بتادیں گا۔سب کچھ بول دیں گا۔اب تیری فسٹ کلاس دوا دارو کریں گا۔اس سالے شہر پر تھوک کر عیش سے دن کاٹیں گے۔ارے تو بولتی کیوں نہیں۔ (رونے لگتا ہے) پھر چیختا ہے۔ماں۔ماں۔

(وقفہ)

رامو: ماں جی مرگئی۔اپن نے اسے مار ڈالا۔ انسپکٹر صاحب اپن نے اسے مار ڈالا۔ ہمیں پھانسی دو۔ہم جیب کاٹ نہیں ہے۔خونی ہے۔بھگوان قسم ہم خونی ہے۔اپن تم سے بھیک مانگتا ہے۔انسپکٹر صاحب، ہمیں پھانسی دے دو۔بھگوان کے لیے پھانسی دے دو۔

☆☆☆

سرخ پردے

ریحانہ: اوپر والے کمرے کی کنجیاں نکالو۔ نصیبن بوا۔

نصیبن: (بہری ہے) چھوٹی سرکار —— کون سے کمرے کی کنجیاں سرکار؟

ریحانہ: اوہو— تم سے تو بات کرنا بھی عذاب ہے۔ (چیخ کر) اوپر والے کمرے کی کنجیاں چاہئیں۔

نصیبن: سرخ پردوں والے کمرے کی کنجیاں— نا ریحانہ بیٹا نا—— اس کمرے میں اثر ہے۔

ریحانہ: جاوید بھیا آرہے ہیں۔ وہ وہیں ٹھہریں گے۔

نصیبن: جاوید بھیا۔ چھوٹے نواب صاحب والے۔ وہ تو سنتی ہوں، ولایت گئے تھے۔ کب آئے وہاں سے؟

ریحانہ: بہت دن ہوئے وہاں سے آگئے۔

نصیبن: (خوش ہوکر۔ ہنستے ہوئے) اچھا۔ اے لو۔ مجھ نگوڑی کو خبر بھی نہیں۔ بھلا مجھے کوئی کیوں بتاتا۔ کان جو پٹ ہوگئے ہیں میرے۔ تمہاری مغلانی کی طرح اچھال چھکّا ہوتی تو ساری سُن گن رکھتی—— ساری عمر تم لوگوں کی خدمت میں گذار دی۔ اب مجھے کاہے کو پوچھو گی نئی نوکرانیاں لونڈیا آکر راج کریں گی۔

ریحانہ: (آہستہ سے) توبہ توبہ۔ (زور سے) نصیبن بوا۔ کنجیاں تو دیدیجئے۔

نصیبن: سرخ پردوں والے کمرے کی کنجی۔ نا بھیا۔ نوج میں کبھی نہ دوں گی۔ بھلا، بیگم صاحبہ کی باتیں، بچے کو وہاں ٹھہرائیں گی، کچھ اثر دسر ہوگیا تو؟

ریحانہ: اس وقت اور کوئی کمرہ خالی نہیں ہے بوا اور جاوید بھیا اکیلے کمرے میں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔

نصیبن: اے ہے، نیچے والے مہمانوں کو نہیں چلتا کرتیں کہ بچے کی جان کے درپے ہوئی ہیں۔

ریحانہ: (جھلا کر) بوا۔۔بوا۔۔تم کنجیاں میرے ہاتھ دو۔

نصیبن: لو، میری بلا سے ۔۔لو یہ رہیں کنجیاں، مجھ نگوڑی کی بات نہ بڑی سرکار کی سمجھ آئے نہ تمہاری۔

ریحانہ: بوا۔تم تو سمجھتی نہیں، مہمانوں کو کیسے کوئی کمرے سے نکال باہر کردے۔ یہ مہمان کہاں جائیں گے۔

نصیبن: اچھا بیٹا۔تم جانو، بڑی بیگم صاحب جانیں۔مگر اس کمرے میں اوپر والوں کا اثر ہے۔ (رک رک کر) تمھاری بڑی بہن رضوانہ بیٹا اللہ اسے جنت نصیب کرے اس کمرے میں مانجھے بیٹھی تھیں اور ٹھیک بیاہ والے دن، میری چاند سی بٹیا کو کچھ ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے آناً فاناً میں لوٹ پوٹ ہوگئی۔ (آواز رندھی ہوئی) ہے ہے، کیا صورت تھی میری بٹیا کی جیسے اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہو۔

ریحانہ: نصیبن بوا۔۔۔۔!

نصیبن: (جیسے کچھ سنا ہی نہیں) کہنے کو کوئی کچھ کہہ لو۔قولنج کا درد تھا، یہ مرض تھا وہ مرض تھا، مگر بندی تو یہی کہے گی کہ اوپر والوں نے بچاری کے ہاتھوں کی مہندی رچنے نہ دی۔ تمھیں کہو بیٹا، وہ کمرہ کبھی کھلا ہے اس کے بعد، کہ آج ہی بیٹھے بیٹھے بیگم صاحب کو جاوید میاں کے لیے کھولنا رہ گیا تھا۔ (زور سے آواز دے کر جس سے معلوم ہو کہ ریحانہ جا چکی ہے) بیٹا۔۔ بیٹا ۔۔ اس کمرے کو تم اپنے ہاتھ سے مت کھولنا۔ مغلانی کو کنجی دیدینا ریحانہ بیٹا۔۔ ریحانہ بیٹا۔

(منظر ہلکی سی موسیقی کے ساتھ تبدیل ہوجاتا ہے)

[موسیقی سے یہ دکھاتے ہیں کہ ڈر اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ساتھ ریحانہ سرخ پردے کے کمرے کی طرف جاتی ہے۔تالے میں کنجی گھماتی ہے اور دروازہ زور سے کھولتی ہے، دروازہ کی چوں چوں کی آواز جو آہستہ آہستہ دیر تک بھیانک انداز میں جاری رہتی ہے]

ریحانہ: اوہ۔ ہو۔ کتنے دنوں سے یہ کمرہ بند پڑا ہے، ساری گرداٹی ہوئی ہے۔ ہر طرف دھول، کوڑا کرکٹ اور جالے (پردہ ہلاتی ہے) اوہ توبہ توبہ، ان سرخ پردوں کو تو دیکھو، کتنی گرد جم گئی ہے ان پر۔

(گھنگھروؤں کی آواز)

ریحانہ: (ڈر کر) کون؟— کون؟

آواز: ڈرو مت ریحانہ بہن۔ (گھنگھروؤں کی آواز اور قریب آتی ہے) مجھے دیکھ نہ پاؤ گی۔

ریحانہ: کون ہو تم؟ خدا کے لیے بتاؤ تم کون ہو۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔

آواز: رضوانہ، تمہاری بہن۔ ہاں بہن، ان سرخ پردوں کی گرد جھاڑ دی یہ کیسے سجے ہوئے تھے۔ جن میں دلھن بنا کر اس کمرے میں لائی گئی تھی، ان باسی پھولوں کو اسی طرح لٹکتا رہنے دو۔ جو میری مسہری کے سرہانے لٹک رہے ہیں۔ اور یہ سامنے کا شمع دان، یہ مجھے بہت پسند ہے اور اس خوبصورت آئینہ سے دھول جھاڑ دو۔

ریحانہ: رضوانہ بہن—!

آواز: (گھنگھروؤں کی آواز) یہ پازیب بھی مجھے بہت عزیز ہے مگر ریحانہ میری جوانی ان سرخ مخملیں پردوں کے انتظار ہی میں کٹ گئی۔ جو دلھنوں کی خواب گاہوں کو سجاتے ہیں۔ وہ پھول، وہ شہنائیاں اور وہ جوانی کی رنگ رلیاں، میں نے اپنی جوانی بڑے دکھ سے اس محل سرا میں گھٹ گھٹ گذاری ہے۔ اور جب انھوں نے میری شادی کے لیے ایک بوڑھے دولت مند کو پسند کیا۔

ریحانہ: رضوانہ بہن—!

آواز: تو میری جوانی بیت چکی تھی اور میں نے اس بوڑھے دولت مند کے ہاتھوں بکنا پسند نہ کیا اور خودکشی کر لی— (ہنستی ہے) مگر یہ سب باتیں تو تمہیں معلوم ہیں اور اب— (طنزیہ ہنسی) اور اب تمھاری جوانی بیت رہی ہے۔ تمہارا راستہ بھی شاید وہی ہے جو میرا تھا۔ نصیبن بوا سچ کہتی ہیں۔ اس گھر میں شہنائیاں نہیں بجیں گی۔ یہاں کسی کا سہاگ نہیں سجے گا۔ آؤ میرے راستے پر آؤ— (قہقہہ) آؤ، برات میرا انتظار کر رہی ہے۔

شہنائیاں سن رہی ہو—؟

(شہنائیاں بج رہی ہیں ان کی آواز پس منظر میں)

ریحانہ: تو کیا میں بھی یوں ہی بوڑھی ہوں جاؤ گی—(سوچتے ہوئے) کیا میری جوانی بھی اسی طرح بیت جائے گی۔(زوردار آواز میں) مجھے بتاؤ—بولو رضوانہ بہن—بولو—؟

(شہنائیوں کی آواز)

ریحانہ: کیا یہ سرخ پردے میرے خون سے رنگے جائیں گے؟

(بہت تیز چیخ) بتاؤ رضوانہ بہن بتاؤ—

(چیخ مارتی ہے اور بیہوش گر پڑتی ہے)

نصیبن: اے ہے بڑی سرکا۔ریحانہ بٹیا کے دشمنوں کو کچھ ہو گیا، ضرور یہ انھیں کی چیخ تھی۔

بیگم: ریحانہ بٹیا۔(گھبرا کر) ریحان نہ بٹیا۔ارے کوئی دوڑو۔مغلانی بی ذرا جا کر دیکھو تو سہی، سرخ پردوں والے کمرے میں ریحانہ بیٹی کو تو جا کر دیکھو۔ارے کوئی مجھے لے چلو۔(اٹھنے کی کوشش کرتی ہیں) اور یہ میری ٹانگیں بالکل کام نہیں دیتیں۔

نصیبن: میں ابھی جاتی ہوں بڑی سرکار۔

بیگم:ن صیبن بوا، تم سے کیا ہوگا، میرے ہاتھ پاؤں بالکل بیکار ہو گئے ہیں۔اپاہج ہو کر رہنے سے تو موت بھلی، نہیں تو میں ریحانہ بیٹا سے اس کمرے کو کھلوانے کو کہتی؟ خدایا رحم کرنا۔ میری ایک ہی بچی ہے۔مولا—مشکل کشا—

نصیبن: میں ابھی درود شریف پڑھ کر دم کرتی ہوں۔

بیگم: ارے کوئی مجھے اٹھاؤ۔لو، وہ ریحانہ کو لیے آ رہے ہیں۔بیہوش ہو گئی میری بچی۔اللہ رحم کرنا مولا نا مشکل کشا تیری نیاز دلاؤں گی۔اللہ میاں تیرا طاق بھروں گی۔اب کھڑی منہ کیا تک رہی ہو۔مغلانی بی۔ذرا لخلخہ سنگھاؤ، گلاب چھڑ کو منہ پر اس کے۔چھوڑو پنکھا مجھے دو۔نصیبن بوا لو ذرا یہ لخلخہ تو سنگھاؤ میری بچی کو۔

نصیبن: (پڑھتے ہوئے) آمین—آمین—ثم آمین۔(پھونکتی ہے)

بیگم: مغلانی بی، کھڑی کیا ہے ٹھٹ لگائے۔ذرا وقار میاں کو خبر کرو کہ بہن کی حالت بے ڈول

ہو رہی ہے۔ کیسی بے سدھ پڑی ہے میری بچی۔ (دعا مانگتے ہوئے) میرے مالک۔ مجھ اپاہج کے سفید بالوں کو لاج رکھ لیجو، میرے مولا۔

(بھاری قدموں کی آواز جو دھیرے دھیرے قریب آتی ہے)

وقار: امی — جاوید آ گیا۔

جاوید: آداب چچی جان۔

بیگم: وقار بیٹے۔ ذرا دیکھ تو کیا ہو گیا میری بچی کو __ اچھی بھلی کوٹھے پر گئی تھی۔ وہاں سے آئی ہے، تو بے ہوش پڑی ہے۔

وقار: (بے رحمی سے) تم زیادہ فکر مت کرو امی۔ یہ ابھی ٹھیک ہوئی جاتی ہے۔

جاوید: ریحانہ بہن کیسی ہیں چچی۔

بیگم: جاوید —— کیا بتاؤں میرے بچے۔

جاوید: گھبرائیے نہیں، تھکن اور کمزوری ہے ابھی ہوش میں آتی ہیں۔ پنکھا مجھے دیجئے۔

وقار: جاوید، نیچے سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور تم یہاں تیمارداری لے کر بیٹھے ہو۔

جاوید: آپ جائیے میں ابھی آتا ہوں۔

وقار: واقعی تم عجیب ہو، میاں ان چھوٹی چھوٹی موٹی بیماریوں سے پریشان ہوتے ہو، اُنہہ یہ ڈھکوسلے تو نوابوں کے گھرانوں میں روز ہی ہوتے رہتے ہیں کیوں امی؟

بیگم: تمھیں یہ باتیں سوجھ رہی ہیں، چلو ہٹو میرے سامنے سے۔ جاؤ ذرا ریحانہ کے ابا ہی کو بھیج دو۔

وقار: بہت اچھا۔

(جاتا ہے)

بیگم: ریحانہ بٹیا۔ ریحانہ بیٹی (آواز دیتے ہوئے) ریحانہ، میری بچی۔ آنکھ تو کھول۔

ریحانہ: (ہوش میں آتی ہے) امی کیا ہوا مجھے۔

بیگم: کچھ نہیں میری بچی۔ مغلانی بی میری بچی نے آنکھ کھولی۔ ذرا صدقہ تو لاؤ، طاق بھرنے کا انتظام کرو۔

جاوید: اب کیسی ہو ریحانہ؟

ریحانہ: ارے جاوید بھائی آپ آگئے؟

جاوید: اٹھو مت تمھاری طبیعت خراب ہے۔

ریحانہ: میں اب اچھی ہوں۔ وہ تو ایکا ایکی نہ جانے مجھے کیا ہوگا۔

بیگم: اللہ نے میری سن لی۔ جاوید میاں۔ وہ بڑا رحیم ہے — ان کے ابا ابھی نہیں آئے۔

(اتنے میں نواب صاحب آجاتے ہیں)

نواب: بیگم بیگم (غصہ میں) بھلا ہمت تو دیکھو ان چپڑ قناتیوں کی کل کے ٹھیکیدار آج کم بخت اپنی حیثیت کو بھول گئے ہیں۔

بیگم: پہلے میری بات تو سن لو۔

نواب: میرا خون کھول رہا ہے بیگم۔ وہ رحمت اللہ ٹھیکیدار اور ان کے رشتے ناتے والے دو چار دن سے آکر ٹھہرے تھے تو ہم نے بھی کہا کہ چلو شکار میں ساتھ ہو جائے گا۔ آج معلوم ہے کہ کیا گل کھلائے انھوں نے؟

بیگم: شکار کو نہیں گئے وہ لوگ؟

نواب: (غصہ میں) نہیں، انھوں نے ہماری مہربانیوں کا خوب انعام دیا۔ ابھی ابھی زمانے بھر کا لچا لفنگا۔ دو دمڑی کا ٹھیکیدار رحمت اللہ ہمارے پاس آیا، کہنے لگا کہ ہمارے گھرانے میں رشتہ کرنا چاہتا ہے۔ بھلا دیکھو تو یہ ہمت؟

بیگم: (تعجب سے آواز کے ساتھ، غصے سے نہیں) رشتہ؟

نواب: ریحانہ کو ہم نے اسی لیے تو پالا پوسا ہے کہ ایسے کمینوں کے حوالے کر دیں؟ نہ ذات، نہ پات، نہ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز، چلے ہیں نوابوں کے ہاں رشتہ کرنے؟ دنیا بھول جائے، کوئی ہم بھولیں گے کہ ان کے پردادا اور ان کے باپ برتن صاف کیا کرتے تھے ______

بیگم: پھر کیا کہا تم نے؟

نواب: یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے، ہم نے یہی کہا کہ پہلے بات کرنے کا سلیقہ سیکھو، اپنی حیثیت مت بھولو۔ روپیہ پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے دنیا میں

بیگم: خدا کے لیے چپ رہو خدا کے لیے آہستہ ـــ دیکھتے نہیں ہو ریحانہ نے ابھی آنکھ کھولی ہے۔

نواب: کیوں؟ کیا ہوا تھا ریحانہ کو؟

بیگم: ریحانہ بے ہوش ہو گئی تھی، وہ تو جاوید نے دوا دی تو ہوش میں آئی ہے۔

نواب: جاوید بڑا لائق بچہ ہے۔

جاوید: کچھ نہیں چچا جان ان کو تھکن اور کمزوری تھی۔

نواب: میں جانتا ہوں۔

بیگم: میں نے تمھیں اسی لیے بلایا تھا، وقار نے کچھ نہیں کہا۔

نواب: نہیں، بھلا وہ مجھے بلانے کیوں جانے لگے؟ وہ تو کوڑی کام کا نہیں رہا۔ ایسا یار باشی میں پڑا ہے کہ خدا کی پناہ۔ جاوید میاں، تم ہی اسے کچھ سمجھانا۔ ریحانہ؟

ریحانہ: جی، ابا جان۔

نواب: اب اٹھو بھی چھوٹی موٹی بیماریوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔ آج تمھاری مرحوم بہن کی فاتحہ ہے۔ اس کی دیکھ بھال تو تمھیں کو کرنی ہے، اچھا بیگم میں اتنے میں حافظ جی کو اطلاع کرا دوں کہ وہ فاتحہ کے وقت آ جائیں۔ (چلتے ہیں)

بیگم: مگر ذرا ٹھہرو۔ ذرا ایک طرف ہو جاؤ۔ (آہستہ سے) تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لیے پیام سلام والوں سے اتنی سختی سے بات نہ کیا کرو۔ لڑکی کا کیا ہوگا۔ وہ کیا سوچے گی اور ادھر سارے پیام آنے بھی بند ہو جائیں گے۔

نواب: فضول کی باتیں مت کرو۔ اس کمبخت ٹھیکیدار کو نہیں کہتیں۔

بیگم: جس گھر بیری ہوگی۔ وہاں ڈھیلے آئیں گے۔

نواب: بیہودہ باتیں! میں ہاتھ توڑ دوں گا ڈھیلے بازوں کے۔ جاؤ چپکی بیٹھو۔

(بھاری قدموں سے نیچے جانے کی آواز)

بیگم: (اپنی پوری آواز سے) جاؤ جاوید بیٹا، تم بھی سفر سے آئے ہو، اپنے کمرے میں تھوڑی دیر آرام کر لو۔

ریحانہ: اب میں اچھی ہوں۔ آپ جائیے نا۔

جاوید: بہت اچھا۔

بیگم: مغلانی بی، سرخ پردوں والے کمرے تک پہنچادوں۔ جاوید میاں کو۔

جاوید: میں چلا جاؤں گا چچی جان۔

(قدموں کی آواز)

وقار: اوہ ہو۔ تو آپ آگئے جاوید صاحب، یہاں میں آپ کے لیے کمرے کو صاف کراتے کراتے—

جاوید: خیریت تو ہے؟

وقار: جناب، بس نہ پوچھئے جو محنت کی ہے، اس کمرے پر۔

جاوید: آخر کیا ہوا؟

وقار: بھئی ایمان کی بات یہ ہے کہ ایک زمانے سے یہ کمرہ کھولا نہیں گیا تھا۔ گرد، دھول، مٹی جالے اور کوڑا کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا یہاں، یہ سرخ پردے دیکھ رہے ہو، ان پر گرد کم سے کم دو انچ تو ہوگی اور یہ مسہری۔

جاوید: اور یہ مسہری پر مرجھائے ہوئے پھولوں کا ہار؟

وقار: ہاں۔ بیوقوف نوکر اسے پھینکنا بھول گیا۔ دراصل یہاں مرحوم رضوانہ بہن دلہن بنائی گئی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد سے یہ کمرہ اسی طرح بند ہے۔ لاؤ ہار مجھے دو۔

جاوید: نہیں وقار، مجھے باسی پھولوں سے عشق ہے۔

وقار: یار، تم بھی ایک معمہ ہو۔ دنیا تازہ پھول پسند کرتی ہے، کبھی کبھی تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ تم جان بوجھ کر یہ اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتے ہو۔

جاوید: نہیں وقار، جب میں باسی پھول دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ انھیں بھی کبھی کھلنے کی آرزو ہوئی ہوگی۔

وقار: شاعری؟ خوب اور بہت خوب، مگر ایک بات بتاؤ۔

جاوید: کیا؟

وقار: تم نے شادی کے بارے میں کیا طے کیا؟

جاوید: تمھیں کتنی بار بتاؤں کہ میں اسے شدید حماقت سمجھتا ہوں۔

وقار: اور تمھارا اور ثریا کا رومان؟

جاوید: ختم ہو گیا۔ کیوں کہ میں عمر بھر اس کا نام جپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

وقار: اب کیا رنگ ہے، کیا ارادہ ہے؟

جاوید: میرا ارادہ؟ (ہنستا ہے) خودکشی کرنے یا سنیاس لینے کے علاوہ اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔
وقار تم نے کبھی غور کیا ہے کہ محبت، رومان عشق اور شادی کے یہ سارے لفظی جال، یہ گھروندے جن سے ہم کھلونوں کی طرح کھیلتے ہیں، محض شعبدہ گری ہیں، ایک ہوا بندی ہے اور کچھ نہیں ورنہ—

وقار: ورنہ شاید آپ جیسے لوگ اس ہوا میں اپنی دنیا تعمیر کرتے۔

جاوید: نہیں، ورنہ انسانی زندگی کا مقصد بچوں کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ (ہنستا ہے)
انسان بھی اپنی حیوانیت کو چھپانے کے لیے کیا کیا حربے آزماتا ہے۔ بے چارہ انسان!

وقار: لو سگریٹ لو۔ تمھارے اندر کا زہر پھر ابلنے لگا ہے۔

جاوید: تم نے شاید ٹھیک ہی کہا جاوید، زہر ہے اور یہ زہر چاروں طرف ہزار شکلوں میں بکھرا ہوا ہے۔ یہ ساری دنیا صرف حقیقتوں کا زہر ہے اور اسے پینے والا شیو ابھی پیدا نہیں ہوا کہ اس سے امرت نکل سکے۔

وقار: خیر، میرے پاس اس زہر کا علاج ہے سرکار!

جاوید: کیا؟

وقار: شراب، ناچ، رنگ، آج ہی زہرہ بائی کو طلب کیا ہے، آج شام کو ہو جائے پھر ایک محفل۔

جاوید: (چلا کر) وقار! (آواز مدھم ہو جاتی ہے) کیا ہوا تمھیں؟ آج رضوانہ بہن کی برسی ہے۔
ریحانہ کی طبیعت ابھی اتنی خراب ہو چکی ہے۔

وقار: خام کار فلسفی! دنیا میں لوگ مرتے جیتے رہتے ہیں۔ رہی ریحانہ تو اس کے دورے کچھ نئے نہیں، میں ان کا عادی ہو چکا ہوں۔

جاوید: مگر میں نہیں، میں اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔

وقار: (ہنستا ہے) خوب، ان جوان لڑکیوں کے دورے سب ڈھکوسلے اور بہانے ہیں۔ سمجھے —— اچھا تم تھوڑی دیر سولو۔ اور نیچے آجاؤ، میں چلتا ہوں۔

(خاموشی)

نصیبن: اے ہے میرا بچہ۔

جاوید: اوہو، نصیبن بوا، سلام۔

نصیبن: جیتے رہو، اب بھلا مجھے کاہے کو یاد کرنے لگے، اب تو بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ میرے پاس آکر جھانکا تک نہیں۔ مجھ بڑھیا کو خود ہی آنا پڑا...... اللہ کی قسم ساری ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔

جاوید: ریحانہ بہن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی نا؟

نصیبن: ہاں، نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔

جاوید: کیوں؟ (بھید بھری آواز میں) کیا بات ہے؟

نصیبن: بات کیا ہوتی بٹیا۔ ان سرخ پردوں کو دیکھ رہے ہو۔

جاوید: سرخ پردے؟!!

نصیبن: یہ مسہری، یہ سرخ پردے، یہ باسی پھولوں کا ہار۔ ہاں بیٹا اس کمرے میں رضوانہ بٹیا دلہن بنی تھیں، میں تو سو میں، ہزار میں کہدوں کہ اس کمرے میں اثر ہے، بچاری کے ہاتھ میں مہندی بھی رچنے نہ پائی تھی کہ پھول کی طرح کمھلا کر رہ گئی۔ اس دن سے آج تک یہ کمرہ اسی طرح بند رہا ہے اور آج تمھارے لیے یہی کمرہ ٹھیک کرایا گیا۔ میں نے لاکھ کہا مگر میری کون سنتا ہے بیٹا۔

جاوید: ہاں، پھر کیا ہوا بوا؟

نصیبن: پھر؟ ریحانہ بٹیا کو کمرہ صاف کرنے بھیجا تھا۔ بچاری یہیں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

جاوید: اچھا —!

نصیبن: اور کیا! میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ تم، میرے چاند ذرا ہوشیاری سے رہنا۔ اور ہو سکے تو بڑی بیگم سے کہہ کر کمرہ ہی بدل دو۔ یہاں بڑا بھراپُرا اثر ہے۔ اللہ جانے۔

جاوید: (ہنستا ہے) نہیں بوا۔ تم فکر نہ کرو۔

نصیبن: میر لیے کچھ لائے ہو؟

جاوید: ہاں— نصیبن بوا۔ بہت کچھ ہے۔ میں ذرا ایک نیند لے لوں، پھر بھجوا دوں گا۔

نصیبن: اچھا تم سو جاؤ۔

جاوید: (جماہی لیتا ہے)

(وقفہ)

(تیز ہوا کا جھونکا۔ اس کے بعد گھنگھروؤں کی آواز، جیسے کوئی پیروں میں گھنگھرو باندھ کر چل رہا ہوں۔ یہ آواز رفتہ رفتہ قریب آجاتی ہے)

جاوید: کون ہو تم؟

آواز: تمہارا خواب، تمہارا خیال۔

جاوید: (ذرا زور سے) کون ہو تم؟

آواز: میں؟ (ہنستی ہے) میں یہ سرخ پردے ہوں۔ یہ مرجھائے ہوئے پھول ہوں۔ یہ مسہری ، یہ کمرے میں بسی ہوئی سہاگ کی خوشبو (گھنگھروؤں کی آواز) میں رضوانہ ہوں۔

جاوید: رضوانہ بہن۔

آواز: ہاں— میں ان مرجھائے ہوئے پھولوں کے ساتھ اس کمرے میں رہتی ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا جاوید۔ ان کلیوں کو بھی کبھی کھلنے کی آرزو رہی ہوگی۔

جاوید: تم سن رہی تھیں؟

آواز: میں تمہارا خیال ہوں۔ مجھ سے کون سی بات چھپا سکتے ہو۔

جاوید: تو بتاؤ میں کیا سوچ رہا ہوں؟

آواز: ٹھیک سوچ رہے ہو، یہ محل سرا، یہ سرخ پردوں سے سجے ہوئے کمرے اور شبستان، قید خانے کی کوٹھریاں ہیں، جن میں کوئی دروازہ نہیں، ان دیواروں میں گھٹ کر میری جوانی نے دم توڑ دیا اور اب—اب— ریحانہ کی جوانی آخری سانسیں لے رہی ہے اور—

جاوید: ——اور—؟

آواز: اور وقار کو عیش سے فرصت نہیں، اور ابا جان کو عزت اور خون کے خالص ہونے کی فکر ہے۔ (ہنستی ہے) میری باتیں سن رہے ہو؟

جاوید: ہاں؟

آواز: تم میرے مہمان ہو۔ میری بات مانو گے؟ میرے ساتھ آؤ ___ یہ دروازہ کھولو ___ یہ سرخ پردے ہٹاؤ ـــ (آواز تیز ہوتی ہے) یہ پردے ہٹاؤ۔

(گھنگھروؤں کی آواز بہت تیز ہو جاتی ہے، جیسے کوئی بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے)

(وقفہ)

جاوید: (جاگ اٹھا ہے اور خواب یاد کر رہا ہے) اوہ، کتنا عجیب خواب تھا یہ بھی۔ نصیبن ٹھیک کہتی تھی۔ سرخ پردے ہٹاؤ۔ سرخ پردے ہٹاؤ۔

ریحانہ: آپ اٹھ بیٹھے جاوید بھائی؟

جاوید: آؤ ریحانہ ـــ چائے لے آئیں۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔

ریحانہ: وقار بھائی ابھی آتے ہی ہوں گے۔

جاوید: مغلانی بی بنا لیتیں۔

ریحانہ: نہیں، آپ نہیں جانتے جاوید بھائی، وہ میرے سوا کسی اور کے ہاتھ کی چائے نہیں پیتے۔

جاوید: میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے ریحانہ۔ بہت ہی عجیب۔

ریحانہ: کیا؟

جاوید: ابھی نہیں، میں تمھیں بتا دیتا مگر مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میں نے اگر ابھی ایک لفظ بھی کہا تو کوئی میرا منہ بند کردے گا اور میری ساری آرزوئیں یوں ہی ختم ہو جائیں گی۔ ایک بات بتاؤ گی، ریحانہ؟

ریحانہ: پوچھیے۔

جاوید: نصیبن بوا کہتی ہیں اس کمرے میں اثر ہے کیا یہ سچ ہے؟

ریحانہ: (پھیکی ہنسی ہنستی ہے) نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔

جاوید: تمھیں تو اس کمرے میں بیہوش ہوئی تھیں؟

ریحانہ: مگر وہ اثر نہیں تھا۔ وہ کوئی روح یا کوئی بھوت نہیں تھا۔

جاوید: اور کیا تھا؟ کیا تم سچ مچ بیمار تھیں؟

ریحانہ: کچھ نہیں—

جاوید: مجھ سے چھپاؤ مت ریحانہ__ تم مجھے عجیب ہی سمجھو۔ مجھ سے تکلف کیا؟

ریحانہ: جاوید بھائی؟

جاوید: کہو ریحانہ—؟ بتاؤ نا؟

ریحانہ: یہ سرخ پردے، یہ باسی پھول، یہ مسہری (آہستہ آہستہ کہتی ہے) یہ سارا کمرہ مجھے رضوانہ بہن کی یاد دلاتا ہے اور جب میں پچھلی بار یہاں آئی تو—

جاوید: تو کیا ہوا؟

ریحانہ: تو مجھے یکایک ان کی شادی یاد آئی، وہ، ان کے دکھ اور ان کی خوفناک موت یاد آئی— اور میری آنکھوں کے سامنے—ہاں موت کے ڈھانچے اور بڑھاپے کی پرچھائیاں میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔ پھر میں نے سوچا— میں نے سوچا۔

جاوید: کیا سوچا؟

ریحانہ: کہ میں بھی ایک دن اسی طرح...... (آواز رندھ جاتی) بس اب اور نہ پوچھیے، اور کچھ نہ پوچھیے۔

جاوید: بڑھاپے سے ڈرتی ہو، موت سے خوف کھاتی ہو۔

ریحانہ: نہیں، جاوید بھائی مگر میں اس طرح مرنا نہیں چاہتی، ان دیواروں میں گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی۔

جاوید: پگلی ریحانہ— (تھوڑی دیر خاموش) کاش کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔ (لہجے میں تبدیلی) مگر یہ دنیا بھی عجیب ہے۔ یہاں کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہے۔

ریحانہ: آپ چائے پیجیے نا، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ وقار بھائی ابھی تک نہیں آئے۔

جاوید: چائے بناؤ۔

(وقفہ)

ریحانہ: آپ کچھ سوچ رہے ہیں جاوید بھائی؟

جاوید: ہاں میں سوچ رہا ہوں ریحانہ، آج شاید وہ دن آگیا ہے، جس میں انتظار کررہا تھا۔

ریحانہ: کون سا دن؟

جاوید: میں نے سوچا تھا ریحانہ کہ میں اپنے لیے ایک ساتھی چنوں گا۔ ایک ایسا ساتھی جو موت کی گھاٹیوں سے نکل کر آئے، جو اس بے جان قانون سے بغاوت کر سکے۔

ریحانہ: کون سا قانون؟

جاوید: وہی قانون جو ہمارے اوپر پچھلی نسل نے لادے ہیں۔ یہ پردے کی جکڑ بندی، یہ دوسروں کی پسند کو اپنے اوپر لادنے کی قید، یہ بزرگوں کے سامنے اپنا سر ٹیک دینے کا رواج، مجھے ان بندھنوں سے نفرت ہے۔

ریحانہ: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی جاوید بھائی۔

جاوید: میں چاہتا ہوں ریحانہ تم ان زنجیروں کو توڑ سکو۔ تم ان بندشوں سے آزاد ہو سکو، میرے ساتھ آؤ میں غلامی سے تنگ آچکا ہوں۔ مجھے باغیوں کی ضرورت ہے۔ بولو؟ تم میرے ساتھ آؤ گی، بولو، تم میرے ساتھ آسکو گی؟

ریحانہ: میں ـــــ میں ـــــ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا جاوید بھائی۔

جاوید: سمجھو ریحانہ! سمجھو، پتھر کی یہ دیواریں تمھیں کچل دیں گی۔ ان سے راستے مانگتے مر جاؤ گی اور راستہ نہ ملے گا۔ تمھاری جوانی ان ہی سرخ پردوں کی پرچھائیں میں دم توڑ دے گی۔ آؤ ریحانہ، میرے ساتھ آؤ، بولو چلو گی میرے ساتھ؟

(وقار آتا ہے)

وقار: جاوید چلو فاتحہ کا وقت ہو گیا۔

جاوید: مگر ٹھہرو وقار میں ریحانہ بی سے اپنی پہیلی کا جواب پوچھ لوں۔

وقار: چلو، یہ بچپنے کی باتیں پھر کرتے کرنا۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

جاوید: وقار، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے، میں نے رضوانہ بہن کی روح سے ابھی

ایک وعدہ کیا ہے میں اسے پورا کرنا چاہتا ہوں، چلو۔ تم اپنے کمرے میں چلو ——

(وقفہ)

وقار: آؤ — بتاؤ — لو ہم کمرے میں آ گئے۔ اب یہاں اور کوئی نہیں ہے۔

جاوید: مجھ میں صبر نہیں ہے وقار۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔

وقار: آخر بات کیا ہے؟

جاوید: وہ لمحہ جس کی میں عرصے سے راہ دیکھ رہا تھا، آج اڑتا ہوا میری انگلیوں کے بیچ آ گیا ہے۔ آج ابھی، اور اس وقت میں نے وہ بات تم سے نہ کہی تو میں اسے پھر کبھی نہ کہہ سکوں گا۔

وقار: وقت ضائع نہ کرو۔

جاوید: میں جس عورت کو چاہتا تھا وہ آ گئی۔ جسے میں موت کی گھاٹیوں سے بچا سکوں، جو زندگی کی آزمائشوں کو ٹھکراتی ہوئی مجھ تک آ سکے۔

وقار: کون عورت ہے وہ؟

جاوید: ریحانہ!

وقار: (غصے سے) جاوید —— تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔

جاوید: محبت اور شادی گناہ نہیں ہیں وقار۔

وقار: اپنی زبان بند کرو۔ ابا جان سن لیں گے تو غدر مچ جائے گا۔

جاوید: مچنے دو! یہی میں چاہتا ہوں، اگر ہم دونوں اس طوفان سے پار اتر گئے تو ہماری محبت کو کوئی شکست نہ کر سکے گا اور اگر —

وقار: تم ٹوٹ جاؤ گے۔

جاوید: اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا ہم ابھی جیت کے قابل نہ تھے، جاؤ خدارا جاؤ وقار تم جا کر کہو، نواب صاحب سے کہو میں ریحانہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

وقار: تمھیں کیا ہو گیا ہے جاوید؟ تم سمجھتے کیوں نہیں؟ یہ ہمارے یہاں ممکن نہیں ہے۔

جاوید: مگر تم تو سمجھتے ہو کہ جاوید ناممکن سے ٹکرانے کا عادی ہے۔

(دور سے غصہ بھری زوردار آوازیں آنے لگتی ہیں، جو نواب صاحب کی ہیں)

نواب: وقار — وقار — وقار —!

وقار: ابھی آیا ابا جان — (مائکروفون نواب صاحب کے نزدیک ہوتا جاتا ہے)

نواب: دیکھیں اس کمینے کی باتیں۔ ٹھیکیدار کم بخت بدتمیز کہیں کا۔ ریحانہ بی کے رشتے سے انکار کر دیا تو آج ہی نوٹس بھجوایا کم بخت نے۔

وقار: ان کی تو تقریباً ۵۵ ہزار روپیہ کی ڈگری ہو چکی ہے۔

نواب: ہاں، اس کا قرضہ ہے ہمارے اوپر۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہماری عزت پر ڈاکہ ڈالے، نیلام کرادے گا محل سرا کو۔ شوق سے نیلام کرادے۔ مگر ہماری عزت تو کوئی ہم سے نہ چھینے گا۔ ہم اپنی بچی کو ننگی بوچی نہ نکالیں گے۔ ہم اسے کم ذاتوں کے حوالے نہیں کریں گے۔

وقار: (بے چینی سے بات کاٹتے ہوئے) ابا جان!

نواب: بیٹے، کیا کہنا چاہتے ہو؟

وقار: کیا ریحانہ بہن کی شادی صرف اس وجہ سے نہیں ہو گی کہ ہمارے پاس دھوم دھام کے لیے روپیہ نہیں ہے اور ان آدمیوں کی ذات میں کھوٹ ہے —؟

نواب: بے شک عزت بڑی چیز ہے۔

وقار: مگر یہ سب کچھ تو نہیں ہے۔ اگر ریحانہ بہن کسی سے شادی کرنا چاہیں؟

نواب: (غصہ میں) وقار، کیا بکتے ہو؟ شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں اس طرح چاہت کے جال نہیں بُنا کرتیں۔

وقار: فرض کیجیے وہ کسی سے شادی کرنا چاہے تو؟

نواب: بکواس بند کرو وقار، میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ اس سے پہلے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو مرنا چاہیے۔

(وقفہ)

نواب: بیگم — بیگم — ریحانہ کو بلاؤ (غصہ میں) کہاں ہے ریحانہ —؟

بیگم: خدا کے لیے ذرا آہستہ بات کرو، جانتے ہو میں اپاہج ہوں، میرا دل کتنا کمزور ہے۔

نواب: میں کہتا ہوں ریحانہ کہاں ہے؟

بیگم: جاوید کے لیے چائے لے کر گئی ہے۔

نواب: (زور سے) ریحانہ ــ بیگم تم اندھی ہو گئی ہو۔ تمھاری عقل سٹھیا گئی ہے۔ محل سرا میں یہ لیلیٰ مجنوں کا کھیل نہیں کھیلا جائے گا۔

بیگم: کیا ہوا ہے تمھیں؟

(ریحانہ آتی ہے)

ریحانہ: آپ نے مجھے بلایا تھا؟

نواب: (وقار اور عظمت کے ساتھ) ہاں میں نے ہی تمھیں بلایا تھا۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی ریحانہ، تم نے خاندان کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے، تو ہماری آبرو ڈبو دینا چاہتی ہے۔ کم بخت بیوقوف لڑکی۔

ریحانہ: کیا کیا ہے میں نے؟

نواب: تم مجھ سے زیادہ بھولی نہ بنو، اس سے کہدو کہ یہاں سے چلا جائے۔ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ۔ لچے لفنگوں کے ہاتھ میں نہیں دوں گا۔ کہاں ہے جاوید؟

جاوید: میں خود ہی آ گیا ہوں چچا جان۔

نواب: مجھے چچا جان کہنے سے پہلے دل میں شرماؤ جاوید۔ تم کو یہ الفاظ کہنے کی ہمت کیسے پڑی؟ مجھ سے دہراؤ کہ میں تمھاری زبان کھینچ لوں، تم شریفوں کے گھر میں پیدا ہونے کے لائق نہیں ہو ــ نکل جاؤ ــ چلے جاؤ میرے سامنے سے۔

جاوید: میں نے کوئی ایسا گناہ نہیں کیا چچا جان۔

نواب: بدتمیز۔

جاوید: نواب صاحب میں چلا جاؤں گا، مگر ریحانہ میرے ساتھ جائے گی۔

نواب: گستاخ، میں تجھے گولی ما دوں گا۔ خبردار۔ جو ریحانہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

جاوید: محبت گناہ نہیں ہے۔ (ہنستا ہے) اور یہ عزت کے اپدیش آپ مجھے سنا رہے ہیں؟ مجھے آپ کی جوانی کی رنگ رلیاں معلوم ہیں۔ بڑھاپے کی یہ مستیاں بھی مجھ سے چھپی ہوئی

نہیں ہیں۔اور آپ مجھے عزت کا سبق دینے چلے ہیں۔

نواب: چلے جاؤ جاوید۔

جاوید: تمھارے قانون؟ تمھارے اخلاق؟ یہ سب فریب ہیں، تم انسان کو جکڑنے کے لیے زنجیریں بناتے ہو اور انھیں خوبصورت نام دیتے ہو۔ اخلاق، مذہب، رسم و رواج، بس یہی تو ہے تمھارا سماج۔ مجھے بدبودار لاشوں سے ڈر نہیں لگتا۔ میں صرف ان سے نفرت کر سکتا ہوں — آؤ ریحانہ چلیں۔

نواب: ریحانہ کا ہاتھ چھوڑ دے، ورنہ میں تلوار کا ہاتھ دیتا ہوں بدمعاش۔

بیگم: میری بچی۔ (چیخ کر) میری ریحانہ۔

نواب: نہیں بیگم، خبردار، اب یہ ہماری کوئی نہیں۔

بیگم: ریحانہ!

ریحانہ: (چلا کر) امی — میری امی — (سینے سے لگ جاتی ہے سسکیوں کی آواز)

نواب: بیگم اسے چھوڑ دو۔

بیگم: نہیں نہیں میں اپنی بچی کو نہیں چھوڑوں گی۔ میری لاڈلی، میری بچی۔

نواب: بیگم — (زیادہ غصہ سے) میں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔

بیگم: میری بچی معصوم ہے۔اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔

نواب: تمھیں کچھ معلوم نہیں ہے، تم خود بڑی بھولی ہو۔ تمھاری لاڈلی مجھ سے چھپ کر اپنا بر تلاش کرتی ہے۔ میں گلا گھونٹ دوں گا ایسی اولاد کا۔ مجھے نوابوں کے گھرانے کی عزت۔

جاوید: (بات کاٹ کر طنز کے ساتھ) نوابوں کے گھرانے کی عزت؟

بیگم: چپ رہو جاوید — میری بات سنو مالک۔

نواب: میرے پاس بیکار وقت نہیں ہے۔

بیگم: تم نے وعدہ کیا تھا کہ...... تمھیں یاد ہوگا، جب تم دوسری شادی کر کے لائے تھے تو تم نے وعدہ کیا تھا۔

نواب: اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں۔

بیگم: تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری ایک آرزو پوری کرو گے۔

نواب: تمہاری بہت سی باتیں پوری کر چکا ہوں، اس وقت میرے راستے میں نہ آؤ۔

بیگم: میری بچی نے غلطی نہیں کی ہے — جاوید بھی اپنا ہی بچہ ہے۔ اس شادی کو خدا کے لیے، اس شادی کو نہ روکو، میری بچی کا دل ٹوٹ جائے گا۔

نواب: میں لچوں لفنگوں کے ہاتھ میں نوابوں کی عزت نہیں بیچ سکتا۔

جاوید: وہ تو آپ پہلے ہی رہن رکھ چکے ہیں۔

نواب: خاموش۔

بیگم: تم نے تو کہا تھا کہ نوابوں کے گھرانے میں زبان بڑی چیز ہے۔

نواب: بے شک!!

بیگم: تو میری درخواست پوری کرو۔ میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں، میری بات مان لو۔

نواب: یہ نہیں ہوسکتا بیگم۔

بیگم: میں اپاہج تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں تم سے اپنی بچی۔

نواب: تمھیں کیا ہو گیا ہے بیگم؟ (زور سے) تم سمجھتی کیوں نہیں؟

بیگم: میں تم سے اپنی بچی کی خوشی کی بھیک مانگتی ہوں۔ خدا کے لے تمھیں اپنے خاندان کی عزت کا واسطہ —— تم میری بات نہیں مانو گے؟

نواب: ہرگز نہیں۔

بیگم: (روتے ہوئے) خدا بھی سفید بالوں کی لاج رکھ لیتا ہے۔ بیمار کی دعا سن لیتا ہے۔ تم اسے بھی نہ سنو گے، میں سچ کہتی ہوں اگر ریحانہ اور جاوید نہ ملے تو میری روح کو قبر میں بھی چین نہ ملے گا —— میں نے آج تک اپنی بیٹی کی کوئی بات نہیں ٹالی —— خدا کے لیے — خدا کے لیے، میری بات مان لو۔

نواب: (چیخ کر) بکواس بند کرو۔ بیگم میں یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتا۔

بیگم: (روتے ہوئے) میں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ میری بات مان لو۔

نواب: میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔

بیگم: (چیخ مارتی ہے اور گر پڑتی ہے، موسیقی سے موت کا اثر قائم کرتے ہیں)

ریحانہ: (سسکیاں بھر کر روتے ہوئے) تم نے انھیں مار ڈالا۔ نواب صاحب، تم نے میری ماں کی جان لے لی۔ خاندان کی عزت کے رکھوالے — تم انھیں زندگی بھر خوش نہ کر سکے۔ ان کو عمر بھر جلاتے رہے۔ ان کو اپاہج کر کے بھی تمھیں چین نہیں آیا تھا۔ لو اب تو چین آ گیا — میری امی — میری امی — میری امی!!

جاوید: چچی، محترم خاتون! تمھاری روح کو لاکھ لاکھ سلام، تمھارا جسم عمر بھی پتھر کی دیواروں میں قید رہا، لیکن تمہارے پہلو میں ایک مغل کا دل تھا، جسے کوئی فتح نہ کر سکتا تھا۔

نواب: بیگم — بیگم — تم نے آج ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہم تمھاری آخری خواہش بھی پوری نہ کر سکے۔ ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے تاکہ تمھاری روح کو سکون مل سکے۔ جاوید اپنا ہاتھ لاؤ، ریحانہ بیٹی!

ریحانہ: جی!

نواب: اپنا ہاتھ دو۔ لو بیگم، ہم تمھارے سامنے ان دونوں کے ہاتھ ملاتے ہیں۔ تم انھیں دعا دو۔

(ڈھولک کی آواز)

کورس: "کاہے کو دینی بدیس رے لکھی بابل مورے"

نصیبن: ارے لڑکیو! بس اب سہاگ ہو چکے۔ چلو ذرا دلھن کو مانجھے بٹھانے کو لے چلو۔ اوپر والے سرخ پردوں والے ہی کمرے میں لے چلنا ہے۔ اے ہے تیرے ہاتھوں میں تو دم نہیں لڑکی — ذرا ٹھیک سے دروازہ کھول — بیٹی، اے ہے اب مجھ سے شرم۔

ریحانہ: کیا ہوا بوا۔

نصیبن: آج دیکھو یہ سرخ پردے کس قدر خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں، کیسے سج رہے ہیں۔

(گھنگھروؤں کی آواز)

آواز: مبارک ہو ریحانہ بہن، آج یہ سرخ پردے، یہ سہاگ کی خوشبو، یہ تازہ پھولوں کے ہار، سب تمھیں مبارکباد دے رہے ہیں۔ میں زندگی میں ان کڑی زنجیروں کو نہ توڑ سکی، جو انسان نے انسان کو پہنا رکھی ہیں۔ تم نے انھیں توڑ دیا۔ میری مبارکباد قبول کرو، کاش کہ میں تمھارے اور قریب آ سکتی۔

(گھنگھروؤں کی آواز قریب ہو جاتی ہے)

☆☆☆

سونے کی زنجیریں

میر: غلام شہ عرض کرتا ہے چھوٹے آغا۔

چھوٹے آغا: شطرنج کھیلنا کبھی نہ آئے گی ہمارے میر صاحب سے یہ خواہ مخواہ کی شہ وہ سے بھلا کیا ہوتا ہے۔

میر: (حقہ گڑگڑاتے ہوئے) اس پیچوان کی سوگند چھوٹے آغا صاحب اس شہ کی کاٹ تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔

آغا: آپ پیچوان سے شوق فرمایئے میر صاحب شطرنج تو شاہوں کا کھیل ہے۔ ع رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔

میر: نہ صاحب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ اب آپ پہلے شہ بچ لیجئے تو بندہ سات بار مجری بجالائے گا اس وقت تنہائی کا معاملہ ہے میں ہوں اور آپ ہیں۔ پیدل پسند کر لیجئے۔ میں کسی سے کہنے تھوڑا ہی جاؤں گا کہ میں نے چھوٹے آغا صاحب کو ایک پیدل پسند مات پلایا ہے۔

(ہنستا ہے)

آغا: اور جتنے میں نے پلائے ہیں وہ سب گننے لگوں تو۔

میر: شوق سے گنئے (پیچوان کی گڑگڑاہٹ)

آغا: کوئی سننے والا ہوتا تو گنا تا۔

آواز: میں دو کش پیچوان کے لے لوں۔

میر: کون یوسفی خان —— یوسفی خان تم کہاں، ہاں ہاں ضرور پیو

یوسفی: (حقہ پیتا ہے) خوب کہاں سے آتا ہے یہ تمبا کو اس میں تو ایسی خوشبو ہے جیسے بھیرویں میں (حقہ کا ایک اور کش) اچھا اب میں جاؤں گا۔ میری بیوی راہ دیکھ رہی ہوگی۔

میر: یوسفی خان، یوسفی خان۔

یوسفی خان: نہیں، میری بیوی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ (یوسفی خان جانے لگا، گنگنا تا ہے)

گورے سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس

خسرو چل گھر اپنے سانجھ ہوئی چودیس

میر: چلا گیا نا۔ پاگل اور رمتے جوگی کا کیا ٹھکانہ۔

آغا: یہی تھے یوسفی خان۔

میر: ہاں یہی آصف الدولہ کے لکھنوکی ناک ہے۔ اودھ کا مشہور پاگل گویا یوسفی خان جس کی ایک ایک تان سننے کے لیے نواب آصف الدولہ بہادر کو بھی انتظار کرنا پڑتا ہے۔

آغا: کیا نواب وزیر بہادر بھی اسے رام نہیں کر سکے میر صاحب۔

میر: نہیں۔ یہ بہتے چشمے کی طرح آزاد ہے اپنی موج میں گاتا ہے جہاں چاہتا ہے جاتا ہے جو بات چاہتا ہے کرتا ہے پاگل یوسفی خان۔

آغا: حیرت ہے کہ کس طرح رمتا ہوا یہاں تک چلا آیا۔ اور پیچوان کے دو کش لے کر اپنی راہ چلا گیا۔

میر: (پیچوان پینے لگتے ہیں) اس کی کہانی بھی عجیب ہے۔

آغا: آپ اسے جانتے ہیں میر صاحب۔

میر: میں اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ اب سے بہت سال پہلے جب اودھ میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑا تھا اور نواب آصف الدولہ بہادر نے لوگوں کی روزی کا بہانہ نکالنے کے لیے امام باڑے اور رومی دروازے بنوانا شروع کیا تھا۔ میں اس زمانے میں اچھا خاصا جوان تھا۔ میں اور یوسفی خان رات کو دو گھنٹے مزدوری کیا کرتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں بہت سے بے حال شریف گھروں کے نکلتے اور مزدوری کرتے تھے، کیوں کہ اندھیرے میں انھیں کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ اسی رات کا واقعہ ہے ہم دونوں امام باڑے سے مزدوری کر کے واپس آرہے تھے۔

(قدموں کی آہٹ)

یوسفی: آج گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ رات بھیگ چلی ہے بس یہ جی چاہتا ہے کہ میں گاتا رہوں اور کوئی سنتا رہے۔

میر: یوسفی تمھیں کال کے دنوں میں گانا بجانا سوجھ رہا ہے۔ گھر پر ماں اور بیوی انتظار کر رہے ہوں گے۔

یوسفی: نہیں۔ میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ میرے دل میں ایک چوٹ دبی ہے دوست۔

میر: سن رہا ہوں۔

یوسفی: مجھے تو محبت کرنے والے ملے۔ میری بیوی میری ماں سب ہیں مگر میرے فن سے محبت کرنے والا کوئی نہیں، تعریف سے میرا جی نہیں بھرتا۔ وہ تو یہ مانگتا ہے کہ کوئی اسے نہ چاہے اس سے جو گیت نکلتے ہیں انھیں چاہے میں گاتا رہوں وہ سنتی رہے میں گاتا رہوں۔

(ایک کراہ کی آواز)

میر: یہ کون کراہ رہا ہے۔

بوڑھی آواز: میری وصیت سن لو، تم کون ہو اجنبی۔

یوسفی: آپ کون ہیں، بولیے کون ہیں آپ؟

بوڑھی آواز: میں چند لحموں کا مہمان ہوں۔ تم میرا ایک کام کر دو گے۔

یوسفی: کہیے۔

بوڑھی آواز: میری یہ انگوٹھی میری بیٹی کو دے دینا، لو___ اور اس سے کہنا کہ وہ اسے لے کر نواب آصف الدولہ کی خدمت میں چلی جائے۔

یوسفی: مگر مجھے آپ کا دولت خانہ۔

بوڑھی آواز: ٹھہرو۔ جان جاؤ گے، مگر پہلے وعدہ کرو۔

یوسفی: وعدہ کرتا ہوں۔ علی کی سوگند کھا کر وعدہ کرتا ہوں۔

بوڑھی آواز: مرنے والے کا نام ثریا بخت ہے۔ (دم توڑ دیتا ہے)

یوسفی: نواب ثریا بخت۔ نواب ثریا بخت بہادر۔

(موسیقی)

میر: ممکن ہے نواب صاحب بھی امام باڑے کی طرف مزدوری کے لیے جارہے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے عزت بچانے کے لیے ہیرے کی انگوٹھی چاٹ کر جان دے دی ہو مگر ان کے راز ان کے ساتھ دفن ہو گئے۔ قصہ بڑا لمبا ہے یوسفی نواب آصف الدولہ کے دربار عام میں حاضر ہوا۔ نواب ثریا بخت کی انگوٹھی پیش کی انگوٹھی کے نگینہ کے نیچے ایک چھوٹا سا پرچہ رکھا ہوا تھا۔ نواب آصف الدولہ نے راجہ جھاؤلال کو حکم فرمایا کہ یوسفی کو ساتھ لے جا کر ارجمند بانو کو پوری عزت اور شان کے ساتھ لایا جائے۔ جب یہ جلوس واپس آیا اس وقت دربار خاص لگا ہوا تھا۔

چوبدار: جہاں پناہ۔ راجہ جھاؤلال اور یوسفی خان شرف باریابی چاہتے ہیں۔

آصف الدولہ: ہم ان لوگوں کے منتظر ہیں۔ تخلیہ۔

چوبدار: نگاہ روبرو۔ حضرت نواب وزیر سلامت۔

آصف الدولہ: آؤ جھاؤلال آؤ، ہم تمھاری رہ دیکھ رہے تھے تم ثریا بخت کی بچی کو لے آئے۔

جھاؤ: حضور کے اقبال سے وہ محل سرا میں ہے اور شرف باریابی چاہتی ہے۔

آصف الدولہ: ضرور، اس کم نصیب بچی کے لیے ہمارا دل روتا ہے جھاؤلال۔ ہر اس آدمی کے لیے ہمارا دل روتا ہے جو اس قحط کے نذر ہو گیا ہے۔ لوگ پریشان ہیں اور آصف الدولہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تم تو ہمارے رفیق ہو جھاؤلال۔

جھاؤ: سرکار کی ذرہ پروری ہے۔

آصف الدولہ: تم جانتے ہو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو برابر روپیہ چاہئے اور اس روپیے کے لیے اودھ کی رعایا کو لوٹا رجا رہا ہے۔ آصف الدولہ بے بس ہے وہ اگر کچھ کر سکتا ہے تو یہی کہ چند عمارتیں بنوا دے، چند باغوں کی تعمیر کرا دے۔ مگر ان تھوڑی بہت مزدوریوں سے کب تک بھوک مٹایا جا سکتا ہے۔ ثریا بخت مر گیا اور نہ جانے کتنے ثریا بخت آصف الدولہ کے لکھنؤ میں فاقے مر رہے ہیں۔

جھاؤلال: مگر تقدیر سے لڑا بھی تو نہیں جا سکتا عالم پناہ۔

آصف الدولہ: یہ کون سمجھے گا جھاؤلال کہ اودھ کے اس حکمراں کا جانشیں، جن نے بکسر میں

انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے تھے آج بالکل مجبور ہے وہ، صرف شیر قالین بن کر رہ گیا ہے۔ تاریخ تو یہی لکھے گی کہ آصف الدولہ ایک فضول خرچ نواب تھا جو اپنی رعایا کو روٹی بھی نہیں دے سکتا۔

جھاؤلال: کیا رومی دروازہ اور امام باڑہ گواہی نہیں دیں گے کہ عالم پناہ اپنی رعایا کی امداد کس طرح فرماتے رہے ہیں۔

آصف الدولہ: لوگ بڑے ظالم ہیں جھاؤلال، وہ صرف گلاب کے پھول کی رنگت دیکھتے ہیں، اس کے سینے میں چھپے ہوئے کانٹے کو نہیں دیکھتے۔ وہ صرف اس شان و شکوہ کو دیکھتے ہیں آصف الدولہ کے دل درد نہیں جانتے۔ ارجمند کو بلاؤ، ارجمند میری فرد جرم ہے اس کے باپ کی جان میں نہ بچا سکا، میں اسے اپنی لڑکی کی طرح پالوں گا۔

(وقفہ)

آصف الدولہ: آؤ ارجمند بیٹی، اس سانحے میں ہمیں تم سے ہمدردی ہے آج سے ہمیں اپنا باپ سمجھو۔ یقین مانو تمھاری کوئی بات آصف الدولہ نہیں ٹالے گا۔

ارجمند: سرکار کی عنایات کے لیے ہمارے خاندان کا سر ہمیشہ جھکا رہا ہے۔ سدا حضور کی دولت و اقبال کے دعا گو رہے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے جہاں پناہ۔

آصف الدولہ: راجہ جھاؤلال ارجمند بانو کے لیے ایک محل سرا دس کنیزیں اور جملہ سامان کا انتظام کرو۔ وہ یہاں اس طرح رہے جیسے آصف الدولہ کی بیٹی کو رہنا چاہیے۔ ارجمند تمھیں کچھ اور کہنا ہے۔

ارجمند: ایک بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔

آصف الدولہ: کہو۔

ارجمند: جس نوجوان نے آخری وقت میں میرے ابا جان (سسکی) کی خدمت کی ہے اس کے لیے کچھ انعام مرحمت فرمایا جائے۔

آصف الدولہ: کون ہے وہ نوجوان۔

جھاؤ: مشہور گویئے جمال خان کا بھتیجا یوسفی خان۔

آصف الدولہ: اس نوجوان کو ارجمند بانو کی سرکار سے وابستہ کر دیا جائے۔ اسے مشاہرہ ہمارے ہی دربار سے ملا کرے گا۔ اب تم آرام کرو بیٹی ارجمند، جاؤ۔

میر صاحب: شام کو جب یوسفی خاں گھر واپس پہنچا تو بہت خوش تھا۔

یوسفی: چچا جان۔ چچا جان۔ چچا جان۔

بیگم: کیا بات ہے کہ آج آتے ہی چچا جان کو پکارا جا رہا ہے۔

یوسفی: بیگم ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔

بیگم: کیا خوشخبری ہے میں بھی تو سنوں۔ کیا کوئی نیا راگ سیکھ کر آئے ہو۔

یوسفی: مجھے نوکری مل گئی نوکری۔ اور وہ بھی دربار میں۔ بس اب کچھ ہ دنوں میں درباری گویا ہو جاؤں گا۔

بیگم: نواب آصف الدولہ کے دربار میں۔

یوسفی: نہیں۔ میں نے تمھیں بتایا تو تھا بیگم نواب ثریا بخت کی لڑکی جسے میں نے محل میں پہنچایا ہے اسے نواب آصف الدولہ نے حویلی اور سارا محل سرا بخش دیا ہے۔ میں اسی کے دربار سے وابستہ ہوں گا میں درباری گویا بنوں گا۔ بس اب کچھ ہی دن میں۔

(جمال خان اندر آتا ہے)

جمال: کون بنے گا درباری گویا۔

یوسفی: چچا جان۔ مجھے نوکری مل گئی ہے۔ مجھے نواب ارجمند بانو کے سرکار میں نوکر رکھ لیا گیا ہے تنخواہ نواب آصف الدولہ ہی کے دربار سے ملے گی۔ دیکھو یہ خلعت ملا ہے، یہ چغہ یہ سرپیچ یہ موتیوں کی مالا۔

جمال: بس بند کر بکواس۔ یہ کیا ہو گیا ہے تجھے۔ پاگل لڑکے جا خلعت، موتیوں کی مالا دربار والوں کے منہ پر دے مار۔ تو سنگیت کو درباریوں کے ہاتھ بیچے گا۔

یوسفی: چچا جان۔ تم تو خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں۔

جمال: تجھے معلوم نہیں جمال کہ درباروں سے نفرت ہے۔ سنگیت کھلی فضا کی طرح آزاد ہے۔ وہ پانی کا چشمہ ہے جو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو اسے سونے کی زنجیریں پہنا کر لایا ہے تو

اپنی خوشی سے نہیں دربار کی خوشی سے گانا چاہتا ہے۔ جا یہ زنجیریں درباروالوں ہی کے منہ پر دے مار۔ بیٹا تیرا زیور سنگیت ہے۔

بیگم: ابا جان آخر اس طرح ہم کب تک فاقے مریں گے۔ کب تک امام باڑے پر مزدوری کرکے زندہ رہ سکیں گے۔

جمال: تو نہیں جانتی بیٹی۔ تو نہیں جانتی۔ یہ دربار ہمارے سنگیت کی قدرواں نہیں۔ یہ یوسفی کو تجھ سے مجھ سے سنگیت سے اور خود اس سے بھی اسے چھین لیں گے۔ اسے ساری دنیا سے الگ کرکے پاگل بنادیں گے اور اس وقت کوئی کچھ نہ کرسکے گا۔

یوسفی: آپ کے اندیشے غلط ہیں، چچا جان۔

جمال: خاموش، میرے اندیشے غلط نہیں؟ آج تو سنگیت کا راجہ ہے جتنی دیر چاہتا ہے ریاض کرتا ہے جو راگ چاہتا ہے گاتا ہے کل وہ تجھے تیرے حلق کو سونے کی زنجیروں سے باندھ دیں گے اور کہیں گے یوسفی خان وہ راگ گاؤ جس سے ہم ہنسیں، وہ راگ گاؤ جس سے ہمیں نیند آجائے اور یوسفی خان اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

یوسفی: چچا جان میرے اوپر ذرا بھی بھروسہ نہیں تمھیں۔

بیگم: ابان جان۔ تمھیں میری سوگند انھیں نہ روکو۔

جمال: جاؤ چلے جاؤ، میرے سامنے سے چلے جاؤ، جو جی چاہے کرو۔ جو جی چاہے کرو۔
(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے پھر ستار چھیڑتا ہے اور اس پر کوئی تیز راگ بجانے لگتا ہے)

(سین کی تبدیلی)

ارجمند: کنیز ابھی تو یوسفی خان نہیں آئے۔

یوسفی: کنیز۔ سرکار عالی میں کورنش عرض کردو اور کہو کہ غلام حاضر ہے۔

ارجمند: کنیز ان سے پوچھو کیا انھیں ایسے راگ بھی آتے ہیں جو اداس دلوں کو زندہ کرسکیں، اگر آتے ہیں تو ان سے کہو راگ چھیڑیں۔

یوسفی: میں نے ابھی تک اپنے ہی دل کو بہلانے کے لیے راگ چھیڑے ہیں۔ دوسرے اداس دلوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

ارجمند: کنیز، کہو۔ آج بھی اپنے ہی اداس دل کو بہلائیں۔

(جیسے ستار کا تار ٹوٹ جاتا ہے)

یوسفی: کون سا راگ پیش کروں۔

ارجمند: کنیز کہو۔ جوان کا جی چاہے ہم سنیں گے۔ ہمارا جی آج بہت اداس ہے۔

یوسفی: (مخصوص الاپ کے بعد یہ ہلکا پھلکا راگ شروع کرتا ہے اور اسے پورے ٹھاٹھ کے ساتھ گاتا ہے)

آج جیا گھبرائے
کاہے چین نہیں پالے
آج جیا گھبرائے
جی ہے کہ امڈ آئے
رم جھم برسے نین کی بدری
کاہے چیں نہیں پائے
آج جیا گھبرائے

ارجمند: کنیز۔ ان سے کہو ہمیں گانا پسند آیا۔ موتیوں کا یہ ہار ہماری طرف سے انعام دو۔

یوسفی: غلام اس عزت افزائی کا مستحق نہیں۔ حضور کی ذرہ پروری ہے۔

ارجمند: ٹھہرو کنیز۔ ہم یہ ہار یوسفی خان کو اپنے ہاتھ سے عنایت کریں گے۔

میر صاحب: یہ گویا یوسفی خان کی تباہی کی پہلی منزل تھی۔ حرم سرا کے مخملیں پردے سے وہ صندلی ہاتھ باہر نکلا یوسفی خان نے بڑے ادب سے ہار قبول کیا لیکن اس ادائے خاص کو زندگی بھر بھلا نہ سکا۔ ان پتلی پتلی انگلیوں نے اسے نہ جانے کیوں یکا یک پاگل کر دیا۔ وہ روز جاتا تھا اور گانا سناتا اور اس طرح مخملیں پردے کے پیچھے سے وہ ہاتھ باہر آتا اور اسے انعام میں کچھ نہ کچھ دیا جاتا۔ یہ تحفے اس کے لیے بے حقیقت تھے۔ کبھی وہ انھیں محل سرا سے نکلتے ہوئے کسی چوبدار کو بخش دیتا، کبھی آ کر اپنی بیوی کو دے دیتا لیکن وہ ایک لمحہ جب

ارجمند بانو کا ہاتھ پردے سے باہر آتا تھا اس کے لیے بڑا قیمتی تھا ایسا ہی ایک دن تھا۔

(ستار چھیڑتا ہے)

ارجمند: گاؤ یوسفی خان۔ گاؤ۔ مگر آج کے گانے کے لیے ایک شرط ہے۔

یوسفی: مجھے منظور ہے۔

ارجمند: تم نے شرط سنے بغیر ہی منظور کر لی۔

یوسفی: شرطیں سن کر تو سب ہی منظور کرتے ہیں۔ یوسفی خان کا جی چاہتا ہے کہ سرکار کی شرط بغیر سنے ہی منظور کرے۔

ارجمند: شرط یہ ہے کہ آج تمھارے راگ سے بادل گھر آئیں اور پانی برسنے لگے۔ اودھ کال سے تڑپ رہا ہے، کیا تمھارا راگ سوکھی کھیتی بھی ہری نہیں کر سکتا۔

یوسفی: ابھی نہیں بیگم صاحبہ۔ آپ کے غلام کو ابھی صرف اپنے ایسے انسانوں ہی کو رلانے اور ہنسا دینے ان کے دلوں میں آگ بھڑکانے اور آنکھوں میں آنسو لانے قدرت ہے۔
ابھی آسمان اور زمین میری زد سے باہر ہیں۔
ابھی میرا فن ادھورا ہے۔ سرکار

ارجمند: تو یہ کس طرح پورا ہوگا یوسفی خان۔

یوسفی: مجھے معلوم نہیں۔

ارجمند: جانے دو۔ ہم اپنی شرط واپس لیتے ہیں تم ہماری پسند کا راگ گاؤ، شرط یہ ہے کہ ہم اپنی پسند نہ بتائیں گے۔

یوسفی: (راگ شروع کرتا ہے)

ارجمند: بہت خوب۔ یوسفی خان بہت خوب، تمھاری آواز میں جادو ہے۔ یہ لو آج ہم تمھیں یہ قیمتی انگوٹھی نذر کرتے ہیں۔

یوسفی: مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجائے تو آج میں اپنا انعام خود ہی مانگ لوں۔

ارجمند: اجازت ہے۔

یوسفی: مکمل وعدہ چاہتا ہوں کہ میرا انعام مجھے ضرور ملے گا۔

ارجمند: ہم وعدہ کرتے ہیں۔

یوسفی: سرکار عالی کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

(ساز کے تار ایک دم جھنجھنا کر ٹوٹ جائیں)

ارجمند: (چیخ کر) یوسفی خان۔

یوسفی: مجھے معاف فرمایئے گا سرکار۔ میں اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے اجازت دیجیے۔

ارجمند: ٹھہرو۔ تم ہمارے محسن ہو یوسفی خان، تم نے ہمارے مرحوم ابا جان کی خدمت کی ہے۔ مگر تم ہماری عنایت کو غلط سمجھ رہے ہو، تم نے اچھا نہیں کیا یوسفی خان۔

یوسفی: مجھے اپنی خطاواری کا اقرار ہے سرکار۔

ارجمند: جاؤ، ہم تم سے ایک بار ضرور ملیں گے۔ آج سے آٹھ دن بعد راجہ جھاؤ لال کے ہاں تقریب ہے۔ اس وقت تک کے لیے الوداع۔

(سین کی تبدیلی)

میر صاحب: اور جب وہ گھر پہنچا تو بیوی نہ جانے کب سے راہ تک رہی تھی۔

یوسفی: آج کون سا دن ہے بیگم۔

بیگم: آج پھر اداس ہو۔ کیا ہوا ہے تمھیں آج اس نے کچھ اور انعام دیا ہے۔

یوسفی: ہاں یہ ہیرے کی انگوٹھی۔

بیگم: لاؤ مجھے دو۔ میں پہنے لیتی ہوں۔

یوسفی: نہیں اسے کوئی نہیں پہنے گا۔ اسے کوئی نہیں پہنے گا۔

(ستار بجانے کی مدھم آواز ختم ہوتی ہے)

جمال: یوسفی۔

(یوسفی کوئی جواب نہیں دیتا)

جمال: اوہ تم آ گئے بیٹا۔ کیا آج سب کچھ کھو آئے ہو۔

بیگم: نہیں ابا۔ یہ تو ہیرے کی انگوٹھی انعام میں لائے ہیں۔

جمال: ہیرے کی انگوٹھیاں۔ ہیرا بھی ایک پتھر ہی ہے ان کے پاس پتھروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ دربار والے تمھارے خونِ جگر سے سینچے ہوئے سنگیت کے بدلے میں پتھروں کے سوا اور دے ہی کیا سکتے ہیں۔ بیٹا یوسفی یہ ایک دن تیرے دل کا مول بھی انہی پتھروں کے بدلے کریں گے۔ تجھے اور تیرے سنگیت کو انھیں پتھروں میں دفن کر کے اس پر اپنی عظمت کا ستون بنائیں گے یوسفی (زور سے) یوسفی۔

یوسفی: (رو کر) چچا جان۔

جمال: آ میرے سینے سے لگ جا بیٹے۔ چل آ میں تجھے نیا راگ سکھاؤں۔

میر صاحب: یوسفی خان اسی دن سے تقریباً گوشہ نشیں ہو گیا، سنتے ہیں کہ اس کے حجرہ کے دروازے اس دن سے بند ہوا تو پھر تین تین دن چار چار دن نہ کھلتا تھا نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ ہاں البتہ اکتارہ بر اس کی دکھ بھری آواز کچھ نہ کچھ گاتی ضرور سنائی دیتی تھی۔ یہ رات گئے تک اس کی الاپ جاری رہتی۔ ہفتے بھر تک اس کا یہی عالم رہا، چوبیس گھنٹے وہ سنگیت میں کھویا رہتا تھا۔

آخر وہ دن آ گیا۔ شادیانے بجنے لگے۔ بازاروں میں چہل پہل تھی ہر گلی کوچہ سجا ہوا تھا، لوگ جلوس کا انتظار کر رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں چوراہوں پر تماشے دیکھنے جمع ہو گئی تھیں۔ بازار دلہن کی طرح سجائے گئے تھے۔ غریب غربا میں خیرات بانٹی جا رہی تھی، ہر کوئی خوش تھا، ہر ایک کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ نواب آصف الدولہ کے حکم سے جشن عام منایا جا رہا تھا، رنگ رلیاں ہو رہی تھیں اور لکھنو میں ہر طرف رقص و موسیقی کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ دیوان خاص میں بھی محفل سجی ہوئی تھی۔ بیگمات نذر گزار چکی تھیں۔ راجہ جھاؤ لال وزیر اعظم اور دو چار بے حد خاص درباری ابھی تک موجود تھے۔

(ناچ رنگ کا شغل جاری تھا۔ گانے کا آخری حصہ سنائی دیتا ہے۔)

پھول گیندوا نہ مارو لاگے کرجوا میں چوٹ

پھول گیندوا نہ مارو..........

آصف الدولہ: بہت خوب، یہ بازو بند تمہارا ہے جھاؤلال۔

جھاؤلال: جہاں پناہ۔

آصف الدولہ: ارجمند بیگم نے نذر دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ نذر میں یوسفی خاں کا گانا بھی پیش کرنا چاہتی ہے کیا وہ واقعی اس قدر اچھا گاتا ہے۔

جھاؤلال: طلب کیا جائے؟

آصف الدولہ: اجازت ہے۔

(تھوڑا سا وقفہ)

چوبدار: نگاہ روبرو۔ باادب حضرت نواب وزیر سلامت۔

آصف الدولہ: یوسفی خان۔ آؤ ساز چھیڑو۔

(ساز چھیڑتا ہے)

آصف الدولہ: راجہ جھاؤلال سنتے ہیں، ہر غم میں تین چوتھائی مسرت ہے اور ہر مسرت میں تین چوتھائی غم، کتنی سچی ہے۔ یہ بات بھی آصف الدولہ اپنے کو فریب دیتا ہے۔ عوام کو جھوٹی خوشی بخشتا ہے۔ جشن راگ رنگ کے ہنگامے برپا کرتا ہے اور جب یہ ہنگامے سرد ہو جاتے ہیں تو اس کا دل اس سے کہتا ہے" آصف الدولہ تم کتنے مجبور"

جھاؤلال: حضور اس وقت اداس نہ ہوں۔

آصف الدولہ: یوسفی خان ہم بہت ہنس چکے۔ بہت خوش ہو چکے آج ہمیں کوئی ایسا گیت سناؤ کہ ہم جی بھر کر رو سکیں۔ (آواز اور بلند ہوتی ہے) تم جو مانگو گے ہم تمھیں دیں گے۔

(ساز اور بلند آواز میں چھیڑتا ہے)

(وقت کا راگ)

آصف الدولہ: یوسفی خان۔ بس کر، بس کر، یہ راگ پرانی یادوں کے زخم جگاتا ہے۔ ہم سے آنسو ضبط نہیں ہوتے ظالم۔ خدارا بس کر— تیرا فن سچا ہے یوسفی۔ بول کیا مانگتا ہے آج تو ہم سے ہماری سلطنت بھی مانگے تو تجھے بخش دیں گے۔

یوسفی: مجھے کچھ نہیں چاہئے عالم پناہ۔

جھاؤلال: یوسفی خان۔

آصف الدولہ: یوسفی خان آج اس دربار سے خالی ہاتھ نہیں جائے گا۔ تو جو مانگے گا تجھے ملے گا۔

یوسفی: مجھے معلوم ہے جہاں پناہ کہ آصف الدولہ سخی کے دربار سے کوئی مایوس نہیں جاتا۔ شاید میں پہلا آدمی ہوں گا جو یہاں سے محروم جائے گا۔

آصف الدولہ: ہماری سخاوت کو جوش میں نہ لاؤ۔ کچھ بھی مانگ ہمارے خزانے کے سب سے بیش قیمت ہیرے ہمارے دربار کا سب سے قیمتی موتی۔ ہمارا تخت وتاج۔ ہماری سلطنت ہماری زندگی۔ کچھ بھی مانگ لے اور آصف الدولہ کی سخاوت پیچھے قدم نہ ہٹائے گی۔ بول یوسفی، کیا مانگتا ہے۔

یوسفی: گستاخی معاف کی جائے، تخلیہ چاہتا ہوں۔

آصف الدولہ: ارجمند کہاں ہے اور جمند میری بچی۔ تمھیں نہیں معلوم یوسفی۔ انگریزوں کے حکم سے ارجمند کو اودھ سے باہر نکال دیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے ارجمند کمپنی کے دشمن نواب ثریا بخت کی لڑکی ہے، اب وہ جھاؤلال کو ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں، تم آصف الدولہ سے ایسی چیز کیوں مانگتے ہو جسے وہ خود بھی نہ دے سکے۔

یوسفی: نواب ارجمند بیگم کو اودھ سے نکال دیا گیا۔ کہاں بھیجی گئی ہیں وہ۔

آصف الدولہ: کوئی نہیں جانتا۔ جاؤ یوسفی جاؤ۔ ہمیں ہماری مجبوریاں اب اور زیادہ یاد نہ دلاؤ۔ آصف الدولہ مجبور ہے۔ وہ مجبور اور تہی دست انسان تمھیں کیا دے سکے گا۔ تمھارے لیے ہمارا دامن خالی ہے جاؤ۔ چلے جاؤ۔

میر صاحب: یوسفی خان بھاری قدموں سے واپس لوٹا۔ دیوانوں کی طرح وہ بھٹکتا پھرا عرصے تک لوگ اسے ایک محل سے دوسرے محل تک ایک شہر پناہ سے دوسری شہر پناہ تک بھٹکتا پھرتے دیکھتے اس کے بعد وہ غائب ہو گیا، کسی کو خبر نہیں تھی وہ کہاں گیا ہے شاید جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ شاید دوسرے شہروں میں وہ ارجمند بیگم کو تلاش کر رہا تھا، گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی، بیوی کا روتے روتے برا حال تھا۔

بیوی: (سسکیاں بھرتے ہوئے) ان کا کچھ پتا چلا بابا۔

جمال: اب اس کا پتا چاہتی ہو بیٹی اب بوڑھا جمال خاں چراغ لے کر ساری دنیا بھی چھان مارے تو بھی یوسفی خان کو نہ پا سکے گا۔

بیوی: کیا ہوا ہے انھیں بابا۔

جمال: نہیں کچھ نہیں ہوا سے، اسے تم نے دربار کی تذر کر دیا میری بچی، پتھر اور انسان کون سی چیز ان میں قیمتی ہے۔ تم نے دربار کے پتھر چن لیے اور انسان کو کھو دیا۔ اب روتی ہو کیوں، روتی ہو تم۔

بیوی: جلے پر نمک نہ چھڑکو بابا۔ میں یوں ہی بہت دکھی ہوں۔

جمال: کیوں دکھی ہو تم۔ ہر مہینے ہرکارہ تمھارے لیے روپیہ تو دربار سے لایا کرے گا، تمھیں ان ٹھیکروں ہی کی ضرورت تھی نا (روپیہ پھینکتا ہے) یہ لو یہ روپیہ۔ چن لو ان ہی چند سکوں پر تم نے سنگیت کو نچھاور کیا تھا، کاش یوسفی آ جاتا تو اب میں اسے تم لوگوں کی آنکھوں سے چھپا کر رکھتا۔

بیوی: بابا آج آصف الدولہ بہادر کا جلوس نکلنے والا ہے۔ تم ذرا وہاں جا کر ان کا پتا لگا لیتے۔ شاید کچھ خبر ملے۔

جمال: جاؤں گا۔ وہاں بھی جاؤں گا۔

(آصف الدولہ کے جلوس کی فضا موسیقی سے قائم کی جائے)

پہلی آواز: ٹھیک سے صف باندھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ اب آصف الدولہ بہار کا جلوس گذرنے والا ہے۔

دوسری آواز: بازار دیکھو کیسا سجا ہوا ہے دلہن کی طرح۔

تیسری آواز: عطر کی خوشبو ہر طرف مہک رہی ہے بس اب جلوس آنے والا ہے۔

چوبدار: باادب باملاحظہ ہوشیار۔
وزیر ممالک نواب آصف الدولہ بہادر کی سواری آتی ہے۔
نگاہ روبرو نگہدار ہوشیار۔
باادب ہوشیار۔

(گھنٹوں کی آواز آہستہ چلتے ہوئے ہاتھیوں کے آنے کا اثر پیدا کرتی ہے)

آصف الدولہ: جھاؤلال۔ یہ کیا سب لوگ ہماری مجبوریاں جانتے ہوئے ہم سے پیار کرتے ہیں۔

جھاؤلال: آپ کی رعایا کے دل میں حضور سے بے پناہ عقیدت ہے کس ذوق شوق سے یہ لوگ

آپ کی زیارت کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

یوسفی خان: گوری سووے سیج پر ڈارے مکھ پر کیس

خسرو گھر چل اپنے سانجھ ہوئی چو دیس

آصف الدولہ: یہ کون آدمی ہے جو اس طرح ہمارے جلوس سے بے خبر راستے گذر رہا ہے۔

جھاؤلال: کوئی دیوانہ ہوگا۔ سپاہی اسے پکڑ کر صف میں لا کھڑا کر رہے ہیں۔

آصف الدولہ: اسے طلب کیا جائے۔

جھاؤلال: اس راہ گیر کو طلب کرو۔

(وقفہ)

یوسفی: (آواز قریب آجاتی ہے) سانجھ ہوئی چو دیس۔

آصف الدولہ: (حیرت سے) یوسفی خاں، تم۔

یوسفی خاں: (پاگلوں کی طرح ہنستا ہے)

آصف الدولہ: (محبت سے) یوسفی خاں، تم ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے۔

یوسفی: گانا۔ ہاں ضرور سناؤں گا آپ کو (افسوس کے ساتھ) مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم۔

درباری: (دو ایک ہنستے ہیں)

آصف الدولہ: (غصہ سے) خاموش۔

(محبت سے) یوسفی خان تو چلو دربار چلو۔ ہمیں گانا سناؤ۔

یوسفی: ہاں ہاں ضرور چلو، مگر ایک شرط ہے استاد۔

آصف الدولہ: کہو۔ کیا بات ہے۔

یوسفی: پوریاں اور بالائی کھلانا پڑے گی (عجب حسرت سے) میں نے بہت دن سے نہیں کھائی ہیں۔

آصف الدولہ: منظور ہے۔

میر صاحب: دربار میں پہنچے، گانے کی محفل جمی۔

یوسفی: میں ایسے نہیں گاؤں گا۔ پہلے بالائی اور پوریاں دو (روتا ہے) نہیں تو بالکل نہیں گاؤں گا۔

آصف الدولہ: بالائی اور پوریاں ابھی آ رہی ہیں تم شروع کرو یوسفی خاں۔

یوسفی خاں: آ گئیں پوریاں۔ اب ٹھیک ہے پہلے ایک چوبدار کے ہاتھ یہ شکر کی پڑیا اور بالائی میری ارجمند بیگم کو بھجوا دیجئے گا۔ پھر میں گاؤں گا۔

آصف الدولہ: ضرور پہلے تم کھالو۔

یوسفی: تب ٹھیک ہے۔ یہ بالائی اچھی ہے کہاں سے منگوائی ہے، لاؤ مجھے ساز دو، میں گاؤں گا۔

(اپنی پسند کا راگ شروع کرتا ہے)

آصف الدولہ: ہم خوش ہیں، ہم تم سے بہت خوش ہیں، یوسفی خان آج سے ہم تمھیں درباری گویا بناتے ہیں اور خلعت و دستار اور خطاب عنایت فرماتے ہیں۔

یوسفی: (چیخ کر) نہیں نہیں نہیں، درباری گویا۔ نہیں مجھے سونے کی زنجیروں میں مت باندھو۔ راگ اور کلا کو تم کسی قسم کی زنجیروں میں نہیں باندھ سکتے۔ مجھے تمھاری خلعت، دستار اور خطاب کی ضرورت نہیں۔

آصف الدولہ: تمھیں یہ مرتبہ قبول نہیں، پھر کیا چاہتے ہو تم کچھ اور مانگنا چاہتے ہو۔

یوسفی: نہیں۔ تم مجھے کیا دے سکتے ہو، کچھ نہیں، کیا تم اجڑے ہوئے چمن میں پھول کھلا سکتے ہو، کیا تم خزاں کو بہار میں بدلنے کی قدرت رکھتے ہو، کیا تم مجھے میرے دل کا سکون واپس دلا سکتے ہو— بولو، چپ کیوں ہو گئے۔

آصف الدولہ: یوسفی ہم تمھارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، کچھ کہو تو تم چاہتے کیا ہو۔

یوسفی: ہاں میری ایک خواہش ہے۔ مجھے پھر کبھی دربار میں نہ بلایا جائے۔ بولو وعدہ کرتے ہو (زور سے) مجھے لوہے کی زنجیروں میں باندھ دو، میں سونے کی زنجیریں نہیں پہنوں گا۔

(پاگلوں کی طرح ہنستا ہے)

(فیڈ آؤٹ)

☆☆☆

نظیر اکبر آبادی

(فقیر چمٹا بجا کر گاتا ہے)

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب کوچ نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

فقیر نظیر کی دنیا میں چلو گے؟ نظیر اکبر آبادی کی دنیا میں چلتے ہو تو پھر میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ میں تخیل کا درویش ہوں تمھارے لیے نظیر کی روح کو پھر بلاؤں گا۔ اس کی البیلی دنیا کو ایک بار پھر سے زندہ کروں گا۔ روحوں سے ملاقات میرے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ وہ دیکھو اس دنیا کا دروازہ کھلا۔

(ایک بڑے پھاٹک کے آہستہ آہستہ کھلنے کی آواز)

دہلی ۱۷۵۷ء میں نادر شاہ اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملے سے تاراج دہلی بے اطمینانی اور ہلچل کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ نظیر کا خاندان اسی دہلی میں زندگی گذار رہا تھا۔

ماں: بیٹا ولی محمد، بیٹا ولی، کہو بیٹا کوئی سبیل نکلی؟

نظیر: نہیں امی جان، آج بھی سارے شہر میں مارا مارا پھرا ہوں مگر کوئی صورت نہیں نکلتی۔ (پریشان ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

ماں: تمہارے ابا جان اس جہاں سے کیا اٹھے کہ ہم لوگوں پر افتاد ٹوٹ پڑی بس اللہ ہی پر بھروسہ ہے۔

نظیر: نانی اماں کیسی ہیں؟

ماں: اندر دالان میں پڑی ہیں، طبیعت اور خراب ہوتی جا رہی ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ اس

پریشانی کے عالم میں کس کا دامن پکڑوں۔ بس اس نیلی چھت والے کا سہارا ہے۔

نظیر: آج شام کو پھر جاؤں گا۔ گلی قاسم جان میرے ایک ملنے والے ہیں۔ انھوں کچھ امید دلائی ہے۔

ماں: خدا اس لائے اب اور مجھ دکھیاری کے پاس رہ کیا گیا ہے۔ اوپر خدا کا بھروسہ ہے نیچے تیری طرف دیکھ کر جی ٹھنڈا کر لیتی ہوں۔ تجھے کیا خبر کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر تجھے پالا ہے۔ آج تیرے ابا جان زندہ ہوتے تو کہیں تجھے اس طرح باہر نکلنے دیتے۔ کیا اس طرح دلی میں تجھے ٹھوکریں کھانا پڑتیں؟

نظیر: پرسوں چاندنی چوک میں ان کے ایک پرانے شناسا ملے تھے، نہ جانے کیسے پہچان لیا بس مجھے دیر تک دلاسا دیتے رہے۔ ہم بھی یہ سوچ کر دل ٹھنڈا کر لیتے ہیں کہ ہماری ماں کوئی ایسی ویسی نہیں، نواب سلطان خان آگرہ کے قلعہ دار کی بیٹی ہیں اور ہمارے ابا جان محمد فاروق عظیم آباد کے مشہور نواب کے ہاں ملازم تھے۔

ماں: ہم دونوں نے کن کن منتوں سے پالا ہے۔ بارہ اولادوں کے بعد تو تیری صورت دیکھی تھی اور سبھی بچپنے میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں، دور پار شیطان کے کان بہرے ایک تیرا دم تھا اور وہ بھی تیرے ابا جان گوندنی کے تکیہ والے شاہ صاحب کے پاس گئے تھے، ان کی دعا اللہ میاں نے سن لی تو تیری صورت دیکھی۔

نظیر: اس لیے تو منت کے مارے ناک اور کان چھید چھید کر میری صورت لڑکیوں کی سی بنادی۔

ماں: چل ہٹ۔ اللہ آمین کر کے تو پالا ہے تجھے۔ یہ مولا علی ہی کی برکت تھی کہ تیری جان بچی۔

نظیر: بس رہنے دو۔ بچپن میں مکتب سے کئی دفعہ مجھے اسی وجہ سے بھاگنا پڑتا تھا کہ لڑکے میرے چھدے ہوئے ناک اور کان کا مذاق اڑاتے تھے۔

ماں: (ہنس کر) لے اور سن۔ اچھا اب جا نانی اماں کے پاس ہو لے، کب سے وہ تیری راہ تک رہی ہیں۔

نظیر: نانی اماں کو سلام کرنے تو جاتا ہوں مگر آج مجھے ذرا نظام الدین میں جانا ہے۔ ذرا جلدی

ہی کھانا مل جاتا تو اچھا تھا۔

ماں: کھانا کیا آج کھچڑی پکائی ہے۔

نظیر: تب تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس ایک آدھ سیر کھچڑی دور کابیوں میں نکال دو اور لیموں کا اچار ساتھ رکھ دینا، میں ابھی آیا۔

(وقفہ)

نظیر: واہ واہ، خوب کھچڑی ہے۔ آج ہمارا دوست میرزا بھی آ جاتا تو اسے بھی کھلاتے۔ بس اب آتا ہی ہوگا۔

ماں: مگر بیٹا دلی، کھچڑی بھی اب میسر ہوتی نظر نہیں آتی۔

نظیر: امی تم جی تھوڑا مت کرو۔ آج جاؤں گا کوئی نہ کوئی بات تو بنے گی۔

ماں: اور نہ بنی تو پھر دلی چھوڑنا ہی پڑے گی۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے دیس آگرے ہی چل کر رہا جائے۔ ہر کسی کا منہ تو نہ دیکھنا پڑے گا۔

نظیر: دہلی چھوڑ دو گی کیا؟

(پیانو کا اونچا سُر)

ماں: اور چارہ ہی کیا ہے؟ پھر دہلی میں ہمارا ہے ہی کون۔

نظیر: ہاں یوں تو کوئی خاص رشتے دار نہیں مگر یہ آٹھوں کا میلہ، یہ پھول والوں کی سیر، یہ نظام الدین صاحب کے عرس کی رونق آگرے میں کہاں ہوگی۔

ماں: جہاں آدمی رہتا ہے وہیں جشن منا لیتا ہے۔ آگرے میں بھی تو آدمی ہی بستے ہیں۔ تو آج نظام الدین صاحب جائے گا اپنے شاہ صاحب سے ذرا اجازت لینا۔

نظیر: مولانا فخر الدین صاحب دہلوی سے؟

ماں: ہاں دیکھو تو کیا کہتے ہیں؟

نظیر: آج ضرور ذکر کروں گا۔ اچھا امی بس اب کھا چکا کھانا بڑھاؤ، یہ کم بخت میرزا ابھی تک نہیں آیا، میں تو اب نظام الدین جا رہا ہوں۔ آئے تو وہیں بھیج دینا۔

(وقفہ)

قوالی شروع ہو چکی ہے۔

قوالی گائی جا رہی ہے۔ ''آج تو جوگن آئی نظام الدین پیا کے دوارے''

نظیر: مولانا صاحب، مولانا صاحب۔

مولانا: ولی محمد کیا ہے؟ بیٹا!

نظیر: میں دہلی سے جا رہا ہوں مولانا صاحب۔ آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔

مولانا: مجھ سے اجازت لیتے ہو؟ نظام الدین اولیا سے پوچھو۔ ساری دلی تمھارے سامنے ہے، تم اس سے اجازت لو۔

نظیر: چاہتا ہوں کہ چلتے وقت کوئی نصیحت کا کلمہ فرما دیجئے کہ ساری عمر اس پر عمل کر سکوں۔

مولانا: بیٹا، خدا سے ڈرتے رہنا اور اس کے بندوں سے پیار کرنا۔ خدا حافظ۔

(قوالی کی آواز پھر پس منظر سے بلند ہوتی ہے) ۔۔۔بیچ میں۔

''آج تو جوگن آئی نظام الدین پیا کے دوارے''

آج تو جوگن آئی..........

نریٹر: آگرہ پہنچ کر نظیر نے مٹھائی کے پل کے پاس نوری دروازے میں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد ان کی شادی عبدالرحمٰن خان چغتائی کی نواسی تہورالنسا بیگم سے ہوگئی جو دہلی سے آکر آگرہ میں بس گئے تھے، وہیں ان کی روزی کا سلسلہ لگا۔ یہیں ان کی شاعری نے جنم لیا۔

نظیر: (گنگناتے ہوئے)

عشق پھر وہ رنگ وہ لایا ہے کہ جی جانے ہے

دل کا یہ رنگ بنایا ہے کہ جی جانے ہے

سمجھے میاں قطب الدین غزل کے پانچ شعر تو ہو گئے، مگر مشاعرہ کے لیے غزل کہنے میں مزا نہیں آتا ہے۔

میاں قطب الدین: استاد، مشاعرے میں تو سب لوگ آپ کے کلام کے مشتاق رہتے ہیں۔

نظیر: نہیں میاں قطب الدین، وہاں لوگ قافیے ردیف اور رعایت لفظی میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ شعر کی مستی پر نظر نہیں کرتے۔ میرے شعر کی مستی تو انہی لوگوں میں نکھرتی ہے جو

اسے تقاضے کر کے لکھواتے ہیں۔

میاں قطب الدین: لوگ تو مشاعروں کی داد کو ترستے ہیں اور آپ کی سیری اس داد سے نہیں ہوتی۔

نظیر: میاں قطب الدین، ایمان کی تو یہ ہے کہ میں ہنسوڑ کھیل تماشوں کا رسیا عالموں فاضلوں کی صحبت میں مجھے مزا نہیں آتا۔ ادھر شعر پڑھا ادھر وہ تقطیع لے دوڑے، مزا جب آتا ہے کہ ادھر شعر زبان سے نکلا اور ادھر سارا شہر جھوم گیا۔

میاں قطب الدین: آپ کی غزلیں تو آگرے کا بچہ بچہ گاتا ہے۔

نظیر: کیوں نہ گائیں۔ انھوں نے ہی تو لکھوائی بھی ہیں۔ اب کل ہی کی بات سنو، کل تاج گنج سے چلا، میرے ملازم ایاز نے گھوڑی کس لی تھی بس بازار تک سوار ہو کر پہنچا ہوں گا کہ لوگوں نے گھیر لیا۔ کہنے لگے ہولی آ رہی ہے ایک ہولی لکھ کر دیجیے، ایک پرندے بیچنے والا سر ہو گیا کہ اس کے طوطے پر کچھ لکھوں۔ میں نے دو چار بند کہہ کر دے دیے، اب گاتا پھرے گا۔

میاں قطب الدین: ہولی کے کچھ بند یاد ہوں تو عنایت فرمایئے۔

نظیر: اب اس وقت میں کچھ نہ سناؤں گا۔ یہ میاں نذرو قوال غزل لینے آئے تھے۔ اب انھیں سے سنو، سر ہو رہے تھے کہ ان کے لیے کچھ لکھ دوں۔ ایک غزل لکھ کر دی ہے۔ ہاں بھئی تم تال سر ہی درست کرتے رہو گے کہ سناؤ گے بھی، اب شروع کرو۔

قوالی:

جاں بھی بجاں ہے، ہجر میں اور ہے دلفگار بھی
تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب بھی اور کنار بھی

(نذرا اور ساتھی پوری غزل گاتے ہیں)

میاں قطب الدین: سبحان اللہ، بہت خوب کیا مرصع کلام ہے۔

نظیر: بھئی نذرو، تم نے واقعی حق ادا کر دیا، میاں قطب الدین آج یہ لڑکے کہاں رہ گئے؟

قطب الدین: وہ آپ کے شاگرد راجہ بلاس رائے کے لڑکے؟

نظیر: اتنی دیر سے انھیں کا انتظار کر رہا ہوں۔ پتا نہیں آج آپ ہی آپ ان لڑکوں نے چھٹی

منالی۔

لڑکوں کی آواز: آداب بجالاتے ہیں!

نظیر: آؤ بیٹے آو۔آج فقط تین ہی بھائی آئے ہو؟ یہ بنسی دھر اور شنکر داس کو کہاں چھوڑ آئے؟

پہلا لڑکا: کل ہولی ہے وہ لوگ تہوار کی تیار میں لگے ہوئے ہیں۔

نظیر: مول چند تو ہمیشہ اپنے دوسرے بھائی کی بات بنانے میں لگا رہتا ہے۔ارے بابا، ہولی تو کل سے شروع ہوگی آج ہی سے یہ دونوں کام چور چھٹی منانے لگے۔

لڑکا: پتا جی نے یہ آم خربوزے آپ کے واسطے بھیجے ہیں۔

نظیر: اچھا ایاز کو دے دو، اس کے کہہ دینا حقہ بھرلائے اور تم لوگ کتاب کھولو اور کل کا آموختہ پڑھو۔

لڑکا: بہت اچھا۔مگر ایک بات اور عرض کرتا ہے بنسی دھر اور شنکر داس نے چھٹی مانگی تھی اور کہا تھا——

نظیر: کیا کہا تھا؟

لڑکا: انھوں نے کہا تھا——

نظیر: ارے بولے گا یا نہیں، کیا کہا تھا؟

لڑکا: آپ نے ہم لوگوں کے کہنے سے بسنت لکھ کر دیا تھا اب کے وہ دونوں ایک ہولی کی فرمائش کر رہے تھے۔

نظیر: (ہنس کر) دیکھا میاں قطب الدین، ان بدمعاشوں کی باتیں۔میرے شاگرد نہیں، استاد ہیں استاد، ان سے کہہ دینا ہولی کل آگرہ بازار میں سنیں۔

لڑکا: ان دونوں نے کہا تھا لکھوا کر لانا۔

نظیر: اچھا۔اچھا۔لکھ لینا۔اب تم سبق پڑھو۔

لڑکا: بہت اچھا۔

پڑھتے ہیں۔

”یکے از وزرا معزول شدہ بخلقہٗ درویشاں در آمد و برکت صحبت ایشاں دروے سرایت

کرو۔ جمعیت خاطرش دست داد۔ ملکِ بار دگر باا ور دل خوش کرو، قبولش نیامد وگفت۔ معزولی بہ کہ مشغولی''۔

نظیر: پڑھ تو لیا ٹھیک ۔اس کا مطلب بھی سمجھ گیا۔

لڑکا: جی ہاں۔

نظیر: کیا مطلب ہوا بھلا۔

لڑکا: ایک وزیر جب وزارت سے معزول ہوا تو فقیر ہو گیا اور فقیروں کی صحبت سے درویشی کی برکت اس کو نصیب ہوئی اور اس کو سکون قلب ملا۔ بادشاہ اتفاق سے اس سے پھر راضی ہو گیا اور چاہا کہ پھر اسے وزیر بنائے مگر اس نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ معزولی میرے لیے نوکری سے بہتر ہے۔

نظیر: مول چند رائے تو واقعی دل لگا کر پڑھ رہا ہے۔ یہ من سکھ اور گور بخش ذرا پیچھے رہے جا رہے ہیں۔ خیر ان کا سبق ابھی سنتا ہوں۔ دیکھا میاں قطب الدین تم نے کیسا فر فر پڑھتا ہے۔

قطب الدین: ماشاء اللہ۔

نظیر: اچھا ئی مول چند، تم نے گلستاں کی حکایت تو پڑھ لی مگر شیخ سعدی کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

لڑکا: کس سوال کا جواب؟

نظیر: معزولی بہتر ہے کہ نوکری اور وہ بھی وزارت کی نوکری، تم کیا بنو گے، وزیر بنو گے کہ درویش؟

لڑکا: میں تو استاد، نہ وزیر بنوں گا نہ درویش۔

نظیر: پھر کیا ارادہ ہے؟

لڑکا: میں تو شاعر بنوں گا استاد۔

نظیر: (ہنستے ہیں) راجہ بلاس رائے سن لیں گے تو بہت پریشان ہوں گے۔ شاعر بنے گا تو فاقوں مرجائے گا۔ ایسے ہی لڑکے پڑھا پڑھا کر گذر بسر کرنی پڑے گی۔

لڑکا: پھر آپ کی طرح ہولی اور بسنت اور برسات کی بہاریں لکھا کروں گا۔

نظیر: اچھا اب سمجھا، تبھی تو میری غزلیں اور ہولی بسنت پر نظمیں اکٹھی کرتا رہا ہے۔ انھیں جمع کر کے اپنے نام سے چھپا لے گا کیا؟

لڑکا: انھیں تو آپ ہی کے نام سے چھپاؤں گا۔

نظیر: (ہنس کر) چھپائے گا؟ اوہو، یہ ارادے ہیں صاحبزادے کے، اچھا ہے۔ ہم بھی یاد کریں گے کہ ہمارے شاگرد نے ہم سے پڑھا ہی نہیں ہم سے کچھ سیکھا بھی۔ اچھا اب آگے پڑھ۔ میاں قطب الدین۔

قطب الدین: جی۔

نظیر: اس لڑکے نے اپنے کچھ بھولے ہوئے شعر یاد دلائے، مزہ یہ ہے کہ میں نے خود اپنے ہی اوپر یہ چند شعر کہے تھے، سچ تو یہ ہے کہ کچھ ان ہی لفظوں میں زمانہ یاد رکھے تو یاد رکھے۔ ورنہ بڑے بڑے بوعلی سینا اور افلاطون گذر گئے کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے۔

قطب الدین: ہاں استاد، شعر سنائیے، میں تو دیر سے اسی انتظار میں بیٹھا تھا کہ آپ ان بچوں کو سبق دے چکیں تو فرمائش کروں۔

نظیر: ہاں بھئی، یہ ہمارا حلیہ ہے۔

کہتے ہیں جس کو نظیر سنئے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلم غریب ، بزدل وترسندہ جاں
فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر
عزت وحرمت کے ساتھ پارچہ وآب ونان
فرد وغزل کے سو اشوق نہ تھا کچھ اسے
اپنے اسی شوق میں رہتا تھا خوش ہر زماں
سُست روشِ ، پستہ قد ، سانولا ، ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق میاں
ماتھے پر اک خال تھا چھوٹا سا مسّے کے طور پر
تھا وہ پڑا آنکھ اور ابروں کے درمیاں

وضع سُبک اس کی تھی تس پہ نہ رکھتا تھا ریش
مونچھیں تھیں اور کانوں پہ پٹے بھی تھے پنبہ سال
پیری میں تھی جس طرح اس کو دل افسردگی
ویسی ہی تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں
لکھنے کی یہ طرز تھی کچھ جو لکھے تھا کتاب
پختگی و خامی کے اس کے تھا خط درمیاں

قطب الدین: شاعرانہ تعلیٰ اور خودستائی تو بہت سنی تھی، لیکن یہ کسر نفسی شعر میں آج ہی سنی ہے۔

نظیر: اچھا میاں قطب الدین میں اب لڑکوں کو پڑھاتا ہوں کل ہولی ہے، اس کی چھٹی رہے گی۔

(سنکھ کی آواز)

(ہولی ہے۔ ہولی ہے۔ شور، تاشے مجیرا اور ڈھول کی آواز)

سب: لو میاں نظیر آ گئے۔ میاں نظیر آ گئے۔ رنگ ڈال آج میاں نظیر کو۔

نظیر: ارے رے رے تم لوگوں نے تو سارا رنگ میرے اوپر ہی خرچ کر دیا۔

سب: ہاں، میاں نظیر، اب ہولی شروع ہو جائے۔

نظیر: ہاں بھئی گاؤ۔ جھانجھ تو رام پرشاہی ٹھیک بجائے گا۔

(سب مل کر گاتے ہیں)

پھر آن کے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمین پر

قطب الدین: استا۔ استاد۔

نظیر: کون؟ قطب الدین کیا بات ہے؟

قطب الدین: شاہِ اودھ کا ایک قاصد آپ کے پاس آیا ہے؟

نظیر: واجد علی شاہ کے دربار سے آیا ہے کوئی؟ اچھا اسے بیٹھاؤ اس کی تو ضع کرو۔ میں تو ہولی کے جشن سے نپٹ کر ہی آؤں گا۔

قطب الدین: اسے کوئی بہت ضروری کام ہے۔

نظیر: ارے جشن اور مستی سے بھی ضروری ہوتا ہے کوئی کام یہی تو ایک کام ہے جو انسان کے اختیار میں ہے باقی تو۔

"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"

قطب الدین: آپ کا ملنا ضروری ہے۔

نظیر: تم چلو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

(وقفہ)

نظیر: لو حقہ پیو۔ میاں قطب الدین تم کس سوچ میں پڑے، میں آگرہ چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔

قطب الدین: نہیں استاد، بہت اچھا موقعہ ہے، شاہ اودھ نے آپ کو طلب فرمایا ہے، بادشاہوں کی نظر عنایت سے مٹی بھی سونا ہو جاتی ہے۔ پھر آپ کے جوہر قابل کے لیے یہ خراج نہایت موزوں ہوگا۔

نظیر: وہ میاں قطب الدین، تم گلستاں کی وہ کہانی اتنی جلدی بھول گئے، ابھی کل ہی تو وہ لڑکا پڑھ رہا تھا۔ معزولی یہ مشغولی، بس وہی میرا فیصلہ ہے۔

قطب الدین: گستاخی معاف! آپ تو خواہ مخواہ ضد کرتے ہیں۔ آخر آگرے میں کون سی ایسی خاص چیز ہے جسے آپ نہیں چھوڑ سکتے۔

نظیر: یہ مستی اور آزادی ہوگی لکھنؤ میں؟

قطب الدین: کیوں نہیں ہوگی اودھ تو مستوں اور آزادوں کا علاقہ مشہور ہے۔ وہاں بھی آخر انسان ہی بستے ہیں۔

نظیر: پھر جیسے آدمی یہاں بستے ہیں، ویسے ہی تو لکھنؤ میں ہوں گے اسی خدا کی خدائی یہاں ہے اسی کی وہاں ہے۔ پھر میں بھلا کیوں در در کی خاک چھانتا پھروں۔

قطب الدین: مگر آپ تو بھول جاتے ہیں۔ آپ یوں ہی تھوڑی جا رہے ہیں۔ آپ بادشاہ کے مہمان ہوں گے۔ آپ یہاں سترہ روپے مہینے پر راجہ بلاس رائے کے لڑکوں کو پڑھاتے ہیں کیا عمر بھر انہی سترہ روپیوں پر پڑے رہیے گا۔ کبھی تو آپ میری بھی مان لیا کیجیے۔

نظیر: اچھا بابا۔ میں تیرا ہی کہا مانتا ہوں۔ جاؤں گا۔ بس دو روز بعد لکھنؤ چلا جاؤں گا۔ مگر دو شرطیں ہیں میاں قطب الدین۔

قطب الدین: سب شرطیں منظور ہیں۔

نظیر: ارے سن تو لو۔ ایک تو سرحد تک تم کو ساتھ پہنچانے چلنا ہوگا اور دوسرے میں آگرے کے حدود ختم ہونے تک اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر جاؤں گا۔

قطب الدین: بہت مناسب۔

(موسیقی کی دھن)

نظیر: چلو، بھئی کوچ کا وقت آپہنچا، ایاز گھوڑی تیار ہے۔

قطب الدین: ایاز نے نہ جانے کب سے گھوڑی کس کر تیار رکھی ہے۔ اب آپ سوار ہو جاتے تو بہتر ہے۔

نظیر: اچھا بھئی بسم اللہ، چلو چلتے ہیں۔

(گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز)

نظیر: دیکھو میاں قطب الدین، تاج محل آج کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔ آج ہم تو اس سے رخصت ہو رہے ہیں، تم ادھر آجاؤ تا کہ یہ میری نظروں کے سامنے رہے۔

قطب الدین: بہت اچھا۔

نظیر: خاصی دور نکل آئے۔ تاج محل دیکھو یہاں سے کتنا چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے۔

قطب الدین: جی ہاں، اب آگرہ کی سرحد تک آپہنچے ہیں۔ یہیں تھوڑی دور پر شاہ اودھ کے ہاں کی سواری آپ کا انتظار کر رہی ہوگی۔

نظیر: (گھبرا کر) تاج محل تو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تمہیں نظر آرہا ہے میاں قطب الدین۔

قطب الدین: جی نہیں، اب تو کافی فاصلہ ہو گیا۔

نظیر: تاج نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نہیں جاؤں گا، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ جہاں تاج میری نظروں سے اوجھل رہے۔

قطب الدین: استاد، وہ لوگ منتظر ہوں گے۔

نظیر: کچھ بھی ہو۔ گھوڑی واپس پھیرو۔ ہم تاج محل کی طرف چلتے ہیں تم کہتے تھے، یہاں میرا ہے ہی کون۔ میں تاج سے کیسے رخصت ہوں گا۔ میں آگرہ کے ان بازاروں سے ان سے محبت والے لوگوں سے کیسے رخصت ہوں گا۔ جو ہر گلی کوچے میں میرے گیت گاتے ہیں۔

(فقیر کے چمٹا بجانے کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ مصرعہ گاتا ہے اور صدا لگاتا ہے)

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

نظیر: سنتے ہو یہ فقیر کیا گاتا ہے۔

(فقیر کی آواز اور زیادہ قریب آجاتی ہے)

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب کوچ نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

☆☆☆

نقشِ فریادی

راوی: تراسی برس پہلے ۱۵ فروری کو غالب نے آخری سانس لی۔ وہی دہلی تھی، وہی قدیم مکان تھا اور وہی مانوس در و دیوار تھے۔ جنھوں نے مرزا کی عظیم زندگی کے تقریباً سبھی اہم موڑ دیکھے تھے۔

غالب: (کمزور آواز میں) دم واپسیں، برسرِ راہ ہے

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے
دم واپسیں، برسرِ راہ ہے

حالی: اب کیسا مزاج ہے میرزا صاحب؟

غالب: ارے میاں حالی، تم ابھی تک بیٹھے ہو؟

حالی: طبیعت اب کیسی ہے؟

غالب: اب حال خود بتانے کے قابل نہیں، خوب یاد آیا، میاں علائی کا خط ایک عرصے سے پڑا ہے۔ اسے جواب لکھ دو۔ کیا معلوم پھر۔ طبیعت سنبھلے نہ سنبھلے، وہ بچارا انتظار کرتا ہوگا۔

حالی: مرزا صاحب، ناامیدی کی باتیں زبان سے نہ نکالیے، طبیعت ٹھیک ہو جائے تو انھیں جواب لکھ بھیجیے گا۔

غالب: نہیں میاں حالی، یہاں چراغ سحری ہیں، نہ جانے کس جھونکے سے بجھ جائے مجھے اب زندگی کا بھروسہ نہیں، لکھو۔

حالی: بہتر —— ابھی لکھے دیتا ہوں۔

غالب: ہاں وہ بچارا اتنی دور بیٹھا ہوا بھی، میر خیریت سے غافل نہیں ہوتا، لکھو "میاں علائی جیتے

رہو"

حالی: (لکھتے ہوئے) جی۔

غالب: "میرا حال ——— مجھ سے ——— پوچھتے ہو"۔

حالی: جی۔

غالب: میرا حال مجھ سے پوچھتے ہو؟ (جی) ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا ——— نہ کرو

ہجر مدارا بمن سرتو سلامت

حالی: (لکھتے ہوئے) سرتو سلامت جی آگے فرمایئے، میرزا صاحب (آواز دیتے ہوئے) میرزا صاحب!

راوی: اور میرزا صاحب پر غشی کا دورا پڑا۔ وہ پھر بیہوش ہو گئے، اس عالم میں ان پر کیا گزری، ان کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کتنی تصویریں اور تصورات کے کتنے خاکے گذرے ہوں گے، اس کا حال کسی کو نہیں معلوم۔ بھولی بسری یادوں کی نہ جانے کتنی دنیائیں ان لمحوں میں ان کے بستر مرگ کے کنارے آباد ہو گئی ہوں گی۔ ان میں ان کے لڑکپن کی یادیں ہوں گی۔

غالب: (نوعمری کے زمانہ میں) چال چلو میاں بنسی دھر!

بنسی دھر: چلتا ہوں چھوٹے میرزا، شطرنج ہے کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔

غالب: اسی لیے آج گھر سے باہر نہ آتے تھے، بار بار دربان کو بلانے بھیجا تب منشی صاحب آئے۔

بنسی دھر: دیکھو چھوٹے میرزا کھیل کا جہاں تک سوال ہے، مجھ سے بازی نہیں لے سکتے۔ ایک شہ دینا نصیب ہو گیا سالہا سال میں تو گویا آپ کو شطرنج کھیلنا آ گئی، چہ خوب! یاد رہے کہ ناظر بنسی دھر کے ساتھ کھیل رہے ہو۔

غالب: قبلہ ناظر صاحب، یہ شہ لیجئے فرزیں تو گیا۔

بنسی دھر: میاں صاحبزادے ہوا بھی، ذرا ٹھہرو، چال ابھی کاٹتا ہوں۔

غالب: ناظر صاحب، دوسری بازی لگا لیجئے، یہ خاکسار چال ہی ایسی چلتا ہے۔

بنسی دھر: چہ خوب! یہ تو کبھی کبھی کھلا دیتا ہوں آپ کو، سمجھتا ہوں کہ پشتوں سے ہمارے اور تمھارے خاندانوں میں راہ ورسم چلی آتی ہے۔ ہمارے دادا عہدِ نجف خان میں تمھارے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خان صاحب کے رفیق تھے اور جب تمھارے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو ہمارے دادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہیں کی، پھر جب سے ہوش سنبھالا ہم تم ساتھ ساتھ ہیں۔ پھر اگر دو چار مات لگا تار پلا دیئے تو تم کہو گے اتنے برسوں کی دوستی کا بھی پاس نہ کیا۔

غالب: (ہنستے ہوئے) واہ ناظر صاحب کیا کہنے ہیں، عمر میں مجھ سے دو ایک برس ہی بڑے یا چھوٹے ہو گے، اور باتیں کرنے میں دادا اور نانا سے کم نوالہ نہیں توڑتے اور شطرنج میں تو بقول شاعر:

رتبہ شاگردی من نیست استادے مرا

بنسی دھر: خیر جی میرزا، یہ بازی تمھیں اٹھا لو۔ مات ہم ہی مانے لیتے ہیں۔ کیا یاد کرو گے کہ ناظر بنسی دھر بھی کیا حاتم تھا۔ اچھا چلو دوسری بازی لگاؤ۔

غالب: نہیں دوسری بازی نہیں، راجہ بلوان سنگھ سے آج پتنگ کے پیچ لڑانا ہیں۔

بنسی دھر: کون راجہ بلوان سنگھ؟ وہی گڈریوں کے کٹڑے والے؟ وہ بھی عمر بھر بچہ رہے گا اور تمھارا بھی وہی حال ہے۔

'چہل سالِ عمرِ عزیزت گذشت'

غالب: (بات کاٹ کر) جی ہاں بس شطرنج کے علاوہ تو سارے کھیل ہی لڑکپن کے ہیں۔ تم بھی ذرا پیچ لڑاؤ۔ آج راجہ بلوان سنگھ سے بازی بدلی ہے۔ چلو کوٹھے پر چلتے ہو؟

بنسی دھر: اماں ہٹاؤ، میں گھر جاتا ہوں، جب فارغ ہو جاؤ تو بلا لینا، گھر ہی کون سا دور ہے۔ بس یہ مچھیا کا گھر ہے اور اس کے آگے دو کٹڑے کہو تو واصل خان کو بھیج دوں۔

غالب: واصل خان، وہی تمھارا پیش دست جو کٹڑوں کا کرایہ اگا کر جمع کرواتا ہے۔ اسے یہاں بھیجو گے تو لوگ سمجھیں گے کہ بڑی حویلی سے بھی کرایہ وصول کرنے آیا ہے۔

بنسی دھر: تم سے کرایہ وصول کریں گے؟ تم کو تو ابھی آٹھ نو مات دینا ہی ہیں۔ آج نوشیرواں نہ

بنایا ہوتو نام نہیں، اچھا اب چلتے ہیں، پتنگ بازی سے جلد ہی فراغت کر لینا، سمجھے؟

غالب: (سرگوشی میں) بنسی دھر، بنسی دھر___!

بنسی دھر: کیوں کیا ہے؟

غالب: ارے ظالم یہ تو خیال ہی نہیں رہا کہ استاد عبدالصمد ہرمزد آج ابھی تک سیر وتفریح کے لیے نہیں گئے ہیں۔ تم نے ادھر پیٹھ پھیری اور ادھر انھوں نے آواز لگائی، عزیزم، عزیزم اور بس پتنگ بازی وغیرہ سب دھری رہ جائے گی، بس ذرا اور بیٹھے رہو۔

بنسی دھر: یعنی استاد ہرمزد سمجھیں کہ آپ میری وجہ سے بیٹھے ہوئے ہیں۔

غالب: بس میں پیچ لڑا کر ابھی آیا۔

بنسی دھر: گویا مجھے کوئی کام تھوڑا ہی ہے۔ میں آپ کے انتظار میں بیٹھا اونگھا کروں گا، جاؤ استاد ہرمزد سے سبق پڑھو۔

'کریما بہ بخشائے بر حالِ ما'

غالب: خیر، سبق یاد کرنے میں میرا کوئی ثانی نہیں۔ پتا ہے استاد عبدالصمد ہرمزد ایرانی ہے اور خالص پارسی نژاد، وہ بھی میری فارسی کے شوق پر فخر کرتا ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ وہ سیر وسیاحت کے شوق میں ایران سے آگرہ آیا اور یہاں دو سال ہوئے ہمارے ہی گھر پر مقیم ہوا، ورنہ کس کو ایسا استاد کامل نصیب ہوتا ہے۔

بنسی دھر: بہت اچھا، بہت خوب، اب آپ جلدی جائیے۔ مجھے دیوان حافظ نکال کر دیتے جائیے، اسے پڑھتا ہوں۔ تم پتنگ بازی سے فراغت کر لو۔ جلدی کرو۔ ورنہ استاد ہرمزد کی طلبی آجائے گی۔

استاد ہرمز: (خالص پارسی لہجے میں، دور سے آواز دیتا ہے) عزیزم، عزیزم___

غالب: می آیم، تیار، می آیم۔

راوی: بچپن کی معصوم اور دلفریب یادوں کی ایک جھلک تصور کے دھندلکوں میں کھوگئی۔ آگرہ کی بڑی حویلی، پتنگ بازی، منشی بنسی دھر کے ساتھ آدھی آدھی رات تک شطرنج کی صحبتیں اور ہرمزد سے درس وتدریس کے سلسلے خواب ہوگئے، جوانی کی پرچھائیاں اپنی ساری رنگینیوں کے ساتھ ذہن پر چھانے لگیں۔ حویلی میں کوئی تقریب تھی۔

ایک عورت: اے بُوا، ڈومنیوں پہ کیا افتاد ہے کہ ابھی تک منہ باندھے بیٹھی ہیں۔

ڈومنی: بیگم صاحب!

بیگم: ہاں، اجازت ہے، شروع کرو۔

ڈومنی: خطا معاف، ہم مردوں کے سامنے نہیں گا سکتے۔

بیگم: توبہ، یہ تو اپنے چھوٹے میرزا ہیں۔ (ہنستی ہیں) چھوٹے میرزا۔

غالب: جی، چچی جان۔

بیگم: لے بیٹے، ذرا باہر جا بیٹھ تو ڈومنیاں گا بجالیں۔

غالب: گایئے گایئے، یہ لیجئے بندہ چلا۔ (آہستہ سے گنگناتے ہوئے)

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

ڈومنیاں: (گانا شروع کرتی ہیں)

عشق برے ہی خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیئے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا، وہ موسم وہ ہنگام گیا
نالۂ میر سواد میں، ہم تک دوشیں شب سے نہیں آیا
شاید شہر سے ظالم کے عاشق وہ بدنام گیا

(گانے کی آواز پس منظر میں تھوڑی دیر جاری رہتی ہے)

غالب: بنسی دھر، آواز سنتے ہو صورت نہیں دیکھی تم نے برق ہے، شعلۂ جوالہ ہے، نظیری کے اس شعر پر آج ایمان لایا ہوں۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

بنسی دھر: تم بھی تو شہر کے حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہو۔ یہ کیا کہ ایک

ستم پیشہ ڈومنی پر دل و جان ہار دو۔

غالب: واللہ ستم پیشہ، خوب کہا۔ مگر سچ کہتا ہوں بنسی دھر اس سے خوبصورت اور اس سے زیادہ خوش وضع عورت میں نے نہیں دیکھی۔

راوی: دوسری تصویر ابھرتی ہے۔ دہلی کی بجی ہوئی محفل میں مرزا اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ علم و ادب کے پرستاروں کا مجمع ان کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

غالب: میں نے وہی غزل کہی تھی جو آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ کوئی دن گر زندگانی اور ہے۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

(لوگ تعریف کرتے جاتے ہیں)

غالب: اب یہی سات شعر کہے ہیں، ابھی ایک مقطع اور دو تین شعر اور نکالنے ہیں۔

غلام علی: سبحان اللہ۔ میرزا صاحب، کیا سادگی و پرکاری ہے۔

میر مہدی: سچ تو یہ ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

حالی: آپ نے کہا تھا۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خان قیامت ہے

غلام علی: قطع کلام ہوتا ہے مولانا حالی۔ وہ تو واقعی قیامت تھا۔ اصلی شاعری اور حسن کلام تو اب نکھرا ہے۔ (قہقہہ)

حالی: لیجئے یہ شاہی چوبدار چلا آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آج پھر قلعہ معلیٰ میں آپ کی طلبی ہوئی ہے۔

غالب: میاں غلام علی تم ذرا اس چوبدار سے پوچھ لو۔ اور اسے انعام دے کر رخصت کرو۔

غلام علی: بہتر۔

غالب: میاں حالی بادشاہ کی غزلوں کی اصلاح سے کبھی کبھی طبیعت عاجز آ جاتی ہے۔ تم جانتے ہو یہ میری افتادِ طبع نہیں۔ مجھے اصلاح سخن کا شوق نہیں۔ طوعاً و کرہاً یہ فرض ادا کرتا ہوں۔ کہو بھئی غلام علی چوبدار کیا فرمان لایا۔

غلام علی: بادشاہ نے بیسنی روٹی بطور اولوش بھیجی ہے اور آپ کو یاد فرمایا ہے۔

غالب: چوبدار کو انعام دلوا دیا۔

غلام علی: جی ہاں۔ وہ بخیر و خوبی رخصت ہوا مگر مرزا صاحب ایک بات سمجھ میں نہ آئی۔ آخر بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے۔

غالب: واہ میاں غلام علی۔ چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں۔ پیستے ہیں۔ بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا کہ مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے ہمارے سامنے سے چلا جا ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھے کھا جائیں۔

غلام علی: بہت خوب، تب تو واقعی یہ نعمت قابل قدر ہے۔ (قہقہہ)

غالب: اسی لیے تو یہ قطعہ بیسنی روٹی کی نذر کر چکا ہوں۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا سے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

اچھا بھئی اب محفل برخاست۔ مجھے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے

راوی: قلعہ معلیٰ، بہادر شاہ کی دہلی جو اپنی آخری بہاروں سے گزر رہی تھی۔ علم وادب کا مرکز بن گئی تھی۔ دہلی کی سیاسی مرکزیت ختم ہونے پر بھی قلعہ معلیٰ کی تہذیبی قدر و قیمت میں فرق نہیں آیا تھا۔ دہلی کی آخری شمع اپنی پوری تابناکی کے ساتھ روشن تھی، بہادر شاہ کا لال قلعہ اس وقت بھی ہندوستان کے ادبی سرمائے کا امین تھا۔ غالب لال قلعہ پہنچے تو بہادر شاہ مصاحبین کے ساتھ آم کے باغ کی سیر کر رہے تھے، وہیں بلالیا۔

چوبدار: نگاہ روبرو۔ نگہدار حضرت ظل سبحانی۔

بہادر شاہ: آؤ مرزا۔ تمھیں یاد ہی کر رہے تھے۔

غالب: کورنش بجالاتا ہوں۔

بہادر شادہ: آج جی چاہا کہ ذرا مہتاب باغ کی سیر کریں۔ دیکھو تمھارا دل پسند میوہ ہی یہاں لگوایا ہے۔

غالب: حضور! میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نو برنخل باغ سلطاں ہو

بہادر شاہ: بہت خوب۔ ہاں خوب یاد آیا۔ قلعہ معلیٰ کے مشاعرے کے لیے غزل کہہ لی ہے؟

غالب: پیر و مرشد۔ ابھی تک تو فکر سخن کا موقع نہیں ملا۔ طرحی غزل تو نہیں ہوئی، ہاں ایک اور غزل ہوئی ہے وہی نذر کروں گا۔

بہادر شاہ: چوبدار۔ ہم بارہ دری کی طرف جا رہے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خان آئیں تو انھیں وہیں

ہمراہ لانا۔ مرزا تم ایک ایک دانہ آم کو اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو۔

غالب: پیرو مرشد۔ یہ جو کسی بزرگ نے کہا ہے کہ ہر دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔

بہادر شاہ: (مسکرا کر) بہت خوب۔ اس حسن طلب کا جواب نہیں بھئی مرزا کے ہاں ایک بہنگی عمدہ آموں کی ضرور جائے گی۔

غالب: حضور کی ذرہ پروری ہے۔ اسی کرم گستری کی بنا پر تو کہتا ہے۔

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب

نظام الدین کو خسرو۔ سراج الدین کو غالب

بہادر شاہ: مرزا۔ تمہاری بذلہ سنجی قابل داد ہے۔ خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ اب کوئی تازہ غزل سنا دو۔

غالب: پیرو مرشد۔ آج تازہ غزل کی فرمائش نہ کیجئے۔ کچھ عجیب سماں ہے۔ اپنی ایک پرانی غزل کے کچھ شعر بے طرح یاد آرہے ہیں۔ ارشاد ہو تو وہی پیش کروں۔

بہادر شاہ: کچھ بھی سناؤ۔

غالب: عرض کرتا ہوں:

حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے

چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے

قد وگیسو میں قیس وکوہ کن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے

بہادر شاہ: واہ مرزا واہ۔ بہت خوب پڑھتے ہو۔

غالب: ذرہ نوازی ہے پیرو مرشد۔

بہادر شاہ: جہاں ہم ہیں وہاں دارورسن کی آزمائش ہے۔ آگے بڑھو۔

وہ آیا بزم میں دیکھو، نہ کہیو پھر کے غافل تھے

شکیب وصبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

بہادر شاہ: سبحان اللہ۔

غالب:

رگ وپے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام ودہن کی آزمائش ہے
وہ آئیں گے مرے گھر؟ وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

بہادر شاہ: میرزا۔ واللہ پڑھنے میں جواب نہیں۔

غالب: حضور۔ حسب ارشاد ''مہر نیمروز'' کا دیباچہ مکمل ہوگیا ہے۔ آپ کو کسی وقت فرصت ہو تو گوش گزار کروں۔

بہادر شاہ: مگر اس وقت ''مہر نیمروز'' کا کیوں خیال آیا؟

غالب: پیرومرشد۔ باربار میرے پڑھنے کے انداز کی تعریف فرمارہے تھے اور مجھے شرمندگی ہورہی تھی، دیباچہ میں میں نے ظلِ الٰہی سے مخاطب ہو کر ایک آرزو کی ہے۔ وہ آرزو اس وقت یاد آرہی ہے۔

بہادر شاہ: وہ کون سی آرزو؟

غالب: سنتا ہوں کہ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں کلیم شاعر سونے اور چاندی میں تولا گیا مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے ساتھ تول لیا جائے حضور۔ باربار میرے پڑھنے کی تعریف کررہے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ اس کلام کی تعریف کون کرے گا؟

تازدیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریدارے کہن خواہد شدن
کوکبم دارد عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعدمن خواہد شدن

(آواز آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہوجاتی ہے)

راوی: انھیں جھلکیوں میں ایک تصویر غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تھی، شہر میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔

ہر چوراہے پر لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ میرزا اپنے گھر میں مقید تھے۔ نہ باہر نکل سکتے تھے۔ نہ کوئی دوست عزیز آ جا سکتا تھا۔

غالب: (گنگناتے ہوئے)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

بیگم: اوئی اللہ۔ شہر میں حشر بپا ہے اور تمھیں اس وقت بھی شاعری موجود ہی ہے۔ للہ ذرا چوبدار کو بھیج کر چھوٹے مرزا کی خیریت معلوم کراؤ۔

غالب: بیگم، چھوٹے مرزا میرا عزیز چھوٹا بھائی ہے۔ بچارا دیوانہ اور پاگل ہو گیا تو کیا میں اسے اپنے ہاتھوں سے پالا ہے، مگر ایسے موقع پر کیسے اس کی خیریت معلوم کروں۔ ناحق مجبور ہو کر بیٹھ رہتا ہوں۔

بیگم: اے ہے، میں تو نہ جانے کب سے تمھارے سر ہو رہی ہوں کہ اس موئے مکان کو تبدیل کر دو۔ تم نہ مانے۔ اب اگر اسی محلے کے مکان میں ہو۔ مرزا سے تو قریب رہتے۔

غالب: جی ہاں، یہ بھی میرا ہی قصور ہے۔ مکان تلاش کیا۔ تم کو معائنہ کے واسطے لے گیا۔ وہاں آپ نے یہ تحقیق فرمائی کہ اس میں بلا کا اثر ہے۔ بھلا تم سے بھی بڑھ کر کوئی اور بلا کیا ہوگی۔

بیگم: اے لو۔ میں بلا ہو گئی۔ تم کو اس قیامت میں بھی مذاق سوجھتا ہے۔

غالب: واقعی بیگم، چھوٹے مرزا کی طرف سے دل بے قرار ہے۔ مہاراج پٹیالہ کی طرف سے کچھ لوگ یہاں حکیم محمود علی خان کی حویلی اور ہمارے گھر کی حفاظت کے لیے تعینات ہیں۔ انھیں میں سے کسی سے کہتا ہوں۔ شاید کوئی خبر ملے۔

بیگم: خدارا کچھ کرو۔ چھوٹے مرزا بیچارے پاگل ہیں تو ان کی دیکھ بھال کو بھی کوئی نہیں ہے۔

غالب: بیگم، بیگم۔

بیگم: کیا ہوا۔ چھوٹے مرزا کی خیریت معلوم ہوئی؟

غالب: ہاں بیگم۔ یوسف مرزا کے مکان میں بھی چند سپاہی گھس آئے تھے اور جو کچھ اسباب ملا لوٹ لے گئے۔

بیگم: چھوٹے مرزا تو خیریت سے ہیں نا؟

غالب: نہیں بیگم، میرا پاگل بے آسرا بھائی پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہا۔ یوسف مرزا مر گیا۔ میرا پاگل بھائی مر گیا۔ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔

بیگم: ہائے یوسف بھیا۔ (روتی ہیں)

(سپاہیوں کا شور)

چوبدار: مرزا صاحب حویلی میں سپاہی گھس آئے ہیں۔

غالب: ان سے کہوں کیا چاہتے ہیں۔ میرا اس گھر میں اب کچھ نہیں۔ ان سے کہو جو چاہیں لوٹ لیں۔ جو چاہیں اٹھا لے جائیں۔

سپاہیوں کی آوازیں: ہم تمھیں گرفتار کرنا مانگتا ہے۔

غالب: مجھے کہاں لے جاؤ گے، لے چلو میں تیار ہوں۔

(سپاہیوں کا شور)

(وقفہ)

کرنل: ویل، تمہاری وضع نئی ہے۔ کلاہ پہنتا ہے۔ کیا تم مسلمان ہے؟

غالب: آدھا مسلمان، کرنل صاحب۔

کرنل: آدھا ہم تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔

غالب: شراب پیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا۔

(قہقہہ)

راوی: مرزا غدر کے بعد بھی کافی عرصے تک زندہ رہے۔ انھوں نے پرانی تہذیب مٹتی اور نئے نظام کی داغ بیل پڑتے دیکھی اور نئی نسل کی تربیت میں حصہ بھی لیا۔ غالب سے زیادہ

کسی دوسرے شاعر نے نئی نسل کو اس قدر متاثر نہیں کیا۔ ان کی شاعری صرف احساس کا آئینہ نہیں، متجسس ذہن کا پتا دیتی ہے۔ آن کی آواز میں محض فریاد نہیں سنگین حقیقتوں کی تلاش ہے۔ مرزا کی نظریں ایک صحت مند تشکیک اور ایک شاداب فکر کے ساتھ زندگی کو ہر رنگ میں دیکھتی ہیں۔ ان کی عظیم وراثت آج بھی اردو شاعری کے لیے ایک زندہ جاوید روایت بنی ہوئی ہے۔ غالب کی شاعری اپنی فکری خوش آہنگی۔ تنوع اور اسلوب کی دلآویزی کے ساتھ انسانیت کی ایک عظیم متاع ہے۔ جب تک سننے والے کان اور محسوس کرنے والے دل شاعری کا جادو اور سنگیت کے کیف کی قدر کر سکیں گے اس وقت تک غالب کی شاعری زندہ رہے گی۔

غالب:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیز واب اللہ ہی اللہ ہے

اللہ ہی اللہ ہے

حالی: مرزا صاحب، مرزا صاحب۔

غالب: کون، کس نے پکارا؟

حالی: جی، میں ہوں حالی۔ آپ میاں علائی کو خط لکھا رہے تھے۔

غالب: نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا — یہ سارے نقش مٹ رہے ہیں — اب کچھ نہیں۔ اب کوئی نہیں۔

دمِ واپسیں بر سر راہ ہے
عزیز واب اللہ ہی اللہ ہے

اللہ ہی اللہ ہے۔

☆☆☆
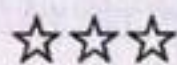
اکبر اعظم

(گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز)

ہمایوں: وہ دھول دیکھ رہے ہو جوہر۔ شاید پھر کوئی لشکر ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ کیا اب بھی ہمایوں کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔

جوہر: جہاں پناہ۔

ہمایوں: ہندوستان چھوٹا تخت و تاج گیا۔ امرکوٹ میں بیگم اور خاندان کو چھوڑ کر اس ریگستان میں بھی خانماں برباد ہمایوں کو سکون نہیں مل سکتا۔ طبل جنگ پر چوب مارو اور ان سواروں سے پوچھو کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ امن یا جنگ۔

(طبل جنگ پر ضرب پڑتی ہے طبل جنگ کی متواتر آواز اور گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے اسلحے کی کھڑکھڑاہٹ کا پس منظر جو کافی دیر تک جاری رہتا ہے)

جواہر: (زوردار آواز میں) سوار ٹھہرو! دوست ہو یا دشمن۔

سوار: دوست۔

جوہر: امن چاہتے ہو یا جنگ۔

سوار: امن۔ ہم امرکوٹ سے شہنشاہ ہندوستان کے لیے خوشخبری لے کر حاضر ہوئے ہیں۔

آوازیں: خوش آمدید۔ خوش آمدید۔

سوار: جہاں پناہ۔

ہمایوں: سوارو۔ ہمایوں تمھاری نوید سننے کے لیے بے تاب ہے۔

سوار: شہنشاہ کو فرزند مبارک ہو۔

آوازیں: مبارک باشد۔ مبارک باشد۔

ہمایوں: سوار تم نے ہمایوں کو بڑی خوشخبری دی ہے۔ ہماری عمر بھر کی مراد آج بر آئی ہے۔ مغل تخت وتاراج کا وارث پیدا ہوا مگر افسوس میرے پاس اس وقت تمھیں انعام دینے کے لیے کچھ نہیں۔

سوار: عالم پناہ کی مسرت ہمارا انعام ہے۔

ہمایوں: مابدولت خوش ہوئے مگر ہم اس لمحے کو اس طرح نہیں جانے دیں گے۔ ہمارے پاس نافۂ مشک ہے۔ جوہر۔

جوہر: عالم پناہ

ہمایوں: نافۂ مشک توڑ کر ہمارے شہسواروں اور لشکریوں میں تقسیم کردو۔ خداوند اسی مشک کی طرح نومولود فرزند کی شہرت اور عزت ساری دنیا میں پھیلائے۔

(مبارک باشد۔ سلامت باشد کا شور)

راوی: اور اکبر کا نام ہندوستان ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں مشک کی خوشبو اور سنگیت کی لہر کی طرح پھیل گیا۔ ہمایوں کے وہ خواب جو اس نے پالے تھے، اس نونہال نے پورے کیے۔ اکبر صرف مغل راج کا نمائندہ نہیں وہ ہندوستانی تہذیب اور ہمارے کلچر کا معمار بن گیا۔ اکبر نے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ ہمایوں کے انتقال کے بعد مصیبتوں اور نئی ذمہ داریوں میں گھر کر بھی نوعمر اکبر نے اپنا یہ عہد فراموش نہیں کیا کہ اسے نئی زندگی کی بنیاد رکھنا اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کرنا ہے۔

تردی بیگ: جہاں پناہ۔

اکبر: تردی بیگ۔ کہو، اکبر تمھاری عرضداشت سننا چاہتا ہے۔

تردی بیگ: مجھے معاف فرمایا جائے شہنشاہ۔ میں چاہتا ہوں میری رائے پر پھر غور فرمائیں۔ ایک طرف سکندر سور ملک پر قابض ہے دوسری سمت ہیمو کی طاقت ور سلطنت ہے ہمارے لشکر بے پشت ہمت اور تھکے ہوئے ہیں ہندوستان میں ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں واپس جانا چاہیے۔

اکبر: (غصہ سے بات کاٹ کر) تردی بیگ۔

تردی بیگ: عالم پناہ۔

اکبر: مابدولت تمھاری عزت کرتے ہیں، تردی بیگ مگر اکبر نے بزدلوں کی عزت کرنا نہیں سیکھا۔ ہم تمہاری صلاح سننے کے لیے تیار نہیں۔ ہمیں کوئی طاقت ہندوستان سے باہر نہیں نکال سکتی۔ کون کہتا ہے ہمارا ہندوستان میں کوئی دوست نہیں ہے۔ ہمیں اس ملک سے محبت ہے۔ ہمیں یہاں کی آب وہوا، یہاں کی مٹی، یہاں کے لوگوں اور یہاں کی تہذیب سے محبت ہے۔

تردی بیگ: عالم پناہ۔

اکبر: تردی بیگ ہمیں ہندوستان عزیز ہے۔ ہم یہاں کے لوگوں کو سینے سے لگائیں گے ہم ان کو محبت سے جیت لیں گے۔

تردی بیگ: مگر جہاں پناہ۔ یہ راستہ بڑا دشوار ہے۔

اکبر: کمزوروں کو ہمارا ساتھ چھوڑ دینا چاہئے تردی بیگ۔ تم جا سکتے ہو۔

راوی: اکبر کے قدم اس شوار گزار راستے پر نہیں ڈگمگائے۔ اس نے محبت سے دلوں کی وہ سلطنت جیت لی جو تلوار نہ جیت سکتی تھی۔ بہادر راجپوتوں سے اس کی محبت نے اٹوٹ رشتے قائم کیے۔ یہ رشتے محلوں اور درباروں ہی میں نہیں جنگ کے میدانوں اور بھیانک لڑائیوں کی صفوں میں قائم ہوئے تھے جہاں اکبری فوجوں اور راجپوت سپاہیوں نے ایک ساتھ مل کر خون بہایا تھا۔ مظفر گجراتی کے خلاف مورچہ بندی ہو رہی تھی۔ لڑائی شروع ہونے والی تھی اکبر نے جے مل کو سامنے سے گذرتے دیکھا۔

(لڑائی کا شور۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز)

اکبر: جے مل۔

جے مل: مہابلی۔

اکبر: تمہارا بکتر بہت بھاری ہے۔ میدان جنگ میں اسے سنبھال سکو گے۔

جے مل: عالم پناہ۔ زرہ وہیں رہ گئی ہے اور یہاں اس بکتر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اکبر: بکتر اتار دو جے مل۔ مابدولت خاص اپنی زرہ تمھیں عطا کرتے ہیں۔ راجہ مل کو خاصہ کی

زرہ عطا کی جائے۔

جے مل: میرا اسوا بھاگیہ۔ مہابلی میں جہاں پناہ کا شکر گزار ہوں۔

اکبر: جے مل۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ ہمارے جانثار اپنی جان کی پروانہیں کرتے ان کی جان ہماری عزت ہے، ہماری جان ہے۔ جاؤ میدان میں فتح تمھاری منتظر ہے۔

(جنگ کا ڈھل)

راوی: محبت اور پریم کی یہ بنیادیں میدان جنگ میں رکھی گئی تھیں۔ اس محبت کا جواب راجپوت بہادروں اور امرا نے بھی بڑی جانثاری اور جواں مردی کے ساتھ۔ راجپوت سردار اکبر اور مغلیہ سلطنت کے لیے جان دینے سے بھی نہیں چوکے۔ مان سنگھ اور بھگوان داس کی تلواروں نے مغل اعظم کے لیے وہ کارنامے سرانجام دیے ہیں، جنھیں تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ اس دور میں ہندو مسلمان، رعایا اور امرا آپس میں اس طرح شیر وشکر ہوگئے کہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ کیے جاسکتے تھے۔ ہندو اور مسلمان صوفی اور سادھو بھگتی تحریک کے رنگ میں رنگے ہوئے خدا کی وحدت اور تصوف کے نغمے گارہے تھے۔

دنیا اس ایک خدا کا پرتو ہے۔ جو دوئی اور تفریق نہیں جانتا۔ یہی ان کی تعلیم کا مقصد تھا وہ مذہب ذات اور پات کے جھوٹے بندھنوں کو توڑ کر انسانیت کو مذہب کی اصلی روح سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ رہا۔ عہدوں میں، دربار کی صفوں میں، میدان جنگ میں اور نشاط کی محفلوں میں ہر جگہ مغل تہذیب اور ہندوستان کا کلچر ملنے لگا اور ایک ایسے تمدن کی پرچھائیاں پڑنے لگیں جو ہمارے زمانے تک چلی آتی ہیں۔ اکبر کے دربار پر نظر ڈالیے، یہاں چغے اور عمامے بہت کم ہیں اور راجپوتوں کے جامے اور کھڑکی دور پگڑیاں سارے درباروالوں نے اختیار کرلی ہیں۔ شاہ خود تخت وتاج کی پرانی شکلوں کو چھوڑ کر سنگھاسن پر بیٹھنے لگا اور بار کی آرائش فروش محل کی تعمیر اور سجاوٹ سبھی میں اس نئے سلیقے کی

جھلکیاں ہیں جو ہندوستان اور ایران کی تہذیب سے مل کر بن رہا تھا۔
ہندوستان اور ایران کا ہر جشن دربار اور محل ہی میں نہیں ملک بھر میں سب مل جل کر مناتے تھے سالگرہ پر تلادان اور ہون ہوتا دسہرہ ہولی دیوالی نوروز عید سبھی کچھ بادشاہ نے قومی تہواروں نے شامل کیے تھے۔ ہولی کا جشن ختم ہو چکا ہے۔ اہل دربار رنگ اور مستی سے چور ہیں۔

اکبر: تان سین۔

تان سین: عالم پناہ۔

اکبر: راگ چھیڑو۔ زمانے نے ہزاروں شہنشاہوں کو افسانہ بنادیا، مابدولت کی خواہش ہے کہ تمھارا راگ ہماری مدد کرے۔

تان سین: کیسی مدد عالم پناہ۔

اکبر: تان سین آج ہولی کا جشن ہے۔ ہولی کے مقدس تہوار میں نوروز کی سی لطافت محسوس فرماتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ تمھارے راگ اس لطافت کا اظہار کر سکے۔ جب آیندہ نسلیں اس غیر فانی ہولی کو سنیں تو وہ سمجھیں کہ اکبر نے ان کے لیے ایک تہذیبی تحفہ پیش کیا تھا۔ راگ چھیڑو تان سین۔

تان سین ساز چھیڑتا ہے۔ (ہولی)

راوی: اکبر نے ہندوستان کی تہذیبی روح کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اتھروید مقدس، رامائن، مہابھارت، راج ترنگنی، ہری بنس، لیلاوتی کے ترجمے ابوالفضل فیضی اور ملا بدایونی جیسے صاحب قلم مصنفین نے کیے نل دمن اور بحرالاسما کے نام سے بھی ہندی اور سنسکرت کے افسانے فارسی میں منتقل ہوئے۔ یہ کتابوں کے ترجمے نہیں تھے۔ ہندوستان کے کلچر کو سمجھنے کی کوشش تھی۔ اکبر پڑھا لکھا نہ تھا پھر بھی اس نے علم وادب کا وہ ذوق بہم پہنچایا تھا کہ عربی فارسی اور سنسکرت کی کوئی اعلی کتاب ایسی نہ تھی جو اس کو بار بار پڑھ کر نہ سنائی گئی ہو۔

اکبر: شاہ مبارک۔

مبارک: عالم پناہ۔

اکبر: تم نے کہا تھا کہ سنسکرت کا کوئی عالم تم نے ہمارے لیے تلاش کرلیا ہے۔ تم نے اسے بلایا۔ مابدولت اسے اپنے حضور دیکھنا چاہتے ہیں۔

مبارک: عالم پناہ۔ وہ ابھی حاضر خدمت کیا جاسکتا ہے۔

اکبر: حاضر کیا جائے۔

(وقفہ)

مبارک: سنسکرت عالم حاضر ہے جہاں پناہ۔

اکبر: مہاپنڈت۔ ہماری خواہش ہے کہ مہابھارت اور رامائن اور سنسکرت کی کتابوں کو پڑھ کر ہمیں سنادیا کرو۔

عالم: مہابلی۔ یہ میرے لیے بڑے اعزازان کی بات ہے۔

اکبر: ہمیں مسرت ہوگی اگر تم رامائن کا کوئی حصہ سناسکو۔

عالم: جوآگیا۔

(رامائن کا حصہ)

راوی: اکبر کی ان صحبتوں میں فارسی شاعروں کے کلام اور ایرانی کتابوں کی تلاوت بھی ہوتی تھی اروجب یہ عالم ان محفلوں میں زانو بہ زانو بیٹھتے تو ان کی نظر کے سامنے اپن ہی روایات کی نہیں بلکہ دوسری ادبیات اور دوسرے کلچر کی عظمت بھی واضح ہونے لگتی تھی۔ رامائن کے اشلوک کے ساتھ ہی کوئی حافظ کی غزل پڑھ رہا ہے:

در عہد پادشاہ خطا بخش جرم پوش
قاضی پیالہ کش شد و مفتی قرابہ نوش

اس گنگا جمنی تہذیب کا سب سے بڑا ثبوت وہ عمارتیں جو آج بھی اکبر کی عظمت کی کہانی دہرا رہی ہیں آگرے کا قلعہ جو سنگ سرخ کی سلیں تراش تراش کر بنایا گیا تھا۔ اپنی طرز تعمیر کی حیثیت سے نرالا ہے۔ چہار ایوان اور اس کے اندر کے محلات میں ہندو طرز تعمیر گاندھار اور ایرانی فن کے نمونے ملتے ہیں۔ چار ایوان کے عبادت خانے نے برے بڑے جید عالم اور فاضل پیشواؤں کی بحثیں شاعروں کے کلام اور اپنے زمانے کے علما

کی صحبتیں دیکھی ہیں، اس کی مرصع اور زرکار چھت کے نیچے وہ محفلیں سجائی گئی ہیں، جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گی۔ فتح پور سیکری کے دروازے پر نقار خانے کی صدا نہ جانے کتنی بیتی باتیں یاد دلاتی ہے۔

(نقار خانے کی صدا)

آواز: جلال الملت والدین عالم پناہ صاحبقراں فرمانروائے ہندوستاں شہنشاہ اکبر تشریف لاتے ہیں۔

اکبر: علما وفضلا! ہماری خواہش ہے کہ عقل کی کسوٹی پر ہم اپنے مذہب ہی کو نہیں دنیا کے سارے مذہبوں اور فلسفوں کو پرکھیں اور تولیں۔ انسان نے ایک عرصے سے اپنے کو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں تقسیم کرلیا ہے۔ مگر کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ ان دائروں سے نکل کر دوسروں کا نقطہ نظر سمجھ ہی نہ سکے۔ مابدولت ایسا نہیں سمجھتے، اس عبادت خانہ کی تعمیر ہم نے اس لیے کی کہ یہاں ہمارے عہد کے علما مختلف مذہبوں کو عقل اور فلسفے کی روشنی میں پرکھ سکیں۔ مابدولت اس محفل میں خاص طور پر ان مسیحی پادریوں کا خیر مقدم کرتے ہیں جو دور دراز کا سفر طے کر کے انگلستان سے ہندوستان آئے ہیں۔ ابوالفضل !

ابوالفضل: عالم پناہ۔

اکبر: مسیحی پادریوں سے کہوں کہ اپنے دین کے متعلق مزید معلومات فراہم کریں۔

پادری: ہم دین مسیحی کے نمایندے ہیں۔ وہ دین جسے حضرت یسوع مسیح نے عالم میں عام کیا۔ نوع انسان کے لیے انھوں نے سب سے بڑی قربانی دی ہے۔ ان کی تعلیمات دنیا والوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنے کا سبق دیتی ہیں۔

اکبر: مذہبی رہبرو! ایک لحہ کے لیے ٹھہرو۔ محبت بھائی چارہ اور انسان دوستی کے مبارک الفاظ ہم ہر مذہبی پیشوا کی زبان سے سن چکے ہیں اگر تمام پیشوا انہی اصولوں پر زور دیتے ہیں، انسانیت کے لیے انہی اعلی صفات کو لازمی سمجھتے ہیں تو پھر ان سارے مذاہب کا فرق کیوں۔ ابوالفضل انسان کی اصل کیا ہے؟

ابوالفضل: لفظ انسان، انس سے نکلا ہے اور انس کے معنی ہیں محبت کرنا۔ اسی طرح ساری انسانیت کا بنیادی فرض آپس میں محبت رواداری اور امن قائم رکھنا ہے۔

اکبر: عبدالقادر بدایونی۔

بدایونی: عالم پناہ۔ اسلام تمام تر مذاہب کے بعد طلوع ہوا لہٰذا وہ سارے مذاہب کی اچھائیاں اور ان کے تمام تر محاسن کو احاطہ کرتا ہے اس نے سبھی محاسن اپنی تعلیمات میں مجتمع کر لیے ہیں لہٰذا وہی دین انسانی ہوسکتا ہے، وہ کل انسانیت کا مذہب بن سکتا ہے۔

فیضی: میں کچھ عرض کروں جہاں پناہ۔

اکبر: کہو فیضی۔

فیضی: میں ملا عبدالقادر بدایونی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ خداوند تعالٰی کی ذات کیا واقعی ایک ہے اور وہ مختار کل ہے۔ اپنے ارادے اور عمل میں کسی دوسرے کی محتاج نہیں۔

بدایونی: جناب فیضی۔ میرا یہی ایمان ہے۔

فیضی: اللہ ایک ہے اور اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے تو پھر اس نے کیوں نہ چاہا کہ اس کے پیدا کیے ہوئے سبھی بندے ایک مذہب پر چلیں۔ دوسرے مذاہب کیوں پیدا کیے گئے۔

اکبر: دوسرے مذاہب کیوں کہتے ہو فیضی۔ ان مذہبوں میں فرق ہی کیا ہے۔ یہ سبھی تو انسانیت کو امن، محبت اور قربانی کا سبق دیتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان وہ خونخوار اختلاف کیوں، ہو امان سنگھ۔

مان سنگھ: مہابلی۔ اسلام کے معنی ہیں صلح و آشتی۔ ہندو مت صدیوں سے شانتی اور نیروان کا سندیس پھیلاتا رہا ہے۔ بدھ، یسوع مسیح اور زرتشت سبھی نے ایک خدا کے جلوے کو دیکھا اور انسانیت کو ایک ہی رشتے میں پرونا چاہا ہے۔

(نقارہ خانے کی آواز)

راوی: فتح پور سیکری کے دروازے پر نقار خانے کی آواز گویا آج بھی وحدت کے اس سنگیت کو دہرا رہی ہے۔ اکبر کا یہ تاریخی کارنامہ ہندوستان کی روح کے مطابق تھا۔ یہ گویا اس عظیم تہذیب کی طرف پہلا نظریاتی قدم تھا، جو ہمارا صدیوں کا سرمایہ ہے۔

فتح پور سیکری اور آگرے کے قلعے کے علاوہ ہمایوں کا مقبرہ۔ بنگالی محل۔ اجمیر کی عمارتیں سلیم شاہ چشتی کی مسجد، کوکھر تلاؤ، الہ آباد کے سنگم پر قلعہ تاراگڑھ اور منوہر پور کی عمارتیں اوران کی فنی عظمت اکبر کو زندہ جاوید بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ پتھر کی ان عمارتوں میں ہندوستان اور ایران کا سنجوگ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔ ان عمارتوں سے نہ جانے کیسے کیسے دلچسپ افسانے متعلق ہیں۔ انوپ تلاؤ کا قصہ مشہور ہے۔

اکبر: ٹوڈرمل۔

ٹوڈرمل: جہاں پناہ۔

اکبر: ہم نے حکم دیا تھا کہ انوپ تلاؤ کا پورا حوض سکّوں سے بھر دیا جائے۔ مابدولت کی خواہش ہے کہ اس کا فیض ہماری رعایا کو اعلیٰ سے ادنیٰ تک پہنچے۔

ٹوڈرمل: عالم پناہ کے حکم کی تعمیل جاری ہے۔ ابھی تک ۱۷ کروڑ بھر چکے ہیں مگر حوض ابھی تک پُر نہیں ہوا۔

اکبر: ٹوڈرمل۔ اس سے پہلے کہ مابدولت وہاں پہنچیں حوض لبالب بھر جانا چاہیے۔

(مہابلی کی جے۔ شہنشاہ اکبر کی جے کا شور)

اکبر: ہماری خواہش ہے کہ انوپ تلاؤ ہماری رعایا کے ہر حصے کو ہر خاص و عام کو فیض بخشے۔ یہ حوض اشرفی روپیہ اور پیسوں سے بھرا ہے۔ ہم ایک اشرفی ایک روپیہ اور پیسہ سارے امرا غربا کو اپنے دست مبارک سے بخشیں گے۔

خدمت گار: عالم پناہ۔ منجھو قوال حاضر ہے۔

اکبر: حاضر کیا جائے۔

منجھو: مہابلی کی جے۔ شہنشاہ اکبر زندہ باد۔

اکبر: آؤ۔ منجھو۔ مابدولت کو کوئی اچھا کلام سناؤ۔ میں نے تیری آواز میں جو رس پایا ہے وہ بڑے بڑے گویوں کی آواز میں بھی نہیں ملا۔

منجھو: عالم پناہ کی عنایت ہے۔ حضرت امیر خسؔرو کا کلام عرض کرتا ہوں۔

(قوالی: غزل امیر خسرو)

کا ہو کلاہل ناہیں پرت ہے

بیاکل رہت سریر رے

نہ جانے کاہوت تن میں

میٹھی میٹھی پیر رے

سگری رین تڑپت بیتی

نین دھرکت نیر رے

پیر نجام خسرو اپنے کے

ان بندھاؤ دھیرے

گوری سوئے سیج پر اور ڈارے منہ پر کیس

چل رے خسرو گھر اپنے رین بھئی چودیس

اکبر: منجھو، تیری کیفیت کو کوئی نہیں پہنچتا۔ جا اُٹھالے جا۔ جا جتنی نقدی تجھ سے اٹھ سکے اٹھالے جا۔

راوی: اس فیاضی اور دریادلی نے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ دربار میں ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ ہر ایک صاحب کمال دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ زین خاں اور تان سین جیسے موسیقار۔ عاقل خاں جیسے مصور۔ شکیبی، نظیری جیسے شاعر۔ ابو الفضل اور فیضی جیسے عالم۔ بیربل جیسے ہنسوڑ اور ذہین انسان۔ مان سنگھ، بھگوان داس جیسے بہادر اور خانخاناں جیسے علم دوست اور ادب نواز اس دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ انگلستان اور ایران تک کے لوگ اس دربار میں نظر آتے ہیں۔ فضا ایسی تھی کہ یورپ کے اعلیٰ سے اعلیٰ دربار کی یاد دلاتی تھی۔ شجاعت اور دلیری۔ نرمی اور محبت، علم دوستی اور ادب نوازی کی اس سے بڑی مثال تاریخ ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

اکبر: بیربل یہ تمھاری کھچڑی کا واقعہ کبھی نہیں بھولے گا۔ مابدولت کو وغمناک لمحات میں بھی جب یہ خیال آجاتا ہے تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

بیربل: مہابلی۔ کھچڑی ہے ہی ایسی چیز۔ پھر میری پکائی ہوئی تو اور بھی مزیدار تھی۔

اکبر: بیربل، مگر آج تمھارے دیر میں آنے کا کیا سبب ہے مابدولت تمھارے منتظر تھے۔

بیر بل: کیا عرض کروں جہاں پناہ۔ چھوٹے بچے نے ناک میں دم کر دیا۔ کسی صورت سے چپ ہی نہ ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے خاموش کیا تب حاضر ہوسکا ہوں۔

اکبر: بیر بل جیسا ذہین ایک بچہ کو بہلا نہیں سکتا۔ تم تو شہنشاہ ہوں کے دل بہلاتے ہو۔ ایک چھوٹے سے بچے کی کون سی ضد ہے۔ جو پوری نہیں ہو سکتی ہے۔

بیر بل: عالم پناہ۔ قصور معاف بچوں کی ایسی ضدیں بھی ہوتی ہیں جو پوری نہیں ہوسکتیں۔

اکبر: ہم اسے تسلیم نہیں کرتے بیر بل، بچے کو بلایا جائے، ہم اس کی ضد پوری کریں گے وہ جو چاہے گا اس کو ملے گا۔

بیر بل: عالم پناہ۔ کبھی کبھی یہ ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔

اکبر: خاصہ دار بچے کو لے آؤ۔

(تھوڑا سا وقفہ)

خاصہ دار: راجہ بیر بل کا فرزند دلبند عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہے۔

بچہ: (تتلا کر) مہابلی کی جے ہو۔

اکبر: بیر بل۔ دیکھو کس قدر سمجھ دار بچہ ہے۔ ہمیں کس طرح تسلیم بجالاتا ہے۔ ہم اسے کھلونے دیں گے۔ خاصہ دار وہ ہاتھی کا کھلونا اور چڑیا کی صورت کا بنا ہوا کھلونا بچے کے سامنے رکھ دو۔

خاصہ دار: بہت بہتر عالم پناہ۔

بیر بل: بیٹے عالم پناہ نے تم کو یہ کھلونے عنایت کیے ہیں۔ عالم پناہ کا شکریہ ادا کرو۔ دیکھو اس ہاتھی کی سونڈ کیسی موٹی ہے۔ کتنا بڑا ہاتھی ہے اور دیکھو یہ چڑیا کیسی چھوٹی سی ہے بالکل ایسی ہی تو ہوتی ہیں چڑیاں۔

بچہ: بابا! یہ ہاتھی اس چڑیا کے اندر بٹھا دو۔

بیر بل: پاگل کہیں کا ہاتھی بھی چڑیا کے اندر بیٹھ سکتا ہے۔ بیٹا ہاتھی کا کھلونا بڑا ہے چڑیا چھوٹی ہے۔ چھوٹی چیز میں بڑی چیز نہیں سما سکتی۔

بچہ: نہیں (رونے لگتا ہے) نہیں۔ بٹھا دو۔ ہاتھی کو چڑیا کے اندر بٹھا دو۔ ہم نہیں مانتے۔

اوں، اوں، ہاتھی چڑیا کے اندر بیٹھے گا۔

اکبر: برخوردار۔ ہاتھی چڑیا کے اندر نہیں بیٹھ سکتا۔

بچہ: اوں اوں، مہابلی ہم تو بٹھائیں گے ضرور۔

بیربل: اب مہابلی ہی اس ضد کو پورا کر سکتے ہیں۔

اکبر: بیربل تم نے ہم سے ایک اور بازی جیت لی۔ (ہنستا ہے)

راوی: اکبر نہ صرف ایک عظیم مغل شہنشاہ تھا اور نہ صرف علم و فضل، مصوری اور سنگیت کا ایک اعلی سرپرست۔ وہ دراصل دنیا کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں تھا جو تاریخ کے سلسلے میں کھو نہیں جاتیں، بلکہ تاریخ کے دھارے کو نئے رخ پر بہانے کی کامیاب کوش کرتی ہیں۔ اکبر نے مغل سلطنت کی بنیادیں ہی مضبوط نہیں کیں بلکہ اس کی بنیاد محبت اور رواداری کی ایک ایسی مضبوط چٹان پر رکھ دی جو مغل سلطنت کے مٹ جانے کے صدیوں بعد تک بھی اس کی یادگار بنی ہوئی ہے۔ اکبر ایک خواب پرست فلسفی نہیں تھا، ایک باعمل فرما ں رواں تھا، اس نے نئی نسلوں کے لیے ایک نیا آدرش پیش کیا اور راج پاٹ کے پرانے اور فرسودہ راستوں سے ہٹ کر محبت اور حقیقی رواداری کی نئی شاہرہ پیدا کی۔

جب ہیموں کو اس کے دربار میں قیدی کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور مفتی اعظم نے کہا کہ وہ اسے ثواب حاصل کرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے قتل کر دے تو اس نے بڑے غصے سے کہا تھا۔

اکبر: نہیں۔ مفتی اعظم، ثواب اس میں نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے اور ہم اپنی سلطنت کی بنیاد ظلم پر نہیں آشتی اور امن پر مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھ کسی کے خون سے آلودہ نہیں کریں گے۔

جب متھرا پہنچے اور وہاں کے مقدس تیرتھ استھانوں کی سیر کرنے لگے تو اکبر کو اس دیس کی مہان آتما کا ایک جلوہ دکھائی دیا۔ متھرا کے مقدس بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے ان کے سامنے کرشن جی کی نہ جانے کتنی کتھائیں آنکھوں کے سامنے گذرنے لگیں۔ اکبر کا جلوس ہرے رادھا ہرے کرشن کی صداؤں میں گزر رہا تھا۔

(متھرا کے بازاروں کا ایک سین ہرے رادھا۔ ہرے کرشن کی آوازیں اور اس کے

سامنے مناسب باجے۔ یہ پس منظر کافی دیر تک قائم رہتا ہے۔ ہاتھیوں کے گھنٹیوں کی آوازیں جو جلوس کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا پتا دیتی ہیں)

اکبر: ابوالفضل۔

ابوالفضل: عالم پناہ۔

اکبر: مذہب انسان کو شانتی اور پریم سکھاتا ہے اور انسان اسے کیسا غلط سمجھ لیتا ہے اس فضا کو دیکھو کس قدر شانتی ہے کیسا پریم ہے۔ ان بھگتوں کی آواز میں کیسا سکھ ہے۔

ابوالفضل: جہاں پناہ۔ صحیح فرماتے ہیں۔

اکبر: وہ سامنے دیکھو۔ وہ یاتریوں کے چاروں طرف یہ پیادے کیسے کھڑے ہیں ابوالفضل۔

ابوالفضل: جہاں پناہ۔ وہ ان سے محصول وصول کررہے ہیں۔

اکبر: محصول؟ کیسا محصول۔

ابوالفضل: متھرا میں داخل ہونے کا محصول۔ جہاں پناہ۔

اکبر: نہیں۔ ہمارے راج میں یہ محصول وصول نہ ہوگا۔ اعلان کردو کہ یاتریوں سے کوئی محصول وصول نہ کیا جائے گا۔ لوگوں کو اپنے تیرتھ استھانوں پر جانے کی پوری آزادی ہے۔

راوی: غرض اکبر کا دربار۔ رنگارنگ تصویروں کا مرقع ہے۔ اس کی شخصیت ہماری تہذیب کا نشان ہے اور ہندوستان کی کلچرل برتری اور ترقی میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر اشوک نے دنیا کے سامنے ہندوستان کا سر اونچا کیا تو اکبر نے اس سربلند ہند کے سر پر رواداری اور خلوص۔ عالم گیر اخوت اور بھائی چارے کا جگمگاتا ہوا تاج رکھا۔ اکبر اور اس کے نورتن ہندوستان کی تاریخ کے ایسے نگینے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اسی تازگی اور روشنی کے ساتھ جگمگاتے رہیں گے۔ تلواروں کی چھاؤں میں بہت سے شہنشاہ آئے اور گذرے گئے۔ تاریخ نے خونخوار اور جابر بادشاہ اور ان کے دور کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا مگر اکبر کی سلطنت تلوار اور خوں خواری کی جگہ انسانیت کے بنیادی اصولوں قائم تھی، اس کی آب وتاب کو زمانہ ہمیشہ مقدس خزانہ کی طرح محفوظ رکھے گا اور ہندوستان اس امانت پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔

☆☆☆

انسپکٹر جنرل

(پس منظر کی موسیقی)

میئر: دوستو! غضب ہو گیا۔ قصبے پر بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔

سب: کیا ہوا میئر صاحب؟

میئر: راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل قصبے کے انتظام کی تحقیقات کے لیے آنے والا ہے۔

جج: انسپکٹر جنرل؟

میئر: جی ہاں۔ جج صاحب! انسپکٹر جنرل! اس کے پاس حکومت کی خفیہ ہدایات ہوں گی۔ وہ سادہ کپڑوں میں رہے گا تاکہ اسے کوئی پہچان نہ سکے۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ کو کیسے اطلاع ملی میئر صاحب؟

میئر: مجھے راجدھانی سے میرے ایک دوست نے خط لکھا ہے، ابھی ابھی مجھے اس کا خط ملا— لکھتا ہے — (پڑھتے ہوئے) مکرمی معظمی میئر صاحب وغیرہ وغیرہ۔ وہ انسپکٹر جنرل شاید قصبے میں پہنچ گیا ہو۔ انسان خطا کا بنا ہوا ہے، آپ کو لکھتا ہوں کہ آپ خبردار ہو جائیے اور احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیں۔ میں نے ملازم سے کہا کہ جج صاحب۔ ہسپتال کے ڈائریکٹر۔ سپرنٹنڈنٹ تعلیمات اور پوسٹ ماسٹر صاحب سب کو مطلع کر دیں۔ سب آ گئے مگر پوسٹ ماسٹر صاحب غائب ہیں۔

جج: ہوں۔ صورت حال واقعی بڑی نازک ہے۔

میئر: یقیناً۔ جج صاحب۔ میں نے اپنے محکمے میں ایک احتیاطی تدبیریں کی ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی میرا یہی مشورہ ہے۔ خاص طور پر خیراتی ہسپتالوں کے ڈائریکٹر توجہ

فرمائیں۔معائنہ کرانے والے آفیسران عام طور پر سب سے پہلے ہسپتال اور خیراتی اداروں کو دیکھا کرتے ہیں۔

ڈائریکٹر: میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں مئیر صاحب (گڑگڑاتے ہوئے) مگر خدا کے لیے اس انسپکٹر جنرل سے تو جان بخشی کرائیے۔

مئیر: آپ کو فوراً مریضوں کے لیے کچھ اجلی چادروں کا انتظام کرنا چاہیے۔آپ کے ہاں کے مریضوں کے چہرے اور کپڑوں پر ایسی سیاہی پتی رہتی ہے گویا ابھی بھاڑ جھونکے چلے آرہے ہیں اور ہاں! مریض کے سرہانے تشخیص مرض اور علاج کا پرچہ بھی ہونا ضروری ہے۔

ڈائریکٹر: مگر میئر صاحب! اتنی چادروں کا انتظام ہونا مشکل ہے۔

مئیر: مریضوں کی تعداد کم دکھایئے۔کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس اسپتال میں مریض بہت جلد اچھے ہوجاتے ہیں۔دوسرے سرکاری امداد کی کمی کی وجہ سے زیادہ انتظام نہیں ہو سکتا۔اور خدا کے لیے برآمدے سے سڑے گلے آلو اور تمباکو بیڑی کے ڈھیر کے ہٹانے کا کوئی بندوبست کرلیجیے——اور جج صاحب——

جج: جی مئیر صاحب۔

مئیر: آپ بھی ذرا اپنی عدالت کے کمروں کی طرف دھیان دیں—عدالت کے کمرے سے بطخ کے بچے ہٹوا دیجیے۔

جج: اہل معاملہ کو کوئی خاص تکلیف نہیں تھی اس لیے وہاں پالے جاتے تھے آج ہی سب کو باورچی خانے بھجوادوں گا۔جی چاہے تو رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھایئے۔

مئیر: اور عدالت کے احاطے میں میلے کپڑے بھی دھوکر سکھلانے کے لیے لٹکائے جاتے ہیں۔آپ شکار سے آکر کھالیں بھی سکھایا کرتے ہیں آپ سے پہلے بھی کئی بار کہنے کا ارادہ کیا مگر بھول جاتا تھا۔ذرا سوچیے تو انسپکٹر کیا کہے گا۔

جج: آپ۔فکر نہ کریں۔

مئیر: پھر آپ کا پیشکار ہے اس کے بدن سے ایسی سڑاند پھوٹتی ہے کہ کمرے میں ٹھہرنا دوبھر

ہو جانا تھا ہے۔ باقی بدعنوانیاں آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔

جج: بدعنوانیاں کوئی نہیں۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ میں کچھ تحفے لے لیا کرتا ہوں رشوت کبھی نہیں لیتا۔

میئر: رشوت پھر رشوت ہے۔ خواہ کسی شکل میں ہو— اور ہاں سپرنٹنڈنٹ تعلیمات صاحب۔ آپ کو اپنے اسکول کے ماسٹروں پر خاص توجہ کرنا ہوگی۔ ایک ماسٹر صاحب ہیں میں نام بھول گیا ان کا۔ وہی موٹا موٹا سا آدمی طرح طرح کے منہ بناتا ہے۔ لڑکوں کے لیے تو خیر ٹھیک ہے مگر ہر آنے جانے والا سمجھتا ہے کہ وہ اسی کو منہ چڑھا رہا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: کیا بتاؤں میئر صاحب۔ میں خود کئی بار اسے منع کر چکا ہوں۔

میئر: جی اور وہ تاریخ پڑھانے والا ٹیچر ہے۔ سکندر اعظم کا بیان پڑھانے لگا تو کرسی اٹھا کر فرش پر دے ماری۔ گلاس اٹھا کر زمین پر دے پٹخا۔ آخر کیا جنون ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: اسے سمجھایا تو کہتا ہے کہ میں علمیت کے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں۔

میئر: اور وہ پوسٹ ماسٹر صاحب ہیں کہ ابھی تک ان کا پتا ہی نہیں۔

پوسٹ ماسٹر: (آتا ہے) اہا سب لوگ جمع ہیں۔ آخر کیا بات ہے دوستو! نمبردار باب چنسکی بتا رہا تھا کہ کوئی انسپکٹر جنرل آ رہا ہے۔

میئر: آیئے پوسٹ ماسٹر صاحب۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں کسی نے میری شکایات تو حکومت کو لکھ کر نہیں بھیجی ہیں۔ آپ ذرا قصبے کے اندر والی اور باہر جانے والی ڈاک پر نگاہ رکھیں۔ میرا مطلب ہے ہر ایک خط کو ذرا سا کھول کر——

پوسٹ ماسٹر: (بات کاٹ کر) میں سمجھ گیا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میئر صاحب احتیاط کی تو اور بات ہے میں تو شوقیہ بھی ہر ایک کے خط کھول کر پڑھ لیتا ہوں خدا کی قسم کیا کیا عبارتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

میئر: اگر بے ضرر خط ہو تو بند کر کے اور ٹھیک نہ بند ہو تو غلطی سے کھول لیا گیا کا سلپ لگا دیجیے گا۔

پوسٹ ماسٹر: آپ فکر نہ کریں۔ لیجیے میں آپ کو ایک لیفٹیننٹ کا خط سناتا ہوں۔ اس نے اپنے ایک دوست کو ماسکو کی ڈانس پارٹی کا حال لکھا ہے کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر

گیا۔ لکھتا ہے...

میئر: بس کیجیے۔ میری آنکھوں میں تو وہی کمبخت انسپکٹر جنرل گھوم رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب دروازہ کھلا اور وہ...

(دروازہ بہت زور سے دھماکے سے کھلتا ہے)

کون ہے؟

باب چنسکی: غضب ہو گیا میئر صاحب غضب ہو گیا۔

میئر: باب چنسکی۔ کیا ہے۔

سب: نمبردار باب چنسکی کیا بات ہے؟

باب چنسکی: بات یہ ہے میئر صاحب کہ میں اور داب چنسکی ہوٹل گئے تھے۔

داب چنسکی: تو نہیں بتا پائے گا میں بتاتا ہوں۔

باب چنسکی: داب چنسکی۔ ارے تو یوں ہی گڑبڑایا ہوا ہے۔ میں بتاتا ہوں۔ بات یہ ہوئی میئر صاحب۔

میئر: افوہ۔ کم بختو۔ خدا کے لیے کچھ کہو تو۔ تم کہو باب چنسکی۔

باب چنسکی: جب میں آپ سے مل کر گیا تو کوروبکن کے ہاں چلا گیا وہ ملا نہیں تو میں رستاکوفکی کے ہاں گیا وہ بھی نہیں ملا تو میں پوسٹ ماسٹر صاحب کو خبر سنانے گیا۔ وہاں سے لوٹتے میں مجھے یہ داب چنسکی مل گیا۔

میئر: افوہ۔ بکواس بند کرو۔ مطلب کی بات کہو۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ تم کہو داب چنسکی۔

داب چنسکی: مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ہم لوگ کچھ کھانے کے لیے ہوٹل چلے گئے۔ جیسے ہی ہوٹل پہنچے ایک خوبصورت نوجوان......

باب چنسکی: اور سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

داب چنسکی: تم چپ رہو جی۔ ہم نے منیجر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان گورنمنٹ آفیسر ہے۔ دو ہفتے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ راجدھانی سے آیا ہے۔ ہلستاکوف نام ہے۔

باب چنسکی: وہ عجیب طریقے پر رہتا ہے۔ ہر چیز ادھار مانگتا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی معلوم

نہیں ہوتا۔

داب چنسکی: میرے اوپر تو یہ سنتے ہی بجلی گر پڑی۔ ہو نہ ہو یہی وہ انسپکٹر جنرل ہوگا۔

باب چنسکی: میرے منہ سے تو بے ساختہ آہ نکل گئی۔

داب چنسکی: غلط آہ پہلے میرے منہ سے نکلی تھی۔

باب چنسکی: اچھا بابا پہلے تم ہی نے آہ کی تھی۔ میں یقین سے کہتا ہوں میئر صاحب یہی وہ انسپکٹر جنرل ہے۔

میئر: جھوٹ غلط بالکل غلط۔

باب چنسکی: ایمان سے وہی ہے۔ اس کی آنکھیں صاف بتاتی ہیں ہر چیز کو ایسا تاکتا ہے کہ بس! میں مچھلی کھا رہا تھا اس نے گزرتے گزرتے کنکھیوں سے یہ بھی دیکھ لیا کہ میں کیا کھا رہا ہوں۔

میئر: کہاں ٹھیرا ہوا ہے؟

باب چنسکی: کمرہ نمبر ۵ میں دو ہفتے سے ٹھیرا ہوا ہے۔

سب: دو ہفتے سے؟

میئر: میرے خدا اب کیا ہوگا۔ ان ہی دو ہفتوں میں تو جمعدار کی بیوی کے کوڑے لگائے گئے ہیں۔ قیدیوں کو راشن نہیں ملا ہے۔ سڑکوں پر کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ وہ کیا کہے گا۔ میرے مالک۔ میرے اوپر رحم فرما۔ ڈائریکٹر صاحب اب کیا ہوگا۔

ڈائریکٹر: جی۔ اگر ہم لوگ اس سے جا کر ملیں تو کیسا رہے گا۔

جج: جی نہیں پہلے پادری اور سوداگر لوگوں کو قاعدے کی رو سے ملنا چاہیے۔

میئر: جج صاحب قاعدے واعدے سے کام نہیں چلے گا۔ فرض کیجیے میں باب چنسکی کے ساتھ ٹہلتا ہوا ہوٹل کی طرف نکل جاؤں میئر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ پتہ لگاؤں کہ کسی آنے جانے والے کو تکلیف تو نہیں ہوتی۔ اس بہانے اس سے ملنا ہے۔ داب چنسکی۔

داب چنسکی: جی۔ میئر صاحب۔

میئر: کوچوان سے کہنا گاڑی تیار کرے میں جاتا ہوں جج صاحب آپ ذرا پولیس داروغہ کو بلا لیجیے۔ اس سے کہیے گا کہ بازار کے دوکانداروں کو پکڑ کر سڑک پر جھاڑو لگوا دے اور

جہاں وہ جوتے بیچنے والا رہتا ہے اس کے مکان کے قریب کچھ جنگلا جھاڑ جھنکاڑ اور اینٹیں جمع کرادے تا کہ معلوم ہو کہ کچھ بن رہا ہے۔

جج: آخر کیا بات ہے؟

میئر: افوہ۔اب آپ بھی مین میخ نکالنے لگے۔پانچ برس ہوئے حکومت نے ہسپتال کا گرجا گھر بنوانے کے لیے کچھ رقم منظور کی تھی لوگوں کو بتا دیجیے اگر انسپکٹر جنرل پوچھے تو کہیں عمارت بن گئی تھی کہ یکا یک آگ لگ گئی۔

جج: میں سب کہہ دوں گا۔آپ جائیے۔

(اینا آتی ہے)

اینا: ڈارلنگ۔میئر ڈارلنگ کیا انسپکٹر جنرل کے بارے میں کچھ پتا چلا۔

میئر: اینا ڈارلنگ۔وہیں جا رہا ہوں۔ماریا بیٹی دعا کرو۔

ماریا: ڈیڈی آپ وہیں جا رہے ہیں۔

اینا: کیسا ہے وہ خوبصورت آدمی ہے،اس کے مونچھیں بھی ہیں یا نہیں؟

میئر: فضول کی باتیں مت کرو۔میں وہاں جا رہا ہوں۔خدا حافظ۔

(گاڑی کے جانے کی آواز)

اینا: (غصہ سے) ماریا۔ماریا بیٹی یہ سب دیر تری وجہ سے ہوئی۔ٹماخ میں وہ مین میخ نکالتی ہے کہ توبہ۔

ماریا: میں نے کیا کیا؟

اینا: اونہ تو نے کیا کیا۔بہر خدا نوکر کو ہوٹل تو بھیجو۔یہ انسپکٹر جنرل وہیں ٹھہرا ہوا ہے۔

(وقفہ)

ہلستاکوف: اوسپ یہ کھانا دیا ہے اس ہوٹل والے نے۔یہ کتے کا گوشتؤ پتھر کنکر کون کھا سکتا ہے۔اس کی صورت پر پھینک آؤ۔

اوسپ: یہ بھی بڑی مشکل سے دیا ہے۔سرکار۔وہ کہتا ہے کہ جب تک پچھلے پیسے نہیں دیں گے کھانا بھی نہیں ملے گا۔

ہلستا کوف: پیسے! پیسے! مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ مجھے کھانا تو ملنا ہی چاہیے۔ یہ میری جان لے لیں گے۔ تم اس سے جا کر کہو تو سہی۔

اوسپ: وہ تو کہہ رہا تھا کہ میں ابھی میئر کے پاس جا کر شکایت کرتا ہوں۔ بیٹا کو جیل کی ہوا نہ کھلائی تو نام نہیں۔

ہلستا کوف: کیسا ذلیل شہر ہے یہ بھی۔ کوئی کم بخت ذرا سی بھی چیز ادھار نہیں دیتا۔

اوسپ: سرکار۔ کب تک ادھار دے دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ آپ تو ہر ایک کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ سب کچھ تو ہار چکے ہیں۔ آپ معمولی کلرک ہیں کوئی بادشاہ تو نہیں۔ اس طرح ادھار مانگ کر کھانے سے کام نہیں چلے گا۔ اب گھر چلیے۔

ہلستا کوف: مجھے نصیحت کرنے چلا ہے۔ جا۔ کم بخت منیجر سے کھانے کے لیے جا کر کہہ۔

اوسپ: وہ کہتا ہے اور کچھ تیار نہیں۔

ہلستا کوف: جھوٹا۔ دغا باز۔ فریبی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دو آدمی بیٹھے مچھلی کباب کھا رہے تھے۔ میرے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ شوربا ہے کہ نمک کا پانی اور یہ چڑیوں کے پر اس کے اوپر تیر رہے ہیں۔

اوسپ: تو لایئے واپس کر آئیں۔

ہلستا کوف: بدتمیز مجھے بھوک لگی ہے پھر کیا تجھے کھاؤں گا۔ جا کر منیجر سے کچھ اور بھیجنے کو کہو (چلا کر) میں کھانا کھاتا ہوں۔

(وقفہ)

اوسپ: (واپس آ کر) سرکار۔ میئر صاحب آئے ہیں اور آپ کے بارے میں منیجر سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔

ہلستا کوف: (گھبرا کر) میئر۔ منیجر کا بچہ۔ آخر نہیں مانا کم بخت نے قانونی کارروائی شروع کر دی (اپنے آپ سے) کیا سچ مچ مجھے جیل بھیج دے گا۔ میں نہیں جاؤں گا۔ میں ہرگز جیل نہیں جاؤں گا۔ میں شریف آدمی ہوں اس طرح اس کو پریشان کرنے کا اس کو حق کیا ہے۔

(دروازے پر دستک)

ہلستا کوف: کون؟

میئر: (دروازہ کھلتا ہے اور اندر آتے ہیں) آداب عرض۔ معاف کیجیے گا شہر کے میئر کی حیثیت سے یہ دیکھنا میرا فرض ہے کہ شہر میں آنے جانے والوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

ہلستا کوف: کیا عرض کروں میئر صاحب! دراصل بات یہ ہے کہ گھر سے میرا منی آرڈر نہیں آیا ہے۔ جیسے ہی میرا روپیہ آجائے گا میں فوراً ادا کردوں گا۔ میری اس میں کچھ خطا نہیں یہ ہوٹل والا جوتے کے تلے کا سا سخت گوشت دیتا ہے اور شوربا بس کچھ نہ پوچھیے۔ چائے خدا کی پناہ۔ چائے میں سے مچھلی کی سی بو آتی ہے۔

میئر: (گھبرا کر) مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ بازار میں بکنے کے لیے جو گوشت منظور ہوتا ہے وہ سب عمدہ اور تندرست جانوروں کا ہوتا ہے۔ پتا نہیں یہ ہوٹل والا کہاں سے گوشت لیتا ہے۔ میری رائے میں آپ کسی اور جگہ رہنے کا انتظام کرلیجیے۔

ہلستا کوف: کسی اور جگہ۔ کس جگہ؟ آپ کی مراد جیل خانے سے ہے۔ میں کیوں جیل جاؤں گا۔ آپ کو مجھ سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں۔ آخر میں گورنمنٹ ملازم ہوں۔ میں۔ میں سیدھا وزیراعظم تک فریاد لے کر پہنچوں گا۔ میں شریف آدمی ہوں۔

میئر: میرے اوپر رحم کھائیے۔ بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔

ہلستا کوف: آپ مذاق کرتے ہیں۔ آپ کے بیوی بچے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں جیل چلا جاؤں۔

میئر: (گھبرا کر) مجھے معاف فرمائیے۔ دراصل میری ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں حکومت سے گرانٹ کم ملتی ہے۔ میری تنخواہ تو چائے پانی کے لیے بھی کافی نہیں ہوتی۔ رشوت میں نہیں لیتا۔ کبھی گھر کے لیے کوئی چیز یا سوٹ کا ایک آدھ کپڑا لے لیا تو کیا ہوتا ہے۔ وہ جمعدار کی بیوی کو میں نے کوڑے نہیں لگوائے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میرے جانی دشمنوں نے یہ خبر گڑھی ہے۔

ہلستا کوف: مجھے جمعدار کی بیوی سے کوئی تعلق نہیں۔ بس آپ میرے لیے کوڑے نہ لگوائیں۔ میں

ہوٹل کا پیسہ پیسہ بے باق کر دوں گا۔ مگر اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

میئر: اگر آپ کو روپیہ پیسہ کی کوئی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ انتظام ہو جائے گا۔

ہلستا کوف: شکریہ۔ اگر آپ مجھے اس وقت یہی کوئی دو سو روپیہ کا انتظام کر دیں تو اس کم بخت ہوٹل والے کا حساب چکا دوں۔

میئر: یہ لیجیے۔ ٹھیک دو سو روپے ہیں۔ گننے کی ضرورت نہیں۔

ہلستا کوف: شکریہ۔ آپ نے بڑے آڑے وقت میں میری مدد کی۔ جاگیر پہنچتے ہی آپ کو رقم بھجوا دوں گا۔

میئر: کوئی بات نہیں۔ مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ مسافروں کی مدد کرنا اپنا فرض ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کس کس جگہ کا دورہ فرمائیں گے۔

ہلستا کوف: جی میں ساراتوف کے علاقے میں اپنی جاگیر جا رہا ہوں۔ میرے والد کا تقاضا ہے کہ میں وہیں رہوں۔ مگر مجھ سے ان قصبوں اور دیہاتوں میں سڑا نہیں جاتا۔ میں اس تہذیب یافتہ زمانے میں دنیا بھر سے الگ کونے کھدروں میں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبوں نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے شہر پسند ہے راجدھانی کی رونق پسند ہے۔

میئر: آپ نے بجا فرمایا۔ راجدھانی کی رونق کا کیا ٹھکانہ ہے۔ آپ کو یہاں تو کافی تکلیف ہوگی۔

ہلستا کوف: تکلیف۔ آپ اس کمرے کو دیکھتے ہیں چوہے کا بل ہے چوہے کا بل اور یہاں کے مچھر اور کھٹمل کتوں کی طرح کاٹتے ہیں۔ بھنبھوڑ کھاتے ہیں اور یہ کمبخت منیجر مجھے موم بتی بھی نہیں دیتا۔ کبھی کچھ لکھنے پڑھنے کو جی چاہے تو مجبور ہیں۔

میئر: آپ ایسے معزز مہمان کو اتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا (تھوڑی دیر سوچتا ہے) میں اس قابل نہیں ورنہ کچھ عرض کرتا۔

ہلستا کوف: فرمایئے۔

میئر: میرا غریب خانہ اس قابل تو نہیں ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ ایک کمرہ شاید آپ کے لائق ہو۔ کافی روشن ہے۔ خاص طور سے شہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے سجا رکھا ہے۔ اگر آپ کرم فرمائیں۔

ہلستا کوف: بڑی خوشی سے آپ کے یہاں رہنا یہاں سے کہیں بہتر ہوگا۔ بہت بہت شکریہ (آواز دیتا ہے) اوسپ ہوٹل والے سے حساب پوچھ کر آؤ اور آ کر سامان باندھو۔

اوسپ: بہت اچھا۔

میئر: آپ نے بڑی عزت افزائی فرمائی۔ آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیوی کو ایک خط لکھ دوں تاکہ وہ سارے انتظامات کر لے اور ہاں کیا آپ چلتے ہوئے قصبے کے چند محکموں کا معائنہ کرنا پسند کریں گے۔

ہلستا کوف: محکموں کا معائنہ؟

میئر: جیل خانہ۔ خیراتی ہسپتال۔ عدالت۔

ہلستا کوف: جیل خانہ! جیل خانہ نہیں البتہ خیراتی ہسپتال دیکھنے چلیں گے۔

میئر: تو اس کے ڈائریکٹر کو لکھے دیتا ہوں تاکہ وہ انتظامات کر سکے۔

ہلستا کوف: ضرور مگر میرے پاس پنسل تو ہے مگر کاغذ نہیں ہے البتہ یہ ہوٹل کے بل ہیں آپ ان پر لکھ سکیں تو لکھ لیجیے۔

میئر: میں ابھی لکھتا ہوں۔

اوسپ: سرکار۔ ہوٹل والا کہتا ہے کہ پہلے دن کے کھانے کے دو روپیہ بارہ آنے اور دوسرے دن چاپ اور مچھلی کے ساڑھے گیارہ آنے اور اس کے بعد——

ہلستا کوف: بکواس بند کرو۔ اوسپ کل کتنے پیسے ہوئے؟

میئر: آپ فکر نہ کریں۔ پیسے اس کو گھر سے بھجوا دیے جائیں گے۔

ہلستا کوف: اچھا اوسپ سامان باندھو۔ ہم میئر صاحب کے گھر چل رہے ہیں۔

میئر: ہاں۔ اور یہ پرچہ ہوٹل کے ملازم سے ذرا میرے گھر بھجوا دینا۔

(وقفہ)

اینیا: (خط پڑھتے ہوئے)

"پیاری اینا۔ میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں دو مٹن چاپ اکسٹرا ایک روپیہ اور ایک پلیٹ مچھلی بارہ آنے" یہ کیا لکھا ہے مٹن چاپ۔ مچھلی ایک پلیٹ۔

داب چلنسکی: دراصل میئر صاحب نے ہوٹل کے بل پر لکھا ہے۔ بل کی چیزیں ہیں۔

اینا: اچھا۔ مگر خدا کے فضل سے اب کچھ بات بنتی نظر آتی ہے۔ مہمانوں کے کمرے کو ٹھیک کر لینا۔ انسپکٹر جنرل نے ہمارے ساتھ ٹھہرنا قبول کر لیا ہے اور اس دوکان دار عبدل کی دوکان سے جتنی شراب ممکن ہو منگا لینا اور کھانے پینے کا بھی انتظام پورا رکھنا۔ ہم اسپتال کے معائنے کے لیے جا رہے ہیں۔"

اینا: ماریا۔ ماریا۔

ماریا: کیا ہے امّی؟

اینا: انسپکٹر جنرل ہمارے یہاں ٹھہریں گے۔ راجدھانی سے آ رہے ہیں۔ تم ذرا اچھے کپڑے پہننا۔ اپنا نیلا سوٹ نکالو۔

ماریا: نہیں امی میں کوئی شوخ لباس پہنوں گی۔

اینا: تم نیلا پہنو میں اپنا زعفرانی سوٹ نکالوں گی۔

ماریا: نہیں امی۔ آپ پر وہ اچھا نہیں لگے گا۔ سیاہ آنکھوں والیوں پر اچھا لگتا ہے۔

اینا: تمھیں تو میری بات کاٹنا ضرور ہے۔ اچھا جاؤ تیار ہو جاؤ۔ وہ اب آتے ہی ہوں گے۔

راوی: ہسپتال کا معائنہ کر کے اور ڈائریکٹر کی ضیافت سے فارغ ہونے کے بعد ہلستا کوف مع ڈائریکٹر میئر کے گھر پہنچے۔ شراب کا دور شروع ہوا۔ میئر نے اپنی بیوی اور بیٹی سے تعارف کرایا اور مہمان خانے میں دونوں نے اس کا استقبال کیا۔ ہلستا کوف کے لیے یہ بڑی عجیب گھڑی تھی۔ نشے کی لہر کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چلنے لگی اور اس نے اِدھر اُدھر کی اڑان گھائیاں شروع کیں۔

ہلستا کوف: نشے میں۔ جی ہاں راجدھانی کی رونق کچھ نہ پوچھیے۔ بال روم وزیر خارجہ۔ جرمنی کے سفیر۔ فرانس کے سفیر اور ان کی بیگمات سبھی آتی ہیں۔ ویٹر کو ذرا سا اشارہ کیجیے اور وہ آ کر آپ کا اوور کوٹ اتار لے گی۔ ایک بار مجھے ایک محکمے کا انچارج بنا دیا گیا۔ دراصل ایک بہت بڑا ڈائریکٹر چلا گیا۔ سوال اٹھا جگہ کیسے پوری کی جائے گی، میں نے تو انکار کر دیا تھا مگر ۳۵۰۰۰ آدمی حکومت کا پیغام لے کر میرے پاس آتے تھے۔ میں نے بھی

شہنشاہ کی رضا جوئی کے خیال سے قبول کر لیا۔

میئر: یور ایکسلینسی۔

ہلستا کوف: کیا ہے میئر۔

میئر: آپ آرام فرمایئے۔ آپ کافی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

ہلستا کوف: (نشے میں) ہم تھکے نہیں ہیں۔ ہم بہت طاقت ور آدمی ہیں۔ ہمارے سامنے کوئی چوں چرا نہیں کر سکتا۔

راوی: دوسرے دن قصبے کے تمام عہدہ داران ہلستا کوف سے ملاقات کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ بڑے بحث و مباحثے کے بعد طے ہوا کہ پہلے جج صاحب شرف باریابی حاصل کریں۔

جج: میں باریابی کی اجازت چاہتا ہوں لبا پکن نیا پکن اسیسر اور ضلع عدالت کا جج ہونے کی حیثیت سے۔

ہلستا کوف: (بات کاٹ کر) چلے آیئے۔ تو آپ یہاں کے جج ہیں۔

جج: جی جی۔ پچھلے تین برس سے مجھے اس عظیم عہدے کا مستحق سمجھا گیا۔ میرے افسران نے دوبار میرا نام سینٹ ولادیمر کے تمغے کے لیے تجویز کیا۔

ہلستا کوف: سینٹ ولادیمر کا تمغہ۔ آپ اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں۔

جج: جی نہیں تو۔ کچھ بھی تو نہیں۔

ہلستا کوف: یہ آپ کی مٹھی میں کیا ہے۔

جج: (بہت گھبرا کر) جی کچھ بھی نہیں۔ لیجیے میں مٹھی کھولتا ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہے۔

ہلستا کوف: کچھ کیسے نہیں۔ روپیہ۔ بالکل کھرے نوٹ ہیں فرض کیجیے آپ یہ نوٹ مجھے قرض کے طور پر دے دیں۔

جج: جی ہاں۔ ضرور۔ بہت بہتر۔

ہلستا کوف: دراصل میرے پاس روپئے کی کمی ہوگئی ہے۔ میں واپس گھر پہنچتے ہی آپ کے قرضے کی رقم واپس کر دوں گا۔

جج: آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں ہمیشہ اپنے سے بڑے افسروں کی حکم بجا آوری اور خدمت کے لیے حاضر رہتا ہوں۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ (جاتا ہے)

ہلستا کوف: بہتر۔

پوسٹ ماسٹر: میں حاضر ہو سکتا ہوں کورٹ کونسلر شپ کن ضلع پوسٹ ماسٹر۔

ہلستا کوف: اندر چلے آیئے۔ مجھے آپ کا قصبہ بہت پسند آیا۔ یہاں بہت معقول آدمی بستے ہیں۔ گو آبادی کچھ کم ہے خیر۔ یہ کوئی راجدھانی تو ہے نہیں۔

پوسٹ ماسٹر: بجایا فرمایا سرکار نے۔

ہلستا کوف: یہاں آ کر اندازہ ہوا کہ آدمی چھوٹے قصبے میں بھی چین سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔

پوسٹ ماسٹر: صحیح فرمایا حضور نے۔

ہلستا کوف: مجھے مسرت ہوئی کہ آپ کو مجھ سے اتفاق ہے۔ ایک عجیب حادثہ ہوا پوسٹ ماسٹر صاحب سفر کے دوران میں مجھے اس بار بڑی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ اگر میرے لیے تین سو روپے کے قرضے کا انتظام کر سکیں۔

پوسٹ ماسٹر: میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ اتفاق سے میرے پاس کچھ روپیہ ہے اگر حضور قبول فرمائیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔

ہلستا کوف: تین سو روپیہ ہیں؟ میں جاگیر پہنچتے ہی آپ کا قرضہ ادا کر دوں گا۔

پوسٹ ماسٹر: سرکار شرمندہ نہ کریں۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ آپ کا کافی وقت خراب کیا۔

سپرنٹنڈنٹ تعلیمات: میں تعارف کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ ہلو پوف۔ سپرنٹنڈنٹ تعلیمات۔

ہلستا کوف: لیجیے سگار حاضر ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: شکریہ — مگر — مگر — لیکن —

لیجیے اچھا سگار ہے۔ آپ کو سگار پسند نہیں مگر مجھے سگار سے عشق ہے۔ اچھا ایک بات بتایئے آپ کو سیاہ بال لڑکیاں پسند ہیں یا بھورے بالوں والی۔ تکلف کی بات نہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: جی۔ جی۔

ہلستاکوف: آپ تو شرمار ہے ہیں اچھا میں سمجھا۔شاید کسی لڑکی کو آپ پہلے ہی دل دے بیٹھے ہیں ممکن ہے میری آنکھوں کا ہی قصور ہے۔ان سے ہر ایک لڑکی شرما جاتی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی۔یہ بات نہیں بلکہ——

ہلستاکوف: مگر میں عجیب مخمصے میں مبتلا ہوں سپرنٹنڈنٹ صاحب مجھے تین سو روپیہ کے قرضے کی ضرورت ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

سپرنٹنڈنٹ: یہ لیجیے کچھ روپے میرے پاس ہیں (کانپتے ہوئے) میں سرکار کا زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔

ہلستاکوف: اور ڈائریکٹر ہسپتال صاحب آئیے۔تشریف رکھیے۔

ڈائریکٹر: جی میرا نام ذم لیانکا ہے۔

ہلستاکوف: جی کل آپ ہی کے ساتھ تو ہسپتال کی سیر کی تھی آپ نے ہماری دعوت بھی کی تھی مگر ڈائریکٹر صاحب آج آپ کل کے مقابلے میں کچھ پستہ قد دکھائی دے رہے ہیں۔

ڈائریکٹر: جی ہاں۔جی ہاں۔مگر یقین مانیے۔میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔پوسٹ ماسٹر البتہ بالکل مفت کی تنخواہ پاتا ہے۔باہر جانے والی ڈاک ہفتوں پڑی رہتی ہے جج کا بھی یہی حال ہے اس کو کتے پالنے کا شوق ہے اور روز روز شکار پر جایا کرتا ہے عدالت کے کمرے میں کتے اور بطخ کے بچے پال رکھے ہیں مجھے ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن ملک اور قوم کی بھلائی کے واسطے ضروری ہے کہ یہ باتیں آپ کے علم میں لائی جائیں ایک نمبردار ہے داب چنسکی اس کی بیوی سے جج صاحب کے تعلقات ہیں اور سپرنٹنڈنٹ تعلیمات کو تو کچھ آتا جاتا ہی نہیں وہ اس عہدے کے بالکل مستحق نہیں ہیں۔آپ کہیں تو میں مفصل رپورٹ پیش کروں۔

ہلستاکوف: ضرور۔ضرور۔جب میرا دل گھبراتا ہے تو کچھ نہ کچھ پڑھنا پسند کرتا ہوں۔آپ ضرور لکھیے۔آپ کا نام بھولا۔

ڈائریکٹر: ذم لیانیکا۔

ہلستاکوف: ہاں تو مسٹر ذم لیانیکا میں دراصل ایک عجیب مخمصے میں پھنس گیا ہوں میرے پاس روپے

کم پڑ گئے ہیں۔ مجھے چار سو روپیہ قرض چاہیے۔

ڈائریکٹر: روپئے۔ فدوی کے پاس اس وقت یہ چار سو روپیہ ہیں۔

ہلستا کوف: شکریہ۔

ڈائریکٹر: اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔

(وقفہ)

ہلستا کوف: ہیلو نمبر دار لوگ باب چنسکی داب چنسکی آیئے حضرات آیئے۔

داب چنسکی: باب چنسکی: ۔آداب

ہلستا کوف: آپ لوگوں کے پاس کچھ رقم ہے رقم۔

دونوں: کتنی رقم۔

ہلستا کوف: مجھے ایک ہزار روپیہ قرض چاہیے۔

باب چنسکی: جی نہیں۔ میرے پاس کل چالیس روپیہ ہیں۔

داب چنسکی: میری جیب میں کل پچیس روپیہ ہیں۔

ہلستا کوف: اچھا جس قدر روپیہ ہو اِدھر دو۔

باب چنسکی: میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں سرکار۔ آپ راجدھانی واپس جائیں اور شہنشاہ سے ملاقات کریں تو ان سے اتنا ضرور فرمادیں کہ فلاں صوبے کے فلاں قصبے میں ایک نمبر دار رہتا ہے جس کا نام پیٹراوانووچ باب چنسکی ہے۔

ہلستا کوف: ضرور ضرور تم لوگ اب جا سکتے ہو۔ (ہنستا ہے) ایک ہزار روپیہ اوسپ اوسپ۔

اوسپ: جی سرکار

ہلستا کوف: یہاں سرکاری افسروں نے ضرور کچھ نہ کچھ گول مال کر رکھا ہے اور شاید یہ لوگ مجھے حکومت کا کوئی بڑا افسر سمجھے ہوئے ہیں۔ (ہنستا ہے) کیسے اول درجے کے احمق ہیں سب۔ واہ بھئی واہ اوسپ۔

اوسپ: جی۔

ہلستا کوف: لاؤ ذرا قلم دوات لاؤ میں راجدھانی میں اپنے ایک دوست تریاپش کن کو سارا حال لکھتا

ہوں ہنستے ہنستے مرجائے گا کم بخت۔ وہ ضرور اس پر کوئی اچھی سی کہانی لکھ کر کسی رسالے میں چھپوا دے گا۔ (ہنستا ہے)

اوسپ: مگر سرکار۔ اب یہاں سے جلد بھاگنے کی تیاری کیجیے۔

ہلستا کوف: کیوں؟

اوسپ: ان لوگوں کو آپ پر کسی افسر کا دھوکا ہوا ہے۔ اب ان سے کہہ کر بہت تیز گھوڑوں کی گاڑی منگوا لیجیے۔ اگر بھید کھل گیا تو مصیبت آجائے گی۔

ہلستا کوف: ٹھیک ہے تو سامان باندھنا شروع کر۔ میں ذرا خط لکھ لوں۔

(باہر سے شور کی آواز آتی ہے)

یہ کیسا شور ہے۔

اوسپ: قصبے کے کچھ دوکان دار اور شہری آپ سے ملنے آئے ہیں سپاہی انھیں روک رہے ہیں۔

ہلستا کوف: میں خود دریچے سے دیکھتا ہوں (ذرا زوردار آواز سے) آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔

آوازیں: ہم سرکار کی خدمت میں درخواست پیش کرنے آئے ہیں۔

ہلستا کوف: اوسپ۔ لاؤ یہ درخواست مجھے دیدو تم سامان باندھو۔ (پڑھتا ہے)

"بحضور فیض گنجور وزیر مال۔ منجانب عبدلن سوداگر" ـــــ یہ سب کیا لکھا ہے۔

عبدلن: سرکار۔ ہمیں میئر اور قصبے کے ظالم افسران سے نجات دلایئے جب جی میں آتا ہے میئر کے آدمی ہمارے ہاں سے مفت مال لے جاتے ہیں۔ ہر تہوار پر ان کے بیوی بچوں کے لیے کپڑے بھیجنا پڑتے ہیں ورنہ وہ فوجیوں اور سپاہیوں کو ہمارے ہاں ٹھہرا دیتا ہے ہم تباہ ہو رہے ہیں۔ ایک ہماری بپتا سن لو سرکار۔

ہلستا کوف: تم لوگ ہم سے کیا چاہتے ہو۔

عبدلن: ہم یہ نذر لے کر حاضر ہوئے ہیں گڑ کی بھیلیاں اور شراب کے پیپے نذر میں لائے ہیں۔

ہلستا کوف: (غصے میں) تم سمجھتے ہو ہم رشوت لیتے ہیں یہ غلط ہے ہاں اگر تم ہمیں تین سو روپیہ قرض دے سکو تو اور بات ہے۔

عبدلن: پانچ سو روپے لے لیجیے ان داتا۔ مگر ہمیں ان موذیوں سے نجات دلا دیجیے۔

ہلستا کوف: ہم تمھاری شکایتوں پر غور کریں گے۔ اوسپ جاؤ ان لوگوں سے قرض کے روپئے لے لو۔

عورت کی آواز: مجھے اندر جانے دو۔ مجھے سرکار کے پاس جانے دو۔

ہلستا کوف: کون ہے۔ آنے دو۔

عورت: (روتے ہوئے) سرکار میں جمعدار کی بیوی ہوں مجھے اس موئے میئر نے کوڑوں سے پٹوایا ہے پولیس نے مجھے بازار میں پکڑ لیا اتنا مارا اتنا مارا کہ میں آٹھ دن اٹھنے بیٹھنے سے مجبور ہو گئی سرکار۔

ہلستا کوف: کیا بات تھی۔

عورت: کوئی بات نہیں سرکار۔ کچھ عورتیں بازار میں لڑ جھگڑ رہی تھیں وہ سب تو بھاگ گئیں۔ (روتے ہوئے) سپاہیوں نے ان کے بجائے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ مجھ دکھیاری کی مصیبت آگئی اتنا مارا ہے سرکار۔ (رونے لگتی ہے)

ہلستا کوف: ہم تمھاری شکایت پر غور کریں گے۔ اب اس وقت تم جاؤ ہم ان افسروں کو سزا دلوائیں گے۔

عورت: اللہ آپ کو دنیا جہان کی دولتیں دے۔

ہلستا کوف: اوسپ دروازہ بند کردو۔ سپاہیوں سے کہہ دو ہم اب کسی سے نہیں ملیں گے۔ کسی کو اندر نہ آنے دیں۔ ہم آرام کرنے جا رہے ہیں۔

اوسپ: بہت اچھا حضور۔ (دروازہ بند کرنے کی آواز قدموں کی چاپ)

ہلستا کوف: اوہ ماریا تم اس وقت کہاں؟

ماریا: کہیں نہیں یور ایکسی لینسی۔ میں نے آپ کے کام میں تو خلل نہیں ڈالا۔

ہلستا کوف: دنیا کو کوئی کام بھی ایک حسین اور خوبصورت لڑکی سے باتیں کرنے سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ تم بڑی خوبصورت ہو۔ آؤ۔

ماریا: آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ ہم دیہاتی لڑکیوں کا آپ جیسے بڑے آدمی اس طرح مذاق اڑایا کرتے ہیں۔

ہلستا کوف: غلط۔ تمھاری آنکھوں کا جادو ہر انسان کو فتح کر سکتا ہے۔

ماریا: میں تو آپ سے یہ کہنے آئی تھی کہ میری بیاض پر کوئی چھوٹی سی نظم لکھ دیجیے۔

ہلستا کوف: جتنی چاہے نظمیں لکھا لیجیے۔ آیئے آپ مجھ سے دور دور کیوں بھاگتی ہیں۔ مجھ سے قریب آیئے۔ مجھے تم سے محبت ہے ماریا۔ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔

ماریا: خدا کے لیے مجھے چھوڑ دیجیے۔ مجھے آپ نے کوئی دیہاتی لڑکی سمجھ لیا ہے۔

ہلستا کوف: مجھے معاف کر دو ماریا۔ میں تمھارے پاؤں پڑتا ہوں۔ دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔

اینا: ماریا بیٹی۔ ماریا بیٹی۔ ارے یہ کیا یور ایکسی لینسی آپ اس چھوکری کے آگے کیوں جھکے ہوئے ہیں۔ جاؤ ماریا بدتمیز کہیں کی۔ جاؤ۔

ہلستا کوف: (بات کاٹ کر) نہیں محترمہ۔ مجھے آپ سے محبت ہے میں آپ کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔

اینا: مگر۔ مگر۔ یور ایکسی لینسی میری شادی ہو چکی ہے۔

ہلستا کوف: کوئی بات نہیں قانون کچھ بھی کہے ہم اس زمین و آسمان سے دور چلے جائیں گے۔ ہم کہیں اور دنیا بسا لیں گے۔

(ماریا آتی ہے)

ماریا: امی۔ امی۔ ابا جان بلا رہے ہیں۔

ہلستا کوف: آؤ ماریا۔

مئیر: (گھبرایا ہوا) یور ایکسی لینسی۔ مجھے تباہ نہ کیجیے۔ میری عزت آپ کے ہاتھ ہے۔ یہ دوکاندار سب چور ہیں اور پرلے درجے کے جھوٹے ہیں۔ یہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور مجھے بدنام کرتے ہیں۔ جمعدار کی بیوی کو میں نے کوڑے نہیں لگوائے اس نے خود اپنے کوڑے لگائے ہیں۔ مجھے بچا لیجیے سرکار۔

ہلستا کوف: جمعدار کی بیوی۔ گولی مارو اس کم بخت کو۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔

مئیر: میرے لائق کوئی خدمت۔

ہلستا کوف: مئیر صاحب اگر میں اور ماریا ایک دوسرے کے شریک حیات ہو جائیں تو۔

مئیر: سرکار۔ میں اتنی بڑی عزت کے لائق نہیں ہوں۔ خدایا تیرا لاکھ شکر ہے۔ خدایا میں تیرا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ مجھے منظور ہے سرکار۔

ہلستا کوف: میں واپس آتے ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔

میئر: آپ کہاں جا رہے ہیں۔

ہلستا کوف: مجھے فوراً اپنے ایک چچا سے ملنے جانا ہے۔ایک دو دن میں واپس چلا آؤں گا۔آپ سارا سامان تیار رکھیے گا۔

اوسپ: سرکار۔سرکار۔گھوڑا گاڑی تیار ہے۔

ہلستا کوف: اچھا میرا سامان رکھو میں ابھی آیا۔

میئر: آپ کو شاید سفر خرچ کے لیے کچھ روپیہ کی ضرورت ہو۔یہ دو سو روپیہ حاضر ہیں۔انھیں رکھ لیجیے۔

ہلستا کوف: اچھا لائیے۔اب آپ کے چار سو میرے ذمے ہو گئے۔اچھا مجھے اب اجازت دیجیے۔خدا حافظ۔ماریا خدا حافظ۔ماریا ڈارلنگ۔

(گھوڑا گاڑی چلنے کی آواز)

اینا: ڈارلنگ۔اب ہم سب بھی ماریا کے ساتھ راجدھانی میں ہی رہنے لگیں گے۔

میئر: ہاں اینا ڈارلنگ۔تمھارا جی تو خوب لگے گا۔خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے بھلا کس نے سوچا تھا کہ حالات ایسا پلٹا کھائیں گے۔اب تو بس راج کریں گے۔

اینا: تم کو نائٹ کا خطاب مل جائے گا۔مگر تمھیں اپنی ساری عادتیں بدلنی پڑیں گی۔چھوٹے موٹے ججوں اور پوسٹ ماسٹروں سے دوستی چھوڑ کر تمھیں گورنروں اور سفیروں سے دوستی کرنا پڑے گی۔

میئر: اب دیکھنا ان کم بخت دکان داروں سے کیسا سمجھتا ہوں۔ابھی ان سب دوکانداروں کو پکڑ کے بلواتا ہوں بڑے چلے تھے میری شکایت کرنے۔وہ میرا داماد بننے والا ہے۔ہونہہ۔

(سپرنٹنڈنٹ۔جج۔ڈائریکٹر۔نمبردار وغیرہ آتے ہیں۔بینڈ مبارک باد کا نغمہ بجا رہا ہے)

سب: میئر صاحب ہماری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

میئر: سب خدا کا کرشمہ ہے جج صاحب اور آپ لوگوں کی مہربانی ہے سپرنٹنڈنٹ صاحب

اس نے ہماری توقع سے زیادہ بخشا۔ اس کی رحمت کے قربان۔

باب چنسکی: خدا ہماری بٹیا کو سلامت رکھے۔ سدا سہاگن رہے۔

مئیر: ہاں بھئی آپ لوگوں کی دعائیں چاہئیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ اب قصبہ چھوٹ جائے گا۔ ہم لوگ بھی راجدھانی ہی چلے جائیں گے۔

سپرنٹنڈنٹ: ہم لوگوں کو نہ بھلا دیجیے گا مئیر صاحب۔

جج: اور ہاں مئیر صاحب اگر کوئی جگہ نکلے تو خیال رکھئے گا۔

مئیر: ضرور۔ ضرور۔ اپنے دوستوں کی خدمت کے لیے میں حاضر ہوں۔ پوسٹ ماسٹر صاحب نہیں دکھائی دیے۔

(پوسٹ ماسٹر صاحب آتے ہیں)

پوسٹ ماسٹر: غضب ہو گیا دوستو! جس کو ہم انسپکٹر جنرل سمجھے ہوئے تھے وہ انسپکٹر جنرل نہیں تھا۔

سب: کیا؟ انسپکٹر جنرل نہیں تھا۔

پوسٹ ماسٹر: ۔ جی ہاں۔ بالکل نہیں تھا۔ مجھے ابھی ایک خط سے پتا چلا ہے۔

مئیر: کیا بکتے ہو۔ کس کا خط۔ کیسا خط؟

پوسٹ ماسٹر: ارے خود اس کا خط۔ اس نے ایک دوست کو خط لکھا تھا۔ میں نے راجدھانی کو جانے والا خط دیکھا تو روک لیا کہ ذرا دیکھوں اس افسر نے ہماری کیا شکایتیں لکھی ہیں۔ میں نے خط کھول لیا۔

مئیر: بدتمیز۔ تم نے اتنے بڑے آدمی کا خط کھولنے کی ہمت کیسے کی۔ میں تمھیں گرفتار کرادوں گا۔

پوسٹ ماسٹر: آپ ابھی اتنے بڑے آدمی نہیں ہیں مئیر صاحب۔

مئیر: تمھیں خبر ہے کہ وہ میرا داماد ہونے والا ہے۔

پوسٹ ماسٹر: ذرا خط سن لیجیے۔ مجھے سب خبر ہے۔ سب کچھ خبر ہے۔

سب: سناؤ خط پڑھو۔

پوسٹ ماسٹر: (کھنکارتے ہوئے) لکھتا ہے۔ ''میرے دوست تریاپشن کن۔ میں تمھیں اپنے دلچسپ سفر کا حال لکھ رہا ہوں۔ میں سب کچھ ہار گیا تھا مگر یہاں شہر والوں نے میری

شکل وصورت یا حلیہ کی وجہ سے انسپکٹر جنرل قسم کی کوئی چیز سمجھ لیا اور اب میں میئر کے گھر پر عیش کر رہا ہوں۔ اس کی بیوی اور لڑکی دونوں حسین ہیں۔ ابھی تک یہ طے نہیں کر پایا ہوں کہ کس سے عشق کرنا بہتر رہے گا۔ میرا ارادہ محترمہ سے شادی کرنے کا ہے۔ یہاں سب مجھے دھڑا دھڑ قرضہ دے رہے ہیں۔ چاندی برس رہی ہے۔ عجیب عجیب لوگ ہیں۔ سب سے پہلے میئر ہے بالکل ہی اول درجے کا احمق ہے۔

میئر: (چلا کر) جھوٹ۔ وہ خط میں یہ نہیں لکھ سکتا۔

پوسٹ ماسٹر: صاف تو لکھا ہے بالکل ہی اول درجے کا احمق ہے۔

میئر: تم نے اپنے آپ لکھ لیا ہوگا۔ اچھا آگے پڑھو۔

پوسٹ ماسٹر: ہاں تو "اول درجے کا احمق ہے۔"

میئر: بار بار اسی کو پڑھے جاؤ گے۔ اس کے دہرانے سے کیا فائدہ۔

پوسٹ ماسٹر: ہونہہ۔ ہوں۔ ہوں......... اور یہاں اس نے میرے بارے میں گستاخی کی ہے۔

میئر: جی نہیں زور سے پڑھیے۔

ڈائریکٹر: لائیے۔ میں پڑھتا ہوں "اور پوسٹ ماسٹر عین مین ہمارے دفتر کے بدلو چوکیدار سے ملتا جلتا ہے بدمعاش کہیں کا" .... اور ڈائریکٹر ہسپتال......... آگے کے الفاظ صاف نہیں پڑھے جاتے۔ اسے چھوڑ کر آگے پڑھتا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: نہیں نہیں۔ ہر لفظ پڑھو۔ لائیے۔ میں پڑھتا ہوں۔ ڈائریکٹر ہسپتال بالکل چغد ہے اور اس کی بالائی عمارت کرائے کے لیے خالی ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

ڈائریکٹر: یہ کیا مذاق ہوا۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ لائیے۔ میں پڑھتا ہوں۔ اور سپرنٹنڈنٹ تعلیمات معطر انسان ہے لیکن پیاز کی خوشبو میں بسا ہوا اور جج.....

جج: میں سمجھتا ہوں حضرات خط کافی لمبا ہے۔ باقی حصہ چھوڑ دیا جائے۔

ڈائریکٹر: جی نہیں۔ (پڑھتا) اور جج لیا پکن ٹیا پکن پرلے سرے کا بدمعاش اور چار سو بیس ہے لیکن مجموعی طور پر یہ لوگ دل کے اچھے اور سیدھے سادے ہیں۔ تم ان کرداروں کو اپنی

کہانی میں شامل کرنا۔تم یہاں ہوتے تو ہنسی کے مارے مرجاتے۔مجھے گھر کے پتے پر خط لکھنا۔

تمھارا ہلستاکوف

میئر: بدمعاش۔چور۔دھوکہ باز کہیں کا۔ارے کوئی ہے۔اس بدمعاش کو پکڑ لاؤ۔میں جان سے ماردوں گا۔کمینہ کہیں کا۔

پوسٹ ماسٹر: اسے پکڑنا اب مشکل ہے۔اس کے لیے تو سب سے تیز رفتار گھوڑوں کی گاڑی آپ ہی نے تو دلوائی تھی۔

میئر: اوفوہ۔میں تو لٹ گیا۔مجھے تو غارت کر گیا کم بخت۔۴۰۰ روپیہ اور ماریا کی منگنی۔

اینا: ماریا کی منگنی اس سے ہو چکی ہے۔

میئر: چپ ہو جاؤ۔اس کو گولی مارو۔

جج: اور مجھ سے تین سو روپیہ لے گیا کم بخت۔

پوسٹ ماسٹر: اور میں نے تو صبر کر لیا تین سو روپیوں کو۔

سپرنٹنڈنٹ: مکار کہیں کا۔مجھے مل جائے تو کچا کھا جاؤں۔تین سو روپیہ ہضم کر گیا۔

میئر: یہ تھا کون جس نے ہمیں سب سے پہلے اطلاع دی۔کہاں ہے باب چنسکی کہاں ہے۔وہ گدھے کہیں کے (نقل اتارتے ہوئے) انسپکٹر جنرل آ گیا۔صاحب وہ ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہے۔میراسر۔ہونہہ۔

داب چنسکی: نہیں میئر صاحب یہ باب چنسکی نے بتایا تھا آپ کو۔

میئر: بکواس بند کرو۔دیکھو یہ سپاہی کون آ رہا ہے۔

سپاہی: بادشاہ سلامت کی مرکزی حکومت سے بھیجے ہوئے سرکاری انسپکٹر جنرل تشریف لے آئے ہیں اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔آپ سب کو انھوں نے فوراً طلب فرمایا ہے۔

☆☆☆

حکم کی بیگم

(گھنٹہ پانچ بجاتا ہے)

ناروموف: اوہ۔ صبح ہو گئی۔ پانچ بج گئے۔ بھئی اب تاش کھیلنا موقوف۔ اب کھانا شروع کیا جائے۔ (گھنٹی بجاتا ہے) یہ نوکر سب کہاں مر گئے۔

سورن: ناروموف یار اس وقت کیا کھانا کھایا جائے گا۔

نارو: واہ سورن۔ یہاں سب لوگ ہارے ہی تھوڑا ہیں۔ جیتنے والے ڈٹ ڈٹ کر کھائیں گے اور ہارنے والے نوالے گنیں گے۔

ہرمان: یا خالی پلیٹوں کو تکیں گے۔

نارو: لو کھانا آ گیا — ہاں بھئی سورن آج تمھارا کھیل کیسا رہا۔ جیتے یا ہارے؟

سورن: حسب معمول ہارے یار دوست اور جی کھول کر ہارے۔ ہماری تو سمجھ کام نہیں کرتی۔ کچھ قسمت ہی کا پھیر ہے۔

نارو: یہ بات نہیں سورن۔ تاش کا کھیل ہی ایسا ہے۔ ہار بھی اور جیت بھی۔

سورن: ارے نہیں یار۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ کبھی بہت بڑھ کے نہیں بولتا۔ ہمیشہ ٹھنڈے دماغ سے کھیلتا ہوں مگر پھر بھی ہمیشہ ہارتا ہی ہوں۔

نارو: ہاں یہ بات تو ہے تمھیں کبھی روپیہ کا بہت زیادہ لالچ نہیں ہے۔ تم ہر ایک بازی میں داؤں نہیں لگاتے۔ تمھارے استقلال پر مجھے تعجب ہے۔

ٹامسکی: استقلال کی نہ کہو۔ انجینئر صاحب بیٹھے ہیں۔ استقلال تو ان کے پاس ہے۔ ارے ذرا غور تو کرو کبھی اس شخص نے تاش کو ہاتھ نہیں لگایا کبھی کسی پتے پر بولی نہیں بولی اور پھر بھی

وہ کس استقلال سے بیٹھا صبح پانچ بجے تک ہمارا کھیل دیکھتا رہا۔

نارو: ہرمان کے بارے میں کہہ رہے ہو یا ٹامسکی۔

ہرمان: یہ آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔ مجھے کھیل دیکھنے میں بڑا مزا آتا ہے مگر میں اپنی جیب کا پیسہ آنے والے موہوم خزانے کی امید میں خرچ نہیں کرسکتا۔

ٹامسکی: ہرمان کی احتیاط سمجھ میں آسکتی ہے۔ جرمن لوگ یوں بھی بہت احتیاط برتتے ہیں۔ دراصل تعجب تو مجھے اپنی دادی کاؤنٹس انناقیدوتونا پر آتا ہے۔

سب: کس بات پر۔

ٹامسکی: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری دادی کیوں تاش کو ہاتھ نہیں لگاتی۔

سورن: یار تمھاری عقل بہت موٹی ہے۔ ارے اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ۸۰ برس کی بوڑھی کاؤنٹس صاحبہ تاش نہیں کھیلتیں تو اس میں تعجب کیا۔

سورن: ہاں مجھے اور کچھ معلوم نہیں۔

ٹامسکی: تو سنو۔ میں تمھیں بتاتا ہوں۔ اب سے ساٹھ برس پہلے کی بات ہے جب میری دادی پیرس گئی تھیں۔ ان کی خوبصورتی اور شائستگی نے پیرس میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ لوگ ماسکو کی حسینہ کو دیکھنے کے لیے آتے تھے فرانس کا وزیر اعظم رشلو ان سے ملنے آیا اور میری دادی خود کہتی ہیں کہ اس نے رشلو جیسے انسان کو بھی تگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔ اس زمانے میں عورتیں تاش کے پتوں کا ایک خاص کھیل کھیلتی تھیں۔ ایک بار محل سرا میں ایک تقریب کے موقع پر میری دادی نے ڈیوک آف ارلیاں سے بہت بڑی رقم ہار دی۔ گھر واپس آتے ہی انھوں نے ساری آرائش اتار پھینکی۔ ہمارے دادا اپنے صوفے پر آتش دان کے قریب بیٹھے پائپ پی رہے تھے اور دادی سے بہت ڈرتے تھے اور ان کی کسی بات کو ٹال نہ سکتے تھے۔ ان کا غصہ دیکھ کر گھبرا گئے۔

کاونٹ: اینا۔ پیاری اینا۔ کیا ہوا تمھیں کیا ہوگیا۔

کاؤنٹس: کچھ نہیں۔ تم سے مطلب۔ اپنا کام کرو۔

کاؤنٹ: اپنا کام تو کر ہی رہا ہوں بتاؤ نا۔ تم سیدھی محل سے آرہی ہونا۔

کاؤنٹس: ہاں ڈیوک آف ارلیاں سے تاش کھیل رہی تھی۔

کاؤنٹ: پھر کیا ہوا۔

کاؤنٹس: میں نے ڈیوک کو ۴۷ ہزار روبل ہار دیئے ہیں۔

کاؤنٹ: ۴۷ ہزار روبل — اوہ خدایا — یہ تم نے کیا کیا پیاری انا۔ میں اس نقصان کو کیسے پورا کر سکوں گا۔ میں اس قرضے کو کیسے ادا کرسکوں گا۔

کاؤنٹس: چیخو مت۔ قرضہ کو ادا کرنا ہی ہے۔ کسی طرح بھی کیوں نہ ہو۔

کاؤنٹ: مگر انا۔ تمھیں معلوم ہے کہ تم پچھلے مہینے میں ۵ لاکھ روبل خرچ کر چکی ہو اور ہم پیرس میں ہیں جہاں سے ماسکو بہت دور ہے اور ہماری جاگیر ساروتوف بھی۔ اتنا روپیہ کہاں سے ملے گا۔

کاؤنٹس: کہیں سے بھی ہو۔ مجھے روپیہ چاہیے۔ میں ڈیوک آف ارلیاں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔

کاؤنٹ: میں روپیہ دینے سے انکار کرتا ہوں۔

کاؤنٹس: کہیں سے قرض بھی نہیں لیا جاسکتا۔ آخر تم کاؤنٹ ہو۔ کاؤنٹ ہو کر قرضوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ہم کوئی ٹٹ پونجیے نہیں کہ قرض ادا نہ کرسکیں۔

کاؤنٹ: نہیں میں ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔

کاؤنٹس: (چیختی ہے) پیسہ نہیں دے سکتے۔ اپنی بیوی کو ذلیل ہوتے دیکھ سکتے ہو۔ تم سمجھتے ہو ڈیوک اپنے دل میں کیا کہے گا۔ اس پر مجھ سے محبت جتاتے ہو۔ مجھے نہیں چاہیے ایسی محبت۔ جہنم میں جاؤ تم اور تمھاری محبت۔

ٹامسکی: گھر میں خوب طوفان مچا۔ دونوں ایک دوسرے سے خفا رہے۔ دوسرے دن ہماری دادی نے شاید زندگی میں پہلی بار غصے کے بجائے نرمی سے دادا کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ مگر انھوں نے صاف انکار کردیا۔ پریشانی کے عالم میں گھبرائی وہ اپنے ایک دوست کاؤنٹ سینٹ جرمان سے قرضہ مانگنے گئیں۔ یہ بڑا پراسرار آدمی تھا اور اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کے پاس امرت

ہے۔ کوئی کہتا اس کے پاس کیمیا کا نسخہ ہے۔ پھر بھی وہ آدمی یاروں کا یار تھا۔ میری دادی نے اسے روپیہ کے لیے خط لکھا بوڑھا کاؤنٹ فوراً ہی دوڑا ہوا گھر چلا آیا۔ یہاں آکر دیکھا کہ ہماری دادی جان سوگ میں بیٹھی تھیں اور پریشان تھیں۔ ماجرا پوچھا تو دادی نے اپنے شوہر کی بے رحمی اور ضد کا سارا قصہ سنایا اور اس سے روپیہ قرض دینے کے لیے بوڑھے کاؤنٹ سینٹ جرمان نے ساری کہانی سن کر سر ہلایا اور کہا —— ''مجھے آپ پر بھروسہ ہے کہ آپ میرا روپیہ ضرور ادا کریں گی۔ مجھے قرضہ دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کی ایک اور بھی ترکیب ہے۔ آپ اپنا سارا روپیہ کھیل میں جیت کیوں نہ لیجیے۔ ایک پیسہ خرچ کیے بغیر آپ اپنا سارا روپیہ جیت سکتی ہیں۔'' اور سینٹ جرمان نے دادی کو تین ایسے پتے بتائے جن کا جیتنا یقینی ہے۔

نارو: پھر کیا ہوا؟

سورن: پھر ہوا ٹامسکی۔

ٹامسکی: ذرا دیا سلائی مجھے دو۔ میں پائپ جلاؤں گا (پائپ جلاتا ہے) ہاں تو پھر دوسرے دن شام کو میری دادی کاؤنٹس اپنا فیدا لٹونا پھر شاہی محل پہنچیں ڈیوک آف ارلیاں سے قرضہ ادا کرنے کی معذرت کی اور اِدھر اُدھر کے بہانوں کے بعد کھیل جم گیا۔ دادی نے تین پتے چنے اور تینوں پتے شروع ہی میں ایک ایک کر کے جیت گئے اور انھیں ساری رقم واپس مل گئی۔

نورو: (قہقہہ) اتفاق کی بات ہے۔

سورن: نشان کے پتے ہوں گے۔

ٹامسکی: جی نہیں۔

نورو: اوہو تو آپ سنجیدہ ہیں۔ اگر تمھاری دادی کو واقعی ایسے تین پتے معلوم ہیں جن کا جیتنا یقینی ہے تو پھر تم ابھی تک لکھ پتی کیوں نہیں بنے۔ تم نے ان سے یہ بھید ابھی تک کیوں نہیں پوچھا۔

ٹامسکی: یہی تو مصیبت ہے۔ وہ اپنا بھید کسی کو نہیں بتاتیں۔ تم جانتے ہو میرے باپ کے علاوہ

میری دادی کے تین بیٹے اور تھے اور چاروں بیٹے تاش کے بے حد شوقین تھے لیکن ان میں سے کسی کو بھی اپنا راز نہیں بتایا۔

نورو: پھر تمھیں کیسے پتا چلا۔

ٹامسکی: مجھے چچا کاؤنٹ ایون ایلیچ نے بتایا۔انھوں نے اپنی سوگند کھا کر کہا تھا دادی نے یہ راز فقط ایک بار بتایا تھا۔

نورو: وہ کون خوش نصیب تھا۔

ٹامسکی: چپ لٹز کی کو تو تم جانتے ہو گے۔

نورو: وہی جو غریبی کی حالت میں مرا ہے۔اس نے ساری جائداد تاش کی بازی ہی کی نذر کردی۔لاکھوں لٹا دیے ظالم نے۔

ٹامسکی: ہاں وہی چپ لٹز کی۔جوانی کے دنوں میں اس نے تین لاکھ روبل ہار دیئے تھے اور بے چارا بالکل نادار ہو گیا تھا۔میری دادی فضول خرچ نوجوانوں سے بہت سختی برتتی تھیں مگر انھوں نے چپ لٹز کی پر رحم کھا کر اسے تین پتوں کا راز بتایا اور اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ کبھی تاش کو ہاتھ نہ لگائے گا۔

نورو: تو پھر وہ جیت گیا۔

ٹامسکی: ہاں وہ اپنے جیتنے والے ساتھی کے پاس پہنچا۔پہلی بازی ہی میں اس نے دو ہزار روبل لگا دیے اور فوراً جیت گیا۔دوسرے میں ایک لاکھ لگائے اور تیسرے میں دو لاکھ۔

نورو: خواب۔ہارا ہوا سب روپیہ مل گیا۔

ٹامسکی: اس سے بھی زیادہ۔(چھ بجتے ہیں)

نورو: چھ بج گئے۔

سورن: ہاں بھئی اب محفل برخاست ہونی چاہیے۔اچھا نوروموف آج کی دعوت اور کھیل دونوں کے لیے شکریہ۔صبح بخیر۔

سب: اچھا بھئی۔

ہرمان: موسیو نوروموف۔

نورو: آ۔ روو ا۔ ہرمان۔ آروا۔

راوی: اور ہرمان واپس چلا آیا لیکن کاؤنٹس کی کہانی اس کا پیچھا کرتی رہی۔ ہرمان ایسے جرمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ایک زمانے سے روس میں آ کر بس گیا تھا۔ اس کو ورثے کے طور پر بہت تھوڑی سی رقم ملی تھی۔ ہرمان کے بہت سی خواہشیں اور ارمان تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ارمان کافی روپے کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا لیکن اپنی مجبوریوں کو سمجھتا تھا اس لیے انجینئر کی حیثیت سے اس کو جو تنخواہ ملتی تھی اسی پر گزر بسر کرتا تھا وہ بھی عیش اور مستی کا رسیا تھا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح شراب شباب اور تاش پر بازی لگانا چاہتا تھا مگر وہ ورثے کی رقم کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتا تھا اور اس کی مختصر تنخواہ میں اس عیش و عشرت کی گنجائش نہیں تھی وہ دل سے جوا کھیلنے کا شوقین تھا اور رات رات بھر بیٹھے تاش دیکھتا رہتا تھا مگر احتیاط کی وجہ سے وہ تاش کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ دن بھر تاش کے تین پتوں کی کہانی اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتی رہی کاش کسی صورت سے کاؤنٹس اسے اپنا یہ راز بتا دے۔ کاش کسی طرح اسے وہ تین پتے معلوم ہو جائیں جن کا جیتنا یقیناً ہے۔ رات بھر وہ خواب دیکھتا رہا۔ لوگ سبز میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے ہیں۔ ہر بار وہ جیت رہا ہے اور ایک چھنا کے کے ساتھ سارے روپے بٹور لیتا ہے۔ اس کی جیبیں سکوں سے بھر گئی ہیں۔ دوسرے دن وہ اسی سوچ میں ٹہلنے چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اسے یہ بھید جلد معلوم ہونا چاہیے۔ کاؤنٹس ۸۰ برس کی بڑھیا ہے اس سے پہلے کہ وہ مر جائے اسے کاؤنٹس تک پہنچنا چاہیے۔ اگر یہ بھید اسے معلوم ہو جائے تو اس کے سارے خواب پورے ہو جائیں گے۔ سارے ارمان نکل جائیں گے۔ اسی طرح ٹہلتے ہوئے وہ اتفاق سے کاؤنٹس کے محل تک جا کھڑا ہوا اور عین اس وقت جب وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا اوپر کی کھڑکی کھلی اور کاؤنٹس کی نوجوان خادمہ لزاوینا کھڑکی کے سامنے دکھائی دی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس نے لزاوینا کے ذریعے کاؤنٹس تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ اس ایک لمحے نے ہرمان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ وہ روز اسی کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑا ہوتا اور

لزاوینا کو دیکھا کرتا۔ ایک دن کاؤنٹس سیر کے لیے باہر جانے کے لیے سنگھار کر رہی تھی۔

کاؤنٹس: لزاوینا۔ لزاوینا۔ سنتی کیوں نہیں۔

لزاوینا: آئی مادام۔

کاؤنٹس: تمھیں کیا ہو گیا ہے لزاوینا۔ تم کچھ سنتی کیوں نہیں ہو۔ کیا ہے، ہوا تمھیں۔

لزاوینا: کچھ بھی تو نہیں مادام۔

کاؤنٹس: تمھیں پتا ہے کہ آج سیر کے لیے باہر جانا ہے۔ مجھے سنگھار کرنا ہے۔ وہ تینوں خادمائیں کہاں ہیں۔

لزاوینا: جی وہ آرہی ہیں مادام۔

کاؤنٹس: روج ادھر لاؤ — اوہ — ذرا تمیز نہیں تم لوگوں کو۔ ہیروئین کا بکس کہاں ہے۔ ہاں۔ وہ سرخ ربن کہاں ہے — توبہ آج کل کی خادمائیں آرائش کا ہنر بھی نہیں جانتیں — آج سے ساٹھ سال پہلے۔

ٹامسکی: بوں ژو۔ گراں ماما۔ بوژو۔

کاؤنٹس: اوہ پال ٹامسکی۔ آؤ پال۔ چلے آؤ۔

ٹامسکی: بوژو موازال لیزے۔

لی: بوژو موسیو۔

ٹامسکی: دادی آپ کو ذرا سی زحمت دینا ہے۔

کاؤنٹس: کہو پال۔

ٹامسکی: بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنے ایک دوست کا تعارف آپ سے کرانا چاہتا ہوں اور آپ اجازت دیں گی تو اسے اپنے ساتھ جمعہ کے دن رقص گاہ میں بھی لیتا آؤں گا۔

کاؤنٹس: ہاں اپنے دوست کو سیدھے رقص گاہ میں لیتے آنا، وہیں مجھ سے تعارف کرا دینا، ہاں تم رین کے یہاں گئے تھے۔

ٹامسکی: جی ہاں، اچھی صحبت رہی اور صبح ۵ بجے تک رقص ہوتا رہا اور وہ مدمزل یلتاز کا یا کس قدر

حسین لگ رہی تھیں۔

کاؤنٹس: مگر میرے بچے وہ لڑکی تو نام کو بھی خوبصورت نہیں تم نے اس کی دادی پرنس واریا پتروینا کو دیکھا ہے۔اب تو کافی بوڑھی ہوگئی ہوں گی وہ بھی۔

ٹامسکی: بوڑھی ہوگئی؟ انھیں مرے ہوئے سات سال ہوگئے۔

کاؤنٹس: اس کا انتقال ہوگیا، خیر مجھے معلوم نہیں تھا، ہم دونوں پہلی بار شاہی محل میں ساتھ گئی تھیں، لزے میرا اسنف بکس کہاں ہے۔ پال تم یہاں بیٹھوں میں جا کر اپنا سنگھار پورا کرلوں۔

پال: (چپکے سے) موسیو ٹامسکی، آپ کاؤنٹس سے کس کا تعارف کروانے والے ہیں۔

ٹامسکی: ناروموف کا، کیا تم اسے جانتی ہو۔

پال: نہیں، وہ فوج میں یا سول سروس میں۔

ٹامسکی: فوج میں۔

پال: وہ انجینئر تو نہیں ہے؟

ٹامسکی: نہیں وہ سواروں میں ہے لیکن تم نے کیسے سمجھا کہ وہ انجینئر ہے۔

پال: (مسکراتی ہے) میں نے تو یوں ہی کہہ دیا۔

کاؤنٹس: (دور سے) پال، میرے لیے کوئی ناول بھیج دینا، مگر خدا کے لیے اس قسم کے نہیں جیسے آج کل کے مصنف الٹے سیدھے ناول لکھتے ہیں، سنا پال۔

ٹامسکی: بہت اچھا گراں ماما، میں اب چلتا ہوں، آروا گراں ماما، گڈ بائی۔

کاؤنٹس: لزے، لزے۔

لزے: جی مادام:

کاؤنٹس: گاڑی تیار ہوگئی۔

لزے: جی مادام۔

کاؤنٹس: گاڑی تیار ہوگئی۔

لزے: جی نہیں مادام۔

کاؤنٹس: اوہ، آج کیا ہوگیا ہے تمھیں لزے۔ جاؤ گاڑی تیار کراؤ، ہم سیر کو جائیں گے۔

لزے: پرنس پاول الیگزنڈروف کا خدمت گار یہ چند ناول لے کر آیا ہے۔

کاؤنٹس: اچھا اس سے کہو کہ ہماری طرف سے پرنس پاؤل کا شکریہ ادا کرے۔ اور تم کہاں جا رہی ہو۔

لزے: میں بھی باہر جانے کے لیے کپڑے بدل لوں۔

کاؤنٹس: اوہ، ابھی بہت وقت ہے، بیٹھو اس ناول کو اٹھاؤ ذرا اسے پڑھ کر سناؤ، ہاں ذرا کرسی اور قریب کرلو، اور قریب، بس بس ٹھیک ہے۔

لزے: (ناول پڑھتے ہوئے) پیٹر اعظم نے جن لوگوں کو علم و فضل حاصل کرنے کے لیے باہر کی درسگاہوں میں بھیجا تھا ان میں ایک نیگرو ابراہیم نامی بھی تھا، پیرس کے فوجی اسکول میں تعلیم پانے کے بعد وہ توپ خانہ کا کپتان بنا دیا گیا اور جنگ ہسپانیہ میں ____

کاؤنٹس: ذرا زور سے پڑھو، تمھاری آواز کو کیا ہو گیا ہے لزے۔

لزے: جنگ ہسپانیہ میں بڑا نام پیدا کیا اور بہت زیادہ زخمی ہونے کی وجہ سے پیرس بھیج دیا گیا۔

کاؤنٹس: بند کرو، نہ جانے کیا بکواس ہے۔ یہ آجکل کے مصنف نہ جانے کیا الٹا سیدھا لکھ مارتے ہیں۔ کوئی دلچسپ بات نہیں، گاڑی تیار ہوگئی۔

لزے: جی ہاں، گاڑی تیار ہے۔

کاؤنٹس: اور تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے لزے، افوہ مجھے ہمیشہ تمھارا انتظار کرنا پڑتا ہے لزے، بہت بری بات ہے، جاؤ کپڑے بدلو (وقفہ) (گھنٹی کی آواز) افوہ تم نے بہت دیر لگا دی، خیر خدا کا شکر ہے تم تیار تو ہو گئیں۔ مگر یہ اس قدر کا سنگھار کیا ہے تم نے، توبہ توبہ کس کو دکھانا چاہتی ہو۔ موسم کیسا ہے لزے۔

لزے: کافی خوشگوار ہے مادام۔

کاؤنٹس: تم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے بات کہہ دیتی ہو، کھڑکی کھولو۔ (ہوا کا شور) افوہ کس قدر تند اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ گاڑی بان سے کہو گھوڑے کھول دے، ہم سیر کو جائیں گے اور تمھارے سنگھار کی بھی ضرورت نہیں ہے تم اپنا کام کرو۔

راوی: لزاودینا اس زندگی سے تنگ آچکی تھی، وہ بھی نوجوان تھی لیکن اس کی جوانی اس بوڑھی

کاؤنٹس کی خدمت گزاری میں کٹ رہی تھی، کبھی ناول پڑھ کر سنانا ہے کبھی اس کے سنگھار میں مدد کرنا کبھی سیر کے لیے جانا گویا وہ خود کچھ بھی نہیں۔ اسے صرف کاؤنٹس کی حکم برداری کرنا ہے، وہ رقص کی ہر محفل میں شریک ہوتی، بڑی بڑی پارٹیوں میں جاتی، سب اسے جانتے تھے مگر کاؤنٹس کی مصاحبہ کی حیثیت سے کوئی نوجوان اس کے ساتھ رقص نہ کرتا تھا، کیا اسے کوئی نہ چاہے گا، کیا وہ کسی کی توجہ کے قابل نہیں ہے، عین اس زمانے میں جب یہ سوال اسے بہت پریشان کر رہا تھا اس نے ہرمان کو اپنی طرف متوجہ پایا، وہی ہرمان جو روز کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوکر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے آتا تھا، اس روز جب وہ بیزار ہوکر باہر جانے کے کپڑے بدل رہی تھی پھر کاؤنٹس نے اسے آواز دی۔

کاؤنٹس: لزے، لزے، کیا کر رہی ہو لزے۔

لزے: ابھی آئی مادام، میں پوشاک تبدیل کر رہی ہوں۔

کاؤنٹس: خوب لڑکی ہے یہ بھی، پوشاک مت بدلو، ہم تفریح کے لیے باہر جائیں گے۔

لزے: مگر مادام آپ تو۔

کاؤنٹس: نہیں موسم بہت خوشگوار ہے، چلو جلدی آؤ، خدمت گاروں کو بلاؤ، مجھے گاڑی تک لے چلیں۔

لزے: آیئے۔

کاؤنٹس: تم جاؤ خدمت گاروں کو بھیج دو، تم گاڑی کو دیکھو۔

لزے: بہت اچھا (جاتی ہے) (وقفہ)

ہرمان: سنئے۔

پال: کون؟ (ڈر کر)

ہرمان: یہ خط، ذرا یہ خط پڑھنے کی زحمت کیجئے، اچھا۔

کاؤنٹس: (زور سے) لزے، گاڑی میں میرا سنف باکس رکھ دینا، شال رکھ دی ہونا۔

ہرمان: (سرگوشی میں) اچھا میں جاتا ہوں۔

کاؤنٹس: (قریب) آؤ لزے، تم ابھی تک یہاں کھڑی ہو، گاڑی میں بیٹھو، یہ خدمت گار آرام

کرسی بھی ٹھیک سے نہیں اٹھا سکتے، کام چور کہیں کے، ہاں ذرا اوپر اٹھاؤ بس ٹھیک ہے،
کوچوان چلو۔ (گاڑی چلتی ہے)

راوی: واپس آکر لزے نے تنہائی میں وہ خط کھولا اور پڑھا۔

لزے: میرے خوابوں کی ملکہ
میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے آپ کے حسن پر فریفتہ ہو گیا ہوں، آپ کی صورت ہر لمحے میری آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے، خوابناک آنکھیں، وہی مسکراتے لب، مجھے دیوانہ بنائے دیتی ہیں، میں آپ کو چاہتا ہوں، کیا میں اپنی محبوبہ سے رحم اور محبت مانگنے کی امید کرتا ہوں۔

آپ کا چاہنے والا۔

ہرمان

راوی: یہ خط کسی ناول سے حرف بہ حرف نقل کیا گیا تھا لیکن لزے اس بناوٹی محبت کے جال کو نہ سمجھ سکی، وہ مسرور تھی پہلی بار اس سے کسی نے محبت کی تھی، اس نے کئی کوششوں کے بعد اس کا جواب لکھا اور ہرمان کو آئندہ اس قسم کے خط لکھنے سے روکا اور اس کا خط بھی واپس کر دیا، یہ دونوں دوسرے دن ہرمان کے آنے کے وقت کھڑکی سے نیچے پھینک دیے گئے، مگر ہرمان اتنی جلدی مایوس ہونے والا نہ تھا، اس کے دو دن بعد ایک چھوٹی سی لڑکی نے اسے ایک اور خط لا کر دیا۔

جان سے زیادہ عزیز لزے، یقین مانو تمھارے بغیر ایک ایک لمحہ کاٹنا میرے لیے دشوار ہو رہا ہے، اس قدر دور سے دیکھ کر طبیعت سیر نہیں ہوتی میں اپنی بے قراری کس سے کہوں، مجھے ایک بار تنہائی میں ملنے کا موقعہ دو، کسی صورت سے بھی، مجھے اپنی ملاقات کا شرف بخشو، میری بے چینی پر رحم کھاؤ، اور ملنے کی کوئی تدبیر نکالو، میں تمھارے جواب کا انتظا کر رہا ہوں۔

تمھارا ہرمان

لزا دینا چونک پڑی۔ یہ جلد بازی اور اس قدر اصرار اس کی سمجھ میں نہ آیا، اس نے خط

پھاڑ کر پھینک دیا اور لڑکی سے کہہ دیا کہ آئندہ وہ کوئی خط نہ لائے، لیکن خط آتے رہے، دھیرے دھیرے لزا دینا بھی ان خطوط کا جواب محبت کے ساتھ دینے لگی، ان خطوط میں محبت کا جوش اور جذبے کی شدت بڑھتی گئی اور ایک دن اس نے یہ خط لکھا اور ہرمان کے ہاں پھینک دیا۔

"ملاقات کا ایک موقعہ نکل آیا ہے، آج سفارت خانے میں ناچ کی محفل ہے، شام کو کاؤنٹس باہر جائیں گی، اور دو بجے رات تک ہم لوگ وہاں رہیں گے، نوکر بھی یا کو باہر رہیں گے، چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوگا، ساڑھے گیارہ بجے رات کو زینے کے راستے سے اوپر آجاؤ، بڑے کمرے سے بائیں بازو کو کاؤنٹس کے سونے کا کمرہ ہے، سونے کے کمرے میں ایک پردے کے پیچھے دو چھوٹے دروازے ہیں، ان میں ایک کاؤنٹس کے مطالعے کے کمرے کی طرف جاتا ہے اور دوسرا میرے کمرے کی طرف جاتا ہے، تم میرے کمرے میں آکر چھپ جانا میں دو بجے واپس آجاؤں گی تو ملاقات ہوگی"۔

(وقفہ)

(ساڑھے گیارہ کا گھنٹہ۔ گاڑی چلتی ہے)

کاؤنٹس: لزے گاڑی کا دروازہ بند کردو۔ اور تم نے آج کیسا بناؤ سنگھار کیا ہے۔ سارے بالوں میں پھولوں کے گچھے گوندھ رکھے ہیں۔ کس کے لیے اتنا سنگھار کر رکھا ہے (ہنستی ہے) کوچوان گاڑی تیز چلاؤ، جلدی پہنچنا ہے، کہیں ناچ شروع نہ ہوگیا ہو، کیوں لزے۔

(روسی ناچ کی دھن، یہ ماذرکا ہے جس کی گردشیں بہت تیز ہوتی ہیں)

کاؤنٹس: ہیلو، پال ٹامسکی۔

لزے: گڈ ایوننگ موسیو ٹامسکی۔

کاؤنٹس: ناچ شروع ہونے والا ہے اور تم ابھی تک یوں ہی گھوم رہے ہو، اوہ پال تم ابھی تک بچہ ہو، تم نے ابھی تک اپنا ساتھی بھی نہیں چنا، آج تم کس کے ساتھ ناچو گے۔

ٹامسکی: ماما، یہی تو مصیبت ہے، شہزادی پالین سے درخواست کی تھی۔

کاؤنٹس: شہزادی پالین؟

ٹامسکی: ہاں گراماما۔ اس نے انکار کردیا، یہ شہزادی اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے، گویا وہ نہیں ہوگی تو میرے ساتھ کوئی رقص نہیں کرے گا، میں چاہتا ہوں کہ آج لزے کو اپنا ساتھی بناؤں آپ کی اجازت ہے ماما۔

کاؤنٹس: لزے کو، خیر خیر، مجھے کیا، تم لزے کو راضی کرلو، مجھے کیا اعتراض ہے بھلا___

ٹامسکی: لزے، آؤ، تم میرے ساتھ رقص کروگی۔

لزے: ضرور، (ناچ کی دھن قریب آجاتی ہے)

ٹامسکی: آؤ لزے، مزرکا بھی کتنا خوبصورت رقص ہے۔

لزے: ہاں موسیو ٹامسکی۔

ٹامسکی: ایک بات بتاؤ گی۔

لزے: کہیے۔

ٹامسکی: تمھیں اس روز یہ کیوں خیال آگیا تھا کہ میرا دوست انجینئر ہے۔

لزے: ہٹا ہیے بھی، میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔

ٹامسکی: یوں تو نہیں تھا، مجھے خوب معلوم ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے ہو، وہ بھی تمھارے فراق میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

لزے: بھلا کیسے معلوم ہے آپ کو؟

ٹامسکی: دراصل انجینئرنگ میں میرا ایک دوست ہے، اس نے مجھے ساری کہانی بتائی۔

لزے: کون دوست ہے بھلا۔

ٹامسکی: اس کا نام ہے ہرمان۔ ہرمان کو دیکھا ہے تم لزے۔

لزے: آپ نے کیا نام بتایا۔

ٹامسکی: ہرمان، تم نے ہرمان کو نہیں دیکھا، بڑا رومانی نوجوان ہے، صورت ہو بہو نپولین کی سی اور فطرت بالکل شیطان کی سی، میں تو اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے، جیسے اس نے کم از کم تین بڑے زبردست پاپ کیے ہیں، ارے تم اس قدر پیلی کیوں پڑ گئیں۔

لزے: کچھ نہیں، موسیو، میرے سر میں درد ہے، خیر ہٹائیے، یہ تو بتائیے کہ اس آدمی نے آپ کو کیا بتایا۔

ٹامسکی: وہ تمھارے محبوب کی بہت برائی کر رہا تھا، کہتا تھا کہ میں اس کی جگہ ہوتا تو اب تک لزے پر قبضہ جما لیتا، بھئی مجھے تو شک ہے۔

لزے: کیا شک ہے۔

ٹامسکی: کہ ہرمان کا بھی تمھارے اوپر دانت ہے ضرور۔ کیوں کہ وہ تمھارا اور تمھارے محبوب کا ذکر بڑی دلچسپی سے سنتا ہے۔

لزے: مگر اس نے مجھے کہاں دیکھا۔

ٹامسکی: ممکن ہے کسی گرجا میں دیکھا ہو، ممکن ہے وہ کسی رات کو دیوار پھاند کر تمھارے کمرے میں گھس آیا ہو، کیوں کہ وہ یہ سب کام کر سکتا ہے۔ (رقص کی گردش تیز ہو جاتی ہے)

راوی: ٹامسکی تو مذاق میں یہ سب باتیں کہہ رہا تھا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی ہر ایک بات کس قدر سچ ہے، ٹھیک اس وقت ہرمان کاؤنٹس کے محل میں دبے پاؤں داخل ہوا اس نے خط بتائے راستے پر چلنا شروع کیا، مکان میں کوئی نہ تھا، چوکیدار سامنے کرسی پر پڑا سو رہا تھا، مضبوط قدم اٹھاتا ہوا، آخر کار وہ ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا، برابر کے کمرے سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی، وہ آگے بڑھتا گیا اور کاؤنٹس کے کمرے میں پہنچ گیا، یہاں مقدس صلیب کے سامنے شمع جل رہی تھی اور چاروں طرف خوشبو پھیلی ہوئی تھی، وہ مخملیں تصویریں، آرام دہ صوفے اور لوہے کی مسہری کمرے میں سجی ہوئی تھی۔ وہ مخملیں پردے کے پیچھے کھڑا ہو گیا، خط کھول کر پڑھا، اسی پردے کے پیچھے والے دروازے میں سے ایک دروازہ لزے کے کمرے کو جاتا تھا اور دوسرا کاؤنٹس کی اسٹیڈی کو، لزے کے کمرے کی طرف دو قدم چلا مگر پھر واپس آ گیا، اس کا مقصد لزے سے ملنا نہیں تھا، کاؤنٹس سے تین پتوں کا بھید معلوم کرنا تھا، اس نے سوچا اسے خواب گاہ میں کاؤنٹس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے، آخر وہ دو بجے گھوڑے گاڑی کی آواز آئی اور لوگوں کے چلنے پھرنے سے چہل پہل ہو گئی۔ (دو بجتے ہیں)

کاؤنٹس: اور یہ خدمت گار بڑے کام چور ہیں — میں کہتی ہوں لزے، ان سے مجھے بوڑھی عورت
کا بوجھ بھی نہیں اٹھتا، ذراسی آرام کرسی اٹھانے کی تمیز نہیں، ٹھیک سے اٹھاؤ، ہاں ہاں
سونے کے کمرے کی طرف چلو، لزے۔

لزے: (گھبرائے ہوئے جلدی میں) جی مادام۔

کاؤنٹس: خیر، کچھ نہیں تم جاؤ، مگر تم اس قدر جلدی میں کیوں ہو، نیند آرہی ہے لزے کو، اچھا جاؤ تم
اسی دروازے سے اپنے کمرے کی طرف چلی جاؤ، شب خوابی کے لباس لاؤ، ٹھیک ہے،
ٹھیک ہے، یہیں رکھ دو (جماہی) ہاں میری نائٹ کیپ کہاں ہے۔ (جماہی لے کر)
آج بہت تھک گئی۔ اچھا شمعدان لے جاؤ، بس مقدس صلیب کی شمع رہنے دو، تم سب
لوگ جاؤ، اچھا شب بخیر (جماہی) نیند آرہی ہے۔

(تھوڑا وقفہ، کسی ساز کی انتہائی پریشان کن آواز جس سے ظاہر ہو کہ خوفناک واقعہ ہو گیا)

کاؤنٹس: (آواز مشکل سے نکلتی ہے) کون؟

ہرمان: گھبرائیے نہیں، خدارا مجھ سے خوف مت کھائیے، میں آپ کو کسی قسم کا صدمہ پہنچانے
نہیں آیا ہوں، میں آپ سے صرف ایک گذارش کرنے آیا ہوں (خاموش رہتی ہے)
کیا آپ میری التجا قبول کریں گی، آپ میری زندگی کو مسرتوں سے بھر سکتی ہیں اور اس
میں آپ کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوتا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ تاش کے تین پتے ایسے
بتا سکتی ہیں، جو برابر —

کاؤنٹس: (گھبرائی ہوئی) یہ محض ایک مذاق ہے، میں سوگند سے کہتی ہوں وہ صرف مذاق کی بات
تھی۔

ہرمان: نہیں مادام، یہ مذاق نہیں ہو سکتا، آپ نے جب چپ لٹز کی مدد کی اور اسے ہاری ہوئی
سب دولت پھر سے مل گئی۔ میرے اوپر رحم کھائیے، مادام میرے اوپر رحم کیجیے، مجھے تین
جیتنے والے پتے بتا دیجیے، خدا کے لیے مادام (لہجے میں تبدیلی) آخر یہ راز آپ کس
کے لیے اپنے سینے میں محفوظ کر رہی ہیں، اپنے پوتوں کے لیے وہ تو خود بھی کافی مالدار
ہیں، انھیں آپ کے اس بھید کی ضرورت نہیں، انھیں روپیہ کی قدر معلوم نہیں، فضول خرچ

آدمی آپ کے بتائے پتوں کی کیا قدر سمجھیں گے، جو اپنی ورثے کی پونجی کو نہیں قائم رکھ سکتا، اس کا نادار ہونا لازمی ہے، اس کی مدد کرنا پاپ ہے، میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں مادام، میں روپیہ کی قیمت جانتا ہوں، مجھے اپنا بھید بتا دیجئے، میرے لیے یہ دولت بے کار نہیں ہے، یہ روپیہ میرے اوپر ضائع نہیں ہوگا، میں عمر بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا، خدا کے لیے اپنا بھید بتا دیجئے، میں آپ کے پیر پڑتا ہوں، اگر کبھی آپ کے دل میں محبت کی کوئی لہر پیدا ہوئی ہے تو میں اس کا واسطہ دیتا ہوں، اگر کبھی آپ کسی بچے کی پیدائش پر مسرت اور شفقت سے مسکرائی ہیں، اگر کبھی کبھی آپ کا دل کسی انسانی جذبے سے دھڑکا ہے تو — میں آپ کو ایک بیوی، ایک عاشق، ایک ماں کی محبت کا واسطہ دیتا ہوں، میں آپ کو ان تمام چیزوں کا واسطہ دیتا ہوں، جو زندگی میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہیں، خدا کے لیے میری درخواست کو رد نہ کیجئے، مجھے اپنا بھید بتا دیجئے، (خاموشی) وہ بھید بھلا آپ کے کس کام کا ہے، (جیسے سوچ رہا ہو) ہوسکتا ہے وہ راز کسی خوفناک گناہ سے متعلق ہو ممکن ہے، وہ شیطان سے کسی سمجھوتہ پر ملا ہو، ہوسکتا ہے آپ کو ڈر ہو کہ اسے بتانے سے آپ کی زندگی سے خوشی چھین جائے گی، مگر خدا کے لیے یہ تو سوچئے آپ بوڑھی ہو چکی ہیں، آپ کو اس دنیا میں کتنے رہنا ہے، مجھے اپنا راز بتا دیجئے میں آپ کے سارے گناہ اپنے سر پر لینے کو تیار ہوں، یہ نہ بھولیے کہ ایک انسان کی خوشی آپ کے ہاتھ میں ہے اور میری ہی نہیں میرے خاندان کی، میرے بچوں کی میرے بچوں کے بچوں اور میری نسل کی خوشی آپ کے ہاتھ میں ہے، اور ہم سب ہمیشہ آپ کو عزت اور احترام سے یاد کریں گے، میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں، مجھے ناامید نہ کیجئے (خاموشی، گھڑی کی ٹک ٹک) تو نہیں بتائے گی (غصہ میں) بوڑھی ڈائن، مکارہ، تو اس طرح نہیں مانے گی، تجھے جواب دینا ہی پڑے گا، تجھے بتانا ہی پڑے گا، ٹھہر جا، یہ پستول دیکھتی ہے، میں گولی مار دوں گا، نہیں تو سیدھی طرح مجھے اپنا راز بتا دو (ہلکی چیخ) اس بہروپ سے کام نہیں چلے گا، میں آخری بار تجھ سے پوچھتا ہوں تو مجھے جیتنے والے تین پتے بتائے گی یا نہیں (زوردار چیخ) (موت کا نغمہ)

راوی: لزاوینا اپنے کمرے میں خوف اور اشتیاق سے بھرے ہوئے دل سے ہرمان کا انتظار کررہی تھی، مگر کمرے میں کسی کو نہ پاکر وہ مایوس ہوگئی، نیند پھر بھی نہ آتی تھی، اس کے بالوں میں پھولوں کے گچھے اب بھی اسی طرح سجے ہوئے تھے اور وہ تکیے پر کہنیاں ٹکائے ہرمان کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایک دم دروازہ کھلا اور ہرمان داخل ہوا۔

لزے: کون؟ ارے آپ؟ میں تو ڈر گئی تھی۔

ہرمان: ہاں میں ہوں۔

لزے: اور آپ اتنی دیر سے کہاں تھے، میں انتظار کررہی تھی۔

ہرمان: میں کاؤنٹس کی خواب گاہ میں تھا لزاوینا، میں ابھی کاؤنٹس کو خواب گاہ میں چھوڑ کر آرہا ہوں، وہ مرگئی ہے۔

لزے: آپ کیا کہہ رہے ہیں، کاؤنٹس مرگئی ہیں، کاؤنٹس۔

ہرمان: ہاں اور لزے میں، یقین مانو، میں اس کی موت کا سبب ہوں۔

لزے: تم قاتل ہو، تم نے میری محسن کو مار ڈالا، میری آقا کو قتل کردیا۔

ہرمان: نہیں لزے، میری بات سنو، میں نے اسے نہیں مارا، میرے پستول میں گولی نہیں تھی، وہ پستول دیکھ کر ڈر گئی، میں نے اس پر گولی نہیں چلائی۔

لزے: اوہ، اب میں تمھیں گھر سے باہر کیسے نکالوں گی، اچھا اچھا، یہ کنجی لو اور پیچھے کے زینے سے ہوکر نکل جاؤ۔ مگر تمھیں اسی خواب گاہ سے ہوکر جانا ہوگا، جلدی کرو، جلدی کرو۔

ہرمان: میں جاتا ہوں لزے، مگر میری پوری بات تو سنو۔

راوی: اور ہرمان نے تاش کے پتوں کی کہانی سنائی، لزے کے دل میں ایک ایک لفظ نشتر کی طرح چبھ رہا تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ ہرمان کا عشق کیا صرف روپیہ کا لالچ تھا، یہ جال صرف کاؤنٹس کا بھید معلوم کرنے کے لیے اس پر پھینکا گیا تھا، وہ اس قتل کی سازش کی ایک حصہ تھی، ٹامسکی نے سچ کہا تھا اس شخص کے سر پر کم سے کم تین خوفناک پاپ معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی ٹھیک تھا دیکھو اس کی صورت بالکل نپولین سی ملتی ہوئی ہے، بالکل

نپولین کی سی ہرمان لڑے کوانہی خیالات میں چھوڑ آیا اور جب وہ کاؤنٹس کی خواب گاہ سے گزر رہا تھا تو اس نے کاؤنٹس کی لاش کے پاس کھڑے ہو کے اس کو تعظیم دی اور زینے سے نیچے اتر گیا، اسی زینے سے ایک دن کاؤنٹس شب عروسی کے لیے خواب گاہ میں آئی ہوگی، اسی خواب گاہ میں اس نے اپنی زندگی کی خوبصورت گھڑیاں گذاری تھیں ،تیسرے دن کاؤنٹس کا جنازہ اٹھا اور شہر کے سب سے بڑے گرجا گھر میں آخری رسوم ادا کی گئیں اور اس کے بعد سب لوگوں نے کاؤنٹس کا آخری دیدار کیا، ایک کے بعد ایک لاش کے پاس جاتا، ہرمان لرزتے ہوئے قدموں سے آخری دیدار کے لیے گیا اور لاش کے پاس عقیدت سے گھٹنوں کے بل جھک گیا، سنگ مرمر پر فرش کی شاخیں بچھی ہوئی تھیں، وہ اس ٹھنڈے فرش پر جھکا گویا مرحومہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں، اتنے میں لوگ بے ہوش لڑے کو اٹھا کر لائے اور اسے لاش کے پاس لے گئے، ہرمان اسی لمحے گرجا سے واپس چلا آیا، وہ راتوں کو سو نہیں سکتا تھا، جب آنکھیں بند ہوتی تھیں کاؤنٹس کی صورت اسے جگا دیتی تھی، ان بھر ہر طرف سے اسے یہ آوازیں آتی تھیں ،تو نے کاؤنٹس کو مارا ہے تو کاؤنٹس کا قاتل ہے، وہ دن بھر بیٹھا شراب پیتا رہا اور رات کو کپڑے بدلے بغیر ہی پلنگ پر لیٹ گیا، جب اس کی آنکھ کھلی تو رات کے تین بجے تھے۔

(تین بجتے ہیں)

ہرمان: کون ہے۔ ارے کون ہے۔ (وقفہ) چوکیدار ہوگا آج پھر کم بخت پی کر آیا ہے۔ (دروازہ کھلتا ہے) کون ہو تم۔

کاؤنٹس: میں کاؤنٹس اپنا فیڈ اوینا ہوں، مجھے نہیں پہچانتے وہ جسے تم نے دھکا کر مار ڈالا، میں اپنی مرضی کے خلاف تمھارے پاس آئی ہوں۔

ہرمان: تم تم۔

کاؤنٹس: ہاں مجھے تمھاری درخواست پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے سنو، وہ تین پتے یہ ہیں، تگی، ستا اور اکا، ایک کے بعد دوسرا کھیلو گے تو ان کا جیتنا یقینی ہے مگر اس کی کچھ شرطیں ہیں۔

ہرمان: (گھبرا کر) کیا؟

کاؤنٹس: ایک یہ کہ تم چوبیس گھنٹے میں صرف ایک پتہ کھیلو گے اور دوسری یہ کہ اس کے بعد پھر تم عمر بھر تاش کو ہاتھ نہ لگاؤ گے، میں تمھیں اپنا خون معاف کر دیتی ہوں بشرطیکہ تم میری بچی لزے سے شادی کر لو، اچھا میں چلتی ہوں (دروازہ بند ہوتا ہے، ہوا کی آواز)

راوی: تری، ستا، اکا، تری ستا، اکا، تری ستا، اکا، ہر وقت یہی تین لفظ اس کے دماغ میں گونجنے لگے، اس کے ذہن پر کاؤنٹس کی موت کا جو خیال جم گیا تھا، اس کی جگہ اب تری ستا، اکا نے لے لی، ہر ایک بات میں ہر جگہ اور ہر خیال کے ساتھ وہ کسی نہ کسی طرح ان لفظوں کو ضرور ملا لیتا تھا، کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتا تو فوراً اس کو خیال آتا کہ یہ لڑکی بالکل حکم کی تریا کی طرح نازک اور دھان پان سی ہے، کوئی وقت پوچھتا تو اس کی زبان سے نکل جاتا کہ سات بجنے میں تین منٹ، یہیں نہیں یہ تینوں پتے مختلف شکلوں میں اس کے سامنے آتے تھے، تری اس کے سامنے کوش رنگ پھولوں کے گچھے کی طرح کھلنے لگتی، ستا کسی گرجے کے اعلی مینار کی شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے اور اکا، بہت بڑی مکڑی کی صورت میں نظر آتا جو اپنا جال تیزی سے بنتی جا رہی ہے اسے یہی خواب نظر آتے یہی تصویریں دکھائی دیتیں، ہر وقت وہ یہی سوچتا رہتا تھا کہ اس بھید کو کس طرح استعمال کرے، جس کو اس نے اتنا کچھ گنوا کر حاصل کیا ہے، اس نے ارادہ کیا کہ وہ چھٹی لے کر پیرس چلا جائے اور وہاں کے مشہور قمار خانوں سے دولت بٹور لائے گا، اسی زمانے میں نارو موف اس سے ملنے آیا۔

نارو موف: ہیلو ہرمان، کس سوچ میں ہو آجکل، ایک زمانے سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ہرمان: ہاں نارو موف، ہمیں ملے سات دن ہوئے۔

نارو موف: آج کل تمھارا تاش کا کھیل دیکھنے کا شوق بہت ٹھنڈا پڑا ہوا ہے۔

ہرمان: نہیں یہ بات نہیں، تاش کے کھیل سے مجھے عشق ہے، کوئی ڈھنگ کا کھلاڑی ہو تو ضرور دیکھوں گا۔

نارو موف: اوہ، ڈھنگ کا کھلاڑی، پیٹرس برگ میں رہتے ہو یا کہیں اور تمھیں یہ بھی خبر نہیں کہ

ماسکو کا مشہور کھلاڑی کاونٹ چیکانسکی ان دنوں یہاں آیا ہوا ہے۔

ہرمان: (خوش ہو کر) چیکانسکی آیا ہوا ہے۔

نارموف: ہاں، اس کا کھیل دیکھو بے خطا نشانہ ہے کم بخت کا، جو کہے گا وہی بازی میں ہوگا۔

ہرمان: سارے شعبدہ بازیہی کرتے ہیں۔

نارموف: جی نہیں، چیکانسکی نہ ہاتھ کی صفائی کرتا ہے، نہ شعبدہ بازی اور پھر بڑا دل والا کھلاری ہے لاکھوں بدتا ہے لاکھوں جیتتا ہے اور لاکھوں ہارتا ہے، مگر ماتھے پر ایک شکن تو آجائے اور کوئی آج سے کھیل رہا ہے، زمانہ ہو گیا اسے کھیلتے ہوئے اور کچھ باتیں تو کمال کی ہیں اس میں۔

ہرمان: وہ کمال کی باتیں کون سی ہیں۔

نارموف: بازی ہر ایک کے لیے کھلی ہوئی ہے، کوئی آئے جو پیسہ لگائے گا وہی پتہ پھینکے گا، دوسرے اس قدر شریف آدمی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو اس کا اطمینان اور اس کی مسکراہٹ۔

ہرمان: ارے ارے تم تو اس کی تعریف میں دہرے ہوئے جا رہے ہو۔

نارموف: تکلف اور تہذیب تو کوئی اس سے سیکھے، اس کا کھیل دیکھنے چلو گے۔

ہرمان: ضرور چلوں گا۔

نارموف: آج ہی ابھی۔

ہرمان: ہاں، آج ہی ابھی۔

نارموف: تم چیکانسکی سے مل کر خوش ہو گے اور اس کا کھیل دیکھ کر اس سے بھی زیادہ خوش ہو گے۔

ہرمان: مجھے یقین ہے نارموف کہ وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوگا۔ (ہنسی)

نارموف: کیا وقت ہوا۔

ہرمان: سات بجنے میں پانچ منٹ ہیں۔ (سات بجتے ہیں)

نارموف: یہ ہیں میرے دوست ہرمان اور یہ ماسکو کے مشہور کھلاڑی کاؤنٹ چیکانسکی۔

چیکانسکی: تشریف لائیے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، میں نے آپ کا تذکرہ بہت سنا ہے، آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔

ہرمان: میر خوش قسمتی۔

چیکا: سگار سے شوق فرمایئے۔

ہرمان: شکریہ۔

چیکا: آپ کے اجازت ہو تو یہ بازی ختم کرلوں۔

ہرمان: شوق سے۔

چیکا: شو، میرا نہلا جیت گیا، مجھے افسوس ہے کاؤنٹ زورن۔ آپ دوسری بازی کھیلنا پسند فرمائیں گے، آپ اطمینان سے پہلے حساب لگا لیجئے میں منتظر ہوں۔

ناروموف: (چپکے سے) ہرمان دیکھو یا پیارا کھلاڑی ہے۔

ہرمان: مجھے ایک بازی کھیلنے کی اجازت دیجئے کاؤنٹ چپکانسکی۔

ناروموف: تم، ہرمان تم کھیلو گے۔

ہرمان: ہاں۔

چیکا: شوق سے موسیو، بڑے شوق سے، ادھر تشریف لایئے۔

نارو: مبارک ہو، ہرمان، آخر کار بہت زمانے کے بعد نے تاش کو ہاتھ لگایا۔

ہرمان: شکریہ ناروموف، پتے بھانٹئے کانٹ چپکانسکی۔

چیکا: آپ جتنے روبل لگائیں میرے بنکر کو لوٹ کرادیں تو بہتر ہوگا۔

ہرمان: میں ۴۷ روبل لگاتا ہوں۔

چیکا: جی آپ نے کتنے روبل لگائے ہیں۔ معاف کیجئے میں اچھی طرح سن نہیں سکا۔

ہرمان: ۴۷ ہزار روبل۔

چیکا: مگر یہاں تو کبھی کسی نے دو ڈھائی سو روبل سے زیادہ نہیں لگائے آپ بہت بڑی رقم لگا رہے ہیں، آپ اچھی طرح سوچ لیجئے، موسیو۔

ہرمان: یہ میں نہیں جانتا، آپ میری بولی قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

ناروموف: تمھیں کیا ہوگا ہے ہرمان۔

ہرمان: فرمایئے۔

چیکا: میں قبول کرتا ہوں، مگر موسیو ہرمان، معاف فرمایئے گا، ہمارے دستور ہے کہ بازی کھیلنے سے پہلے روبل اپنے پتہ پر رکھ دینا ضروری ہے، مجھے آپ پر بھروسہ ہے، مگر قاعدے سے مجبور ہوں۔

ہرمان: ضرور یہ لیجئے، میں اپنے کارڈ پر ۴۷ ہزار روبل رکھتا ہوں، یہ لیجئے، تاش پھانٹئے موسیو چیکانسکی۔

چیکا: بہتر میں بانٹتا ہوں، یہ لیجئے، آپ نے کس پتے پر روپیہ لگایا ہے۔

ہرمان: تریا، یہ دیکھو تریا آ گئی میرے پاس، تمھارا نہلا ہار گیا، تمھارا نہلا ہار گیا۔

چیکا: ہاں، آپ کی تریا جیت گئی، مجھے ابھی سارا حساب بے باق کرنا ہوگا یا آپ اور کھیلیں گے۔

ہرمان: نہیں، بہتر ہوگا کہ ابھی حساب بے باق کر دیں۔

چیکا: یہ لیجئے ۹۴ ہزار روبل۔

ہرمان: شکریہ، ذرا ایک گلاس لمینڈ منگوا دیجئے۔

چیکا: ضرور۔

ہرمان: آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی، اچھا اب اجازت دیجئے، آروا۔

راوی: کھلاڑیوں میں کھل بلی مچ گئی، ہرمان جس نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، چیکانسکی جیسے خرانٹ کھلاڑی سے ۹۴ ہزار روبل جیت گیا اور دوسرے دن شام کو جب سارے کھلاڑی کل کے حیرتناک کھیل پر غور کر رہے تھے، ہرمان پھر چیکانسکی کے دیوان خانے میں پہنچا، سارے کھلاڑی سناٹے میں آ گئے، ہرمان تاش کے پتوں کا جادو گر ہرمان پھر آ گیا تھا۔

چیکا: تشریف لایئے موسیو ہرمان۔

ہرمان: حاضر ہوا، آپ یہ بازی پوری کر لیجئے۔

چیکا: بازی پوری ہو چکی ہے، آپ تشریف لایئے، کل آپ کے کھیل نے یہاں سب لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا (مسکراتا ہے) میں نے اپنی زندگی میں ایسا کھلاڑی نہیں دیکھا۔

ہرمان: یہ آپ کی عنایت ہے کاونٹ چیکانسکی۔

چیکا: اجازت ہے۔

ہرمان: ضرور پھانٹیے۔

چیکا: آپ نے اپنا پتہ چن لیا موسیو ہرمان۔

ہرمان: جی ہاں، میں ۹۴ ہزار روبل لگاتا ہوں اور آپ کے قاعدے کے مطابق یہ رقم اس پتے پر رکھے دیتا ہوں۔

آواز: (سرگوشی) ۹۴ ہزار روبل۔

دوسر آواز: ۹۴ ہزار روبل۔

ہرمان: پتے بانٹ دیجیے، کاؤنٹ چیکانسکی، میرا پتا کھولیے۔

چیکا: بہتر۔

ہرمان: ستا، ستا، آپ کا اینٹ کا غلام ہار گیا، میں نے ستے ہی پر داؤں ہار لگایا تھا۔

چیکا: آپ جیت گئے۔

راوی: ہرمان نے ایک لاکھ ۸۸ ہزار روبل جیب میں رکھے اور خاموشی سے ٹہلتا ہوا گھر واپس آگیا، شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، پیٹرس برس میں تاش کے سب کھلاڑی حیرت زدہ رہ گئے، کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، دوسرے دن شہر کے سارے معزز کھلاڑی، فوجی جنرل، سینٹ اور شاہی دربار کے بڑے بڑے ارکان ہرمان کا کھیل دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے، چیکانسکی کے یہاں آج بڑی چہل پہل تھی، ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد ہرمان پھر چیکانسکی کے یہاں پہنچا، کھیل شروع ہوا، چیکانسکی کا چہرہ زرد تھا اور تاش پھانٹتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے، لیکن پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا، سب لوگوں کی آنکھیں ہرمان پر تھیں۔

چیکا: اجازت ہے۔

ہرمان: ضرور، شوق سے۔

چیکا: کیا آپ نے اپنا پتا پسند فرما لیا ہے موسیو۔

ہرمان: جی ہاں، میں اس پتے پر تین لاکھ ۶۷ ہزار روبل لگاتا ہوں۔

چیکا: پتے بانٹے جائیں۔

ہرمان: ہاں، میرا پتا کھول دیجئے، اکا جیتے گا، اکا۔

چیکا: مگر اس بار اکا میرے پاس ہے، آپ کے پاس حکم کی بیگم ہے۔ آپ کی حکم کی بیگم ہار گئی۔ (وقفہ)

ہرمان: حکم کی بیگم، حکم کی بیگم، اِکا نہیں آیا، اِکا نہیں آیا میرے پاس، حکم کی بیگم اور ہو، دیکھو کیسی آنکھیں چڑھاتی ہے حکم کی بیگم۔ ڈائن چڑیل بڑھیا، حکم کی بیگم، کاؤنٹس (قہقہہ) بڑھیا نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ (قہقہہ) تریا۔

ستا، اکا، تریا۔ ستا، اکا، بیگم (قہقہہ) کاؤنٹس، کاؤنٹس، (بہت زیادہ چیخ کر) تریا، ستا، اکا، تریا، ستا، حکم کی بیگم۔

(آواز اونچے سروں میں ڈوب جاتی ہے)

☆☆☆

معمار اعظم

بروڈک: (کھانسنے اور مشکل سے سانس لینے کی آواز) نہیں (کھانسی) اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔

کایا: بروڈک بابا۔ کیا اس وقت آپ کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے؟

راگنر: ابا جان۔ آپ گھر کیوں نہیں چلے جاتے۔ کچھ دیر سو لیجیے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

بروڈک: سو جاؤں؟ تم سب یہی چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں۔

کایا: اچھا تو کچھ دیر ٹہل لیجیے۔

راگنر: ہاں، ہاں، چلیے میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

بروڈک: نہیں۔ راگنر۔ اس کے آنے سے پہلے میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے۔ اب میں تمھارے مالک سے اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گا۔

کایا: نہیں، بابا، ابھی کچھ دن اور ٹھہر جایئے۔

بروڈک: (گہری سانس لے کر) میرے لیے اب انتظار کا وقت کہاں ہے۔

(پاؤں گی چاپ)

کایا: چپ ہو جایئے۔ وہ آ رہے ہیں۔

راگ نر: کون؟

کایا: ہمارا تمھارا مالک، معمار اعظم ہال ورسول نس۔ جاؤ تم اپنی میز پر جا بیٹھو۔ میں اپنا ٹائپ رائٹر اٹھاتی ہوں۔

(سول نس کے بھاری قدموں کی آواز، دروازہ کھلتا ہے)

سول نس: کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا، راگ نر۔

راگ نر: جی ہاں، مسر سول نس، وہی دونوں نوجواں میاں بیوی آئے تھے جو لوس تراد میں اپنا مکاں بنوانا چاہتے ہیں۔ مکان کے نقشے کے لیے بے حد بے چین تھے۔

سول نس: ان کو، ابھی کچھ روز اور انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے ابھی تک نقشوں کا کوئی خاکہ تک نہیں بنایا ہے۔ کیوں برودک۔

برودک: لیکن وہ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ انھیں مکان کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

سول نس: میرے پاس ابھی وقت نہیں ہے۔ ایسا ہی ہے تو وہ کسی اور انجینئر سے نقشہ کیوں نہیں بنوا لیتے۔

برودک: مگر یہ لوگ تو آپ کے بھروسہ کے آدمی ہیں۔

سول نس: ہونہہ۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ برودک (غصہ میں) میں نئے آدمیوں سے کام لینا نہیں چاہتا۔

برودک: تو کیا آپ کا یہی فیصلہ ہے؟

سول نس: ہاں، بالکل یہی۔ (کچھ دیر خاموشی)

برودک: مسٹر سول نس۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

سول نس: ضرور۔ برودک، میں ضرور سنوں گا۔

برودک: کایا۔ تم ذرا دیر کو باہر چلی جاؤ۔

کایا: لیکن بابا......

برودک: (بات کاٹ کر) بیٹی، میرا کہنا مانو، دروازہ بند کرتی جانا۔

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

(آہستہ سے) مسٹر سول نس میں نہیں چاہتا کہ ان بچوں کو معلوم ہو جائے کہ میری طبیعت کتنی خراب ہے۔ اب میں کچھ ہی دن کا مہمان ہوں۔ میرے دل پر سب سے بڑا بوجھ اپنے بیٹے راگ نر کا ہے، میرے بعد اس کا کیا ہوگا؟

سول نس: کیوں؟ جب تک وہ میرے ساتھ کام کرنا چاہے گا۔ وہ یہیں رہے گا۔

برودک: یہی بات تو وہ نہیں چاہتا۔ وہ اپنا نجی کاروبار کرنا چاہتا ہے اور میری بھی یہی تمنا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے اپنے لڑکے کو اپنے پیروں پر کھڑا ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔

سول نس: (غصے میں) تو کیا تم سمجھتے ہو، وہ الگ کام چلانے کے قابل ہو گیا ہے۔ اسے ابھی کچھ بھی تو نہیں آتا۔ میرے پاس رہ کر اسے تھوڑا بہت نقشہ کشی تو آ گئی ہے مگر صرف اسی سے تو کام نہیں چل سکتا۔

برودک: مسٹر سول نس، جب آپ میرے دفتر میں کام کرتے تھے تو آپ بھی کاروبار کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے مگر اس کے باوجود اپنا کاروبار چلانے میں کامیاب ہوئے (مشکل سے سانس لے کر) اور آپ نے آگے بڑھنا چاہا، میرے کاروبار کو تہس نہس کر کے میرے اور میرے ایسے بہت سوں کو پاؤں تلے کچل کر ہی تو آپ آگے بڑھے تھے......

سول نس: ہاں، وقت نے میرا ساتھ دیا۔

برودک: پھر آپ کا کام چمک اٹھا اور میں آج آپ کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔ آپ نے مجھے ٹھیک کہا، قسمت اور وقت نے آپ کا ساتھ دیا۔ مسٹر سول نس۔ ہوسکتا ہے وقت میرے بیٹے راگ نر کا بھی ساتھ دے۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہو۔ کیا میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جاؤں اور یہ بھی نہ دیکھ سکوں کہ راگ نر کام کے قابل ہے اور پھر آنکھ بند ہونے سے پہلے کایا اور راگ نر کی شادی بھی نہ دیکھ سکوں۔ (آواز رندھ جاتی ہے)

سول نس: کایا سے بھی پوچھ لیا ہے؟

برودک: کایا کو اتنی بیقراری نہیں ہے لیکن راگ نر اس کے لیے بڑا بے چین ہے۔ میرے اوپر رحم کیجئے مسٹر سول نس۔ آپ اسے الگ کام کرنے میں مدد دیجئے۔ میں آپ سے......

سول نس: (بات کاٹ کر) ارے، کیا خواہ مخواہ کی باتیں لے بیٹھے ہو۔ میں راگ نر کے لیے کام کوئی آسمان سے ڈھونڈھ کر لاؤں گا۔

برودک: (کھانستے ہوئے) آپ چاہیں تو اسے بھی کام مل سکتا ہے۔ ''لوس تراند'' میں مکان کے

نقشے بنانے کا کام آپ اسے دلوا سکتے ہیں۔ اگر آپ اسے موقعہ دیں اور پھر ان نقشوں پر ایک نظر خود ڈال لیں تو آج ہی اسے اپنا کاروبار شروع کرنے کا موقعہ مل سکتا ہے۔

سول نس: کیا؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ٹھیکہ توڑ دوں۔ نہیں۔ میں کبھی جگہ نہیں چھوڑ سکتا۔ کچھ بھی ہو میں کسی کے لیے بھی راستے سے نہیں ہٹوں گا۔ نہیں کبھی نہیں۔

برودک: تو کیا میری جان اسی طرح نکل جائے گی۔ کیا میں اطمینان اور سکون کے بغیر ہی مر جاؤں گا راگ نر پر بھروسہ کیے بغیر اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا کوئی نمونہ دیکھے بغیر۔ میں آپ سے اس کا جواب چاہتا ہوں مسٹر سول نس۔ بتائیے، بولئے، مسٹر سول نس، بولیے......

سول نس: (جھنجھلا کر) میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تمھاری جان اسی طرح نکلے گی۔ جیسا تمھاری تقدیر میں لکھا ہوگا۔

برودک: اچھا۔ یوں ہی سہی، مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ دروازہ کھول دیجیے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

سول نس: راگ نر۔

راگ نر: جی مسٹر سول نس۔

سول نس: انھیں گھر پہنچا دو۔ ان کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔

راگ نر: ابا جان۔

برودک: مجھے سہارا دو میرے بیٹے، چلو اب گھر چلیں۔

(وقفہ)

سول نس: مس کایا۔ ذرا ادھر آؤ۔

کایا: بہت اچھا۔ ابھی آئی۔

سول نس: کیا تمھاری ہی مہربانی سے آج یہ سب کچھ ہوا۔

کایا: جی نہیں۔ ایسا نہ سمجھیے مسٹر سول نس۔

سول نس: مگر یہ تو تم مانتی ہو تو تم راگ نر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ تم اس سے محبت کرتی ہو نا؟

کایا: ہاں چار پانچ برس ہوئے میری منگنی راگ نر سے ہوئی تھی۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔

میں اسے بہت چاہتی تھی مگر.....

سول نس: مگراب؟

کایا: جب سے یہاں ٹائپسٹ ہو کر آئی ہوں۔ ہاں تو آپ جانتے ہیں میں ایک ہی آدمی سے محبت کرتی ہوں۔ ساری دنیا میں ایک اور صرف ایک آدمی سے۔

سول نس: اور پھر تم میرے پاس سے چلے جانے کا خیال بھی دل میں لاتی ہو۔

کایا: تو کیا میں راگ نر سے بیاہ کرنے کے بعد آپ کے پاس نہیں رہ سکتی۔

سول نس: نہیں یہ ناممکن ہے۔ اگر راگ نر مجھے چھوڑ کر الگ کاروبار چلائے گا تو اسے تمھاری ضرورت ہوگی۔

کایا: لیکن میں آپ سے دور نہ رہ سکوں گی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

سول نس: تو پھر اس کا خیال رہے کہ راگ نر کے دل سے الگ کاروبار کا دھیان نکل جانا چاہئے۔ جتنی بار چاہو اس سے بیاہ کرو مگر.... مطلب یہ ہے کہ اچھا خاصا وہ میرے پاس نوکر ہے۔ اسے نوکری چھوڑنے سے روکو۔ اسی طرح تم بھی میرے پاس رہ سکتی ہو۔ تمھارے بغیر تو میں زندہ نہیں رہ سکتا، میری کایا۔

کایا: کوئی آرہا ہے؟

نسوانی آواز: پیارے سول نس۔

سول نس: ارے تم ہو اینا پیاری۔

کایا: صبح بخیر مادام سول نس۔

مادام: تم کام تو نہیں کر رہے ہو؟

سول نس: نہیں۔ میں کایا کو چھوٹی سی ایک چٹھی لکھوا رہا تھا، تمھیں مجھ سے کچھ کام ہے اینا پیاری۔

مادام: ہاں، میں یہ کہنے آئی تھی کہ ڈاکٹر، ہیروال ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

سول نس: اچھا تو تم چلو میں ابھی آیا............ (وقفہ کے بعد) ہاں تو سنو کایا ''لوستراند'' کے لیے راگ نر نے کچھ نقشے بنائے ہیں؟

کایا: جی ہاں، وہ نقشے یہیں رکھے ہوئے ہیں۔

سول نس: تو وہ نقشے ذرا مجھے لادو۔ اچھا ہے کہ میں انھیں ایک نظر دیکھ لوں (تھوڑی دیر بعد) ٹھیک، بس یہیں رکھ دو۔ اسی میز پر۔ اچھا اب تم جاؤ گی۔ مگر یہ نہ بھولنا راگ نر کو نوکری چھوڑنے کا خیال ترک کرانا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

کایا: خدا حافظ، مسٹر سول نس۔

ڈاکٹر: میں اندر آسکتا ہوں۔

سول نس: آؤ ڈاکٹر ہیل وار۔

ڈاکٹر: میں بہت دیر سے ڈرائنگ روم میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔

سول نس: اچھا ہوا تم آگئے۔ کہو۔ ڈاکٹر تمہاری مریضہ کا اب کیا حال ہے۔ اس کی حالت میں کوئی افاقہ بھی ہوا یا نہیں۔

ڈاکٹر: اس وقت تو میں یہی محسوس کر رہا ہوں کہ مادام امین سول نس آپ سے کافی ناراض ہیں۔ کایا کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں مادام سول نس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ اسے برداشت نہ کرسکیں گی، تم کوئی دوسری ٹائپسٹ کیوں نہیں رکھ لیتے۔

سول نس: اس کی جگہ کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتا ڈاکٹر۔

ڈاکٹر: کیوں آخر، اس کی وجہ؟

سول نس: ہاں اس کی وجہ ہے، یہ بڑی عجیب کہانی ہے۔

ڈاکٹر: میں بڑے دھیان سے سنوں گا۔

سول نس: تمھیں یاد ہوگا کہ برودک اور اس کے بیٹے راگ نر کا کاروبار مٹی میں مل جانے کے بعد میں نے ان دونوں کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا ہے۔

ڈاکٹر: ہاں، مجھے معلوم ہے۔

سول نس: یہ دونوں بڑے محنتی اور ہوشیار ہیں۔ دونوں خود اعتمادی اور قابلیت رکھتے ہیں لیکن بیٹے کے دماغ میں یہ دھن سمائی ہے کہ وہ خود انجینئر بنے اور اپنا کاروبار آپ چلائے اور پھر کایا سے شادی کرے، تم تو جانتے ہو آج کل کے نوجوانوں کا کیا حال ہے۔

ڈاکٹر: (ہنس کر) ہاں، ان سب کو بیاہ کرنے کی بری لت پڑ گئی ہے۔

سول نس: لیکن مجھے راگ نر کی ضرورت ہے۔ برودک بھی میرے کاروبار کے لیے ضروری ہے۔
اسے عمارت کے بوجھ اور رقبہ نکالنے کا کام پوری طرح آتا ہے۔

ڈاکٹر: تب تو ان کا یہاں رہنا ضروری ہی ہے۔

سول نس: ہاں اور ایک دن یہ لڑکی کا یا یہاں آئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اس سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ لڑکی میرے دفتر میں نوکر ہو جائے تو راگ نر کبھی نوکری نہ چھوڑے گا میں نے اسے نوکر رکھ لیا اور پھر ایک انوکھی بات ہوئی۔

ڈاکٹر: کیا؟

سول نس: میرے پاس آنے کے بعد ہی وہ اپنے منگیتر راگ نر سے دور ہوتی گئی۔

ڈاکٹر: اور وہ کھنچ کر تمھارے پاس آتی گئی۔

سول نس: ہاں ڈاکٹر، وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، بہت محبت کرتی ہے۔ اس کی پیٹھ میری طرف ہو اور میں اس کی طرف دیکھوں تو وہ بھی اسی لمحے محسوس کر لیتی ہے جب میں اس کے پاس جاتا ہوں تو اس پر ایک کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر: تم نے اپنی بیوی کو یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا۔

سول نس: اس بات کو سوچ کر مجھے درویشوں کا سا سکون ملتا ہے کہ ایلین میرے بارے میں غلط رائے قائم کرے۔ میں اس طرح اس کے احسانات کے بار شاید کچھ کم کر سکوں۔

ڈاکٹر: میں کچھ نہیں سمجھا۔

سول نس: جانے بھی دو، اچھا یہی ہے کہ ہم اس بارے میں زیادہ بات نہ کریں ....اور پھر تم تو میرا راز بھی پا چکے ہو۔

ڈاکٹر: کون سا راز، مسٹر سول نس؟

سول نس: میں خود اسے اچھی طرح محسوس کر چکا ہوں۔ کیا تمھارا بھی میرے بارے میں یہی خیال ہے جو ایلین کا ہے؟

ڈاکٹر: یعنی۔

سول نس: ایلین کو یقین ہے کہ میں آہستہ آہستہ پاگل ہوتا جا رہا ہوں اور تم کبھی کبھی میری دیکھ بھال

بھی کرتے رہے ہو!

ڈاکٹر: نہیں، مسٹر سول نس۔ مجھے کبھی ایسا دھیان بھی نہیں آیا۔

سول نس: تم مجھ سے بیکار چھپا رہے ہو۔ اگر تم مجھے مریض اور پاگل نہیں سمجھتے.....

ڈاکٹر: تو —؟

سول نس: تو تم میری زندگی کو کامیاب اور آسودہ سمجھتے ہو۔

ڈاکٹر: تو کیا میرا خیال غلط ہے؟

سول نس: نہیں، بالکل نہیں، ہال وار، سول نس کہلانا ہال وار سول نس معمار اعظم — اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر: قسمت نے تمھارا ساتھ دیا اور وہ قلعہ تمھاری خوش قسمتی سے جل گیا۔ تمھیں اسے پھر سے بنانے کا موقعہ مل گیا۔

سول نس: ڈاکٹر، اس کا بھی خیال رکھو یہ قلعہ ایلین کا خاندانی محل تھا۔

ڈاکٹر: انھیں تو بڑا رنج ہوا ہوگا۔

سول نس: ہاں، اور وہ اس سے نہ سنبھلی تھی کہ اسے بچوں کے مرجانے کا صدمہ اٹھانا پڑا۔

ڈاکٹر: پھر بھی تم نے تو اپنے فن تعمیر کی بنیاد اس کھنڈر پر رکھی۔ جب تم نے کام شروع کیا تو تم بالکل مفلس اور قصباتی نوجوان تھے اور اب تم ملک کے معمار اعظم ہو۔ قسمت نے تمھارا ساتھ دیا۔

سول نس: ہاں، اسی وجہ سے میں ڈرتا ہوں ڈاکٹر۔ ڈرتا ہوں کہ اسی طرح قسمت مجھ سے منہ نہ موڑ لے۔

ڈاکٹر: کیوں؟

سول نس: نئی پود۔ ڈاکٹر، میں جانتا ہوں کہ وہ دن آرہا ہے کہ کسی نہ کسی کے سر میں یہ دھن سمائے گی اور وہ کہے گا "مجھے موقعہ دو" اور پھر سب غل غپاڑے مچاتے ہوئے اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ مجھ پر گھونسے تان کر چلائیں گے۔ "جگہ خالی کردو۔ جگہ خالی کردو۔ جگہ خالی کردو" سمجھے ڈاکٹر، نئی نسل میرا دروازہ کھٹکھٹانے والی ہے۔

ڈاکٹر: اگر آ بھی جائے تو ہرج ہی کیا ہے؟

سول نس: آجائے تو؟ تب ہال ور سول نس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(دروازے پر دستک)

ڈاکٹر: کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

سول نس: کون ہے؟ اندر آجاؤ۔

ہلڈا: تسلیم، شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ مسٹر سول نس، میں ہلڈا وانگل ہوں۔

سول نس: تسلیم۔ اگر میری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو آپ سانگر ضلع کے ڈاکٹر وانگل کی صاحبزادی ہیں۔

ہلڈا: جی ہاں۔

سول نس: تب تو میں سمجھتا ہوں کہ میں وہیں آپ سے ملا ہوں گا۔ جب میں بہت عرصے پہلے موسم گرما میں پرانے گرجا کا مینار بنا رہا تھا۔

ہلڈا: جی ہاں۔

سول نس: لیکن یہ تو بہت سال پہلے کی بات ہے۔

ہلڈا: جی پورے دس برس پہلے کی۔

سول نس: تب تو آپ بہت چھوٹی رہی ہوں گی۔

ہلڈا: ہاں میں ۱۲۔۱۳ برس کی تھی۔

ڈاکٹر: مس ہلڈا وانگل۔ کیا آپ اس شہر میں پہلی بار آئیں ہیں۔

ہلڈا: جی ہاں، ڈاکٹر۔

سول نس: اور آپ یہاں کسی سے متعارف نہیں ہیں۔

ہلڈا: جی ہاں مسٹر سول نس۔ آپ کے سوا اور ہاں میں مادام سول نس کو بھی جانتی ہوں۔ ہم دونوں کچھ دنوں ایک ہسپتال میں ساتھ ساتھ رہی تھیں۔ میں آپ سے آج کی رات یہیں ٹھہرنے کی اجازت چاہوں گی۔

سول نس: ضرور۔ میں ابھی مادام سول نس سے کہتا ہوں وہ سب انتظام کریں گی.... (پکارتا ہے) ایلن۔

مادام: (دور سے) آئی، سول نس۔

ڈاکٹر: اب میں چلوں گا مسٹر سول نس۔ (آہستہ سے) تمھارا اندیشہ پورا ہوا مسٹر سول نس۔
آخر نئی نسل نے تمھارا دروازہ کھٹکھٹایا۔

سول نس: مگر بالکل دوسرے ہی انداز میں۔

ڈاکٹر: چھا تو میں چلتا ہوں، خدا حافظ۔

مسز سول نس: (آتی ہے) تم نے مجھے بلایا تھا۔

سول نس: ہاں، ایلین مس ہلڈا وانگل آئی ہیں۔

مسز سول نس: اوہو۔ یہ آپ ہیں۔ اچھا تو آپ آ ہی گئیں۔

سول نس: اور آج کی رات یہیں رہنا چاہتی ہیں۔

مسز سول نس: میں ابھی آپ کے ٹھہرنے کا بندوبست کرتی ہوں۔

سول نس: انھیں بچوں کے کمروں میں سے کسی کمرے میں کیوں نہ ٹھہرایا جائے۔

مسز سول نس: ہاں ہاں، ان کمروں میں کافی جگہ ہوگی۔ اب آپ ذرا آرام کر لیجیے، میں ابھی آئی۔
(جاتی ہے)

ہلڈا: کیا آپ کے گھر میں بچوں کے کمرے بہت ہیں، مسٹر سول نس۔

سول نس: ہاں، گھر بھر میں تین کمرے ہیں۔

ہلڈا: آپ کے بچے بھی بہت ہوں گے۔

سول نس: جی نہیں، ہمارے ایک بھی بچہ نہیں ہے۔

ہلڈا: مسٹر سول نس۔

سول نس: جی کہیے۔

ہلڈا: کیا آپ کو باتیں بہت کم یاد رہتی ہیں۔

سول نس: میری یادداشت کچھ زیادہ کمزور تو نہیں ہے۔

ہلڈا: تو کیا جو باتیں وہاں ہوئی تھیں، ان کے بارے میں آپ مجھ سے کچھ نہ کہیں گے۔

سول نس: کہاں، لی سان گر میں؟ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کوئی خاص بات تو پیش نہیں آئی تھی۔

ہلڈا: آپ بیٹھے، بیٹھے، کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔

سول نس: اچھا تو آپ ہی مجھے یاد دلائیے۔

ہلڈا: جب مینار بن کر تیار ہو گیا تھا تو گاؤں میں بڑی دھوم دھام کا جشن ہوا تھا۔ گرجے میں گانا ہو رہا تھا، سڑکوں پر مرد عورتیں جمع تھے۔ ہم سب اسکول کی لڑکیاں سفید پوشاک پہنے ہوئے تھیں اور ہمارے ہاتھوں میں جھنڈیاں تھیں۔

سول نس: مجھے وہ دن ابھی تک یاد ہے۔

ہلڈا: پھر آپ مچان پر چڑھ کر چوٹی تک پہنچ گئے تھے۔ آپ کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک بہت بڑا ہار تھا اور وہ آپ نے اوپر کلس پر پہنا دیا تھا۔

سول نس: جی ہاں، میں نے اس وقت یہ رسم خود ہی ادا کی تھی۔ یہ بہت پرانی رسم ہے۔

ہلڈا: نیچے کھڑے ہو کر آپ کو اوپر چڑھتے ہوئے دیکھنا — اور وہ بھی کیسا سنسنی خیز عجیب منظر تھا۔ ڈر لگتا تھا کہ اگر آپ کہیں نیچے نہ گر پڑیں۔ کہیں خود معمار اعظم ہی نیچے نہ گر پڑے۔

سول نس: ہو سکتا تھا کہ میں گر ہی پڑتا کیوں کہ ان سفید فراک والی چھوٹی چڑیلوں میں سے ایک مجھے دیکھ کر چلا رہی تھی۔

ہلڈا: ہاں اس نے کہا تھا ”معمار اعظم کی جے“۔

سول نس: وہ زور زور سے اپنی جھنڈی لہرا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے چکر سا آنے لگا تھا۔

ہلڈا: وہ چھوٹی سی چڑیل میں ہی تو تھی مسٹر سول نس۔ اوہ کتنا خطرناک منظر تھا وہ بھی۔ ہوا میں بانسریاں بج رہی تھیں۔ لیکن خاص بات تو اس کے بعد ہی ہوئی تھی۔

سول نس: وہ کیا۔

ہلڈا: آپ کو یاد نہیں کہ کلب میں آپ کے اعزاز میں ڈنر دیا گیا تھا اور جب آپ کمرے میں داخل ہوئے تھے میں اکیلی تھی اور اس وقت آپ نے مجھے چھوٹی چڑیل کی بجائے شہزادی کہا تھا۔

سول نس: ہو سکتا ہے۔ میں اس دن بہت خوش تھا۔

ہلڈا: پھر آپ نے کہا تھا کہ جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو آپ کی شہزادی بنوں گی۔

سول نس: اوہ کیا میں نے یہ بھی کہا تھا۔

ہلڈا: ہاں اور جب میں نے یہ پوچھا تھا کہ مجھے کب تک انتظار کرنا ہوگا تو آپ نے کہا تھا دس برس بعد آپ پھر آئیں گے اور دیو کی طرح آپ مجھے اٹھا لے جائیں گے اور پھر آپ مجھے ایک چھوٹی سی سلطنت مول لے دیں گے۔ آپ نے کہا تھا کہ اس سلطنت کا نام رنجستان ہوگا۔

سول نس: نہیں۔ میں نے یہ سب کچھ نہیں کہا ہوگا۔

ہلڈا: آپ نے ایسا ہی کہا تھا۔

سول نس: خیر۔ اس کے بعد اس سب کا نتیجہ کیا نکلا

ہلڈا: آپ اچھی طرح جانتے ہیں کوئی نتیجہ نہیں نکلا، کیوں کہ پھر دوسرے مہمان اندر آگئے تھے۔ شاید آپ کو یاد نہیں وہ کون سا دن تھا۔

سول نس: جی نہیں۔

ہلڈا: دس برس پہلے ستمبر کی انیسویں تاریخ تھی۔

سول نس: اچھا۔ آج بھی انیسویں ہی ہے۔

ہلڈا: جی ہاں، دس برس پورے ہو گئے میں اپنی سلطنت لینے آئی ہوں۔ لایئے میری سلطنت مسٹر سول نس۔

سول نس: (ہنس کر) اچھا اب مذاق چھوڑیئے۔ یہ بتایئے آپ یہاں کیسے آئی ہیں۔

ہلڈا: سب سے پہلے تو میں ایک چکر لگا کر آپ کی بنائی ہوئی ساری عمارتیں دیکھنے آئی ہوں۔

سول نس: لیکن اچھی خاصی ورزش ہو جائے گی۔

ہلڈا: مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بہت سی عمارتیں بنائی ہیں اور ان کے ساتھ ہی گرجا گھروں کے اونچے اونچے مینار بھی

سول نس: نہیں۔ اب میں نہ گرجے بناتا ہوں اور نہ گرجوں کے اونچے مینار۔ صرف انسانوں کے رہنے کے لیے گھر بناتا ہوں اور بس۔

ہلڈا: کیا آپ ایک آدھ گرجا کا مینار بھی ان مکانوں کے ساتھ نہیں بنا سکتے۔ کوئی ایسی چیز جو

خوب اونچی ہو، کھلی ہوا میں بہت اونچائی کی طرف اشارہ کرتی ہو، جس کا کلس اتنا اونچا ہو کہ دیکھنے سے چکر آ جائے۔

سول نس: مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ بھی وہی کہہ رہی ہیں جن کے بنانے کی مجھے خود بڑی فکر ہے میں اپنے لیے مکان بنا رہا ہوں لگ بھگ پورا ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اونچا مینار بھی ہے۔ بہت ہی اونچا مینار۔

ہلڈا: کل سویرے میں پہلا کام یہ کروں گی کہ اس مینار کو دیکھوں۔

سول نس: ہلڈا، بڑا اچھا ہوا کہ تم میرے پاس آ گئیں۔

ہلڈا: بہت اچھا ہوا؟

سول نس: ہاں کیوں کہ میں بالکل ہی تن تنہا تھا میں ہر چیز کو بے بسی سے تکتا تھا۔ میں ڈرنے لگا تھا نئی پود سے ڈرنے لگا تھا۔

ہلڈا: ہونہہ۔ نئی پود بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ کیا میں آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں۔

سول نس: ضرور۔ تم بھی تو ایک نئی دھج کے ساتھ آئی ہو۔ شباب شباب سے مقابلہ کرنے آیا ہے۔ نئی پود نئی پود کے مقابل۔

ہلڈا: تو کیا میں سچ مچ آپ کے کام آ سکوں گی۔

سول نس: سچ مچ۔

ہلڈا: پھر تو..... بھگوان.... پھر تو میری سلطنت مجھے مل گئی۔

سول نس: ہلڈا۔

ہلڈا: میں کہہ رہی تھی کہ قریب قریب مل گئی ہے۔

(مسز سول نس کے قدموں کی آواز)

مسز سول نس: مس ہلڈا اوانگل آپ کا کمرہ بالکل تیار ہے۔

ہلڈا: مسز سول نس آپ کی مہربانی۔

سول نس: بچوں کے کمرے ہیں؟

مسز سول نس: جی ہاں، بیچ والے میں، لیکن کھانا تو کھا لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے ہیں۔

سول نس: اچھا چلو۔

(2)

سول نس: ہاں، تو یہ ہے راگ نر کا بنایا ہوا نقشہ۔ ابھی دیکھے لیتا ہوں انھیں۔ اوہ تم ہو کایا۔

کایا: میں آپ کو صرف اپنے آنے کی اطلاع کرنا چاہتی تھی۔

سول نس: ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ راگ نر نہیں آیا۔

کایا: نہیں۔ ابھی تو نہیں آئے۔ برودک بابا کے لیے ڈاکٹر کو لینے گئے تھے۔ لیکن اب شاید آتے ہی ہوں گے۔

سول نس: بڑے میاں کا کیا حال ہے؟

کایا: ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے آپ سے چھٹی مانگی ہے۔ آج وہ پلنگ سے اٹھ بھی نہیں سکتے۔

سول نس: ہاں، ہاں، ضرور اچھا تو تم کام شروع کرو۔

کایا: بہت اچھا۔

ہلڈا: صبح بخیر مسٹر سول نس۔

سول نس: آؤ، ہلڈا۔ کہو اچھی طرح نیند نہیں آئی کیا؟

ہلڈا: بہت اچھی طرح۔ بڑے آرام سے۔

سول نس: کچھ خواب بھی دیکھے۔

ہلڈا: جی ہاں، بہت ڈراؤنے خواب۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک بھیانک اونچی اور سیدھی چٹان سے نیچے گر رہی ہوں — آیئے مسز سول نس۔

مسز سول نس: میں تمھاری تلاش میں تھی، میں بازار جا ہی رہوں تمھیں کچھ منگانا ہو تو بتا دو۔

ہلڈا: شکریہ، آپ کتنی اچھی ہیں۔

مسز سول نس: کوئی بات نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا اور اس کے پورا کرنے میں مجھے خوشی ہوگی۔ اچھا تو میں چلتی ہوں۔

ہلڈا: مسٹر سول نس، کیا مسز سول نس مجھے اچھا نہیں سمجھتیں۔

سول نس: ادھر چند سال سے ایلن اجنبیوں سے کچھ دور دور رہتی ہیں۔ جب تم اسے اچھی طرح جان جاؤ گی تب معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر پر خلوص اور محبت کی عورت ہے۔

ہلڈا: اگر واقعی وہ اتنی اچھی ہیں تو پھر انھوں نے فرض کا لفظ کیوں استعمال کیا، میں اس بھیانک، خراب اور بے کار لفظ کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

سول نس: کیوں؟

ہلڈا: کچھ عجیب ٹھنڈا اور چبھتا ہوا لفظ ہے۔ فرض۔ فرض۔ فرض۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ کو یہ لفظ چبھتا ہوا نہیں لگتا۔ اچھا خیر یہ سب نقشے آپ کے کھینچے ہوئے ہیں۔

سول نس: نہیں میرے ایک نوجوان اسسٹنٹ کے ہیں۔

ہلڈا: اس کو آپ ہی نے کام سکھایا ہے؟

سول نس: ہاں ہاں، اس نے مجھ سے بھی سیکھا ہے۔ یہاں میرے بہت سے شاگرد ہیں، پھر بھی انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

ہلڈا: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اتنے کند ذہن کیوں ہیں؟

سول نس: کیوں؟

ہلڈا: اگر آپ اسی قدر بے فکری سے سب لوگوں کو سکھاتے پھرے....نہیں مسٹر سول نس اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ آپ کے علاوہ کسی اور کو تعمیر کی اجازت ہی نہیں دینی چاہئے، صرف تم سے ایک بات کہوں۔

ہلڈا: کیا؟

سول نس: میں خود بھی تنہائی میں برابر یہی سوچا کرتا ہوں۔ اچھا یہاں آؤ۔ کھڑکی سے باہر دیکھو، ادھر باغ میں جہاں سے پتھر نکالے جاتے ہیں اس کے ٹھیک اوپر۔

ہلڈا: آپ اس نئے مکان کو کہہ رہے ہیں۔ اس کا مینار تو بہت ہی اونچا ہے... سچ کیا یہی آپ کا مکان ہے؟

سول نس: ہاں۔

ہلڈا: اور اسی میں آپ جلدی ہی رہنے لگیں گے۔

سول نس: تین کمرے جیسے یہاں ویسے ہی اس نئے مکان میں بھی ہیں۔

ہلڈا: لیکن کوئی بچہ نہیں۔

سول نس: نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

ہلڈا: (ہنسی کے ساتھ) کیا وہی بات ہے جو میں نے کہا تھا کہ آپ میں کچھ جنون کے آثار ہیں ضرور۔

سول نس: کیا تم یہی سوچ رہی تھیں ہلڈا.... ہمارے بھی بچے تھے میرے اور ایلین کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو قریب قریب ایک ہی عمروں کے تھے۔

ہلڈا: یعنی جڑواں بچے۔

سول نس: ہاں اب تو ۱۱۔۱۲ برس ہوگئے۔ وہ صرف دو تین ہفتے زندہ رہے۔ میں تمھیں کیسے بتاؤں ہلڈا کہ تمھارا آنا میرے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔ اب کم از کم مجھے کوئی ایسا تو ملا جس سے دل کھول کر باتیں کرسکوں۔ کیا تم میری کہانی سنوگی۔

ہلڈا: شوق سے۔

سول نس: کھڑکی سے باہر دیکھو وہاں بلندی پر، جہاں تم کو نیا مکان دکھائی دے رہا ہے۔

ہلڈا: ہاں۔

سول نس: میں اور ایلین شادی کے کچھ برس بعد تک وہاں رہے۔ وہاں ہمارا قدیم خاندانی مکان تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ پائیں باغ بھی تھا۔

ہلڈا: کیا اس مکان میں بھی کوئی مینار تھا۔

سول نس: نہیں۔ باہر سے وہ صرف لکڑی کا ایک بڑا سا ریک بے ڈول ڈبہ سا لگتا تھا پھر بھی اندر سے وہ بہت آرام دہ تھا۔

ہلڈا: تو کیا آپ نے وہ بھدا قدیم مکان ڈھا دیا۔

سول نس: نہیں اس میں آگ لگ گئی۔

ہلڈا: پورا مکان جل گیا۔ آپ کو بہت نقصان ہوا ہوگا۔

سول نس: یہ سب انسان کے اپنے رویہ پر منحصر ہے۔ معمار کی حیثیت سے یہی آگ میری ترقی کا

باعث ہوئی۔

ہلڈا: ہاں، لیکن۔

سول نس: یہ دونوں بچوں کی پیدائش کی بات ہے۔ یہ بچے بڑے تندرست اور خوبصورت تھے جب ایلن انھیں گود میں لیتی تو دنیا کی ہر چیز مسکرا اٹھتی تھی لیکن پھر وہ رات آئی جب آگ لگ گئی۔

ہلڈا: پھر کیا ہوا کوئی جلا تو نہیں۔

سول نس: نہیں ہم سب گھر سے زندہ ہی باہر آ گئے، لیکن، لیکن اس حادثے سے اس کے دل پر ہیبت بیٹھ گئی۔ بھیانک رات ...... وہ فائر بریگیڈ کا خوفناک شور..... رات کی برفیلی ہوائیں اور پھر جس طرح بچے ایلن کے پاس لیٹے ہوئے تھے اسی طرح وہ باہر لائے گئے۔

ہلڈا: کیا اس ہیبت سے بچے مر گئے۔

سول نس: نہیں لیکن ایلن کو بخار آ گیا اور اس کا اثر دودھ پر پڑا۔ اسے ضد تھی کہ وہ بچوں کو خود ہی دودھ پلائے گی۔ وہ کہتی تھی یہ اس کا فرض ہے— ہمارے دونوں بچے— وہ— خیر دنیا میں اس قسم کے واقعے ہوتے رہتے ہیں۔ اس دن سے گرجا بنانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔

ہلڈا: تو آپ نے ہمارے شہر کے گرجا کا مینار بھی اوپری دل ہی سے بنایا تھا۔

سول نس: ہاں، اپنی مرضی کے خلاف جب وہ پورا ہو گیا تو مجھے بڑا اطمینان ہو گیا اور اب میں کبھی کبھی بھی اس قسم کی کوئی چیز نہ بناؤں گا۔ نہ گرجا نہ مینار۔

ہلڈا: انسانوں کے رہنے کے لیے مکانوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

سول نس: ہاں ہلڈا صرف انسانوں کے رہنے کے لیے مکان۔

ہلڈا: لیکن ایسے مکان جس میں اونچے مینار بھی ہوں۔

سول نس: شاید— ہاں تو یہ آگ ہی میری ترقی کا سبب بنی۔ میں نے باغ کو کئی حصوں میں تقسیم کیا اور اپنی مرضی کے مطابق مکان بنائے جس سے میری شہرت اور ترقی کا آغاز ہوا۔

ہلڈا: اس طرح آپ کی زندگی واقعی کامیاب رہی۔

سول نس: کامیاب؟ اور سب لوگوں کی طرح کیا تم بھی یہی کہتی ہو۔

ہلڈا: ہاں۔ اگر آپ اپنے بچوں کے بھلا دینے میں کامیاب ہوئے ہوں تو۔

سول نس: ان کا بھلانا اس قدر آسان نہیں لیکن ہلڈا آگ لگ جانے کا قصہ سن کر تمھیں ایک خیال نہیں آیا۔

ہلڈا: کیا؟

سول نس: یہی کہ صرف اس آگ کی بدولت ہی مجھے انسانوں کے لیے مکان بنانے کا موقعہ ملا۔ خوبصورت اور آرام دہ گھر جن میں رہ کر ماں، باپ اور بچے یہ محسوس کرسکیں کہ زندگی کتنی بڑی نعمت ہے اور پھر ایک دوسرے کے چھوٹے بڑے کاموں میں شریک ہوسکیں۔

ہلڈا: کیا یہ بات آپ کے اطمینان کے لیے کافی نہیں۔

سول نس: لیکن اس کی قیمت؟ ہلڈا، میں نے اس کے لیے بھاری قیمت ادا کی۔ دوسروں کے مکان بنانے کے لیے مجھے خود اپنا مکان تباہ کرنا پڑا۔

ہلڈا: اس کا کیا مطلب ہے؟

سول نس: میری طرح ایلین کی زندگی کا بھی تو ایک آدرش تھا۔ میرے آدرش نے اسے کچل ڈالا۔ ایلین میں بھی عظیم تخلیقی قوتیں موجود تھیں۔

ہلڈا: تخلیقی صلاحیت۔

سول نس: ہاں۔ گرجے اور مینار بنانے کی نہیں بلکہ اور نئی نسل کو تعمیر کرنے کی صلاحیت تھی۔ اور اب وہ اس طرح بے کار ہوگئی جیسے آگ کے بعد راکھ کا ڈھیر۔

ہلڈا: لیکن اگر یہ بات ہوتی تو بھی تو ــــ

سول نس: یہی بات ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

ہلڈا: تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔

سول نس: فرض کرو یہ سب میری ہی غلطی سے ہوا ہو۔ یہی خیال مجھے دن رات کھائے جا رہا ہے۔

ہلڈا: آپ کی غلطی سے آگ ــــ

سول نس: شاید اس کی ذمے داری مجھی پر ہو۔

(راگ نر آتا ہے)

راگ نر: اوہ۔ مسٹر سول نس، معاف کیجئے۔

سول نس: راگ نر ٹھہرو۔ میں نے سنا ہے کہ تمھارے باپ کی طبیعت خراب ہے۔

راگ نر: جی ہاں، بہت خراب ہے۔ میں آپ سے یہی گزارش کرنے آیا ہوں کہ آپ میرے بنائے ہوئے نقشوں کے بارے میں تعریف کا ایک جملہ لکھ دیں تاکہ وہ اطمینان سے آخری سانس لے سکیں۔

سول نس: میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ نقشے بالکل غلط سلط ہیں۔

راگ نر: اور شاید میں بھی کسی کام کا نہیں ہوں۔

سول نس: میرے ساتھ کام کرتے رہو راگ نر۔ تمھاری سب خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ کایا سے شادی بھی ہو جائے گی اور شاید تمھاری زندگی مسرت اور اطمینان سے گزرے۔ یہ الگ کام شروع کرنے کا خبط چھوڑو۔

راگ نر: تو کیا میں انھیں بستر مرگ پر آپ کا یہی پیغام سنادوں۔

سول نس: راگ نر، میں مجبور ہوں۔

راگ نر: میرے نقشے تو مجھے لوٹا دیجئے۔

سول نس: ضرور، میز پر رکھے ہوئے ہیں اٹھالو۔

راگ نر: شکریہ۔

ہلڈا۔ نہیں نقشے یہیں رہنے دو۔ میں ذرا انھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔

سول نس: اچھا تو یہ نقشے پھر لے جانا۔ تمھیں اپنے باپ کی تیمارداری کے لیے دیر ہو رہی ہے۔

راگ نر: اچھا تو میں جاتا ہوں۔

ہلڈا: مسٹر سول نس۔ آپ نے بڑی واہیات بات کی ہے۔

سول نس: مگر تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ میرے سوا کسی کی تعمیر کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔

ہلڈا: میں کہہ رہی تھی مگر آپ کو تو نہ کہنا چاہئے تھا۔

سول نس: مجھے تو سب سے پہلے یہ کہنا چاہئے تھا میں نے اس بلندی تک پہنچنے کے لیے بڑے دکھ

اٹھائے ہیں۔ سنو۔

ہلڈا: کہیے۔

سول نس: میں نے آگ لگنے سے بہت پہلے چمنی میں اس شگاف کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے بارہا اسے ٹھیک کرانے کا ارادہ کیا مگر جیسے میرا کوئی ہاتھ پکڑ کر روک دیتا تھا۔

ہلڈا: آخر کیوں؟

سول نس: کیوں کہ میں سوچتا تھا شاید اس سے میری ترقی کا کوئی راستہ نکل آئے۔ میں سوچتا تھا جاڑے کے موسم میں دوپہر سے کچھ پہلے میں اور ایلن ٹہلنے کے لیے باہر جائیں گے اور گھر میں نوکر خوب زور سے آتش داں میں آگ جلائے گا۔

ہلڈا: کیوں کہ اس دن سردی بہت تیز ہوگی۔

سول نس: ہاں، اور جب ہم گھر لوٹیں گے تو لکڑی کے ڈبے کی طرح اس مکان سے دھواں اور آگ کی لپٹیں اٹھتی دکھائی دیں گی۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح کا حادثہ ہو اور سب کچھ اسی طرح ہوا۔

ہلڈا: تو کیا آپ کو یقین ہے کہ آگ اسی دراز سے لگی۔

سول نس: نہیں۔ یہ تو طے ہے کہ آگ کپڑے کی الماری سے لگی جو مکان کے بالکل ہی دوسرے حصے میں رکھی ہوئی تھی۔

ہلڈا: تو چمنی کے بارے میں اتنی دیر سے آپ کیا کہہ رہے تھے؟

سول نس: ہلڈا، کیا تم میری بات مانتی ہو کہ دنیا میں کچھ ایسے گنے چنے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں کسی چیز کو چاہنے کی خواہش اس قدر زبردست اور ان کی قوت ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں ہو کر رہتا ہے۔

ہلڈا: تو کیا آگ آپ کی خواہش کی وجہ سے لگی؟

سول نس: میری ہی غلطی سے دونوں بچوں کی جانیں گئیں، میری ہی وجہ سے ایلن جو کچھ بن سکتی تھی نہ بن سکی۔ اسے لوگ قدرتی حادثہ کہتے ہیں۔ میری زندگی کو کامیاب قرار دیتے ہیں لیکن یہ میرے سینے کا بہت بڑا زخم ہے تم اندازہ کرسکتی ہو کہ اس زخم میں کتنی جلن ہوتی ہے۔

ہلڈا: (نقشے سامنے ٹیک کر) اچھا۔ اب ہم ان نقشوں کے بارے میں کچھ باتیں کریں گے۔

سول نس: (غصے سے) ان نقشوں کو میرے سامنے سے ہٹا لو۔

ہلڈا: بچارا بڈھا مرنے والا ہے۔ اسے اس آخری مسرت سے کیوں محروم کرتے ہو، ممکن ہے اس کے لڑکے کو ان نقشوں ہی کی وجہ سے کام مل جائے۔ کیا ان نقشوں پر آپ جھوٹی تعریف کے دو حرف بھی نہیں لکھ سکتے۔

سول نس: نہیں ہلڈا نہیں۔ انھیں لے جاؤ، میں ان سے عاجز آ چکا ہوں۔ میں راگ نر کو میدان میں نہیں آنے دینا چاہتا۔ اسے موقعہ مل گیا تو وہ مجھے خاک میں ملا دے گا۔ جیسے میں نے اس کے باپ کے کاروبار کو مٹا دیا تھا۔

ہلڈا: کیا راگ نر میں سچ مچ اتنی قابلیت ہے؟

سول نس: ہاں ہے اور ضرور ہے وہی اس نئی پود کا نشان ہے جو میرا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے یہ لوگ میرا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں۔

ہلڈا: ایسی بات مت کیجئے۔ کیا آپ مجھے اس چیز سے محروم کرنا چاہتے ہیں جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

سول نس: کون سی چیز؟

ہلڈا: آپ کو اونچے سب سے اونچے مقام پر دیکھنے کی آرزو۔ یہی آرزو کہ آپ ہار ہاتھ میں لیے ہوئے گرجا کے بلند ترین مینار پر چڑھ رہے ہوں۔ اچھا آپ کی پنسل کہاں ہے۔

سول نس: یہیں کہیں ہوں گی۔

ہلڈا: ہاں تو یہ رہی پنسل۔ اب آپ نقشوں پر کچھ لکھئے خلوص اور پیار کے ساتھ تعریف کے دو حرف۔

سول نس: ہلڈا۔ کیا تم سچ مچ دس برس تک میرا انتظار کرتی رہیں۔

ہلڈا: جی۔

سول نس: تو پھر تم نے کیوں خط نہ لکھا۔ میں جواب دیتا۔

ہلڈا: نہیں یہ تو چاہتی ہی نہ تھی۔ میں ڈرتی تھی اس طرح سارا کام ہی خراب نہ ہو جائے۔

لیکن مسٹر سول نس ان نقشوں پر تو کچھ نہ کچھ لکھئے۔

سول نس: تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔

ہلڈا: اپنی سلطنت، لیکن آپ۔

سول نس: اچھا تو کیا ان نقشوں پر لکھنا ہی پڑے گا۔

ہلڈا: ہاں— آیئے مسز سول نس۔

مسز سول نس: مس ہلڈا وانگل، یہ کچھ چیزیں میں آپ کے لیے لیتی آئی ہوں۔ بڑے پارسل ابھی آرہے ہیں۔

ہلڈا: شکریہ۔

مسز سول نس: نہیں یہ تو میرا فرض تھا۔

سول نس: ایلین، وہ میری ٹائپسٹ کایا دفتر میں ہے؟

مسز سول نس: ہاں وہ میز کے پاس کھڑی تھی۔

ہلڈا: کیا آپ لکھ چکے مسٹر سول نس! نہیں آپ نہ جایئے یہ فخر مجھے حاصل کرنا ہے۔ میں یہ نقشے کایا کے پاس خود ہی لے کر جاؤں گی۔ (زور سے آواز دیتی ہے) کایا۔ کایا۔ یہاں آؤ، جلدی کرو۔

کایا: آئی..... کیا ہے مادام۔

ہلڈا: دیکھو کایا ان نقشوں کو ابھی گھر لے جاؤ۔ مسٹر سول نس نے ان پر سفارشی نوٹ لکھ دیا ہے۔ جلدی کرو۔

سول نس: ہاں انھیں لے کر اسے دے دو۔ اب راگ نر کو اپنا کاروبار چلانے کا موقع مل جائے گا۔

کایا: آپ اجازت دیں تو وہ خود آ کر آپ کا شکریہ ادا کرے۔

سول نس: نہیں مجھے شکریہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں، یہ کہہ دینا کہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں اور نہ تمھاری ضرورت ہے۔

کایا: اور نہ میری خدمات کی۔

سول نس: ہاں تمھارے لیے یہی اچھا ہے۔ یہ نقشے لے کر فوراً گھر چلی جاؤ، سنا تم نے، چلی جاؤ۔

کایا: بہت اچھا۔

(جاتی ہے)

مسز سول نس: لیکن سول نس ڈیر اس کے بغیر تمھارا کام کیوں کر چلے گا۔

سول نس: تم نئے مکان میں منتقل ہونے کا بندوبست کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے۔ ممکن ہو تو آج شام ہی کو مینار کو ہار پہنانے کی رسم ادا کر دی جائے۔

ہلڈا: اوہ، آپ، دوبارہ اتنی بلندی پر چڑھیں گے کتنا مبارک منظر ہوگا، وہ بھی۔

سول نس: میں؟

مسز سول نس: خدا کے لیے ہلڈا، ایسی بات زبان سے نہ نکالیے۔ مسٹر سول نس کو فوراً ہی چکر آ جاتا ہے۔

ہلڈا: نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں اونچے مینار کی سب سے بلند کلس کو ہار پہناتے دیکھا ہے۔

مسز سول نس: ہاں سنا تو ہے لیکن یہ ناممکن ہے قطعی، ناممکن۔

سول نس: لیکن ہو سکتا ہے کہ تم آج شام کو بالکل ہی دوسرا منظر دیکھو۔

مسز سول نس: نہیں، نہیں، خدا کے لیے نہیں میں ابھی جا کر ڈاکٹر کو خط لکھ کر بلاتی ہوں۔ وہ تمھیں منع کریں گے۔ وہ کبھی تمھیں مینار پر چڑھنے کی اجازت نہ دیں گے۔

(جاتی ہے)

ہلڈا: کیا یہ بات سچ ہے مسٹر سول نس۔

سول نس: کیا؟

ہلڈا: کہ میرا معمار اعظم جس قدر بلند عمارتیں بنا سکتا ہے اس بلندی تک چڑھنے کی اس میں سکت نہیں ہے۔

سول نس: میری شخصیت کا کوئی حصہ بھی تمھارے اثر سے محفوظ نہیں ہے ہلڈا۔

ہلڈا: تو آپ مینار کو ہار پہنائیں گے۔

سول نس: ہاں۔ تو آج شام کو ہم کلس کو ہار پہنائیں گے شہزادی ہلڈا۔

مسز سول نس: مس ہلڈا۔ کیا آپ باغ کی سیر کر رہی تھیں۔

ہلڈا: جی ہاں، ذرا ٹہلنے گئی تھی۔ آپ کے باغ کی جھاڑیوں میں تو پھولوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

مسز سول نس: اچھا۔ ابھی تک؟

ہلڈا: کیا آپ باغ میں بہت کم جاتی ہیں؟

مسز سول نس: ہاں۔ میرے لیے باغ اتنا منحوس ہو گیا ہے کہ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔

ہلڈا: اپنے باغ سے؟

مسز سول نس: نہیں اب وہ باغ مجھے اپنا نہیں لگتا۔ اس کا کافی حصہ باغ سے باہر نکال کر اس پر لوگوں کے رہنے کے مکانات بنوا دیئے گئے ہیں اور وہ لوگ اپنی کھڑکیوں میں سے ہمیں گھور سکتے ہیں۔

ہلڈا: پیاری مسز سول نس، ایک بات پوچھوں۔

مسز سول نس: ضرور۔

ہلڈا: آپ نئے مکان میں جانے کے خیال سے خوش ہیں؟

مسز سول نس: مجھے کوشش کرنی چاہیئے، کیونکہ سول نس کی یہی خوشی ہے۔ لیکن کبھی کبھی دل پر قابو رکھنا دشوار ہوتا ہے۔

ہلڈا: اور پھر جب کسی نے اتنے دکھ سہے ہوں جتنے کہ آپ نے۔ پہلے تو آگ لگنے کا حادثہ اور پھر بچوں کی موت۔

مسز سول نس: لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟

ہلڈا: مسٹر سول نس نے مجھے بتایا۔

مسز سول نس: ہاں، مس ہلڈا میں آپ سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں ضرورت سے زیادہ دکھ سہے ہیں۔ اس آگ میں میری ساری چیزیں جل گئیں۔ بچوں کی موت کا ذکر چھوڑیئے وہ تو اب وہاں چین سے ہوں گے۔ دراصل چھوٹی چھوٹی چیزوں کا نقصان دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

ہلڈا: آپ کن چیزوں کے بارے میں کہہ رہی ہیں۔

مسز سول نس: ساری پرانی تصویریں جو دیواروں میں جڑی ہوئی تھیں، جل گئیں۔ وہ سارے ریشمی کپڑے جو پشتہا پشت سے ہمارے خاندان میں چلے آتے تھے جل کر راکھ ہو گئے اور پھر میر گڑیاں۔

ہلڈا: گڑیاں۔

مسز سول نس: میرے پاس تو بڑی خوبصورت گڑیاں تھیں وہ ہمیشہ میرے پاس ہی رہتی تھیں۔ وہ سب کی سب جل گئیں کسی نے ان کے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہنسئے نہیں مس ہلڈا۔ ان میں بھی جان تھی ان بچوں کی طرح جو ابھی پیدا نہ ہوئے ہوں۔

(ڈاکٹر ہیروال آتا ہے)

ڈاکٹر: نمستے مسز سول نس۔

مسز سول نس: آیئے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: مجھے آپ کی چٹھی مل گئی تھی __ کیا کوئی خاص کام ہے۔

مسز سول نس: ہاں مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔

ڈاکٹر: بہت خوب، تو آیئے پھر ہم اندر چلیں۔ مس ہلڈا، آپ ابھی تک آپ کو ہستانی کپڑے ہی پہنے ہوئے ہیں۔

ہلڈا: ہاں، بالکل پوری وردی میں ہوں مگر آج چڑھائی چڑھنے کا ارداہ نہیں ہے۔ ہم دونوں تو صرف نیچے سے دیکھتی ہی رہیں گی۔

ڈاکٹر: کیا بات؟

مسز سول نس: خاموش خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ مسٹر سول نس آ رہے ہیں۔ ہلڈا خدا کے لیے یہ خیال ان کے دماغ سے نکال دو۔ آؤ ڈاکٹر ہم دونوں چلیں۔

(سول نس آتا ہے)

سول نس: تم نے دیکھا ہلڈا میرے آتے ہی وہ اٹھ کر چلی جاتی ہے۔

ہلڈا: جی نہیں، آپ کے آتے ہی انھیں اٹھ کر چلا جانا پڑتا ہے۔

سول نس: کچھ بھی ہو، میں مجبور ہوں۔

ہلڈا: میں بھی چلی جانے والی ہوں، مسٹر سول نس۔

سول نس: جانے والی ہو؟ میں تمھیں نہ جانے دوں گا۔

ہلڈا: مجھے جانا ہی ہوگا جس کسی کو میں چاہتی ہوں اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ چیز جس پر آپ کی بیوی کا حق ہے میں ان سے نہیں چھین سکتی۔ میں یہاں سے چلا جانا ہی چاہتی ہوں۔

سول نس: تمھارے چلے جانے کے بعد میرا کیا ہوگا ہلڈا۔ میری اور صرف میری وجہ سے مسز سول نس مردہ ہو چکی ہیں میں ایک مردہ لاش کے ساتھ زندہ زمین میں گاڑ دیا گیا ہوں۔ میں جو سکون اور مسرت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

ہلڈا: اس کے بعد آپ کون سی عمارت بنائیں گے مسٹر سول نس۔

سول نس: مجھے بھروسہ نہیں کہ اب میں کچھ اور بنا سکوں۔

ہلڈا: مجھے یقین ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کے بعد آپ کیا بنائیں گے۔

سول نس: بتاؤ۔

ہلڈا: قلعہ۔ میرا قلعہ۔ میرا قلعہ بہت اونچائی پر ہوگا۔

سول نس: کیا اب تم قلعہ بنوانا چاہتی ہو۔

ہلڈا: واہ شاہی قلعے کے بغیر بھلا میری ریاست کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔ اب میں اپنی سلطنت کے لیے بہت دیر انتظار نہیں کر سکتی۔ اچھا لائیے۔ میرا قلعہ حاضر کیجیے۔

سول نس: اور اس میں بہت اونچا مینار بھی۔

ہلڈا: ہاں اس کا مینار بہت اونچا ہوگا اور اس کی چوٹی پر ایک کھڑکی ہوگی جس میں کھڑی ہوا کروں گی۔

سول نس: تب تو وہ ضرور آئے گا۔ لیکن اس میں کچھ بنانے کی سکت ہی نہ رہ جائے گی۔ بچارا معمار اعظم۔

ہلڈا: کیوں نہیں، ہم دونوں مل کر کام شروع کریں گے۔ اور پھر دنیا کی سب سے بڑی خوبصورت چیز کی تعمیر شروع کریں گے۔

سول نس: کون سی چیز؟

ہلڈا: ہوائی قلعے۔ جن میں پناہ لینا آسان ہے اور جن کو بنانا اس سے زیادہ آسان ہے اور جن کو بنانا اس سے زیادہ آسان ہے خاص طور پر ان معماروں کے لیے جنھیں جلد چکر آ جاتا ہے۔

(راگ نر آتا ہے)

سول نس: راگ نر، تم ہار لے کر آئے ہو۔

راگ نر: جی ہاں، میں نے مستری سے وعدہ کیا تھا۔

ہلڈا: اب تو آپ کے والد کی طبیعت ٹھیک ہے۔

راگ نر: نہیں۔

سول نس: کیا میں نے جو کچھ لکھ دیا تھا۔ انھیں اس سے اطمینان نہیں ہوا۔

راگ نر: جب آپ کی تحریر پہنچی انھیں دورہ پڑ چکا تھا، وہ بے ہوش ہیں۔

سول نس: اچھا تو تم گھر جاؤ، یہ ہار مجھے دے دو۔

راگ نر: اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ابھی یہیں رہوں۔

سول نس: اچھا۔ مجھے جانے دو۔ (سول نس باہر چلا جاتا ہے)

ہلڈا: مسٹر راگ نر، آپ کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا۔

راگ نر: اس کا شکریہ جس نے مجھے برسوں الجھائے رکھا جس نے میرے باپ کو مجھ پر اعتماد نہ کرنے دیا۔ مجھے اپنے پر اعتماد نہ کرنے دیا اور یہ سب اس لڑکی کایا کی وجہ سے ہوا جسے وہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

ہلڈا: آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں مسٹر راگ نر۔

راگ نر: کایا ہی سے پوچھ لو خود اس نے مجھے بتایا ہے۔

ہلڈا: یہ بات جھوٹ ہے میں بتاتی ہوں کہ کایا کو صرف اس لیے الجھایا گیا کہ وہ آپ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

راگ نر: کیا یہ بات اس نے خود کہی۔

ہلڈا: نہیں لیکن یہی بات ہونی چاہئے۔ یہی بات ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہی بات ہو۔

راگ نر: تو کیا واقعی وہ اتنے دنوں تک مجھ سے ڈرتا رہا ہے۔ دیکھا آپ نے وہ کتنا بزدل ہے۔

ہلڈا: کاش کہ آپ نے بھی انھیں اسی قدر بلندی پر دیکھا ہوتا جس پر میں نے دیکھا ہے۔

راگ نر: ہاں مجھے پتا ہے کہ عمر بھر میں صرف ایک بار اس نے بلندی تک پہنچنے کی ہمت کی تھی لیکن دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے دوبارہ اس بلندی تک پہنچنے کے لئے آمادہ نہیں کرسکتی۔

ہلڈا: آج وہ پھر اوپر چڑھیں گے۔ دیکھ لیجئے گا۔

راگ نر: نہ میں دیکھوں گا اور نہ آپ۔

ہلڈا: میں دیکھوں گی۔ میں دیکھوں گی۔ میں ضرور دیکھوں گی۔

(مسز سول نس آتی ہے)

مسز سول نس: مسٹر سول نس یہاں نہیں ہیں۔

ہلڈا: وہ نیچے مزدوروں کے پاس ہیں اور اپنے ساتھ ہار بھی لیتے گئے ہیں۔

مسز سول نس: خدا کے لیے راگ نر۔ ذرا تم جا کر انھیں یہاں بھیج دو۔ یہ نہ کہنا کہ مجھے ان سے کچھ کام ہے۔ یہ کہہ دینا کہ کوئی ان سے ملنے آیا ہے۔

راگ نر: بہت اچھا، میں ابھی انہیں بلائے لاتا ہوں۔

(جاتا ہے)

مسز سول نس: ہلڈا تم اندازہ نہیں کرسکتیں میں کتنی پریشان ہوں۔

ہلڈا: کیا کوئی ایسی بات ہے جس سے آپ اس قدر فکر مند ہوں۔

مسز سول نس: ہاں ضرور ہے۔ ذرا سوچئے اگر سچ مچ انھوں نے مچان پر چڑھنے کی ٹھان لی تو۔

ہلڈا: آپ کا خیال ہے کہ وہ بلندی پر چڑھیں گے۔

مسز سول نس: کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کچھ بھی ممکن ہے۔

(ڈاکٹر آتا ہے)

ڈاکٹر: مسز سول نس، میری رائے میں آپ کو ڈرائنگ روم میں ہونا چاہئے۔

مسز سول نس: میں یہاں سول نس کا انتظار کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر: لیکن کچھ عورتیں آپ سے ملنے آئی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ تقریب میں شرکت کرنا چاہتی

ہیں۔

مسز سول نس: اوہ، میرے خدا مجھے جانا ہی پڑے گا۔ یہ تو میرا فرض ہے لیکن آپ یہیں رہیے مس ہلڈا۔

ڈاکٹر: اور انھیں باتوں میں لگائے رکھئے۔

مسز سول نس: نہیں جہاں تک ہو سکے آپ انھیں اپنے قبضے میں رکھیں۔

ہلڈا: یہ تو آپ کے لیے مناسب تھا۔

مسز سول نس: ہاں فرض تو میرا ہی تھا لیکن جب کسی کو مختلف فرائض ایک ہی وقت میں انجام دینا ہوں تو.....

ڈاکٹر: وہ تو آرہے ہیں۔

مسز سول نس: اور مجھے ڈرائنگ روم جانا ہے۔

(جاتی ہے اور سول نس آتا ہے)

سول نس: کوئی بلا رہا تھا؟

ہلڈا: ہاں میں نے بلایا تھا۔

سول نس: میں ڈر رہا تھا کہ ایلین یا ڈاکٹر نے مجھے بلایا ہوگا۔

ہلڈا: تب تو واقعی آپ بہت جلد ڈر جاتے ہیں۔ تو کیا یہ بھی سچ ہے کہ آپ اونچائی پر چڑھنے سے بھی ڈرتے ہیں۔

سول نس: ہاں ڈرتا ہوں۔

ہلڈا: نیچے گرنے اور مرنے سے ڈرتے ہیں۔

سول نس: نہیں اس سے نہیں، میں انجام سے ڈرتا ہوں۔

ہلڈا: میں سمجھی نہیں مسٹر سول نس۔

سول نس: یہاں میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ ہلڈا۔

ہلڈا: (پاس آجاتی ہے) کہئے۔

سول نس: کیوں کہ میرا بچپن گاؤں کے ایک مذہبی گھرانے میں گزرا تھا اور میں اسے مبارک کام

جانتا تھا، میں نے چھوٹے گرجا اسی جذبے سے بنائے تھے کہ خدا ان سے خوش ہوا ہوگا لیکن اس نے ـــــ

ہلڈا: تو کیا سمجھتے ہیں کہ خدا آپ سے خوش نہیں ہوا۔

سول نس: اس نے میرے پرانے مکان کو جلا دیا۔ میرے چھوٹے بچوں کو اٹھا لیا پہلے تو میں اس کا مقصد نہ سمجھ سکا لیکن جب میں ''لی سان گر'' کا گرجا بنا رہا تھا تو یکا یک مجھ پر یہ بھید کھل گیا۔

ہلڈا: کیا؟

سول نس: وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی چیز نہ رہ جائے جو مجھے اپنے لالچ اور محبت میں الجھا سکے۔ محبت، مسرت، لالچ یا کچھ اور۔

ہلڈا: پھر آپ نے کیا کیا؟

سول نس: سب سے پہلے تو میں کبھی اس قدر اونچائی تک چڑھنے کی ہمت نہ کر سکا تھا لیکن اس دن میں نے یہ ناممکن کام بھی کر دکھایا اور جب میں وہاں سے اونچائی سے کھڑا ہو کر گرجا کے سب سے اونچے کلس کو ہار پہنا رہا تھا میں نے اس سے کہا: (اے خدا) آج سے میں بھی اپنی دنیا میں آزاد ہوں جس طرح تو اپنی کائنات میں سب سے عظیم ہے۔ میں تیرے لیے گرجا بنانے کے بجائے صرف انسانوں کے رہنے کے مکان بناؤں گا۔

ہلڈا: کیا یہی وہ گیت ہے جس کی آواز میں نے فضا میں سنی تھی۔

سول نس: لیکن پھر اس کی باری آئی۔ انسانوں کے لیے مکان بنانا بے کار ہی ثابت ہوا، کیوں کہ ان میں انسان کو سکون نہ ملا، میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کا ہر کام ہی مجھے بے کار سا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے دراصل کوئی چیز بھی نہیں بنائی اور نہ تعمیر کا موقع پانے کے لیے میں نے کوئی قربانی دی۔ یہ سب کچھ فضول ہے۔

ہلڈا: اب آپ تعمیر کا کام بالکل ہی چھوڑ دیں گے؟

سول نس: نہیں اب تو تعمیر کا کام شروع کروں گا۔

ہلڈا: اب آپ کیا بنائیں گے؟

سول نس: میں سمجھتا ہوں۔ انسانیت کو سچی مسرت صرف ایک جگہ مل سکتی ہے۔ ہوائی قلعہ۔ اور اب

میں ہوائی قلعے بنانا ہی شروع کرنے والا ہوں۔

ہلڈا: میں پھر آپ کو اسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہوں۔

سول نس: لیکن ہلڈا میں ہر روز ایسا نہیں کر سکتا۔

ہلڈا: لیکن آپ کو یہ کرنا ہی پڑے گا۔ میں کہتی ہوں آپ کو صرف ایک بار آپ کو اس ناممکن کو پھر ممکن کرنا ہوگا۔

سول نس: تو پھر میں اس بلندی پر خدا سے اسی طرح پھر باتیں کروں گا۔

ہلڈا: آپ کیا کہیں گے؟

سول نس: میں کہوں گا ''سن اے پروردگار جس طرح چاہے تو انصاف کر مگر اب میں دنیا کی سب سے خوبصورت چیزوں کے علاوہ اور کچھ نہ بناؤں گا اور یہ چیزیں میں ایک شہزادی کے ساتھ مل کر بناؤں گا، اور پھر میں اس سے کہوں گا ''اب میں نیچے اتر کر اسے اپنی گود میں لے لوں گا'' اور پھر ٹوپی ہلا کر نیچے اتر آؤں گا۔

ہلڈا: اب میں آپ کو وہی معمار اعظم بنتے دیکھ رہی ہوں جو آپ پہلے تھے۔

سول نس: اب شہزادی کو اپنا قلعہ مل جائے گا۔

ہلڈا: مسٹر سول نس، میرا پیارا، پیارا قلعہ، ہمارا ہوائی قلعہ۔

(مسز سول نس آتی ہے)

مسز سول نس: کیا بینڈ کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

ہلڈا: آیئے مسز سول نس۔

راگ نر: مستری نے آپ سے کہلوایا ہے کہ وہ ہار لے کر مینار پر چڑھنے کے لیے تیار ہے۔

سول نس: اچھا، راگ نر، میں خود ابھی اس کے پاس جاتا ہوں۔

مسز سول نس: تم وہاں کیوں جا رہے ہو۔

سول نس: میں نیچے مزدوروں کے پاس رہوں گا۔

مسز سول نس: ہاں۔ وہاں، نیچے ہی رہنا۔ نیچے ہی رہنا۔ (جاتا ہے)

اچھا میں ابھی آئی۔ (چلی جاتی ہے)

راگ نر: مس ہلڈا وانگل۔ وہ دیکھئے۔ بچارے نوجوان سڑک پر تقریب دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔

ہلڈا: ہاں، راگ نر۔

راگ نر: یہ سب میرے ساتھی طالب علم ہیں جو استاد کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ دیکھنے آئے ہیں کہ اس میں اپنے مکان کی چوٹی تک چڑھنے کی بھی سکت نہیں ہے۔

ہلڈا: اس بار تو آپ لوگوں کو مایوسی ہوگی۔

راگ نر: اچھا تو پھر کیا وہ اس بلندی تک چڑھ پائے گا؟

ہلڈا: جی ہاں ضرور۔

راگ نر: ناممکن۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ چلیے تقریب کا وقت ہو رہا ہے۔

(بینڈ باجے کی آواز قریب آجاتی ہے)

اوہو، کتنی بھیڑ ہے۔ ڈاکٹر ہال وار، مسز سول نس بھی تو موجود ہیں۔

ڈاکٹر: دیکھئے مادام سول نس مستری سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔

مسز سول نس: ہاں، ڈاکٹر اس کے ہاتھ میں ہار بھی ہے۔ خدا کرے ذرا سنبھل کر چڑھے۔

راگ نر: (زور سے) لیکن یہ تو......

ہلڈا: ہاں یہ وہی ہیں۔

مسز سول نس: ڈاکٹر، یہ تو مسٹر سول نس ہی ہیں، میرے خدا۔ میں اس کے پاس جاؤں گی۔ میں اس کے پاس جاؤں گی۔ میں انھیں نیچے اتار لاؤں گی۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔

ہلڈا: وہ چڑھتے ہی جارہے ہیں چڑھتے ہی چلے جارہے ہیں اونچے اور بھی اونچے۔ دیکھو، راگ نر دیکھو۔

راگ نر: اسے لوٹنا پڑے گا۔

ہلڈا: وہ چڑھتے ہی جارہے ہیں۔ کوئی لمحے میں وہ چوٹی تک پہنچ جائیں گے۔

مسز سول نس: میں خوف سے مری جارہی ہوں۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

ڈاکٹر: تو آپ اس طرف مت دیکھئے مادام سول نس۔

ہلڈا: دیکھو راگ نر، وہ بالکل اوپر مچان تک پہنچ گئے۔ وہ ٹھیک چوٹی پر ہیں۔ اب میں ایک بار

پھر انھیں اسی قدر عظمت اور بلندی پر دیکھ رہی ہوں۔

راگ نر: لیکن یہ ناممکن ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔

ہلڈا: ہاں ناممکن آج ممکن ہو گیا ہے۔ کیا تمھیں بھی ہوا میں کوئی گیت سنائی دے رہا ہے۔

راگ نر: یہ پتیوں سے ہوا کے ٹکرانے کی آواز ہے مس ہلڈا۔

ہلڈا: میں گیت سن رہی ہوں وہی عظیم نغمہ۔ دیکھو وہ ٹوپی ہلا رہے ہیں۔ اب کام پورا ہو چکا ہے۔ معمار اعظم زندہ باد۔

(سب لوگ مل کر نعرہ لگاتے ہیں۔ معمار اعظم زندہ باد)

(بینڈ کی آواز یکا یک بند ہو جاتی ہے)

ایک آواز: گر پڑا، گر پڑے۔

ہلڈا: میرا معمار اعظم بلندی سے گر پڑا۔

راگ نر: اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوں گے۔ وہ مینار کے سب سے اونچے مچان سے گر پڑا۔ وہ دیکھو لوگ مسز سول نس کو سنبھال رہے ہیں۔

دوسری آواز: کیا وہ ابھی زندہ ہیں؟

پہلی آواز: نہیں مسٹر سول نس کا انتقال ہو گیا۔

(موسیقی کی لہریں بلند ہوتی ہیں)

ایک آواز: بچارے کا جسم پاش پاش ہو گیا۔ ٹھیک پتھروں کے اوپر گرے تھے۔

ہلڈا: اب وہ مجھے اس بلند چوٹی پر دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔

راگ نر: اوہ خدایا کس قدر دردناک حادثہ ہے۔ خیر، وہ اپنے کام کو پورا کر کے نہ دکھا سکا۔

ہلڈا: (جوش میں) لیکن وہ ٹھیک چوٹی پر پہنچ گیا اور میں نے فضا میں بانسریوں کے نغمے کی آواز سنی۔ اس نے سب سے اونچی بلندی کو فتح کر لیا، میرا معمار اعظم۔

(فیڈ آوٹ)

☆☆☆

میرے اسٹیج ڈرامے

[چھ اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ]

ڈاکٹر محمد حسن

ناشر: ________

ادارۂ فروغ اردو 20 امین آباد پارک لکھنؤ

سول ایجنٹ: ________

انوار بک ڈپو 137 امین آباد پارک لکھنؤ

پاکستان میں: ______

مبارک بک ڈپو بندر روڈ بالائے نیشنل بنک کراچی 3

اشاعت: 1961

انتساب

اپنے محترم دوست نصیر حیدر کے نام
جس نے ہیرو کی طرح زندگی بسر کی۔

فہرست

پردہ اٹھنے سے پہلے

شائقین وناظرین!

جو ڈرامے آپ کے سامنے پیش کئے جارہے ہیں ان کی دو خصوصیات ہیں ایک یہ سب میرے لکھے ہوئے ہیں اور دوسرے یہ سب اسٹیج کیے جاسکتے ہیں۔ بعض ایک سے زائد بار اسٹیج ہو چکے ہیں۔ اگر اردو میں اسٹیج ''ڈراموں کی'' اتنی کمی نہ بھی ہوتی تو بھی انھیں کسی معذرت کے بغیر پیش کیا جاسکتا تھا کیونکہ ہر لکھنے والے کو اپنی تخلیق بھی لگتی ہے اور اس خوشگوار تجربے میں وہ سب کو شریک کرنا چاہتا ہے۔

دراصل اسٹیج ڈراما ایک مکمل وحدت اور مکالمے اس وحدت کا محض ایک ناقص سا جزو ہوتے ہیں۔ مکالمے سیپیاں ہیں یا قطرہ ہائے نیساں ہیں۔ انھیں موتی بنانے والا کیمیاوی عمل تو اسٹیج کے فن میں مضمر ہے۔ اداکاری، نغمہ، صورت، روشنی اور سائے، حرکات وسکنات، پس منظر اور سیٹنگ اور دوسرے تمام لوازم۔ میں یہ تمام لوازم آپ کے تخیل کے لیے چھوڑتا ہوں اور صرف الفاظ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

الفاظ بھی عجیب ہیں۔ ڈرامے میں بہت سی باتیں الفاظ کے بغیر ادا ہو جاتی ہیں۔ زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے الفاظ ہمارے خیالات وجذبات کا نقاب ہیں۔ ہم جب اپنے آپ کو چھپانا چاہتے ہیں تو الفاظ کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ ان کی مدد کے بغیر بھی تو لہجے کے اتار چڑھاؤ سے، ابرو کے اشارے سے، برتاؤ سے، ہماری خاموشیوں سے، ہمارے کی چہرے کی کیفیات سے، ہمارے دل کی بات ظاہر ہو جاتی ہے۔ الفاظ گویا ہمارے خیالات کے حاشیے ہیں۔ یہ ہماری خاموشیوں کو معنی دیتے ہیں اور ان کہی باتوں کی ناقابل بیان گہرائیوں کا پس منظر فراہم

کرتے ہیں۔

اصل متن کے بغیر میں یہ حاشیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے آپ کے تخیل پر بھروسہ ہے۔ میں تخیل کے ہاتھ میں الفاظ کی کلید دیتا ہوں اور اسے ڈراما پرڈیوسر کے سارے منصب سونپتا ہوں۔ وہ اس عظیم الشان ہال اور اس وسیع اسٹیج کی گرد جھاڑے گا، اداکاروں کو یکجا کرے گا، انھیں مناسب لباس اور میک اپ سے آراستہ کرے گا، نغمہ، صوت، روشنی اور اسٹیج کا انتظام کرے گا۔ شائقین و ناظرین کو فراہم کرے گا اور آپ کو سامنے والے صوفے پر اطمینان سے بٹھا کر تماشائیوں کی تالیوں کی گونج میں پردہ اٹھائے گا۔

لیجیے وہ پہلی گھنٹی بج گئی۔ آپ میرے ساتھ اسٹیج کے بازو میں آیئے تو کچھ اور باتیں کرلی جائیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے 14 سال میں ہندوستان میں جتنے نیک کام ہوئے ہیں ان میں سے ایک ڈرامے کی طرف توجہ کی تجدید بھی ہے۔ ابھی ڈرامے کا احیا نہیں ہوا اور اس کی طرف توجہ کا احیا اہم ہے۔ اردو نے جدید ہندوستانی ڈرامے کی جو خدمت کی ہے وہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں چار پانچ زبانوں ہی نے کی ہوگی۔ اب جو ایک بار پھر ڈراموں کی مانگ ہوئی اور عرصۂ محشر میں پیش ہونے کا وقت آیا تو اسٹیج ڈراموں کی ڈھونڈ ھیا پڑی۔ انارکلی کے بعد ہمارے ہاں ڈرامے بہت سے لکھے گئے مگر غالبؔ کی خواہشوں کا سا حال رہا۔

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ ڈرامے بھی اسی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ادبیت بھی برقرار رہے اور عام دلچسپی کا سامان بھی موجود ہو۔ ان میں کئی طرح کے ڈرامے ہیں بعض ایسے ہیں جن کے لیے لباس اور سیٹنگ کی فراہمی شوقیہ ڈراما کرنے والوں کے لیے دشوار ہوگی بعض ایسے ہیں جن میں زیادہ ساز و سامان کی ضرورت نہیں ہے۔

لیجیے دوسری گھنٹی بج گئی۔

چلتے چلتے یہ بات سنتے جایئے کہ ان ڈراموں کے لکھوانے کے بہت کچھ ذمہ داری استاد محترم سید احتشام حسین صاحب (جنھیں ہم سب صرف احتشام صاحب کہتے ہیں) کی ہیں انھوں

نے ہمت افزائی کی اور اس ہمت افزائی کے نتیجہ ان ڈراموں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور ان ڈراموں کو نوک پلک بخشنے کے لیے میں ان تمام خواتین وحضرات کا رہین منت ہوں جنھوں نے ان ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کیا اور انھیں خراد پر چڑھانے میں مدد کی۔ اگر انھیں اسٹیج پر پیش کرتے وقت مختلف گروپ اپنی دشواریاں اور تجاویز سے مصنف کو مطلع کرسکیں تو شاید ہم دونوں کے لیے مفید ہوگا۔ ان میں سے بعض ڈرامے ریڈیو ڈراموں کی شکل میں براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں انھیں آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔

لیجئے تیسری گھنٹی بھی بج گئی۔

غالب کا یہ شعر سنتے جایئے۔

نہ بندھے تشنگی شوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(پردہ اٹھتا ہے)

محمد حسن
رابعہ منزل، بدر باغ
علی گڑھ

20/ جنوری 1961ء

ریہرسل

[ایک ایکٹ کی کامیڈی]

یہ کامیڈی پہلی بار حیدر آباد میں اسٹیج کی گئی اور اس کے بعد نینی تال میں دو بار اور علی گڑھ میں مختلف موقعوں پر چار مرتبہ اسٹیج کی گئی۔ پہلی بار جن اداکاروں نے حصہ لیا ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

ڈائرکٹر	حکیم محبوب عالم
امجد	قمر رئیس
نوین	امیر شرر
روحی	الویرا محمود
رمیش	شہاب جوزی
جھمن لال	مقصود محمود
مرزا الٰہی بخش	افتخار عالم
رفیق	احمد اسحاق نعمانی
نورا	عمرانہ قدیر

کردار:

ڈائرکٹر	ایک ادھیڑ عمر کا بے حد تصور پرست اور جوشیلا شخص
امجد	ہیرو بننے کا شوقین، دل پھینک قسم کا نوجوان
نوین	25 سال کا ایک خوبصورت نوجوان
مس روحی	19 سال کی دبلی پتلی مگر خوبصورت گھریلو قسم کی لڑکی جسے فیشن ایبل اور ماڈرن بننے کا شوق ہے مگر کبھی کبھی گھریلو پن کی وجہ سے ہچکچاتی ہے۔
جھمن لال	بے پروا قسم کا ایک نوجوان جو انسپکٹر جنرل میں جج کا رول ادا کر رہا ہے
مرزا الٰہی بخش	عمر 55 کے لگ بھگ مگر بلا کے شوقین مزاج، پرانی چال کے بزرگ ہیں، دو پلی ٹوپی، مشروع کا تنگ پاجامہ، بھڑک دار پوت کی شیروانی، آنکھوں پر چشمہ، ہاتھ میں عصا، تیز چلتے ہیں اور تیزی سے باتیں کرتے ہیں۔ اپنے آگے کسی کو بولنے نہیں دیتے۔ پھرتی اور آواز سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانے میں تھیٹر میں کام کر چکے ہیں۔
رفیق تازی	مرزا الٰہی بخش کا ان سے زیادہ شوقین مزاج امریکن ٹائپ 19 سالہ لڑکا۔ وہ آوارہ قسم کی پتلون اور شوخ بش شرٹ میں ملبوس ہے۔
مس نورا	اینگلو انڈین استانی، عمر یہی کوئی 28 کے لگ بھگ اور لہجے میں بہت تصنع ہے۔

اور چند دوسرے افراد جو اسٹیج پر موجود رہتے ہیں مگر گفتگو میں حصہ نہیں لیتے۔ ان کی تعداد کم یا زیادہ کی جاسکتی ہے۔

وقت	40 منٹ۔
مقام	ہندوستان کا کوئی شہر۔
زمانہ	حال

منظر

[گوگول کے مشہور ڈرامے "انسپکٹر جنرل" کے ہندوستانی روپ کو ایک کالج کی شوقیہ اداکاروں کی ناٹک منڈلی پیش کر رہی ہے۔ یہ کامیڈی اسی کے مسائل پر لکھی گئی ہے۔]

ڈرامے کی ابتدا رسمی طور پر پردہ اٹھنے سے نہیں ہونی چاہیے۔ پردہ پہلے ہی سے اٹھا دیا جائے اور تیسری گھنٹی بجنے کے ساتھ ہی وہ کردار جو ڈرامے میں پارٹ کر رہے ہیں مختلف سامان اور فرنیچر لا کر اسٹیج پر رکھنے لگیں۔ اسٹیج پر آہستہ آہستہ ایک عمدہ صوفہ سیٹ جس کے تین اجزا ہوں، ایک گول میز، ایک معمولی میز، ایک کرچ کی پشت والی کرسی اور دو ہتھے والی معمولی کرسیاں رکھی جاتی ہیں۔ صوفہ سیٹ اور گول میز وسط میں ہوں اور باقی فرنیچر اسٹیج کے دائیں حصے میں ایک کنارے پر ہونا چاہیے مگر ہال کے ہر گوشے سے صاف طور پر دکھائی دینا چاہیے۔

پیچھے ایک اور نسبتاً اونچی میز پر میک اپ کا سامان، ایک بڑا آئینہ، چند قینچیاں، آئی برو پنسل، اسپرٹ گم اور داڑھی مونچھ بنانے کے بالوں کے ساتھ رکھا ہوا ہے اور ایک میک اپ کرنے والا بیٹھا ہوا کسی کا میک اپ کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ میک اپ نوین کا ہو رہا ہے۔

لوگ جب رفتہ رفتہ سامان لا کر رکھ دیتے ہیں تو میک اَپ والا میک اَپ شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا نوجوان اسی کے پیچھے کھڑا ہو کر چہرے پر پاؤڈر مل کر مونچھ لگانے میں مصروف ہے جو بار بار گر جاتی ہے۔ اسٹیج کے دائیں کنارے سے بائیں کنارے تک کچھ لوگ زور زور سے اپنے مکالمے یاد کرنے میں مصروف ہیں کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں کبھی طرح طرح کے منہ بناتے ہیں۔ ان میں مس روحی،

امجد، جھمن لال، رمیش اور چند دوسرے اداکار شامل ہیں۔

نوجوان امجد اس وقت گوگول کے ڈرامے کے بنیادی کردار 'میئر' کے میک اپ میں ہے، صرف ٹھوڑی پر داڑھی ہے، مونچھیں اور عمدہ سوٹ نکٹائی اور سر پر فلیٹ ہیٹ پہنے ہوئے ہے۔ مکالمے یاد کرتے وقت طرح طرح کے منہ بناتا ہے اور ہاتھ پیر بہت ہلاتا ہے۔ جھمن لال بھی نوجوان ہے۔ گل مچھے رکھے ہوئے ہے جو گالوں پر لگے ہوئے نقلی بالوں سے مل گئی ہیں۔ ٹھوڑی منڈی ہوئی ہے۔ رمیش اور چند دوسرے اداکار انسپکٹر جنرل کے کرداروں کے میک اپ میں ہیں۔ ڈائرکٹر خاصہ سنجیدہ اور بارعب آدمی ہے۔ درمیانہ قد، موٹے فریم کا چشمہ، پتلون قمیص پہنے اور نکٹائی لگائے کافی مصروف ہوتا ہے۔

اسٹیج کے دو دروازے ہیں۔ دائیں طرف کا دروازہ گرین روم کو جاتا ہے اور بائیں طرف کا دروازہ ایک اور کمرے کی طرف کو جس سے ہوکر باہر بھی جا سکتے ہیں۔ اسٹیج پر اداکاروں کے زور زور سے مکالمے یاد کرنے کی وجہ سے کافی شور ہو رہا ہے۔ ڈائرکٹر داخل ہوتا ہے اس کے داخل ہوتے ہی خاموشی چھا جاتی ہے اور جو جس پوز میں ہے اسی حالت میں رہ جاتا ہے۔ ڈائرکٹر لاپرواہی سے آگے بڑھتا ہے۔

ڈائرکٹر : سب لوگ تیار ہیں۔ ریہرسل شروع کریں (اسٹیج کے وسط میں آ کر) گوگول کا شاہکار ''انسپکٹر جنرل''۔

امجد : (آگے بڑھ کر ٹوکتے ہوئے) ایک منٹ ڈائرکٹر صاحب!

ڈائرکٹر : کیا بات ہے امجد؟ تم ہمیشہ مجھے عین وقت پر ٹوکا کرتے ہو۔

امجد : بات یہ ہے شاید ڈائرکٹر صاحب کہ اور تو سب آ گئے ہیں شاید ہیروئن ابھی نہیں آئی ہے اور ہیرو کا میک اپ ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔

ڈائرکٹر : اوف فوہ (غصے میں) نوین! نوین!! کہاں ہے نوین!

امجد : ابھی تو یہیں تھا پتہ نہیں کیوں نہیں بولتا۔

ڈائرکٹر : (پیچھے مڑ کر میک اپ کے سامان کی میز کی طرف دیکھتا ہے) نوین! تم یہاں بیٹھے ہو اور میں چلا رہا ہوں۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔

نوین : (ڈرامائی انداز میں کھڑے ہو کر کہتا ہے) آپ مجھے تو نہیں پکار رہے تھے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا ڈائرکٹر صاحب کہ ہم سب کو اپنے اصلی نام بھول جانے چاہئیں نوین کے نام سے میں کیوں بولوں۔ میں ہوں انسپکٹر جنرل (مکالمہ بولنے کے انداز میں) کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

ڈائرکٹر : کیا بدتمیزی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تمہارا میک اپ کب ختم ہوگا۔ ریہرسل کا وقت ہو گیا۔

نوین : بس ایک مونچھ باقی رہ گئی ہے۔

ڈائرکٹر : (غصے میں ٹہلتے ہوئے) کیا بے ہودگی ہے، ایک ہی مونچھ لگا کر ٹہلنے لگے۔

نوین : میرے خیال میں تو اگر انسپکٹر جنرل کے ایک ہی مونچھ ہو تو زیادہ حقیقی، بالکل نقل مطابق اصل معلوم ہوگا۔ آپ خود غور کریں گوگول کے ڈرامے میں بھی تو یہ کردار کچھ غیر معمولی سا کچھ عجیب بے تکے قسم کا ہے۔ چیرمین جب اس سے ملنے ہوٹل کے کمرے میں آتا ہے تو فرض کیجئے وہ حجامت بنا رہا ہے اور آدھی مونچھ مونڈ چکا ہے۔

ڈائرکٹر : بکواس بند کرو۔ جلدی میک اَپ کرو (نوین واپس میز کی طرف جاتا ہے اور امجد ڈائرکٹر کی چہل قدمی کو بیچ سے کاٹ دیتا ہے)

امجد : ایک بات مجھے عرض کرنی ہے۔ یہ جو چیرمین کا رول ہے شاید۔

ڈائرکٹر : امجد، شاید کیا چیز ہے۔ ہر بات میں شاید۔ یہ شاید۔ وہ شاید۔ اچھا اب کہئے کیا کہنا ہے۔

امجد : جی، اس میں اگر چیئرمین کے داڑھی نہ ہو تو کیسا رہے گا۔ خدا کی قسم ڈائرکٹر صاحب۔ یہ میک اپ والا نہ جانے کیا کیا الا بلا پوت رہا ہے ش— (ڈائرکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر شاید، کے لفظ کو نا تمام چھوڑ دیتا ہے) بناوٹی بال ایسے چبھتے ہیں اور ایسی سرانڈ پھوٹتی ہے کہ مجھے تو متلی ہونے لگتی ہے۔ (ابکائی لیتا ہے) میں بغیر داڑھی کے بھی رول کر سکتا ہوں۔

ڈائرکٹر : کاش گوگول کی روح یہاں ہوتی! تم لوگ اپنی تجویزیں اپنی جیب میں رکھو۔ صبح انھیں عرق بنفشہ میں گھول کر پی جانا۔ سمجھے؟ دیکھو، تمہاری داڑھی گر رہی ہے!

امجد : (داڑھی کو سنبھالتے ہوئے) ابھی جا کر چپکوائے لیتا ہوں (میک اپ کی میز کی طرف جاتا ہے)۔

ڈائرکٹر : اچھا تو شروع سے پوری ریہرسل کرنے کے بجائے بیچ کے ایک حصے کی ریہرسل کرتے ہیں مجھے اس میں ابھی کچھ ہدایات دینی ہیں بات کچھ بنی نہیں۔

نوین : (میک اپ کی میز کے قریب سے چونک کر) میں تیار ہوں ڈائرکٹر صاحب۔

ڈائرکٹر : ہاں تو ہم اس سین کی ریہرسل کر رہے ہیں جب چیئر مین اپنے گھر سے ہوٹل کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور اسے خبر مل چکی ہے کہ قصبے میں ایک انسپکٹر جنرل تحقیقات کے لیے آیا ہوا ہے (تالیاں بجا کر) سب لوگ تیار ہیں۔ چیئر مین، بیگم، مریم، دیو خاں، بوخاں، نمبر دار لوگ (سب اداکار اسٹیج کے وسط میں جمع ہونے لگتے ہیں)۔
جی ہاں سب ہیں مگر جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا ہیروئن ابھی تک ——

ڈائرکٹر : (بات کاٹ کر) گولی مارو ہیروئن کو۔ ہم سین شروع کر رہے ہیں ہیروئن کا پارٹ نوین پڑھ دے گا۔

نوین : بہتر۔

ڈائرکٹر : ریڈی۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔ میوزک، موسیقی، لائٹ۔

[فٹ لائٹ اور فلڈ لائٹ دونوں جلتی ہیں اور ایک سمت سے موسیقی کی دھن سنائی دیتی ہے۔ ڈرامے کا پہلا مکالمہ بولا جاتا ہے سب اداکار اسٹیج کے وسط میں صوفہ سیٹ کے سامنے جمع ہیں۔ مس روحی بائیں طرف کونے میں ہیں اور ڈائرکٹر کرچ والی کرسی پر اسٹیج کے دائیں طرف بیٹھے ہیں]

امجد : ''میں سب کچھ کہہ دوں گا۔ آپ جائیے۔''

روحی : (اپنی جگہ سے چل کر ڈائرکٹر تک آتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ امجد بھی چلا آتا ہے) دیکھئے ڈائرکٹر صاحب یہ مکالمہ کچھ ٹھیک نہیں ہے (ہاتھ میں جو پرچہ ہے اسے

ڈائرکٹر کی طرف بڑھا دیتی ہے) افوہ ڈراما اسٹیج ہونے میں کل دو دن رہ گئے ہیں اور ابھی تک آپ مکالموں میں باریکی نکال رہی ہیں۔ کیا مکالمہ ہے؟

[جھمن لال منہ بنا کر گرین روم کی طرف چلا جاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو، بس ہو چکی ریہرسل]

روحی : آپ ہی پڑھیے، ہم سے نہیں پڑھا جائے گا۔ (موسیقی اور روشنیاں بند ہو جاتی ہیں، صرف معمولی روشنی جلتی رہتی ہے)

ڈائرکٹر : (پرچہ چھین کر پڑھتا ہے) ''ڈارلنگ چیئر مین ڈارلنگ۔ کیا انسپکٹر جنرل کے بارے میں کچھ پتہ چلا'' کیا خرابی ہے اس مکالمے میں؟!

امجد : (دخل در معقولات) شاید مس روحی کا اشارہ ''ڈارلنگ'' کی طرف ہے۔

ڈائرکٹر : (امجد سے) تم چپ رہو جی۔ (روحی سے) جی تو مس روحی، کیا اعتراض ہے آپ کو؟!

روحی : دیکھیے ہم لوگ اس قسم کے الفاظ اپنے گھروں میں بزرگوں کے سامنے نہیں بولتے۔

ڈائرکٹر : یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ کوئی آدمی اپنے گھر دن رات ڈرامے نہیں کھیلا کرتا۔ لیکن آپ آخر ایک خاتون کا رول ادا کر رہی ہیں جو چیئر مین کی چہیتی بیوی ہے۔

روحی : بیوی؟! ہائے میرے اللہ!!

ڈائرکٹر : آپ نے ایک لمحے کے لئے اسٹیج پر کسی کو ڈارلنگ کہہ بھی دیا تو کیا قیامت آجائے گی۔

روحی : ہم کسی کو ڈارلنگ کہنے ہی کیوں لگیں۔ آخر آپ کو اس مکالمے کے بدل دینے میں کیا اعتراض ہے؟

ڈائرکٹر : یہ مکالمہ ہی تو پورے سین کی جان ہے۔

امجد : اسی سے تو ساری فضا قائم ہوتی ہے۔

ڈائرکٹر : (امجد کو غصے سے گھورتا ہے اور امجد خوف کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے) میں اسے نہیں بدل سکتا۔

روحی : آخر آپ کو دوسروں کی مشکلیں بھی تو سمجھنی چاہئیں آخر میں کیسے، اللہ میرے کیسے

بھرے مجمع میں کسی کو ڈارلنگ کہہ سکتی ہوں۔ آپ جانتے ہیں ہم طالبات ہیں کوئی با قاعدہ ایکٹریس تو ہیں نہیں۔

ڈائریکٹر : یہ تو آپ مجھے ایک ہزار دو سو پچاس بار بتا چکی ہیں محترمہ، لیکن اگر میں اسی طرح مکالمے کاٹنے لگا تو مجھے یہ سارا ڈراما کاٹ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دینا ہوگا (زور دے کر) آپ کا سابقہ ذرا مختلف قسم کے ڈائرکٹر سے پڑا ہے اس ڈرامے کا ایک حرف نہیں کٹے گا۔

روحی : ہم ڈرامے میں پارٹ کرنے آئے ہیں بے شرمی ہمارا کام نہیں۔ میں یہ مکالمہ نہیں بولوں گی، نہیں بولوں گی، آپ اسی کو بلا لیجئے جو بے شرمی سے یہ بات کہہ سکے۔

ڈائرکٹر : تم تو خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہو روحی (مصالحانہ انداز میں) اس میں آخر بگڑنے کی کیا بات ہے؟

روحی : (رونی آواز میں) ہم سے نہیں بولا جائے گا یہ مکالمہ، ہم سے یہ پارٹ نہیں ہوگا۔

ڈائرکٹر : (ہنستے ہوئے جیسے روحی کو بہلا رہے ہوں) لڑکیاں بڑی جذباتی ہوتی ہیں۔ لو دیکھو میں بولتا ہوں یہ مکالمہ۔ (عورت کی آواز بناتا ہے) ''ڈارلنگ چیرمین ڈارلنگ۔ کیا انسپکٹر جنرل کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔'' (سب اداکار ہنسنے لگتے ہیں۔)

ڈائرکٹر : (خفا ہو کر) ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟

امجد : آپ عورت کی آواز میں بول رہے تھے نا (بمشکل ہنسی روکتے ہوئے)

ڈائرکٹر : جی، بول رہا تھا پھر ــــ؟ تم لوگ ڈرامے کو بہروپ سمجھتے ہو نا! (بیچ اسٹیج پر آکر تقریر کے انداز میں) یہ نہیں سمجھتے کہ یہ وہ مقدس فن ہے جس کے بغیر انسانی تہذیب ناتمام ہے جس کے بغیر انسان کائنات کو پھر سے تخلیق کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جس کے بغیر انسان ادھورا ہے اس کی شخصیت ادھوری ہے۔ اس کے جذبات کی ترتیب ناتمام ہے (یکا یک مس روحی کی طرف پلٹتا ہے جو اب اس کے دائیں طرف ہے) اور اس پر ایک آپ ہیں کہ انھیں اسٹیج پر 'ڈارلنگ' کہنے سے انکار ہے اور (امجد کی طرف مڑ کر) ایک وہ ہیں کہ کسی نے عورت کی آواز بنائی تو انھیں ہی ہی ہی ہنسی

چھوٹتی ہے (امجد شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور بمشکل ہنسی روکتا ہے)

روحی : اگر میں ڈارلنگ کی جگہ ڈیئر کہہ دوں تو کیا ہرج ہے۔

ڈائرکٹر : ہرج ہی کیا ہوتا ہے، آپ اس کی جگہ قبلہ و کعبہ کیوں نہ کہہ دیں، میں کہہ چکا ہوں۔ ایک حرف تبدیل نہیں ہوگا۔ آپ اتنے سوچ لیجئے اتنے ہم سڑے گلے آلو اور تمبا کو بیڑی کے ڈھیر والا سین کرتے ہیں۔

امجد : یہ بالکل ٹھیک ہے۔

ڈائرکٹر : تو سب لوگ تیار ہیں نا۔ جج صاحب، چیئرمین، ڈائرکٹر ہسپتال، سپرنٹنڈنٹ تعلیمات اور پوسٹ ماسٹر۔

امجد : جی سب تیار ہیں مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا—(جھمن لال گرین روم سے آتا ہے واسکٹ پہنے ہوئے ہے)

ڈائرکٹر : (بات کاٹ کر کیونکہ اس درمیان میں اس کی نظر جھمن لال پر پڑتی ہے) اے جھمن لال، جھمن لال، تم پھر واسکٹ پہنے چلے آرہے ہو، ہزار بار کہا ہے کہ یہ فل ڈریس ریہرسل ہے فل ڈریس۔ تمہاری گاؤن کہاں ہے؟

جھمن لال : (گھبرا کر) وہ بات یہ ہوئی ڈائرکٹر صاحب کہ میک اپ مین کوئی لوشن چھان رہا ہے۔

ڈائرکٹر : لوشن چھان رہا ہے؟ گاؤن لوشن چھاننے کے لیے ہے (پلٹ کر میک اپ کی میز کی طرف دیکھتا ہے وہاں میک اپ کرنے والے کا پتہ نہیں)

جھمن لال : جی۔ لوشن چھاننے کے لئے تو نہیں ہے۔ میں نے اسے بہتیرا سمجھایا مگر وہ مانا ہی نہیں۔ میں نے سوچا یوں ہی سہی ریہرسل تو شروع ہو جائے۔

ڈائرکٹر : (نقل اتارتے ہوئے) ریہرسل ہو جائے۔ چلو ریہرسل شروع کرو۔ چیرمین کے گھر پر تم سب لوگوں کو جو قصبے کے ذمہ دار افسران کی حیثیت رکھتے ہو۔ طلب کیا گیا ہے۔ چیئرمین گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ ایک..... دو..... تھری..... لائٹ۔ موسیقی۔ میوزک۔

[ایک بار پھر فلڈ لائٹ وغیرہ جلتی ہیں اور موسیقی کی تیز دھن بجنے لگتی ہے تھوڑی دیر

کے بعد موسیقی مدھم ہو جاتی ہے روشنی اس وقت تک موجود رہتی ہے جب تک ''انسپکٹر جنرل'' کے سین کی ریہرسل میں کوئی تازہ خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس وقت روشنی بند ہو جاتی ہے اور طرف اسٹیج کی اوپری بتیاں جلتی رہتی ہیں۔

جھمن لال، رمیش اور چند دوسرے اداکار جو اس وقت علی الترتیب جج، سپرنٹنڈنٹ تعلیمات اور ڈائرکٹر ہسپتال کا پارٹ ادا کر رہے ہیں، صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں اور امجد تھوڑی دور ہٹ کر بائیں طرف صوفے کی طرف بڑھتا ہے۔ (نوین وغیرہ صوفے کے پیچھے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب کرچ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں)

امجد : (چیرمین.... داخل ہوتے ہوئے) ''دوستو غضب ہو گیا۔ قصبے پر بہت بڑی آفت آنے والی ہے۔''

سب : ''کیا ہوا چیئرمین صاحب۔''

امجد : ''راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل قصبے میں تحقیقات کے لئے آرہا ہے'' شاید۔

ڈائرکٹر : (غصے میں) پھر وہی شاید؟ ''شاید'' سے کیا مطلب ''ہر چیز ڈیفنٹ ہے'' ''راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل قصبے میں تحقیقات کے لئے آرہا ہے'' آرہا ہے۔ بس۔ فقط آرہا ہے سمجھے آرہا ہے آگے کچھ نہیں۔ پھر سے مکالمہ بولو۔

امجد : راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل قصبے میں تحقیقات کے لئے آرہا ہے۔ بس فقط آرہا ہے آگے کچھ نہیں۔

ڈائرکٹر : اوہ ہو۔ کیا بکواس ہے امجد۔ ''راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل تحقیقات کے لئے آرہا ہے۔'' فل اسٹاپ۔

امجد : ''راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل قصبے میں تحقیقات کے لئے آرہا ہے فل اسٹاپ''۔

ڈائرکٹر : فل اسٹاپ نہیں۔ میرے ساتھ کہو ''راجدھانی سے ایک انسپکٹر جنرل قصبے میں تحقیقات کے لئے آرہا ہے۔''

(امجد دہراتا ہے)

جھمن لال: (جج— ڈر اور حیرت سے) انسپکٹر جنرل۔

امجد : جی ہاں۔ جج صاحب، انسپکٹر جنرل، میں نے اپنے محکمے میں تو کچھ احتیاطی تدابیر کر لی ہیں شاید۔ آپ بھی اپنی عدالت کے کمروں کی طرف دھیان دیں ش۔۔ (ڈائرکٹر کی طرف دیکھتا ہے اور 'شاید' کو ناتمام چھوڑ دیتا ہے) بغل کے کمروں سے عدالت کے بچے ہٹوا دیجئے۔

ڈائرکٹر : (چیخ کر) امجد! امجد!! کیا بک رہے ہو؟ بغل کے کمروں سے عدالت کے بچے۔ (سب لوگ ہنسنے لگتے ہیں ڈائرکٹر قہقہوں کے طوفان میں تھوڑی دیر پریشان کھڑا تکتا رہتا ہے)

ڈائرکٹر : کیا ہی ہی لگائی ہے اسی طرح ہنستے رہے تو ڈرامے کا ستیاناس ہو جائے گا۔ تم سے دو منٹ ہنسی نہیں روکی جاتی۔

نوین : (بے اختیار ہنستے ہوئے) ڈائرے.... قہقہہ..... کٹر.... سا.... ب (سب لوگ پھر ہنسنے لگتے ہیں)

ڈائرکٹر : افوہ، کیا مصیبت ہے، کیا ہوا ہے تم لوگوں کو (خود بھی ہنسنے لگتا ہے) اچھا بس۔ اب خاموش ہو جاؤ بالکل خاموش... لیجئے اب یہ سین پورا کرنا مشکل ہے۔ مس روحی۔ آپ نے اپنے پارٹ کے بارے میں سوچ لیا۔

روحی : میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں میں ہرگز کوئی خلاف تہذیب لفظ نہیں بولوں گی یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جو میں نجی زندگی میں نہ بولتی ہوں۔ میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔

ڈائرکٹر : ماشاءاللہ۔ ٹھیک ہے۔ نوین!

نوین : جی۔

ڈائرکٹر : تو پھر وہ جو خوبصورت سی لڑکی ہے نا تمہارے کلاس میں۔ اس سے کہہ دینا کل سے وہ پارٹ کی ریہرسل شروع کر دے۔

نوین : وہی مس جوزف!

ڈائرکٹر : مجھے نام وام یاد نہیں۔ وہی جس کی آواز سریلی سی ہے۔

روحی : (غصے میں) آپ پارٹ جسے چاہئے دے دیجئے میری بلا سے مگر مس جوزف کے بارے میں آپ کی رائے بالکل غلط ہے۔

ڈائرکٹر : یعنی—؟

روحی : وہ بہت ذہین ہوں تو ہوں! خوبصورت کہنا خوبصورتی کی توہین ہے اور آواز— کل ہی ان کے بارے میں میوزک ماسٹر کہہ رہے تھے کہ کوّے کی آواز بھی ان سے زیادہ سریلی ہے۔

ڈائرکٹر : افسوس ہے کوّے ہمارے ڈرامے میں پارٹ نہیں کر سکتے!

روحی : وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی آپ مجھے پارٹ دینا ہی نہیں چاہتے۔ اسی لئے تو ہزاروں بہانے ڈھونڈھتے ہیں (روتی آواز میں) آپ نے پہلے ہی مس جوزف کو بلا لیا ہوتا۔ مجھ سے مذاق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

ڈائرکٹر : مذاق؟ کیسا مذاق؟ آپ مذاق کر رہی ہیں۔ میں ڈارلنگ نہیں کہوں گی، میں یہ لفظ نہ بولوں گی، میں 'اب برائے زندگی' کی قائل ہوں۔

روحی : میں وہ لفظ بول بھی دیتی تو بھی آپ مجھے پارٹ نہ دیتے۔ مجھے سب معلوم ہے۔

ڈائرکٹر : آپ اچھا خاصہ پارٹ کر رہی ہیں لیکن یہ مکالموں پر بار بار جھگڑنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔

روحی : اچھا تو میں وہ لفظ کہے دیتی ہوں تو آپ مجھے پارٹ دے دیں گے؟ ہرگز نہیں دیں گے۔

ڈائرکٹر : اسٹامپ لکھا لیجئے۔ پارٹ دوں گا ضرور دوں گا۔ چلئے اب تو خوش لیکن آپ کو ڈارلنگ کہنا پڑے گا۔

روحی : (ہنستے ہوئے) آپ تو ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔

ڈائرکٹر : میوزک، موسیقی—!! لائٹ— ہم ریہرسل شروع کر رہے ہیں۔

[پھر فلڈ لائٹ جلتی ہیں اور موسیقی شروع ہوتی ہے تھوڑی دیر بعد بند ہو جاتی ہے]

روحی : لیکن ڈائرکٹر صاحب!

ڈائرکٹر : اب کیا بات ہے؟

روحی : (شرما کر) میں ڈارلنگ کہہ تو دوں گی مگر ذرا آہستہ سے کہوں گی۔ دوسرے جولڑکا چیئرمین بنا ہوا ہے وہ اس وقت میری طرف نہ دیکھے اور تیسرے یہ کہ اسٹیج پر جو لوگ

اس وقت ہوں وہ اپنی نظریں ذرا نیچی کرلیں۔

ڈائرکٹر : بکواس۔ سراسر بکواس۔ موسیقی بند کرو (موسیقی بند ہوجاتی ہے) میں کوئی شرط ورط نہیں سنوں گا۔

روحی : آپ کو میری شرطیں تو سننی ہی پڑیں گی ورنہ—

ڈائرکٹر : (بات کاٹ کر غصے میں) ورنہ کیا؟ ورنہ کیا کریں گی آپ؟

روحی : "ورنہ— (پھر کچھ سوچ کر) ورنہ پھر میں بغیر شرطوں ہی کے پارٹ کرلوں گی۔"

ڈائرکٹر : اچھا تو ریڈی۔ سب تیار ہیں۔ ون— ٹو—

امجد : ایک منٹ، ڈائرکٹر صاحب۔

ڈائرکٹر : اوہ ہو۔ کیا بات ہے امجد۔ تم ہمیشہ مجھے عین وقت پر ٹوکا کرتے ہو۔ کیا ہوا۔

امجد : دو صاحبان آپ سے ملنے آئے ہیں شاید۔

ڈائرکٹر : کون صاحبان ہیں۔ میں کسی صاحبان سے نہیں ملوں گا۔ کہہ دو اس وقت فرصت نہیں ہے۔

امجد : وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے والد کے ملنے والوں میں سے ہیں شاید۔

ڈائرکٹر : کیا چاہتے ہیں اس وقت؟

امجد : آپ سے ملنا چاہتے ہیں شاید۔

ڈائرکٹر : اوہ ہو۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر یہ پوچھو کہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ کام کیا ہے؟

امجد : جی ہاں۔ میں نے پوچھا تھا مگر وہ کوئی فارسی کا شعر پڑھنے لگے۔

ڈائرکٹر : فارسی کا شعر۔

امجد : جی ہاں فارسی کا تھا شاید۔ مجھے تو یاد نہیں رہا۔ مجھے تو لے دے کر فارسی کا ایک ہی شعر یاد ہوا ہے۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام

زیرِ قدمت ہزار جاں است شاید

ڈائرکٹر : پھر وہی 'شاید' امجد یہ تکیہ کلام چھوڑو۔ ہر بات میں شاید۔ اچھا ان سے کہہ دو کہ میں

اس وقت نہیں مل سکتا۔

امجد : لیجئے وہ خود ہی آ گئے۔

[اسٹیج کے بائیں دروازے سے مرزا الٰہی بخش اپنے صاحبزادے کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش کی داڑھی سفید اور سرخ ہے یعنی کچھ حصہ مہندی سے سرخ ہو گیا ہے سر پر دو پلی ٹوپی، بھڑک دار شیروانی کی جیبیں بوجھ سے لٹکی ہوئی ہیں، چست ساٹن یا مشروع کا پاجامہ اور سنہرے فریم کا چشمہ آنکھوں پر لگا ہوا ہے، پان بری طرح کھائے ہوئے ہیں، چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتے ہیں رنگ گورا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں ہیرو رہے ہوں گے ہاتھ میں چھڑی ہے جسے ہلاتے رہتے ہیں پاؤں میں کامدار سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے ہیں۔

نوجوان کالج کا طالب علم معلوم ہوتا ہے نہایت شوخ رنگ بش شرٹ پہنے ہوئے ہے جس پر مختلف فلم اسٹاروں کی تصویریں چھپی ہوئی ہیں، گلے میں سرخ رومال، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پر لپ اسٹک، بالوں کی ایک لٹ بڑی ریاضت کے بعد وسط پیشانی پر چپکائی گئی ہے۔]

مرزا : آداب عرض، کہو میاں للّن کیسے ہو؟!

رفیق : السلام علیکم۔

ڈائرکٹر : آداب عرض ہے۔ تشریف رکھئے۔

مرزا : (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) تم نے غالباً پہچانا نہیں مجھے۔ بھئی مجھے تو تمہارا بچپن کا نام للّن ہی یاد ہے اب تک سب پیار سے للّن للّن کہا کرتے تھے۔ تم اتنے سے تھے (دونوں ہاتھوں سے بتاتے ہیں) جب میری انگلی پکڑ کر بازار جایا کرتے تھے (ہنس کر) بڑے ہی شریر تھے اس وقت مگر میں نے تمہارے والد سے اللہ انھیں جنت نصیب کرے، اسی وقت کہہ دیا تھا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ ڈرامے اور اداکاری میں تو اس کا جواب نہ ہوگا۔ نام روشن کرے گا۔

ڈائرکٹر : (بات کاٹ کر) معاف کیجئے گا میں ذرا ریہرسل سے فارغ ہولوں۔

مرزا : ہاں ہاں ضرور میاں صاحبزادے۔ شوق سے بچپن ہی سے تمہیں اس کا شوق ہے ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ میرے ساتھ بازار گئے تھے وہاں کسی گنے والے کو آواز لگاتے دیکھ لیا ہوگا واپس گھر پہنچتے ہی ویسے ہی کان پر ہاتھ رکھ کر اور پھینٹا سر سے لپیٹ کر اس اتار چڑھاؤ سے آواز لگائی کہ بس کیا بتاؤں۔ محلے کی عورتیں گنے والے کو آواز دینے کے لیے دروازوں پر نکل آئیں (ہنستا ہے اور اطمینان سے ادھر ادھر دیکھتا ہے)۔

ڈائرکٹر : اگر آپ اجازت دیں تو——

مرزا : ہاں ہاں۔ ضرور شروع کرو مگر ایک بات ہے۔ میں اس وقت تمھیں ہرگز تکلیف نہ دیتا مگر یہ نالائق میرا بیٹا ہے محمد رفیق——

رفیق : جی نہیں رفیق تازی۔

مرزا : چپ بے۔ کیا تازی باسی لگا رکھی ہے۔ ہاں تو اس کا نام ہے محمد رفیق۔ رفّن رفّن کہتے ہیں۔ تو بھئی لکھنے پڑھنے میں تو بس خدا ہی حافظ ہے۔ اس نامعقول کو کچھ ڈرامے ورامے کا شوق ہو گیا ہے۔ یہ سر ہو گیا اس نے تمہارا نام لیا کہ ان سے کہہ دو تو مجھے پارٹ مل جائے گا۔ وہ نام تو میں سمجھا وجھا نہیں۔ مجھے تو تمہارا گھر کا نام للن ہی یاد ہے۔

ڈائرکٹر : جی، گھر پر بھی میرا نام للن تو کبھی نہیں تھا۔

مرزا : اب تمہیں کیا یاد ہوگا، تم اتنے سے تھے (دونوں ہاتھوں کے درمیان فاصلے کر کے بتاتے ہیں) دراصل اس کا بھی بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ اس زمانے میں مجھے یادش بخیر شاعری واعری کا شوق تھا۔ خاص طور پر قصیدے لکھا کرتا تھا۔ تمہارے والد کو ایک روز نیا قصیدہ سنانے گیا۔ وہ کسی سوچ میں بیٹھے تھے میں نے پوچھا تو بولے لڑکے کا کیا نام رکھوں؟ یہی سوچ رہا ہوں۔ میں نے کہا قصیدہ سن لیجئے۔ اسی میں سے کوئی مناسب نام تلاش کر لیجئے گا۔ وہی جو داغ کا مشہور قصیدہ ہے نا....

(گا کر)

میں ہوا بادیہ پیما طرف ملک دکن
سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گرد دامن

بس اسی زمین میں اسی قافیے کے ساتھ لکھا تھا۔

ڈائرکٹر : میں ذرا ریہرسل سے فرصت پالوں۔

مرزا : ہاں ہاں ضرور، تو بھئی تمہارے والد نے کہا کہ مرزا الٰہی بخش سارے قافیے تو بندھ گئے مگر تمہارا تخلص نہیں آیا، اسی قافیے پر اپنا تخلص للن رکھ لو۔ میں نے کہا آپ اپنے برخوردار کا نام رکھ لیجئے۔ تو بھئی اس طرح تمہارا نام للن پڑ گیا۔

ڈائرکٹر : (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر مرزا صاحب ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتے ہیں)۔

مرزا : (بیان جاری ہے) ہاں تو بھئی اصل بات تو رہ ہی گئی میں نے اس نالائق سے وعدہ کر لیا ہے کہ تجھے ہیرو کا پارٹ دلوا دوں گا تمہارے والد سے تو میری ایسی گاڑھی چھنتی تھی کہ وہ ہوتے تو بخدا ڈرامے کو ہاتھ نہ لگاتے مجھ سے کہتے دیکھو مرزا الٰہی بخش اب تم جانو تمہارا کام۔ ڈراما مجھے فلاں تاریخ کو تیار مل جائے (روتے ہوئے) ہائے ہائے، کیا خوب آدمی تھے۔ سچ ہے رہے نام اللہ کا۔

ڈائرکٹر : محترم مرزا صاحب۔ صرف ایک سین کی ریہرسل کرنی ہے اس کے بعد میاں رفیق کا ٹیسٹ لئے لیتا ہوں۔

رفیق : (چونک کر) ٹیسٹ!!؟

مرزا : ٹیسٹ؟ میاں صاحبزادے رفیق کوئی اینلا اناڑی نہیں جو اس کا ٹیسٹ ہو۔ آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔ اب لہو ولعب سے میرا جی بھر گیا ورنہ ایک زمانہ تھا حضت کہ اسی شہر میں وہ ناٹک کھیل کر دکھایا تھا کہ آغا حشر مرحوم دانتوں تلے انگلی داب کر رہ گئے تھے۔ وہ مجنوں کا پارٹ کر کے دکھایا تھا کہ ماسٹر نثار پانی بھریں (کھڑے ہو کر پورے بھاؤ اور نرتیہ کے ساتھ بتاتے ہیں۔) لیلیٰ لیلیٰ!! (گا کر)

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی مورے من میں

رفیق!

رفیق : جی ابا جان۔

مرزا : چل بیٹا۔ کھڑا ہو جا۔ تو بھی سنا دے۔ دیکھئے ڈائرکٹر صاحب۔

رفیق : آغا حشر مرحوم کا ڈراما ہے ''اسیر حرص'' (جیسے ڈائرکٹر کی معلومات میں عظیم اضافہ کر رہے ہوں) چنگیز خاں کے سامنے اسی کا چچازاد بھائی ناصر پابہ زنجیر کھڑا ہے۔ چنگیز خاں اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے (نہایت میلوڈرامائی انداز سے قہقہہ لگا کر) ''کہئے اے شہباز زمانہ، آپ نے اس ناچیز خادم کو پہچانا'' (ناصر کا مکالمہ بولنے کے لئے چھلانگ مار کر اسٹیج کے دوسری طرف آ جاتا ہے اور آواز بدل کر کہتا ہے) ''پہچانا۔ پہچانا شیطان کو کون نہیں جانتا بلکہ ہر شخص پہچانتا ہے۔

شکل و صورت دیکھ لی کبر و رعونت دیکھ لی

نام پہلے ہی سنا تھا آج صورت دیکھ لی''

(دوبارہ چھلانگ لگا کر چنگیز خاں کی جگہ پر آ جاتا ہے اور آواز ذرا بھاری بنا لیتا ہے) مغرور تو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے پھر بھی یوں اکڑا ہوا ہے۔

سر سے غرور مسند مخمل نہیں گیا

رسی تمام جل گئی پر بل نہیں گیا

(پھر چھلانگ لگا کر ناصر کی جگہ آتا ہے اور اسی آواز میں کہتا ہے) ہمت والے مصیبت سے کب ڈرتے ہیں۔ تارے اکثر دن کے عوض رات کو نکلتے ہیں۔

بھری برسات میں جن ندی نالوں میں روانی ہے

انھیں گرمی میں دیکھو تو نہ موجیں ہیں نہ پانی ہے

مگر دریا کو اس تابش کا ہرگز غم نہیں ہوتا

لگا دو آگ بھی اس میں تو پانی کم نہیں ہوتا

عطر کی مٹی میں بھی مل کر مہک جاتی نہیں

توڑ بھی ڈالو تو ہیرے کی چمک جاتی نہیں

سختیاں ہوں لاکھ پر جوہر نہ جائیں گے کبھی

شیر کی کچھ قید میں شیرانہ خو جاتی نہیں

[یہ تمام اشعار پورے بھاؤ اور ترتیہ کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں جن سے قدیم اداکاری کی پیروڈی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس اثناء میں تمام اداکار توجہ اور انتہائی حقارت سے ان مکالموں کو سن رہے ہیں کچھ ہنس رہے ہیں کچھ ہنسی ضبط کر رہے ہیں۔ مرزا الٰہی بخش مست ہو ہو کر جھوم رہے ہیں اور بات بات پر ڈائرکٹر کو مخاطب کر رہے ہیں اور ڈائرکٹر قہر درویش بر جان درویش کی تصویر بنا ہوا ہے۔]

ڈائرکٹر : بہت خوب بہت خوب۔ اب آپ تھوڑی دیر کے لئے مجھے ریہرسل کی اجازت دیں۔

مرزا : شوق سے، آپ ریہرسل فرمائیں۔ رفیق!

رفیق : (جو ابھی بیٹھ کر اپنا لپ اسٹک اور بال درست کرنے لگا ہے) جی۔ ابا جان!

مرزا : جا کھڑا ہو جا۔ ریہرسل شروع ہو رہی ہے۔

رفیق : بہت اچھا (کھڑا ہو جاتا ہے)

ڈائرکٹر : ایں یعنی یہ کیا؟ رفیق صاحب آپ تشریف رکھئے۔

مرزا : بھئی للن میاں۔ میں نے کہا اسے ہیرو کا پارٹ تو دینا ہی ہے تو اسے ایک ریہرسل ہی کیوں نہ کرا دی جائے؟ کیا برائی ہے؟

ڈائرکٹر : میری رائے مانئے تو ابھی انھیں ایک ریہرسل دیکھنے دیجئے۔ دوسری ریہرسل میں انشاءاللہ۔

مرزا : (بات کاٹ کر) انشاءاللہ العزیز!

ڈائرکٹر : اچھا تو ریہرسل شروع ہوتی ہے۔ مرزا صاحب آپ صوفے پر سے ادھر کرسی پر تشریف لے آیئے۔

[مرزا صاحب اور رفیق دونوں دائیں طرف کی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں مرزا صاحب دونوں پاؤں اٹھا کر کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں]

ڈائرکٹر : دو سین کی ریہرسل ہوگی۔ پہلا سین وہ ہے جب بیگم انسپکٹر جنرل کے بارے میں پوچھتی ہے ریڈی — ون — ٹو — تھری!

[موسیقی اور روشنیاں پھر اسٹیج کو جگمگانے لگتی ہیں۔]

جھمن لال: اچھا آپ جائیے میں سب کچھ کہہ دوں گا۔

روحی : ''ڈارلنگ۔ چیرمین ڈارلنگ۔ انسپکٹر جنرل کے بارے میں کچھ پتہ چلا۔''

امجد : ہاں ڈارلنگ۔ وہیں جارہا ہوں۔ مریم بیٹی دعا کرو شاید (مریم غائب ہے)

ڈائرکٹر : ہیروئن! ہیروئن!! ابھی تک ہیروئن کا پتہ نہیں۔ جھمن لال تم ہیروئن کا پارٹ پڑھ دو۔

جھمن لال: میں؟!

ڈائرکٹر : ہاں تم پڑھو۔

جھمن لال: بہت اچھا۔ ہاں تو پچھلا مکالمہ بولو۔

امجد : ''ہاں ڈارلنگ، وہیں جارہا ہوں۔ مریم بیٹی دعا کرو۔ شاید''

جھمن لال: (عورت کی آواز میں) ''تو ڈیڈی۔ کیا آپ وہیں جارہے ہیں۔''

ڈائرکٹر : اوہو۔ جھمن لال۔ تم کو عورت کی آواز بنانا نہیں آتی۔ ذرا باریک آواز نکالو۔ اور باریک اور باریک ذرا اور باریک (جھمن لال پھر اسی آواز میں بولتا ہے)

ڈائرکٹر : ذرا اور باریک!

جھمن لال: (جھنجھلا کر) یہ پارٹ مجھے نہیں کرنا ہے ہیروئن کو کرنا ہے۔

ڈائرکٹر : ٹھیک ہے مگر عورت کی آواز بنانے کی پریکٹس تو ہونی ہی چاہیے۔

جھمن لال: ذرا آپ ہی بتائیے۔

ڈائرکٹر : لو میں بولتا ہوں (مکالمے کو نسوانی آواز میں دہراتا ہے)
(جھمن لال دہراتا ہے)

روحی : کیسا ہے وہ۔ خوبصورت نوجوان ہے نا۔ اس کی موچھیں بھی ہیں یا نہیں؟

امجد : فضول کی باتیں مت کرو۔ وہیں جارہا ہوں شاید۔ خدا حافظ۔

[موسیقی جو اس اثنا میں ہلکے سروں میں جاری تھی بند ہو جاتی ہے]

ڈائرکٹر : اچھا اب دوسرے سین کی ریہرسل کے آخری حصے کی ریہرسل بھی ہو جائے۔ انسپکٹر

جنرل مریم سے اظہار محبت کر رہا ہے۔ عین اس وقت مریم کی ماں کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ جھمن لال۔ تم مریم کی جگہ پر کھڑے ہو جاؤ، نوین، اظہار محبت کرو۔۔ موسیقی۔

[موسیقی ہلکے سروں میں شروع ہوتی ہے نوین جھمن لال کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا معافی مانگ رہا ہے]

روحی : مریم بیٹی۔ مریم۔ ارے یہ کیا۔ یور ایکسی لینسی۔ آپ اس چھوکری کے آگے کیوں جھکے ہوئے ہیں۔ جاؤ۔ مریم۔ بدتمیز کہیں کی۔ جاؤ۔ (جھمن لال خفا ہو کر چلا جاتا ہے)

نوین : نہیں محترمہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ کو میں دل و جان سے چاہتا ہوں۔

روحی : مگر.... مگر.... یور ایکسی لینسی۔ میری تو شادی ہو چکی ہے۔

نوین : کوئی بات نہیں۔ قانون کچھ بھی کہے ہم اس زمین و آسمان سے دور چلے جائیں گے۔ ہم کہیں اور اپنی دنیا بسائیں گے۔

[مرزا صاحب بے حد زور سے قہقہہ لگاتے ہیں اور برابر ہنستے رہے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پر دورہ پڑ گیا ہے۔ سارے اداکاران کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔]

ڈائرکٹر : کیا ہوا؟! مرزا صاحب، کیا بات ہے؟

مرزا : اوف فو.... ہی ہی.... ہو ہو.... ہاہا.... ہی ہی۔

ڈائرکٹر : مرزا صاحب۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ امجد۔ ذرا پانی لاؤ۔ نوین تم ذرا ہوا کرو۔

[امجد پانی لاتا ہے مگر مرزا صاحب ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹا دیتے ہیں اور بدستور ہنستے رہتے ہیں۔]

مرزا : یہ آپ کا ڈراما... میاں صاحبزادے.... یہ تو مذاق ہے مذاق... اول تو یہ کیا لچر ڈراما کھیل رہے ہو۔ نہ کوئی گرما گرم گانا نہ کوئی کامک پارٹ۔ کون دیکھے گا اسے؟

ڈائرکٹر : یہ مشہور روسی مصنف گوگول کا ڈراما ہے۔

مرزا : روسی مصنف کا ہے تو خیر ضرور اچھا ہوگا مگر یہ کیا پارٹ ادا کئے جا رہے ہیں۔ بھلا ہیرو کی کوئی آواز ہے جیسے ابھی پیدا ہوا ہے۔ رفیق!!

رفیق : جی، ابا جان۔

مرزا : ذرا اس مکالمے کو بولنا۔ یہ دیکھئے ڈائرکٹر صاحب۔

[رفیق مکالمے کا پرچہ نوین سے لیتا ہے جو طوعاً و کرہاً پرچہ دیتا ہے رفیق بڑی گھن گرج کے ساتھ بھاؤ بتا کر بولتا ہے]

رفیق : ''کوئی بات نہیں — قانون کچھ بھی کہے۔ ہم اس زمین و آسمان سے دور چلے جائیں گے۔ ہم کہیں اور اپنی دنیا بسائیں گے۔''

ڈائرکٹر : خدا کے لئے بند کرو۔ میرے کان کا پردہ پھٹ جائے گا۔

مرزا : اب ہوئی بات۔ اسٹیج پر آنا ہے تو کان میں نئے پردے لگوا لیجئے۔ رفیق!

رفیق : جی ابا جان۔

مرزا : پہلا مکالمہ بھی بولو۔

ڈائرکٹر : جی نہیں میرزا صاحب۔ بہت ہو چکا رفیق آپ ہی کو مبارک ہو۔

مرزا : رفیق۔ کس خوش قسمت ڈرامے کو نصیب ہوتا ہے میاں للن۔ میں نے تو کہا کہ چلو تمہارا ڈراما بھی چمک جائے تو اچھا ہے۔

ڈائرکٹر : ایسا ہی شوق ہے آپ لوگوں کو تو ایک ناٹک کمپنی کھول لیجئے۔ میاں رفیق لیلیٰ کا پارٹ کریں اور آپ مجنوں کا۔

مرزا : میں بھی کوئی ایسا ویسا جواب دیتا مگر کیا کروں پرانے تعلقات جو تمہارے والد سے تھے، آڑے آتے ہیں (نہایت رازدارانہ لہجے میں) لو پان کھاؤ۔ (جیب سے ڈبیا نکالتے ہیں)

ڈائرکٹر : جی نہیں۔ شکریہ۔

مرزا : ارے لو بھی۔ ہاں تو ایک بات ہے میاں للن۔ یہ رفیق بتا رہا تھا کہ تمہیں مکان کی تکلیف ہے اگر نئے مکان کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔ الاٹ منٹ آفیسر میرے پرانے لنگوٹیا یار ہیں چٹکی بجاتے میں کام بن جائے گا۔

ڈائرکٹر : شکریہ اس بارے میں پھر کبھی باتیں ہوں گی۔

مرزا : باتیں واتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب یہ رفیق تو تمہاری ریہرسل میں آیا ہی کرے گا اس کے ہاتھ ایک درخواست لکھ کر مجھے بھجوا دینا۔ میں خود نبٹتا رہوں گا؟

ڈائرکٹر : رفیق ریہرسل میں کیوں آتا رہے گا؟

مرزا : یہی، ہیرو کا پارٹ جو کرنا ہے اسے۔

ڈائرکٹر : جی نہیں، رفیق کوئی پارٹ نہیں کرے گا چاہے آپ مجھے مکان دلوائیں یا نہ دلوائیں۔ کوئی پارٹ نہیں۔ سمجھے مرزا صاحب!

مرزا : (اٹھتے ہوئے) اونہہ، دیکھتا ہوں رفیق کے بغیر آپ کیسے ڈراما کامیاب کر لیتے ہیں۔ ہونہہ چلو میاں رفیق بڑے آئے فرعون بے ساماں کہیں کے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ لہو ولعب کہیں شریفوں کے بچوں کا کام ہے۔

ڈائرکٹر : خدا حافظ مرزا صاحب۔

مرزا : (غصے میں) خدا حافظ (بائیں طرف سے دروازے تک پہنچ کر اپنے ہاتھ کی چھڑی گھماتے ہوئے پھر پلٹتے ہیں لیکن چلتے چلتے ایک بات بتائے دیتا ہوں میاں للن۔ تھیٹر کے لئے پھیپھڑے میں دم ہونا چاہئے برخوددار اور ہاتھ پیر کی لچک۔

ڈائرکٹر : بہت ہو چکا مرزا صاحب، خدا حافظ۔

مرزا : خدا حافظ۔ چلو میاں رفیق (ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں)

رفیق : تو پارٹ نہیں ملے گا۔

مرزا : چل بے۔ لعنت بہ کار شیطان۔ نہ جانے کہاں سے چلے آتے ہیں مردود ڈائرکٹر بن کر۔

ڈائرکٹر : (غصے میں مرزا کی طرف بڑھتا ہے) کیا کہا مردود؟

مرزا : (دروازے سے منہ نکال کر دو قدم آگے بڑھتے ہیں۔) ارے میں نے تو امرود کہا تھا۔ چلو میاں رفیق۔

[دونوں چلے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر اسٹیج پر سناٹا رہتا ہے]

ڈائرکٹر : (سکون کا سانس لے کر سناٹے کو توڑتے ہوئے) بلا ٹلی۔ اچھا اب ریہرسل شروع کرو۔

امجد : مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہیروئن ابھی تک نہیں آئی ہے شاید۔

ڈائرکٹر : پہلی مرتبہ اسے اتنی دیر ہوئی ہے ویسے تو وہ کافی ذمہ دار لڑکی ہے اور وہ مس نورا بھی ابھی تک نہیں آئیں۔ جاؤ ذرا دیکھو تو۔ بس اب دونوں آتی ہی ہوں گی۔

امجد : بہت اچھا۔ (امجد جاتا ہے)

ڈائرکٹر : آپ سب لوگ میک اپ، سامان، لباس وغیرہ ٹھیک ٹھاک کر لیں۔ جھمن لال تم جا کر گاؤن پہن لو۔

امجد : (گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے) ڈائرکٹر صاحب۔ مس نورا آ رہی ہیں۔

ڈائرکٹر : اور ہیروئن!

امجد : جی وہ تو نہیں ہے شاید۔

[مس نورا داخل ہوتی ہیں ہاتھ میں کامدار پرس ہونٹوں پر شوخ لپ اسٹک چہرے پر نہایت احتیاط اور کاریگری سے میک اپ کیا گیا ہے۔ سیاہ اسکرٹ اور ہلکا رنگین بلاؤز، لہجہ نیم دیسی نیم ولائتی ہے۔]

نورا : (غصے میں) آداب عرض۔

ڈائرکٹر : آداب عرض۔ آج آپ اکیلی کیسے۔

نورا : جی ہیروئن نہیں آیا۔ پروین اب آکے ڈرامے میں پارٹ نہیں کرنے سکتا۔

ڈائرکٹر : کیا؟ پارٹ نہیں کر سکتی۔

نورا : جی ہاں۔ اب ہم لوگ اس ڈرامے سے کسی قسم کا تعلق رکھنا نہیں مانگتا۔ بہت غلط بات ہے۔ ہم لوگ ڈراما نہیں کھیلنا مانگتا۔

ڈائرکٹر : مس نورا۔ کیا مذاق ہے۔ بتایئے نا۔ آپ تو پہیلیوں میں باتیں کر رہی ہیں۔

نورا : اوہ مائی گاڈ۔ ہم آپ کو کیسے بتلایئے۔ ہم کو پرنسپل نے بھیجا ہے۔ وہ آپ سے کہنا مانگتی ہے کہ۔

ڈائرکٹر : ہاں کیا کہتی ہیں وہ۔

نورا : کہ ہمارے 'بابا لوگ' ڈرامے میں پارٹ نہیں کرے گا۔

ڈائرکٹر : یہ تو آپ پہلے ہی کہہ چکی ہیں لیکن آخر کیوں؟

نورا : بہت سیریس بات ہوگیا ہے۔ آپ ہم لوگوں کا ذمہ داری نہیں جانتا۔ ہمارے کالج کا کام بڑا ذمہ داری کا کام ہے۔

ڈائرکٹر : سب جانتا ہوں مس نورا۔ سب جانتا ہوں مگر ہیروئن کیوں نہیں آئے گی، یہ بتائیے۔

نورا : ہم یہی بتانے آیا ہے آپ کے ڈرامے میں پارٹ کرنے والے کسی لڑکے نے خط لکھا ہے۔

ڈائرکٹر : (معصومیت سے) خط لکھا ہے؟ تو کیا ہوا؟ خط تو یہ لوگ لکھتے ہی رہتے ہیں۔

نورا : نہیں بابا۔ اب ہم آپ کو کیسے سمجھائے۔ لو لیٹر (Love Letter) لکھا ہے۔ آپ کے ڈرامے میں پارٹ کرنے والے کسی لڑکے نے ہیروئن کو Love Letter لکھا ہے۔

(امجد گھبرا کر بے تحاشا گرین روم کی طرف بھاگتا ہے)

ڈائرکٹر : لو لیٹر Love Letter؟ محبت نامہ؟! اوہ میرے خدا کون تھا وہ؟ کس کے سر پر یہ عشق کا بھوت سوار ہوا۔

نورا : (پرس سے خط نکال کر) یہ ہے لو لیٹر۔ پرنسپل نے آپ کے پڑھنے کے لئے بھیجا ہے۔

ڈائرکٹر : لائیے۔ مجھے دیجئے۔ (خط کھول کر پڑھتا ہے) خوب، بہت خوب، محبت نامے کے نیچے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے (نقل اتارتے ہوئے) ''میں ہوں آپ کا جاں باز امجد'' کہاں ہے امجد، امجد کو بلاؤ۔

نوین : (گرین روم کی طرف سے آتے ہوئے) مگر امجد تو گرین روم میں بے ہوش پڑا ہے۔

ڈائرکٹر : بے ہوش پڑا ہے (مس نورا سے) مجھے شرمندگی ہے مس نورا۔ یہ غیر ذمہ داری کی انتہا ہے۔ یقین مانئے محبت نامہ بھی اس کا اپنا لکھا ہوا نہیں ہے۔ صاف رٹے ہوئے ڈائلاگ ہیں۔

نورا : مگر ہم لوگ کا کام ٹیڑھا ہے آپ جاتے ہیں، ہم ذمہ داری نہیں لینے سکتا۔

ڈائرکٹر : ٹھیک ہے مگر اس وقت ڈرامے کے لئے نئی ہیروئن ڈھونڈنا ناممکن ہے۔

نورا : ہم تو آپ سے پہلے ہی بولا ڈائرکٹر صاحب جب تک لوگوں کو تہذیب نہیں آئے گی ڈراما کیسے ہوگا۔ یہاں اسٹیج کیسے آگے بڑھے گا۔

نورا : نہیں مس نورا۔ جب تک ہم اسٹیج کی روایات قائم نہیں کریں گے۔ ہمیں تہذیب بھی پوری طرح نہیں آئے گی (کچھ سوچ کر) ایک بات یاد آئی مس نورا۔ اگر آپ ہی ہیروئن کا پارٹ ادا کرلیں تو واللہ مزا آجائے۔

نورا : مائی گاڈ۔ میں، یعنی میں؟

ڈائرکٹر : ہاں آپ، آپ کا لہجہ بھی خوب ہے۔ آواز بھی ٹھیک ہے۔ دیکھئے اب تکلف نہ کیجئے۔ ریہرسل شروع کرتے ہیں۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔

[ابھی مس نورا پس وپیش میں کھڑی تھیں کہ پردہ یکا یک گر جاتا ہے]

ڈائرکٹر : ارے پردہ..... پردہ.... یہ پردہ کس نے گرادیا؟!

[ڈراپ]

☆☆☆

محل سرا

کردار:

نواب صاحب : کسی زمانے میں بڑے جاگیردار تھے۔ عمر تقریباً 68 سال چہرے سے وجاہت ٹپکتی ہے۔ رنگ گورا اور نقشہ تیکھا۔ اس عمر میں پوری بتیسی موجود ہے اور تندرسی اچھی ہے۔

منظور : نواب صاحب کا بڑا لڑکا جو جائیداد کا سارا کاروبار سنبھالتا ہے۔ جاگیرداری ختم ہو جانے کے بعد فارم وغیرہ کی نگرانی کرتا ہے اور مکانات اور شہری جائیداد کا کرایہ وصول کرتا ہے۔ عمر تقریباً 40 سال۔ شکل وصورت سے رعب داب ٹپکتا ہے۔ عام طور پر مغربی لباس کا دلدادہ ہے۔

شاہانہ : نواب صاحب کی بڑی بیگم۔ منظور کی ماں۔ بوڑھی ستر سالہ عورت ہے۔ سب بال سفید ہیں، منہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے۔ چھوٹا قد ہے۔ تندرستی بہت خراب ہے۔ پتلا دبلا جسم ہے، جب بیٹھتی ہے تو بالکل گٹھری سی لگتی ہے۔ لباس میلا ہی پہنے رہتی ہے۔ چہرے پر مظلومیت کا بڑا گہرا تاثر چھایا رہتا ہے۔

ریحانہ : منظور کی بہن عمر 30 سے 35 سال کے درمیان۔ قبول صورت لڑکی ہے۔ لباس میلا اور بے ترتیب سا ہوتا ہے۔ قد نکلتا ہوا۔

سلیم : شاہانہ بیگم کا بھانجا جو مصور ہے اور ان دنوں مہمان آیا ہوا ہے۔ عمر تقریباً 30 سال۔ خاصہ وجیہہ نوجوان ہے جسم گٹھا ہوا اور ناک نقشہ تیکھا ہے۔ اس کی

آنکھوں میں ایک خواب آگیں کیفیت ہر وقت چھائی رہتی ہے۔

خادم : ایک بوڑھا مگر تنومند نوکر جو اس گھرانے کا وفادار اور قدیمی خدمت گار ہے اور جس سے گھر بھر میں کوئی پردہ نہیں کرتا۔

زمانہ : موجودہ۔

مقام : یو۔پی کا کوئی شہر۔

پہلا سین

[پرانے زمانے کے ایک مکان کا وسیع صحن جس کے ایک طرف دالان کے در دکھائی دے رہے ہیں اور دوسری طرف باورچی خانہ ہے۔ باورچی خانے کے کواڑ بند ہیں۔ اور دالان کے باہر چوکی پر جانماز بچھی ہوئی ہے ایک دو پلنگ صحن میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان پر میلی چادریں بچھی ہوئی ہیں ایک پلنگ پر شاہانہ بیگم بیٹھی چھالیاں کتر رہی ہیں۔ اونچی پیشانی اور کھلی رنگت سے ظاہر ہوتا ہے کبھی خوبصورت رہی ہوں گی]

شاہانہ بیگم : ریحانہ.... ریحانہ (پھر چھالیاں کترنے لگتی ہیں) ریحانہ... کہاں ہے بیٹی؟

ریحانہ : (دور سے آواز آتی ہے) آئی امی جان۔ آئی۔

بیگم : اری بیٹی۔ منظور آتا ہوگا اور چائے ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔

(ریحانہ دالان کی طرف سے صحن میں داخل ہوتی ہے میلے کپڑے، بے دھلا سر۔ کچھ لٹیں باہر نکلی ہوئی دو پٹہ آدھے سر کو ڈھکے ہوئے ہے، ہاتھ میں صرف دو چوڑیاں پڑی ہیں، عمر ڈھلنے لگی ہے اور چال میں وہ ٹھسک پیدا ہوگئی ہے جو جوانی کے آخری دنوں کی نشانی ہے)

ریحانہ : امی۔ آج میری آنکھوں میں درد ہے، دھوپ بھی تو نہیں اتری۔

بیگم : (دلار سے) میری اچھی بیٹی۔ منظور اب آتا ہی ہوگا۔ چائے تیار نہ ہوگی تو الٹے پاؤں واپس لوٹ جائے گا۔

ریحانہ : امی۔ آخر میری بھی تو طبیعت خراب ہے۔ میں کیا کروں۔

بیگم : میری اچھی بیٹی۔ میں اتنے چائے کے برتن لگاتی ہوں تو پانی رکھ دے۔

(ریحانہ باورچی خانے میں داخل ہوتی ہے۔ کیتلی اٹھاتی ہے۔ برابر کے نل سے

پانی بھرنے لگتی ہے۔ اتنے میں دروازے سے منظور داخل ہوتا ہے جو دالان میں ہے۔ یہ دالان میں سے ہو کر صحن میں آتا ہے۔ یہ اس ویران ماحول میں اجنبی سا معلوم ہوتا ہے اس وقت ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے ہے مگر بال ترتیب کے ساتھ سنوارے گئے ہیں۔ آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ۔ ہاتھ میں اخبار ہے۔)

منظور : ریحانہ بی۔ چائے تیار ہوگئی۔

ریحانہ : ابھی لائی۔ بھائی جان۔

منظور : (اخبار پڑھنے لگتا ہے۔ صحن میں پڑے ہوئے تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد) امی۔

(شاہانہ بیگم جو برابر پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ ہیبت اور اندیشے کے احساس کے ساتھ متوجہ ہو جاتی ہیں۔)

منظور : سنی نواب صاحب کی باتیں۔

بیگم : کیا کہا انھوں نے؟

منظور : صاف بات ہے۔ کان کھول کر سن لو۔ تم ہو یا تمہارے شوہر نامدار۔ میں یہ طعنے تشنے دن رات نہیں سنوں گا۔ میں نے جائیداد کے کام میں خون پسینہ ایک کر دیا۔ آپ کا ہزاروں کا قرضہ قریب قریب ادا ہی کر چکا ہوں۔ دن رات پلا رہتا ہوں اور پھر بھی مجھی کو برا بھلا سننا پڑتا ہے۔

بیگم : آخر بتاؤ بھی تو۔ اللہ میرے کیا کہہ دیا۔ انھوں نے؟

منظور : امی جائداد پر قرضہ لینے کا ذمہ دار کون ہے؟ میں یا وہ؟ انھوں نے راتوں مجرے اور دنوں عیاشیاں کی ہیں یا میں نے۔ انھوں نے رام رنگی کی محفلیں اور اندر سبھا کے اکھاڑے سجائے ہیں یا میں نے۔

بیگم : (ایک آہ سرد کے ساتھ) میں جانتی ہوں۔

منظور : اور میری تعلیم پر ایک پیسہ خرچا ہو گیا ہوتا تو میں بھی آج کسی بڑے عہدے پر ہوتا۔ میری پرداخت پر اتنی توجہ ہوتی تو میں آج یوں تمہاری جائداد کی چچوڑی ہوئی ہڈی کو

پھر سے چھوڑنے پر مجبور نہ ہوتا۔ میری تعلیم کے پردے میں ہوس کو پورا کیا گیا۔
میرے لئے جو استانیاں رکھی گئیں ان سے عشق لڑایا گیا اور جب میں جوان ہوا...

بیگم : ان باتوں سے کیا فائدہ۔

منظور : امی۔ مجھ سے نہیں سہا جاتا۔ میں اس لئے جوان ہوا تھا کہ تمہاری جائداد کا غم اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھالوں اور اب وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں انھیں فاقے مار رہا ہوں، میں ان کے پھٹے پرانے کپڑوں کو رفو کرنے کے لئے بھی پیسے نہیں دیتا۔ مجھے طعنے دیئے جاتے ہیں کہ میں ان کی بیوی اور بیٹی سے پکانے والی اور نوکرانی کا کام لیتا ہوں۔

بیگم : وہی تو کہتے ہیں۔ ہم تو نہیں کہتے میرے لال۔ ان کے کہنے کا کیوں برا مانتا ہے۔

منظور : چوبیس گھنٹے تمہارے کام کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہوں۔ کچہری جاتا ہوں۔ کاغذات سے مغز پچی کرتا ہوں۔ اور اس کا انعام یہ ہے۔ میں تم لوگوں کے لئے اپنی کھال کی جوتیاں بنوا کر دے دوں تو بھی یہی انعام ملے گا۔ میں تمہیں فاقے مارتا ہوں؟ میں—

بیگم : ارے توبہ، تو بھی کیا قضیہ لے بیٹھا۔

منظور : نہیں امی۔ وہ ہوں یا تم۔ یا کوئی اور۔ میں کسی کو فاقے نہیں مارتا۔ میں کسی سے نہیں کہتا کہ نوکرانی مت رکھو۔ اور مجھے کھانا کھلاؤ۔ میں ہی فاقے مر جاؤں گا۔ میں آج ہی فوج میں نام لکھا سکتا ہوں۔ کما کھا سکتا ہوں۔ جائداد کے پیچھے پھرنے والے کتے کوئی اور ہوں گے۔

(ریحانہ چائے لاتی ہے ٹرے تخت پر رکھ دیتی ہے اور خاموش کھڑی ہو جاتی ہے)

اب یہاں کھڑی کیا ہو! اگالدان اٹھا کر لاؤ۔ سچ مچ میرا کام سبھی کو بھول جاتا ہے۔
آج انھوں نے کہا ہے کل تم لوگ کہو گے۔ نہیں مجھے منظور نہیں۔

(ریحانہ اگالدان لا کر رکھ دیتی ہے اور قریب کے پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے۔ سلیم اندر داخل ہوتا ہے۔ آدرش وادی خواب پرست نوجوان ہے۔ مصوری کا شوقین)

سلیم : ارے کیا ہوا منظور بھائی۔ کیا منظور نہیں آپ کو۔ ہم منظور کیے لیتے ہیں۔

منظور : آؤ بھئی، سلیم چائے پیو۔

سلیم : بنایئے۔ شکر ڈیڑھ چمچ ___ لیکن یہ آپ ہی آپ منظور نا منظور کیا کر رہے تھے آپ؟

منظور : کچھ نہیں۔ ریحانہ کا ایک رشتہ آیا تھا۔

سلیم : اوہ۔ میں سمجھا۔ آیا تھا یا آیا ہے۔

منظور : تفصیل بتاؤں گا تو ریحانہ ابھی یہاں سے بھاگ جائے گی۔

سلیم : نہیں منظور بھائی۔ مجھے کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ رشتہ آیا تھا، ذات میں کھوٹ رہی ہوگی۔ آپ نے نا منظور کر دیا اور بس۔ بہت کافی ہے۔ (شاہانہ مسکراتی ہے پھر چھالیاں کترنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ ریحانہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ بیٹھی رہے یا چلی جائے۔ تھوڑی دیر بعد شاہانہ بیگم اٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ دالان کی طرف غائب ہو جاتی ہیں۔)

منظور : آدمی یار تم ہو عقلمند۔ آپ کے شاہکار کا کیا حال ہے؟

سلیم : آپ میری تصویر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ اس نمائش سے پہلے مکمل ہو جائے گی۔

منظور : تم نے حسن مغموم کا یہ تصور لیا کہاں سے؟

سلیم : بھائی۔ وہ تصویر پوری ہو جائے تو دیکھئے گا۔ خیر یوں حسن مغموم کا تصور تو عام ہے بلکہ حسن بیمار کا بھی۔ (ریحانہ کی طرف دیکھتا ہے) مجھے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اب اگر موت کی تصویر بھی بناؤں گا تو کسی کا منہ کی شکل ہی میں تصور کروں گا۔ فانی کا وہ شعر یاد ہے تمہیں۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے

منظور : ہاں بہت سنا ہے۔

سلیم : یہ بھی کہہ دو کہ مجروں اور رقص گاہوں میں بدمذاقی کی حد ہوگئی (تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد) یاس حسن کی انتہا ہے اور موت زندگی کی یاس اور زندگی، حسن اور موت۔ یہی میرا فن ہے۔ تم بہی کھاتے اور کھتونی والے بھلا اسے کیا سمجھو گے۔ ریحانہ بہن۔ تم بھی کچھ سمجھیں اس فلسفے کو؟

ریحانہ : (جواب کھڑی ہوئی منظور کے پاس مکھیاں جھل رہی ہے بڑی معصومیت سے سرہلا دیتی ہے) نہیں۔ سلیم بھائی۔ میں نہیں سمجھی۔

سلیم : (اسی طرح ریحانہ کو دیکھتے ہوئے) تم سمجھ سکتی ہو مگر (منظور کی طرف اشارہ کر کے) تم نہیں۔ ہرگز نہیں۔ جس دن تم نے حسن اور غم۔ محبت اور ایثار کو سمجھ لیا حسن خودکشی کرلے گا، خوبصورتی اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے گی اور آرٹ دم توڑ دے گا۔

منظور : باتیں کم کیا کرتے ہیں سلیم (سگریٹ دیتا ہے) لو سگریٹ لو۔

سلیم : شکریہ (سگریٹ جلاتا ہے)

منظور : اب یہ فرمایئے کہ وہ ہمارے اسکیچ کا کیا ہوا۔

سلیم : لاؤ ابھی کھینچ دیں۔ طبیعت موزوں ہے۔ Sitting دو۔

منظور : جی نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ آج مجھے بہت کام ہے۔

سلیم : لعنت ہے تمہارے کام پر۔ سچ کہتا ہوں منظور۔ اس وقت طبیعت رواں ہے۔

منظور : اس وقت تو کسی اور پر مشق ستم کیجئے۔ میں تو یہ چلا (اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

سلیم : ریحانہ بہن کی تصویر کھینچ دیں؟!

منظور : ہاں بھئی ریحانہ کی تصویر کھینچو مگر خاکہ نہیں تصویر۔ عمدہ صاف ستھری۔

سلیم : ان سے اچھی ہوئی تو بات ہے۔

ریحانہ : جی نہیں۔ میں نہیں کھچواتی۔

سلیم : لیجئے اور سنئے!

منظور : نہیں ریحانہ۔ کھچوا بھی لو۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

سلیم : ہاں بس خاکہ تیار ہو جائے پھر ہوتا رہے گا۔

ریحانہ : نہیں بھئی، ہم سے نہیں بیٹھا جائے گا۔

سلیم : اچھی ریحانہ۔

ریحانہ : آپ نہیں سمجھتے کھانے کو دیر ہو جائے گی۔

منظور : ہو جانے دو۔ آج ذرا دیر ہی سے کھالیں گے۔ تم نہیں جانتیں سلیم بہت بڑا آرٹسٹ ہے یہ موقع روز روز تھوڑا ہی آتا ہے۔

ریحانہ : اللہ سلیم بھائی۔ آپ کتنا پریشان کرتے ہیں۔ اچھا لیجئے بیٹھ گئی۔

سلیم : شکریہ۔ (منظور سے) بھئی منظور نیچے سے میرا سامان بھجوا دینا، اس دن سے وہیں پڑا ہے۔

منظور : اچھا (دالان کے اندر والے دروازے سے چلا جاتا ہے)

بیگم : (دالان سے باہر آتے ہوئے) ریحانہ۔

ریحانہ : (سلیم سے) دیکھا آپ نے؟ (ذرا زور سے) جی۔ امی۔

بیگم : دال دھولی ہے نا!

ریحانہ : ہاں امی۔

بیگم : اچھا تو میں ذرا نیچے سے پودینہ توڑ لاؤں۔

(بیگم صاحب چلی جاتی ہیں۔ خادم سامان لے کر آتا ہے اور سلیم تصویر بنانے کے لئے سارا سامان درست کرتا ہے، پنسل اٹھاتا ہے اور کینوس پر خاکہ بنانا شروع کرتا ہے، ریحانہ تخت پر بیٹھی ہوئی ہے)

سلیم : (خاکہ کھینچتے ہوئے) بھئی ہلو مت۔ ادھر دیکھو پھر ہلیں! تمہیں ڈر لگ رہا ہے کیا؟!

ریحانہ : نہیں تو سلیم بھائی۔

سلیم : تو پھر ادھر کیوں نہیں دیکھتیں؟

ریحانہ : میری آنکھوں میں تکلیف ہے۔ میں دھوپ کی طرف نہیں دیکھ سکتی۔

سلیم : اوہ۔ مگر تم تو ابھی باورچی خانے میں تھیں۔

ریحانہ : وہ تو کام کی مجبوری تھی۔

سلیم : اور یہ فن کی مجبوری ہے۔ اچھا خیر نہ دیکھو۔ پروفائل ہی سہی۔ میں چاہتا تھا تمہاری تصویر مونالزا اسٹائل میں بناتا۔

ریحانہ : کون سا اسٹائل؟!

سلیم : مونالزا اسٹائل۔ یہ ایک بہت بڑے فن کار کی تصویر ہے۔ ایک عورت تھی مونالزا۔ وہ جب تصویر کھچانے بیٹھی تو اس کے نقوش میں کوئی بات بھی مصور کو انسپائر نہ کر سکی مگر جب ایک روز مصور نے اس کے لئے بہار کے شاداب اور تازہ پھول اکٹھے کئے بہار کے سب سے پیارے گیت یک جا کئے تب اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ آئی جو مصور کو ایک غیر فانی شاہکار بنانے کے لئے آمادہ کر سکی۔ اور اس نے اس مسکراہٹ کو اسیر کر لیا۔ بہار کے حسین ترین پھولوں سے پیدا کی ہوئی مسکراہٹ۔ موسم گل کے سحر آلود نغموں سے جگائی ہوئی مسکان۔

ریحانہ : (بے اختیار ہنس پڑتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ اور اس کے رخساروں پر بہنے لگتے ہیں اس کی آواز رندھی ہوئی ہے) میں... میں مسکرا نہیں سکتی سلیم بھائی۔

سلیم : (بے خبری کے عالم میں تصویر پر نظریں جمائے رہتا ہے) یہ میں جانتا ہوں (پھر نظر اٹھا کر ریحانہ کو دیکھتا ہے اس کی آواز میں حیرت ہے) مگر یہ تم رو کیوں رہی ہو؟

ریحانہ : آپ جانتے ہیں؟!

سلیم : ہاں جانتا ہوں۔ مگر تم رویا تو نہیں کرتیں!

ریحانہ : مگر آج.... (سسکی بھرتی ہے) جب آپ میری تصویر کھینچ رہے ہیں۔ میری خوبصورت یا بدصورت شکل کو محفوظ کر رہے ہیں تو میں سوچتی ہوں میں بھی ایک عورت تھی میں بھی ایک انسان تھی اور میں بھی زندہ رہنا چاہتی تھی۔

سلیم : اور تمہیں زندہ نہیں رہنے دیا گیا۔ میری تصویر "گل فام" دیکھی ہے تم نے۔ وہ جسے کنویں میں قید کر دیا گیا تھا۔

ریحانہ : میں تصویروں کی زبان نہیں سمجھتی۔ اپنی آواز پہچانتی ہوں۔ پیدائش سے لے کر آج تک میں اس گھر کے قید خانے میں عمر قید کی سزا بھوگ رہی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں مصالحے کی مہندی رچی ہے۔ میرا سر ابابیل کا گھونسلا بنا ہوا ہے اور میرے کپڑے صافی کی رنگت کے ہیں۔ میرے کاندھوں پر رات دن پکانے کا بوجھ ہے اور خوراک میں وہ سڑی ہوئی دالیں اور جو ملے ہوئے آٹے کی روٹی ہے۔ میں بھی پہننا چاہتی تھی۔ میں بھی ہنسنا چاہتی تھی۔ میں جینا چاہتی تھی اور مجھے زندہ دیوار میں چن دیا گیا کہ میں ایک بڑے جاگیردار کے گھرانے کی بیٹی ہوں۔

سلیم : (ایک برش اٹھاتا ہے اور اس پر اپنا گال لگا کر بیٹھا ہوا ریحانہ کو تکتا رہتا ہے پھر کھوئے ہوئے انداز میں کہتا ہے) حسن مغموم۔ یاس اور حسن...

ریحانہ : (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) سلیم بھائی۔ آپ میری تصویر بنا رہے ہیں اس دنیا کے لئے جسے میں نے نہیں دیکھا جس کی میں نے سیر نہیں کی جس میں میں نے قدم نہیں رکھا (اس کی آواز میں تندی ابھر آتی ہے) میں اس دنیا میں اپنی یادگار بھی کیوں رہنے دوں۔ ریحانہ کوئی نہیں تھی۔ وہ کبھی پیدا نہیں ہوئی، اس نے اس دنیا میں قدم نہیں رکھا۔!

سلیم : ریحانہ بہن۔ میں تمہاری یہ تصویر بناؤں گا— ضرور بناؤں گا (زور "یہ" پر ہے)

ریحانہ : نہیں سلیم بھائی۔ آپ کی تصویر پوری نہیں ہوگی (اٹھتی ہے اور سر وتے سے کینوس کو چیر ڈالتی ہے) نہیں سلیم بھائی نہیں۔ ریحانہ کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا۔ میں نہیں چاہتی تھی کوئی مجھے دیکھے۔ ریحانہ کو جو وہ تھی۔ اور اس ریحانہ کو نہ دیکھ سکے جو وہ بننا چاہتی تھی (اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے اور دالان کی طرف دوڑتی ہوئی چلی جاتی ہے اور ایک سسکی کے ساتھ پلنگ پر گر پڑتی ہے اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگتی ہے)

(سلیم گھبرایا ہوا کچھ دیر اپنے کینوس کو دیکھتا رہتا ہے پھر سگریٹ کا ایک کش لیتا ہے اور دالان کی طرف جاتا ہے، ادھر سے شاہانہ بیگم آجاتی ہیں۔ سلیم بھی دالان میں جا

کر ریحانہ کو پنکھے سے ہوا کرنے لگتا ہے)

بیگم : ریحانہ بیٹی!

سلیم : خالہ جان۔ادھر آیئے۔

بیگم : کیا ہوا؟

سلیم : ریحانہ کی طبیعت یکا یک خراب ہوگئی ہے۔

بیگم : اوہ میری بچی کو پھر دورہ پڑ گیا۔بیٹا سلیم تم ذرا پانی لیتے آؤ۔میں گلاب چھڑکتی ہوں۔ پنکھا کہاں ہے۔اے ہے۔خدایا اپنا فضل کیجیو۔(سلیم پانی لاتا ہے،بیگم اس کے منہ پر پانی کے دو ایک چھینٹے دیتی ہیں اور گلاب سنگھاتی ہیں۔سلیم پنکھا جھلتا ہے)

(اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور دالان والے دروازے سے نواب صاحب داخل ہوتے ہیں ایک سیاہ قیمتی شال اوڑھے ہوئے ہیں آنکھوں پر سونے کے فریم کا چشمہ ہے۔آواز میں شاہانہ وقار ہے)

نواب : (دروازے ہی سے) بیگم۔بیگم۔کہاں ہو؟

(سلیم کے ہاتھ کا پنکھا ایک لمحے کے لئے رک جاتا ہے اور بیگم اپنے سارے ہوش و حواس یک جا کرتی ہیں۔اور ریحانہ کی طرف سے بے خبر ہو کر نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہیں آخر گھبرا کر پلنگ سے اٹھ جاتی ہیں۔اور نواب صاحب کی طرف جاتی ہیں)

نواب : بیگم یہ لو۔عظیمہ کا خط آیا ہے اس نے لکھا ہے کہ اسے تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا حلوہ بہت پسند آیا۔

بیگم : (سنی ان سنی کر کے) ریحانہ کی طبیعت ایک دم خراب ہوگئی ہے۔

نواب : ریحانہ! کیسی ہے ریحانہ؟ وہی، دورہ پڑ گیا ہوگا؟!

بیگم : ہاں۔میں نیچے پودینہ توڑنے چلی گئی میرے پیچھے ہی دورہ پڑ گیا۔آپ کے پاس کوئی مجرب دوا ہوگی۔

نواب : ہاں بھیجتا ہوں (ہاتھ میں جو کھلا ہوا خط ہے اسے پڑھتے ہیں) مگر دیکھو یہ عظیمہ کا خط

آیا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ مجھے تمہاری بیگم کے ہاتھ کا بنا ہوا حلوہ بہت ہی پسند آیا۔
دیکھا تم نے بڑی ہی شریر ہے یہ بھی۔ ''تمہاری بیگم کے ہاتھ کا بنا ہوا'' گویا تم اس کی
کچھ ہو ہی نہیں۔اس نے لکھا ہے ''ہمارے علاقے میں ان دنوں شکار کی بڑی کثرت
ہے۔تمہیں بھی تو شکار کو گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں ادھر آجاؤ تو بڑا اچھا ہو،
تمہارے ساتھ ہی چلی چلوں گی۔اب تو منظور میاں کا غصہ بھی اتر گیا ہوگا؟''

بیگم : ریحانہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔تم ذرا جا کر جلدی کوئی دوا بھیج دیتے۔

نواب : ہاں بیگم۔مگر یہ خلوص تم نے کسی میں نہ پایا ہوگا۔لاکھ تمہاری سوکن ہے مگر تمہارے
حلوے کی کتنی تعریف لکھی ہے۔اس نے تمہاری طبیعت کو پوچھا ہے اور لکھا ہے کہ
(خط پڑھنا چاہتے ہیں کہ اتنے میں سلیم ان کے سامنے سے گزرتا ہے۔)

سلیم : (پانی کا گلاس ہاتھ میں ہے اور کچھ گھبرایا ہوا ہے) خالو میاں۔آداب (بیگم سے)
خالہ جان ریحانہ ابھی تک بے ہوش پڑی ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ذرا
آپ.....

نواب : ارے میاں سلیم جیتے رہو۔بھئی یہ تمہاری خالہ کا خط آیا ہے ایک رشتے سے تو عظیمہ
بھی تمہاری خالہ ہی ہوئی۔تمہاری ماں کے رشتے سے نہ سہی، ہمارے رشتے سے
سہی۔دیکھو تو سہی اسے تم ابھی تک یاد ہو۔لکھا ہے کہ ''سلیم میاں نے ابھی تک
میری تصویر نہیں بنائی۔''

سلیم : نواب صاحب۔بناؤں گا۔ضرور تصویر بناؤں گا (پانی لے کر چلا جاتا ہے)

نواب : سنو تو میاں سلیم (سلیم چلا جاتا ہے) اس نے یہ تصویر بھی بھیجی ہے۔لو جی بیگم تم دے
دینا سلیم کو۔میں جاتا ہوں۔خط لانے والا جواب کے انتظار میں بیٹھا ہے اور سنو
ریحانہ کی دوا بھیج دوں؟

بیگم : ہاں ضرور (چلے جاتے ہیں)

(ریحانہ کو اب ہوش آگیا ہے اور وہ دو تکیوں کے سہارے سے بیٹھی ہوئی ہے)

سلیم : ریحانہ اب کیسی ہو؟

(ریحانہ جواب نہیں دیتی)

بیگم : بیٹی اب دل کیسا ہے؟

ریحانہ : (سر ہلا دیتی ہے آواز میں نقاہت ہے جیسے کہیں دور سے آ رہی ہو) اچھی ہوں امی (تھوڑی دیر بعد) آپ پریشان نہ ہوں سلیم بھائی۔ یہ دورہ مجھے کبھی کبھی پڑ جایا کرتا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔

سلیم : خالہ جان۔ اس کو باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے۔

بیگم : (تھوڑی دیر خاموش رہتی ہے) جانتی ہوں۔ مگر دیکھا نہیں تم نے۔ تم نے کچھ سنا نہیں۔ بیٹی بے ہوش پڑی تھی اور ابا اپنی نئی نویلی دلہن کا خط سناتے پھر رہے تھے اور ہاں (میز پر سے تصویر اٹھا کر دیتی ہے) میں تو بھول ہی گئی ان کی تصویر بھی بنانی ہے تمہیں۔

سلیم : تصویر بنانا ہی میرا پیشہ ہے خالہ جان۔ مگر اس صورت میں ایسی کون سی دلکشی ہے جو بوڑھے دل سے اولاد کی مامتا چھین سکتی ہے؟!

ریحانہ : (مسکراتی ہے) سلیم بھائی۔ تصویر بنانے والوں پر یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ یہ بات دیکھنے والوں پر چھوڑیئے۔

بیگم : ایک اولاد کی مامتا کیا؟ گھر کا چین، زندگی کا سکھ اور ——

ریحانہ : (بات کاٹ کر) آپ ٹھیک نہیں کہہ رہی ہیں امی۔ ایک کو سارا الزام دے کر باقی سب کو بے گناہ ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ عظیمہ تو اب آئی ہیں اس سے پہلے صغیرن۔ مشتری اور — اور — (اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ لیتی ہے)

بیگم : ٹھیک ہے میاں سلیم۔ جب اپنے ہی گھر کو آگ لگی ہو تو بجلی کو کیوں کوسیں؟ انہی کا دماغ ٹھیک نہیں انھیں ہی رنگ رلیوں سے فرصت نہیں تو —— (رک جاتی ہے)

سلیم : نہیں تو ——

بیگم : نہیں تو میرے گھر میں بھی شہنائیاں بجتیں۔ میری بچی کے ہاتھ بھی پیلے ہوتے میں بھی منظور کی بہو لاتی اور آنگن میں نواسوں اور پوتوں سے گود بھرے بیٹھی ہوتی۔ اس گھر کی نیو کس نحس گھڑی میں پڑی تھی کہ دکھ درد کے سوا اور کچھ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

ریحانہ : امی۔ہم نے مرگھٹ میں جنم لیا ہے۔

سلیم : مگر جائیداد کا انتظام تو منظور کے ہاتھ میں ہے!(ریحانہ کی آنکھیں جھپک جاتی ہیں)

بیگم : ہاں اسی لئے تو جائداد کی آمدنی بھی اسی کے لئے ہے۔

سلیم : اگر وہ چاہیں تو—

بیگم : (بات کاٹ کر) مگر وہ کیوں چاہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں انھیں ملتا ہے۔اچھے سے اچھے کپڑے پہننے کو۔بگھی سواری کو اور روپیہ عیاشی کو اور ہمارے لئے بس ان کے پاس ہر فصل میں بھروا دینے کے لئے جنس ہے اور گیہوں اور جو کی ملی ہوئی روٹی۔

سلیم : آپ اس سے کہتی کیوں نہیں؟!

بیگم : تم ابھی یہاں نئے نئے ہو۔ جو کچھ ملتا ہے وہ بھی بے مانگے نہیں ملتا۔(کھانسی اٹھ آتی ہے اور دیر تک کھانسی رہتی ہے)ایک نوکرانی بھی نہیں جو کھانا پکا سکے۔

سلیم : (خالی نظروں سے گھر کی اونچی اونچی دیواروں کو دیکھنے لگتا ہے) مجھے یقین نہیں آتا۔ (ریحانہ ہنس پڑتی ہے)

بیگم : تم ابھی بچے ہو سلیم ____ ایک کام یاد رکھنا؟

سلیم : کیا؟ (ریحانہ اٹھنے لگتی ہے)

ریحانہ تم کہاں جا رہی ہو؟

ریحانہ : اب رات کی ہنڈیا کے لئے مصالحہ پیسوں گی۔

سلیم : خالہ جان۔انھیں مت جانے دیجئے،طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔

بیگم : بیٹی میں پیس لوں گی۔تو مت جا۔ٹھہر جا۔ابھی——

ریحانہ : امی۔ٹھنڈے پانی میں ہاتھ کرو گی تو تمہاری کھانسی پر زور ہو جائے گا۔(بیگم منہ پھیر کر سلیم سے باتیں کرنے لگتی ہیں اور سلیم ریحانہ کو باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے)

بیگم : ہاں بیٹا۔ وہ کام یاد رکھنا۔ یہ تصویر عظیمہ کی ضرور بنا دینا۔ جلد ہی بنا دینا۔ وہ تم ہی سے نہیں مجھ سے بھی خفا ہو جائیں گے۔

سلیم : کیوں؟

بیگم : کہ شاید میں نے ہی تمہیں تصویر بنانے سے روکا ہوگا۔

سلیم : آپ... انھیں شادی کرنے سے نہ روک سکیں تو مجھے تصویر بنانے سے کیوں روکیں گی؟

بیگم : وہ یہ نہ سمجھیں گے!!

سلیم : وہ تو وہ میں بھی یہ بات نہیں سمجھ سکتا۔

بیگم : تم ابھی یہاں نئے نئے آئے ہو۔

سلیم : خالہ جان۔ خدا نہ کرے میں کبھی بھی پرانا ہو جاؤں۔ آپ خالو جان کی حالت کو دیکھتی ہیں اور انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، ان کی آگ میں جلتی ہیں اور ان پر پھول چڑھاتی ہیں۔ ان کے زہر کو اپنے ہی میں نہیں اس گھر کی ایک ایک اینٹ میں سموتی ہیں اور ان کی پوجا کرتی ہیں۔ اس مندر کو مرگھٹ بنانے کی ذمہ دار آپ ہیں خالہ جان! آپ۔

بیگم : (چہرے پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں مگر ضبط کرتی ہیں۔ برابر سے پاندان اٹھا لیتی ہیں اور پان لگانے لگتی ہیں) مجھے چھوٹوں کی زبان سے طعنے سننے کی عادت نہیں سلیم۔ ہمدردی کرنے سے گئے اور میرے ہی کلیجے میں کچوکے لگانے آئے ہو۔

سلیم : خالہ جان۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے۔ میں ہی غلط کہتا ہوں۔

بیگم : (بات کاٹ کر) بالکل ___ تم عورت کا فرض نہیں جانتے۔

سلیم : نہیں جانتا! پتھروں کے سامنے انسان کا سر کاٹ کر چڑھا دینے کا رواج زمانہ ہوا، اٹھ گیا۔ آپ اسے فرض کہتی ہیں۔ یہ فریب ہے، بہت بڑا فریب جس کے آسرے پر پچھلی نسل نے آنے والی نسل کی جوان ہڈیوں پر اپنا محل چنا اور آج یہ نسل پھر اسی فریب کو دہرانا چاہتی ہے۔ لفظ انسان کے ایجاد کیا ہوا سب سے بڑا فریب ہے۔ محبت؟ فرض؟ اور قربانی! لفظوں کے رنگین جال۔ مجھے ان بے ہودگیوں سے نفرت ہے، ہمدردی نہیں۔ آپ نہیں جانتیں خالہ جان۔ میرے آرٹ کی یہی پرتکیا ہے کہ وہ انسان کو لغو توہمات سے آزاد کرائے۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اسے ساری

زنجیریں شکست کرنی ہیں۔

(خادم داخل ہوتا ہے۔ بوڑھا نوکر ہے قمیص اور پاجامے میں ملبوس ہے جو زیادہ صاف ستھرے نہیں ہیں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ خادم کو کسی طرح بھی مضحک کردار نہ بنایا جائے نہ اس کی شکل پر غریبی، نقاہت یا بہت زیادہ بڑھاپے کے آثار پیدا کر کے اسے قبل رحم بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہ ایک معمولی نوکر ہے جس میں مضحکہ یا ہمدردی پیدا کرنے والی کوئی صفت نہیں ہے۔ خادم کے ہاتھ میں دوا کا ایک پیکٹ اور شیشی ہے)

خادم : بڑے سرکار نے دوا بھیجی ہے۔

(بیگم دوا لے لیتی ہیں)

خادم : اور (سلیم سے) آپ کو چھوٹے سرکار بلا رہے ہیں۔

سلیم : ابھی آتا ہوں۔

خادم : انھوں نے کہا تھا کہ ساتھ ہی لے کر آنا۔

سلیم : اچھا ——

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

(منظور کی اسٹڈی کا کمرہ، نہایت آراستہ پیراستہ۔ دفتر کی بھاری میز کے گرد گھومنے والی کرسی پر منظور بیٹھا ہوا ہے۔ دونوں طرف مختلف رنگوں کے فائل اور کاغذات ہیں جن پر خوش رنگ پیپر ویٹ رکھے ہوئے ہیں۔ بیچ میں نیلے رنگ کے شیڈ کا ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہوا ہے اس کے برابر قلمدان اور دوسری مختلف چیزیں ہیں برابر ہی چھوٹا سا شلف کتابوں سے پر ہے اور دوسری طرف چھوٹی سی میز پر مختلف کتابیں رکھی ہوئی ہیں

جن میں دو ایک کھلی ہوئی ہیں۔ یہ سب کتابیں خاصی ضخیم ہیں اور قانون کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ جس وقت سلیم داخل ہوتا ہے۔ منظور کا ٹیبل لمپ روشن ہو چکا ہے اور وہ اپنے ہاتھ میں قلم لئے ہوئے ہے جس کا اوپری حصہ اس کے گال کو چھو رہا ہے اس کے سامنے ایک فائل ہے۔ کپڑے اس وقت سادہ پہنے ہوئے ہے اور کوٹ پہن رکھا ہے نائٹ کیپ میز پر رکھی ہوئی ہے، موٹے فریم کا چشمہ لگا ہوا ہے۔

میز کے سامنے دو تین کرسیاں پڑی ہیں ایک کرسی دائیں طرف ہے اور اسی پر سلیم آ کر بیٹھتا ہے اور اوپر کے روشن دانوں میں ہلکی سی روشنی ہے جو اس سین کے دوران مدھم ہوتی جاتی ہے اور بعد کو بارش اور بجلی کی کڑک کے اثرات انہی روشندانوں کے ذریعہ دکھائے جا سکتے ہیں۔ قدموں کی چاپ ہوتے ہی منظور فائل سے نظریں اٹھاتا ہے اور چشمہ اتارتا ہے۔)

منظور : اماں آدمی ہو یا افلاطون۔ ڈیڑھ گھنٹے سے تمہیں بلا رہے ہیں۔ ایک بڑا باذوق آدمی آیا ہوا تھا تمہاری کچھ تصویروں کا سودا کرا دیتے۔

سلیم : مگر مجھے تو ابھی اطلاع ملی۔

منظور : خیر جانے دو۔ تمہاری قسمت؟ میں نے تو اسے اتنی دیر روکے رکھا کہ شاید تم آ جاؤ، بھئی بات یہ ہے کہ یہ شہر کے مشہور رئیس ہیں بابو جگن ناتھ۔ شراب کی ہول سیل دوکان ہے، درآمد برآمد کا کاروباری ہے اس قصبے سے گزر رہے تھے، مجھ سے ملنے چلے آئے تھے بڑا خوش مزاج آدمی ہے یار۔

سلیم : سچ؟

منظور : اس کا ڈرائنگ روم دیکھو گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی۔ بڑے فنکاروں کے شہ کار ملیں گے۔ میں نے امرت شیر گل کی سب سے پہلی تصویر اسی کے ڈرائنگ روم میں دیکھی تھی — اور ہاں، ریحانہ کی تصویر بنائی تم نے؟

سلیم : (سگرٹ منہ سے لگاتے ہوئے) نہیں۔

(بادل کی گرج اور کڑک صاف سنائی دیتی ہے۔ بارش ہونے لگتی ہے اور تھوڑی دیر

بعد اس کی بوندیں۔ روشن دانوں کے ذریعے اندر بھی آنے لگتی ہیں)

منظور : آخر کیوں نہیں بنائی؟

سلیم : منظور۔ سن رہے ہو۔ بادل کس زور شور سے گرج رہے ہیں۔

منظور : روشن دان بند کر دو۔ (خادم دوڑتا ہوا اندر آتا ہے)

خادم : حضور۔ حضور۔

منظور : (اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکے) روشن دان بند کر دو۔ خادم (خادم ڈوری کھینچتا ہے اور روشن دان بند کر دیتا ہے)

خادم : حضور۔ سونے کے کمرے کی چھت ٹپکنے لگی ہے۔

منظور : اس وقت کیا کیا جا سکتا ہے۔ ضروری چیزیں اس جگہ سے ہٹا دو۔ (خادم جانے لگتا ہے) اور سنو (سلیم کی طرف مخاطب ہو کر) میں سمجھتا ہوں ٹھنڈ کافی ہے۔ ہاتھ تمہارے بھی ٹھٹھر رہے ہیں۔

سلیم : کیوں؟

منظور : ہاں تو دو پیالی چائے چاہئے۔ تم یہ کام کرو۔ ریحانہ بی بی سے کہہ دینا۔ وہ دے جائیں گی۔

خادم : بہت اچھا۔ حضور (خادم چلا جاتا ہے)

(سلیم کے چہرے پر سے گویا ایک سایہ گزر جاتا ہے)

منظور : ہاں تو سلیم صاحب۔

سلیم : پھر کوئی تازہ خبر؟

منظور : آپ نے وہ تصویر نہیں بنائی۔ وہ بات ادھوری رہ گئی۔

سلیم : جی نہیں بنا سکا۔

منظور : مگر کیوں نہیں بنائی یہی تو پوچھتا ہوں۔

سلیم : (لائٹر سے سگریٹ جلاتا ہے) تمہیں معلوم نہیں کہ ریحانہ بہن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

منظور : (بے پرواہی اور خشونت کے ساتھ) وہی دورہ پڑ گیا ہوگا۔ یہی بات ہے نا؟

سلیم : ہاں وہ کافی دیر بے ہوش ہیں۔ تمہیں کوئی فکر نہیں ہوئی۔

منظور : (سامنے دیکھتے ہوئے نہیں۔ کنواری لڑکیوں کے دورے ڈھکو سلے ہوتے ہیں، نرے پرے ڈھکوسلے۔

سلیم : یہ تم کہہ رہے ہو منظور (زور "تم" پر)

منظور : ہاں، سلیم، تم اس گھر کو نہیں پہچانتے۔

سلیم : یہ بات تو اس سے پہلے بھی سن چکا ہوں۔ تم پہچانتے ہو شاید۔ میں تم سے پوچھتا ہوں آخر تم اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔

منظور : میں؟ میں اس کی شادی کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ تم نواب صاحب کو فراموش کر رہے ہو سلیم۔

سلیم : جی نہیں۔ تم ہر ایک بات میں اپنی خود مختاری پر ناز کرتے ہو۔ یہ اعلیٰ سگرٹوں کے ٹن۔ یہ سگاروں کے ڈبے، یہ تکلفات کے انبار۔ تمہاری ڈنر پارٹیاں اور شکار کی ضیافتیں ہر ایک بات میں تم بااختیار ہو لیکن جب ایک لڑکی کو اس کا حق دینے کا سوال اٹھتا ہے تو ——

منظور : (بات کاٹ کر) میں اس کے حق سے انکار نہیں کرتا۔

سلیم : انکار اقرار کا سوال نہیں۔ میں مسئلے پر جذباتی ہو کر غور نہیں کر رہا ہوں۔ جذباتی آدمی کو میں اندھا سمجھتا ہوں۔

منظور : (بات شروع کرنے کے لئے) اخلاقی نقطۂ نظر سے—

سلیم : (بات کاٹ کر) نہیں میں تمہاری اخلاقی قدروں کو تسلیم نہیں کروں گا۔ آگ لگاؤ ان قدروں کو جو ایک بچے کی نازک پیٹھ پر باپ کے بے جا حق کا بوجھ رکھتی ہیں اور اسے قربان کر دیتی ہیں۔ چھوٹے کو بڑے کی قربان گاہ پر چڑھا دیتی ہیں۔ میں سیدھی بات جانتا ہوں۔ انسان آزادی کا حق رکھتا ہے اور ریحانہ عورت ہے اسے تم ہاتھ پیر باندھ کر رکھ رہے ہو۔

منظور : نہیں سلیم۔ میں نے کسی کے ہاتھ پیر نہیں باندھے۔

سلیم : (سگریٹ کا ایک کش لے کر) سوال یہ ہے کہ تم ریحانہ کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔

منظور : بات یہ ہے سلیم، تم نے جب تذکرہ چھیڑا ہے تو سنو۔

سلیم : کہو۔

منظور : پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا کوئی ڈھنگ کا پیام ہی نہیں آتا۔ تم چاہتے ہو کہ میں بھائی ہو کر کسی ایسے ویسے جاگیردار کے ہاتھ سونپ دوں۔ جس کی آمدنی کا کوئی بھروسہ نہ ہو جس کی ذات پات میں کھوٹ ہو اور جو ہماری سا عزت اور وقار نہ رکھتا ہو۔

سلیم : (ہنس کر) نہیں۔ منظور بھائی۔ تمہارے ذات پات کے ڈھکوسلے نہ جائیں گے۔

منظور : میں سماج میں رہ کر باغی نہ ہو سکوں گا۔ میں تمہاری طرح عورت کی بے راہ روی اور نراج کا قائل نہیں۔ عورت ایک ہیرا ہے اور اسے محفوظ رکھنا چاہیے۔

سلیم : الفاظ۔ محض الفاظ۔

منظور : اس کے علاوہ تم میری مالی حالت دیکھتے ہو۔ شادی وہ چیز ہے جس کے لئے وافر روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے پاس روپیہ نہیں۔ شاید تم کہہ دو کہ اپنے خرچ کے لئے تو میرے پاس روپیہ ہے مگر ریحانہ کے لئے نہیں۔ کہہ سکتے ہو۔ مگر مجھے اس گھرانے کا ناموس برقرار رکھنا ہے آج بگھی بیچ ڈالوں، قصبہ بھر میں نوابوں کے گھرانے کا نام ڈوب جائے گا ___ کوٹھی کے ساز و سامان پر ویرانی چھائی رہی جو حویلی کے اندر ہے تو لوگ میرے گریبان میں تھوکیں۔

سلیم : اور اگر زہرہ سے۔

منظور : میں بھورا۔ تم تو میرے اس راز سے واقف ہو (مسکراتا ہے مگر یہ مسکراہٹ فکر آلود ہے) ہاں اگر زہرہ کے پاس نہ جاؤں تو میرا دماغ اس پاگل خانے میں کس طرح کام کرے ایک ستر سالہ بوڑھا جو ایک نئے رومان میں مبتلا ہے۔ عظیمہ کا خط تم نے بھی سنا ہوگا۔ اور ایک 65 سالہ بڑھیا جو دمے کے دائمی اور مہلک مرض میں گرفتار

ہے اور ایک اختلاجی لڑکی ___ اور زہرہ میری زندگی کا اکیلا راز ہے وہ گاتی ہے، وہ ناچتی ہے، وہ مجھے سکون اور محبت کے سارے خزانے بخش دیتی ہے۔ اور کچھ نہیں لیتی۔ وہ مجھ پر اپنی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالتی۔ روپیہ اور صرف روپیہ اس کے سوا کچھ نہیں لیتی۔ وہ اگر وہ مجھے نہ ملی ہوتی تو اس جاگیر میں کتے لوٹتے اور اس محل میں لاشیں سڑا کرتیں۔

سلیم : میں جانتا ہوں۔ تم اچھے جاگیردار رہے ہو۔ پھر کیوں گھر والوں کو سالہا سال سے دالیں کھانی پڑ رہی ہیں اور یہ گیہوں اور جو کی روٹیاں، تم دو بندوں کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ تم ایک ماں کو تندرستی نہیں دے سکتے تم ایک لڑکی کو مسرت نہیں دے سکتے (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد) تم میری بات کو پھر ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ریحانہ کے سوال کا تم نے جواب نہیں دیا۔

منظور : اور کیا جواب دوں؟

سلیم : اور اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم ذات کی کھوٹ اور خاندانی عزت کے لئے نہیں بلکہ —

منظور : اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

سلیم : اس لئے کہ تمہاری جاگیر کا حصہ تقسیم ہو جائے گا۔ تمہیں کھانے پکانے کے لئے ماما اور کام کاج کے لئے نوکرانی رکھنا پڑے گی تم خالص لالچ اور ذاتی نفع کے خیال سے اس کی شادی نہیں کر رہے ہو؟

منظور : (ہنس دیتا ہے) کہہ سکتے ہو!

(اتنے میں قدموں کی چاپ ہوتی ہے اور ریحانہ چائے کی ٹرے لئے داخل ہوتی ہے۔ کپڑے اور حلیہ وہی ہے جو پہلے سین میں تھا صرف ذرا بھیگ گئی ہے، بالوں میں پانی کے قطرے چمک رہے ہیں، منظور اسی طرح بیٹھا رہتا ہے، صرف ذرا فائل کی طرف توجہ کرنے لگتا ہے۔ سلیم کے چہرے سے رنگ اڑ جاتا ہے)

ریحانہ : بھائی جان۔ چائے کہاں رکھوں۔ چاروں طرف تو کتابیں بکھیر رکھی ہیں آپ نے۔

منظور : (دو تین فائلیں ہٹا لیتا ہے) یہاں رکھ دو (چائے رکھ دیتی ہے اور برابر والی کرسی پر

بیٹھ جاتی ہے)

سلیم : ریحانہ بہن۔ کیا بارش ابھی تک ہو رہی ہے؟

ریحانہ : اوہ۔ کچھ نہ پوچھئے۔ قیامت کا طوفان ہے۔

سلیم : سچ؟

ریحانہ : آپ بال دیکھ رہے ہیں میرے۔ ان میں تمام پانی بھر گیا ہے۔ اب جا کر چائے پیوں گی۔

سلیم : یہیں کیوں نہیں پی لیتیں؟

منظور : (جیسے بات سنی ہی نہ ہو) بھئی تمہاری خاطر کے لئے تو یہ کیک اور بسکٹ بھی لے آئیں۔

ریحانہ : مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ سلیم بھائی یہاں ہیں۔

منظور : (چائے بنا کر دیتے ہوئے) لو (کیک کی پلیٹ سلیم کی طرف بڑھاتا ہے) آج تو تم سے بہت دنوں بعد اتنی باتیں ہوئیں۔ ہاں یار۔ یہ تو بتاؤ تم شادی کب کرو گے؟

سلیم : میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!

منظور : میں نے کہا تم شادی کب کر رہے ہو؟

سلیم : ہونہہ! ضروری ہے کہ شادی کروں؟

منظور : قطعی۔

سلیم : میں ان ڈھکوسلوں میں یقین نہیں رکھتا۔ اگر شادی سے مراد نکاح بیاہ ہے جس میں چغد کی طرح بیٹھ کر میں بھی فلاں بنت فلاں کو اتنے معجّل اور اتنے غیر معجّل کے عوض منظور کروں تو میں شادی کبھی نہیں کروں گا۔

منظور : اور کیا کرو گے؟

سلیم : ہاں اگر شادی سے مراد ایک عورت کا ہم رفیق ہونا ہے تو ایک عورت میرے ساتھ ضرور رہے گی۔ اسے تم بھابھی بھی کہہ سکتے ہو۔

منظور : پاگل ہو گئے ہو سلیم!

سلیم : نہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات تو نہیں۔

منظور : بہت غیر معمولی بات ہے۔ یہاں رہنے نہ پاؤ گے۔

سلیم : (بڑی بے تعلقی سے) نہ رہوں گا۔ میں ٹوٹ سکتا ہوں، جھک نہیں سکتا۔ (باہر بجلی کی کڑک تیز ہو جاتی ہے، خادم اندر داخل ہوتا ہے)

خادم : حضور۔ منشی جی آگئے ہیں۔

سلیم : اچھا۔ ان سے کہو بیٹھیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔

خادم : بہت اچھا (خادم الٹے پاؤں واپس جاتا ہے)

منظور : (چائے کی پیالی ختم کر کے میز پر رکھتا ہے رومال سے منہ پوچھتا ہے) اچھا بھئی سلیم۔ تم چائے پیو۔ میں اتنے میں منشی جی سے بات کر آؤں۔

سلیم : ضرور۔

(منظور اٹھ کر چلا جاتا ہے بارش کے قطرے بڑی تیزی سے روشندانوں سے ٹکرا رہے ہیں)

سلیم : (صرف بات کرنے کی خاطر) آج کی بارش نہیں طوفان ہے۔

ریحانہ : سلیم بھائی۔ کیا شادی کے بارے میں آپ کا سچ مچ یہی خیال ہے، جو آپ ابھی کہہ رہے تھے۔

سلیم : ہاں ریحانہ۔ میں کہتا ہوں نکاح کے دو بول میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ شاید تم سے مجھے یہ باتیں نہ کہنی چاہئیں۔

ریحانہ : نہیں سلیم بھائی۔ اب مجھ عورت پر لڑکیوں جیسی شرم اچھی نہیں لگتی۔

سلیم : شادی یا بغیر شادی۔ انسان، مرد اور عورت کی آزادی بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے کردار کو نشو ونما کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ اپنی طاقتوں کو آزمانے کا موقع ملنا چاہئے۔ تم چائے پیو ریحانہ۔ اب تو ایک پیالی بھی خالی ہو گئی۔ میں ابھی اسے دھوئے دیتا ہوں (پیالی کو گلاس میں رکھے ہوئے پانی سے دھو لیتا ہے پھر چائے بنانے لگتا ہے، اس عرصہ میں ریحانہ اسے خاموش نظروں سے دیکھتی ہے)۔

سلیم : کیوں ریحانہ (چائے دیتا ہے۔ وہ پیالی کو بے خیالی میں تھام لیتی ہے۔)

ریحانہ : کیا واقعی دنیا بہت بڑی ہے۔

سلیم : ہاں ریحانہ۔ بہت بڑی ہے— تم نے الف لیلیٰ پڑھی ہے ریحانہ؟

ریحانہ : نہیں۔ کچھ کہانیاں سنی ہیں!

سلیم : سند باد کا سفر سنا ہے؟

ریحانہ : نہیں!

سلیم : سند باد بہت بڑا سیاح گزرا ہے۔

ریحانہ : کیا گزرا ہے؟

سلیم : سیاح؟ ملکوں ملکوں گھومتا پھرتا تھا وہ ایک ویران پہاڑی پر اترا تھا۔ جہاں روزانہ ایک بہت بڑا خوفناک جانور آیا کرتا تھا رخ۔ یہ رخ جانور بہت ہی بڑا تھا۔ جب وہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر بن نہ پڑی تو سند باد نے گوشت کے ایک ٹکڑے میں خود کو لپیٹ لیا اور رخ اسے گوشت سمجھ کر اڑا لے گیا۔ اور اسے آبادی میں اتار دیا۔

ریحانہ : پوری کہانی سنائیے۔

سلیم : کہانی پوری ہوگئی ریحانہ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایک رخ بن جاؤں۔

ریحانہ : (ہنس پڑتی ہے) آپ سچ مچ بچے ہیں۔

سلیم : ہاں۔

ریحانہ : الف لیلیٰ کی کہانیاں کوئی بڑے سنا کرتے ہیں۔

سلیم : ہاں۔ مگر کیا تم سند باد بننا نہیں چاہتیں۔ تم ایک ویران پہاڑی پر پڑی ہو اس پہاڑی کی وادیوں میں لاشیں سڑ رہی ہیں اور گدھ منڈلا رہے ہیں۔

ریحانہ : اور رخ؟

سلیم : ہاں ریحانہ ادا میں رخ بننا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں دنیا دکھاؤں گا، میں بہتے ہوئے آبشاروں اور کھلتے ہوئے پھولوں کے پس منظر میں تمہاری تصویریں بناؤں گا وہ تصویریں جنھیں تم چاک نہ کرسکوگی۔ تم دنیا پر

بہار کے گیت کی طرح چھا جاؤ گی۔ وہ اس دن میں کتنا خوش ہوں گا۔

ریحانہ : کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟

سلیم : ہاں ریحانہ۔ چلو گی میرے ساتھ؟

ریحانہ : یہ بھی کوئی کہانی ہے۔ بھلا آپ میرے ساتھ اپنی زندگی کیوں خراب کرنے لگے؟

سلیم : نہیں ریحانہ۔ بالکل سچ۔

ریحانہ : تو کیا آپ مجھ سے ——

سلیم : ہاں شادی کروں گا لیکن تمہیں میرے ساتھ بھاگ کر چلنا ہوگا۔

ریحانہ : یہ کیوں؟ وہ راضی ہو جائیں گے۔

سلیم : ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ تم ابھی تک ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔ میرے ساتھ صرف وہی عورت خوش رہ سکے گی جو پتھر کے مقابلے میں لوہا بن کر آئے جو آگ میں تپ کر آئے گی جو جہنم پار کر کے آئے گی۔ تم انسان ہو طوفانوں سے ٹکرا سکتی ہو۔ اگر ٹکرانے کے لئے کچھ نہ ہو تو انسان فولاد نہ بنے موم بن کر پگھل جائے۔ اگر ٹکرانے والے چیز مضبوط نہ ہو تو ٹکرانے والے کی توہین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سر بلند ہو۔ سر اٹھاؤ۔ بادلوں سے بھی اونچا۔ ستاروں سے بھی بلند۔ تم آخر ڈرتی کس لئے ہو۔

ریحانہ : خاندان کی عزت ——؟

سلیم : (بات کاٹ کر) میں جانتا تھا خاندان نے تمہیں کون سی عزت دی ہے جس کا تمہیں اس قدر پاس ہے۔ ڈرپوک نہ بنو، ظالم اور مظلوم کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اور بزدلی کی سزا ہے عمر قید۔ ان بے رحم دیواروں سے راستہ مانگتے مانگتے مر جاؤ گی اور یہ ایک انچ نہ ہٹیں گی، اسی قید خانے میں تمہاری جوانی دم توڑ دے گی اور خاندان کی عزت کا دامن بھیگے گا بھی نہیں۔

ریحانہ : خدایا۔

سلیم : بولو۔ آج کی رات اور آج ہی کی رات اس کا فیصلہ ہونا ہے۔ میں آج رات کے دو بجے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں چور دروازے پر تمہارا انتظار کروں گا۔ بولو۔ تمہارا کیا

فیصلہ ہے؟

ریحانہ : (سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دیکھتی ہے پھر نیچی نظریں کر لیتی ہے) مجھے سوچ لینے دیجئے۔ خدارا مجھے سوچ لینے دیجئے۔

(منظور داخل ہوتا ہے)

منظور : کوڑی کام کے نہیں ہیں حرام خور کہیں کے۔ جس کام کو بھیجو بہانہ بنا کر لے آتے ہیں۔

سلیم : کیا بات ہوئی۔

منظور : ریحانہ تم جاؤ (ریحانہ جو چائے کے برتن ٹرے میں اکٹھے کر رہی تھی چلی جاتی ہے) ارے میاں وہی الو کے پٹھے منشی جی ہیں ان سے کہا تھا کہ ذرا زہرہ کو بلا لاؤ سوچا تھا تم آئے ہوئے ہو ذرا آج کی رات ناچ رنگ ہو جائے گا۔

سلیم : پھر کیا خبر لائے؟

منظور : کہتے ہیں گوالیار گئی ہوئی ہے۔ لاحول ولاقوۃ جی چاہتا ہے ان سب کے گولی ماردی جائے۔

(نواب صاحب داخل ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں تسبیح ہے وہی قیمتی سیاہ شال اوڑھے آئے ہیں۔ سونے کی عینک کی گرفت میں ناک کا بانسہ پھڑک رہا ہے)

نواب : ارے میاں سلیم۔ تم یہاں بیٹھے ہو۔

سلیم : منظور میاں نے بلا لیا تھا۔

نواب : اور وہ عظیمہ کی تصویر بنانی شروع کی تم نے۔

سلیم : (کچھ گھبراہٹ) کچھ حیرت سے جی۔ جی۔ نہیں ابھی تو نہیں۔

نواب : لاحول ولاقوۃ۔ توبہ توبہ اس وقت سے بے کار بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہو۔ تصویر ہی بنا لیتے۔

منظور : ابا جان۔ خادم نے سونے والے کمرے سے آپ کا کچھ سامان ہٹا دیا تھا۔ کمرہ ٹپک رہا ہے۔ اسے دیکھ لیں۔

نواب : (گرج کر) میرا اس گھر میں کوئی سامان نہیں۔ (سلیم سے) عظیمہ کی تصویر کہاں ہے سلیم میاں؟

(سلیم میز پر سے تصویر اٹھا کر دیتا ہے وہ تسبیح والے ہاتھ سے تصویر سنبھال لیتے ہیں)

بس۔اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

(باہر چلے جاتے ہیں ایک ساتھ ہی بادل زور سے گرجتے ہیں بجلی کڑکتی ہے اور پردہ گرتا ہے۔)

تیسرا سین

(رات کی تاریکی چھا گئی ہے۔ دالان کے اندر کا کمرہ جس میں ایک پلنگ پر شاہانہ بیگم سو رہی ہیں، دوسرے پلنگ پر ریحانہ لیٹی ہوئی ہے۔ سرہانے بڑا مدھم اور دھندلا بلب روشن ہے۔ کمرہ سیلا ہوا سا ہے، ایک طرف مچان پر کچھ صندوق اور کپڑے اور گٹھریاں ہیں ایک طرف نماز پڑھنے کی چوکی بچھی ہوئی ہے اور اس پر ایک لوٹا رکھا ہے۔ ایک طرف سنگھار میز اور اس پر ایک بڑا آئینہ رکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیاں ہیں اور ایک چھوٹے سے مچان پر قرآن مجید رکھا ہوا ہے۔ ریحانہ کے پلنگ کے ایک طرف وہ تصویر پھٹی ہوئی پڑی ہے جو سلیم نے بنائی تھی۔ ریحانہ صاف شفاف کپڑے پہنے ہوئے ہے بال بھی سلیقے کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ شاہانہ بیگم کو کبھی کبھی کھانسی اٹھتی ہے اور دیر تک اٹھتی رہتی ہے تو ریحانہ کروٹ بدلتی ہے۔)

شاہانہ بیگم : ابھی بجلی بند نہیں کی بیٹی۔

ریحانہ : امی۔تمہیں کھانسی بہت اٹھ رہی تھی نا۔اسی لئے جلتی رہنے دی ہے۔تم آرام سے سو جاؤ۔

بیگم : ارے پگلی۔کھانسی تو دم کے ساتھ ہے۔تو ابھی تک سوئی نہیں۔

ریحانہ : مجھے نیند نہیں آتی۔امی۔

بیگم : سو جا بیٹی۔ تیری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ آج صبح ہی دورہ پڑ چکا ہے۔ (رضائی میں منہ لپیٹ کر کروٹ بدل لیتی ہیں۔ دورہ کے لفظ پر پس منظر کی چونکا دینے والی موسیقی شروع ہوتی ہے)

ریحانہ : دورہ پڑ جائے گا؟ دورہ پڑ جائے گا؟! (آہستہ سے پلنگ پر سے اٹھتی ہے اور بڑے آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور غور سے اپنی شکل آئینہ میں دیکھنے لگتی ہے۔ پیچھے سے آواز آتی ہے) ریحانہ تمہارے پاس کیا رکھا ہے۔ تندرستی مٹ چکی ہے۔ جوانی ختم ہوگئی۔ خوبصورتی (ہنستی ہے) خوبصورتی نے بدصورتی اور بڑھاپے کا روپ لے لیا۔ کس کے بھروسے پر کس کے ہاتھ میں ہاتھ دو گی۔ کس آسرے پر۔

بیگم : (پھر کروٹ لیتی ہیں) ریحانہ بیٹی۔ دروازہ بند کرنا نہ بھول جانا۔

ریحانہ : اچھا امی۔ بھلا کبھی میں دروازہ بند کرنا بھولتی ہوں۔

بیگم : نہیں۔ بھولتی تو کبھی نہیں پر یاد دلا دینا تو اچھا ہوتا ہے۔ خدا تجھے اچھا رکھے، خوش رکھے (رضائی میں منہ لپیٹ کر دوسری طرف کروٹ بدل لیتی ہیں۔ پس منظر میں ہلکی سی موسیقی ابھرتی ہے جس میں شہنائی کی آواز بھی شامل ہے جو دور کہیں بج رہی ہے)

ریحانہ : (بڑبڑاتی ہے) خدا تجھے اچھا رکھے خوش رکھے (ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے پلنگ تک آتی ہے۔ اپنی پھٹی ہوئی ادھوری تصویر اٹھا لیتی ہے جسے اس نے سروتے سے چیر دیا تھا) پھر آپ ہی آپ ہنستی ہے (پس منظر کی آواز فضا پر چھا جاتی ہے) یہ تم نے کیا کیا سلیم! اتنی بڑی دولت بے کہے بے مانگے میری گود میں ڈال دی۔ ساری دنیا کا دروازہ میرے لئے کھول دیا۔ میرے در پر پہلی بار اور آخری بار محبت نے دستک دی۔ میں بھی جیوں گی۔ میں بھی زندگی کو خوشی سے بھر دوں گی۔ کوئی کچھ بھی کہے مجھے کیا؟ میں جاؤں گی۔ میں اس بار دروازہ بند نہیں کروں گی۔ ہر رات میں دروازہ بند کرتی رہی ہوں۔ آج نہیں، آج ہرگز نہیں۔

(پس منظر کی موسیقی ایک چھناکے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے)

بیگم : آج تو سوئے گی نہیں۔

ریحانہ : نیند نہیں آرہی تھی میں نے سوچا ذرا منہ دھولوں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

بیگم : جب تک تو نہیں سوتی مجھے بھی نیند نہیں آتی۔

ریحانہ : مجھے کب تک ساتھ باندھے باندھے پھرو گی۔ امی۔ مجھ سے اتنی محبت نہ کرو کہ مجھے جینا دوبھر ہو جائے۔

بیگم : ٹھیک تو کہتی ہے۔ مجھے تو کتنا ارمان تھا کہ تجھے پیار سے رخصت کرتی مگر کیا کروں بچی قسمت سے کس کا بس چلا ہے (کھانسی اٹھنے لگتی ہے اور دیر تک اٹھتی رہتی ہے) میری زندگی میں خوشی کہاں ہے۔

ریحانہ : ٹھیک ہی تو ہے امی۔ عورت سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہی بنی ہے۔ وہ خود کوئی قربانی نہیں مانگتی۔

بیگم : کیا الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگی جا سو جا میں بھی سوتی ہوں (پھر رضائی سے منہ لپیٹ کر کروٹ لے لیتی ہیں۔)

ریحانہ : امی۔

بیگم : کیا ہے؟ پھر باتیں شروع کر دیں۔

ریحانہ : آج رات سلیم بھائی جا رہے ہیں۔

بیگم : ہاں۔ شام کو رخصت لینے آیا تو تھا۔ بڑا اچھا لڑکا ہے میرے دل سے تو سدا اس کے لئے دعا نکلتی ہے، خدا کرے ہمیشہ خوش رہے۔ خدا کرے اسے اسی کی طرح کوئی قابل خوبصورت بیوی ملے۔

ریحانہ : اور انھوں نے قابل اور خوبصورت بیوی کے بجائے کسی پھوہڑ، بدصورت اور جاہل لڑکی کو پسند کر لیا تو۔

بیگم : خدا نہ کرے۔ وہ کوئی پاگل ہے۔

ریحانہ : تم نے سنا نہیں۔ جج صاحب کا لڑکا تو ولایت پاس کر کے آیا تھا۔ پانسو سات سو روپیہ مہینہ کی آمدنی بھی ہے اس نے تو اپنی نوے شادی کی ہے۔

بیگم : رفو کی عمر کیا ہو گی۔

ریحانہ : میری سی عمر ہوگی اس کی پڑھی لکھی بھی بس یوں ہی سی ہے، قرآن مجید تو اسے تم ہی نے ختم کرایا تھا کچھ یوں ہی سی اردو لکھ پڑھ لیتی ہے اور کیا۔

بیگم : ہاں بیٹی، قسمت کے کھیل ہیں۔

ریحانہ : اور رفو کو تو کوئی کہتا ہے مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔

بیگم : ہاں جج صاحب کے لڑکے کے ساتھ بڑا ظلم ہوا۔ اپنی رفو کو ایسا نہ چاہئے تھا۔ وہ لڑکا اس کا اتنا خیال رکھتا تھا تو اس کی زندگی اس طرح تباہ نہ کرتی تھی۔

ریحانہ : مگر امی اس لڑکے نے تو خود کہا تھا۔

بیگم : اس نے اچھا کیا تھا مگر رفو کا بھی کچھ فرض تھا۔ اسے تو سوچنا چاہئے تھا۔

ریحانہ : (اعصابی تشنج کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، آواز ذرا بلند ہو جاتی ہے) کیا سوچنا چاہئے تھا اسے؟! یہی کہ وہ آرام سے زندگی نہ گزارے۔ وہ عمر بھر تڑپ تڑپ کر بلک بلک کر جان دیتی رہی۔ وہ آزادی کا سانس نہ لے۔ وہ کبھی تازہ ہوا میں سانس نہ لے۔ اس نے بڑا پاپ یہ کیا کہ جج صاحب کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ جیتے جی گھر کی دیواروں میں چنی رہتی تو بڑا ثواب ہوتا۔

بیگم : (حیرت سے) بیٹی۔

ریحانہ : ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!

بیگم : نہیں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس لڑکے کا دھیان بھی کرنا چاہئے تھا۔

ریحانہ : کیا دھیان کرنا چاہئے تھا!

بیگم : رفو ادھیڑ تھی۔ بیمار تھی۔ ان پڑھی تھی۔ اس لڑکے نے اپنی شرافت میں اسے پسند کیا اور اپنا سکھ چین رفو پر قربان کرنے پر راضی ہو گیا۔

ریحانہ : تو اس میں رفو کا کیا قصور ہے؟

بیگم : اس نے اپنی خوشی کے لئے جج صاحب کے لڑکے کی ساری خوشی قربان کر دی نا۔ تو سمجھتی ہے وہ اس کے ساتھ خوش رہ سکے گا۔ وہ اَن پڑھ، بیمار، بوڑھی، بیوی کو گلے باندھ کر کب تک خوش رہے گا؟ رفو کی گردن کا طوق بن جائے گی۔ وہ پاؤں کی

بیڑی بن جائے گی۔ یہ بات ٹھیک ہے نا؟!

ریحانہ : میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

بیگم : اچھا اب بہت باتیں کر چکی۔ اب مجھے سونے دو۔ (پھر رضائی میں منہ لپیٹ کر کروٹ لے لیتی ہے۔ ریحانہ پھر آہستہ آہستہ پلنگ سے اٹھتی ہے اور آئینہ کے سامنے دوبارہ آکر کھڑی ہو جاتی اور دیر تک اسے گھورتی رہتی ہے۔ پیچھے سے اسی کے لہجے میں مگر ذرا بھاری آواز میں کوئی کہتا ہے)

آواز : بوڑھی؟!

(ریحانہ تکلیف سے بے قرار ہو کر اثبات میں سر ہلاتی ہے)

آواز : بیمار؟!

(ریحانہ تکلیف سے بے قرار ہو کر اثبات میں سر ہلاتی ہے)

آواز : وہ دورے جو تمہیں بار بار پڑتے ہیں اور سارے گھر کو پریشان کرتے ہیں۔ یہ تو تمہاری زندگی کے ساتھ ہیں۔

(ریحانہ تکلیف سے بے قرار ہو کر اسی حالت میں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے)

آواز : اَن پڑھ! جاہل؟!

(ریحانہ تکلیف سے بے قرار اسی مبہوت حالت میں گھری رہتی ہے)

آواز : (ذرا بلند ہو جاتی ہے) ایک کمزور لمحے میں اس نے تمہیں بلایا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اپنے بیمار، بدصورت اور ان پڑھ وجود سے اس کی زندگی تباہ کردو۔ تم اسے کیا دے سکوگی؟ اسے اتنی بڑی سزا نہ دو۔ خدارا اس پیار کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ (ریحانہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیتی ہے) تم تو انہی دیواروں میں گھٹ گھٹ کر مر جانے کے لئے پیدا ہوئی ہو۔ تم اب ایک لاش ہو۔ لاشوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زندہ انسانوں کے گلے کا طوق بن جائیں۔

(تھوڑی دیر تک وہ اپنے پلنگ پر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے بیٹھی رہتی ہے۔ سسکی کی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے۔ شاہانہ بیگم اسی طرح بے خبر سو

رہی ہیں۔ پھر ذرا ہمت اور عزم کے ساتھ چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹاتی ہے۔ سفید دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتی ہے۔ تکیئے کے نیچے سے کنجی نکالتی ہے اور ارادہ اور قوت کے ساتھ قدم اٹھاتی ہے۔ اتنے میں گھنٹہ دو بجاتا ہے جس کی جھنجھناہٹ دیر تک قائم رہتی ہے۔

آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکلتی ہے۔ ہر قدم پر پیانو کے مدھم سر پس منظر سے سنائی دیتے ہیں۔ دالان والے دروازے کی بجلی ابھی تک جل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس دروازے تک پہنچتی ہے۔ آنچل سے دوبارہ آنسو خشک کرتی ہے۔ آنگن اور دالان کی طرف نگاہ واپسیں ڈالتیں ہے۔ دروازے سے اندر داخل ہو کر دو قدم آگے بڑھتی ہے، دروازہ بند کرتی ہے اور اس کی کنڈی میں پڑے ہوئے تالے کو اٹھا کر بند کرتی ہے۔ پھر چند لمحے کے لئے اس سے سہارا لے کر روتی رہتی ہے۔ پس منظر میں غمناک موسیقی اور دوکان کے اندر والے کمرے سے آتی ہوئی مدھم روشنی اس منظر کو اور زیادہ ویران اور المناک بنادیتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے پلنگ پر واپس آجاتی ہے۔ پلنگ پر بیٹھتی ہے، اتنے میں شاہانہ بیگم کی آنکھ کھل جاتی ہے)

بیگم : کیا ہے ریحانہ، کیا بات ہے بیٹی!

ریحانہ : (رندھی ہوئی آواز میں) کچھ نہیں امی۔ دروازہ بند کرنے گئی تھی۔ میں نے بند کر دیا دروازہ!!

(دور بگھی کے پہیوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور اسٹیج کی روشنیاں بجھنی شروع ہو جاتی ہیں)

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے اور سارا اسٹیج اندھیرے میں دفن ہو جاتا ہے)

☆☆☆
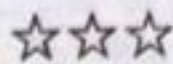
میر تقی میر

[پانچ مناظر میں ایک تمثیل]

یہ تمثیل پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام لکھنؤ میں اسٹیج کی گئی 21؍دسمبر 1957ء میں یہ تمثیل پیش کی گئی۔ اس میں پارٹ کرنے والے اداکاروں کے نام یہ ہیں:

مقام اکبر آباد، دلی اور لکھنؤ زمانہ گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری۔

۱۔میر تقی میر عارف نقوی — میؔر صاحب کی عمر کے مختلف مدارج دکھائے گئے ہیں جن کی تفصیل ہر منظر میں الگ ملے گی۔

۲۔میر تقی میر (نوعمری میں) حسن کمال — عمر 15-12 سال تک۔ قد اور خط و خال میؔر صاحب سے ملتے جلتے ہوں۔

۳۔ماہ طلعت — مس ایم ماتھر — خوبصورت 18-17 سال کی پتلی دبلی لڑکی جو دہلی کی مسلم معاشرت کا نمونہ ہے۔

۴۔احسان اللہ — شارب ردولوی — درویش جن کی عمر 55 سال کے لگ بھگ ہے مگر تقدس کے باوجود بڑھاپے کے آثار نہیں ہیں۔

۵۔امان اللہ — احمد اسامی — عمر 45 سال، کھچڑی داڑھی، میؔر کے چچا اور دوست۔

۶۔محمد حسن — محمد حسین منصوری — میؔر کے بڑے بھائی عمر میں کوئی دس برس بڑے ہیں۔ چہرے سے چالاکی اور دنیاداری ٹپکتی ہے۔

۷۔ ابا جان — شوکت عمر — عمر کے آخری حصے میں ہیں عمر 65 سال سے کچھ زائد ہے۔

۸۔ خان آرزو — عقیل ہاشمی — عمر 45 سال کے لگ بھگ ہوگی چہرے سے عالمانہ وقار ٹپکتا ہے، جسم بھاری بھرکم ہے، قد متوسط اور چہرہ گول، داڑھی بھری ہوئی۔

۹۔ سودا — کمال فاطمی — قد متوسط، عمر 25-20 کے لگ بھگ، چھوٹی سی داڑھی، زندہ دل۔

۱۰۔ شاہ صاحب — عارف فتح پوری — 50 کے قریب عمر ہے۔ نورانی چہرہ اور داڑھی

۱۱۔ شیخ صاحب — اقبال عمر انصاری — ان کی عمر بھی کوئی 30 برس کے قریب ہے۔ سودا سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ مونچھیں بڑی بڑی ہیں۔

۱۲۔ احسن — بادشاہ حسین علوی — احسن کی عمر 28 برس کی ہوگی مگر قد و قامت کے اعتبار سے بہت تندرست معلوم ہوتے ہیں۔

۱۳۔ آصف الدولہ — سفیان علوی — آصف الدولہ کی عمر 45-40 ہے بہت بارعب شخصیت ہے۔ لمبے گل مچھے ہیں غلافی آنکھیں اور لمبا قد۔

۱۴۔ سالار جنگ — محمد نسیم — سالار جنگ عمر میں آصف الدولہ سے کچھ بڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر صرف مونچھیں ہیں قد و قامت سے بارعب ہیں۔

۱۵۔ میر سوز — کیف لکھنوی — عمر میں میر سے زیادہ ہیں، قد متوسط۔ رنگ سانولا۔

۱۶۔ مرزا — اشہد رضوی — لکھنؤ کے بانکوں کی طرح ان کے پٹے بھی ہیں اور گل مچھے بھی۔ عمر 35 سال ہے۔

۱۷۔ غفر غینی — رفیع اللہ — عمر 50 سے متجاوز مگر دل جوان ہے، لباس کے اعتبار سے دہلوی اور شوقین دونوں معلوم ہوتے ہیں۔

۱۸۔ تین مرغ باز — اے کے فریدی، اے وی پاشا، اے اے تلہری — مرغ بازوں کے بارے میں پروڈیوسر کو مکمل اختیار ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس دور کے مروجہ لباس اور آداب کا خیال رکھا جائے مثلاً سب کے مونچھیں ہیں اور مختلف قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔

۱۹۔ نقیب — نریش کمار

۲۰۔ہدایت کار — آغا سہیل

۲۱۔موسیقی — جام لکھنوی

۲۲۔اسٹیج ڈائرکشن — سنت رام اور عارف نقوی

نوٹ: اس ڈرامے میں بعض ضعیف ادبی روایتوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ عام طور پر ''آب حیات'' اور ''تذکرۂ خوش معرکہ زیبا'' کی روایات کو استعمال کیا گیا ہے۔ حلیے اور لباس کے سلسلے میں ''آب حیات'' ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' دیکھنا چاہیے۔ اسی لئے طوالت کے خیال سے لباس اور دیوان خانوں کی آرائش کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں۔

پہلا منظر

[درویش کی رہائش گاہ۔ ایک غار جس میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ مشعلیں جل رہی ہیں جن سے چند حصے روشن ہو گئے ہیں۔ زمین پر چٹائی بچھی ہوئی ہے۔ ان میں نہ کوئی روشن دان ہے نہ روزن۔ ایک طرف قد آدم آئینہ رکھا ہوا ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پر ہلکی روشنی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ درویش قد آدم آئینے کے سامنے ٹہلتا ہے۔ چہرے پر خشونت اور گہری فکر کے نشانات ہیں، خرقہ سیاہ ہے، گلے میں تسبیح ہے، سیاہ داڑھی ہے، خوبرو نوجوان درویش ہے، سیاہ تہمد پہنے ہوئے ہے، ٹہلتے ٹہلتے ایک دم قد آدم آئینے کے سامنے رک جاتا ہے اور زیر لب اور اس کے بعد زور زور سے اپنا نام دہراتا ہے]

درویش : احسان اللہ! احسان اللہ!! (پتھر اٹھا کر قدم آدم آئینے پر دے مارتا ہے۔ آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے اور زور زور سے احسان اللہ کا نام لے کر پکارنے کی آوازیں آتی ہیں)

درویش : سنتے نہیں ہو، احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔ احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔

آواز : احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ تو ہے۔

درویش : امان اللہ کے لئے کس کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ آجاؤ۔ آکر دیکھ لو احسان اللہ یہاں نہیں ہے۔

(دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کے درویش صفت بزرگ داخل ہوتے ہیں جو زعفرانی رنگ کے کرتے اور تہمد میں ملبوس ہیں، وضع بڑی بانکی ہے۔ آنکھوں میں بڑی دلکشی اور جاذبیت ہے۔ ان کے ساتھ 14-13 برس کا ایک نوعمر اور خوب رولڑکا بھی داخل ہوتا ہے جو درویش کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ انگرکھے اور ٹوپی میں ملبوس ہے۔ درویش ان دونوں کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہے، بے خبر آئینہ کے ٹکڑوں کے ڈھیر کے پاس)

امان اللہ : السلام علیکم۔

احسان اللہ: احسان اللہ موجود نہیں ہے۔ ہم نے اسے مار ڈالا (آئینے کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے) وجود سب سے بڑا فریب ہے۔ ہم نے اس وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔ اب اس کا کوئی نام نہیں۔ کوئی نفس نہیں (پھر ٹہلتا ہوا اسٹیج کو پار کرتا ہے) آدم زاد کی صحبت کا یارا نہیں۔ مخلوق پر اپنا دروازہ بند کر دیا ہے اور بازی گاہ عالم کی سیر کے لئے دل کی آنکھیں کھولی ہیں۔

امان اللہ : خاکسار کو بھی مدت سے درویشوں کی صحبت سے فیض اٹھانے کا اشتیاق ہے، اور تصوف سے دل بستگی ہے، جب سے میر علی متقی کی نظر حقیقت اثر دل پر پڑی ہے اس وقت سے یہی دھن سمائی ہے کہ فقیروں کی خاک پا بنوں کہ درویشوں کی ایک نظر خاک کو کیمیا بنا دیتی ہے۔

احسان اللہ: اے یار عزیز! وہ یکتا پیر ہن معشوق ہزار لباس بدلتا ہے اور لاکھوں جلووں میں جھلک دکھلاتا ہے۔ کبھی گل ہے، کبھی رنگ کبھی لال ہے تو کبھی سنگ۔ کچھ لوگوں کو پھول پسند آجاتا ہے، کچھ کو پتھر بھاتا ہے اور اس کی عبادت کرنے لگتے ہیں، ایسی نظر

چاہئے جو اس کے سوا نہ پھول دیکھے نہ پتھر۔ جو محراب میں اس کے ابرو کو دیکھے اور میخانے میں اس کی آنکھ کی مستی کو تلاش کرے۔ اپنی ہستی کو مٹا دے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی ہستی نہیں ہے۔ اپنے وجود کو نیست و نابود کر دے کہ اس کے سوا ہر وجود باطل ہے۔

امان اللہ : اپنی خاطر بیقرار کو بھی انہی باتوں میں قرار ملتا ہے۔

احسان اللہ: بے قراری اس محبوب کا عطیہ خاص ہے کہ وہ محبوب محبت دوست ہے کبھی بے پرواہی سے اپنے دیوانوں پر نظر کرتا ہے کبھی تغافل سے دل کو خون کرتا ہے، کبھی توجہ اور التفات سے بے قرار کرتا ہے، انقباض اور انبساط اس سے عبارت ہے۔

امان اللہ : یہ عزیز جو میرے ہمراہ ہے میرے مرشد میر علی متقی کا لڑکا ہے اس بچے پر بھی ایک نظر حقیقت اثر ہو جائے کہ صفائے قلب ہو اور یہ مٹی کے ذرے بھی آفتاب کی روشنی سے جگمگا اٹھیں۔

احسان اللہ: (ایک نظر میر صاحب کی طرف ڈالتے ہیں پھر برابر سے آئینہ کا ٹکڑا اٹھا کر اسے پلٹ کر دیکھتے ہیں اور میر صاحب کی طرف بڑھا دیتے ہیں) آئینہ وہ اچھا ہے جو ٹوٹا ہوا ہو کہ جس میں بال نہیں۔ وہ بے بال و پر ہے، لڑکا سوزہ بال ہے اگر تربیت پائے گا تو ایک پرواز میں آسمان تک جا پہنچے گا۔ عزیز من۔ درد بڑی دولت ہے۔ اپنے کو کسی کے حوالے کر دے۔ سارا عالم آئینہ خانہ ہے کہ اس آئینہ ہی میں اپنی صورت پہچان سکتا ہے۔ کسی میں محو ہو جا کہ ایسے گل کا شیدائی بنے جس کے لئے کبھی خزاں نہیں ہے، عشق بڑی نعمت ہے۔ اس آگ سے جو دل سوز نہیں وہاں اندھیرا ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کی کرامات ہے، آگ اس کا سوز ہے ___ پانی اس کی رفتار ہے، خاک اس کا قرار ہے، ہوا اس کا اضطراب ہے، موت عشق کی مستی ہے، حیات اس کی ہوشیاری ہے۔

امان اللہ : تو پھر یہ عالم رنگ و بو کیا ہے۔ یہ زمان و مکان کا سراب کیا ہے؟

احسان اللہ: آئینہ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے کر کائنات کی سیر کو نکلا ہے۔ عقل کی ڈور لے کر یوسف

جمال کی خریداری کا ارمان ہے۔ عقل سے اوپر اٹھ شعور اور خودی سے بلند ہو کر دیکھ۔ زمانے کے پردے سرکتے جائیں گے (بے قرار ہو کر ٹہلنے لگتے ہیں میر تک پہنچتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں) زمانے کی طنابیں کھینچ دو۔

امان اللہ : میں کچھ نہیں سمجھا پیر و مرشد۔

احسان اللہ: شطرنج کی بساط پر دہلی تاراج ہو گئی۔ احمد شاہ کی فوجیں آئیں "زر۔ زر" چلاتی گزر گئیں۔ مرہٹے اور جاٹ۔ اودھ کے سردار۔ روہیلے (وحشتناک آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہوئے) روہیلوں نے تمہارے تیموری شہنشاہ کی آنکھیں خنجر کی نوک سے نکال لی ہیں۔ خانقاہیں ویران۔ محل سنسان، شہنشاہ بے تاج۔

امان اللہ : (ڈر کر) الامان والحفیظ۔

احسان اللہ: اور یہ بچہ (پیار سے دوبارہ میر کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں) ہاں اس بچے کے نام کا سکہ چلے گا اس کے سر پر غریبی کی خاک ہو گی۔

امان اللہ : رحم، پیر و مرشد!

احسان اللہ: اس کے سینے میں وہ بیش بہا دولت ہو گی جسے ٹوٹا ہوا دل کہتے ہیں۔

امان اللہ : اس کے حق میں دعائے خیر فرمائیے۔

احسان اللہ: اس کے دل میں زخموں کا گل کدہ کھلا ہوا ہو گا اور ہونٹوں پر وہ نغمے ہوں گے جو آگ کو فردوس بنا سکیں۔ اس دکھوں کے پالے ہوئے شہنشاہ کے سر پر تمہیں تاج دکھائی نہیں دیتا؟! کیا عمر بھر کی بے قراری کا اتنا بڑا انعام کافی نہیں ہے۔

امان اللہ : حضور۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔

احسان اللہ: بس اب خاموش ہو جاؤ۔

(پس منظر سے اذان کی آواز ابھرتی ہے، خاموشی اور ادب کے ساتھ احسان اللہ دروازے کی مخالف سمت بڑھتے ہیں۔ پھر یکایک اسٹیج کے دائیں طرف پہنچ کر پلٹتے ہیں، آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتے ہیں)

احسان اللہ: وہ بلا رہا ہے (اور چلے جاتے ہیں)

میر : میں جانتا تھا۔ عمو جان۔

امان اللہ : نہیں۔ تقی۔ درویشوں کی باتیں تم نہیں جانتے۔ نہ جانے کیا کہتے ہیں اور اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

میر : نہیں عمو جان، جب ان بزرگ نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا تو میں اپنی آنکھوں کے سامنے دہلی کو تاراج ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کو لشکر کے ایک ایک خیمے میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے کو سراسیمہ اور پریشان ہو کر نگر نگر مارے مارے پھرتے دیکھا ہے۔ یہ سب جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

امان اللہ : (تسلی دلانے کے انداز میں) نہیں، جی اتنا چھوٹا نہ کرو۔ ابھی تم ان باتوں کو نہ سمجھ سکو گے۔

میر : مگر اور ہے بھی کیا اس زندگی میں؟ سوتیلے بھائی کا بس چلے تو آج میرا گلا گھونٹ دے۔ عمو جان۔ آپ نہ ہوتے تو میں سچ سچ کب کا یہاں سے جدھر منہ اٹھتا نکل جاتا۔

امان اللہ : بھیا جی کی باتیں نہ کرو۔ ان کا برتاؤ برا ہے مگر وہ آدمی برا نہیں ہے۔

میر : ابا جان بھی یہی کہتے ہیں مگر میرا دل خون ہو رہا ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

امان اللہ : تم بہت حساس ہو!

میر : میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ابا جان نے اگر دوسری شادی نہ کی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ وہ درویش ہیں اس دنیاداری کے دھندے میں نہ پھنستے۔

امان اللہ : ہاں، ان کی نگاہِ کرم کے صدقے میں، میں تو اس الجھاوے سے بچ گیا۔

میر : اور میں بھائی صاحب کی مہربانیوں کا شکار ہونے کے لئے رہ گیا۔ خدا کی قسم عمو جان، وہ مجھے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے۔

امان اللہ : مجھے سب کچھ معلوم ہے بیٹے۔ اس نے تمہیں ماہ طلعت سے ملنے کو منع کر دیا ہے۔ ماہ طلعت کو بہت چاہتے ہو تم؟

میر : آپ سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ عمو جان ہم دونوں بچپن سے ساتھ کھیلے کودے، ساتھ ہی پلے بڑھے۔

امان اللہ : میرے بیٹے۔ یہ سودا بہت مہنگا ہے۔ کیا تم اپنے خون کے ایک ایک قطرے سے اس کا سوال کر سکتے ہو۔ کیا تم اپنی آنکھوں کی بینائی دے کر اپنی زندگی کا سکھ چین دے کر، راتوں کی نیندوں کا آرام کے ایک ایک لمحے سے اس کا سودا کرنے کو تیار ہو۔ بولو۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ منظور ہے بولو۔ جواب کیوں نہیں دیتے۔ اچھا میری طرف دیکھو۔ میں تمہاری آنکھوں میں اس کا جواب پڑھ لوں گا۔

(یکا یک میر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ امان اللہ کی گود میں سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگتے ہیں۔ امان اللہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں)

امان اللہ : زندگی میں ایسے ہی کسی جنون کی ضرورت ہوتی ہے لختِ جگر۔ ایسا ہی کوئی جنون جس پر آرام، چین، سکھ، نیند سب کچھ وار دیا جائے۔ عشق اصل حیات ہے اس کے بغیر زندگی ایسا فانوس ہے جس میں نور اور روشنی نہ ہو۔ عشق حاصل کرو مگر ہوس سے بچو۔ عشق کے سہارے سے خدا تک پہنچو۔ عشق ترکِ ذات کے بغیر اس محبوب تک رسائی نہیں۔ ہوس شادکامی کی غلامی ہے اور عشق ایثار اور قربانی کا نام ہے۔

میر : (روتے ہوئے) عمو جان! ایسی زندگی گزارنے کو کہاں سے جگر لاؤں۔

(درویش احسان اللہ دائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں)

احسان اللہ: آپ لوگ کس کے انتظار میں؟

امان اللہ : ہم لوگ تو احسان اللہ صاحب ہی سے ملنے آئے تھے۔

احسان اللہ: فضول وقت برباد کرنا گناہ ہے، احسان اللہ یہاں نہیں ہے۔ جائیے۔ اس کے انتظار سے کچھ حاصل نہیں۔

امان اللہ : اچھا۔ اجازت دیجئے۔ خدا حافظ۔

(امان اللہ جھک کر آداب بجالاتے ہیں، درویش کمال بے تعلقی سے کھڑا رہتا ہے، اسٹیج کی روشنیاں آہستہ آہستہ بجھنے لگتی ہیں یکا یک درویش میر صاحب کو جاتے جاتے روک لیتے ہیں۔)

احسان اللہ: بیٹے، دو باتوں کا عہد کرو۔ تمہارے لیے دو بستیاں ہیں۔ اکبر آباد اور جہاں آباد۔

ان بستیوں کو چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ اور تاجداروں کے سامنے سر نہ جھکانا۔ لوہے کی زنجیریں پہن لینا مگر سونے کی زنجیریں نہ پہننا۔ ان باتوں کو نہ مانوگے تو ہمیشہ سرگرداں اور حیراں رہوگے — خدا حافظ

میر : میں عہد کرتا ہوں۔

(احسان اللہ چلے جاتے ہیں۔ ان کی پرچھائیں اسٹیج کے دائیں طرف دکھائی دیتی ہے، اسٹیج پر اندھیرا چھاتا ہے اور پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا منظر

[دوسرے منظر کا زمانہ پہلے منظر سے کئی سال بعد کا ہے۔ اس کا احساس میر کی عمر اور ان کے میک اپ سے ہونا چاہیے۔ ہلکی ہلکی مونچھیں نکل آئی ہیں، داڑھی کے بھی چند بال موجود ہیں۔ دوسرا منظر دیوان خانے میں ہے، اس دیوان خانے کے دو دروازے ہیں۔ ایک اسٹیج کے باہر جاتا ہے اور دوسرا ایک کمرے میں کھلتا ہے۔ اس وقت یہ دروازہ بند ہے اور دروازے کے آگے پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اس منظر کے دوسرے حصے میں جب دروازہ کھلتا ہے تو پردہ ہٹانے کے بعد اس کمرے کی اندرونی حالت بھی دکھائی دیتی ہے۔ دیوان خانے میں امارت کے نشان دکھائی نہیں دیتے، ہاں، یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ دیوان خانہ خوب آراستہ و پیراستہ رہا ہوگا۔ اندر کمرے میں ایک پرانا مگر قیمتی فانوس لٹک رہا ہے۔

اسٹیج کے پہلے حصے میں ایک چھوٹے سے تخت پر قالین بچھا ہوا ہے۔ میر صاحب سادہ لباس پہنے ہوئے تخت پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ سر پر مندیل، سر پر پٹے ہیں، کرتہ اور برکا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ جب پردہ اٹھتا ہے اس وقت اسٹیج پر اندھیرا ہے۔ میر صاحب ایک شمع جلاتے ہیں پھر دوسری پھر تیسری پھر چوتھی حتی کہ

شمعوں کی قطار سے کافی روشنی ہو جاتی ہے، پھر شعر گنگناتے ہیں۔

بیا کہ عمر عزیزم بہ جستجوئے تو رفت

زدل نہ رفتی و جانم ز آرزوئے تو رفت

ماہ طلعت : (بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے) اوئی اللہ۔ میں تو ڈر گئی تھی۔

میر : تو آخر کار تم آ ہی گئیں۔

ماہ طلعت : کیوں میرا آنا برا لگا ہو تو چلی جاؤں۔ میں تو پھوپھا جان کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔

میر : ہاں ہاں، ماہ طلعت۔ واپس لوٹ سکو تو لوٹ جاؤ۔

ماہ طلعت : کیا ہو گیا ہے تمہیں؟!

میر : کل کون سا دن تھا۔ کچھ یاد ہے تمہیں؟

ماہ طلعت : ہاں میری سالگرہ کا دن تھا۔ اللہ تمہاری کتنی راہ دیکھی۔ امی نے نہ نہ جانے کتنی بار پوچھا۔ مگر نہ آنا تھا نہ آئے اور الٹے مجھی سے شکوے ہو رہے ہیں خدا کی قدرت!

میر : تم ہر سال خود مجھے بلانے آیا کرتی تھیں۔

ماہ طلعت : لیکن اب میں کیسے آسکتی تھی۔ وہ لڑکپن کی باتیں تھیں۔ اب میں بلانے آتی تو دنیا کیا کہتی۔

میر : میں نے ساری رات تمہاری حویلی کے سامنے کاٹی ہے کہ شاید تم مجھے بلانے آؤ۔ رات بھر میں اس برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑا تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں جہاں کبھی ہم نے پہلی بار مٹی کا گھروندا بنایا تھا۔ تمام رات میں تمہاری راہ دیکھا کیا ہوں۔

ماہ طلعت : ہائے اللہ۔ رات کس قدر ٹھنڈی تھی۔ تم اس ٹھنڈ میں باہر (جملہ نا تمام چھوڑ کر) جھوٹے کہیں کے۔ باہر رہتے تو بیمار پڑ گئے ہوتے۔ مجھے ڈرانے کو ایسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تمہاری ساری ترکیبیں خوب سمجھتی ہوں۔

میر : (بایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) یہ دیکھو۔ اس ہاتھ کے زخم کو دیکھتی ہو۔

ماہ طلعت : (گھبرا کر ہاتھ تھام لیتی ہے) ہائے، کیا ہوا تمہارے ہاتھ میں۔

میر : کچھ نہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں یہ زخم چاقو سے لگایا تھا کہ اس کی تکلیف سے رات

پھر نیند نہ آئے۔ شاید تم آواز دیتیں اور میں اس وقت بیدار نہ ہوتا۔

ماہ طلعت : (دوپٹہ پھاڑ کر پٹی باندھتے ہوئے) یہ سب کیا کرتے ہو۔ کیا فرہاد اور مجنوں کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اوسان کھو بیٹھے ہو! کیا ہو گیا تمہیں؟!

میر : تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں!

ماہ طلعت : تمہیں میری قسم اپنے کو اس طرح تکلیف نہ پہنچاؤ۔

میر : چچا امان اللہ کا انتقال ہوئے آج زمانہ گزر گیا۔ ایک بار چچا جان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔

ماہ طلعت : پھر تم نے کیا کہا تھا؟

میر : انھوں نے پوچھا تھا "کیا تم خون کے ایک ایک قطرے کو اس کے لئے وقف کر سکتے ہو؟ کیا آنکھوں کی بینائی، زندگی کے سکھ چین، رات کی نیند اور دن بھر کے آرام کے بدلے میں اس کی محبت کا سودا کرو گے؟"

ماہ طلعت : پھر؟

میر : میں نے ان سے عہد کیا تھا۔

ماہ طلعت : اس کا انجام سوچا ہے؟

میر : (ایک شمع کو پھونک مار کر بجھا دیتے ہیں) نہیں۔ ایک دل میں دو خیال نہیں رہ سکتے۔ اگر میرے سارے خواب جھوٹے نکلے تو میں چچا جان کا دامن پکڑوں گا۔ اس سے جواب طلب کروں گا کہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی ایک پر جان نچھاور کر دو پھر اس کے سوا اور کس آستانے پر جاؤں۔ اس کے بغیر کیونکر زندہ رہوں۔ (بند دروازہ کھلتا ہے اور میر کے سوتیلے بھائی محمد حسن داخل ہوتے ہیں، چہرے سے غصہ ٹپک رہا ہے)

محمد حسن : بہت خوب۔ صلاح مشورے کے لئے اچھا وقت نکالا ہے؟

میر : بھائی جان!!

محمد حسن : ماہ طلعت! تم تو پھوپھی جان کے لئے پان لینے گئی تھیں!

(ماہ طلعت روتی ہوئی دوپٹے سے منہ چھپا کر دروازے سے باہر چلی جاتی ہے)

میر : آپ اسے کچھ نہ کہیں بھائی جان۔

محمد حسن : خبر دار مجھے اب سے بھائی جان نہ کہنا۔ تمہیں معلوم ہے ابا جان بیمار ہیں، وہ اب چند لمحوں کے مہمان ہیں۔

میر : ان کی حالت اتنی خراب تو نہ تھی۔

محمد حسن : مگر اب اسی قدر خراب ہے۔ مگر تمہیں کیا۔ تم شیریں فرہاد بنو۔ رنگ رلیوں سے تمہیں فرصت ملے تب تو۔ خیر میرے رنگیلے بھائی تمہیں جلد ہی اس کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

میر : جی؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

محمد حسن : سمجھ جاؤ گے، مگر سیدھی طرح نہیں سمجھو گے۔ میں بھی انسان ہوں میرے سینے میں بھی دل ہے۔ ماہ طلعت میرے دل کی ملکہ ہے۔ تمہاری نگاہیں اس کی طرف اٹھیں گی تو میں آنکھیں نکال لوں گا۔ تمہیں اکبر آباد چھوڑنا پڑے گا۔ میرے راستے میں آؤ گے تو برباد ہو جاؤ گے۔

میر : (افسوس اور حیرت کے ساتھ دہراتے ہیں) اکبر آباد چھوڑنا پڑے گا!

محمد حسن : چلو۔ ابا جان تمہیں یاد کر رہے ہیں۔

(اسٹیج کے وسط کا بند دروازہ کھلتا ہے، پردے اٹھا دیئے جاتے ہیں، ایک لمحے کے لئے اسٹیج کی روشنیاں گل ہوتی ہیں اور اس اثناء میں درمیانی پردے اٹھ جاتے ہیں اب اس کمرے میں ایک مریض کا پلنگ، ایک پرانا فانوس جس میں چند شمعیں اب بھی روشن ہیں اور دو تین چوکیاں اور ایک تخت نظر آتا ہے۔ چوکیوں پر دونوں بھائی خاموشی اور ادب سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔)

محمد حسن : ابا جان! تقی آ گیا ہے۔

ابا جان : (بے ہوشی کی حالت سے چونکتے ہوئے آنکھیں کھولتے) الحمد للہ۔ اب سفر ختم ہونے والا ہے۔ فقیر چند گھڑیوں کا مہماں ہے۔ چاہتا ہوں اپنی ساری ملکیت اسی وقت تقسیم کر دوں۔

محمد حسن : ملکیت؟

ابا جان : ہاں فقیر کی ملکیت میں تین سو کتابیں ہیں، اس وراثت کو بہت سمجھنا۔اس میں سے ڈیڑھ سو جلدیں تقی کی ہیں اور ڈیڑھ سو تمہارے لئے ہیں۔

محمد حسن : (غصے سے میر صاحب کو دیکھتا ہے پھر ابا جان سے مخاطب ہوتا ہے) مگر ابا جان میں طالب علم ہوں پڑھنے لکھنے کا شغف ہے۔تقی کو کتابوں سے کوئی ربط نہیں۔اگر یہ تین سو جلدیں مجھے مرحمت ہوں تو میرے کام آئیں گی۔تقی کو ان کی ضرورت نہیں ہے ویسے آپ مختار ہیں۔آپ جیسا خیال فرمائیں مجھے حکم بجا آوری سے انکار نہ ہوگا۔

میر : ابا جان! اگر بھائی جان کو ضرورت ہے تو انھیں کو دے دیجئے۔

ابا جان : میرے بیٹے۔میرے پاس آ بیٹھ (میر پلنگ پر باپ کے پاس جا بیٹھتے ہیں۔ابا جان ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں) تو نے میری درویشی کی آبرو رکھ لی۔خدا تجھے تا دیر سلامت رکھے۔یہی درویشی ہے تقی۔اپنے آپ کو دوسروں کے لئے قربان کر دینا یہی ترک دنیا ہے، یہی ترک ذات ہے، اس سبق کو کبھی نہ بھولنا۔محمد حسن میری ساری کتابیں تم لے لو۔تم اپنے چھوٹے بھائی کو وراثت سے محروم کر کے یہ نہ سمجھنا کہ وہ تمہارے آسرے کے بغیر زندہ نہ رہ سکے گا خدا نے چاہا تو وہ کبھی تمہارا دست نگر نہ ہوگا۔کبھی تمہارا احتاج نہ رہے گا۔بیٹے!

میر : ابا جان۔

ابا جان : حق تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے۔بیٹے کچھ دکانداروں کا تین سو روپیہ میرے اوپر قرض ہے اسے تمہارے ذمے میں چھوڑتا ہوں۔جب تک قرضہ ادا نہ کرو میرا جنازہ مت اٹھانا۔

میر : مگر ابا جان۔ان چند کتابوں کے سوا اور گھر میں تھا ہی کیا اور وہ سب اثاثہ آپ نے بھائی جان کو بخش دیا۔میں کیونکر قرض ادا کر سکوں گا۔

ابا جان : خدا کریم ہے۔دل چھوٹا نہ کرو۔ہنڈی راہ میں ہے۔کوئی بندۂ خدا تمہارے ہاتھ میں روپیہ لا کر دے گا مگر میرے پاس فرصت کم ہے۔خدا تجھے سرفراز کرے میرے

بیٹے۔ خدا کو یاد رکھنا — اللہ بس باقی ہوس۔ اللہ اللہ (پھر میر صاحب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، لیکن ہاتھ میر صاحب تک پہنچنے سے پہلے ہی بے جان ہو کر گر جاتا ہے۔ اسٹیج کی روشنیاں بجھنی شروع ہوتی ہے۔ پس منظر سے غم ناک موسیقی ابھرتی ہے اور اسٹیج پر آڑے ترچھے سایوں اور پرچھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ تھوڑی دیر یہ کیفیت قائم رہتی ہے۔)

(دروازے سے باہر آ کر میر صاحب اسٹیج کے وسط میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دروازے کا پردہ گر جاتا ہے۔ اسٹیج پر اور کوئی نہیں ہے۔ میر صاحب کچھ دیر افسردہ اور غور و فکر میں ڈوبے ہوئے کھڑے رہتے ہیں پھر اپنے آپ سے کہتے ہیں)

میر : ماہ طلعت کو چھوڑنا ہوگا!؟ کیونکر چھوڑ سکوں گا؟ اکبر آباد چھوڑنا ہوگا؟! نہیں! مجھ سے یہ سب نہیں چھوٹ سکیں گے۔ میں اپنے دل کو پتھر کیسے کرلوں! میں بھی انسان ہوں۔ میں بھی جینے کا حق رکھتا ہوں۔ خوش ہونے کا حق رکھتا ہوں۔ (پھر حسرت سے اسٹیج پر چاروں طرف دیکھتے ہیں) کیا ایثار کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ خدایا! میں کس طرح اپنے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں، کس طرح اسے دوسروں کے لئے قربان کردوں!!

(اسٹیج کی روشنیاں گل ہو جاتی ہیں، پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

[دہلی — اس سین پر پردہ اٹھنے سے پہلے میرؔ کی مثنوی کے یہ اشعار پس منظر سے گائے جائیں۔ (ایکتارے کی موسیقی کے ساتھ۔)

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — درو بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشک حسرت ہوا　　　جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
کھنچا ساری رہ دامن چاک دل　　　رہا برقفا روئے غمناک دل
پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت　　　بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

(پردہ اٹھتا ہے۔ خان آرزو کے دیوان خانے کا منظر پیش نظر ہے۔ محفل شعروسخن گرم ہے۔ بیچ بیچ میں لطائف بھی ہوتے جاتے ہیں۔ چھ شعرا جمع ہیں۔ ان شعرا کے انتخاب میں تاریخ ادب سے انحراف کیا گیا ہے اور ڈرامائی ضرورت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس لئے محققین سے معذرت طلب ہوں)

خان آرزو : لڑکا ہونہار ضرور ہے مگر دل گرفتہ رہتا ہے، فکر سخن میں توجہ کرے تو عجب نہیں شیریں کلام ہو۔

احسن : قبلہ۔ آپ کی نسبت ہی شیریں کلامی کے لئے بہت ہے، میں تو کہتا ہوں خان آرزو کو زباں دانی پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے، جو کہ ارسطو کو فسلفہ، منطق پر ہے۔

شیخ صاحب: اس میں کیا شک ہے۔ استاد کی استادی مسلم .....

خان آرزو : شاہ صاحب۔ آپ مجھے استاد کہہ کر شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، بزرگ ہیں۔ آپ کلام مجھے دکھالیتے ہیں تو یہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ آپ میرے بزرگ اور کرم فرما ہیں۔ میں آپ حضرات کے سامنے استادی کا دعویٰ کس زبان سے کرسکتا ہوں۔

شاہ صاحب: نہیں۔ میاں آرزو۔ زباں دانی اور شعرفہمی خداداد ہے۔ اس میں خوردی بزرگی کیا۔ عین ممکن ہے کہ تمہارا نوعمر بھانجہ پرانے استادوں سے بہتر شعر نکال لے۔

آرزو : میرے برادر نسبتی کی نشانی ہے۔ وہ مرحوم بھی درویش صفت صوفی منش تھے۔ یہ انھیں کا فیضان ہے کہ لڑکے کو دل دردمند اور طبع موزوں ملی ہے۔ افسوس کہ بھائیوں کی ناچاقی اور اکبرآباد کی صحبت نے اسے غریب الوطن کر دیا۔ خدا بہتر کرے (تھوڑی دیر خاموشی) کیوں میاں مرزا رفیع تمہارے شیخ صاحب کا کیا حال ہے؟

سودا : کچھ نہ پوچھئے پیرومرشد۔ شیخ علی حزیں سے پرسوں ایک صحبت میں ملاقات ہوگئی تھی۔ فرمایا "کچھ اپنا کلام سناؤ" میں نے وہ شعر عرض کیا۔[1]

ا۔ اس روایت کی صداقت مشتبہ ہے، یہاں اس کی صداقت سے بحث نہیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے کہا ''تڑپھے چہ معنی دارد؟'' میں نے عرض کی ''اہل ہند طپیدن را تڑپھنا می گویند'' بس پیرو مرشد نہ پوچھئے کیا حالت طاری ہوگئی۔ بار بار شعر پڑھواتے تھے اور جھومتے تھے۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''مرزا رفیع قیامت کردی۔ یک مرغ قبلہ نما باقی بود آں را ہم نگذاشتی'' یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس زور سے بغل گیر ہوئے کہ ابھی تک بخدا پسلیاں دکھ رہی ہیں۔

احسن : مگر ہم نے کچھ اور سنا۔

خان آرزو : آپ کی روایت بھی سنیں۔

شیخ صاحب: نا پیرو مرشد۔ جب تک مرزا رفیع اس کا وعدہ نہ کریں کہ میری ہجو نہ لکھیں گے اس وقت تک میں زبان نہ کھولوں گا۔

سودا : میری ہجو سے آپ اس قدر خائف ہیں تو چلئے وعدہ کرتا ہوں۔

خان آرزو : ہاں میاں سناؤ۔

شاہ صاحب: میں نے تو یہ سنا ہے کہ شعر سننے کے بعد شیخ علی حزیں دیر تک سوچتے رہے پھر برا سا منہ بنا کر بولے:

در پوچ گویان ہند بدنیستی

سودا : واللہ بالکل غلط ہے، سرتا پا لغو — (باقی لوگ ہنستے ہیں)

خان آرزو : یوں شیخ علی سے تو یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب: میاں جو شیخ سراج الدین علی خاں کے آگے چراغ جلانے کا مدعی ہو اس کے بارے میں کچھ کہنا بیکار ہے۔

خان آرزو : خیر، یہ مذکور موقوف ہو۔ میاں سودا کوئی تازہ ریختہ سناؤ کہ طبیعت کو فرحت ہو۔

سودا : غزل کیا۔ حکم ہو تو حاصل غزل ایک شعر عرض کر دوں۔

خان آرزو : ہاں ہاں ضرور سناؤ۔

سودا : پیرومرشد آپ لوگ تو اس دشت کے سیاح ہیں۔ میں نے بھی تھوڑا بہت خونِ جگر صرف کیا ہے لیکن ریختے میں جس ڈھب کا یہ شعر بن پڑا ہے اس طرح کی بہت کم بیتیں میری نظر سے گزری ہیں۔

شاہ صاحب: آپ اشتیاق اور زیادہ کر رہے ہیں۔

سودا : میں تو پوری غزل سناتا لیکن ایک تو یہ شعر حاصل غزل ہے۔ دوسرے خواجہ صاحب کے ہاں مراختے میں غزل پڑھنا ہے۔ پہلے پڑھوں گا تو غزل باسی ہو جائے گی۔

شاہ صاحب: میاں وہ شعر تازہ تو پڑھو۔

سودا : جی، ملاحظہ ہو:

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا[1]
صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا

(سب لوگ داد دیتے ہیں)

آرزو : خوب۔ مرزا رفیع، بہت خوب۔

شیخ صاحب: مگر پیرومرشد اس میں بھی کہیں حدیث قدسی والی بات تو نہیں آ گئی ہے۔

آرزو : نہیں بھئی۔

شاہ صاحب: کیوں شیخ صاحب، یہ حدیث قدسی والی روایت کیا ہے؟

شیخ صاحب: پچھلی بار مشاعرہ کی صحبت میں مرزا رفیع نے وہ شعر پڑھا تھا۔

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

پیرومرشد نے برجستہ کہا۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے چاہئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

خان آرزو : ہاں بھئی قدسی کے مطلع کا مرزا رفیع نے ترجمہ کر دیا تھا اس کا مطلع ہے:

۱۔ یہ روایت ادبی تحقیق کی رو سے غالباً مستند نہیں۔ یہاں یہ واقعہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کی روایت پر نقل کیا گیا ہے۔

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را

اختر ز فلک می نگر و روئے زمیں را

سودا : مگر پیرومرشد کیا فارسی کے شعر کا اس قدر بے ساختہ پن سے ریختے میں ترجمہ کرنا قابلِ داد نہیں۔ یہ بھی تو ہنر ہے۔

خان آرزو : کیوں نہیں۔

شیخ صاحب: صاحبو۔ خواجہ صاحب کے مشاعرے کا وقت ہو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اب رخصت ہوا جائے۔

سودا : رخصت ہونے کا کیا موقعہ ہے۔ کیا خانِ آرزو خود مشاعرے میں نہ چلیں گے۔

خان آرزو : نہیں میاں، میں آج نہ جاؤں گا۔ میری طبیعت میں کچھ گرانی ہے۔ رات کو دیر تک جاگنے سے مبادا تکلیف بڑھ جائے۔ آپ لوگ سدھاریں۔ بسم اللہ ورنہ خواجہ صاحب کہیں گے آرزو نے سب کو روک لیا۔

شاہ صاحب: ہاں بھئی۔ آپ لوگ مشاعرے میں ہو آئیں۔ میں تو ابھی خان آرزو کے پاس دو گھڑی بیٹھوں گا۔

احسن اور سودا: بہتر، السلام علیکم۔

شاہ صاحب اور خان آرزو : وعلیکم السلام، خدا حافظ۔

(سب لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ خانِ آرزو تکیے کے نیچے سے کاغذ کا ایک پرچہ نکالتے ہیں اور کئی بار غصے اور تشویش سے پڑھتے ہیں)

آرزو : حافظ محمد حسن کا خط ہے۔ اکبر آباد سے قاصد کے ہاتھ بھیجا ہے۔

شاہ صاحب: وہی میاں میر تقی کے بڑے بھائی۔

آرزو : جی ہاں۔ لکھا ہے میر تقی بڑا فتنہ روزگار ہے اس کی تربیت اور پرداخت آستین میں سانپ پالنے کے برابر ہے۔

شاہ صاحب: سوتیلے بھائیوں کی رنجش۔

آرزو : (بات کاٹ کر) نہیں شیخ صاحب، وہاں خاندان کی ایک لڑکی سے میر تقی کی آنکھ

لڑی ہوئی ہے بھلا یہ کہیں شریفوں کے اطوار ہیں۔ ماشاء اللہ اسے اپنے ہمراہ دہلی لانے کے منصوبے باندھے تھے ان صاحبزادے نے۔ وہ تو کہیے محمد حسن آڑے آیا اور لڑکی کے ماں باپ بھی تیار ہو گئے۔ وہ محمد حسن سے لڑکی کی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے (اس جملے پر میر صاحب دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں اور اس طرح ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں کہ ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ چہرے پر وحشت کے آثار ہیں، آنکھیں ابلی ہوئی ہیں، خان آرزو اسی طرح اپنی بات جاری رکھتے ہیں) اس میں بھی بڑے رخنے پڑے۔ وہ تیار نہ ہوتی تھی۔ مجھے تو قاصد کی زبانی ساری داستان معلوم ہوئی۔

شاہ صاحب: مگر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیا فکر ہے!

آرزو : ایسے فتنۂ روزگار اوباش طبع کی دست گیری کہاں تک مناسب ہے۔

شاہ صاحب: مگر اب تو اس لڑکی کی شادی ہو گئی (یہاں بہت بلند آہنگ موسیقی دی جائے جس سے میر کا تاثر معلوم ہو سکے) جبراً و کرہاً ہی سہی مگر اب کیا مذائقہ ہے؟!

آرزو : مجھے یہ اطوار پسند نہیں۔ اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ کل ول ایسا ہی واقعہ یہاں ہو گیا تو لوگ کہیں گے خان آرزو کی تربیت کا یہی اثر ہے۔

(خط دوبارہ گاؤ تکیے کے نیچے رکھنے کے لئے مڑتے ہیں تو میر صاحب پر نظر پڑتی ہے جن کا چہرہ جذبات کی شدید کشمکش کا آئینہ دار ہے اور وحشت کے آثار نمایاں ہیں۔)

آرزو : ارے، میری تقی، تم کب آئے؟ شیخ صاحب۔ آپ کی نظر بھی نہیں پڑی (میر صاحب سے) اور شیخ صاحب سے ملاقات نہیں ہے تمہاری؟ اس قدر خاموش کیوں ہو عزیزم، تمہیں تو میں یاد ہی کر رہا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ آج مرزا رفیع آئے تھے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ یہ شعر پڑھ گئے ہیں:

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا

صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا

کہتے تھے کسی سے اس دھوم دھام کا مطلع ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میں نے

سوچا تھا تمہیں سناؤں گا اور کہوں گا کہ اس زمین میں فکر کرو۔

میر : (تھوڑی دیر خاموش اور کھوئے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اسٹیج پر خاموشی طاری رہتی ہے۔ دونوں بزرگ سراسیمگی کی حالت میں پہلو بدلتے ہیں، پھر یکایک میر صاحب بے خودی کے عالم میں شعر پڑھتے ہیں۔ خانِ آرزو پر شعر کا اثر بہت نمایاں طریقے پر ظاہر ہوتا ہے۔ بار بار یہ لوگ شعر دہراتے ہیں۔ سر دھنتے ہیں اور زانو پر ہاتھ مارتے ہیں۔ خان آرزو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ شعر یہ ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

آرزو : (بے اختیار ہو کر تعریف کرتے ہیں) واہ میر تقی۔ شاباش۔ زندہ باش۔ ریختہ کی شہنشاہی کا تاج کبھی تیرے سر پر رکھا جائے گا۔ واہ واہ جی خوش کر دیا۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

(میر صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے خانِ آرزو کو دیکھتے رہتے ہیں پس منظر سے اکتارے یا ستار کی غمگین موسیقی ابھرتی ہے اور کوئی اس شعر کو ترنم سے پڑھتا ہے۔ آواز میں بڑا سوز ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

(اور اسٹیج کی ساری روشنیاں ایک دم بجھ جاتی ہیں، چند لمحے کے بعد صرف میر صاحب کی پرچھائیں اسٹیج پر رہ جاتی ہے جس کا عکس پردے پر پڑ رہا ہے۔ پس منظر سے کوئی ان کی مثنوی کے یہ اشعار ترنم سے پڑھتا ہے۔ اکتارے یا ستار کی غمگین موسیقی کے ساتھ:

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام

لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا

کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرق بحر تحیر رہوں

کبھو سر بجیب تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا

کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر جا پڑی

تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

نظر آئی اک شکل مہتاب میں

کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ

وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

(ان اشعار کے پڑھے جانے کے دوران اسٹیج کے پچھلے حصے کے اوپر چودھویں کا چاند آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا نظر آتا ہے۔ چاند کی کرنیں تاریکی کو دور کردیتی ہیں۔ یہ تاثر اسٹیج کے اوپر سے روشنی ڈال کر پیدا کیا جاسکتا ہے۔ میر صاحب تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔)

میر : (عالم وحشت میں چیخ اٹھتے ہیں) ماہ طلعت! ماہ طلعت!!

(اسٹیج پر نیم تاریکی کا عالم ظاہر کر رہا ہے کہ یہ صرف عالم خیال کی باتیں ہیں۔ ماہ طلعت اسی لباس میں ملبوس ہے جس میں پہلے نظر آئی تھی)

ماہ طلعت : (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے) اپنے سارے وعدے وعید بھلا دیئے۔ اتنی جلدی فریاد کرنے لگے۔

میر : ایسی زندگی کو کہاں سے جگر لاؤں ؟!

ماہ طلعت : تم نے وعدہ کیا تھا کہ سینے میں دل جل کر راکھ ہو جائے گا اور ہونٹوں سے آہ نہ نکلے گی۔ تم نے میرا پیار عمر بھر کا سکھ چین دے کر اپنایا تھا۔

میر : مجھ سے تمہارے بغیر زندہ نہ رہا جائے گا۔

ماہ طلعت : (ناراض ہو کر اٹھ کر جاتے ہوئے) بزدل کہیں کے۔ میں تم سے کبھی بات نہ کروں گی۔ زندگی عبادت ہے، اسے اس طرح برباد نہ کرو۔

میر : اس عبادت کا اتنا بڑا انعام ملا ہے۔ فقط دکھ درد، فقط غم والم!

ماہ طلعت : (لوٹ آتی ہے اور گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے) ماہ طلعت سے اس طرح خفا نہ ہو۔ میری زندگی تمہارے پیار کی روشنی سے ہمیشہ جگمگائے گی مگر اب میں کسی اور کی ہو چکی ہوں۔ مجھے گنہ گار نہ کرو۔ اپنا یہ نور دنیا کو بخش دو۔ تمہارے لئے اس دنیا کے پاس کچھ نہیں ہے، تم تو اس کی مانگ میں افشاں چن دو۔ اس کے آنگن میں دیئے جلا دو۔ اس کی جھولی گیتوں اور پھولوں سے بھر دو۔

میر : کیا ایسے دکھ بھرے دل سے کوئی گا سکتا ہے !؟

ماہ طلعت : کیوں نہیں۔ میری وہ تصویر جو تمہارے دل میں جگمگاتی رہی ہے آنسوؤں اور گیتوں ہی میں اتر سکتی ہے جو دنیا نہ دے سکی اسے تم دنیا کو بھیک میں دے دو۔ جو پھول گلزار میں نہ کھل سکے انھیں اپنے تصور میں کھلاؤ نہیں تو میں چلی جاؤں گی کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی۔

میر : مگر میں کیونکر بیتیں پڑھوں گا۔ کس کے لئے بیتیں پڑھوں گا۔

ماہ طلعت : اسی چاند کے جھولے سے میں تمہاری بیتیں سنوں گی۔ کیا میرے لئے بھی نہ گاؤ گے؟!

میر : تم اس درد کو نہیں جانتیں۔ مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے گا۔

ماہ طلعت : یہ ہر کمال کا مول ہے۔ بے پناہ درد کی ٹیسوں ہی سے لے کی مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ آج سے تمہارے لئے اس دنیا میں صرف کمال کا یہی مول رہ گیا ہے۔

میر : ساری دنیا، اس کی مسرتیں اور کامرانیاں آج سے میرے لئے ختم ہو گئیں۔ آج میر تقی) مر گیا، میر تقی اور اس کی معصوم تمنائیں مر گئیں اب اس کے پاس ایک ٹوٹے

ہوئے دل کے سوا اور کچھ نہیں۔

ماہ طلعت : جب بھی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھو گے میں چاند کے اڑن کھٹولے پر سے اتر کر تمہارے پاس آجاؤں گی۔ اچھا خدا حافظ۔

(چلی جاتی ہے اور ایک دم تاریکی غائب ہو جاتی ہے اور ساری روشنیاں یکا یک جل اٹھتی ہیں۔)

میر : (پھر اسی کرب کے ساتھ چلاتے ہیں) ماہ طلعت۔ ابھی نہ جاؤ۔ ابھی نہ جاؤ۔ خدارا کوئی اسے روک لو۔ خدا کے لئے اسے کوئی روک لو۔

(خانِ آرزو اور دو ایک اور آدمی دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ یہ اسٹیج کے دائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں۔)

میر : (اسی طرح چلاتے ہوئے) اسے روک لو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں خالو جان۔ اسے روک لو۔ وہ چاند کے اڑن کھٹولے میں جا بیٹھی ہے، وہ مجھ سے روٹھ کر چلی گئی ہے۔

خان آرزو : کون روٹھ کر چلا گیا ہے؟ بیٹے ہوش میں آؤ۔ یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ خدارا ہوش میں آؤ۔

میر : خدا کے لئے اسے روک لو۔ کوئی نہیں روکتا۔ میں چاند کو توڑ ڈالوں گا، اس کا نور اپنے بیتوں میں بہاؤں گا۔ وہ چاند کے دریچے سے سنے گی۔ میرے دامن کا سرا نہ پکڑو۔ میں تمہاری دنیا کا نہیں ہوں۔ مجھے (لوگ میر صاحب کو پکڑ کر گرنے سے روکتے ہیں) مجھے جانے دو۔ میں اسے چاند کی نگری میں ڈھونڈھ نکالوں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو!!

خان آرزو : بے چارا پاگل ہو گیا۔ خدا رحم کرے۔

میر : (گنگناتے ہوئے) ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا

خان آرزو : لے چلو۔ گھر کے اندر لے چلو۔ حکیم صاحب کو بلا کر فصد کھلوانے کا انتظام کرنا چاہیے۔

(اس سے پہلے کہ لوگ میر صاحب کو پکڑ کر اٹھائیں پردہ گر جاتا ہے)

چوتھا منظر

[لکھنؤ کا ایک دیوان خانہ۔ وسط میں قیمتی قالین اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے ہیں۔
دائیں طرف کا دروازہ باہر کی طرف جاتا ہے، بائیں طرف کا دروازہ حویلی کے
اندر کے حصے کی طرف جاتا ہے۔ شہ نشیں خالی ہے، معلوم ہوتا ہے کسی اہم مہمان
کی آمد قریب ہے۔ شہ نشیں کے دائیں اور بائیں طرف لکھنؤ کے بے فکرے اور
بانکے جمع ہیں کسی کی بغل میں مرغ ہے۔ کسی کے ہاتھ میں بٹیر ہے اور پہلو میں بٹیر
کا پنجرہ۔ ہر ایک کے آگے تپائی پر بھنے ہوئے دھنیے کی طشتری اور پاندان رکھے
ہوئے ہیں۔ اگالدان بھی قرینے سے سجائے گئے ہیں۔ فانوس لٹک رہے ہیں۔
لباس کی تفصیلات کے لئے شررؔ کی کتاب ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' سے مدد لی
جائے۔ میرؔ دائیں طرف کی صف میں ایک کنارے خاموش بیٹھے ہیں]

ایک : واللہ۔ مرزا صاحب۔ آپ کو قسم ہے کیا اصیل پٹھا نکلا ہے میرا شہ زور۔

مرزا : ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ کیوں نہ ہو میاں (مرغ کو دیکھتے ہوئے) چشم بد دور، آپ
کے گھرانے میں اسی جوڑ کے جانور ہوئے ہیں۔ آخر کس قبیل کا چشم و چراغ
ہے؟!

ایک : بس یہ آپ نے باون تولے پاؤ رتی کی بات کہہ دی۔ بخدا ہے ہے اس کا باپ،
ظفر مند۔ کیا کہنے تھے اس کے۔ پلٹ کے وہ زور کا لات دیتا تھا کہ رستم مقابل
ہو تو میلوں پر جا کر گرے۔

مرزا : خوب (خاصدان آگے بڑھاتے ہوئے) لیجئے۔ شوق فرمایئے۔

ایک : (خاصدان سے پان لے کر آداب کرتے ہیں) آج کا معرکہ دیکھا آپ نے؟
ایمان کی بات کہوں گا جھمن نواب کا جانور بھی کمزور نہیں تھا۔ کھلائی پلائی تو اس کی
بھی خوب خوب ہوئی ہے لیکن کیا مجال جو کہ میرے شہ زور کو منہ آئے۔ آپ کو
میری جان کی قسم ذری دیکھئے گا کیا سینہ تانے کھڑا ہے۔ ہے ہے ذرا چال ملاحظہ

ہو۔آپ تو بیتیں موزوں کرتے ہیں مرزا صاحب۔ ذرا اس چال پر بھی کوئی بیت پڑھیئے گا۔

مرزا : ارے بھئی ع

اب کیا ہے وہ وقت گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

ایک : کیا زبان ہے۔ کوثر کی دھلی ہوئی، کیا روانی ہے، کس غضب کا مصرعہ ہے۔ کس ظالم نے اس صفائی سے کہہ دیا ہے۔

مرزا : صفدر نواب دلی گئے تھے وہاں سے میر تقی صاحب کی غزل سوغات میں لائے، میں نے بھی ایک نقل لے لی تھی، اسی کا مصرعہ ہے۔

ایک : (ذرا رازدارانہ لہجے میں) میں نے سنا ہے میر صاحب قبلہ لکھنؤ تشریف لانے والے ہیں۔

مرزا : کچھ تحقیق معلوم نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ دلی میں سخت پریشان ہیں۔ صفدر نواب بتاتے تھے کہ درانی نے دلی کو تاراج کیا پھر دکنیوں نے وہ لوٹ مچائی کہ اہل شہر دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ میر صاحب راجہ ناگرمل کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور ہر چند راجہ نے مشاہرہ معقول مقرر کیا تھا مگر سراسیمہ اور پریشان حال رہے۔ صفدر نواب بیان کرتے تھے کہ میر صاحب لشکر شاہی کے ایک ایک سرکردے کے پاس گئے۔ چونکہ شہرت کمال تھی لہٰذا چند لوگوں نے توجہ کی مگر اس طرح کا باکمال اور یوں کتوں بلیوں کی سی زندگی بسر کرے۔

ایک : تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مرزا : سنتے ہیں کمال نازک مزاج ہیں بھئی وہ کرتے نہیں شاہوں اور امیروں کی گدائی سے انھیں پرہیز ہے۔

ایک : خوب ہو جو لکھنؤ آجائیں۔ ایک نظر ہم کو بھی زیارت نصیب ہو۔

(ایک اور معمر بزرگ جو ابھی تک کسی اور سے باتوں میں مصروف تھے یکا یک گفتگو میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں)

غفرغینی : (ان کا لباس دہلوی انداز کا ہے انگرکھا، ٹوپی اور بر کا پاجامہ مگر اس میں لکھنوی طرز کی تراش خراش شامل ہو گئی ہے لہجہ کچھ عجیب ہے۔ باتونی آدمی ہیں اور 'ز' اور 'ل' کی جگہ 'غ' بولتے ہیں) اجی حضت قطع کلام معاف، آپ کس کا ذکر فرما رہے ہیں۔

ایک مرغ باز: میر صاحب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

غفرغینی : آپ صاحبان کس منہ سے میر تقی صاحب کا نام لیتے ہیں۔ آپ حضرات کو شعور ہے ان کا کلام سمجھنے کا۔ ہائے دلی وائے دلی۔

ایک مرغ باز: واہ حضت۔ ہر چند دہلی کسی زمانے میں زبان کی ٹکسال رہی ہے لیکن دہلی کے باہر بھی اہل زبان بستے ہیں اور ان کا مذاق شعر درست ہے۔

غفرغینی : معاف فرمایئے گا بندہ اسے تسلیم نہ کرے گا۔ ہم نے جب سے دلی چھوڑی کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں نہ رہا۔ ریختے میں استاد میاں ولیؔ ہوئے۔ ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی پھر میاں آبروؔ اور میاں ناجیؔ اور میاں حاتمؔ۔ پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السوداؔ اور میر تقی صاحب۔ پھر حضرت خواجہ میر درد جو میرے بھی استاد تھے۔

ایک مرغ باز: اور لکھنؤ کے شعرائے نامور کا نام بھی آپ نے نہیں لیا۔

غفرغینی : اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ویسے ہی شاعر ہیں۔

مرزا : (غصے میں) جی؟ کیا فرمایا؟

غفرغینی : (بات جاری رکھتے ہوئے) اور دلی میں بھی کچھ ایسا ہی چرچا ہے تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ سبحان اللہ کون میاں مصحفیؔ۔ بڑے شاعر ہیں کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھیے ضرب زید عمروا کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں اور میاں حسرتؔ کو دیکھو اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا ہے۔

ایک مرغ باز: یہ تو صریحاً ناانصافی ہے۔

مرزا : معاف فرمایئے میر غفرغینی صاحب۔ آپ تو اپنے تئیں کسی کو استاد ہی تسلیم نہیں

کرتے۔

غفر غینی : یہ غفر غینی یعنی چہ؟ یہ غفر غینی کون مروک ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا زمانہ آگیا۔ بزرگوں کا ادب، پاس، لحاظ، مروت، سب کافور ہو گئے۔

ایک مرغ باز: مگر آپ بھی تو کمال کرتے ہیں، لکھنؤ کے اساتذہ کو نام دھرتے ہیں۔

غفر غینی : تم لوگ ایسے ہی بد کتے ہو تو ہم چلے۔ مرغ کی پالی دیکھنے کا شوق کس نامراد کو تھا۔ یہ سوچ کر چلے آئے تھے کہ چار خوش طبع حضرات کے ساتھ صحبت رہے گی۔ دو گھڑی دل بہلے گا۔

(میر صاحب ان حضرات کے آگے رکھا ہوا خاصدان اٹھانے کے لئے بڑھتے ہیں تو تینوں حضرات میر صاحب کی طرف غور سے دیکھتے ہیں، لباس کی تفصیل یہ ہے۔ کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا پاجامہ، ایک پورا تھان پستو لئے کا کمر سے بندھا ہوا۔ ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ، عرض کے پائنچے، کمر میں ایک طرف سیدھی اور دوسری طرف ٹیڑھی تلوار، ہاتھ میں جریب)

ایک : ذرا ان بزرگ کو دیکھئے۔ انھیں دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں روشنی آجائے گی۔

غفر غینی : یہ تو لکھنؤ کا انداز نہیں ہے۔ یہ کوئی نو وارد معلوم ہوتا ہے۔

مرزا : بالکل اوپچی معلوم ہوتا ہے کیل کانٹے سے لیس ہے۔

ایک : تازہ ولایت ہے مگر ہے کوئی بگڑا دل نوابی لٹ گئی مگر اکڑ بانکپن نہ گیا۔

دوسرا مرغ باز: یار مجھے تو کوئی بہروپیا معلوم ہوتا ہے (سب قہقہہ مار کر ہنس پڑتے ہیں، میر اسی محویت کے عالم میں بیٹھے رہتے ہیں)

ایک : یار ذرا پوچھیں تو سہی۔ یہ حضرت کہاں سے چلے آرہے ہیں۔

مرزا : ہاں ہاں چلو۔

دوسرا مرغ باز: ہاں ہاں، ذرا دیر چہل ہی رہے گی۔ (تینوں حضرات اٹھ کر میر صاحب کی طرف جاتے ہیں۔)

مرزا : قبلہ، آداب بجالاتا ہوں۔

ایک : تسلیمات عرض ہے۔

دوسرا مرغ باز: کہاں سے تشریف لانا ہوا؟ یہ تو جناب کے حلیے اور لباس سے ظاہر ہے کہ آپ نو وارد ہیں؟

ایک : (بغل سے مرغ نکال کر) کچھ مرغ بازی کا مذاق ہو تو بسم اللہ (سب قہقہہ لگاتے ہیں، میر صاحب منہ پھیر کر بیٹھ جاتے ہیں)

(اتنے میں نقیب داخل ہوتا ہے اور اعلان کرتا ہے)

نقیب : نگاہ روبرو حضرت نواب وزیر رونق افروز ہوتے ہیں۔

(سب سروقد کھڑے ہو جاتے ہیں، نقیب ہاتھ باندھ کر ایک طرف نیچی نظر کر کے مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے۔ نواب آصف الدولہ چند امرا اور وزرا کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں۔ آصف الدولہ سیدھے مسند کی طرف جا کر صدر نشیں۔ قیمتی مگر سادہ لباس پہنے ہوئے ہیں۔ لباس کی تفصیلات شرر کے ''مشرقی تمدن کے آخری نمونے'' میں ملیں گی۔ گردن کے اشارے سے سب حاضرین کو بیٹھنے کا حکم دیتے ہیں۔ سب بیٹھ جاتے ہیں۔)

آصف الدولہ: خوب۔ ماشاء اللہ۔ سالار جنگ، تمہارے ''افراسیاب'' نے واقعی میدان مار لیا۔ کیا لات دی کہ ایک ہی چوٹ میں شہ زور جیسا مرغ اصیل لوٹ گیا۔

سالار جنگ : حضور کی بندہ نوازی ہے۔

آصف الدولہ: ہمارے مرغ ''صف شکن'' سے لڑاؤ، اس پالی کو اگر تمہارا ''افراسیاب'' جیت لے تو ہم جانیں۔

سالار جنگ : حضور کی ہمت افزائی۔ جب مرضی مبارک ہو تاریخ مقرر فرما دی جائے۔

آصف الدولہ: رجب کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ رکھ لو۔

سالار جنگ : بہتر۔

آصف الدولہ: اگر ہمارا صف شکن جیت گیا تو اس کا قصیدہ کون لکھے گا۔

سالار جنگ : بندہ پرور قصیدہ گوئی تو مرزا رفیع مرحوم پر ختم ہو گئی۔

آصف الدولہ: ہم استاد میر سوز سے اس کا قصیدہ لکھوائیں گے۔

سالار جنگ : مرغ پر میر تقی صاحب کا شعر بھی دہلی میں زباں زد ہو گیا ہے۔

آصف الدولہ: کیا شعر ہے؟

سالار جنگ : میر تقی صاحب نے ایک مرغ پالا تھا وہ قضائے الٰہی بلی کے ہاتھوں جان بحق ہو گیا۔اس کے مرثیے کا ایک شعر ہے:

جھکا جو خاک کی جانب کو کیس بے جاں کا

زمیں پہ تاج گرا ہد ہد سلیماں کا

آصف الدولہ: سبحان اللہ، سبحان!! کیا صاحب کمال شاعر ہے!

سالار جنگ : بجا ارشاد ہوا۔

آصف الدولہ: تم کہتے تھے کہ تم نے میر صاحب کو ہمارے ایما سے مطلع کر دیا ہے اور وہ لکھنؤ آنے والے ہیں۔اس کے بعد کوئی اطلاع نہیں ملی۔

سالار جنگ : جی ہاں شاید ہفتے عشرے میں تشریف لے آئیں۔

آصف الدولہ: (تھوڑی دیر وقفے کے بعد۔اتنے میں نقیب شمع دان لا کر رکھتا ہے) تو بسم اللہ۔ اب محفل مشاعرہ شروع کی جائے۔

(لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مرغ کے کھانچے پیچھے چھپا دیئے جاتے ہیں۔میر صاحب ایک کنارے پر ہیں میر صاحب سے کچھ فاصلے پر مرزا غفر غینی بیٹھے ہیں جن کے سامنے سب سے پہلے شمع دان رکھا جاتا ہے۔)

غفر غینی : (اپنے مخصوص انداز میں) صاحبو! ایک غزل عرض کرتا ہوں۔

کچھ نہیں اعتبار دنیا کا

ہیچ ہے کاروبار دنیا کا

مرد دیندار کو کب آئے خوش

دار ناپائیدار دنیا کا

بد ہے جیسے شراب کی مستی
ویسے بد ہے خمار دنیا کا
کہئے اس دل کو آئینہ طلعت
ہو نہ جس میں غبار دنیا کا

(کچھ لوگ تعریف کرتے ہیں مگر مرزا غفر غینی اس تعریف سے مطمئن نہیں ہوتے)

مرزا : اس غزل کا مقطع بھی عنایت ہو۔

غفر غینی : میں پہلے ہی جانتا تھا۔ لکھنؤ والے ضرور کوئی شوشہ چھوڑیں گے۔ حضرت۔ آخر یہ کیا ضرور ہے کہ مقطع کہا جائے۔ میرا اپنا انداز سخن ہے آپ حضرات کا مذاق نہیں ہے۔ یہاں ایک غزل کے دو شعر کہہ دیئے بس کافی ہے۔ ان میں کیفیت اور گداز کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ یہ نہیں کہ غزل میں مطلع بھی ہے مقطع بھی ہے، غزل ہے کہ شیطان کی آنت ہے اور مطلب خبط، حضرت، ہوش کے ناخن لیجئے، میری غزل مطلع اور مقطع کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے ع

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید

ایک : یہ تو گیا لنڈوری غزل ہوئی۔

غفر غینی : اماں لاحول ولاقوۃ۔ یہ لنڈوری غزل یعنی چہ؟ اتنی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ زبان دہلی کی ہے۔ اصلاً تمہارے تصرف میں نہیں آسکتی تم بھلا اس کی باریکیوں اور لطافتوں کو کیا سمجھو گے۔ یہ خاص انداز استاد مرحوم کا ہے انھیں کا فیضان ہے۔ مجھ سے بھی کیا چوک ہوئی کہ کور ذوقوں کے سامنے یہ غزل پڑھ دی۔ توبہ۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔

مرزا : اے لیجئے ہم کور ذوقے ہو گئے۔

غفر غینی : اور کیا؟ ادھر دیکھئے (میر صاحب کی طرف اشارہ کر کے) نہ جانے کس کس ولات کے نووارد جمع ہیں۔ اب زبان ریختہ میں شعر کہنا کوئی لڑکوں کا کھیل نہیں

جگر خون کرنا ہوتا ہے میاں۔ یہ نہیں کہ ہر آنے جانے والا شعر سمجھ لے۔ اب یہ بزرگ بیٹھے ہیں نئے نئے اس دیس میں آئے ہیں اب یہ شعر فہمی کا دعویٰ کرنے لگیں تو۔۔۔

(میر صاحب شمع دان اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں مجمع پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ آصف الدولہ غور سے ان کو دیکھتے ہیں)

میر صاحب: صاحبو! ایک قطعہ پڑھوں گا۔ یہی میرا جواب ہے۔

کیا بودو باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سالار جنگ: (بے تاب ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں) بخدا یہ آواز میر تقی صاحب کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

آصف الدولہ: (استعجاب سے) میر صاحب!!

(میر صاحب اسی طرح بے خبری کے عالم میں بیٹھے رہتے ہیں۔)

آصف الدولہ: (خود تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سارا مجمع احترام کے طور پر کھڑا ہو جاتا ہے) میر صاحب۔ آپ ادھر صدر نشیں پر تشریف لے آیئے۔

میر صاحب : حقیر کی جگہ پا انداز کے قریب مناسب ہے۔

(آخر سالار جنگ زبردستی اٹھا لاتے ہیں اور میر صاحب صدر نشیں ہوتے ہیں)

مرزا : میر صاحب ہم لوگوں سے جو بے ادبی سرزد ہوئی اسے معاف فرمایئے گا۔

ایک : ہم شرمندہ ہیں۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ اقلیم سخن کا شہنشاہ ہمارے درمیان رونق افروز ہے۔

سالار جنگ : آپ نے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں دی۔

آصف الدولہ: آپ کا قیام کہاں ہے؟

میر : سرائے میں سامان رکھ دیا ہے۔

آصف الدولہ: سالار جنگ، کیا تاریخ میں یہ لکھا جائے گا کہ آصف الدولہ کے زمانے میں سخن وروں کی ایسی ناقدری تھی۔ میر صاحب کے ٹھہرانے کا معقول انتظام کرو۔

سالار جنگ : سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

مرزا : حضور، میر صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی ریختہ عنایت ہو۔ حضور حکم فرمائیں تو ممکن ہے۔

ایک مرغ باز: ایک قطعے سے سیری نہ ہوگی۔ بہتر ہے غزل عنایت ہو جائے۔

میر : صاحبو، میرے اشعار آپ حضرات کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔

(مرزا اور دوسرے حضرات چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور مجمع پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں)

مرزا : حضور تقصیر معاف، آخر انوری وخاقانی کا کلام سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔

میر : یہ درست ہے مگر ان کی شرحیں، مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام[1] کے لئے فقط محاورۂ دہلی ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم ہیں مثلاً یہ بیت ملاحظہ کیجئے:

عشق ہمارے خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی 'ی' کو ظاہر کرو پھر کہیں گے کہ 'ی' تقطیع میں گرتی ہے مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ ہے۔

ایک : اس طرح تو دہلی اور لکھنؤ کے بہت کم حضرات شاعر قرار پائیں گے۔

میر : اس میں کیا شک ہے۔

غفر غینی : تو آپ کے نزدیک اس دور میں شاعر کون کون گزرے ہیں؟

میر : ایک سودا مرحوم ایک یہ خاکسار۔ (تامل کرکے) آدھے خواجہ میر درد۔

غفر غینی : لاحول ولا قوۃ۔

مرزا : اور میر سوز صاحب کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

میر : میر سوز بھی شاعر ہیں؟ (مجمع میں بے چینی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں)

مرزا : آخر وزیر ممالک حضور نواب کے استاد ہیں۔

میر : خیر یہ ہے تو پونے تین سہی مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سنے۔

آصف الدولہ: میر صاحب۔ لکھنؤ کی یہ پہلی نشست ہے، جو آپ کی آمد سے ممتاز ہوئی آپ کو غزل پڑھنی ہوگی۔

سالار جنگ : سرکار عالی کی فرمائش ہے تو میر صاحب ضرور ریختہ پیش کریں گے۔ بسم اللہ میر صاحب۔

میر : بہتر۔ غزل پیش خدمت ہے۔

دل، پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

(آصف الدولہ تعریف کرتے ہیں اس مجمع کے دوسرے حضرات تعریف کرتے ہیں۔ سب پر بے خودی کی کیفیت طاری ہے)

جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج
رات گزرے گی کس خرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

(شعر کئی بار پڑھوایا جاتا ہے۔ نواب آصف الدولہ پر وجد کی کیفیت طاری ہے)

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

(داد سے ہنگامہ بپا ہو جاتا ہے۔ بار بار شعر پڑھوائے جاتے ہیں۔ آصف الدولہ

کئی بار تعریف کرتے ہیں۔ سارے مجمع پر بے خودی اور کیف طاری ہے کہ اسی عالم میں پردہ گرتا ہے۔)

پانچواں منظر

[آصف الدولہ کے محل کا اندرونی حصہ۔ دور سے محرابیں سجے ہوئے در، جھاڑ فانوس دکھائی دے رہے ہیں۔ برابر حوض ہے جس کے قریب مسند اور قیمتی ایرانی قالینوں کے فرش پر گاؤ تکیہ لگے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی چھڑی ہاتھ میں ہے۔نواب صاحب حوض کے کنارے بیٹھے ہیں۔میر صاحب قالین پر براجمان ہیں ہاتھ میں کوئی کاغذ ہے قالین پر ادھر اُدھر مختلف کتابیں بکھری ہوئی پڑی ہیں اور وسط میں گاؤ تکیے کے سامنے قلمدان وغیرہ رکھا ہوا ہے۔)

آصف الدولہ: میر صاحب آپ نے ہمارے پائیں باغ کی سیر کی۔

میر : (کاغذ کی طرف اشارہ کر کے) میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔

آصف الدولہ: سچ ہے اس باغ کی آبیاری پانی سے ہو جاتی ہے مگر باغِ معانی کی آبیاری کے لئے خونِ جگر چاہئے (پھر حوض کے قریب چھڑی سے مچھلیوں سے کھیلنے لگتے ہیں اور بے نیازی کے عالم میں کہتے ہیں) میر صاحب، کچھ سنایئے۔

میر : ایک تازہ غزل کہی ہے اجازت ہو تو وہی پیش کروں۔

آصف الدولہ: ضرور۔

میر : مطلع عرض کیا ہے۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

(آصف الدولہ چھڑی سے مچھلیوں سے کھیلتے رہتے ہیں اور متوجہ نہیں ہوتے)

(میر صاحب خاموش ہو جاتے ہیں)

آصف الدولہ: میر صاحب۔ خاموش کیوں ہو گئے۔ اگلا شعر مرحمت ہو۔

میر : آپ سر دست مچھلیوں ہی سے کھیل لیجئے۔ جب تک آپ کی توجہ شعر کی طرف نہ ہو اس وقت تک شعر پڑھنے سے فائدہ۔

آصف الدولہ: آپ غزل پڑھیے جو شعر ہوگا خود متوجہ کر لے گا۔

میر : اگر یہ شعر آپ کو متوجہ نہ کر سکا تو ریختے کے سارے دیوان آپ کی توجہ حاصل نہ کر سکیں گے (پھر شعر دہراتے ہیں)

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

(نقیب داخل ہوتا ہے)

نقیب : استاد میر سوز صاحب تشریف فرما ہیں۔ حکم ہو تو حاضر بارگاہ کیا جائے۔

آصف الدولہ: اجازت ہے۔

(نقیب جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد میر سوز تشریف لاتے ہیں اور جھک کر آداب شاہی بجالاتے ہیں۔)

آصف الدولہ: آیئے استاد، تشریف رکھئے (خود بھی حوض کے کنارے سے ہٹ کر مسندر پر آ بیٹھتے ہیں) کہئے کوئی فکر تازہ؟

میر سوز : قبلۂ عالم، کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ تازہ غزل آج صبح ہوئی ہے۔ ارشاد ہو تو نذر کروں۔

آصف الدولہ: ضرور، میر صاحب غزل سماعت فرمایئے۔

میر سوز : (میر سوز کی غزل کے بارے میں تفصیلات ''آب حیات'' صفحہ 199 پر دیکھنی چاہئیں۔ پورے حرکات وسکنات کے ساتھ بتا کر شعر پڑھتے ہیں اور ایکٹنگ کے ساتھ ہر لفظ ادا کرتے ہیں)

مرا جان جاتا ہے یارو بچالو
کلیجہ میں کانٹا گڑا ہے نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی

مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو

(ہر شعر پر آصف الدولہ مبالغے کے ساتھ تعریف کرتے ہیں)

خدا کے لئے میرے اے ہم نشینو!

وہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلا لو

اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے

تو دم کھا رکھو کچھ نہ بولو نہ چالو

نہ آوے اگر وہ تمہارے کہے سے

تو منت کرو گھیرے گھیرے منالو

کہو ایک بندہ تمہارا مرے ہے

اسے جان کندن سے چل کر بچالو

جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے

تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

آصف الدولہ: واہ واہ استاد، کلام کیا ہے اعجاز ہے اور پڑھنے کا یہ انداز بھی کسی کو کہاں نصیب ہوا ہوگا۔ پچھلے مشاعرے میں آپ نے وہ قطعہ جس انداز سے پڑھا تھا ابھی تک آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومتا ہے۔

میر سوز: ذرہ نوازی ہے حضور والا کی۔

آصف الدولہ: میر صاحب نے وہ قطعہ سنا ہی نہیں استاد۔ آپ کو زحمت ہوگی۔ ذرا ایک بار پھر عنایت کیجئے گا۔

میر سوز: (پہلے مصرع پر ڈرتے ڈرتے بچ کر جھکے۔ پھر "کاٹا نہ ہٹی" کہہ کر دفعتہً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے جیسے سچ مچ سانپ نے کاٹ لیا ہو۔

او مار سیاہ زلف سچ کہہ

بتلا دے دل جہاں چھپا ہو

کنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے

کاٹا نہ ہفی!! ترا برا ہو

آصف الدولہ: سبحان اللہ، سبحان اللہ!! یہ کلام یہ شعر خوانی آپ کا ہی حصہ ہے۔ کیوں میر صاحب۔

میر : حوض کی ساری مچھلیوں پر اس کلام سے حالت وجد و سماع طاری ہے۔ میری تعریف کی احتیاج ہی کیا ہے۔[1]

میر سوز : نہیں میر صاحب، کچھ تو فرمایئے۔

میر : بزرگی اور شرافت میں کیا تامل ہے مگر شعر میر سے کیا کسی کو ہم سری؟ موقع اور محل تمہاری شعر خوانی کا وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کلیاں پکتی ہوں نہ کہ میر تقی کے سامنے۔

آصف الدولہ: اس قدر غرور و نخوت نامناسب ہے میر صاحب۔ مرزا سودا کیسا مسلم الثبوت شاعر گذرا ہے مگر نخوت اور غرور نام کو نہ تھا۔

میر : ہر عیب کہ سلطاں بہ پسند و ہنر است۔

میر سوز : خیر اس تذکرے کو چھوڑیئے۔ میر صاحب سے ریختہ ہی سنیں ممکن ہے اس سے کچھ استفادہ ممکن ہو۔

میر : میرے پاس کوئی تازہ ریختہ نہیں ہے۔

میر سوز : نہیں میر صاحب۔ یہ ضد اچھی نہیں۔

آصف الدولہ: میر صاحب۔ جو کچھ یاد ہو ارشاد فرمایئے۔ تازہ اور باسی کی قید نہیں۔

میر : بہتر۔ اس وقت اپنی غزل کے چند قطعہ بند اشعار یاد آرہے ہیں۔ ارشاد ہو تو عرض کروں۔

آصف الدولہ: بسم اللہ۔

1۔ یہ روایت تذکرہ خوش معرکۂ زیبا سے لی گئی ہے۔ اس کی صداقت کی ذمہ داری مصنف پر نہیں ہے۔

میر کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

(میر سوز تعریف کرتے ہیں)

اور ایک مطلع ارتجالاً کہا ہے نذر کرتا ہوں:

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں
میں جو نسیم باد فروشِ چمن نہیں

(میر سوز تعریف کرتے ہیں۔ میر صاحب بے نیازی کے عالم میں کھوئے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں پھر یکا یک اٹھتے ہیں اور ایک پرچہ جیب سے نکال کر آصف الدولہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔)

آصف الدولہ: یہ کیا ہے؟

میر : غلام کا استعفیٰ — خانہ آباد، دولت زیادہ!!

آصف الدولہ: ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔

میر : قصور میرا ہی تھا جہاں پناہ۔ سخن کی آبیاری خون جگر سے ہوتی ہے۔ رنج و محنت اس کی خوراک ہیں۔ شعر کے لئے خودداری اور آزادی درکار ہے مسرت نہیں۔ میں دربار میں خودداری، آزادی اور مسرت ڈھونڈھنے آیا تھا یہ فریب تھا۔ مجھے تو زندگی بھر لہو رونا ہے، خون جگر نذر کرنا ہے پھر میں مسرت کے نام پر یہ سونے کی زنجیریں کیوں پہنوں۔ میری سلطنت زماں و مکاں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہے۔ سوز و ساز کی اقلیم میری ہے۔ درد و داغ کی سلطنت میری ہے۔ مجھے تو لہو کے چراغوں سے ان اندھیروں میں چراغاں کرنا ہے۔ اس شمع کو کوئی فانوس نہیں پہنا سکتا۔ اس روشنی کو کوئی زنجیر نہیں کر سکتا۔

(میر صاحب بے نیازانہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں، پس منظر سے ستار کی غمناک موسیقی ابھرتی ہے۔ اسٹیج کی روشنیاں بجھنے لگتی ہیں۔ پردہ گرتا ہے۔)

موم کے بت

[یہ المیہ تمثیل پہلی بار نینی تال میں اسٹیج کی گئی، اس کے بعد دہلی میں۔ پہلی بار جن اداکاروں نے اس میں حصہ لیاان کے نام یہ ہیں:

نواب صاحب قمر رئیس

بیگم عمرانہ مقصود

ڈاکٹر ارشاد ثانی

میر بخشی افتخار عالم

نور جہاں الویرا محمود

جہاں گیر عزیز اشرف

فریادی احمد اسحٰق نعمانی

ضمنی کردار: حکیم محبوب عالم، نفیس پنچو، اختر سعید اور اختر علی نے ادا کیے۔

پہلی بار جس شکل میں یہ ڈراما اسٹیج کیا گیا تھا اس میں بہت کچھ ترمیم اور اضافہ کر دیا گیا ہے]

کردار:

نواب صاحب : 55 سال کے وجیہہ اور باوقار رئیس۔

بیگم : 45 سال کی خوش پوشاک اور با اخلاق مگر اعصابی طور سے مریض خاتون۔

ڈاکٹر : ادھیڑ عمر کا کامیاب ڈاکٹر جس کے کپڑے اور لب ولہجہ اس کی مالی آسودگی اور پیشہ ورانہ پختگی کو ظاہر کرتا ہے۔

میر بخشی : ادھیڑ عمر کا شخص جو قیمتی لباس میں اجنبی معلوم ہوتا ہے۔

نور جہاں : نوجوان، خوبصورت اور نازوں میں پلی ہوئی دوشیزہ جو نواب صاحب کی اکلوتی بیٹی ہے۔

جہاں گیر : 40-35 سال کا قبول صورت شخص جو نواب صاحب کا داماد ہے، اس کے چہرے پر ذہنی الجھن کے آثار نمایاں ہیں۔

چند درباری، ایک فریادی اور ایک ادھیڑ عمر کا ملازم۔

[صرف مرکزی خیال پیرانڈلو کے ایک ڈرامے سے لیا گیا۔]

زمانہ : موجودہ

مقام : ہندوستان کا کوئی حصہ

پہلا منظر

[جب پردہ اٹھتا ہے تو مغلیہ طرز تعمیر پر بنا ہوا دیوان خانہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ محرابوں اور ستونوں کے علاوہ پشت کی محراب پر بنی ہوئی مرصع جالی بتا رہی ہے کہ یہ کسی مغلیہ شاہی قلعہ کا حصہ ہے۔ فانوس اسٹیج کے وسط میں لٹک رہا ہے۔ خوبصورت شمع دان قریب چوکی پر رکھا ہوا گذری ہوئی رات کی داستان کہہ رہا ہے۔ تین چوکیاں لگی ہوئی ہیں جن پر مخملی مسندیں بچھی ہوئی ہیں۔ وسط میں قیمتی ایرانی قالین پڑا ہوا ہے۔ دیوان خانے کے دونوں طرف دروازے ہیں جن میں سے دایاں دروازہ نواب صاحب کے کمرے کو جاتا ہے۔ اور بائیں طرف کا دروازہ زنان خانے کو ان دروازوں اور دیوان خانے کی پشت کے وسطی حصہ میں بنی ہوئی جالی پر بھی قیمتی مخملی پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جالی کے پردے کھینچ دیئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دھوپ ابھی پوری طرح چڑھی نہیں ہے۔ اور نو دس بجے سے زائد کا وقت نہیں ہے۔ دیوان خانے میں کئی جگہ تلواریں اور ڈھال ملا کر لٹکائے گئے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے۔ اس وقت نواب صاحب اور بیگم صاحبہ اسٹیج کے وسط میں بچھی ہوئی چوکی پر مسند پر بیٹھے ہیں۔ نواب صاحب وجیہہ اور باوقار رئیس ہیں مختصر سی خوبصورت سفید داڑھی ان کے چہرے پر زیب دیتی ہے۔ زرق برق خلعت پہنے ہوئے ہیں جو مغلیہ دربار میں پہنا جاتا ہو گا سر پر مغلیہ طرز کا سرپیچ اور عمامہ ہے جسے انھوں نے اتار کر بیگم کے قریب رکھ دیا ہے۔ اور ان کے سفید بال صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ تلوار دوسری چوکی پر رکھی ہوئی ہے سامنے پیچوان رکھا ہوا ہے اور اس وقت بڑے سکون کے ساتھ پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ لیکن اس وقت بھی ان کے چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے، بیگم اپنی سرخ وسفید رنگت، بھرے بھرے جسم اور قیمتی لباس میں مغلیہ شہزادی نظر آرہی ہیں۔ سر کے بائیں

طرف کی ایک لٹ سفید ہوگئی ہے۔ لیکن بڑھاپا ان کے لئے ایک زیور بن گیا ہے۔ لباس قیمتی ہے اور سر سے لے کر پیر تک مرصع اور کامدار۔ ڈاکٹر غور سے مریض کا حال سن رہا ہے اور بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کی باتوں پر توجہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر عمدہ کوٹ، سوٹ اور نکٹائی میں ملبوس ہے۔ لمبے سفر کی وجہ سے اس کے بال بکھر گئے ہیں۔ لیکن شخصیت سے کافی بھاری بھر کم چست و چالاک ذہین معلوم ہوتا ہے۔]

بیگم : ڈاکٹر صاحب۔ خدا کے لئے میری اکلوتی بچی کی زندگی کا سوال ہے۔ بے زبان بچی ہے۔

ڈاکٹر : آپ گھبرائیں نہیں بیگم صاحبہ، میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھوں گا۔

بیگم : نہ جانے کس کمبخت نے جادوٹونا کرادیا۔ نہ جانے کونسی برائی میری بچی کے سامنے آئی کہ عین برات کے دن دلہن کی رخصتی کرا کے لئے جارہا تھا کہ گھوڑے پر سے گر پڑا۔ وہ گھڑی تھی یا آج کی گھڑی ہے بچارے کا دماغ پھر گیا ہے۔

نواب : ڈاکٹر صاحب (آہِ سرد کے ساتھ) ایسا حادثہ نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔

ڈاکٹر : لیکن پاگل پن تو کوئی ایسی عجیب بیماری نہیں ہے نواب صاحب۔

نواب : یہ لڑکا جو اب میرا داماد ہے دراصل ہمارے دور کے عزیزوں میں تھا۔ ہمارے خاندان میں آپ جانتے ہیں نسل اور خون کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے، اس کے ماں باپ بڑے غریب تھے مگر میں نے اپنے خاندان کا سمجھ کر اپنی لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک ہی تو لڑکی ہے میری۔ ساری دھن دولت جائداد کی وارث یہی ہوگی۔ اتفاق دیکھئے جب برات رخصت ہو کر جانے لگی تو گھوڑے پر سے گر پڑا۔ سر پر چوٹیں تو بہت معمولی آئیں مگر دماغ اسی وقت سے خراب ہوگیا۔

ڈاکٹر : آخر پاگل پن میں کیا حرکتیں کرتے ہیں۔

نواب : بس ایک خیال بری طرح دماغ میں سما گیا ہے۔

بیگم : (بیگم جو گفتگو بڑی توجہ سے سن رہی تھیں بول اٹھتی ہیں) بس اسی خیال کی تو ساری آفت ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ سمجھتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں۔

نواب : ہاں یہ بات دماغ میں بیٹھ گئی ہے کہ وہ جہاں گیر ہے۔

ڈاکٹر : جہاں گیر؟! (پھر ہنستا ہے ہنسی میں وہی بے نیازی ہے جو عام طور پر مریضوں کی شکایتیں سننے کے بعد ڈاکٹر کی ہنسی میں ہوتی ہے) اچھا میں سمجھا!

نواب : جی ہاں۔ آپ اس کمرے کی آرائش کو دیکھتے ہیں۔ ان مخمل کے پردوں کو دیکھتے ہیں، یہ شمع دان، یہ مشعلیں، فانوس سب اسی انداز سے یہاں رکھنے پڑتے ہیں... جیسے آگرہ کے قلعہ میں رکھے جاتے ہوں گے۔ اتنی بڑی کوٹھی ہے بجلی لگی ہوئی ہے مگر بجلی جلانے کو ترستے ہیں۔

ڈاکٹر : (کچھ محظوظ ہو کر) عجیب بات ہے۔

نواب : آپ میرے لباس کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں مجھے یہ زرق برق خلعت پہننے کا شوق ہے؟ مگر مجبوری ہے ڈاکٹر صاحب، اس چغے، سرپیچ، کلاہ اور عمامے کے بغیر کمرہ سے باہر نکلنا ناممکن ہے۔ میرے اعلیٰ اعلیٰ کوٹ اور پتلونیں سوٹ اور شیروانیاں بکسوں میں بند پڑی سڑ رہی ہیں انھیں پہننے کو ترس گیا ہوں۔

[برابر شور ہوتا ہے اور ایک ملازم میلے کچیلے کپڑے پہنے روتا پیٹتا داخل ہوتا ہے سر پر کالی ٹوپی ہے اور مونچھیں سیاہ ہیں پتلا دبلا آدمی ہے، آنکھوں سے اور بات چیت کے لہجے سے سادگی ٹپکتی ہے۔ داخل ہوتے وقت اپنا بایاں بازو پکڑے ہوئے ہے]

ملازم : دہائی ہے مالک دہائی ہے۔ ہم تو بھر پایا مالک (روتے ہوئے) ہماری تو بس چھٹی کر دو سرکار۔

ڈاکٹر : سراسیمہ ہو کر ملازم کی طرف دیکھتا ہے۔ کیا ہوا؟

ملازم : (ہاتھ جوڑ کر) نواب صاحب کے قدموں میں جھک جاتا ہے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بالک ہیں مہریا ہے ہم جان سے جاتا رہا تو کوئی پانی دیوا خبر لیوا نہیں ان کا سرکار۔

نواب : کیا بات ہوئی عیدو کچھ منھ سے بولے گا بھی۔

ملازم : ہم کیا بتائیں سرکار۔ بس ہماری جان بخشی کردو مالک ہمیں اب معافی دے دو۔

نواب : ارے آخر کچھ بتائے گا بھی یا نہیں۔

ملازم : تلوار لے کر دوڑ پڑے چھوٹے سرکار، ہماری تو لاش ہی ملتی لاش جو بخشی جی نہ پہونچ جاتے میں تو مر گیا اللہ میرے (رونے لگتا ہے)

نواب : ادھر کیوں گیا تھا۔ کس نے تجھ سے کہا تھا، ادھر جانے کے ئے۔

ملازم : گول کمرے میں پھول دان رکھنے کو جارہا تھا حضور مجھے تو یاد نہ رہی انھیں کپڑوں میں چل کھڑا ہوا۔ بس تلوار لے کر جھپٹ پڑے۔ جان سے مار ہی ڈالا تھا (پھر رونے لگتا ہے)

نواب : اچھا جاؤ میر بخشی کو بھیج دو (ملازم عیدو جانے لگتا ہے تو پھر آواز دیتے ہیں) اور دیکھو جا کر فوراً کپڑے بدل لو اب کبھی ان کپڑوں میں ادھر مت جانا۔

ملازم : ترنت بدلتا ہوں سرکار (چلا جاتا ہے)

نواب : دیکھا آپ نے۔ اگر کسی کو اصلی لباس میں دیکھ لیتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ تلوار لے کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے اور بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔

ڈاکٹر : (پریشان ہو کر) تو کیا تلوار بھی ان کی کمر سے بندھی رہتی ہے؟

نواب : (سر سے اثبات کا اشارہ کرتے ہیں۔ پیچوان کا ایک کش لیتے ہیں اور پھر بڑے المناک لہجے میں خود کلامی کے انداز میں کہتے ہیں) کوئی حد ہے اس محرومی کی ہم سب لوگ اپنے اصلی ناموں کے لئے ترس گئے ہیں (پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہوتے ہیں) چار برس ہو گئے گھر میں مجھے اعتماد الدولہ کے سوا اور کسی نام سے نہیں پکارا گیا۔

ڈاکٹر : اعتماد الدولہ (حافظے پر زور ڈال کر) یہ تو جہاں گیر کے وزیر اعظم اور نور جہاں کے باپ کا نام تھا۔

نواب : (پھر اثبات میں سر ہلاتے ہیں)

بیگم : خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب اسے توجہ سے دیکھ لیجئے کسی طرح بھی اسے اچھا کر دیجئے۔ میری بچی عمر بھر آپ کو دعائیں دے گی۔

ڈاکٹر : آپ گھبرائیں نہیں بیگم صاحبہ خدا نے چاہا تو وہ ضرور اچھے ہو جائیں گے ___ آیئے مریض کو دکھایئے (اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

بیگم : (بیگم روکنے کے لئے فوراً ذرا بلند آواز میں کہتی ہے) کہیں ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ ابھی جہاں پناہ خواب گاہ سے باہر نہیں آئے۔

ڈاکٹر : جہاں پناہ، کون جہاں پناہ؟

نواب : ہم اس ڈرامے کو اتنے دن سے لگاتار کھیل رہے ہیں کہ اب ہم ایک دوسرے کو انھیں ناموں سے پکارنے لگے ہیں۔ جہاں پناہ شہنشاہ جہانگیر۔

ڈاکٹر : (اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ) اچھا میں سمجھا۔

نواب : ڈاکٹر شاید تمہیں یہ سب کچھ بڑا عجیب معلوم ہو لیکن ہم سب کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جب مجھے پہلی بار اعتماد الدولہ کے نام سے پکارا گیا تھا تو میں بھی تمہاری طرح ہنسا تھا۔ مگر، اب میں اپنا اصلی نام بھول چکا ہوں۔

ڈاکٹر : تو چلئے مریض کو دیکھنے چلیں۔

نواب : خاموش ذرا آہستہ بولئے، مریض نہیں جہاں پناہ کہئے جہاں پناہ اور ان تک پہونچنا آپ جانتے ہیں، آسان نہیں۔

بیگم : پہلے آپ برابر کے کمرے میں جا کر لباس بدل ڈالئے۔

ڈاکٹر : (حیران ہو کر) لباس؟ کیوں کیا خرابی ہے میرے لباس میں؟

بیگم : غضب خدا کا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کوٹ پتلون اور نکٹائی پہن کر آپ جہاں پناہ کا سامنے زندہ واپس لوٹ سکیں گے؟

نواب : ڈاکٹر ہماری نقلی دنیا میں آئے ہو تو ہماری طرح ہو کر رہنا ہوگا۔ تمہیں بھی مغلیہ دربار کے کپڑے پہنے ہوں گے۔

ڈاکٹر : مغلیہ دربار کا خلعت؟!

نواب : جی ہاں خلعت، چغہ، سرپیچ، مالائے مروارید زربفت کا جوڑا اور جڑاؤ سلیم شاہی اور میری رائے میں نقلی داڑھی مونچھیں بھی موزوں رہیں گی۔

ڈاکٹر : آپ مذاق کر رہے ہیں۔ یہ ناممکن ہے اس طرح تو میں سچ مچ تماشا بن کر رہ جاؤں گا۔

نواب : تماشا؟ ڈاکٹر یہ تماشا نہیں بہت بڑا مذاق ہے جو میں تم سے نہیں کر رہا ہوں۔ قدرت نے ہم سب کے ساتھ کیا ہے۔ ایک لکھ پتی کی بیٹی طلسمات میں گھر گئی ہے اور اس چہیتی لاڈلی بیٹی کے لئے ہم سب کو یہ تماشا کھیلنا پڑ رہا ہے۔ مان جاؤ ڈاکٹر، یہ مذاق نہیں ہے اس کی زندگی کو بچانے کا سوال ہے۔

ڈاکٹر : تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟

نواب : میری رائے میں تم حکیم ہمام بن جاؤ۔

ڈاکٹر : لیکن اگر مجھ سے جہاں پناہ نے کوئی سوال کیا تو میں کچھ بھی نہ کہہ پاؤں گا۔ میں نے ہندستان کی تاریخ کبھی نہیں پڑھی ہے۔

نواب : ذرا ٹھیر جایئے، میں ابھی تاریخ کی کتاب دیکھ کر بتاتا ہوں۔ بیگم ذرا وہ کتاب تو اٹھا دینا (کتاب دیکھتا ہے) ہاں حکیم ہمام....ولایت کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا۔ صدر جہاں کا خطاب پایا جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو اسے چار ہزاری منصب بھی دیا (ڈاکٹر سے) ٹھیک ہے۔ جہاں پناہ حکیم ہمام سے کافی خوش ہوں گے۔

ڈاکٹر : تو میں اسی بہانے جہاں پناہ کا ڈاکٹری معائنہ کرلوں گا۔

نواب : ایک دشواری اور ہے۔

ڈاکٹر : اب اور بھی کوئی دشواری ہے؟!

نواب : ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی شخص کو کچھ بنا کر پیش کرتے ہیں اور جہاں پناہ اسے کچھ اور ہی سمجھ لیتے ہیں اگر خدانخواستہ ایسا ہوا—

ڈاکٹر : (بات کاٹ کر) تو کیا ہوگا؟

نواب : ممکن ہے تمہاری گرفتاری کا حکم صادر ہو جائے یا ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر

کھلوانے کا حکم دیا جائے؟

ڈاکٹر : جی؟

نواب : سپاہیوں کو مشکیں کس کر تمہیں باہر لے جانا پڑے گا اور پھر باہر لا کر تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

(نور جہاں داخل ہوتی ہے۔ مغلیہ دربار کے مرصع کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے)

نور جہاں : ابا جان! ابا جان!!

نواب : کیا ہے۔ بیٹی؟

نور جہاں : ابا جان۔ آج تو صبح ہی سے جہاں پناہ کو غصہ آ رہا ہے۔ خدارا کچھ کیجئے۔

نواب : دیکھو ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر یہ ہے میری بد نصیب بچی ملکۂ نور جہاں۔

ڈاکٹر : آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔

نور جہاں : آج تو آپ کا حضور میں پیش ہونا بہت مشکل ہے ان کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر : کیا بات ہے؟

نور جہاں : یہ میں نہیں جانتی مگر صبح سے کہہ رہے ہیں کہ آج کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ کوئی دشمن سر اٹھانے والا ہے یا کوئی وفادار غداری کرنے والا ہے۔

نواب : کس دشمن کا نام لیتے ہیں؟

نور جہاں : مہابت خاں کا ذکر کرتے ہیں۔

نواب : مجھے یاد آ گیا وہی سردار مہابت خاں جس نے ایک بار جہاں گیر کو دھوکا دے کر اپنے خیمہ میں قید کر لیا تھا۔

نور جہاں : اور شاید جہاں گیر سے نور جہاں بیگم کے قتل کا حکم بھی لکھوا لیا تھا۔

ڈاکٹر : تو آیئے جہاں پناہ کو دیکھنے چلیں۔

نور جہاں : یہ ناممکن ہے۔ آج ان کا مزاج ناساز ہے کسی کو حضوری کی اجازت نہیں مل سکتی۔

ڈاکٹر : مگر آپ تو ملکۂ نور جہاں ہیں، آپ کے حکم سے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

نور جہاں : مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا، میں منع کرتے کرتے تھک گئی مگر وہ شراب کے جام پر جام چڑھائے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر : (حیرت سے) شراب؟!

نور جہاں : ہاں پانی کو رنگین کر کے انھیں دے دیا جاتا ہے، اسی کو وہ شراب سمجھ کر پیتے رہتے ہیں۔

نواب : جہاں پناہ سے ملنے کی ایک تدبیر ہو سکتی ہے۔

نور جہاں : آج کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی ہے۔

نواب : سن تو لو بیٹی۔ ایسا کرتے ہیں کہ انصاف کی اس زنجیر کو جو خواب گاہ میں لٹک رہی ہے کوئی فریادی کھینچے وہ زنجیر تو اسی لئے لٹکائی گئی ہے کہ فریادی جب بھی چاہیں اسے کھینچ کر شہنشاہ کے انصاف کی پناہ مانگ سکیں۔ اس صورت میں تو جہاں پناہ کو دربار میں آنا ہی پڑے گا۔

نور جہاں : آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ اچھا خدا حافظ ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر : تسلیمات ملکۂ عالم۔

(میر بخشی زرہ بکتر اور خود لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)

میر بخشی : خلعت، چغہ اور سرپیچ تو نہیں مل رہے ہیں۔

نواب : نہیں مل رہے ہیں؟ کیا مطلب؟

میر بخشی : جی ہیں تو سہی لیکن حکیم ہمام کی شان کے مناسب نہیں۔ ذرا میلے ہو گئے ہیں۔ (تھوڑی دیر سوچ کر) میری رائے میں تو ڈاکٹر صاحب کو زرہ بکتر اور چار جامہ پہنا دیجئے گا۔ آخر صوبیدار ہیں کہہ دیں گے جنگ سے واپس آ رہے ہیں۔

نواب : خیال اچھا ہے۔ ڈاکٹر اب ذرا جلدی کپڑے تبدیل کر لو۔

ڈاکٹر : (زرہ اور خود سنبھال کر) مگر نواب صاحب خود تو بہت بھاری ہے اور یہ زرہ بکتر تو میرے بدن میں گڑی جا رہی ہے۔

نواب : ذرا سی دیر کی بات ہے ڈاکٹر (میر بخشی سے) تم ڈاکٹر صاحب کو لباس پہنا کر

دربار خاص میں لے آؤ، میں زنجیر کھینچنے کے لئے فریادی کا انتظام کرتا ہوں (نواب چلے جاتے ہیں)۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

[پردہ اٹھنے کے بعد دربار خاص آگرہ کا ایک نقلی نمونہ پیش نظر ہوتا ہے۔ سامنے شہنشاہ جہانگیر کا مرصع اور نقلی ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا تخت ہے۔ سامنے سونے اور چاندی کے رنگوں کے ستون کھڑے ہیں۔ تخت کے پیچھے تھوڑے فاصلہ پر ایک زرنگار چلمن پڑی ہے۔ بیش قیمت فانوس لٹک رہے ہیں اور سنہری فرش نے پوری مغلیہ فضا قائم کردی ہے۔]

ڈاکٹر : (ہر ایک چیز کو غور اور حیرت سے دیکھتا ہوا داخل ہوتا ہے میر بخشی اس کے ہمراہ ہے) دربار؟ حیرت خیز، خوبصورت۔ بہت خوبصورت!!

میر بخشی : جی ہاں فرش کا رنگ سونے کے رنگ سے ملا دیا گیا ہے۔ یہ سامنے کا تخت نقلی جواہرات سے سجا ہوا ہے اور یہ شاہی چھتر نقلی ہوتے ہوئے بھی بہت قیمتی ہے۔ تخت شاہی کے پیچھے چلمن کے پیچھے ملکہ نور جہاں بیٹھی ہیں۔ اور یہ سونے کے ستون کے قریب منصب دار حضور میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر : اور وزیر اعظم۔

میر بخشی : جی ہاں یہاں سب سے اگلی صف میں وزیر اعظم اور خاص شہزادے، پھر راجہ مان سنگھ، ملکۂ عالم کے بھائی آصف خاں، راجہ رایاں بکرما جیت، باز بہادر، خان اعظم، کوکلتاش خاں پھر زین خاں اس کے بعد منصب دار اور یہ درمیان میں میری جگہ ہے۔ یہاں میر بخشی کھڑا رہتا ہے اس کے برابر میر عدل اور میر منشی۔

ڈاکٹر : اب مجھے کیا کرنا ہے؟

میر بخشی : دائیں طرف کے راستہ سے جہاں پناہ داخل ہوں گے پہلے نقیب آواز لگائے گا۔ پھر جہاں پناہ کے داخل ہوتے ہی سب جھک کر آداب بجا لائیں گے اور اس وقت تک جھکے رہیں گے جب تک جہاں پناہ تخت پر نہ بیٹھ جائیں اگر جہاں پناہ آپ کو طلب کریں تو آگے بڑھ کر سات بار آداب بجا لایئے گا اور پھر نذر پیش کیجئے گا۔ دیکھئے اس طرح (نذر پیش کر کے دکھاتا ہے)

ڈاکٹر : بھئی مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا (نواب صاحب داخل ہوتے ہیں)

نواب : میر بخشی انصاف کی زنجیر کھنچی جانے والی ہے۔ سب منصب داروں کو بلا لو۔ (خود اپنی جگہ پر مؤدب کھڑے ہو جاتے ہیں) میر بخشی دروازے سے باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں مختلف منصب دار مغلیہ خلعتوں اور پوشاکوں میں ملبوس ایک ایک دو دو کر کے داخل ہوتے ہیں اور اپنے مراتب کے لحاظ سے کھڑے ہو جاتے ہیں اتنے میں زنجیر کے کھینچے جانے سے گھنٹے کی گرج دار اور گونجنے والی آواز سنائی دیتی ہے جس سے سارا ایوان لرز جاتا ہے اور جو دیر تک ساری فضا پر چھائی رہتی ہے۔ سب لوگ ہیبت اور اشتیاق سے شاہی ایوان کے دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ پہلے چوبدار داخل ہوتا ہے اور اس کے تھوڑی دیر بعد جہاں پناہ۔)

چوبدار : باادب باملاحظہ ہوشیار، نگاہ روبرو، نگہدار عالم، عالمیان ظل سبحانی شہنشاہ جہانگیر جلوس فرماتے ہیں۔

جہانگیر : ہمارے انصاف کو کس نے آواز دی فریادی کو ہمارے حضور میں پیش کیا جائے۔

فریادی : (فریادی ایک معمر آدمی ہے جو درباری پوشاک پہنے ہوئے ہے) عالم پناہ!

جہانگیر : مت گھبراؤ فریادی عالم پناہ کا انصاف تمہارا محافظ ہے بولو تمہیں کس نے دکھ پہنچایا۔ بولو تمہیں کس سے شکایت ہے؟

فریادی : جان بخشی کی جائے تو عرض کروں۔!

جہانگیر : جہانگیر کے انصاف کو مت آزماؤ فریادی۔ اگر تمہارے اوپر ظلم کرنے والا شہنشاہ کا داہنا بازو بھی ہوگا تو یقین مانو ہمارا دوسرا بازو اسے جسم سے کاٹ پھینکے گا۔

فریادی : اَن داتا! سلطنت عالیہ کے رکن رکین مہابت خاں نے میرے لڑکے کو قتل کر دیا۔ دہائی ہے عالم پناہ دہائی ہے۔ تلوار بازی کی مشق میں دونوں میں بات بڑھ گئی۔ میرے لڑکے نے فتح حاصل کی اس پر مہابت خاں کو غصہ آ گیا اور اس نے میرے اکلوتے لڑکے کی پیٹھ میں تلوار گھونپ دی۔

جہانگیر : (متفکر ہو کر) ٹھہرو۔ فریادی ایک لمحہ ٹھہرو۔ تم جانتے ہو مہابت خاں ہماری سلطنت کا ستون ہے اس کے ہمارے اوپر بڑے احسانات ہیں۔

فریادی : مگر جہاں پناہ کا انصاف؟

جہانگیر : اعتماد الدولہ۔

نواب : عالم پناہ۔

جہانگیر : مہابت خاں کو حاضر کیا جائے۔ تم جا سکتے ہو فریادی ہم خود تمہاری طرف سے مہابت خاں سے باز پرس کریں گے۔

فریادی : خدا اقبال دن دونا رات چوگنا کرے۔ پروردگار شہنشاہ کا عدل ابدالآباد تک قائم رکھے۔

جہانگیر : ہم اپنے جاہ و جلال کی قسم کھاتے ہیں فریادی اگر ہماری سلطنت کا یہ محسن بھی مجرم ثابت ہوگا تو انصاف سزا سے ہاتھ نہ روکے گا۔ تم جا سکتے ہو۔ (فریادی رخصت ہوتا ہے جہانگیر کی نظر یکایک حکیم ہمام پر پڑتی ہے وہ گرج کر اعتماد الدولہ کو پکارتا ہے) اعتماد الدولہ!

نواب : عالم پناہ۔

جہانگیر : یہ کون گستاخ ہے جو خلعت اور کلاہ کے بغیر ہمارے دربار میں زرہ بکتر پہن کر چلا آیا ہے۔

نواب : ظل سبحانی آپ انھیں نہیں پہچانتے؟ آپ کی ولایت کے صوبہ دار صدر جہاں حکیم ہمام سیدھے میدان جنگ سے قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

جہانگیر : ہم خوش ہوئے۔ پیش کیا جائے۔

نواب : (سرگوشی سے) سات بار جھک کر سلام کرو نیچی نگاہیں ذرا اور اونچی!

جہانگیر : اعتماد الدولہ۔ تم نے کیا کہا۔ یہ حکیم ہمام ہیں؟ اور آگے آ جاؤ۔ اجنبی اور آگے آ جاؤ

(ڈاکٹر اور آگے بڑھتا ہے)

ڈاکٹر : عالم پناہ.....نذر پیش کرنے ...کی اجازت ...چاہتا ہوں۔

جہانگیر : اور قریب آؤ۔ ہاں نذر پیش کرنے کی اجازت ہے، مگر اعتماد الدولہ تم نے غلط کہا تھا۔ تم سمجھتے ہو ہماری آنکھیں دھوکہ کھا سکتی ہیں۔ یہ حکیم ہمام نہیں یہ حکیم ہمام ہو ہی نہیں سکتے، تم مہابت خاں کو نہیں پہچانتے۔ یہ زرہ پوش مہابت خاں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر : مہابت خاں؟!

نواب : عالم پناہ نے بجا ارشاد فرمایا۔

ڈاکٹر : مگر عالیجاہ میں بہت دور سے.....

جہانگیر : تو آخر تم آ ہی گئے۔ مہابت خاں۔ ملکۂ عالم نے تمہیں طلب فرمایا، ہم نے تمہارے لئے فرمان خاص بھیجا۔ آج آخر کار تم ہمارے حضور میں آئے ہو۔

ڈاکٹر : عالم پناہ.....میری مصروفیات.....

جہانگیر : (گرج کر) مصروفیات؟ شہنشاہ ہندوستان کے فرمان سے زیادہ اہم کون سی مصروفیت ہے۔ ہمیں بتاؤ ہم بھی تو سنیں۔ کابل یہاں سے بہت دور سہی مہابت خاں، مگر مابدولت کی انگلی کے ایک اشارہ پر صوبیدار مہابت خاں کا سر نیزے پر چڑھا کر ہمارے سامنے لایا جا سکتا تھا مگر ہمیں رحم آ گیا۔

ڈاکٹر : سرکار، عالیجاہ، میں ہر خدمت کے لئے...حاضر ہوں۔

جہانگیر : ہم نے سوچا مہابت خاں نے ایک عمر ہماری خدمت گذاری میں بسر کی ہے ہم خون ناحق سے ڈرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ حشر کے روز ہمیں اپنے سے بڑے شہنشاہ کے حضور میں ہر بات کے لئے جواب دہ ہونا ہے اور پھر ملکۂ عالم نے بھی تمہاری سفارش کی ہے۔

ڈاکٹر : ملکۂ عالم کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔

جہانگیر : وہ ملکہ جسے تم اپنا دشمن سمجھتے رہے ہو جس کے خلاف تم سازش کرتے رہے ہو اور

اب فریادی تمہارے ظلم کی فریاد لے کر آیا ہے تم نے اس کے اکلوتے بیٹے کو قتل کر دیا اس جرم کو ہم بھی معاف نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر : رحم عالم پناہ رحم !!

جہانگیر : تم مابدولت کے حضور میں زرہ بکتر پہن کر بغیر اجازت داخل ہوئے تمہیں معلوم ہے یہ جرم ہے۔ میر بخشی اس جرم کی سزا کیا ہے؟

میر بخشی : موت!

جہانگیر : سنا تم نے مہابت خاں۔ لیکن ہم نے تمہیں درگذر کیا۔ پھر تم سات بار کی بجائے صرف چھ بار جھک کر تسلیم بجالائے یہ گستاخی ہے۔ اعتماد الدولہ اس گستاخی کی سزا کیا ہے؟

نواب : پیٹھ کے پیچھے ہاتھ بندھوا کر مجرم کو پورے شہر میں ذلت کے ساتھ گشت کرایا جاتا ہے۔

جہانگیر : ہم نے پھر بھی مہابت خاں کو معاف کر دیا کیونکہ وہ خاندان مغلیہ کا پرانا خادم ہے۔ لیکن ایک بات اور ہے اس کے لئے بھی تمہیں جوابدہ ہونا ہے تمہیں معلوم ہے کہ سلطنت کے خاص خاص امیر جب اپنی اولاد کی شادی طے کرتے ہیں تو ہماری اور ملکۂ عالم کی اجازت طلب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر : مجھے معلوم نہیں عالم پناہ!

جہانگیر : جھوٹ مت بولو مہابت خاں جہانگیر کا انصاف جھوٹ بولنے والے کی زبان حلق سے کھینچ لیا کرتا ہے۔ تم جانتے تھے اور جانتے ہوئے بھی تم نے اپنی لڑکی کی شادی ہماری اجازت کے بغیر ایک امیر زادے سے طے کر دی۔

ڈاکٹر : ج.... ہاں.... پناہ۔

جہانگیر : ہم تمہاری زبان سے اس کی وجہ سننا چاہتے ہیں گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں پورا موقعہ دیں گے لیکن اگر تم ہمیں کوئی معقول جواب دینے سے قاصر رہے تو گورخر کی کھال میں سلوا کر تمہیں ہاتھی کے پاؤں تلے اس طرح کچلوا دیا جائے گا کہ تمہارا نشان تک نہ ملے گا۔

ڈاکٹر : میرے اوپر رحم کیجئے خداوند.... مجھے ایک ...اور موقع دیجئے۔

جہانگیر : اچھا تو تم اپنے خاندان کے معاملات سب لوگوں کے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتے۔ چلو ہمیں یہ بھی منظور ہے۔ اعتماد الدولہ!

نواب : عالم پناہ!!

جہانگیر : شاید مہابت خاں تنہائی میں ہمیں کوئی معقول وجہ بتا سکے ہم تخلیہ چاہتے ہیں۔

(چوبدار آگے بڑھ کر آواز لگاتا ہے۔ ''تخلیہ، تخلیہ، تخلیہ'' اور اس کے ساتھ ہی سارے امیر مؤدب انداز میں رخصت ہو جاتے ہیں)

جہانگیر : بولو مہابت خاں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

ڈاکٹر : عالم پناہ! میں آپ کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی چاہتا ہوں۔ میری جان بخش دیجئے۔

جہانگیر : (تلوار سر کے اوپر رکھ دیتا ہے) ہم اپنی تلوار تمہارے سر پر رکھ کر قسم کھاتے ہیں مہابت کہ ہم تمہاری جان لینا نہیں چاہتے لیکن اگر تم ہمیں کوئی معقول وجہ نہ بتا سکے تو پھر مجبوراً ہمیں اپنی تلوار سے انصاف کا ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر : میں اپنی ساری خطاؤں پر نادم ہوں۔ شرمندہ ہوں۔

جہانگیر : (طنز سے) نادم ہو؟ شرمندہ ہو؟ آؤ میرے قریب آؤ دوست اور قریب آؤ قدموں میں نہ جھکو، اٹھو اٹھ جاؤ اس خود کو اتار پھینکو یہ زرہ بکتر کھول دو، بہروپ بیکار ہے۔

ڈاکٹر : بہروپ؟

جہانگیر : ہاں بہروپ ہم تم سب بہروپیے ہیں۔ یہ ساری زندگی ایک لاجواب اور شاید بے رحم بہروپ ہے، جس میں کوئی اپنی شکل نہیں دیکھ پاتا کوئی اپنی آواز نہیں سن پاتا۔ سب اپنے لفظوں اور اپنے ناموں سے محروم ہیں ہم سب اداکار ہیں، ہم سب تماشائی ہیں۔

ڈاکٹر : (حیرت سے) عالم پناہ۔

جہانگیر : تم حکیم ہمام نہیں ہو، ہم جانتے ہیں تم مہابت خاں بھی نہیں ہو ہمیں یہ بھی معلوم ہے ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے کوئی ہماری نگاہوں سے نہیں چھپ سکتا۔

ڈاکٹر : یہ حضور کیا فرما رہے ہیں۔

جہانگیر : بیٹھ جاؤ، یہاں ہمارے پاس بیٹھ جاؤ، ہم جہانگیر نہیں ہیں تم مہابت خاں بھی نہیں ہو۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے کوئی ہماری نگاہوں سے چھپ نہیں سکتا۔

ڈاکٹر : یہ حضور کیا فرما رہے ہیں؟

جہانگیر : بیٹھ جاؤ، ہمارے پاس بیٹھ جاؤ، ہم جہانگیر نہیں ہیں تم مہابت خاں نہیں ہو لیکن سوچو ذرا سوچو تو سہی یہ کتنا عجیب کتنا اچھا لگتا ہے کہ ہم تم اور اس محل سرا کے سب لوگ وقت کے خوفناک نشانات سے دور زمانہ کی دسترس سے الگ تاریخ کے ورق میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ ہمارا نہ کوئی حال ہے نہ مستقبل ہمیں آنے والے خطروں کا، قسمت اور اتفاقات کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہماری زندگی زمانے اور تقدیر سے بالاتر ہے۔

ڈاکٹر : تو کیا آپ سچ مچ...؟

جہانگیر : ہاں دوست (قہقہہ لگا کر) ہاں تمہارا خیال شاید ٹھیک ہے (اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، ٹہلنے لگتا ہے، ڈاکٹر اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے) اور دیکھو میرا خیال بھی کتنا درست ہے (ڈاکٹر کا خود اور زرہ بکتر اتار کر پھینک دیتا ہے جسے ڈاکٹر زمین پر سے اٹھا لیتا ہے) تم دہلی کے مشہور ڈاکٹر فریدوں ہو (قہقہہ لگا کر) ڈاکٹر فریدوں!

ڈاکٹر : تو آپ مجھے پہچانتے ہیں (دونوں ٹہلتے ٹہلتے اسٹیج کے دوسرے سرے تک آجاتے ہیں)

جہانگیر : بہت اچھی طرح، مگر تم مجھے نہیں پہچانتے میں تمہیں بتاتا ہوں اس وقت کی بات ہے جب تاریخ لکھی جانا شروع نہیں ہوئی تھی۔ سن رہے ہو؟

ڈاکٹر : میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔

جہانگیر : بہت دنوں کی بات ہے جب یونیورسٹی سے بی اے کر کے نکلا تھا میرے ماں باپ غریب تھے کسی طرح فاقے کر کے اور مصیبتیں جھیل کر انھوں نے مجھے پڑھوایا تھا۔ دوسرے ہزاروں نوجوانوں کی طرح میں بھی یونیورسٹی سے بڑے بڑے خواب لے کر نکلا تھا۔ زندگی کو خوبصورت بنانے کے خواب اپنے خاندان کو

انسانیت کو خوشیوں سے بھر دینے کے خواب!

ڈاکٹر : پھر کیا ہوا؟

جہانگیر : نواب صاحب مجھ سے اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتے تھے مجھے گھر داماد بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ میرے ماں باپ کی بھی یہی مرضی تھی۔ مگر میں دولت کے بدلے بک جانے پر راضی نہیں تھا۔ سچ کہتا ہوں، ڈاکٹر میری روح کسی اور آواز کے لئے تڑپ رہی تھی۔

ڈاکٹر : وہ کون تھا؟

جہانگیر : بتاتا ہوں مجھے دولت کے بدلے بک جانے سے انکار تھا۔ کتنا بے وقوف تھا میں بھی۔ میں ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ ہم سے بھی زیادہ غریب تھے لیکن وہ بچپن ہی سے میرے ساتھ پلی بڑھی تھی۔ میں نے اس سے شادی کر لی۔ سرائے کی کوٹھری کی میلی کچیلی دیواریں، ٹوٹی چارپائیاں، ٹوٹے پھوٹے بکس، برتن ــــ یہ سب کچھ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومتے ہیں۔ وہ دبلی پتلی کامنی سی لڑکی میلے کچیلے کپڑے پہنے حیران پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا کرتی تھی۔ وہ دیکھو۔ وہ دیکھو! وہ اب بھی اسی طرح کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے۔ وہ دیکھو!

ڈاکٹر : کہاں! مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آتا!

جہانگیر : میں جب ملازمت کی ناکام تلاش سے تھک ہار کر آتا تو وہ اسی طرح انہی پر امید نگاہوں سے میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ (آپ ہی آپ ہنستا ہے) میں اسے ''انارکلی'' کہتا تھا نا۔ وہ مجھ سے ہر مرتبہ پوچھتی تھی ''میری سلطنت کہاں ہے، میری سلطنت کہاں ہے صاحب عالم''؟

(تھوڑی دیر خاموشی، جہانگیر کا چہرہ کسی قدر سخت ہو جاتا ہے)

جہانگیر : دلی کی جاگتی جگمگاتی سڑکوں پر پاگلوں کی طرح منڈلاتا پھرا ہوں۔ ہر دفتر کے چکر کاٹے۔ دوست بدل گئے، یار آشنا بدل گئے، ملنے والوں کی نظریں بدل گئیں۔

جگمگاتی ہوئی دکانوں میں سجی ہوئی چیزیں مجھ سے آنکھ ملا کر پوچھتیں ”تمہیں ہماری ضرورت ہے؟ تم نے تو انارکلی کو سجانے کی قسم کھائی تھی بولو جواب دو“۔ ہر چیز میرا منہ چڑھاتی تھی، مذاق اڑاتی تھی۔

(جہانگیر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور اسٹیج پر ٹہلنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر غور اور حیرت سے اس کی حرکات کا معائنہ کر رہا ہے۔)

جہانگیر : آخر ایک دن مجھے ایک پریس میں کمپوزیٹر کی جگہ ملنے کی امید بندھی۔ اس دن میں خوشی سے زمین پر پاؤں نہ رکھتا تھا۔ بے خود ہو کر میں یہ خبر انارکلی کو سنانے پہنچا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمارہا تھا اس کی آنکھوں میں تھکن اور مایوسی تھی۔ خوش خبری سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر دوڑ گئی۔

ڈاکٹر : وہ بیمار تھی؟

جہانگیر : اس بار تمہاری تشخیص غلط نہیں ہے۔ ڈاکٹر! وہ بیمار تھی، اس کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔

[پھر بیٹھ جاتا ہے اور اسی طرح کرب سے ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے]

اس کا بخار کسی وقت نہیں اترتا تھا، سرسام کی حالت میں وہ اکثر بڑبڑاتی رہتی تھی۔ تم مجھے نہیں پہچانتے ڈاکٹر فریدوں میں وہی پریشان حال اور غریب آدمی ہوں جسے تمہارے دواخانے سے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا تھا۔ تم صبح کو صرف چند مریض مفت دیکھتے تھے نا اور میرے پاس تمہاری فیس کے لئے روپے نہیں تھے۔ میں چلاتا رہا۔ تمہارے مطب میں کسی نے میری فریاد نہیں سنی۔ میں چلاتا رہا اور تمہارے کمپاؤنڈروں نے دھکے دے کر مجھے مطب کے باہر نکلوا دیا۔ تمہارے مطب کے سامنے فٹ پاتھ پر میری کائنات دم توڑ رہی تھی، سرسام کی حالت میں وہ بڑبڑا رہی تھی۔

[جہانگیر پر وہی کرب طاری ہو جاتا ہے اس کی آواز دکھ کے بوجھ سے بھرا جاتی ہے اور وہ انارکلی کی طرح سرسامی انداز میں بڑبڑانے لگتا ہے]

”اف..... کتنی تھکن ہے... کتنا لمبا سفر ہے۔ میرے خواب تو مجھ سے نہ چھینو۔

میرے گیت میرے پھول... میرا پیار... یہی میری سلطنت۔ خدارا میری سلطنت مجھ سے نہ چھینو... کوئی نہیں سنتا۔ چھینے لئے جاتے ہیں... انھیں روکو... صاحب عالم... انھیں روکو... مجھے زندہ دیوار میں چنے دیتے ہیں... میرا دم گھٹا جا رہا ہے...

[ڈاکٹر گردن جھکائے ندامت کے ساتھ سارا قصہ سن رہا ہے۔ جہانگیر اس واقعے کو بیان کر کے غیظ و غضب کی تصویر بن جاتا ہے]

جہانگیر : انارکلی مرگئی (سسکنے لگتا ہے) ایک بار اور انارکلی اینٹوں میں چن دی گئی۔ میں نے اسے دفن کیا، بڑے دکھ کے ساتھ دفن کیا ڈاکٹر۔ تم نے اسے دیکھنے سے انکار کیا تھا۔ تم نے اسے مار ڈالا۔ میں نے اسے مار ڈالا۔ ہم سب قاتل ہیں! ہم سب خونی ہیں۔

ڈاکٹر : مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے ندامت ہے۔

جہانگیر : اور پھر کیا ہوا؟ جب مجھے ہوش آیا تو میری آنکھوں سے سارے نقاب ہٹ چکے تھے۔ دنیا صرف ایک محور پر گھوم رہی تھی۔ روپیہ! روپیہ!! روپیہ!!! باقی تمہاری ساری قدریں موم کے بت ہیں۔ تمہارا علم، انسانی زندگی کے نام پر بنائے ہوئے سارے منصوبے! سب کاغذ کے پھول ہیں اور یہ کاغذ کے پھول یہ موم کے بت جل جل کر گل گل کر میرے سامنے بکھر رہے تھے، میں دولہا بنا ہوا تھا۔ شہنائیاں بج رہی تھیں، میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا تھا (قہقہہ) میں نے اپنے سارے خوابوں کو بیچ دیا تھا۔

ڈاکٹر : اور اس وقت گھوڑے پر سے گر کر آپ کے چوٹ لگی۔

جہانگیر : اور اس کے بعد ساری دنیا بدل گئی، وہ چہرے جو مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھر لیتے تھے میرے پیسے کی تان پر ناچ رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر فریدون جس نے دھکے دے کر مجھے اپنے دواخانے سے باہر نکلوا دیا تھا آج میرے لئے بہروپ بھر کر میرے قدموں پر سر جھکانے آیا ہے۔ موم کے سارے بت اپنے شہ نشینوں کے ساتھ آج میری ٹھوکروں میں پڑے ہوئے ہیں (ایک اور وحشیانہ قہقہہ)

ڈاکٹر : تو کیا سچ مچ آپ پاگل نہیں ہیں؟

جہانگیر : شاید میں پاگل ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں تم لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ شاید میں پاگل ہوں۔ تمہاری اس ننگی تہذیب کے سارے خول ایک ایک کر کے میرے روبرو گر چکے ہیں۔ تم اپنے کو اس آئینے میں دیکھو، تم بھی تو چاندی کے چند سکوں کے پیچھے بھاگ رہے ہو اور بس ___ اور اسے تم نے کیسے کیسے دل فریب نام دے رکھے ہیں۔ علم! سائنس!! عزت!!! ملک! قوم!! مذہب!!! ہم سب بہروپیے ہیں میرے دوست!

ڈاکٹر : یہ بھی تصویر کا ایک رخ ہے۔

جہانگیر : اور یہی اصل رخ ہے میرے دوست! تقدیر اور تاریخ کی باگ آج ہمارے ہاتھ میں ہے ہم اسے جس طرف چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں۔ اس وقت تم نے مجھے دھکے دے کر نکلوا دیا تھا۔ آج ہم تمہیں باہر نکل جانے کا حکم دیتے ہیں۔ نکل جاؤ۔ دور ہو جاؤ۔ میرے سامنے سے دور ہو جاؤ!

[جہانگیر غصے میں تلوار کھینچ لیتا ہے۔ ڈاکٹر گھبرا کر دروازے سے باہر چلا جاتا ہے۔ جہانگیر تھوڑی دیر تک بے قراری کے ساتھ ٹہلتا رہتا ہے پھر گھنٹے پر ضرب لگاتا ہے]

[میر بخشی داخل ہو کر تسلیمات بجالاتا ہے۔]

میر بخشی : کیا جہاں پناہ نے غلام کو طلب فرمایا۔

جہانگیر : بلاؤ دربار خاص کے سارے امیروں کو۔ ابھی ہمیں بہت سے ضروری فیصلے کرنے ہیں۔

میر بخشی : فرمان شاہی کی تعمیل کی جائے گی۔

[میر بخشی رخصت ہو جاتا ہے، جہانگیر چند لمحے اسی عالم اضطراب میں ٹہلتا رہتا ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں سارے امرائے سلطنت اپنے مراتب کے لحاظ سے مناسب جگہوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن اعتماد الدولہ اور ڈاکٹر موجود نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر پر اسرار سناٹا طاری رہتا ہے]

جہانگیر : میر بخشی۔ سارے اراکین سلطنت آگئے؟

میر بخشی : عالم پناہ۔ سب حاضر ہیں۔

جہانگیر : ہماری سلطنت کے سارے امیر حاضر ہیں۔ دیوانِ خاص کے سارے ستون یک جا ہیں۔ مگر اعتماد الدولہ نہیں آئے۔

میر بخشی : وزیر اعظم مہابت خاں کے ساتھ ابھی حاضر ہوتے ہیں۔

جہانگیر : بہت خوب ___! (تھوڑی دیر وقفہ) ہماری سلطنت کے جانباز وفادارو! ہم کبھی سوچتے ہیں کہ ہماری زندگی خواب ہے اور ہم سب خواب میں ایک دوسرے سے مل بیٹھے ہیں۔ تاریخ نے نہ جانے کتنے بادشاہوں کو افسانہ بنا دیا۔ کتنی سلطنتیں وقت کی ایک لہر نے پانی کے بلبلے کی طرح مٹا ڈالیں۔ اگر کبھی ہمارا یہ وہم سچا نکلا اور یہ سب کچھ خواب ہی ثابت ہوا تو!___

میر بخشی : عالم پناہ یہ کیا فرماتے ہیں!

جہانگیر : ایک بات کا وعدہ کرو گے۔

میر بخشی : عالم پناہ کے ہر فرمان پر جان نچھاور کرنا خادم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

جہانگیر : وعدہ کرو۔ اگر یہ سب کچھ خواب ہو جائے تو بھی تم سب ہمیں برائی سے یاد نہ کرو گے۔ ہمارے بے نام ونشان ہو جانے پر بھی اس جہانگیر کو یاد کر لیا کرو گے جو ان سب سے محبت کرتا تھا۔

[اعتماد الدولہ داخل ہوتا ہے اور دروازے ہی سے گرج کر کہتا ہے]

اعتماد الدولہ : یہ کیا مذاق ہے؟ یہ ناٹک بند کرو۔

جہانگیر : مذاق!؟ یہ لفظ کس نے استعمال کیا؟

اعتماد الدولہ : میں نے استعمال کیا! تم پاگل نہیں ہو۔ میں پوچھتا ہوں۔ سب کیا مذاق ہے؟

جہانگیر : پاگل کون ہے؟ اعتماد الدولہ تمہیں اس گستاخی کی جرأت کیسے ہوئی؟

اعتماد الدولہ : مجھے ڈاکٹر نے سب کچھ بتا دیا۔

جہانگیر : ہم پاگل؟ ہم پاگل نہیں ہیں یا شاید پاگل ہیں؟ یہ دراصل ہمارے اوپر نہیں تمہارے اوپر منحصر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم تمہیں پہچانتے ہیں۔ یہ میر بخشی، یہ اعتماد الدولہ، یہ

جھرو کہ ہے، یہ دیوان خاص اور وہ ملکۂ نور جہاں۔ لیکن ہم نے تو فقط تمہارے چہروں سے نقاب اٹھایا ہے۔ اسے تم پاگل پن کہتے ہو؟ کہو! ہمیں تمہاری پروانہیں بات صرف اتنی ہے کہ شہنشاہ جہانگیر سے مہابت خاں نے غداری کی ہے۔

ڈاکٹر : مگر میں نے فقط اتنی بات کہی ہے کہ جسے عام طور پر پاگل پن کہا جاتا ہے اس حالت میں بھی کوئی انسان مکمل طور پر پاگل نہیں ہوتا کبھی کبھی پاگل کا ذہن بھی وقتی طور پر ٹھیک کام کرنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ پاگل نہیں ہوتا اور دانشمندی کے ان لمحوں میں اس کا ذہن اور اس کی یادداشت دانشمندوں سے کہیں بڑھ کر کام کرتی ہے۔ میں نے ابھی ایسے ہی لمحوں کا ایک نمونہ دیکھا ہے۔

جہانگیر : خاموش۔ غدار! تو نے ہماری رعایا کے ایک فرد کو جان سے مار دیا۔ تو نے اپنے شہنشاہ سے دغا کی۔ تو مجرم ہے۔ فریادی ٹھیک کہتا ہے۔ میر بخشی۔ مہابت خاں کو گرفتار کرلیا جائے۔

میر بخشی : بہت بہتر۔

اعتمادالدولہ : خبردار، میر بخشی۔ یہ پاگل نہیں ہے۔ خبردار، ڈاکٹر کو ہاتھ نہ لگانا۔

جہانگیر : میر بخشی، حکم کی تعمیل کی جائے۔ شہنشاہ کا انصاف اتنی دیر انتظار نہیں کرسکتا۔ میر بخشی!

[میر بخشی گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ اعتمادالدولہ اسے اشارے سے روک دیتے ہیں]

ڈاکٹر : میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔

جہانگیر : تو ٹھہرو۔ ہماری تلوار کو انصاف کا فرض ادا کرنا ہوگا۔

[تلوار سے حملہ کردیتا ہے۔ ڈاکٹر زخمی ہوجاتا ہے اور خون کا فوارہ پھوٹ نکلتا ہے۔ سارے مجمع میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ کچھ لوگ ڈاکٹر کو اٹھا کر اسٹیج سے باہر لے جانے لگتے ہیں، جہانگیر پر غصے اور انتہائی غیظ و غضب کے آثار طاری ہیں اور پاگلوں کی طرح چلا رہا ہے۔ منہ سے غصے میں جھاگ نکل رہے ہیں]

جہانگیر : اس زخمی سپاہی کو شہر کی سب سے اونچی فصیل سے نیچے لٹکا دو تا کہ دنیا کو معلوم ہو کہ جہانگیر کا انصاف جرم اور بغاوت کی سزا دینا جانتا ہے۔ لے جاؤ (بہت اونچی آواز میں) ہم حکم دیتے ہیں۔ ہم نافرمانی برداشت نہیں کریں گے۔ ایک ایک گستاخ اور نافرمان کا سر کچل ڈالیں گے۔ خون کر دیں گے۔

اعتمادالدولہ : عالم پناہ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔

جہانگیر : قتل کر دیں گے! خون کر دیں گے (بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

اعتمادالدولہ : جہاں پناہ کو پھر بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا۔

[نور جہاں گھبرائی ہوئی اسٹیج کے بائیں طرف سے داخل ہوتی ہے اور جہانگیر کو سنبھال لیتی ہے۔ باقی سب لوگ حیران اور استعجاب کے عالم میں کھڑے ہیں]

نور جہاں : یہ آپ نے کیا کیا؟ ابا جان۔ آپ سمجھتے ہیں جو کچھ انھوں نے ڈاکٹر سے کہا وہ سچ ہے؟ ممکن ہے وہ سب کچھ جھوٹ ہو۔ ممکن ہے وہ بھی دیوانے کی بڑ ہو۔ اور اگر وہ سب کچھ سچ بھی ہو تو کیا پاگل پن میں آدمی کبھی کبھی ہوشمندی کی باتیں نہیں کرتا؟ اتنے خلوص اور اتنی محبت کا آدمی فریبی نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

اعتمادالدولہ : اس نے ڈاکٹر کو سخت گھائل کر دیا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ بیٹی!

نور جہاں : ہائے میرے اللہ! تو گویا اب ان کا اچھا ہونا کبھی ممکن نہ ہوگا۔ اب ان کی زندگی اور ہماری عزت کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمر بھر پاگل کہے جائیں۔ نہیں تو عدالت انھیں مجرم کہے گی۔ انصاف انھیں کبھی نہ بخشے گا۔ یہ آپ نے کیا کیا ابا جان آج سے وہ ہمیشہ کے لئے پاگل رہنے پر مجبور ہو گئے — میرے شہنشاہ! میرے مجبور شہنشاہ!!

(رونے لگتی ہے)

پردہ گرتا ہے

☆☆☆

فٹ پاتھ کے شہزادے

کردار:

نوجوان: عمر تقریباً تیس سال، قبول صورت اور خوش پوشاک شخص ہے لیکن آنکھوں سے عیاری اور چالاکی ٹپکتی ہے، گفتگو میں تیزی، بلا کا اعتماد اور بے تکلفی۔

نرگس کینٹن والا: پچیس سالہ فیشن ایبل اور خوش حال عورت جس میں حسن کے ساتھ ساتھ دوشیزگی کا الھڑپن ابھی تک باقی ہے۔

ڈنڈر ہیڈس : ستائیس سالہ نوجوان جو امریکن لہجہ میں انگریزی بولنے پر اصرار کرتا ہے اور چال ڈھال اور لباس کے اعتبار سے اپنے کو بے حد ماڈرن ثابت کرنا چاہتا ہے اور ہر وقت فلمی دنیا کے خواب دیکھتا ہے۔

سیٹھ : ایک ادھیڑ عمر مگر زندہ دل بوڑھا بنیا جو ہر چیز کو کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے باتیں چبا چبا کر کرتا ہے۔

شہزاد : ایک بتیس سالہ آرٹسٹ جو تصورات کی دنیا میں بستا ہے۔

مسٹر کینٹن والا : تیس پینتیس سال کا خوبصورت اور بارعب انسان چند خوش پوشاک ملکی اور غیر ملکی مسافر جن کی عمریں مختلف ہو سکتی ہیں۔

زمانہ : حال

مقام : بمبئی

نوٹ : او ہنری کی ایک کہانی سے متاثر ہو کر۔

پہلا منظر

[بمبئی کے ہوائی اڈے کا ویٹنگ روم۔ ایک بڑا سا ہال ہے۔ جس کے صرف دو حصے دکھائی دے رہے ہیں ان میں سے ایک طرف کاؤنٹر پر ایر انڈیا انٹرنیشنل کا بورڈ اور نشان لگا ہوا ہے اور دوسری طرف کاؤنٹر پر ایر انشورنس کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

کاؤنٹر پر دو خوبصورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے ابھی کام کرتے کرتے رکی ہیں تھوڑی دیر میں یہ لڑکیاں کاؤنٹر کے پیچھے والے کمروں میں جاتی آتی رہتی ہیں۔ دائیں طرف ایک گیلری ہے۔ جس پر ریستوراں کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راستہ ریستوراں کی طرف جاتا ہے۔ اسٹیج کے بالکل پشت پر سامنے کی طرف ایک گیلری ہے جو ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔ بائیں ہاتھ کو جو راستہ جاتا ہے اس پر 'ایکزٹ' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ باہر جاتا ہے اس گیلری کے ٹھیک اوپر لاؤڈ اسپیکر کا جالی دار ڈبہ لگا ہوا ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے اس وسیع کمرے کے درمیان میں لگے ہوئے مختلف لکڑی کے بغیر ہتھے کے صوفوں میں سے ایک پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا ہے۔ یہ صوفے خاصے قیمتی اور خوبصورت ہیں اور ان مسافروں کے لئے بچھا دیئے گئے ہیں جو اپنے ہوائی جہاز کا انتظار کرنے کے لئے یا کسی دوست کے استقبال کے لئے آئے ہیں۔

ابھی اس نوجوان نے دو تین ہی کش لئے ہوں گے اور کاؤنٹر پر کام کرنے والی لڑکیوں کو ایک بار نظر بھر کر دیکھا ہوگا کہ لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوتا ہے بعد میں انگریزی میں اور پہلے ہندوستانی میں۔

''دہلی سے آنے والا انڈین ایر لائنز کا ڈکوٹا ہوائی جہاز چند سکنڈ میں آنے والا ہے۔ یور اٹن شن پلیز۔

INDIAN AIRWAYS ANNOUNCES THE ARRIVAL OF

DAKOTAUAC - 29 FROM DELHI.... THANK YOU.

یہ اعلان نوجوان بڑے غور سے سنتا ہے اور سگریٹ کو سامنے ایش ٹرے میں مسل دیتا ہے ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتا ہے اور ایک بارگی اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔ اتنے میں مختلف مسافر جن کے ہاتھ میں بیگ اور اٹاچی کیس وغیرہ ہیں اسٹیج کے پشت والی گیلری سے داخل ہوتے ہیں۔ یہ مختلف ملکوں کے رہنے والے لوگ ہیں۔ انگریز، ایک یا دو امریکی، کچھ افریقی اور باقی ہندوستانی مرد اور عورتیں۔ ان لوگوں پر سفر کے اثرات نمایاں ہیں، کچھ ریستوراں کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ کچھ صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں، نوجوان ان میں سے ہر مرد اور عورت کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتا ہے اور مختلف طریقوں سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے کچھ وقفے کے بعد نرگس کینٹن والا ایک چھوٹا سا ایر بیگ لٹکائے داخل ہوتی ہے۔ نوجوان ایک دم اس کی طرف بڑھتا ہے اور گیلری سے نکلتے ہوئے اسے جالیتا ہے]

نوجوان : (گرمجوشی سے) ہیلو، کہئے سفر تو اچھا رہا۔ کب سے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ آسمان کو تکتے تکتے آنکھیں رہ گئیں تب کہیں ہوائی جہاز دور سے ایک ننھے منے تارے کی طرح نظر آیا۔

نرگس : جی.... معاف کیجئے گا، آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔

نوجوان : غلط فہمی؟! غلط فہمی تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں دنیا میں کسی ایسے جاندار کا نام لیجئے جسے غلط فہمی نہ ہو۔ انسان کو غلط فہمی ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔

نرگس : میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ میرا مطلب ہے میں نے اس سے پہلے کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔

نوجوان : خیر۔ یہ معاملہ تو یادداشت کا ہے اور کبھی کسی ذہین آدمی کی یادداشت اچھی نہیں ہو سکتی

صرف بیوقوف آدمی یاد رکھتے ہیں کیونکہ ان کے دماغ خالی ہوتے ہیں۔ (اس صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے جس پر پہلے وہ بیٹھا ہوا تھا) آیئے تشریف رکھئے۔

نرگس : (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) شکریہ۔

نوجوان : بات یہ ہے کہ مادام نورا باٹلی والا کہ۔

نرگس : (بات کاٹ کر) معاف کیجئے گا میرا نام باٹلی والا نہیں ہے نرگس کینٹین والا ہے۔

نوجوان : شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ دراصل بات یہ ہے کہ میری زندگی کے چند اصول ہیں اور ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ نوجوانوں کو ہر اصول توڑنا چاہیئے۔ میں پوچھتا ہوں کیا ستم ہو گیا اگر میں اس سے پہلے آپ سے کبھی نہیں ملا۔ کیا واقعی یہ بات اہم ہے۔ جب بھی آپ سے ملتا یا کسی سے بھی ملتا اتفاق اور حادثہ ہی ہوتا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ حادثہ آج ہی ہوا۔

نرگس : تو آپ کا مطلب ہے کہ آپ مجھ سے کبھی نہیں ملے۔

نوجوان : جی۔

نرگس : اور آپ مجھے بالکل نہیں جانتے تھے پھر بھی آپ میرا انتظار کر رہے تھے۔

نوجوان : جی ہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں آنے والے لمحوں کا اسی شدت سے انتظار کیا کرتا ہوں اور آنے والے لمحوں کو کون جانتا ہے۔ آپ جانتی ہیں نوجوانی اور بڑھاپے میں کیا فرق ہے۔ جوانی آنے والے لمحوں کی طرف دیکھتی ہے اور بڑھاپا گزرے ہوئے لمحوں کی طرف۔ ہر نوجوان آنے والے انجانے لمحے کا انتظار کرتا ہے۔ کیا تعارف کے لئے اتنی بات کافی نہیں ہے۔

نرگس : بالکل کافی نہیں ہے۔ آپ اس طرح ایک اجنبی عورت سے تعارف کے بغیر بات کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

نوجوان : تعارف اور کیسے ہوتا ہے؟ آپ کا نام تو مجھے معلوم ہی ہو گیا۔ ویسے آپ کو جاننا کہاں ہے۔ آپ یقین مانئے میں نہ کسی ہوٹل کا منیجر ہوں، نہ سی آئی ڈی انسپکٹر۔ آپ مجھے نہایت اطمینان سے اپنا پورا حدود اربعہ بتا سکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے

اگر آپ چاہیں تو۔

نرگس : دیکھئے مسٹر، آپ خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، مجھے یہ انداز بالکل پسند نہیں۔

نوجوان : مادام۔ مجھے یہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ میں سو فی صدی ڈیموکریسی کا قائل ہوں اور اتنی بات میں نے مڈل اسکول ہی میں پڑھ لی تھی کہ ہر انسان کی پسند الگ الگ ہوتی ہے۔

نرگس : آپ خاموش نہیں بیٹھ سکتے؟

نوجوان : بیٹھ تو سکتا ہوں مگر ہر وقت نہیں۔ پھر آپ شاید اس بات سے قطعی واقف نہیں کہ خاموشی سے کبھی دنیا میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا بکواس کرتے رہنے سے بہت سارے مسئلے حل ہوئے ہیں۔ اب خاموش رہنا لازمی قرار دے دیا جائے تو پارلیمنٹ اور اسمبلیاں ٹوٹ جائیں، سیاسی جماعتیں ختم ہو جائیں لیڈروں کا دیوالہ نکل جائے اسکول اور کالج بند ہو جائیں۔ یو۔این۔او کی غلام گردشوں میں الو بولنے لگے۔ بولنا کارِثواب ہے۔

نرگس : میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ آپ یہاں سے چلے جایئے پلیز!

نوجوان : شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ میں وقت آنے پر خود ہی چلا جاؤں گا۔

[اس درمیان میں مختلف مسافر ہال میں گردش کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور کچھ تھوڑی دیر کے لئے صوفوں پر بیٹھتے ہیں ایک نوجوان بے ڈھنگے طریقے پر پاؤں پھیلائے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا ہے آنکھیں بند ہیں جیسے سونے کی کوشش کر رہا ہو کبھی کبھی ایک آنکھ کھول کر نرگس اور نوجوان کی طرف ناگواری کے انداز میں دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے]

نوجوان : (بات جاری رکھتے ہوئے) مگر ابھی تو میں نے آپ سے وہ ضروری بات بھی نہیں کہی ہے جس کے لئے میں یہاں تک آیا ہوں۔

نرگس : تو خدا کے لئے جلدی کہئے اور جایئے۔

نوجوان : قصہ یہ ہے مادام نرگس کینٹین والا کہ میں ان دنوں ایک عجیب مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں اور اگر میرا تجربہ غلط نہیں تو ایسی تمام خواتین جن کا نام کینٹین والا وغیرہ پر ختم ہوتا ہے، مجھ جیسے نیک مگر آفت زدہ نوجوانوں کو مصیبت سے نکالنے میں کافی دلچسپی لیا کرتی ہیں۔

نرگس : میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھی۔ آپ مصیبت میں ہیں! Impossible آپ مذاق کر رہے ہیں۔

نوجوان : آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مادام نرگس کینٹین والا۔ ہماری سوسائٹی کا یہی حال ہے، بال بکھرا کر، ٹھنڈی سانس بھر کر اور منحوس صورت بنا کر بات نہ کہی جائے تو یہاں مذاق سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کوئی اس غم کو سمجھتا ہی نہیں جو مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ برداشت کر لیا جائے۔

نرگس : خدارا فلمی ڈائلاگ میں باتیں نہ کیجئے۔ اگر آپ واقعی پریشان ہیں تو بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔

نوجوان : آفت یہ ہے، مادام کہ مجھے اس عظیم الشان شہر بمبئی میں ایک نام اور ایک پتے کی ضرورت ہے۔

نرگس : کیا آپ پہلی بار بمبئی آئے ہیں۔

نوجوان : جی نہیں خاکسار پچھلے آٹھ دس برس سے اس شہر کی سڑکیں ناپ رہا ہے اور اس کی ایک ایک گلی سے اچھی طرح واقف ہے۔

نرگس : پھر آپ کو کس کا پتہ چاہئے۔

نوجوان : پتہ ہی نہیں محترمہ، ایک نام اور ایک اچھا سا پتہ۔ مجھے اپنے لئے ایک نام اور ایک اچھا سا پتہ چاہئے۔

نرگس : اپنے لئے؟ (ہنستی ہے) تو کیا آپ کا کوئی نام نہیں ہے؟ How Silly

نوجوان : آپ کو بڑا عجیب لگتا ہے نا؟ اس شہر میں بمبئی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کا سچ مچ کوئی نام ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ یہ جو ہزاروں آدمی سڑکوں پر، بسوں میں، ٹرام

میں چل پھر رہے ہیں ان کا کوئی نام ہے۔ ممکن ہے اس کرسی کا کوئی نام ہو جس پر یہ دفتر میں جا کر بیٹھتے ہیں، ممکن ہے اس وردی کا کوئی نام ہو جو انھیں پہنتی ہے مگر یہ ـــــ یہ سب تو فقط خالی چہرے ہیں، خالی جسم ہیں، جن کا کوئی نام نہیں۔

نرگس : (پھر ہنستی ہے) آپ تو اچھی خاصی شاعری کرنے لگے۔

نوجوان : جی نہیں۔ سچ بات ہے۔ یہاں نام اور پتے بینک بیلنس کی ڈوری سے لٹکا کرتے ہیں، سچ پوچھئے تو مجھے اپنے نام کی بھی کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ میرے پاس کوئی پتہ نہیں ہے۔ رات گزارنے کے لئے تو فٹ پاتھ خاصی پر فضا جگہ ہے، انسان فطرت سے قریب رہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا کوئی پتہ Postal Address نہیں ہو سکتا۔

نرگس : اوہ، میں تو سمجھی تھی آپ راستہ بھول گئے ہیں۔

نوجوان : بمبئی میں راستے ہی کتنے ہیں جو کوئی بھولے۔ ایک فٹ پاتھ کو جاتا ہے دوسرا سیدھا سمندر کو جاتا ہے اور پھر وہاں سے کہیں نہیں جاتا اور تیسرا ایلڈ وریڈو کو جاتا ہے، سونے کا شہر EL Dorado

نرگس : آپ کے خیال میں آپ کس راستے پر ہیں۔

نوجوان : اسی سلسلے میں تو میں آپ کی مدد چاہتا ہوں مادام نورا باٹلی والا۔

نرگس : دیکھئے میں آپ کو بتا چکی ہوں میرا نام نورا باٹلی والا نہیں ہے۔

نوجوان : شکریہ۔ لیکن میرے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ آپ کا نام مادام نورا باٹلی والا بھی ہو سکتا تھا، مجھے امکانات سے عشق ہے۔ حقیقتیں!! ہونہہ، ان کی مجھے پروا نہیں۔ آخر آپ کو اس نام سے چڑ کیوں ہے؟

نرگس : مجھے چڑ نہیں لیکن یہ میرا نام نہیں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔

نوجوان : بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ مطلب میرا ہی ہے۔ بات یہ ہے مادام کہ میں نے ایک اچھے نام اور باعزت پتے کی جاں کاہ تلاش میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں، بہت سے بزنس کئے ہیں۔ ان دنوں بھی ایک بزنس شروع کر رکھا ہے اور اس کے لئے

مجھے سردست ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔ آپ سے صرف اتنی مدد چاہتا ہوں آپ اور ہم دونوں اگر بزنس پارٹر بن جائیں تو بس۔ مجھے — !

نرگس : بزنس! کیسا بزنس!! مجھے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ماہی گیروں کی زندگی پر اپنے ناول کے لئے مواد جمع کرنے آئی ہوں۔ مجھے آپ کے احمقانہ Suggestion سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

نوجوان : Oh, Most Wonderful

نرگس : (ناراضی سے) آپ کا مطلب؟!

نوجوان : میں بھی ماہی گیروں ہی کے بزنس کی بات کر رہا ہوں مادام۔ دراصل ہر بزنس ماہی گیروں کا بزنس ہوتا ہے۔ چھوٹے کانٹے اور معمولی جال سے بڑی مچھلی پھانسنا یہی تو بزنس ہے __ اچھا تو فرض کر لیجئے آپ دہلی سے آرہی ہیں۔

نرگس : آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں دہلی سے آرہی ہوں۔

نوجوان : خوب، بہت ہی خوب۔ فرض کیجئے وہاں آپ کی بہت سی کوٹھیاں اور جائیداد ہے اور آپ کے لکھ پتی شوہر آپ کو اس بہت بڑی جائیداد کا تنہا وارث چھوڑ کر چل بسے ہیں اور اب آپ نے دوسری شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

نرگس : Shut Up! I say, Shut Up (اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

نوجوان : ذرا ٹھہریئے۔ میری بات سنئے۔ میں آپ کو اپنے بزنس کے بارے میں بتا رہا تھا۔

نرگس : میں کہتی ہوں گولی ماریئے بزنس کو۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ بکواس بند کیجئے نہیں تو میں کسی سے کہہ کر آپ کو ہوائی اڈے سے باہر نکلوا دوں گی۔

نوجوان : شکریہ۔ مگر ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ جب ضرورت ہوگی عرض کر دوں گا — لیکن محترمہ، آپ ماہی گیروں کی زندگی پر ناول کا مواد اکٹھا کرنے آئی ہیں۔ آپ ایسی خاتون کو ذرا رحم دل ہونا چاہئے آخر میں بھی ماہی گیر ہوں۔

نرگس : آپ ماہی گیر ہیں؟ (بیٹھ جاتی ہیں)

نوجوان : جی ہاں اور میری زندگی میں بھی کئی ناولوں کا مواد موجود ہے۔ بات دراصل یہ ہے مادام نورا باٹلی والا۔

نرگس : گولی ماریئے نورا باٹلی والا کو۔ میرا نام نورا نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے۔

نوجوان : Never Mind، بات یہ ہے کہ میں نے ایک کمپنی کھولی ہے یا یوں کہیئے کہ سمجھا جاتا ہے کہ میں نے ایک کمپنی کھولی ہے اور اپنی کمپنی کی طرف سے ایک اشتہار ہندوستان کے سارے بڑے بڑے اخباروں میں چھپایا ہے۔

نرگس : پھر آپ نے بزنس کی بات شروع کی؟

نوجوان : جی نہیں۔ اپنے نام اور پتے کی تلاش کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے شادی کرانے کی ایک کمپنی ___

نرگس : (بات کاٹ کر) قائم کی ہے۔

نوجوان : قائم نہیں کی ہے، قائم کرنے کی محض کاغذی کارروائی کی ہے۔ یہ ہمارا پہلا اشتہار ایک ایسی جوان بیوہ کی طرف سے تھا جس کی کئی لاکھ کی جائیداد دہلی میں موجود ہے اور ہزاروں روپیہ بینک میں جمع ہے اور وہ ایک ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جو اس کی جائیداد کا انتظام سنبھال سکے اور اس کا روپیہ کسی مناسب کاروبار میں لگا سکے۔

نرگس : میری رائے میں آپ کو اس سے فوراً شادی کر لینی چاہئے۔ نام اور پتہ حاصل کرنے کی آسان ترکیب ہے۔

نوجوان : اصل مشکل تو یہی ہے، مادام نورا باٹلی والا کہ اشتہار چھپتے ہی ہمارے پاس درخواستوں کا ڈھیر لگ گیا ہے، روز اس سے ملنے کے لئے آٹھ دس آدمی آتے ہیں اور آفت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی بیوہ نہیں ہے۔ ہمیں ایک عورت کی فوری ضرورت ہے جو بیوہ معلوم ہو۔

نرگس : جی؟ کیا مطلب؟! بیوہ معلوم ہو؟!

نوجوان : میرا مطلب ہے اگر بیوہ نہ بھی ہو تو کم از کم بیوہ ہو سکتی ہو۔ میں بزنس کے لئے

یہاں تک تیار ہوں کہ اسے ایک عمدہ ہوٹل میں رہنے اور کھانے پینے کا خرچہ اور کچھ جیب خرچ پیش کر دوں۔ اسے ایک مہینے تک صرف اتنا کرنا ہوگا کہ جو امیدوار اس سے ملنے جائیں انھیں Reject یعنی نامنظور کر دے اور سارے درخواست بھیجنے والوں کو لکھ دے کہ درخواست کے ساتھ پانچ روپے شادی کمپنی کی فیس ضرور بھیج دیا کریں۔

نرگس : اسے قانون کی زبان میں چار سو بیس کہتے ہیں جناب۔

نوجوان : دیکھئے مادام لفظوں کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ لفظ بھی انسان کا لباس ہے اگر مناسب آدمی اسے پہنتا ہے تو برا لباس بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اگر پھٹے پرانے کپڑوں پر کوئی آدمی پچھتر روپیہ کی خوبصورت ٹائی لگائے تو کیا اچھی لگے گی؟ اسی طرح خلوص، ایمانداری، سچائی، انسان دوستی وغیرہ خوبصورت اور مہنگے لباس ہم جیسوں کے لیے نہیں ہیں۔

نرگس : مجھ سے دھوکا بازی نہیں ہو سکتی۔

نوجوان : آپ کی انگریزی کافی کمزور معلوم ہوتی ہے مادام نورا باٹلی والا۔ بزنس کا ترجمہ دھوکا بازی نہیں ہوتا، بزنس کا ترجمہ ہے بزنس اور بس __ !!

نرگس : (تلخی سے) میں آپ کو بتا چکی ہوں میرا نام ہے نرگس کینٹین والا۔

نوجوان : آپ بھی خوب ہیں اپنے نام کے بارے میں تو اتنی سنجیدہ ہیں اور ایک شریف آدمی اپنا نام تلاش کرنا چاہتا ہے تو آپ اسے دھوکہ بازی کہتی ہیں۔

نرگس : اور کیا؟ آپ کتنے آدمیوں سے فیس وصول کریں گے اور ان کے بدلے میں انھیں کچھ نہیں ملے گا۔ آپ اسے بزنس کہتے ہیں؟! یہ چوری ہے چوری!

نوجوان : (ہنستا ہے) آپ انسانوں کو نہیں جانتیں مادام نورا باٹلی والا۔ ہم ان تمام لوگوں کو پانچ روپے کے بدلے میں بہت بڑی دولت دیں گے۔ دنیا کی سب سے بڑی دولت __ امید!! یہ لوگ درخواست بھیج کر رات بھر اپنے قبضے میں آنے والی جائیداد کے خواب دیکھیں گے، دن بھر اپنی ویران تنہائیوں میں ہزاروں رنگ محل

بنائیں گے۔ ڈرائنگ روم کے نقشے، موٹر کار، بنگلے اور کوٹھیوں کے نقشے سجائیں گے اور ان میں کھو رہیں گے۔ ہم انھیں خواب دیکھنے کا پیدائشی حق دیں گے اور اتنے بڑے کاروبار کو آپ دھوکہ بازی کہتی ہیں۔ افسوس!

نرگس : آپ کو یا تو شاعر ہونا چاہئے تھا یا وکیل۔

نوجوان : محترمہ، مجھے دنیا میں صرف ایک چیز سے شدید ترین نفرت ہے اور وہ ہے ہمدردی۔ بزنس میں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ آیئے اب ہم اپنے کاروبار کے شرائط طے کرلیں۔

نرگس : جی؟! آپ نے سنا نہیں مجھے آپ کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

نوجوان : میں نے اچھی طرح سن لیا ہے مگر میں کیا کروں ابھی تک میں آپ کو اس قدر بیوقوف مان لینے پر تیار نہیں ہوں۔

نرگس : زبان سنبھال کر بات کیجئے۔

نوجوان : اور آپ ذرا عقل کو سنبھالئے۔ ذرا سوچئے۔ اس ملک میں کتنے آدمی ہیں جو عورت سے نہیں صرف اس کی جائیداد سے شادی کرنے کے لئے بیقرار ہیں جنھیں محبت نہیں چاہئے روپیہ چاہئے جنھیں آنگن میں کھیلتے ہوئے بچے نہیں چاہئیں سڑکوں پر چکر کھاتی ہوئی موٹریں چاہئیں جو محبت کا بیوپار کرتے ہیں اور میں ایک غریب نوجوان جب صرف ان کی اس کمزوری کی تجارت کرتا ہے تو اسے آپ دھوکہ بازی کہہ رہی ہیں خوب__؟

نرگس : کچھ بھی ہو مگر یہ بزنس نہیں ہوسکتا۔

نوجوان : کیوں نہیں ہوسکتا۔ آپ کو بھوک لگتی ہے اور آٹا بیچنے والا آپ کو بغیر پیسے کے آٹا نہیں دیتا تو اسے آپ تجارت کہتی ہیں مادام۔ میں اتنے لوگوں کو پانچ روپے کے بدلے میں بہشت دیتا ہوں اسے آپ کاروبار نہیں کہتیں۔

نرگس : لیکن میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔

نوجوان : میں آپ سے مدد چاہتا ہی کب ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ سچ سچ

بات کہہ دیں۔

نرگس : یعنی۔

نوجوان : ظاہر ہے کہ آپ کو ان لوگوں سے شادی نہیں کرنا ہے جو درخواست لے کر آپ سے ملنے آئیں گے۔

نرگس : قطعی نہیں۔

نوجوان : بس تو آپ یہ بات ان سے کہہ دیجئے اور کچھ مت کہئے۔ باقی سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دیجئے۔

نرگس : اور آپ ان سے میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کہتے رہیں گے؟ ہے نا یہی بات؟

نوجوان : مادام نوراباٹلی والا۔ آپ ابھی پوری بات نہیں سمجھیں۔

نرگس : جی۔ میرا نام ہے نرگس کینٹین والا۔ یہ میں آپ سے پچاسویں بار کہہ رہی ہوں۔

نوجوان : خیر۔ خیر۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں بھی ان سے اور کچھ نہ کہوں گا۔ باقی باتیں اعلیٰ ترین ہوٹل کا کمرہ کہے گا جس میں آپ کے رہنے کا انتظام کیا جائے گا۔ آپ کے کمرے کا قیمتی فرنیچر، آپ کے لباس کی سادگی اور آپ کا وہ رعب اور دبدبہ جس سے آپ نے ابھی مجھے یہاں سے باہر نکلوانے کی دھمکی دی تھی۔

نرگس : آپ کافی ذہین معلوم ہوتے ہیں۔

نوجوان : ذرہ نوازی کا شکریہ ـــ اس ایک مہینے کی تکلیف کے لئے ہوٹل اور کھانے پینے کے خرچ کے علاوہ تین سو روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

نرگس : خاصی دلچسپ Proposal ہے آپ کی۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے شوہر کی دہلی میں بڑی جائداد ہے اور ابھی حال میں میری ان سے تکرار ہوگئی ہے۔ خیر چلئے آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ مصیبت زدوں کی مدد کرنا ہمارا انسانی فرض ہے۔

[نوجوان کے چہرے پر مسرت کے نشانات نمایاں ہو جاتے ہیں کچھ کہنا ہی چاہتا

تھا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز فضا پر چھا جاتی ہے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا جارہا ہے

Your Attention Please!

Passengers of Dakota UAG-29

Should Kindly Collect Their

Luggage From Corridor Thank You!

''انڈین ائرلائنز کے ڈاکوٹا یو اے.جی نمبر 29 کے مسافر جو دہلی سے آئے ہیں اپنا سامان برآمدے سے آکر لے لیں۔'']

نوجوان : شکریہ۔ بہت بہت شکریہ (ہاتھ بڑھاتا ہے اور نرگس اس سے ہاتھ ملاتی ہے) وکٹری، وکٹری!Victory at Last، آیئے چلیں۔

[دونوں آہستہ آہستہ بائیں طرف کی گیلری کی طرف جاتے ہیں ریستوراں سے آنے والے کئی اور مسافر بھی ان کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں اور یہ دونوں مسافروں کے ہجوم میں کھو جاتے ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔]

دوسرا منظر

[ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل کا آراستہ پیراستہ کمرہ جس کے وسط میں قیمتی فانوس روشن ہے۔ ایک قیمتی صوفہ سیٹ وسط میں رکھا ہے کمرے کے پردے قالین، دیواروں پر قلعی سب ہلکی نیلے رنگ کی ہے، ایک چھوٹی میز پر ٹیلی فون رکھا ہوا اور صوفے کی میز پر چند اخبارات اور تصویروں والے امریکی رسائل رکھے ہوئے ہیں۔ مینٹل پیس پر ایک بڑی تصویر لگی ہوئی ہے جس میں کئی سیب اور ایک چھری ایک پلیٹ رکھی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ ٹیلی فون والی میز پر گل دان رکھا ہوا ہے اور میز پر ایک گھنٹی رکھی ہوئی ہے۔

اس کمرے کا دروازہ بائیں طرف ہے جس پر ہلکے نیلے رنگ کے پردے

پڑے ہوئے ہیں۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج کے وسط والے صوفے پر نرگس کینٹین والا نیلے رنگ کی قیمتی ساری پہنے ہوئے بیٹھی دکھائی دیتی ہیں وہ کسی امریکی رسالے کی تصویریں دیکھ رہی ہیں۔ اتنے میں اسٹیج کے بائیں کونے سے نوجوان کی آواز آتی ہے۔

''حاضر ہوسکتا ہوں''

نوجوان داخل ہوتا ہے وہ نیا سوٹ اور نکٹائی پہنے ہوئے ہے ہاتھ میں ایک خوبصورت فائل ہے۔]

نرگس : Come in!

نوجوان : ہیلو مادام نورا باٹلی والا۔ گڈ مارننگ۔

نرگس : گڈ مارننگ۔

نوجوان : تو جناب۔ چنانچہ یہ ہے آپ کی عظیم الشان ڈاک۔ ان میں فٹ پاتھ کے وہ شہزادے ہیں جو اپنے خوابوں کی ہیروئن ڈھونڈ رہے ہیں۔ خیالوں کی دنیا کے وہ سکندر ہیں جو اپنی سلطنت تلاش کرنے نکلے ہیں۔

نرگس : آپ پھر شاعری کرنے لگے۔ سیدھے سادے لفظوں میں کہیے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

نوجوان : سیدھے سادے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان پچاس خطوں پر اپنی نرم و نازک انگلیوں سے آپ کو دستخط کر دینا ہے۔

نرگس : کیا لکھا ہے ان خطوں میں؟

نوجوان : وہی پرانی بات؟ ''میں بہت ممنون ہوں گی اگر آپ اگلے خط میں اپنی تازہ ترین تصویر ارسال فرمانے کی زحمت کریں۔ آپ کو اس طرف بھی توجہ دلانا چاہتی ہوں کہ مجھے ہر درخواست پر پانچ روپیہ اپنے ایجنٹ یعنی اے بی سی اینڈ کمپنی کو دینا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رقم آپ تصویر کے ساتھ بھیجنا فراموش نہ فرمائیں گے۔ میں بے چینی سے آپ کے گرامی نامے کا انتظار کروں گی۔ فقط۔ آپ کی

وغیرہ وغیرہ مادام نورا باٹلی والا۔

نرگس : کیسا خوبصورت خط ہے اور کیسے میٹھے الفاظ ہیں۔

نوجوان : آداب بجالاتا ہوں۔ اچھا تو مناسب ہوگا ان خطوں پر اسی قدر میٹھے دستخط کردیں۔

نرگس : بہت خوب!

نوجوان : (برابر کی میز سے قلم اٹھا کر پیش کرتا ہے نرگس خطوں پر دستخط کرتی جاتی ہے اور نوجوان ہر ایک خط پیش کرتا جاتا ہے۔)

نوجوان : اب بزنس کی باتیں ہو جائیں جلدی جلدی۔ ان لوگوں کو تو چھوڑیئے جن کی تصویریں اور فیس آچکی ہے۔ ہاں تو یہ لوگ وہ ہیں جو آپ سے ملنے کے لئے سخت بے قرار ہیں۔ (فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے) یہ تصویر دیکھی آپ نے؟ آپ ہیں مسٹر لونڈر۔ مدراس سے آپ کے شوقِ دیدار میں چلے آرہے ہیں یوں نام تو ان کا ہے مسٹر اے۔ جی ڈنڈر ہیڈس، مگر لونڈر میں اس قدر بسے ہوئے ہیں کہ آپ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو جائیں گی۔

نرگس : (ہنستی ہے) اوہو۔ تب تو انھیں ضرور بھیجئے۔ میں نے آج تک کبھی لونڈر کو بات کرتے نہیں سنا۔

نوجوان : اچھا تو میں جا کر پہلے انھیں بھیجتا ہوں۔ سارے خطوں پر دستخط ہو گئے ہیں۔ اچھا تو مجھے اجازت دیجئے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔

[نوجوان چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب نرگس ایک ادا کے ساتھ سر کے بال درست کرتی ہے اور شان بے نیازی کے ساتھ گھنٹی بجا کر امریکی رسالے کی تصویریں دیکھنے لگتی ہے۔ گھنٹی بجنے کے کچھ دیر بعد اے۔ جی ڈنڈر ہیڈس داخل ہوتے ہیں شکل وصورت، حلیے اور لباس سے سو فیصدی امریکن مذاق کے معلوم ہوتے ہیں رنگین ہالی وڈ کی ایکٹرسوں کی تصویروں والی بش شرٹ پہنے ہوئے ہیں چیونگ گم چبا رہے ہیں۔ ہر چیز میں ایک اسٹائل اور فلمی اور ڈرامائی انداز پیدا

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔]

نرگس : چلے آیئے۔

ڈنڈر ہیڈس : !With your Permission Madam

نرگس : تشریف رکھئے۔

ڈنڈر ہیڈس : ۔This is A.G. Dunderhead, at Your Service

نرگس : مسٹر ڈنڈر ہیڈس۔ایک بات پہلے سمجھ لیجئے۔ میں انگریزی صرف اس وقت بولتی ہوں جب مجھے اپنے نوکر کو ڈانٹنا ہوتا ہے۔

ڈنڈر ہیڈس : معاف کیجئے گا مادام۔ دراصل مجھے خود بھی انگریزی میں بات چیت کرنا زیادہ پسند نہیں ہے مگر You See زمانے سے مجبور ہوں۔

نرگس : میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جناب۔ صرف تین باتوں کا جواب چاہتی ہوں۔ نمبر ایک آپ میرے روپئے کو کس کام میں لگائیں گے؟

ڈنڈر ہیڈس : (گھبراہٹ میں کھانس کھنکار کے گلا صاف کرتا ہے) In Fact مادام، یعنی I'm Sorry، سچ پوچھئے تو مجھے آپ کے روپیے سے کچھ زیادہ دل چسپی نہیں۔ دراصل میں نے جب سے اپنے ملک میں بیواؤں کی خراب حالت کے بارے میں غور کیا ہے۔ اسی وقت میں نے Pledge لیا کہ میں کسی بیوہ سے شادی کروں گا (گھبراہٹ کی ہنسی) اتفاق سے مجھے آپ کی خدمت کا موقعہ ملا۔ سچ مادام یوں تو کئی خوبصورت اور کنواری فلم ایکٹرسوں نے آفر کیا مگر میں اپنے عہد پر قائم رہا۔

نرگس : مگر میرے روپئے کا کیا ہوگا؟

ڈنڈر ہیڈس : جب آپ Insist کرتی ہیں تو اس روپیے کو کسی کاروبار میں لگانا ہی ہوگا میں دراصل اسی سال آئی اے ایس میں بیٹھ رہا ہوں پھر یہ خیال ہے کہ انگلستان یا امریکہ جا کر ٹریننگ لوں گا۔ ڈربی میں اپنے اور آپ کے نام سے ایک گھوڑا دوڑائیں گے اور کسی ریویریا پر یا کسی حسین جزیرے میں جا کر بس جائیں گے جہاں Natural Views اور Luxury Items ہوں گے۔

رمبھا سمجھا ہوگا اور ہم ہوں گے۔

نرگس : اچھا اب سوال نمبر ۲۔ آپ کے خیال میں مجھے آپ سے شادی کیوں کرنی چاہیئے۔

ڈنڈر ہیڈس : یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ آئی۔ اے۔ ایس کے بعد میرا فیوچر (Future) بالکل Bright ہے وہ کون سا کمال ہے جو مجھ میں نہیں۔ ماؤتھ پیس بے مثال بجا سکتا ہوں۔ سنفنی سے Musical Instruments کی ساری دھنیں نکال سکتا ہوں۔ فیشن میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ہالی وڈ کی تازہ ترین تصویر کا Latest لباس مجھے معلوم ہے پھر نائٹ کلب کے طور طریقے میری انگلیوں پر ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں مجھے کئی بار ہیرو کا رول ملتے ملتے رہ گیا۔ Sports کی دنیا میں کون سا کھیل ہے جس کے ریکارڈ مجھے یاد نہ ہوں مجھ سے زیادہ ماڈرن آدمی مادام اس ملک میں بہت کم ہوں گے اور Business میں روپیہ کو سلیقے سے لگانے اور سلیقے سے زندہ رہنے کا گر صرف ماڈرن آدمی ہی اچھی طرح جانتا ہے۔

نرگس : بس کیجئے۔ قابلیتوں کی اتنی بڑی فہرست! اوہ میرے خدا!! آخری سوال یہ ہے کہ آپ کا قد کتنا ہے۔

ڈنڈر ہیڈس : پانچ فٹ چھ انچ۔

نرگس : افسوس مسٹر ڈنڈر ہیڈس مجھے نقلی ڈان ژواں سے کوئی دل چسپی نہیں۔ مجھے دراصل چھوٹے قد کا شوہر چاہیے زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ دو انچ جسے ریویریا Riviera کی عورتوں میں دل چسپی نہ ہو اور جس کا دماغ چلتا پھرتا ہالی وڈ نہ ہو۔

ڈنڈر ہیڈس : مجھے تو دراصل خود بھی مادام ہالی وڈ اور ریویریا وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے مگر کیا کیا جائے Modern زمانے کے چلن سے مجبور ہوں۔ ایسی باتیں نہ کیجئے تو لوگ دقیانوسی سمجھنے لگتے ہیں اور اس میں گھاٹا ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد آپ ان سب چیزوں کا نام بھی میری زبان سے نہ سنیں گی۔

نرگس : ہاں ہاں صحیح فرمایا آپ نے۔ مگر آپ کے قد کا کیا کیا جا سکتا ہے؟

ڈنڈر ہیڈس : اگر میں پتلے تلے کے جوتے پہنا کروں تو ـــــ

نرگس : (ہنس کر) اگر آپ جوتے پہننا بالکل چھوڑ بھی دیں تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اچھا تو آپ جا سکتے ہیں؟

ڈنڈر ہیڈس : (مایوسی کے لہجے میں صوفے پر سے اٹھتے ہوئے) اچھا۔ تو اب مجھے جانا ہی ہوگا ــــ ٹاٹا۔

نرگس : لیکن جاتے جاتے میرا ایک مشورہ سنتے جایئے مسٹر ڈنڈر ہیڈس (ڈنڈر ہیڈس دروازے کے قریب سے مڑ کر دیکھتا ہے) اگر پھر کبھی آپ کسی انٹرویو میں جائیں تو اپنے پھٹے ہوئے جوتے بھی تبدیل کر لیجئے گا تا کہ یہ نہ معلوم ہو کہ آپ کا باقی لباس اور یہ شوخ نکٹائی سب اسی طرح مانگے کی چیزیں ہیں جیسے آپ کا دماغ اور آپ کی زبان ــــ ٹاٹا۔

[ڈنڈر ہیڈس ناگواری کے اثرات چہرے سے ظاہر کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ نرگس تھوڑی دیر امریکی رسالے کی ورق گردانی کرتی ہے پھر گھنٹی بجاتی ہے جس کے تھوڑی دیر بعد ایک مارواڑی سیٹھ جی بند گلے کا بغیر استری کا مڑا تڑا کوٹ اور دھوتی پہنے داخل ہوتے ہیں۔ پاؤں میں چپل ہے، سر پر مارواڑی ٹوپی ہے اور ماتھے پر بڑا سا تلک۔ مونچھیں کافی نمایاں ہیں۔ بات کرتے ہیں تو دہانہ پوری طرح پھیلا دیتے ہیں۔ داخل ہوتے ہی غور سے اوپر نیچے تک کمرے اور فرنیچر کا معائنہ کرتے ہیں۔]

سیٹھ : نمسکار، میم صاحب۔

نرگس : آیئے سیٹھ جی۔ کیا آپ نے بھی درخواست بھیجی تھی؟

سیٹھ : اجی۔ میں نے سوچو یہ تو ایک پن کاریہ ہے۔ ودھوا وواہ سے تو سماج کا کلیان ہی ہوگو۔ میرو فوٹو تو ملو ہوگو۔ وہ بات یہ ہے کہ فوٹو جرا (ذرا) جوانی کے جمانے (زمانے) کا ہے اس کارن پہچان میں جرا (ذرا) کٹھنائی ہوئی۔

نرگس : سیٹھ جی اس عمر میں آپ کو کیا سوجھی۔

سیٹھ : اجی تم عمر و مر کی پروامت کرو میم صاحب۔ یہ تو نزلے سے دانت جرا جلدی جاتے رہے ہیں۔ نہیں تو ابھی میری عمر کوئی ایسی جیادہ (زیادہ) نہیں میری پتنی کو گجرے (گزرے) ابھی دو مہینے تو ہوئے ہیں۔ بیچاری کا بھیجا پھر گیا تھا۔ اسی پاگل پنے میں آتم ہتھیا کر لی اس نے۔ وہ تو تم سے بھی کم عمر تھی۔

نرگس : میرا روپیہ آپ کس کاروبار میں لگائیں گے سیٹھ جی۔

سیٹھ : اس کی تم ذرا پھکر (فکر) مت کرو جی۔ ادھر ہزاروں کاروبار ہیں اپنے۔ ادھر کچھ مندا ہو گیا ہے روئی کے بزنس میں ادھر کچھ گھاٹا بھی ہو گیا ہے اب تم سے کیا چوری میم صاحب۔ جو تمہارا دھن ہاتھ آ جائے تو اس بزنس میں وہ مناپھا (منافع) کر کے دکھاؤں کہ آنکھوں میں روسنی (روشنی) آ جائے۔

نرگس : میری آنکھوں میں تو آپ کو دیکھنے ہی سے روشنی آ گئی مہاراج۔

سیٹھ : یہ تو تم مسخری کی بات کرو ہو میم صاحب۔ پر اتنی بات ضرور ہے کہ تم جو میرے گھر آ جاؤ تو تمہیں گھر کی رانی بنا کے رکھوں۔ آنکھوں کی پتلی کی طریوں (طرح) رکھو۔ گر یہہ لکشمی بناؤں۔ سچ مچ آگے پیچھے دس دس نوکر مہری کھان ساماں (خانساماں) اور دودھ گھی کی ندیاں بہادوں اور بزنس آسماں پر پہنچ جائے بھگوان سوگند۔

نرگس : مگر ایک مشکل ہے سیٹھ جی۔ مجھے تو ایک ایسے ماڈرن شوہر کی ضرورت ہے جو ہوائی بش شرٹ پہنتا ہو ایک سال میرے ساتھ ریوریا پر رہ سکے بال روم میں ناچ سکے اور جس کی ناک کم سے کم ایک انچ اونچی اور لمبی ہو۔

سیٹھ : خیر وہ بش شرٹ کی تو کوئی بات نہیں بال روم میں ناچ بھی سکوں ہوں۔ جوانی میں ہم نے بھی سیکھا تھا رھمبا سمبھا۔ رھمبا سمبھا۔ پر ناک ــــ

نرگس : ہاں یہی تو مشکل ہے ناک کا کیا ہو گا؟ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ ایک انچ سے کم ناک والے سے شادی نہیں کروں گی۔

سیٹھ : (کچھ سوچ کر) امریکہ میں تو سنڑیں ہوں نقلی ناک بنادیویں ہیں۔

نرگس : مگر مجھے تو اصلی ناک چاہیے۔

سیٹھ : یہ تو بڑی کٹھنائی آن پڑی۔ (تھوڑی دیر سوچتا ہے) پر بڑی بڑھیا ترکیب سمجھ میں آئی۔ ایسا کرو میم صاحب کہ تم وواہ تو کسی لمبی ناک والے جنٹلمین سے کرو پر اپنا روپیہ مجھے دے دو۔ بس وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مجھ جیسا بھلا مانس بجنس مین (بزنس مین) سوجھ بوجھ والا تمہیں ملے گا نہیں۔

نرگس : اس بارے میں اپنے ہونے والے شوہر سے مشورہ کر کے بتاؤں گی۔ اچھا تو منکا۔

سیٹھ : (بڑی مایوسی سے) اچھا۔ تمہاری اِچھا۔ منکا۔

[جاتا ہے۔ تھوی دیر خاموشی رہتی ہے۔ اس بار پھر نرگس کینٹین والا اپنے بال درست کرتی ہے، وینٹی بیگ سے شیشہ کنگھا نکال کر روج اور پاؤڈر ٹھیک کرتی ہے اور پھر میز پر رکھے ہوئے اس فائل کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے جو نوجوان نے دیا تھا۔ پھر گھنٹی بجتی ہے اور گھنٹی بجتے ہی فوراً شہزاد داخل ہوتا ہے۔

یہ لمبے قد کا ایک نوجوان ہے جس کی داڑھی کچھ بڑھی ہوئی ہے گرم کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے ہے مگر دونوں مسلے ہوئے اور کچھ میلے معلوم ہوتے ہیں۔ بال بکھرے ہوئے ہیں اور قمیص کا کالر کھلا ہوا ہے لباس اور انداز دونون سے لا ابالی پن ٹپکتا ہے۔ داخل ہوتے ہی تھوڑی دور پر رک جاتا ہے اور ڈرامائی انداز میں مکالمے بولنے لگتا ہے۔]

شہزاد : اے ستاروں کی رانی! ایک بھٹکی ہوئی روح کا سلام قبول کر۔

نرگس : دیکھیے، یہ اسٹیج نہیں ہے میرا کمرہ ہے۔ میرا یعنی مادام نورا باٹلی والا کا کمرہ ہے۔

شہزاد : نورا باٹلی والا۔ نورا!! ہاں مجھے یاد آیا۔ اس نام نے میری تنہائیوں کو مہکایا ہے میرے خوابوں کو حقیقت کے ریشمی جھولوں میں جھلایا ہے۔ آپ ہی وہ بیوہ خاتون ہیں جسے رفیق حیات کی ضرورت ہے جو اپنی لاکھوں کی جائیداد اور لاکھوں نقد روپیہ کے باوجود اس اجنبی دنیا میں ایک دردمند دل کی تلاش میں نکلی ہیں۔

نرگس : میں کچھ نہیں سمجھی۔ [تھوڑی دیر سوچ کر] ۔ وہ میرے فائل میں آپ کی تصویر موجود ہے [فائل کی ورق گردانی کر کے تصویر نکالتی ہے اور پڑھتی ہے] اچھا تو

آپ ہیں ملک کے مشہور آرٹسٹ شہزاد۔

شہزاد : ملک کا مشہور آرٹسٹ نہیں ملک کا مشہور اور مفلس آرٹسٹ، خاتون۔ میرے خواب فٹ پاتھ پر پڑے دم توڑ رہے ہیں۔ مادام۔ انھیں تمھاری مسکراہٹ، تمھاری ایک سنہری مسکراہٹ کی ضرورت ہے۔

نرگس : دیکھئے اس قدر شاعری نہ کیجئے کہ بدہضمی ہو جائے۔ شاعری بھی زندگی کا نمک ہے نہ ہوگا تو کھانا پھیکا رہے گا اور زیادہ ہو جائے گا تو جی متلانے لگے گا۔

شہزاد : بہت خوب۔ کاش کہ میرا موقلم اس ذہین چہرے کو زندہ جاوید کر سکے۔

نرگس : آیئے بزنس کی بات کریں۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ میرے روپے کا کیا کریں گے۔

شہزاد : یہ سوال غلط ہے مادام۔ کبھی کسی انسان نے روپیہ کا کچھ نہیں کیا۔ یہ پوچھئے روپیہ میرا کیا کرے گا۔ روپیہ آدمی کو بناتا بگاڑتا رہا ہے۔ آدمی نے کبھی روپیہ کو بنایا بگاڑا نہیں۔

نرگس : ابھی تک تو میں نے یہی سنا تھا کہ خدا انسان کو بناتا ہے اور عورت اسے بگاڑتی ہے۔

شہزاد : مادام۔ بہت ہی اوریجنل۔ بہر حال روپیہ میرے ہاتھ میں آئے گا تو میرا اسٹوڈیو بمبئی کے فٹ پاتھ نہ ہوں گے۔ سوئزرلینڈ کے خوابناک جھیل کے دامن میں میرا اسٹوڈیو ہوگا۔ دنیا کے عظیم ترین آرٹسٹ میرے دوست ہوں گے، لندن، نیویارک اور پیرس میں میری تصاویر کی نمائش ہوگی اور میں سوپر کانسٹی لیشن میں ساری دنیا کا طوفانی دورہ کروں گا۔

نرگس : اس تصویر میں آپ میرا ذکر ہی کرنا بھول گئے۔ اور میں کیا کروں گی؟

شہزاد : آپ کا ذکر؟ میں آپ کے ان گیتوں کی لے سنوں گا جن کے گانے کے لئے آپ کی روح بے قرار رہی ہے، میں اس درد کی آواز سنوں گا جس پر آپ کے دل کی دھڑکنیں ہمیشہ ناچتی رہی ہیں۔ میں اپنے موقلم سے ان خوابوں کو چھولوں گا جنھیں آپ کی بے خواب آنکھیں دیکھنے کی حسرت کرتی رہی ہیں۔ اور میرے سوا، مادام آپ کی قدر کون جان سکے گا۔

نرگس : مگر مسٹر شہزاد، مشکل یہ آپڑی ہے کہ مجھے ایسے شوہر کی ضرورت ہے۔ جس کے بال

سرخی مائل بھورے ہوں اور آپ کے بال بدقسمتی سے کالے ہیں۔

شہزاد : آپ کی پسند اور ناپسند بڑی سطحی ہے مادام۔

نرگس : میں بھی تو آرٹسٹ کی طرح رنگ اور روپ کو پسند کرنے کا حق رکھتی ہوں مسٹر شہزاد۔ اور اگر میں بالوں سے رنگ کا ذکر ایک آرٹسٹ سے کر رہی ہوں تو کیا یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔

شہزاد : مگر بالوں کے رنگ پر آپ ایک بہت بڑی نعمت کو قربان کر رہی ہیں۔ آپ دنیا کے ایک مشہور فن کار کی رفیق حیات ہوتیں جس کا نام امریکہ سے افریقہ کے ہر گوشے میں ادب اور احترام سے لیا جائے گا جس کی شہرت کا آفتاب کبھی غروب نہیں ہوگا جس کا نام اور کارنامہ تاریخ کے صفحوں پر پوری تابناکی کے ساتھ چمکے گا۔ آپ بھی اس شہرت، عزت اور لافانی زندگی میں اس کی شریک ہوتیں۔

نرگس : میں شہرت سے بہت گھبراتی ہوں مسٹر شہزاد۔ آپ کو معلوم ہے دنیا میں سب سے زیادہ شہرت شیطان کو حاصل ہے۔

شہزاد : تو آپ بالوں کے رنگ پر آرٹ کو قربان کر دیں گی۔ یہی آپ کا فیصلہ ہے؟

نرگس : جس آرٹ کا مقصد صرف پیسہ اور عیش کی زندگی ہو اسے بالوں کے رنگ پر قربان کر دینا چاہئے۔ آپ جا سکتے ہیں۔

شہزاد : خدا حافظ۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

نرگس : ہاں سنئے۔ میری رائے میں آپ مصوری چھوڑ کر اشتہار بنانے کا دھندا شروع کر دیں تو اچھا ہے۔ اس میں خوب پیسہ ملے گا۔ جب ہم بزنس شروع کریں گے تو اپنی فرم کا اشتہار آپ ہی سے بنوائیں گے۔ خدا حافظ۔

(بہت غصہ ہو کر چلا جاتا ہے)

[تھک کر نرگس صوفے کی پشت سے سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہے پھر میز پر رکھے ہوئے تھرمس سے چائے نکال کر پیتی ہے تھوڑی سی دیر ستاتی ہے پھر گھنٹی بجاتی ہے، چائے کا پیالہ ہاتھ میں ہے۔ کیپٹن والا داخل ہوتے ہیں عمدہ گرم کوٹ میں

ملبوس، شوخ نکٹائی باندھے بغل میں چمڑے کا بریف کیس دبائے، بال بہت باقاعدگی سے کاڑھے گئے ہیں اور رفتار اور لباس سے امارت برستی ہے۔ نرگس گھنٹی بجانے کے بعد چائے پینے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور جب دروازہ کھلنے کی آواز ہوتی ہے تو وہ اس طرف دیکھے بغیر کہتی ہے]

نرگس : چلے آئیے۔

کینٹین والا : (جس نے ابھی نرگس کو غور سے نہیں دیکھا ہے) حاضر ہوا۔

نرگس : (یکا یک کینٹین والا کو دیکھتی ہے پہلے حیران ہو کر صوفے سے پیٹھ الگ کر کے ٹھیک سے بیٹھ جاتی ہے اور چائے کا پیالہ میز پر رکھ دیتی ہے پھر ہنستی ہے کینٹین والا بھی حیران اور کچھ پریشان ہے) اوہ۔ یعنی آپ بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ مسٹر کینٹین والا!

کینٹین والا : مجھے کہتی ہو، اپنے کو نہیں کہتیں۔ یہاں آ کر مادام نورا باٹلی والا بن بیٹھیں اور میری بیوی ہو کر بھی اپنے کو بیوہ مشہور کر دیا۔ یہ اچھا ڈھونگ نکالا ہے۔

نرگس : اور آپ اس نوجوان اور مالدار بیوہ سے شادی کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ یہ ہے آپ کی درخواست (فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے) دہلی کا مالدار تاجر۔ عمر 35 سال۔ شرم نہیں آتی؟

کینٹین والا : میں تو یوں ہی چلا آیا تھا۔

نرگس : اور یوں ہی آپ نے یہ درخواست اور پانچ روپے بھی بھیج دیئے ہوں گے۔ ہے نا؟!

کینٹین والا : لیکن اپنے کو تو کہو۔ تم یہاں نورا باٹلی والا بن کر کیا چار سو بیس کھیل رہی ہو؟

نرگس : میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ پیسے والی بیوہ کے امیدواروں کی صورتیں کیسی ہوتی ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا۔ اگر میں یہاں نہ آتی تو آپ سے ملاقات کی صورت کیسے نکلتی۔ آپ بھی اس بیوہ کی چاہت میں آئے ہیں؟

کینٹین والا : مگر آپ تو ماہی گیروں پر ناول لکھنے یہاں آئی تھیں؟

نرگس : اور آپ بھی اپنے دوست سے ملنے بمبئی آئے ہوں گے؟

کینٹین والا : حد ہے دھوکہ بازی کی!

نرگس : کوئی حد ہے اس فریب کی! مکار۔ دغا باز!!

کینٹین والا : نوجوان مالدار اور خوبصورت بیوہ!! ہونہہ۔ کبھی اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔

نرگس : اور تم نے اپنی صورت دیکھی ہے۔ آپ اس بیوہ سے شادی کرنے تشریف لائے ہیں۔ ہیں بڑے شوقین مزاج۔

کینٹین والا : اور آپ سوانگ رچا کر بھولے بھالے شہریوں کو بیوقوف بنانے بیٹھی ہیں۔ چال باز، فریبی کہیں کی!

نرگس : زبان سنبھال لو۔

کینٹین والا : تم خود زبان سنبھال کر بات کرو۔

نرگس : نہیں تو ابھی تمہیں یہاں سے (گھنٹی بجاتی ہے دو بار تین بار) ارے کوئی ہے!!

[نوجوان گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے لیکن جب دیکھتا ہے کہ معاملہ زیادہ سنگین نہیں ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے]

نوجوان : کیا بات ہے مادام نورا باٹلی والا۔

نرگس : دیکھئے یہ عجیب باتیں کر رہے ہیں!

نوجوان : دیکھئے مسٹر کینٹین والا۔ آپ کو مادام نورا سے ملنے کا حق ہے مگر عجیب باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

کینٹین والا : واہ جناب، کیسی نورا باٹلی والا۔ یہ میری بیوی مادام نرگس کینٹین والا ہے۔ مجھ سے لڑ کر یہاں چلی آئی ہے۔

نرگس : مگر اس وقت یہ امیدوار کی حیثیت سے شادی کرنے آئے ہیں۔

نوجوان : خوب بہت خوب۔ مسٹر کینٹین والا۔ یہ آپ کی بیوی ہیں مگر میری بزنس پارٹنر ہیں۔

کینٹین والا : اجی کیسا کنٹریکٹ! کیسا معاہدہ!! میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔

نوجوان : مگر ابھی کنٹریکٹ کی میعاد میں ایک مہینہ باقی ہے۔

کینٹین والا : جی نہیں۔ کنٹریکٹ اب ختم ہوتا ہے۔ اب ہم صلح صفائی کر کے دہلی جائیں گے۔

نوجوان : (بجھے ہوئے دل سے) مادام! آپ کا کیا فیصلہ ہے؟!

نرگس : (کینٹین والا سے) تو پھر بولئے پانچ بجے تک آپ دفتر سے ضرور واپس آجائیں گے اور وہ ساری میرے لئے ضرور خریدیں گے جو مجھے پسند ہے، کلب ہفتے میں دو دن جائیں گے اور مجھے ساتھ لے جائیں گے بولئے ساری شرطیں منظور ہیں آپ کو۔ وعدہ کیجئے۔

کینٹین والا : ہاں بابا سب شرطیں منظور ہیں۔

نرگس : (نوجوان سے) تو پھر مجبوری ہے جناب۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔

کینٹین والا : چلو سامان باندھو۔

[نرگس اسٹیج کے دائیں طرف کے دروازے میں داخل ہوتی ہے تھوڑی دور تک التجا اور سخت پریشانی کے ساتھ نوجوان اس کے پیچھے پیچھے آتا ہے اور رونی آواز میں کہتا ہے]

نوجوان : تو پھر بزنس کا کیا ہوگا۔ مادام بزنس! مادام بزنس!!

[کینٹین والا کچھ دیر صوفے پر بیٹھا ہوا سگار پیتا ہے۔ نرگس اسٹیج کے دائیں طرف غائب ہو جاتی ہے۔ کینٹین والا بھی نرگس کے ساتھ چلا جاتا ہے صرف نوجوان دائیں طرف کے دروازے کے بالکل قریب دوزانو بیٹھا ہوا ہے جیسے اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے ہوں۔]

پردہ گرتا ہے

☆☆☆

گوشۂ عافیت

[ایک ایکٹ میں ایک طربیہ]

کردار:

بیگم : بیس پچیس سال کی خوبصورت دوشیزہ جس کی شادی کو ابھی زیادہ مدت نہیں گزری ہے۔

انور : تیس بتیس سال کا متوسط طبقے کا ایک نوجوان۔

اختر : انور کا دوست جو تقریباً ہم عمر ہے، مرنجاں مرنج اور خوش طبع نوجوان ہے۔

بوڑھا : 65 یا 70 برس کا چھوٹے قد کا بوڑھا۔ اس کی خضاب سے رنگی داڑھی، اور شرارت سے بھری ہوئی آنکھیں اس کی کمینگی اور چالاکی کی غماز ہیں۔

پیر صاحب: ادھیڑ عمر کے درویش نما بزرگ جن کی داڑھی اور سر سیاہ ہے لیکن تقدس سے زیادہ کھلنڈرا پن نمایاں ہے۔

چند پڑوسی ادھیڑ، جوان اور نوجوان

زمانہ : موجودہ

دوسرے پنج سالہ منصوبے کے مکمل ہونے سے پہلے جب ہندوستان میں مکان کا مسئلہ حل ہونے کی صورت نظر نہیں آئی ہے۔

جگہ : ہندوستان کا کوئی شہر۔

پہلا منظر

[نہایت خستہ حال، گندے اور مختصر مکان کا کمرہ۔ جس کی دیواروں پر برسوں سے قلعی نہیں ہوئی ہے۔ چھت نیچی ہے، دیواروں پر مختلف لکیریں اور کارٹون بنے ہوئے ہیں۔ فرش کہیں کہیں کچا ہے اور کہیں اینٹیں دکھائی دینے لگی ہیں۔ اس کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے ہیں، ایک کا رخ اسٹیج کی طرف ہے دوسرا اسٹیج کے بائیں طرف اسٹیج کی لمبائی میں بچھا ہوا ہے۔ اسی طرح جو جگہ کمرے میں نکالی گئی ہے، اس میں ایک چھوٹا سا غالیچہ بچھا دیا گیا ہے اور اس پر ایک چھوٹی سی اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی میز اور دو کرسیاں بچھی ہیں، یہ دونوں قیمتی اور اچھی حالت میں ہیں۔ اسٹیج کے بیچ میں پہلے پلنگ کے ٹھیک اوپر ایک کھڑکی ہے جس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ لکڑی کا پالس کہیں کہیں سے اڑ گیا ہے، کچھ حصہ دیمک نے کھا لیا ہے۔ شیشے بھی بدرنگ ہو گئے ہیں لیکن اس کھڑکی کے نچلے حصے پر بھی چھوٹے چھوٹے پردے لٹکائے گئے ہیں۔ پردے خوشنما ہیں لیکن اس کھڑکی پر عجیب بے جوڑ سے لگتے ہیں۔ بائیں طرف دوسرے پلنگ کے سرہانے چند بکس رکھے ہوئے ہیں ایک بکس کے اوپر میز پوش بچھا کر پاندان رکھ دیا گیا ہے۔ دونوں پلنگوں پر صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے ہیں مگر کمرے کی فضا پھر بھی ملگجی، دھندلی اور دھوئیں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے بائیں طرف کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ بیچ کی میز پر گل دان رکھا ہوا ہے۔ جس میں پھول بھی موجود ہیں، ان میں سے کچھ مرجھا گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہی کمرہ بہ یک وقت سونے کا کمرہ بھی ہے اور ڈرائنگ روم بھی۔

اس کمرے کے دو دروازے ہیں اسٹیج کی دائیں طرف کا دروازہ باہر جاتا ہے، اس پر رنگین پردے لٹکائے گئے ہیں، بائیں طرف کا دروازہ مختصر سے صحن اور باورچی خانے کی طرف جاتا ہے۔

[جب پردہ اٹھتا ہے انور کرسی پر بیٹھا جوتے کے بند کھولتا دکھائی دیتا ہے، بکھرے ہوئے بال اور گرد آلود چہرے سے ظاہر ہے کہ کافی دور گھوم گھام کر آیا ہے۔ چیک کا گرم کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ چکا ہے، جوتے کے بند کھول کر جرابیں اتارتا ہے اور ایک پاؤں گھٹنے پر رکھ کر اسے دباتا ہے معلوم ہوتا ہے بہت تھکا ہوا ہے پھر انگڑائی لیتا ہے اور نکٹائی کھولنے لگتا ہے۔ ابھی کھول ہی رہا ہے کہ بیگم دائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے]

بیگم : آ گئے شہزادہ گل فام؟! کہئے کچھ مکان کا بندوبست ہوا۔ (بیگم غرارہ جمپر اور دوپٹہ پہنے ہوئے ہیں لباس سے ان کی خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے)

انور : ابھی تھک ہار کر آیا ہوں۔ دم تو لینے دو۔ نہ چائے کو پوچھا نہ پانی کو۔ بس آتے ہی مکان کا سوال شروع ہو گیا۔

بیگم : میں کہہ چکی ہوں مجھ سے اس کمرے میں نہ گھٹا جائے گا۔ میں کل ہی اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ نہیں تو کسی ٹھکانے کے مکان کا انتظام کرو۔

انور : یہی بات تمہاری سمجھ میں آجاتی تو پھر رونا کاہے کا تھا۔ میں کہتا ہوں اس زمانے میں چاہو تو کولمبس کی طرح نئی دنیا ڈھونڈھ نکالو مگر مکان نہیں مل سکتا۔

بیگم : آخر شہر بھرا پڑا ہے مکانوں سے۔ دنیا جہان کے لوگ رہتے ہیں، ہر کوئی تمہاری طرح کونے کھدروں میں پڑا رہے تو بھلا کیسے کام چلے۔

انور : بیگم، جی جلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مکان نہیں ملے گا، نہیں ملے گا، نہیں ملے گا۔

بیگم : تو میں کہتی ہوں ایسی نوکری کو جھونکو بھاڑ میں۔ صاف صاف تم اپنے دفتر والوں سے کہہ کیوں نہیں دیتے کہ اگر تمہیں نوکر رکھنا ہے تو مکان دیں نہیں تو بابا، بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ یہ لو اپنی نوکری۔

انور : جی ہاں! ایسے ہی تو وہ میرے عزیز دار لگتے ہیں کہ میرے ناز نخرے اٹھائیں گے۔

بیگم : جب اپنی گوں اٹکے گی تو ہزار بار اٹھائیں گے، میں تو پہلے ہی جانتی ہوں تم مکان کے لئے دوڑ دھوپ ہی نہیں کرتے۔ یہ تم تو سدا سے چاہتے ہو کہ میں گھبرا کے

میکے چلی جاؤں۔

انور : بیگم! بیگم! خدا کے لئے رحم کرو مجھ غریب پر۔ دیکھ رہی ہو آج تین دن سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ پنواڑی۔ سائیکل کا پنکچر بنانے والے، اخبار والے سبھی سے کہہ آیا ہوں اور تم کہتی ہو کہ میں دوڑ دھوپ نہیں کرتا۔ اب کیا اپنی جان دے دوں؟

بیگم : (دوسرے پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے) میں بھی تو سنوں کیا کہتے یہ سب لوگ؟

انور : (کچھ دیر گھبرا کر خاموش ہو جاتا ہے پھر یکایک جیسے کچھ یاد آ گیا ہو) ہاں خوب یاد آیا۔ اختر نے اس وقت آنے کو کہا تھا۔ وہ ضرور مکان کا کوئی انتظام کر کے لائے گا۔

بیگم : دیکھ چکی ہوں تمہارے سارے دوستوں کو سب چولہے میں ڈالنے کے قابل ہیں۔ کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے۔ ویسے انور میاں کہتے منہ سوکھتا ہے اور کام کے وقت ادھر رخ بھی نہیں کرتے۔

انور : جی ہاں۔ میں برا۔ میرے دوست برے۔ میری قدرت میں ہوتا تو الہ دین کا چراغ کہیں سے لے آتا۔ چٹکی بجاتے میں مکان فراہم ہو جاتا۔ مگر افسوس انسان ہوں الہ دین نہیں ہوں۔

[دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ دستک کی آواز سن کر بیگم پہلے برا سا منہ بناتی ہے پھر سر پر دوپٹہ ٹھیک کر کے پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور پاندان اٹھا کر چھالیہ کاٹنے لگتی ہے]

انور : کون؟ (اختر کے کھنکھارنے کی آواز آتی ہے)

انور : اختر، آؤ بھی اندر آ جاؤ۔ خدا کی قسم بڑی عمر ہے تمہاری۔

[اختر اندر داخل ہوتا ہے۔ گرم سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں ہیں۔ ٹائی شوخ رنگ کی ہے، اس کی چال اور چہرے سے اس کی بشاشت اور ظرافت طبع کا اندازہ ہوتا ہے]

انور : ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔

اختر : آداب عرض ہے بھابھی۔ کہئے کچھ چائے وائے کا بندوبست ہے۔

بیگم : (آداب عرض سے خوش ہو گئی ہے مگر جلی کٹی سے باز آنے والی نہیں) آتے دیر

نہیں چائے کی رٹ لگ گئی۔ اب بتاؤ اتنے سے کمرے میں تم لوگوں کو بٹھاؤں یا چائے کے برتن لگاؤں یا...

اختر : (بات کاٹ کر) بس بس رہنے دیجئے صاحب۔ مکان کی تکلیف ہے آپ کو؟ تو یوں کہئے نا۔

بیگم : تو کیا کوئی مکان مل گیا ہے؟

اختر : ایسی معمولی بات ہے مکان ملنا؟ جناب بھابی صاحبہ۔ دفتر کے چپراسی کو ترکی کی بنی ہوئی اعلیٰ ترین ایک چھوڑ دو سگرٹیں پلائی ہیں، اس نالائق کے کندھے پر ہاتھ رکھا، مکان ملنے پر انعام دینے کا وعدہ کیا تب کہیں خدا خدا کر کے __

انور : (بے صبری سے بات کاٹ کر) کہو، کہو رک کیوں گئے۔

بیگم : تو کیا مل گیا مکان؟

اختر : جلدی کام شیطان کا۔ بھابی اب میرے پاس کوئی جادو کا ڈنڈا تو ہے نہیں کہ گھمایا اور مکان حاضر۔ نہ علاؤالدین کا چراغ ہے کہ ذرا سا گھسا اور جن نے ایک سیکنڈ میں محل چن دیا۔

بیگم : خدا کے لئے! کیا اب ساری الف لیلیٰ یہیں پر ختم ہو جائے گی یا کچھ اور بھی بات کرو گے۔

اختر : اچھا مٹھائی کا وعدہ کیجئے تو بتائیں۔

بیگم : وعدہ بابا، پکا وعدہ کرتی ہوں۔ کچھ کہو تو سہی۔

اختر : تو سنئے جگر تھام کے سنئے ع

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

کہ جناب اس چپراسی کا بیان ہے کہ ایک مکان خالی ہوا ہے اور آپ کو کرایہ پر مل سکتا ہے۔

بیگم اور انور: (بے اختیار ہو کر) کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کرایہ کتنا ہے؟

اختر : آرڈر! آرڈر!! ذرا صبر سے کام لو بھائی۔

بیگم : اختر! ڈراما ختم کرو۔ سچ سچ بتاؤ مکان کہاں ہے اور کیسا ہے؟

اختر : یہی تو بتا رہا ہوں۔ یہی کوئی یہاں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہوگا۔ کیپٹرامل سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ویسے ہے کافی بڑا۔ تین کمرے ہیں۔ باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ وغیرہ اور چھوٹا سا صحن بھی ہے۔ آبادی اس طرف ذرا کم ہے نیچے والے حصے میں مالک مکان خود رہتے ہیں، آس پاس چار پانچ مکان ہیں۔

بیگم : پانچ چھ میل!

انور : ہاں تو گویا ذرا دور ہے مگر خیر کیا ہوا؟ ہے تو مکان۔

بیگم : ہر مہینے تھوڑی بچت کر کے قسطوں پر ایک سائیکل خرید لینا۔

اختر : ایک بات اور ہے مالک مکان خبطی قسم کا بوڑھا ہے۔ عمر بھی کوئی 70 سال کے قریب ہے۔ کرایہ داروں کو بہت پریشان کرتا ہے۔

بیگم : خبطی ہو تو ہوا کرے۔ ہمارا کیا کرے گا؟ اپنا کرایہ لے گا کوئی جان تھوڑا ہی لے گا۔

اختر : میں نے بتا دیا۔

انور : مالک مکان کو مارو گولی۔ یہ بتاؤ کہ کتنے کمرے ہیں اس مکان میں؟

اختر : میں نے کہا نا؟! تین کمرے ہیں بڑے! بیچ میں پردہ ڈال ڈال کر دو کمرے اور نکل سکتے ہیں۔

انور : بس تو ٹھیک ہے۔ بھئی ایسا کریں گے بیگم کہ ایک کمرہ مردانہ بنالیں گے وہاں ایک کمرے میں قالین اور دری چاندی کا فرش کرادیں گے اور دوسری طرف صوفہ سیٹ اور دیوان۔

بیگم : یہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کی نشست کا کمرہ اور پڑھنے کا کمرہ الگ الگ نہیں کرنے دوں گی بس۔ ایک کمرہ آپ کے قبضے میں ہوگا۔ چاہے اس میں بیٹھئے چاہے بٹھایئے۔

انور : نہیں بھئی یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کا کمرہ تو الگ ہونا چاہئے تمہیں دو کمروں کا کیا کرنا ہے۔

بیگم : یہ لیجئے مجھے کمروں کی بھلا کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ بھی خوب کہی بھئی۔ آپ کے ملنے والے آئیں تو صوفے اور قالین پر بیٹھیں اور میری سہیلیاں آئیں گی تو کیا ان کو سونے کے کمرے میں بٹھاؤں گی۔

انور : بھئی تم تو ناحق خفا ہونے لگیں۔ ایسا کرو کہ اس کمرے میں ایک طرف بیڈ روم بنالو اور پردہ ڈال کر ایک طرف سنگھار کا کمرہ بنالو۔ وہیں کرسیاں یا تخت ڈال کر دوسری طرف ـــــ

بیگم : (بات کاٹ کر) آہا۔ دوسروں کو ترکیبیں بتانا کوئی ان سے سیکھے۔ تمہیں اپنے کمرے میں پردہ ڈال کر اسٹڈی کا کمرہ کیوں نہیں نکال لیتے!

اختر : بھئی اچھی خاصی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ پہلے کمرے کو دیکھ لو پھر طے کرنا کس کے حصے میں کون سا کمرہ آئے گا۔

بیگم : نہیں صاحب ابھی طے ہو جانا چاہئے ایک کمرہ آپ کو ڈرائنگ روم اور اسٹڈی کے لئے ملے گا دوسرا کھانے کا کمرہ ہوگا اور تیسرا میرے لئے۔

انور : اور بیڈ روم؟ سونے کا کمرہ کدھر گیا؟!

بیگم : اس کا بھی کچھ ہو جائے گا۔ یہ سب بعد میں طے ہوگا۔

اختر : اور ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ اس میں ایک چھوٹا سا برآمدہ بھی ہے۔

انور : بہت خوب، بیگم، اب تو ہم گھر سے رنگین پردے بھی لیتے آئیں گے۔

بیگم : اور صحن میں گلاب کی کیاریاں لگائیں گے۔

اختر : مگر بھابی وہ تو اوپری منزل پر ہے کچی زمین آپ کو کہاں ملے گی؟

انور : گملوں میں سہی۔ پھولوں کے گملے ہمارے یہاں ہونے چاہئیں۔ مجھے تو گلاب سے عشق ہے۔ ہمارے ملک میں تو پھولوں کا شوق ہی مٹتا جا رہا ہے۔ آدمی بالکل کاروباری ہو گیا ہے۔

بیگم : تمہاری بیٹھک میں کچھ تصویریں بھی ہونا ضروری ہیں۔

انور : خدا کی قسم کیا بات کہی ہے بیگم!! میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی وہ خوبصورت تصویریں

پڑی ہوئی ہیں کہ بس نہ پوچھو۔ جب سے کم بخت مکان کا چکر شروع ہوا ہے اس وقت سے ان تصویروں کا خیال ہی ذہن سے نکل گیا۔ ان سب کو پھر سے فریم کرا کے ڈرائنگ روم میں لگاؤں گا۔

بیگم : (اختر سے) اچھا بھیا۔ اب یہ بتاؤ کہ مکان کا کرایہ کیا ہے؟

اختر : پچھلا کرایہ دار تو پینتیس روپیہ دیتا تھا مگر میں نے سنا ہے کہ وہ کرایہ کچھ بڑھانا چاہتے ہیں۔

بیگم : زیادہ ہے کرایہ۔

انور : بس اب لگیں تم باریکیاں نکالنے۔ پیسہ دانت سے پکڑو گی تو بس مل چکا مکان۔ کوئی روز روز آتے ہیں یہ موقعے۔ بھئی دیکھو صبح ناشتے میں روغنی ٹکیاں کم کر دینا کسی طرح تو بچت کرنی ہوگی۔

بیگم : خیر! اللہ مالک ہے۔

اختر : تو پھر کیا ارادہ ہے۔

انور : ارے میاں۔ ارادہ کیا ہوتا، چلو میں گھڑی کی چوتھائی میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ذرا مجھے مالک مکان سے تو ملا دو۔ سب ٹھیک کیے لیتا ہوں۔

اختر : مگر، برادر، وہ آدمی ذرا خبطی قسم کا ہے۔

انور : تم چلو تو سہی میں اس سے بڑا خبطی ہوں۔

اختر : (اٹھتے ہوئے) اچھا چلو۔

بیگم : خدا کرے کامیاب ہو کر لوٹو۔ سرخرو آؤ۔

[انور کھونٹی پر سے کوٹ اتار کر پہنتا ہے، ٹائی لگاتا ہے۔ جوتوں کی گرد جھاڑتا ہے اور دائیں طرف کے دروازے سے دونوں باہر نکل جاتے ہیں۔]

دوسرا منظر

[لکڑی کا جنگلہ اسٹیج کے تین طرف لگا ہوا ہے اس کا صدر دروازہ اسٹیج کے بائیں طرف ہے۔ جنگلے کے پاس ہی ایک زبردست قسم کا کتا ٹہل رہا ہے، کبھی ٹہلتا ہے اور کبھی آرام سے بیٹھ جاتا ہے۔ دائیں طرف اسٹیج کے بالکل آخر میں دو منزلہ مکان کا کچھ حصہ دکھائی دیتا ہے۔ سامنے میدان میں دو یا تین مونڈھے اور ایک آرام کرسی پڑی ہوئی ہے ان میں سے ایک مونڈھے کے نیچے مرغیاں بند ہیں اور ایک دوسرے مونڈھے کے نیچے ایک مرغا بند ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو ایک مونڈھے پر بوڑھا بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ اس وقت اس کی خاکی پتلون کے علاوہ اور کوئی کپڑا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اس کے جوتے بغیر پالش کیے ہوئے سیاہ بوٹ ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اسٹیج کے بائیں کنارے پر جنگلے کے صدر دروازے پر انور اور اختر دکھائی دیتے ہیں۔ انور جنگلے کا دروازہ کھولتا ہے اور کتا ایک دم لپک کر اس کی طرف آتا ہے اور بھونکتا ہے۔ انور خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے]

انور : ارے ارے..... میاں اختر۔ یہ تو کاٹ کھائے گا۔

(کتا پھر بھونکتا ہے)

انور : کھڑے کھڑے دیکھ رہے ہو، اسے مارتے نہیں۔

اختر : تم اپنے آپ اسے مارو نا! (کتا پھر بھونکتا ہے، انور داخل ہونا چاہتا ہے پھر جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

انور : (کتے کی طرف دوبارہ بڑھتے ہوئے) ارے تم کب مارو گے اسے۔ وہ تو کاٹ کھائے گا۔

اختر : ٹھہرو ابھی خبر لیتا ہوں۔

[اخبار میں جنبش پیدا ہوتی ہے اور اخبار تہہ کر کے بوڑھا فوراً صدر دروازے کی

طرف بڑھتا ہے۔ بوڑھا ٹھنڈی خاکی پتلون پر سیاہ صدری اور کالی ٹوپی پہنے ہوئے ہے، داڑھی خضاب سے رنگی ہوئی ہے۔ آنکھوں پر پتلی کمانی کا چشمہ ہے جس کے شیشے اور کمانیاں میلی ہیں چہرے پر غصے کے آثار ہیں۔]

بوڑھا : خبردار جو اس پر ہاتھ اٹھایا۔ نہایت بدتمیز معلوم ہوتے ہیں آپ لوگ، میرے گھر میں گھس کر میرے ہی کتے پر حملہ کرتے ہیں۔ یہ کہاں کی شرافت ہے؟

انور : بڑے میاں آپ بھی الٹا ہمیں پر خفا ہونے لگے۔ کتے کو کیوں باندھ کر نہیں رکھتے۔

بوڑھا : جناب آپ میرے گھر میں مجھے مشورہ دینے والے کون ہوتے ہیں۔ میرا کتا ہے چاہے اسے کھلا رکھوں چاہے باندھوں۔ آپ سے مطلب؟

اختر : (جو ابھی تک پیچھے دروازے ہی پر کھڑا ہے آگے بڑھتا ہے) آداب عرض ہے۔ معاف کیجئے گا ہم ایک ضروری کام کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

بوڑھا : مجھ سے ملنے آئے تھے؟ میں آپ کی صورت تک سے ناواقف ہوں۔ غالباً آپ غلط مکان میں چلے آئے ہیں۔

اختر : نہیں جناب، ہم لوگ یعنی میں اور مسٹر انور__ ہاں ان کا تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا یہ میرے دوست مسٹر انور ہیں۔ یہاں سرکاری ملازمت میں ہیں۔ ابھی حال میں آپ کا تقرر اس جگہ پر ہوا ہے۔ نہایت عمدہ اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصوری سے بھی دلچسپی ہے، موسیقی کا بھی آپ کو مذاق ہے۔

بوڑھا : اچھا۔ ہوگا!! مگر آپ پہلے اپنی تعریف تو بیان کیجئے۔

انور : (اختر کھسیانا ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے، انور آگے بڑھتا ہے) یہ میرے دوست مسٹر اختر ہیں، سرکاری ملازمت میں نہیں ہیں مگر اس کی کوشش کر رہے ہیں۔ ویسے نہایت عمدہ اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصوری سے دلچسپی نہیں ہے البتہ گانا سننے کا شوق ہے اور گانے رونے دونوں میں ماہر ہیں۔

بوڑھا : آپ کے یہاں آنے کا مقصد؟

انور : آپ کو کھڑے کھڑے تکلیف ہوتی ہوگی۔ آپ چل کر بیٹھک میں تشریف رکھیں اور اپنا مقصد بیان کریں۔

بوڑھا : بیٹھک میں میری بطخوں نے انڈے دیئے ہیں۔ بس اب بچے نکلنے والے ہیں۔ ہاں باہر بٹھایا جاسکتا ہے۔

انور : بہت خوب۔ دراصل عرض یہ کرنا تھا۔

بوڑھا : (مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے) فرمایئے فرمایئے۔

انور : تو وہ بات یہ تھی۔ (پھر کچھ سوچ کر ٹھہر جاتا ہے) تمہیں کہہ دو نا میاں اختر۔

اختر : جناب، دراصل آپ کے مکان کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

بوڑھا : ''گوشۂ عافیت'' کے بارے میں؟

اختر : جی نہیں۔ جو آپ کے مکان کے اوپر کا حصہ خالی پڑا ہے سنا تھا اس کو آپ کرایے پر اٹھانا چاہتے ہیں۔

بوڑھا : جی ہاں اس کا نام ''گوشۂ عافیت'' ہے۔ آپ، شوق سے اسے دیکھ لیجئے۔ کرایہ چالیس روپیہ ماہوار ہوگا۔ بجلی کا بل دھوبی نائی وغیرہ کے اخراجات آپ کو خود ادا کرنے ہوں گے۔ لیکن ٹھہریئے۔ پہلے ایک بات بتایئے۔

اختر : جی۔ فرمایئے۔

بوڑھا : آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟

انور : اگر گستاخی نہ ہو تو پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ شادی شدہ کو مکان دینا چاہتے ہیں یا غیر شادی شدہ کو۔

بوڑھا : دیکھیئے میں ایسے شادی شدہ کو مکان دینا چاہتا ہوں جس کے بچے نہ ہوں۔

انور : اتفاق سے ہم لوگ شادی شدہ بھی ہیں اور ابھی تک باپ بننے کی نوبت نہیں آئی ہے۔

بوڑھا : اس کے علاوہ مکان میں رہنے کے لئے ایک شرائط نامہ بھی ہے۔ ٹھہریئے میں ابھی لاتا ہوں۔ میں نے احتیاطاً اس کی کچھ کاپیاں نقل کروا کر رکھ لی ہیں۔ بات

یہ ہے صاحب کہ صاف بات ٹھیک ہوتی ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔ اسے سن کر اس پر دستخط کر دیجئے پھر آگے بات چیت ہوگی۔ (اٹھنے لگتا ہے)

اختر : جی ہاں، ضرور (کتا پھر بھونکتا ہے اور اختر کی طرف آتا ہے)

انور : مگر معاف کیجئے جناب آپ اپنے کتے کو اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

بوڑھا : (پھر بیٹھ جاتے ہیں) دیکھئے حضرت۔ یہ عہد نامے کی پہلی شرط ہے۔ آپ کو اس کتے کے بارے میں کچھ بھی کہنے سننے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بھونکنے پر آپ کبھی اعتراض نہیں کریں گے۔ کبھی اس کو مارنے پیٹنے کا ارادہ نہیں کریں گے۔ اور نہ اس کو روٹی وغیرہ کے ٹکڑے ڈال کر اپنے اوپر بلائیں گے۔

انور : مگر صاحب یہ تو بڑی زیادتی ہے اور اگر کتا کاٹنے کو دوڑ پڑے__

بوڑھا : تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کرایہ دار رکھوں تو وہ میرے گھر کے معاملات میں دخل دے۔ مجھے کتا پالنے کا بھی مجاز نہیں رہا۔ نہیں صاحب مجھے ایسے کرایہ دار کی ضرورت نہیں۔

انور : آپ تو خواہ مخواہ خفا ہوئے جا رہے ہیں۔ میں نے تو صرف یہ عرض کیا تھا کہ آپ اپنے کتے کو زنجیر سے باندھ کر رکھا کریں۔

بوڑھا : لاحول ولا قوۃ۔ یعنی پھر گھر کی حفاظت میں اپنے آپ کروں۔ یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا۔ آپ کو شرط منظور ہو تو مکان میں رہیئے ورنہ کوئی دوسرا مکان تلاش کر لیجئے۔

انور : اور کوئی شرط (اختر بور ہو کر اخبار اٹھا لیتا ہے)

بوڑھا : جی ہاں وہ دوسری شرط یہ ہے کہ کرایہ پیشگی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح 7 بجے ادا کرنا ہوگا۔ تیسری یہ کہ کرائے کی کوئی رسید نہ دی جائے گی اور آپ کو رسید مانگنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ چوتھی یہ کہ آپ بیڑی یا سگرٹ پیتے ہوئے گنگناتے ہوئے یا شعر پڑھتے ہوئے اپنے زینے پر سے نہ گزریں گے۔

انور : سبحان اللہ شعر پڑھنا بھی جرم۔

بوڑھا : میاں صاحبزادے مجھے بحث کرنے کی مہلت نہیں۔ ''گوشۂ عافیت'' چاہئے تو یہ شرط ہے۔

انور : مگر بیڑی سگرٹ پینے یا شعر پڑھنے سے آپ کا کیا تعلق۔ یہ ہمارا ذاتی فعل ہے۔ آپ کو میرے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں بڑے میاں۔

بوڑھا : واہ صاحب واہ میاں ایسے ویسے کرایہ داروں کو رکھ کر میں اپنے بچوں کا ستیاناس مارلوں!؟ میرے بچوں کے اخلاق پر کیا اثر پڑے گا۔

اختر : (اخبار پڑھتے پڑھتے ایک دم بول اٹھتا ہے) خیر اب کوئی اور شرط تو باقی نہیں ہے۔ بوڑھا! پانچویں شرط یہ ہے کہ اس مکان کی صفائی مرمت وغیرہ کرانے کے لئے آپ تقاضہ نہیں کریں گے اور اگر آپ مرمت کرائیں گے تو مجھ سے اجازت لے لیں گے۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ آپ کے دوست اور مہمان سات بجے شام کے بعد اور نو بجے سے پہلے نہ آئیں گے۔ ساتویں شرط یہ ہے کہ آپ اوپر گراموفون بجانے اور کوئی چیز کوٹنے سے پہلے اطلاع کر دیا کریں گے۔ (اختر پھر اخبار پڑھنے لگتا ہے)

انور : آپ نے تو پوری نادر شاہی بنا رکھی ہے۔

بوڑھا : نادر شاہی؟! نادر شاہی کیسی جی؟! میں نے آپ کے گلے پر چھری تو رکھی نہیں ہے کہ آپ مکان لے لیں، آپ کو ہزار بار غرض پڑے تو ''گوشۂ عافیت'' کا رخ کیجئے ورنہ کوئی زبردستی نہیں ہے۔

انور : آپ نے کرایے دار کو سمجھ کیا رکھا ہے۔ آخر کوئی حد ہے اس دھاندلی بازی کی؟

بوڑھا : برخوردار۔ پگڑی میں نہیں لیتا۔ کسی قسم کی زور زبردستی نہیں کرتا۔ کرایہ دار رکھ کر اپنے بچوں کے اخلاق کا ستیاناس مارنا نہیں چاہتا۔ میں صاف آدمی ہوں۔

انور : جی ہاں اس میں کیا شک ہے کہ آپ صاف آدمی ہیں۔

اختر : (اخبار تہہ کر کے رکھ دیتا ہے) مگر آپ جانتے ہیں بڑے صاحب کہ میرے دوست کو گانے کا بے حد شوق ہے۔

بوڑھا : جناب اس علاقے میں تو گانا نہیں ہوسکتا۔آپ چاہیں تو اپنا شوق سینما ہال میں پورا کر سکتے ہیں۔میرے یہاں ناممکن ہے۔

اختر : اچھا تو آپ کا عہد نامہ ختم ہوا مکان دیکھ لینے کے بعد کچھ عرض کریں گے۔

بوڑھا : جی نہیں میرا عہد نامہ ختم کہاں ہوا ہے۔آٹھویں شرط یہ ہے کہ میں جس وقت چاہوں گا۔پندرہ روز پہلے اطلاع دے کر آپ سے مکان خالی کرا سکوں گا لیکن اگر آپ خالی کرنا چاہیں تو دو مہینے پہلے اطلاع کرنا ضروری ہوگا۔بات دراصل یہ ہے کہ میرے کچھ عزیز جلد ہی آنے والے ہیں ممکن ہے اس وقت آپ کو مکان خالی کرنا پڑے۔ابھی سے بتائے دیتا ہوں میں صاف آدمی ہوں۔

اختر : کیا؟!جلد ہی عزیز آنے والے ہیں؟

انور : لیکن یہ تو مذاق ہوا بالکل۔ایک مہینے بعد ہم کو مکان خالی کرنا پڑا تو__

بوڑھا : (بات کاٹ کر) یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے میرا فرض تھا آپ کو آگاہ کر دوں۔عہدنامے کی باقی شرطیں آپ خود پڑھ لیجئے گا۔

انور : بہتر۔اجازت ہو تو مکان کو ایک نظر دیکھ لیں۔

بوڑھا : ٹھیک ہے۔چلئے۔

[اٹھنے کے لئے انور مونڈھا کھسکاتا ہے،مرغیوں کی فوج مونڈھے کے نیچے سے نکل بھاگتی ہے اور اسٹیج پر ہر طرف دوڑنے پھرنے لگتی ہے]

بوڑھا : ارے ارے....آپ نے تو سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔مونڈھے کے نیچے تو مرغیاں بند تھیں۔(جھنجھلا کر) اوہ ہو آپ سے کسی نے کہا تھا کہ اس زور سے مونڈھا گھسیٹئے۔بس یوں ہی اٹھ جاتے۔اسے ہلانے جلانے کی کیا ضرورت تھی۔اب بتائیے کون پکڑ کر بند کرے گا اسے۔لاحول ولاقوۃ۔

انور : معاف کیجئے گا۔

بوڑھا : اچھا معاف کیجئے گا! آپ تو زبان ہلا کر خاموش ہو گئے۔یہاں جان ضیق میں ڈال دی آپ نے۔

[اختر گھبرا کر اٹھتا ہے تو اس مونڈھے کے نیچے سے مرغا بھی نکل بھاگتا ہے]

بوڑھا : لاحول ولا قوۃ۔ خوب ہیں آپ کے دوست بھی۔ انھوں نے مرغے کو بھی کھول دیا۔ بڑا سرکش مرغا ہے۔ اب بتایئے کون بند کرے گا اسے، آپ لوگوں کو ذرا احتیاط برتنا نہیں آتا۔

اختر : ارے تو صاحب آپ غور فرمایئے بھلا مونڈھوں کے نیچے مرغیاں بند کرنے کی کوئی تک ہے۔

بوڑھا : میں کہتا ہوں آپ کے مونڈھا کھینچنے کی کیا تک تھی۔ آپ نے میری جان عذاب میں ڈال دی۔ اچھا بیٹھئے آپ کرسی پر۔ میں ان مرغیوں کو پکڑ لوں (یہ کہتے ہوئے بوڑھا مرغیوں کے پیچھے لپکتا ہے اور دیر تک کڑی، کڑی، ڈربے، ڈربے، ڈربے، کور کور کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ایک بار مرغیوں کا پیچھا کرتے کرتے بائیں طرف اسٹیج سے باہر چلا جاتا ہے)

انور : (بوڑھے کو جاتا دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا ہے پھر آہستہ سے اختر سے مخاطب ہوتا ہے) ارے بھئی اختر۔ اب بولو۔ کیا کہتے ہو دوست۔ یہ انیس شرطوں کا عہد نامہ کون پورا کرے گا۔

اختر : میری سنو تو مکان لے لو۔

انور : مکان تو لے لوں مگر یہ عہد نامہ اور مہینے بھر بعد ان کے عزیزوں کو کون بھگتے گا۔

اختر : وہ سب بھگت لیا جائے گا۔ تم آٹھ دن رہ کر دیکھ لینے کو کہو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔

بوڑھا : (ہنستا ہوا مرغ پکڑے ہوئے بائیں طرف سے اسٹیج پر آتا ہے) ارے جلدی اٹھئے مونڈھے پر سے بڑی مصیبت سے قبضے میں آیا ہے یہ کم بخت۔ میرا تو سانس پھول گیا۔ اصیل ہے اصیل۔ (انور مونڈھا اٹھاتا ہے۔ بوڑھا اس کے نیچے مرغ کو بند کر کے مونڈھا سنبھال کر کھڑا ہو جاتا ہے) جناب دیکھئے خدا کے لئے مونڈھے پر جمے بیٹھے رہئے گا۔

[مرغا مونڈھے کے نیچے اذان دیتا ہے]

انور : آپ فکر نہ کریں اب میں ہلوں گا بھی نہیں۔

بوڑھا : آپ کا نام بھولا۔

اختر : جی۔ خاکسار کو اختر کہتے ہیں۔

بوڑھا : تو میں نے کہا ذرا مرغیاں پکڑنے میں مدد کرو۔ نوکر کم بخت کو خضاب لینے شہر بھیجا تھا وہیں مر کر رہ گیا اور آج کل کے لڑکے تم جانو بالکل نالائق ہوتے ہیں، دو کوڑی کام کے نہیں۔

اختر : جی صحیح فرمایا آپ نے۔ اکبر مرحوم نے اسی لئے تو کہا تھا۔

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

بوڑھا : ارے اکبر کی باتیں چھوڑیئے۔ اکبر بادشاہ کو تو لال قلعہ بنوانے اور شعر لکھنے کے سوا کام ہی کیا تھا۔ اسی لئے ایسی آوارہ اولاد اٹھی ہاں تو اختر صاحب ذرا مرغیاں گھیریئے نا۔

اختر : (ذرا سا ہنس کر) عجیب اتفاق ہے جناب آپ کے یہاں آتے ہوئے پاؤں میں درد محسوس ہوا اب اس وقت اچھا خاصہ شدید ہو گیا ہے۔ غالباً نزلے کا اثر ہے۔ مجھے معاف کیجئے البتہ ___

انور : میں ذرا جلدی میں ہوں، دفتر سے ذرا دیر کی چھٹی لے کر چلا آیا تھا ورنہ میں آپ کا ہاتھ ضرور بٹاتا۔

بوڑھا : اچھا۔ اچھا۔ لیکن آپ ذرا دیر اسی مونڈھے پر جمے بیٹھے رہئے۔ ارے دیکھئے اسے ٹیڑھا مت کیجئے۔ آپ ذرا آگے جھک گئے تو مرغا نکل جائے گا۔

انور : بہت خوب آپ فکر نہ کریں۔ میں نے سوچا مکان کے بارے میں بات پکی کر لی جائے۔

بوڑھا : آپ کا مطلب ہے ''گوشۂ عافیت'' کے بارے میں۔

انور : جی ہاں۔ جی ہاں۔

بوڑھا : تو آپ کو ساری شرطیں منظور ہیں نا۔ اور ہاں وہ ایک شرط میں عہد نامے میں نقل کرانا بھول گیا۔

اختر : وہ کیا۔

بوڑھا : وہ شرط یہ ہے کہ آپ ''گوشۂ عافیت'' کو اپنا مکان نہ کہہ سکیں گے۔ خط و کتابت میں بھی نہ لکھیں گے۔ اور اگر ان شرائط میں سے کسی کی خلاف ورزی کریں گے تو مجھے مکان کو فوری طور پر خالی کرا لینے کا حق ہوگا۔

انور : تو پھر کہیے تو عہد نامے پر دستخط کر دوں۔ خیال یہ ہے کہ پہلے ایک مہینے کے لیے رہ کر دیکھوں گا۔ اگر آپ کی اور ہماری بنے گی تو رہوں گا ورنہ کوئی اور انتظام کرلوں گا۔

بوڑھا : مگر اس صورت میں بھی کرایہ تو ایک مہینے کی پیشگی دینا ہی ہوگا۔

انور : (روپے نکال کر بوڑھے کو دیتے ہوئے) اچھا تو یہ لیجیے پیشگی کرایہ۔ میں کل ہی سے مکان میں آجاؤں گا۔

بوڑھا : بہت خوب۔

انور : اچھا تو اب اجازت دیجیے۔ دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ آداب عرض۔

بوڑھا : آداب عرض۔ دیکھیے ذرا احتیاط سے اٹھیے گا، مرغا نہ نکل جائے۔

[انور اور اختر بہت احتیاط سے اٹھتے ہیں کتے سے بچتے بچاتے صدر دروازے تک پہنچتے ہیں]

تیسرا منظر

[''گوشۂ عافیت'' کا ایک کمرہ جو زینے کے بالکل قریب ہے۔ زینے کی دو ایک سیڑھیاں اسٹیج کے بائیں طرف دکھائی دیتی ہیں کیونکہ زینے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اسی کمرے میں مینٹل پیس پر ایک لیمپ جل رہا ہے کمرے میں ایک بڑا گھنٹہ ٹنگا ہوا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ کمرے کی

فضا میں ترتیب اور بے ترتیبی دونوں موجود ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ حال ہی میں اس مکان میں منتقل ہوئے ہیں اور ابھی پوری طرح سامان اور گھر سلیقے سے نہیں سجایا گیا ہے۔ مثلاً وہ کرسیاں اور میز جو پہلے منظر میں دیکھی گئی تھی یہاں بھی موجود ہے، قالین بھی وہی ہے البتہ بکسوں میں سے صرف ایک بکس یہاں اسٹیج کے دائیں طرف بے ترتیبی سے پڑا ہوا ہے اور اس کے برابر چھوٹا موٹا سامان بھی پڑا ہوا ہے جس میں جوتے، خالی شیشیاں، خالی ڈبے فلٹ، ایک پرانا ہیٹ اور ایک ہارمونیم بھی ہے۔ چند کتابیں بھی یہاں دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ مینٹل پیس پر رکھ دی گئی ہیں۔ یہاں کچھ کپڑے اور چادریں بھی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی ہیں۔ برابر ایک پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر بستر موجود ہے۔ دیوار پر ایک ڈھولک بھی لٹک رہی ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے اختر کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ سلیپنگ سوٹ پہن رکھا ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ کر سگرٹ سلگاتا ہے اتنے میں انور دائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ یہ دروازہ دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہے جبکہ اسٹیج کی بائیں طرف کا دروازہ زینے کے دروازے کے قریب ہے۔ انور بھی شب خوابی کے لباس میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بیگم بھی داخل ہوتی ہیں۔ ملگجا سا غرارہ، قمیص اور دوپٹہ پہنے ہوئے ہیں، سویٹر بھی پہن رکھا ہے۔]

اختر : (ڈرامائی انداز میں کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہوئے)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

انور : شہ__ خاموش۔ ارے بھئی بڑے میاں سن لیں گے کہ تم گنگنا رہے ہو اور اس مکان کو اپنا گھر کہہ رہے ہو تو ابھی مکان سے نکال باہر کر دیں گے۔

اختر : بڑے میاں نکالیں یا رکھیں اس وقت تو یہ کمرہ میرا ہے۔ آپ لوگ اپنے کمرے

۔سے اس کمرے میں آئے ہیں تو گویا ہم اپنے بھائی بھابی کا استقبال بھی نہ کریں۔
کیا بالکل پھاوڑے ہی ہو جائیں۔

بیگم : اچھا مکان لیا ہے تو کیا سچ مچ ناک کان کٹا کر رہنا پڑے گا۔

اختر : نہیں بھابی۔ ہرگز نہیں۔ دیکھو تو میں کیا گل کھلاتا ہوں مگر ایک شرط ہے کہ تم ذرا اپنا دل مضبوط کر رکھنا کچھ وہم دل میں نہ دلانا۔

بیگم : آخر سنوں تو کیا کرنے والے ہو۔ (انور اشارے سے منع کرتا ہے)

اختر : جی نہیں سننے کی بات نہیں دیکھنے کی بات ہے۔

بیگم : اے ہوگی۔ تمہاری باتیں تو سدا بے تکی ہوتی ہیں۔ میں تو یہ پوچھنے آئی تھی کہ چائے اور لوگے یا نہیں۔ آج دن بھر سامان ٹھیک کرنے میں، میں تو تھک کر چور ہو گئی ہوں، جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ میں تو جاتی ہوں سونے کو سخت نیند آ رہی ہے۔
مگر تمہارے بھائی کی نیند نہ جانے کیوں غائب ہو گئی ہے۔

اختر : آپ آرام کیجئے۔ مردوں کی نیند زیادہ تھکن میں غائب بھی ہو جاتی ہے۔

بیگم : اچھا بھئی میں تو چلی۔

اختر : خدا حافظ۔

انور : ہاں بھئی ٹھیک ہے تم جا کر سوؤ۔ میں اختر سے دو باتیں کر کے ابھی آتا ہوں۔ خدا حافظ۔ شب بخیر۔

[بیگم باہر سونے کے کمرے کے دروازے سے چلی جاتی ہے۔]

اختر : (کچھ وقفے کے بعد) تو بھئی۔ سارا انتظام مکمل ہے۔

انور : ہاں سب ٹھیک ہے۔ اس لڑکے سے بھی کہہ دیا ہے۔

اختر : تو پھر شروع کریں پروگرام۔ یار بہت دنوں بعد اداکاری کا موقع آیا ہے۔ کیا پتہ تھا کہ کالج کے ڈراما کلب کے کمالات اب اس طرح کام آئیں گے۔

انور : مگر کمال کی اداکاری ہو تب تو بات ہے ورنہ پڑیں گی بے بھاؤ کی۔

اختر : ذرا انسپائر کرو۔ دیکھو ذرا وہ چادر اٹھاؤ۔ پرانا ہیٹ پہنو (انور ڈھیر سے چادر اٹھاتا

ہے) اسے اوڑھ کر ذرا مردے کی طرح کمرے میں چکر تو لگاؤ، جیسے ہی میں چیخ ماروں تم بھی چادر پھینک کر میری طرح چیخ مارنا۔ (انور چادر اوڑھ کر ہیٹ پہن کر مردے کی طرح لنگڑاتا ہوا کمرے کا گشت لگاتا ہے)

اختر : (زور سے چیختا ہے) بچاؤ... بچاؤ.... مار ڈالا... مار ڈالا... بچاؤ۔

(انور بھی یہ سب الفاظ داہراتا ہے)

اختر : ہائے.... ہائے.... ہوہو.... ہاہا.... افوہ.... مار ڈالا.... ارے کوئی بچاؤ... اے مرا... ... مرے اللہ.... بچاؤ....

(بیگم گھبرائی ہوئی دائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہیں)

بیگم : کیا ہوا؟ اختر بھائی! کیا ہوا۔

انور : کیا بات ہے؟

اختر : بھابی آپ جائیے۔ انور بھیا۔ وکیل صاحب کو بلائیے۔ میرا دم نکلا جارہا ہے میں مرجاؤں گا۔ میری آنکھوں نے اسے دیکھا ہے... افوہ... ارے کوئی بچاؤ... وہ مار ڈالے گا مجھے۔

انور : بیگم تم انھیں سنبھالو۔ میں ابھی وکیل صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔

(انور نیچے جاتا ہے بائیں طرف دروازے زینے کی طرف جاتا نیچے سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اختر کی بے قراری اور چیخ پکار بدستور جاری ہے)

اختر : ارے محلے والو مر گئے کیا؟... یہ مجھے مار ڈالے گا... ہائے... ہائے... افوہ... مار ڈالا... مرے اللہ بچاؤ... میری جان لے لے گا...

بیگم : اختر بھیا۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔

اختر : بھابی۔ آپ اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ وکیل صاحب آتے ہوں گے... ہائے کیسے چپ ہو جاؤں میری آنکھوں میں تو اسی کی صورت ناچ رہی ہے.... (پھر چلانے لگتا ہے) ہائے... مار ڈالا... وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا... وہ مجھے مار ڈالے گا...

(انور بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

انور : (تیز قدموں سے آتا ہے) آجائیے وکیل صاحب (بیگم دائیں طرف کے دروازے سے چلی جاتی ہے)

اختر : ارے محلے والو مر گئے کیا؟... یہ مجھے مار ڈالے گا... ہائے... ہائے... افوہ... مار ڈالا... مرے اللہ... بچاؤ... میری جان لے لے گا....

(بوڑھے کا لباس وہی ہے فرق یہ ہے کہ پتلون کی جگہ پاجامہ پہنے ہوئے ہیں جو گرم ہے اور مٹیالے رنگ کا ہے اور سر پر کنٹوپ پہنے ہوئے ہیں جو کانوں کو ڈھکے ہوئے ہے)

بوڑھا : کیا بات ہے بھائی۔ کیا تکلیف ہے؟

اختر : وکیل صاحب! آپ کے گھر میں بھوت!

بوڑھا : (حیرانی اور پریشانی میں خود بھوت کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے) بھوت! میرے گھر میں بھوت!!

اختر : جی ہاں بھوت۔ آپ کے گھر میں بھوت!! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے دیوار پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا پھر میری طرف بڑھا (پھر چیخنے لگتا ہے) ہائے مجھے بچاؤ... وکیل صاحب کے مکان نے میری جان لے لی.... مجھے بچاؤ... ہائے... ہائے!!!

(شور سن کر چند ہمسایے زینے پر دستک دیتے ہیں اور دستک دے کر تھوڑی دیر میں اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ پڑوسی مختلف قسم کے ہیں اور مختلف لباس پہنے ہوئے ہیں جو عام طور پر لوگ سوتے وقت پہنتے ہیں سب کے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند سے اٹھ کر آئے ہیں۔ ان میں ایک پیر صاحب بھی ہیں جو گیروا کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور تسبیح گلے میں ڈالے ہوئے ہیں۔)

ایک ہمسایہ: کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟

اختر : (چلا کر) بھوت! وکیل صاحب کے گھر میں بھوت!!

بوڑھا : میں کہتا ہوں اس مکان میں پینتیس سال سے رہتا ہوں کبھی میں نے کوئی بھوت نہیں دیکھا۔

اختر : میں نے تو اپنی ان دونوں آنکھوں سے (آنکھوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) دیکھا ہے وکیل صاحب۔

دوسرا ہمسایہ: کہاں دیکھا! کہاں تھا؟ کیسا تھا؟

اختر : جناب سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی پیشاب کرنے کے لئے اٹھا صحن میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دیوار پر سفید کپڑے پہنے بیٹھا ہے بھوت! (پھر چلانے لگتا ہے) اللہ! اللہ کی پناہ!! بھوت!

تیسرا ہمسایہ: تو جناب پھر کیا ہوا؟؟

اختر : مجھے دیکھ کر مسکرایا پھر میری طرف بڑھا۔

پہلا ہمسایہ: مسکرایا؟!

دوسرا ہمسایہ: جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔

بوڑھا : جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے۔

اختر : آپ تو کہیں گے ہی۔ آپ کے مکان میں جان دینے نہیں آئے ہیں ہم۔

تیسرا ہمسایہ: پھر کیا ہوا؟

اختر : اس نے مجھ سے کہا۔

پہلا ہمسایہ: اس نے بات بھی کی؟!

دوسرا : کیا بات کی اس نے؟

اختر : جی ہاں اس کی نذر نیاز نہیں ہوئی ہے نہ قوالی کرائی گئی ہے۔ یہ لوگ اسے ترساتے ہیں، اسی لئے اس کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔

بوڑھا : لاحول ولاقوۃ۔ میں کہتا ہوں سب فضول کی باتیں ہیں۔

انور : جی ہاں آپ کی نظر میں ہوں گی فضول کی باتیں؟ ایسا ہی ہے تو آپ ذرا اس مکان میں آکر رہیے۔

پہلا ہمسایہ: ہاں بھئی جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔

دوسرا ہمسایہ: کون رہے گا اس مکان میں۔ کس کی جان فالتو ہے؟!

بوڑھا : میں کہتا ہوں بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے آپ لوگوں کو کس نے بلایا ہے کوئی تماشا ہو رہا ہے یہاں! بے کار کی باتیں لگا رکھی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

پیر جی : (جو ابھی تک خاموشی سے ساری گفتگو سن رہے تھے) جناب بدارواح اور جنات کا وجود تو قرآن کریم سے ثابت ہے (اختر سے مخاطب ہو کر) حضت۔ آپ بسم اللہ کیجئے آج ہی رات کو قوالی کا انتظام کر لیجئے۔ انشاء اللہ ساری زحمت رفع ہو جائے گی۔

بوڑھا : اجی سب ضعیف الاعتقادی کی باتیں ہیں۔

پیر جی : بھوت نے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے اسی طرح ترسایا گیا تو میں محلے والوں کو بھی پریشان کروں گا۔

پہلا پڑوسی : محلے کے اور گھروں میں بھی جائے گا؟!

دوسرا : کیا کہا؟! محلے والوں کو پریشان کرے گا؟!

پیر جی : حضت۔ آپ قوالی کا انتظام کیجئے۔

بوڑھا : میرے گھر ہر گز قوالی وغیرہ نہیں ہوگی۔

کئی ہمسائے: یہ سارے محلے کی خیریت کا سوال ہے۔

اختر : اور بھوت!! — ہائے میرے اللہ۔ ابھی تک میری آنکھوں میں بھوت کی شکل گھوم رہی ہے بھوت!! (پھر چیخنا چلانا شروع کر دیتا ہے)

انور : وکیل صاحب۔ ہم لوگ تو صبح کو اپنا سامان باندھ لیں گے۔ صاحب۔ آپ کا مکان آپ کو مبارک۔ یہاں اس چکر میں ایک آدھ کی جان چلی جائے گی۔

کئی آدمی : ہاں صاحب ٹھیک بھی تو ہے۔

بوڑھا : ارے انور میاں! خدارا کہیں ایسا بھی نہ کیجئے گا بھئی جیسے تمہارے گھر کی خیریت ویسے ہی میرے گھر کی خیریت اس میں کوئی غیریت کی بات تو ہے نہیں۔

انور : نہیں صاحب میں بھر پایا ایسے مکان سے۔ بیگم کا ڈر کے مارے برا حال ہے۔

اختر : میں تو واپس چلا۔ ہرگز اس گھر میں نہ رہوں گا۔

بوڑھا : ایسی بات نہیں کرتے اختر بیٹا۔ ایسا ہی ہے تو قوالی کرالو۔

اختر : میں کیوں کرالوں؟ قوالی تو مالک مکان کی طرف سے ہونی چاہیے۔

(باقی لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ کچھ غور سے اس گفتگو کو سن رہے ہیں اور اختر کی حمایت میں سر ہلا رہے ہیں)

بوڑھا : جی نہیں۔ میرے پاس اتنا فالتو روپیہ نہیں ہے۔

انور : ٹھیک ہے لیکن ہم تو ایک پل بھی اس بھوت گھر میں نہیں رہ سکتے۔ ہمارا اسلام لیجئے۔

پیر صاحب: وکیل صاحب۔ قوالی کا خرچہ تو واقعی آپ ہی کو کرنا چاہئے۔ کوئی سو دو سو روپیہ کا سوال تو ہے نہیں۔ بس نذر فاتحہ کے لئے کچھ مٹھائی، کچھ سگرٹ پان کا خرچہ اور قوالوں کو جو کچھ دیں۔ بس۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

بوڑھا : مگر اس وقت قوال کہاں ملیں گے۔

ایک ہمسایہ: یہ تو سارے محلے کا سوال ہے۔

دوسرا ہمسایہ: محلے کے لیے وکیل صاحب کو اتنی قربانی تو کرنی ہی چاہیے۔

تیسرا ہمسایہ: وکیل صاحب، مان جایئے نہیں تو ہمیشہ مکان خالی پڑا رہے گا۔

پیر صاحب: اجی پیسہ کیا ہاتھ کا میل ہے۔ خدا کا فضل چاہیے۔ یوں بھی قوالی سے خدا کا فضل ہی ہوگا۔

بوڑھا : پیسے کی کیا بات ہے۔ چلئے میں ہی دے دوں گا مگر اب قوال کہاں ملیں گے۔

انور : وکیل صاحب۔ اس وقت ہم سب مل کر قوالی گا لیں گے۔ ہارمونیم تو یہاں موجود ہے ڈھولک یہ رہی۔

پیر صاحب: بسم اللہ! بسم اللہ!!

اختر : آپ حضرات تشریف رکھیں (اختر میز اور کرسیاں ہٹا کر ایک کنارے رکھ دیتا ہے اور قالین پر سب لوگ بیٹھنے لگتے ہیں۔ بوڑھا کافی دیر ناگواری سے ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے پھر بیٹھ جاتا ہے)

پیر صاحب: اس وقت زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں۔ لائیے ہارمونیم مجھے دیجئے۔ ڈھولک مرزا صاحب لے لیں گے (ڈھولک اتار کر ایک پڑوسی کے سپرد کر دی جاتی ہے، پیر صاحب ہارمونیم لے کر بیٹھتے ہیں)

انور : (اختر سے) پارٹنر۔ ذرا سگریٹ تو پلاؤ۔

اختر : (سگرٹ نکال کر دیتا ہے) یہ لو اور دوسروں کو بھی پلاؤ۔

بوڑھا : یعنی لاحول ولاقوۃ۔ سگرٹ بھی پینا ضروری ہے۔

پیر صاحب: آخر ہرج ہی کیا ہے وکیل صاحب جس روح کو جو چیز پسند ہو اسی پر نیاز دلا کر استعمال کرنا چاہیے۔

بوڑھا : میں کہتا ہوں کیا غدر مچا رکھا ہے ان سب لوگوں نے۔

انور : دیکھیے وکیل صاحب جی تھوڑا نہ کیجئے نیت کا بھی بڑا اثر پڑتا ہے۔

بوڑھا : مگر صاحب، میرے گھر میں کبھی یہ نوبت نہیں آئی۔

اختر : سب کچھ اسی کا فتور ہے وکیل صاحب بس قوالی ہونے دیجئے دیکھئے چند دنوں میں یہ گھر گلزار ہو جائے گا۔

پیر صاحب: صحیح فرمایا آپ نے۔ قوالی میں بڑی برکت ہے اور بزرگوں کی ارواح مقدسہ کا سایا سر پر ہو تو واللہ کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اچھا حضرات! شروع کرتا ہوں۔

(پیر صاحب ہارمونیم بجاتے ہیں۔ ایک پڑوسی ڈھولک بجانا شروع کرتا ہے باقی انور، اختر اور چند لوگ تالی بجاتے ہیں۔ قوالی شروع ہوتی ہے پہلے دو رباعیاں پڑھی جاتی ہیں۔

گلشن میں پھروں کہ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی

ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اس کے بعد پیر صاحب غزل شروع کرتے ہیں۔ انور لے ملاتا ہے۔ اختر تال دیتا ہے۔ اختر بار بار بوڑھے کو اشارہ کرتا ہے کہ آپ بھی تال دیجئے مگر بوڑھے کے چہرے پر تھوڑی دیر ناگواری کے آثار قائم رہتے ہیں پھر تال دینے لگتا ہے۔

قوالی

قوالی کے انتخاب کا معاملہ مکمل طور پر ڈرامے کے پروڈیوسروں کے مذاق پر چھوڑا جاتا ہے۔

[قوالی کے منظر کو مختلف ترکیبوں سے حقیقی اور دلچسپ بنانا چاہیے۔ کبھی کبھی پیر صاحب پر حال کے اثرات بھی ظاہر کیے جاسکتے ہیں مگر جلد ہی پھر ہارمونیم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لوگ فرمائش کرتے ہیں گانے والے کو نذر بھی دی جاتی ہے جو پہلے بوڑھے کو پیش کی جاتی ہے اور بعد کو انور کی جیب میں پہنچ جاتی ہے]

ایک پڑوسی: سبحان اللہ! سبحان اللہ! جناب غزل کا پہلا شعر پھر عنایت ہو۔

انور : جناب ٹھہریئے۔ قوالی میں مالک مکان کو بھی ضرور شریک ہونا چاہیے۔ کار خیر ہے اور پھر۔

بوڑھا : میں؟ میں گاؤں؟!

انور : جی ہاں۔ تو کیا ہوا؟

وہی پڑوسی: بسم اللہ! بسم اللہ!!

دوسرا پڑوسی: جی ہاں۔ آپ کی شرکت ضروری ہے۔

بوڑھا : کیا شعر ہے۔ (انور شعر دہراتا ہے پھر بوڑھا بھی وہ شعر اپنی انتہائی بھدی آواز میں گاتا ہے اس کے بعد پیر صاحب اسے دہراتے ہیں پھر سب دہراتے ہیں۔)

[ایک پڑوسی اتنے میں پان اور سگرٹ لئے داخل ہوتا ہے۔ بوڑھا اسے بڑی

ناگواری کے ساتھ سر سے پاؤں تک دیکھتا ہے۔ اس کے آنے کے کچھ دیر بعد تک قوالی جاری رہتی ہے پیر صاحب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں سب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں]

انور : اب سب حضرات اپنے اپنے حصے کی سگرٹیں اور پان لے لیں اور دھواں اڑاتے ہوئے مرحوم کی روح کو ثواب پہنچاتے ہوئے اپنے گھر جائیں۔ آپ سب حضرات کا میری طرف اور وکیل صاحب کی طرف سے بہت بہت شکریہ۔

[بوڑھا چلنے لگتا ہے تو انور اسے روک لیتا ہے۔ باقی لوگ رفتہ رفتہ چلے جاتے ہیں]

انور : وکیل صاحب۔ مجھے آپ سے ایک بات عرض کرنی ہے۔

بوڑھا : کیا بات ہے میاں انور؟

انور : بات یہ ہے جناب کہ صاف صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ ہم اس مکان میں شاید نہ رہ سکیں گے۔

بوڑھا : پھر وہی بات؟ اسی کے لئے سب کچھ کیا ہے۔ اور پھر تم کہہ رہے ہو کہ نہ رہ سکوں گا۔

انور : جی نہیں۔ بھوت پریت کے خوف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ کے عہد نامے کی شرطیں منظور نہیں ہیں۔

بوڑھا : تمہیں جو شرط منظور نہ ہو میں اسے کاٹ دوں۔

انور : مجھے آپ کا کتا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ رات میں دیر سے لوٹنے کا عادی ہوں اور پھر گانا، پان سگرٹ دونوں میری عادت میں داخل ہیں اور پھر مہینے بھر میں عزیز بھی آنے والے ہیں۔

بوڑھا : کیسی باتیں فرما رہے ہیں آپ میاں انور۔ تم تو میرے بیٹے کے برابر ہو واللہ آج ہی سے کتے کو زنجیر میں باندھ کر رکھوں گا۔ رہا گانا اور سگریٹ یہ تو بھئی اپنا اپنا شوق ہے۔ اور تم کیا میرے عزیزوں سے کم ہو۔ اب تو میرے کتنے ہی عزیز کیوں نہ آئیں تم سے مکان خالی نہ کراؤں گا۔

انور : اور پھر مکان کا کرایہ بھی زیادہ ہے۔

بوڑھا : ارے بھئی تم خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہو۔ اچھا چلو دس روپیہ کم کرلو۔ اس قسم کا آدھا کرایا دے دیا کرو۔ بس اب تو خوش۔

انور : کیا عرض کروں وکیل صاحب۔ یہ رقم بھی ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو صبح 7 بجے پیشگی دینا میرے لیے مشکل ہوگا اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں کسی دوسرے مکان کی تلاش۔

بوڑھا : (بات کاٹ کر) لاحول ولاقوۃ۔ میں نے ایسا تکلف کرنے والا انسان نہیں دیکھا کون مردود تم سے پیشگی کرایہ مانگتا ہے جب مرضی ہو کرایہ دے دینا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس طرح تمہارے چلے جانے سے پھر کوئی کرایہ دار میرے مکان میں نہ آئے گا۔

انور : پھر آپ کا عہد نامہ؟!

بوڑھا : بھاڑ میں جھونکو عہد نامے کو میں تمہارے سامنے پھاڑ کر جلائے دیتا ہوں۔

انور : بہت خوب۔ اب آپ مجبور کرتے ہیں تو اور بات ہے۔ بزرگ کی بات ٹالی نہیں جاسکتی۔

بوڑھا : اچھا بھئی اب مجھے اجازت دو۔ نیند آرہی ہے۔

(بوڑھا چلا جاتا ہے)

(اختر جو پڑوسیوں کے ساتھ باہر چلا گیا تھا داخل ہوتا ہے۔ انور کمرے کو پھر سے ٹھیک ٹھاک کر رہا ہے اور قالین پر سے کاغذ کے ٹکڑے اور سگرٹ کے ٹکڑے ہٹا رہا ہے انھیں ہٹا کر کرسیاں اور میز پھر سے جماتا ہے)

اختر : (قہقہہ لگاتے ہوئے داخل ہوتا ہے) کہو دوست۔ مانتے ہو کیسا رام کیا بڈھے ہو۔

انور : واہ بھئی واہ۔ عہد نامہ منسوخ۔ کرایہ آدھا۔ گانے کی آزادی۔ کتے سے چھٹکارا۔ اب تو بس عیش کریں گے عیش۔ ہالا استاد۔

اختر : اس کو کہتے ہیں ''گوشۂ عافیت''

انور : بوڑھے کو تو اب عمر بھر بھوت نظر آئیں گے۔ مکان خالی ہو جانے سے تو وہ ڈر ہی

رہا ہے خوف اسے اس بات کا بھی ہے کہ بھوت خود اس کے گھر میں نہ گھس آئیں۔

اختر : اچھا سبق ملا ہے بڑے میاں کو۔ بہت دنوں تک یاد رکھے گا ظالم۔ بہت افلاطون اور قانون داں بنتا تھا۔ اور یہ بھابی کہاں چلی گئیں۔ (آواز دیتا ہے) بھابی۔

بیگم : (برقعہ پہنے ہوئے داخل ہوتی ہے)

انور : ارے یہ تم برقعہ اوڑھے کیوں چلی آ رہی ہو۔ کیا کہیں کی تیاری ہے۔

بیگم : سامان باندھ رہی تھی تم لوگ بھی تیاری کرو۔

انور : آخر بات کیا ہے۔

بیگم : مجھ سے اس گھر میں ایک سیکنڈ بھی نہیں رہا جائے گا۔

اختر : تو کیا تم سچ مچ سمجھ رہی ہو کہ اس گھر میں بھوتوں کا اثر ہے بھابی۔ وہ تو فقط ذرا مالک مکان کو ڈرانے دھمکانے کو ڈراما کھیلا تھا۔

بیگم : یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں۔

انور : تو پھر کیا بات ہے تم سے تو پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ جی میں وہم نہ لانا۔

بیگم : مگر میری آنکھوں میں تو وہی کم بخت بھوت ناچ رہا ہے۔ طبیعت میں بڑی وحشت ہے نابابانا۔ مجھ سے اس گھر میں ذرا دیر بھی نہ رہا جائے گا۔

انور : بچوں کی سی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تھوڑے دنوں میں پریشانی دور ہو جائے گی بھوت پریت پر اعتقاد نہیں کیا کرتے۔

بیگم : کون اعتقاد رکھتا ہے، مگر بھوت پریت (چیخ مارتی ہے) وہ دیکھو کون ہے۔ کتنے بڑے بڑے دانت نکالے کھڑا ہے سفید کپڑے پہنے ہوئے۔

انور : توبہ توبہ۔ وہ تو دیوار پر پچھلی مرمت کا نشان ہے۔

بیگم : میں پاگل ہو جاؤں گی خدا کے لئے یہاں سے چلو۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے تم تو یہی چاہتے ہو تا کہ میں گھبرا کر اپنے میکے چلی جاؤں۔ مجھے ساتھ رکھنا ہے تو ٹھکانے کے مکان ڈھونڈو۔ مجھ سے یہاں نہیں رہا جائے گا۔ ہرگز نہیں رہا جائے

گا۔ میں تو ڈر کے مارے مر جاؤں گی۔

انور : اچھا بابا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ اختر چلو سامان باندھو۔

(دونوں کے چہروں پر مردنی چھا جاتی ہے اور دونوں کرسی میں دھنس جاتے ہیں)

☆☆☆

سلسلۂ مطبوعات شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

کہرے کا چاند

بیادگار جشنِ صد سالہ غالبؔ دہلی یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد حسن

شائع کردہ

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

سلسلۂ مطبوعات، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

کہرے کا چاند

از ڈاکٹر محمد حسن

قیمت: تین روپے

سنہ اشاعت: فروری ۱۹۶۹ء

مطبع: جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی

شائع کردہ: شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

حرفِ آغاز

غالبؔ کے جشنِ صد سالہ کا نقشِ اول ۱۹۶۰ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ہاتھوں صورت پذیر ہوا تھا۔ اس سال دہلی یونیورسٹی میں جو یومِ غالب منعقد ہوا اس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بین قومی سطح پر منایا گیا اور اس میں ۱۹۶۹ء کے جشن کا بھی پورا منصوبہ پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت وائس چانسلر ڈاکٹر وی۔ کے آر۔ وی۔ راؤ نے کی جو اب ہندوستان کے وزیرِ تعلیم ہیں اور اس کا افتتاح قبلہ دیدہ ودل ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے عالمانہ خطبے سے ہوا، جو اُس زمانے میں بہار کے گورنر تھے۔ اس یومِ غالب میں ہندوستان کے اہلِ علم کے علاوہ جرمنی، چیکوسلواکیہ، روس، ایران، افغانستان اور پاکستان کے تہذیبی نمائندوں نے بطورِ خاص شرکت کی اور غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر ہم نے اردوئے معلّٰی کے غالب نمبر (۱۹۶۰ء) میں لکھا تھا کہ "ہمارا ارادہ ہے کہ غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر اس کام کو اور زیادہ وسیع پیمانے پر کیا جائے...... اردو کی خدمت ایک سرمایۂ سعادت ہے جو ہم تہی دستوں تک پہنچا ہے اور اگر ہم اس نیکی کے فروغ دینے میں کچھ بھی مدد دے سکے تو یہ خدائے کریم کی بخششِ خاص ہوگی۔" ذاکر صاحب ہی کی درخواست پر میں نے ۱۹۶۷ء میں یورپ، امریکہ اور مغربی ایشیا کا دورہ کیا اور یونیسکو، ادبی انجمنوں اور بعض یونیورسٹیوں کو غالب کے جشنِ صد سالہ کی طرف متوجہ کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ شاخِ آرزو ذاکر صاحب کے نفسِ گرم سے بار آور ہوئی اور یہ جشنِ صد سالہ ۱۹۶۹ء میں قومی اور بین قومی سطح پر منایا جا سکا۔

دہلی یونیورسٹی نے اس سلسلے میں جو کام کیے ان میں لائقِ ذکر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے وہ بصیرت افروز نظام خطبات ہیں جو انھوں نے غالبؔ کی حیات اور شاعری پر دیے اور جو شعبۂ

اردو کی طرف سے شائع ہو رہے ہیں۔ دوسرے وہ بین قومی مذاکرہ ہے جس میں غالب کے ترجمہ کرنے کے مسائل پر بحث کی گئی اور جس میں ہندوستانی مترجمین کے علاوہ پروفیسر شیمل (امریکہ) پروفیسر بوسانی (اطالیہ) پروفیسر داؤد رہبر (امریکہ) مسٹر رالف رسل (انگلستان) اور مسز ملینا پشونووا (چیکوسلواکیہ) نے شرکت فرمائی۔

تیسرا کام کتابوں کی اشاعت کا ہے جن میں تحقیقی بھی ہیں اور تخلیقی بھی۔ اسی میں ترجمے کے سمپوزیم کی روداد اور اردوئے معلیٰ کا وہ غالب نمبر جلد ۳ بھی شامل ہے۔ جو اندازہ ہے کہ ۸۰۰ صفحات پر محیط ہوگا۔ تخلیقی کاموں میں سرِ فہرست میرے رفیق کار ڈاکٹر محمد حسن ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کا یہ ڈرامہ ''کہرے کا چاند'' ہے جس کو آندھرا کی ساہتیہ اکادمی نے بھی قدر اول کی چیز قرار دیا ہے۔ امید ہے اس سے غالب کے متعلق ہماری بصیرت میں اضافہ ہوگا۔

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی — خواجہ احمد فاروقی

یکم مارچ ۱۹۶۹ء

☆☆☆

کہرے کا چاند

تین ابواب کا اسٹیج ڈرامہ

پہلا ایکٹ: تین سین

آرزو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

دوسرا ایکٹ: دو سین

شکست آرزو

آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

تیسرا ایکٹ:

عرفان

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

وقت: تین گھنٹہ

کردار

۱۔ چوبدار

۲۔ بنسی دھر

۳۔ غالب

۴۔ یوسف مرزا

۵۔ بیگم

۶۔ ماں

۷۔ محبوبہ

۸۔ داستان گو

۹۔ مولانا

۱۰۔ بزرگ

۱۱۔ ماموں

۱۲۔ میر کاظم

۱۳۔ حالی

۱۴۔ شیفتہ

۱۵۔ آرزو

۱۶۔ فضل حق

۱۷۔ کوتوال

تماشائی، سپاہی

جواری، فقیر، چوبدار

پہلا ایکٹ، پہلا سین

آگرہ انیسویں صدی کے شروع میں

(چند لوگ فقیروں کا سا لباس پہنے چمٹوں پر گاتے ہوئے اسٹیج کے ایک طرف سے داخل ہوتے ہیں اور وسط اسٹیج پر کچھ دیر ٹھہر کر گاتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے ہیں)

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو نہ مالک نہ خار بند
کیا چھوٹے کام والے وکیا پیشہ ورنجیب
روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آشام عنقریب
اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہوگئی بے اختیار بند

(فقیر حویلی کے دروازے پر رک جاتے ہیں)

ایک فقیر: اللہ ہی دے گا مولا ہی دے گا۔

دوسرا: تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

(حویلی سے چوبدار آتا)

چوبدار: بابا، برکت ہے، آگے بڑھو۔

پہلا فقیر: جا جا، ہم اس سرکار سے محروم واپس جانے والے نہیں۔

چوبدار: (آہ سرد بھر کر) بابا اب وہ حویلی کہاں، رسالدار نصر اللہ بیگ خان کا انتقال ہوگیا۔ کیا تیور کے لوگ تھے، پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے رسالدار مقرر ہوئے، فرنگیوں کے حملے کے وقت جان لڑادی مگر راجہ نے شنوائی نہ کی۔ شراب میں مست پڑا رہا تو یہ بھی استعفیٰ دے کر الگ ہو گئے پھر فرنگیوں کے لشکر میں رسالدار رہے، اللہ مغفرت کرے اچھی گزار گئے، اب کیا ہے چھوٹے بھائی پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوئے، دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر سدھار گئے، سچ ہے رہے نام اللہ کا۔

پہلا فقیر: اللہ ہی دے گا۔

دوسرا فقیر: مولا ہی دے گا۔

پہلا فقیر: تری ذات ہے اکبری سروری

مری بار کیوں دیر اتنی کری

(غالب جن کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں ڈیوڑھی سے نکل کر آتے ہیں اور فقیروں کو ایک نظر دیکھتے ہیں اور جیب میں جو کچھ ہے نکال کر دینے لگتے ہیں اپنا چھوٹا سا فرغل اور کلاہ بھی اتار کر بخش دیتے ہیں)

چوبدار: (حیران کھڑا دیکھتا رہتا ہے) سرکار! چھوٹے سرکار!

غالب: مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

چوبدار: (غالب کو گلے سے لپٹا کر چمکارتا ہے اور خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے)

آخر کیوں نہ ہو، بڑی سرکار کا بیٹا ہے جس ڈیوڑھی سے کبھی فقیر واپس نہ لوٹا ہو جہاں سے محتاج کبھی خالی ہاتھ نہ گیا ہو، وہاں یہ حال ہو کہ نہ باپ کا سایہ سر پر نہ چچا کا دست شفقت میسر۔

(یوسف مرزا، جو غالب سے دو برس چھوٹے ہیں، دوڑتے آتے ہیں۔ آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہے)

یوسف: —— مگر سر پر تاج ہے۔

چوبدار: کیا کہہ رہے ہیں چھوٹے سرکار۔

یوسف: ہم کہتے ہیں — سر پر تاج ہے (چوبدار ہنس دیتا ہے) ہنسو۔ ہم بھی ہنستے ہیں مگر سر پر تاج ہے (ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(بنسی دھر جو مرزا سے عمر میں کچھ بڑے ہیں، داخل ہوتے ہیں)

بنسی: چلو شطرنج کی ایک بازی ہو جائے استاد (پاس کے دیوان خانے میں جا بیٹھتے ہیں جو اسٹیج کے بائیں طرف ہے۔ جلدی جلدی شطرنج کے مہرے لگاتے ہیں۔ تھوڑی دیر خاموشی سے شطرنج کی بازی ہوتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بنسی دھر چال چلنے میں دیر کرتے ہیں)

غالب: چال چلو۔ میاں بنسی دھر۔

بنسی: چلتا ہوں مرزا، شطرنج ہے کوئی بچوں کا کوئی کھیل نہیں۔

غالب: ہمارے لیے تو کھیل ہے۔

بنسی: دیکھو مرزا۔ شطرنج میں تو کوئی خان ہو مجھ سے بازی نہیں لے جاسکتے۔ ایک شہ۔ برس ہا برس میں تو گویا آپ کو شطرنج کھیلنی آ گئی، چہ خوب! یاد رہے کہ ناظر بنسی دھر کے ساتھ کھیل رہے ہو۔

غالب: تو ابھی سے ناظر بھی ہو گئے۔

بنسی: باپ دادا عزت والے تھے تو بیٹا بھی ناظر ہوگا۔ دیکھ لینا۔

غالب: اچھا تو قبلہ ناظر صاحب یہ شہ تو بچئے۔ یہ لیجئے فرزیں تو گیا۔

بنسی: میاں صاحبزادے ہوا بھی، ذرا ٹھہرو، چال ابھی کاٹتا ہوں، وہ بھی ایسی کہ یاد کرو گے عمر بھر۔

غالب: ناظر صاحب دوسری بازی لگا لیجئے یہ خاکسار ترک بچہ ہے چال ہی ایسی چلتا ہے، باپ مرا زندگی بھر فوج میں رہا، چچا مرا رسالدار، نانا میرا کمیدان، باپ دادا کا سلسلہ تو ابن فریدون تک پہنچتا ہے، ہم سے بازی لے جانا آسان نہیں۔

بنسی: چہ خوب، یہ تو کبھی کبھی کھلا دیتا ہوں، تو برخوردار سمجھتے ہو کہ شطرنج آ گئی، کچھ خاندان کی پرانی راہ و رسم کا لحاظ کرتا ہوں ورنہ مات پلا پلا کر نوشیرواں بنا دیتا، سوچتا ہوں ہمارے تمہارے خاندانوں میں پشتوں سے رسم چلی آتی ہے۔ نجب خان کے زمانے میں

تمہارے نانا اور ہمارے نانا دونوں کمیدان تھے۔ دونوں نے ساتھ ہی فوج کی نوکری چھوڑی اور گھر بیٹھ رہے اور پھر کہیں نوکری نہ کی پھر جب سے ہوش سنبھالا ہم تم ساتھ ساتھ ہیں اگر دو چار مات پلا دیے تو کہو گے کہ برسوں پرانی دوستی کا پاس نہ کیا۔

غالب: واہ ناظر صاحب کہا کہنے ہیں عمر میں مجھ سے دو ایک برس ہی چھوٹے یا بڑے ہو گے اور باتیں کرتے ہو تو دادا نانا سے کم نوالہ نہیں توڑتے اور__

بنسی: خیر جی مرزا۔ یہ بازی تمہیں اٹھالو۔ مات ہم ہی مانے لیتے ہیں۔ کیا یاد کرو گے تم بھی کہ ناظر بنسی دھر کیا حاتم تھا۔ اچھا چلو دوسری بازی لگاؤ۔

غالب: نہیں جناب، دوسری بازی نہیں، آج بلوان سنگھ سے پتنگ کے پیچ لڑانا ہیں۔

بنسی: کون؟ راجہ بلوان وہی گدڑیوں کے کٹرے والا، وہ بھی عمر بھر بچہ رہے گا اور تمھارا بھی یہی حال ہے۔

غالب: جی ہاں۔ بس شطرنج کے سوا تو سارے کھیل گویا لڑکپن ٹھہرے، تم بھی ذرا پیچ لڑاؤ تو جانیں، چلو چلتے ہو۔

بنسی: اماں، توبہ کرو، میں گھر جاتا ہوں جب اس لونڈھیارپن سے نپٹ جاؤ تو بلا لینا، بازی سے جلد ہی فراغت کر لینا۔ سمجھے؟

(اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

غالب: بنسی دھر۔

بنسی: کیوں اب کیا افتاد ہے۔

غالب: ارے ظالم۔ یہ تو خیال ہی نہیں رہا کہ استاد عبدالصمد ہرمزد آج ابھی تک سیر تفریح کے لیے نہیں گئے، تم نے ادھر پیٹھ پھیری اور ادھر انھوں نے آواز لگائی 'عزیزم، عزیزم' اور بس پتنگ بازی وغیرہ سب دھری رہ جائے گی۔ بس ذرا دیر اور بیٹھے رہو۔

بنسی: یعنی استاد ہرمزد یہ سمجھیں کہ آپ میری وجہ سے بیٹھے ہوئے ہیں۔

غالب: بس میں پیچ لڑا کے ابھی آیا۔

بنسی: گویا مجھے کوئی اور کام تھوڑا ہی ہے میں آپ کے انتظار میں بیٹھا اونگھا کروں، جاؤ استاد

ہرمزد سے سبق پڑھو۔

کریمانہ بخشائے برحال ما

غالب: خیر۔ سبق یاد کرنے میں میرا کوئی ثانی نہیں، پتہ ہے استاد ہرمزد خالص ایرانی ہے اور خالص پارسی نژاد اور میری فارسی پر فخر کرتا ہے خوش نصیبی ہے میری کہ وہ سیر سیاحت کے شوق میں ایران سے آگرے آگیا اور ہمارے گھر مقیم ہوا۔ ورنہ کس کو ایسا استاد کامل نصیب ہوتا ہے۔

بنسی: بہت اچھا، بہت خوب، اب آپ جلد ہی آیئے۔ مجھے دیوان حافظ دیتے جایئے میں فال نکالتا ہوں کہ تمہاری پتنگ ڈور سے کٹتی ہے کہ پار ہوتی ہے۔ اور میری سنو تو مرزا لعنت بھیجو پتنگ بازی پر۔ آج رات راجہ بلاس رائے کی حویلی میں مشاعرہ ہے چلے چلتے ہیں۔ بھئی میری تو جان جاتی ہے ان مشاعروں پر۔ اکبرآباد کے شاعر بھی ایرانی شاعروں کو شرماتے ہیں اور ریختہ، تمہاری قسم وہ وہ مضمون نکالتے ہیں کہ میر و مرزا کو شرمائیں اور اپنے میاں نظیر __ ان کا کلام تو شہر میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔

غالب: تم کہو گے اپنی بڑائی کرتا ہے خدا کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں دو چار شعر تو ہم نے کہنے شروع کر دیئے ہیں۔

بنسی: سچ؟

غالب: بالکل سچ۔

بنسی: اچھا یہ تو بتاؤ اردو میں یا فارسی میں؟

غالب: دونوں گھر کی لونڈی ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ قطعہ، پتنگ پر لکھا ہے ذرا دیکھنا، داد دینے میں کنجوسی نہ کرنا۔

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی
لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیا نے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا اے دل ہوائے دلبراں
بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
بیچ میں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسی کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ ان کے کر نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری سانٹھ گانٹھ
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے
قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اڑادیں گے کہیں
مفت میں ناحق کٹادیں گے کہیں
دل نے سن کر کانپ کر کھا پیچ وتاب
غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب
رشتۂ در گردنم افگندہ اوست
می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

بنسی: (تھوڑی دیر مبہوت ہو کر تکتے رہتے ہیں۔) اچھا یار، یہ تو بتاؤ کس سے لکھوائی ہے۔

غالب: یقین نہیں آیا تمہیں۔

بنسی: یقین؟ میرا ایمان ہے کہ یہ شعر تم نہیں لکھ سکتے۔ تم پتنگ بازی اور شطرنج کے رسیا ظہوری، عرفی، خاقانی پڑھ لیے تو پڑھ لیے ورنہ تمہیں لکھنے پڑھنے سے کیا کام، اس میں ضرور کوئی چال ہے۔

غالب: ٹھیک کہتے ہو بنسی دھر۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔

بنسی: اب ہم سے نہ اڑو۔

غالب: (جیسے سنا ہی نہ ہو) مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میرے اندر کئی دل چھپے ہوئے ہیں کئی اور پیکر پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک امیر زادے کا دل ہے جس سے اپنے خاندان کی تباہی نہیں دیکھی جاتی اور وہ کسی طرح بھی اپنی آن بان رکھنا چاہتا ہے۔ ایک شاعر کا دل ہے جو سب آن بان، روٹی، روزی، شہرت، جاہ وجلال، منصب پر لات مار کر اپنے من کی دنیا میں حکمرانی کرنا چاہتا ہے جو من موجی ہے جسے ہوس ہے کہ شاعری کی دنیا میں ظہوریؔ، عرفیؔ اور بیدلؔ کیا حافظ وخیامؔ کو گرد کر دوں اور میرا کلام سونے جواہرات میں تولے ہوئے شاعروں کے کلام کے ساتھ تولا جائے اور آسمان کے سات طبق میری شاعری کے غلغلے سے گونج اٹھیں۔ پھر ایک نوجوان کا دل ہے جو عیش سے زندگی گزارنا چاہتا ہے ، شطرنج ، پتنگ بازی اچھی اچھی باتیں ، مزے دار جیالے دوست اور مشاعرے کی محفلیں۔ میلے ٹھیلے، نغمہ وسرود، بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

بنسی: یار تجھے سمجھنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ تبھی تو شطرنج میں بھی ٹیڑھی چال چلتا ہے۔ (دونوں ہنستے ہیں)

(غالب چلے جاتے ہیں۔ بنسی دھر تھوڑی دیر دیوان حافظ کی ورق گردانی کرتے ہیں، آنکھیں بند کر کے حافظ کے دیوان سے ایک فال نکالتے ہیں۔ ایک پرچہ پر دیوان کا شعر لکھتے ہیں اور رکھ دیتے ہیں ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ دلچسپی کا کوئی سامان نہیں پاتے تو دیوار پر لگی ہوئی ان روغنی تصویروں کو دیکھتے ہیں جو غالب کے باپ، چچا، نانا کی ہیں اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا نام پڑھتے ہیں اور ان کے پہلو میں ایک کیل سے وہ شعر لٹکا دیتے ہیں جو ابھی دیوان حافظ سے انھوں فال لیتے وقت نقل کیا ہے۔ اس عبارت کو زور سے پڑھتے ہیں۔

اسد اللہ خان بیگ:

اے در رخ تو پیدا انوار پادشاہی
در فکر تو پنہاں صد حکمت الٰہی

ابھی وہ شعر پڑھ کر بغور اس کے منہ کو دیکھ ہی رہے ہیں کہ پس منظر سے ڈھولک کی تان کے

ساتھ میراثیوں کے گانے کی آواز ابھرتی ہے اور فضا پر چھا جاتی ہے۔

بقدرت خلعت شاہانہ مبارک باشد

جلوہ شمع بہ پروانہ مبارک باشد

ساقی وشیشہ وپیانہ مبارک باشد

بتو غلطیدن مستانہ مبارک باشد

گانا ختم ہونے پر بنسی دھر ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف آتے ہیں چوبدار ابھی تک کھڑا ہوا ہے۔اس سے پوچھتے ہیں)

بنسی: آج یہ گانا بجانا کیسا ہے خان صاحب۔

چوبدار: تمہیں پتہ نہیں، اپنے مرزا کی شادی دلی میں طے ہوگئی ہے۔

بنسی: مرزا کی شادی؟

چوبدار: ترک بچوں میں یہی ۱۲۔ ۱۳سال کی عمر میں شادی کا دستور ہے۔ چھوٹے مرزا ماشاء اللہ تیرہ سال بھر کے چودھویں میں لگنے والے ہیں۔

بنسی: اچھا تو یہ گل کھلا رہے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں، لڑکی کس خاندان کی ہے؟

چوبدار: انہی کے خاندان کے لوگ ہیں، ریاست لوہارو کا نام سنا ہے، اس کے نواب احمد بخش کی بھتیجی اور نواب الٰہی بخش کی صاحبزادی — میں تو جانوں چھوٹے میرزا بھی اب دلی ہی جا بسیں گے۔

بنسی: اور سب لوگ!

چوبدار: اور سب لوگ بھی۔

بنسی: تو ڈیوڑھی ویران ہو جائے گی۔

چوبدار: ایسا نہ کہو بیٹے۔ ایسا نہ کہو۔

(بنسی دھر کچھ مغموم قدموں سے آگے بڑھتے ہیں۔ پس منظر میں میراثیوں کے گانے کی آواز پھر ابھرتی ہے۔ عشق برے ہی خیال پڑا ہے۔ چین گیا، آرام گیا)

(پردہ)

پہلا ایکٹ، دوسرا سین

(دونوں چوبدار پھر آتے ہیں)

پہلا: دلی۔

دوسرا: گلی قاسم جان کے قریب ایک چوراہا۔

(شب کا ابتدائی حصہ۔ لوگ ایک طرف داستان گو کے گرد جمع ہیں اور لالٹینوں کی روشنی میں داستان بیان کی جارہی ہے)

داستان گو: — جب شہر کے دروازے پر آیا، ایک نعرہ مارا اور تبر سے قفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا کہ اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خان ملکہ، مہر نگار اور شہزادہ کامگار کو جو تمہارا داماد ہے، ہانکے پکارے لیے جاتا ہے اگر مردمی کا کچھ نشہ ہے تو باہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو یہ نہ کہو چپ چاپ لے گیا نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو، یہ خبر بادشاہ کو پہنچی وزیر اور میر بخشی کو حکم ہوا ان تینوں بدذات مفسدوں کو باندھ کر لاؤ یا ان کے سر کاٹ کر حضور میں پہنچاؤ، ایک دم کے بعد غٹ فوج کا نمودار ہوا اور زمین آسمان گرد باد ہو گیا، بہزاد خان نے ملکہ کو اور اس فقیر کو ایک در میں پل کے کہ بارہ پلے اور جون پور کے پل کے برابر تھا کھڑا کیا۔

(چاوش اور چوبدار اور کچھ پولس کے سپاہی آگے آگے دوڑتے آتے ہیں۔ ''ہٹو، بچو، دور باش، ہوشیار، فرنگی، ریذیڈنٹ ولیم فریزر صاحب بہادر کی سواری آتی ہے'' کی آوازیں آتی ہیں، پھر ٹم ٹم کی گھنٹی کی کئی آوازیں سنائی دیتی ہیں، پھر بگھی کے گزرنے کی آواز — سب لوگ اسی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ سواری گزر جاتی ہے مجمع میں بے چینی او رسرگوشیاں)

مولانا: صاحبو! ملاحظہ فرمایا آپ نے — یہ مغلیہ شہزادے آغا بابر فرنگی ہو بیٹھے۔ وہی وردی، وہی پوشاک اور فرنگی ریذیڈنٹ کو ساتھ بٹھا کر خود بگھی ہانک رہے ہیں، پیچوان کے پاس رکھا

ہے اور سائیس پیچھے کھڑا ہے لوہارو کے نواب شمس الدین خان راوی ہیں اے سبحان اللہ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

داستان گو: تو صاحبو! بہزاد خان نے ملکہ کو اور اس فقیر کو ــــــ

مولانا: بس میر صاحب۔ داستان ہو چکی۔ اب اجازت ہو تو میں کچھ دین ایمان کی باتیں کروں۔ اے ایمان والو! کفر نے جو اشتعلہ اٹھایا ہے اور فرنگی نے جس طرح اقلیم میں غضب ڈھایا ہے آپ حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، بزم تیموری کا آخری چراغ جل رہا ہے پتہ نہیں کب بھڑک کر خاموش ہو جائے۔ دن رات نہ جانے کتنے ہندو مسلمان بے دین ہو رہے ہیں مدرسے تباہ، خانقاہیں ویران، دفتر آباد اور فسق و فجور کا بازار گرم ہے اب سنتا ہوں غازی الدین حیدر کے مدرسے کو انگریزی کے مدرسے میں بدل دیا جائے گا اور علم دین کی جگہ گٹ پٹ سکھائی اور لادینی بتائی جائے گی، ملک ویران ہو رہا ہے، دین تباہ، اپنے بیگانے اور امیر تاراج ہو رہے ہیں۔ یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ ہم سچی راہ سے بھٹکے ہیں، ہم نے حق کے لیے جینا اور حق کے لیے مرنا چھوڑ دیا ہے. جی چاہے تو مجھے وہابی کہہ کر ہنس لو، صاحبو! یاد رکھو حساب کا وقت قریب ہے. بہت قریب اور اس وقت اس سے بڑی سعادت کوئی نہ ہوگی کہ ہر مومن ہنستے ہنستے حق کے لیے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کردے۔

داستان گو: تو صاحبو! بہزاد خان نے ملکہ ــــــ

مجمع سے ایک آواز: مولانا، کیا دلی کالج میں عربی فارسی اور علوم دینی کی تعلیم نہیں ہوتی جو آپ اس قدر خواہی نخواہی خفا ہو رہے ہیں۔

بزرگ: اجی حضت۔ داستان کا سارا مزا کرکرا کر دیا۔ لاحول ولا قوۃ۔

تیسری آواز: کوئی دقیانوسی بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔

چوتھی آواز: انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ فریزر صاحب نے نواب شمس الدین لوہارو والے کو بیٹے کی طرح تربیت کیا ہے۔ انہی کی وجہ سے لوہارو کی جاگیر کی ولی عہدی انھیں ملی ہے۔

داستان گو: تو صاحبو! بہزاد خان نے ملکہ کو ــــــ

مولانا: میں پھر کہتا ہوں جو فرنگیوں پر بھروسہ کرے گا نقصان پائے گا، اس میں خسران عظیم ہے خسرانِ عظیم۔

بزرگ: اماں، لاحول ولاقوۃ۔ دو گھڑی جی بہلانے دو گال ہنسنے بولنے کو آجاتے ہیں یہاں بھی اس شخص نے خسرانِ عظیم وغیرہ کا تذکرہ لا چھیڑا۔ اب وہ اگلی صحبتیں لٹ گئیں۔ سلونوں میں وہ مزا نہ میلے ٹھیلوں، عرس قوالیوں میں وہ کیفیت۔ اک ذری داستان سے جی بہلانے آئے تھے تو یہاں بھی خسرانِ عظیم۔ لاحول ولاقوۃ۔ اجی حضت آپ سے خاموش نہیں رہا جاتا۔

(بنسی دھرآ کر مجمع کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں)

بنسی: صاحبو——

بزرگ: (بات بات کاٹ کر) اب آپ بھی ماشاللہ کوئی وعظ فرمائیں گے۔

بنسی: قبلہ مجھے نواب اسداللہ خان بیگ کے مکان کا پتا پوچھنا ہے۔

مولانا: تازہ وارد معلوم ہوتے ہو۔

بنسی: جی ہاں اکبرآباد سے حاضر ہوا ہوں۔

بزرگ: اماں یہ اسداللہ خان بیگ کون ہوئے۔

داستان گو: جناب والا، یہ نواب مرزا الٰہی بخش معروف کے داماد اسداللہ کو پوچھ رہے ہیں۔ جاؤ برخوردار آگے گلی میں سیدھے ہاتھ جا کر الٹے ہاتھ مڑ جانا وہیں سب پتہ نشان معلوم ہو جائے گا۔

مولانا: تو جناب یہی راستہ پکڑ لیں سیدھا ڈیوڑھی پر پہنچے گا۔

بزرگ: اجی حضت کیا تذبذب میں پڑے ہیں ٹھیک راہ بتائی جا رہی ہے۔ وہی اکبرآباد سے آئے ہیں۔ اب تو ماشاءاللہ شعر بھی کہنے لگے۔ بیدلؔ مرحوم کو گرد کر دیا۔ البتہ اکثر معنی ڈالنے بھول جاتے ہیں (کچھ لوگ ہنستے ہیں) دلی کے شرفا کا دم غنیمت ہے کہ کبھی کبھار دو چار شعر ان کے بھی پلّے پڑ جاتے ہیں۔

(دلی کا لفظ آتے ہی ایک ہاتھ میں مشعل لیے یوسف مرزا سیاہ کفنی گلے میں ڈالے نمودار

ہوتے ہیں آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہے۔)

یوسف مرزا: (پاگل ہو چکے ہیں اور پاگلوں کی طرح چیخ کر کہتے ہیں) دلی مرگئی! دلی مرگئی! اب صرف میرا بھائی اسداللہ دلی ہے۔ تم سب باطل ہو، زمانہ سب کو مٹا دے گا، سنتی ہو کاغذی تصویرو! دلی مرچکی۔

(چیختے چیختے مجمع کی طرف بڑھتے ہیں اور مشعل کو آگے بڑھا کر گھماتے ہیں، مجمع چھٹ جاتا ہے صرف دو چار آدمی ادھر ادھر کھڑے رہ جاتے ہیں۔ البتہ ناظر بنسی دھر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتے)

یوسف: (مشعل ایک طرف پھینک کر بنسی دھر کو کندھوں سے پکڑ لیتے ہیں) تم کون ہو۔ کاغذی تصویروں میں ایک انسان! جیتا جاگتا انسان!

بنسی دھر: میرا نام ہے بنسی دھر۔

یوسف: تمھاری بنسی کہاں ہے۔ برادرم یہ دلی ہے

ع: دلی جو اک شہر ہے عالم میں انتخاب

یہاں دن رات پتلیوں کا تماشا ہوتا ہے۔ سب ناچتے ہیں۔ لال قلعہ بھی ناچتا ہے، اس کے اندر بیٹھا ہوا عالم پناہ بھی ناچتا ہے، فرنگی فرنگن بھی ناچتے ہیں۔ کون نچاتا ہے۔ (انگلی ہونٹوں پر رکھ کر) خاموش۔ یہ مت پوچھو۔ آؤ اب ہم تم بھی ناچیں۔

بنسی: کون ہو تم؟

یوسف: میں ہوں دلی۔ میں ہوں ہندوستان! میں ہوں تاج محل! (ہنسنے لگتے ہیں) کبھی وہ مجھے یوسف مرزا کہتے تھے۔

بنسی: یوسف مرزا (گلے سے لپٹا لیتے ہیں)

یوسف: (خود بھی رونے لگتے ہیں) اکبر آباد سے جو یہاں آیا مٹ گیا بابا۔ اکبر کا خاندان لٹا۔ خداوندِ سخن میر لٹا، اب یہ مجھے میرے بھائی اسداللہ خان کو لوٹ رہے ہیں، مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ (دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں دو چوبدار آتے ہیں اور انھیں دیکھ کر ان کے پاس آ کھڑے ہوتے ہیں)

پہلا چوبدار: چھوٹے مرزا گھر چلیے۔

دوسرا چوبدار: ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔

یوسف: چلو!

بنسی: مجھے پہچانا؟

پہلا: پہچانا کیوں نہیں ناظر صاحب۔ خانہ زاد کبھی ولی نعمت کو نہیں بھولتے۔ آپ اکبر آباد سے کب آئے۔ چلیے گھر چلیے۔

بنسی: اسد اللہ کہاں ہیں؟

چوبدار: لمبی کہانی ہے۔ سب بتاؤں گا۔ دو پہر رات گئی۔ انگریزی عمل داری ہے۔ دلی کی حالت خراب ہے۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔

بنسی: میں اس طرح گھر نہیں جانے کا۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیا طلسم ہے اسد اللہ کو کیا ہوا ہے۔

چوبدار: (دوسرے سے) اچھا تو تم چھوٹے مرزا کو لے کر گھر چلو میں ابھی آتا ہوں، گھر پر سب انتظام کر رکھنا۔ کہہ دینا آکبر آباد سے ناظر صاحب آئے ہیں۔

(دوسرا چوبدار یوسف مرزا کے ہمراہ چلا جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں داستان گو کی جگہ چوبدار لے لیتا ہے اور سننے والے کی جگہ بنسی دھر اور اس طرح ایک نئی داستان شروع ہوتی ہے)

چوبدار: کیا عرض کروں بندہ پرور۔ دلی اس خاندان کو راس نہ آئی۔ پورا خاندان تباہی میں آگیا۔ انسان کیا سوچتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ اسد میاں نواب الٰہی بخش کے داماد ہو کر ان کے بڑے بھائی نواب احمد بخش والی لوہارو کی فوج میں کمیدانی اور رسالداری پائیں گے۔ شادی کے بعد آس اولاد کا سکھ ملے گا تو باپ اور چچا کا غم جی سے ڈھل جائے گا۔

بنسی: مگر ہوا کیا، جلد بیان کرو۔ مرزا نوشہ خیریت سے تو ہیں؟

چوبدار: خیریت سے ہیں۔ پہلے سرکار فرنگی سے ایک حکم آیا دس ہزار سالانہ مرحوم رسالدار نصر اللہ بیگ خان کے عزیزوں کو ملا کرے پھر کوئی ایک ماہ بعد دوسرا حکم ہوا کہ فقط پانچ ہزار ملے اور اس میں بھی کئی شامل ہوں۔ پھر ایک نہیں دو نہیں سات اولادیں ہوئیں۔ مگر کوئی ڈیڑھ

سال سے زیادہ نہ جیا، بہو بیگم کیا کیا تڑپی ہیں۔ یوسف مرزا چھوٹے بھائی کی شادی ہوئی مگر سکھ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پے در پے مصیبت جھیلتے جھیلتے پاگل ہو گئے، آخر بڑے بھائی نے لوہارو والوں کے ہاں فوج میں نوکری کی ٹھانی، بھرت پور والی مہم میں شریک ہوئے مگر تم جانو ناز و نعمت میں پلے ہوئے فوج کی سختیاں کیا اٹھتیں، آخر لوٹ آئے۔

بنسی: آخر اب کیا کرتے ہیں؟

چوبدار: نہ پوچھو بھیا، شعر و شاعری ہے اور وہ ہیں، مشاعرے پڑھتے ہیں، غزلیں کہتے ہیں، گلی گلی، کوچے کوچے شاعر مشہور ہیں۔ اور بس اب کیا کہوں۔

بنسی: کہو۔

چوبدار: نہیں کہا جاتا بھیا۔ آخر اس سرکار کا پرانا نمک خوار ہوں۔

بنسی: تمہیں میری قسم۔ مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔

چوبدار: دکھ سہا نہیں گیا میرزا سے۔ بس اب شراب منہ کو لگی ہے اور سنتا ہوں ایک ڈومنی بچی پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ اب دیکھو دو پہر رات گئی ہے ابھی گھر واپس نہیں پہنچے ہیں۔ بہو بیگم بچاری آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ پتہ نہیں کہاں ہوں گے۔ کس حال میں ہوں گے۔

(اسی اثنا مرزا غالب کا ہوادار دو کہار لیے آتے ہیں، ہاتھوں میں مشعلیں غالب چوبدار کی آواز پہچانتے ہیں۔ نشے میں گنگنا رہے ہیں۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو

اتنے میں چوبدار کی آواز سن کر چونکتے ہیں)

غالب: ہوادار یہیں رکھ دو (ہوادار سے لڑکھڑاتے ہوئے اترتے ہیں) یعنی کہ آپ کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہیں۔

چوبدار: ناظر بنسی دھر بھیا اکبر آباد سے آئے ہیں۔ ان کی پیشوائی کے لیے یہاں تک آیا تھا۔

غالب: بنسی دھر۔ تم ہو (چوبدار سے) تو پھر تم جاؤ۔ بنسی دھر میرا ہمدم و دمساز ہے۔ آؤ بنسی دھر۔ بیا برادر، آ و رے بھائی، بنشیں مادر، بیٹھ ری مائی (ہنستے ہیں) بنسی دھر دلی لٹ گئی۔ اب یہاں مرزا نوشہ کا کلام سمجھنے والا کوئی نہیں۔ کبھی یہاں عرفیؔ، نظیریؔ اور بیدلؔ کے قدر دان

موجود تھے آج بڑے بڑے سخن سنج اور سخن فہم طرہ ودستار والے کہتے ہیں کہ مرزا نوشہ مہمل بکتا ہے کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں کہ میری دھڑکنوں کو سمجھنے میرے لفظوں کی تہہ تک پہنچے میرے خون جگر کی تراوش پائے۔ قلعہ معلیٰ کے مشاعرے میں جاتا ہوں لوگ منہ تکتے ہیں۔ ریختہ کو فکر کی بلندی اور اسلوب کی تہہ داری سے آسمان کا تارا بنا کر دکھاتا ہوں اور داد پاتا ہوں تو کس سے جہاں پناہ سے نہیں، ذوقؔ اور مومنؔ سے نہیں، نغمے کی اس مورت سے جو میرے ریختوں کو گنگناتی ہے اور اپنی انمولی رسیلی آواز سے جاوداں بنا دیتی ہے، سن یار ریختہ سن۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

(پوری غزل سناتے ہیں)

(بنسی دھر خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں)

غالب: چلو گھر چلیں، تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھو گے مری جان، انھیں سمجھنے کے لیے پتھر کا کلیجہ درکار ہے۔ آؤ ہوادار میں بیٹھ جاؤ۔

(کہار ہوادار اٹھا کر چلے جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے اسٹیج اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے)

پہلا ایکٹ، تیسرا سین

(حویلی، اسٹیج پر مرمر کی جالی کا پارٹیشن، اس طرح بنا ہوا ہے کہ دونوں طرف کا منظر صاف دکھائی دے رہا ہے۔ جالی مغل طرز میں کٹی ہوئی ہے۔ جالی کے ایک طرف ماں سروتے سے چھالی کھاٹ رہی ہیں اور کسی سے باتیں کرتی جاتی ہیں دوسری طرف کافی دور پر ستار ہاتھ میں لیے نوجوان لڑکی مرزا غالب کی کسی غزل کی دھن بنانے میں مصروف ہے)

نو وارد: میں کہتا ہوں اب انتہا ہو چکی، بات گھر سے نکلی کوٹھو چڑھی، شہر میں بدنامی ہو رہی ہے۔ بچے بچے کی زبان پر تمہاری بیٹی اور مرزا نوشہ کے قصے ہیں۔ توبہ توبہ، اب میری بات مانو تو اس کے ہاتھ پیلے کردو۔

ماں: کیا کروں بیرن۔ کچھ بس نہیں چلتا۔ تم جانو پھوٹی آنکھ کا دیدہ ایک ہی تو بچی ہے۔ اس کا دل بھی نہیں توڑا جاتا۔ اتنی بڑی ہوگئی میں نے کبھی جو اس کا جی میلا کیا ہو، اچھے سے اچھا کھلایا، اچھے سے اچھا پہنایا۔ کبھی اس کا کہنا نہ ٹالا، اس بڑھاپے میں چونڈے میں کالکھ لگنی تھی۔

نو وارد: ہر گھر میں ایسے قصے ہو جاتے ہیں مگر آخر بزرگ کس دن کے لیے ہوتے ہیں۔ بچی ناسمجھ ہے، جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ذرا جبر کرنا پڑے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گی۔

ماں: اور جو میری چاند سی بیٹی کو کچھ ہو گیا؟

نو وارد: بہن کی باتیں! ارے شادی بیاہ کے بعد ارمانوں میں لگ جائے گی یاد بھی نہیں رہے گا کہ تھے کوئی مرزا نوشہ بھی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں تماشے دیکھ لیے اور پھر ذرا دل میں سوچو ڈومنی ذات ہمیشہ سے عزت دار غیرت والی مشہور ہے۔ ہم کوئی نیچ ذات ہیں کہ جس نے چاہا ہاتھ ڈال لیا۔ یہ قصہ ہو گیا تو ہمیشہ کے لیے ڈومنی ذات بھی کسبی باجنے لگے گی۔

ماں: تم میری بٹیا کو نہیں جانتے بیرن۔ وہ بڑی ہٹیلی ہے وہ چاند کے لیے بھی مچلے گی تو اسے لے کر چھوڑے گی یا اپنا جی کھو دے گی۔

نو وارد: بالک ہٹ ہے مگر ہٹ کے آگے ہار گئیں تو سر پکڑ کر روؤ گی بچی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ذرا سوچو مرزا نوشہ اچھے گھرانے کا نواب زادہ جیب میں کوڑی نہیں خرچ لمبا، بیوی گھر بار شاعری سے تو کوئی پیٹ پلتا نہیں اول تو وہ گھر ڈالے گا کیسے اور گھر ڈال بھی لے تو یہ نبھنے والی بات نہیں۔ آخر اس کی بیوی بھی نواب الٰہی بخش کی بیٹی نواب لوہارو کی بھتیجی ہے ناک چنے چبوا دے گی۔

ماں: میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نو وارد: میرا کہا مانو تو اس جوکھم سے نکلو گی۔ (جیب سے سونے کی مہریں نکال کر رکھتا ہے) دو دو توڑے سونے کے رکھ لو۔ بڑی قسمت والی ہے تمہاری بیٹی، کوتوال کی نظروں میں ایسی جچی ہے کہ نہ پوچھو، بولو منظور ہے، باقی میں خود نبٹ لوں گا۔ تم ایک ذرا ہامی بھر لو اور پھر دیکھو چٹکی بجاتے میں سب تصفیہ ہو جائے گا۔ شام ہوتے ہوتے منگنی کا جوڑا آ جائے گا۔

ماں: میں ایسی جلدی کیسے ہامی بھر لوں (لڑکی سب کچھ سن لیتی ہے، غصے میں بپھری ہوئی جالی تک آتی ہے)

لڑکی: اماں۔ ان سے کہیے یہاں سے چلے جائیں۔

ماں: بیٹی۔ تیرے ماموں ہیں، ان کی اس طرح توہین نہیں کرتے۔

لڑکی: میں کوئی کارچوب کی گڑیا نہیں ہوں کہ دو توڑے سونے میں بک جاؤں گی۔ یہ کون میرا مول لگانے والے، مجھے نیلام پر چڑھانے والے۔

نو وارد: بیٹی۔ میری بات سنو۔ تمہاری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔

لڑکی: خبردار جو مجھے بیٹی کہا۔ میں آپ کے کوتوال صاحب کو تلوؤں سے مسل کر پھینک دوں، ان سے کہہ دیجئے گا۔

نو وارد: میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بڑھاپے نے کبھی جوانی سے قول نہیں ہارا۔ تم غصے میں ہو جوش ٹھنڈا ہو جائے۔ ذرا معاملے پر غور کر لو۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔ سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔

لڑکی: مجھے نہیں سوچنا۔ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔

نو وارد: (ہنستا ہے) بچی نادان ہو۔ میں ان باتوں کا برا نہیں مانتا۔ سوچنے سے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ (چلا جاتا ہے)

لڑکی: (جالی کے دوسری طرف آ کر) یہ آپ کیا کھچڑی پکایا کرتی ہیں اماں۔ ہر وقت شادی، ہر وقت منگنی بیاہ۔ آپ کے نزدیک دنیا میں اس کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں، آپ سمجھتی کیوں نہیں، میں کب کی کسی دوسرے کی ہو چکی، میرا تن من اسی نشے میں ڈوبا ہے آپ مجھے جان بوجھ کر کیوں تڑپاتی ہیں۔ (رونے لگتی ہے) جائیے میں آپ سے نہیں بولوں گی۔

ماں: (گلے لگا کر) بوڑھی ہو گئی ہوں، سٹھیانے پن میں بھول جاتی ہوں تو کچھ خیال مت کیا کر۔

لڑکی: بہت بڑی بھول ہے اماں، تم نے سوچا یہ بات انھیں معلوم ہو گی تو اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ شاعر کا دل ہے اماں۔ صدیوں میں ایسا انمول دل کسی کو ملتا ہے۔ دولت نہیں، حکومت نہیں، مشاعرے کی واہ واہ تک نہیں، شیشے سے زیادہ نازک اور ہیرے سے زیادہ انمول دل کو تم چاہتی ہو میں بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔ یہ بہت بڑا پاپ ہے ماں۔

(ماں ندامت سے گردن جھکا لیتی ہے اور آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں پر سے ڈھلکنے لگتے ہیں۔ لڑکی واپس جاتی ہے اور ستار ملانے لگتی ہے پھر آپ ہی آپ کھوئے ہوئے انداز میں گانے لگتی ہے)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(آخر مصرعہ سے کچھ پہلے ناظر بنسی دھر آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں اور مبہوت ہو کر غزل سنتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر اشعار کی اداسی اور سنگیت کی فضا قائم رہتی ہے، کھنکنار

کر اندر چلے آتے ہیں)

بنسی دھر: اس طرح بے اطلاع اندر چلا آیا معاف کیجئے گا، مجھے دو باتیں کرنی ہیں۔ میرا نام ہے بنسی دھر۔ اکبر آباد سے آیا ہوں، مرزا نوشہ کا بچپن کا دوست ہوں۔

لڑکی: (بے قرار ہو کر جالی کی دوسری طرف آجاتی ہے ماں اٹھ کر چلی جاتی ہے)
فرمائیے۔ کیا مرزا صاحب نے کوئی پیغام بھیجا ہے؟ کیا کہا ہے انھوں نے؟ کیسے ہیں وہ، آپ کیوں نہ چلے آئے۔

بنسی: آتے ہوں گے۔

لڑکی: تشریف رکھیے۔

بنسی: بہن۔ مرزا کے بچپن کا دوست ہوں۔ ساتھ شطرنج کھیلنے میں راتیں سیاہ کی ہیں۔ باہم قصے کہانیاں کہی سنی ہیں۔ پتنگیں لڑائی اور بازیاں ہاری اور جیتی ہیں، اس خاندان کو اپنی نظروں کے سامنے پامال ہوتے دیکھا ہے، اکبر آباد میں آج بھی عبداللہ بیگ خاں اور مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خان اور مرزا کے نانا غلام حسین خان کا نام باجتا ہے۔ کوئی رسالدار، کوئی کمیدان۔ میں نے اس خاندان کا وقار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کی آن بان کا سورج میرے سامنے ڈوبا ہے۔

لڑکی: میں کچھ نہیں سمجھی۔

بنسی: آپ کو ایک نظر دیکھا تو مرزا کے حسن نظر کی داد دی۔ بخدا خالق نے اپنے ہاتھ سے نور کے اس پتلے میں جان ڈال دی ہے اور جادو بھری آواز بخشی ہے پھر مرزا نوشہ نے جان نچھاور کر دی تو کیا تعجب۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کئی جانیں نچھاور کر ڈالتا۔ مجھے یہ بھی بھروسہ ہے کہ اس نورانی پیکر میں ایسا ہی نازک، لطیف اور ہمدرد دل ہوگا جو دوسروں کے درد سے تڑپ اٹھتا ہوگا۔

لڑکی: میں کچھ نہیں سمجھی، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

بنسی: میں نہیں مانتا۔ دلی شہر میں جو مرزا نوشہ کے شعر سمجھنے والی ہستی ہو وہ اتنی سیدھی سی بات نہیں سمجھے گی۔ میں نہ مانوں گا۔

لڑکی: خدارا پہیلیاں نہ بوجھئے۔

بنسی: لے دے کے اس گھرانے کے پاس تھوڑی سی آن بان بچی ہے۔آپ چاہیں تو یہ آن بان قائم رہ جائے۔

لڑکی: میں چاہوں، میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے بھائی صاحب۔دنیا میری مرضی پر چلتی تو مرزا کا نام آفتاب و ماہتاب کی طرح رات دن عالم پر چمکتا۔انھیں اپنے کلام کی داد ملتی ٹوٹے ہوئے دل کی صداؤں پر لوگ سر دھنتے۔میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں۔

بنسی: میں آپ ہی سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔آپ اس گھرانے کی آبرو بچا سکتی ہیں۔آپ نے مرزا نوشہ کا دل دیکھا مگر اس کی خوشی، اس خاندان کی آبرو مندی، اس کے گھر بار کی ذمہ داریوں کا خیال نہیں کیا۔مرزا نوشہ نے اپنا سب کچھ آپ پر وار دیا مگر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ کوئی اور عورت آپ ہی کی طرح نازک، آپ ہی کی طرح دردمند عورت اپنا سب کچھ مرزا پر وار چکی ہے اور اسے وہ پیار بھی نہیں ملا جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گیا۔

لڑکی: میں بھی انسان ہوں میرے سینے میں بھی دل ہے پتھر نہیں ہے، بھائی صاحب مجھے بھی جینے کا حق ہے۔

بنسی: میں نے سنا تھا محبت قربانی دیتی ہے قربانی لیتی نہیں۔

لڑکی: (غصے میں) آپ نے غلط سنا تھا۔بالکل غلط سنا تھا۔عورت بھی انسان ہوتی ہے ہم گانے والیاں بھی انسان کا دل رکھتی ہیں۔

بنسی: آپ ٹھیک فرماتی ہیں۔مگر بڑی بیگم بھی عورت ہیں اور ان کا دل بھی انسان کا دل ہے۔

لڑکی: میں کچھ نہیں جانتی۔میں نے صرف اتنا سوچا کہ درد سے چور شاعر کے دل کو اپنے پیار سے بھر دوں، پھر دل سوچا سمجھا کہاں مانتا ہے اس کی تو اپنی ڈگر ہے اپنی راہ ہے پھر میں اسے سمجھانے والی کون۔یہ سب مقدر کا پھیر ہے بھلا کبھی خواب میں بھی سوچا تھا کہ جس شاعر کے کلام کو اس طرح جی جان سے گاتی رہی ہوں کبھی اسے دیکھ بھی پاؤں گی، کبھی اس سے بات بھی کر پاؤں گی، ہائے کتنے اچنبھے کی بات ہے۔

بنسی: ذرا سوچیے ایک گھر تباہ ہو جائے گا آپ پسند کریں گی کہ یہ تباہی آپ کے نام لکھی جائے۔

ایک نامور گھرانا تاراج ہو جائے اور اس تباہی کی لپٹوں میں ایک عورت کا دل، اس کا سہاگ ہی نہیں اجڑے گا، ایک ہونہار شاعر کا مستقبل بھی جل جائے گا۔

لڑکی: یہ سب مجھ سے کیوں کہتے ہیں آپ۔ جائیے اپنے دوست کو سمجھائیے۔

بنسی: وہ نہیں سمجھ سکے گا۔ اسی لیے آپ کو زحمت دینے حاضر ہوا ہوں۔ ذرا سوچیے پورے خاندان کا دارومدار مرزا نوشہ پر ہے۔ مرزا جوانی دیوانی کی نذر ہو گئے تو یہ باعزت خاندان بھیک مانگے گا۔ سرکار انگریزی میں پینشن کے کاغذات پیش ہیں۔ وہاں اس قضیے کی سن گن پہنچی تو کیا سوچیں گے۔ سرکار بھی یہی سوچے گی کہ نصر اللہ بیگ کی پینشن اللّے تللّوں میں اڑائی جاتی ہے۔ اب اس میں اضافہ بے محل ہے جسے آپ حافظ و خیام کے مرتبے پر دیکھنا چاہتی ہیں وہ ایک انسان بھی تو ہے ایک مفلوک الحال امیر زادہ بھی تو ہے۔ میں آپ سے اس کے وقار، واس کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔

لڑکی: میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں مجھے تنہا چھوڑ دیجیے۔ خدا کے لیے مجھے تنہا رچھوڑ دیجیے۔

(آنسو پونچھتی ہوئی دیوانہ وار جالی کے دوسری طرف دوڑتی چلی جاتی ہے۔ بنسی دھر بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور بھاری قدموں سے چلے جاتے ہیں)

(لڑکی ستار لے کر بیٹھ جاتی ہے اور پھر وہی تار چھیڑنے لگتی ہے۔ پس منظر سے وہی گانا پھر ابھرتا ہے۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو، ماں آتی ہے اور تھوڑی دیر تک ہمدردی اور دل سوزی سے لڑکی کو دیکھتی رہتی ہے)

ماں: بیٹی اب ستار رکھ دو۔ چلو کھانا کھالیں۔ دیر ہو رہی ہے۔

لڑکی: (ایک دم چونک کر) اماں۔

ماں: ہاں بیٹی! ڈر گئیں؟

لڑکی: اماں! میں نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ماں: بیٹی۔

لڑکی: ماموں ٹھیک کہتے تھے۔ انھیں بلاؤ ان سے کہو منگنی کا جوڑا لائیں۔ میں اس جوڑے میں کیسی لگوں گی۔ اماں تم نے میری شادی کے جوڑے تو سیئے ہیں، میری بات مانو گی۔

ماں: کہو بیٹی۔

لڑکی: مجھے دلہن بنادو۔ مجھے شادی کا جوڑا پہناؤ۔ میرے ہاتھ چوڑیوں سے بھر دو۔ میری مانگ میں افشاں چن دو۔ آج سے میں نئی زندگی شروع کروں گی۔ چلو اماں چلو۔ (ماں کو گھسیٹی ہوئی لے جاتی ہے)

ماں: پاگل ہوئی ہے لڑکی، ذرا دم لے۔

لڑکی: میری اچھی اماں۔ اب دیر نہ کر۔ میری اچھی اماں۔ (دونوں چلی جاتی ہیں)

(آہستہ قدموں سے غالب داخل ہوتے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھے رہتے ہیں)

غالب: ارے بھئی سب کہاں چلے گئے ہیں۔ (کاغذ قلم اٹھاتے ہیں اور کچھ لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے شعر لکھتے جاتے ہیں۔ اتنے میں ماں کے چلانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ماں: ارے دوڑو! لوگو! میں لٹ گئی۔ ارے لوگو! میری بچی! ارے کوئی آؤ۔ دیکھو میری چاندسی بٹیا کو کیا ہوا۔

(غالب دیوانہ وار اندر بھاگتے ہیں اور اندر سے گود میں بھر کر لڑکی کو لاتے ہیں جو عالم سکرات میں ہے اور باہر آتے آتے مرزا کی گود میں دم توڑ دیتی ہے۔ دلہن کا لباس پہنے ہوئے ہے اور پیچھے پیچھے ماں روتی پیٹتی پچھاڑیں کھاتی ماتم کرتی چلی آتی ہے)

ماں: ارے لوگو میں لٹ گئی۔ ارے لوگو میں لٹ گئی! میں کیا جانتی تھی کہ میر بچی اس لیے دلہن بن رہی ہے۔ میں رنڈیا اس کی باتوں میں آ گئی۔ ہائے میں کیا روں، کہاں جاؤں۔ ہیرے کی انگوٹھی میں زہر چھپا رکھا تھا، زہر کھالیا میرے بنو نے ہائے تیرے وارے جاؤں میری لاڈلی۔ تیرے بدلے مجھے کیوں نہ موت آئی۔

(غالب سکتے کے عالم میں ہیں اس کی پٹی پکڑ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ بھیڑ بڑھتی جاتی ہے اور لوگوں کے مجمع میں آہستہ آہستہ وہ دونوں کھو جاتے ہیں۔ صرف ماں کے بین کی آواز جو بار بار انہی جملوں کو دہراتی ہے، سنائی دیتی ہے، وہ بھی تھوڑی دیر میں مدھم ہو جاتی ہے اور پس منظر سے غزل کے یہ اشعار ابھرنے لگتے ہیں۔ جن کا اداس نغمہ اسٹیج پر

چھا جاتا ہے)

گل فشانی ہائے ناز جلوہ کو کیا ہوگیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

دوسرا ایکٹ، پہلا سین

دونوں چوبدار دوبارہ آتے ہیں اور اس بار غالب کے دیوان خانے کا پردہ پکڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ غالب دیوان خانے میں نیم دراز ہیں، کچھ نیم مدہوشی سی ہے جیسے غم واندوہ سے انسان بے حال ہو گیا ہو اور احساس زائل ہو چکا ہو۔

پہلا چوبدار: دلی۔

دوسرا: بیس سال بعد۔

(پردہ اٹھتا ہے تو اچانک یوسف مرزا داخل ہوتے ہیں اور غالب کے سرہانے جا پہنچتے ہیں۔ پھر آڈی ٹوریم کی طرف دیکھ کر وحشت ناک طور پر ہنستے ہیں)

یوسف: جہاں آباد کا شاعر اعظم، نظیری، عرفی، ظہوری، خاقانی کا مقابل اسد اللہ خان غالب سرکاری بولی ۶۲ روپے، سرکاری بولی ۶۲، ہے کوئی لینے والا، ۶۲ ایک ۶۲ دو۔

غالب: (سنبھل کر اٹھتے ہیں۔ یوسف مرزا! تم کب آئے، آؤ بیٹھو۔)

یوسف: بہت تکلیف ہے کیا؟ جانتا ہوں، سب جانتا ہوں، جو جانتا ہے وہ بولتا نہیں جو بولتا ہے وہ جانتا نہیں۔

غالب: تکلیف! کیسی تکلیف۔ (پس منظر سے کسی فقیر کی دردمند آواز غزل چھیڑتی ہے)

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

چوبدار: (ڈھونڈتا ہوا آتا ہے) کیا چھوٹے مرزا ادھر آئے ہیں؟ (اچانک چوبدار کی نظر یوسف مرزا پر پڑتی ہے۔ یوسف مرزا اس کے ساتھ ہولیتے ہیں۔ پس منظر سے غزل ابھرتی ہے)

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

(غزل کے کئی شعر پس منظر سے سنائی دیتے ہیں)

غالب: (پہلے مصرعے کے بعد چوبدار سے کہتے ہیں) میاں ذرا دیکھنا۔ یہ کون ہے جو غزل گاتا ہے اسے ایک ذرا بلالو۔

چوبدار: نابینا فقیر ہے، اکثر ادھر سے گزرتا ہے۔

غالب: جاؤ، بلالاؤ۔

(فقیر آتا ہے جھک کر سلام کرتا ہے)

فقیر: آنکھوں والوں کو سلام، حضور سرکار کو سلام۔

غالب: بابا کیا گا رہے تھے۔

فقیر: کچھ نہیں سرکار، قلندرانہ لے ہے۔

غالب: گاؤ، اک ذرا ہم بھی سنیں۔

(فقیر دو ایک شعر گاتا ہے)

(غالب اس کیفیت میں ڈوب جاتے ہیں پھر صندوقچے سے کچھ نکال کر دینا چاہتے ہیں، صندوقچہ خالی ہے۔)

غالب: ارے کوئی ہے۔ (چوبدار آتا ہے) بابا کو کچھ دے دو۔

چوبدار: بہتر (چوبدار کچھ دیتا ہے فقیر دعا دیتا ہوا رخصت ہوتا ہے)

فقیر: اقبال بلند، دولت زیادہ، (فقیر چلا جاتا ہے)

غالب: (خودکلامی) اقبال بلند، دولت زیادہ! خوب۔! اقبال اتنا بلند کہ بھکاری غزلیں گائیں اور علما فضلا امرا اور بادشاہ قدر افزائی سے باز رہیں۔ رہی دولت تو اس کا یہ حال کہ ساری دنیا کا قرض دار۔ متھرا داس، درباری مل، خوب چند جین سب تمسک مہری لے کے چاٹیں اور

ایک دن قرض خواہوں کا ہاتھ ہے اور یہ گردن، انجام موت ہے یا بھیک مانگنا، کسی دوکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسہ مل گیا۔ اب شعروں میں جی کا دکھڑا رو لینے اور اپنے کو سعدی و حافظ جان لینے سے کیا ہوگا اور ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ مجھے ہوگا۔ (اچانک اس خود کلامی سے چونک پڑتے ہیں سامنے بیگم کھڑی ہیں) ارے بیگم تم دیوان خانے میں!

بیگم: مجھے کچھ بات کرنی تھی۔

غالب: تو بلا بھیجا ہوتا۔

بیگم: اس طرح کب تک کام چلے گا۔ گھر میں خرچ کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں۔

غالب: مجھے معلوم ہے۔

بیگم: پھر اس کا کچھ انتظام؟

غالب: مجبوری۔

بیگم: تو پھر اس امیر الامرائی کو سلام کیجئے۔ نوابی ختم کرائے کا مکان چھوڑیئے۔ کوئی چھوٹی موٹی کوٹھری تلاش کیجئے اور محنت مزدوری ڈھونڈیئے آخر اس طرح کب تک گزر ہوگی۔

غالب: جانتا ہوں سب کچھ جانتا ہوں۔ اسی لیے پنشن کی واگذاری کے لیے اتنی جان کھپائی، کلکتے تک کا سفر کیا۔ ریذیڈنٹ بہادر سے سفارشیں لکھوائیں، کمپنی کو درخواست دی، لندن ملکہ معظمہ کے پاس اپیل کی، کس در کی خاک چھانی، کس کس کو نذر گزرانی مگر نتیجہ کچھ نہیں۔ درباروں سرکاروں میں صدا لگائی۔ قصیدے گزارے مگر کوئی سبیل نہیں۔

بیگم: آخر کام کیسے چلے گا۔ قرضہ اور سود جدا، شاگرد پیشہ، چوکیدار، چوبدار، نوکرانی، یوسف مرزا کی دوا دارو کھانا پینا، مکان کا کرایہ، آخر یہ سب کہاں سے آئے گا۔

غالب: کہاں سے گنجائش نکالوں۔ سنو، صبح کی تبرید موقوف، رات کی شراب و گلاب موقوف، چاشت کا گوشت آدھا۔

بیگم: اس طرح پیٹ کاٹ کر کیا مل جائے گا۔

غالب: جو ملے غنیمت ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

بیگم: خدا جانے میری قسمت کا سکھ چین کہاں چلا گیا ہے۔ اس گھر میں نہ اچھا کھانے کو نہ اچھا پہننے کو نہ اولاد کا سکھ چین ہے۔ نہ دل کو اطمینان۔

غالب: میں جس عالم میں ہوں، وہاں تمام بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ یہ دریا نہیں سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ مجھ سے وہ نہ مانگو جو میرے اختیار سے باہر ہو۔ تمہاری یہ دنیا، یہ کائنات اتنی بھی وسعت نہیں رکھتی کہ ایک ذرہ جی بھر کر بازو پھیلا کر بے تابانہ ناچ لے پھر میں تو انسان ہوں امراؤ بیگم، انسان۔ اور میرے دل میں وہ غم چھپے ہیں کہ پتھر پر پڑیں تو اس کی رگوں سے خون کی ندیاں جاری ہو جائیں۔ جاؤ بس اب جاؤ__ میں نے تو دنیا سے اقبال و دولت، جاہ و حشمت کچھ نہیں چاہا کچھ نہیں مانگا، صرف اتنی مہلت چاہی تھی کہ جی کی بات کہہ سکوں اور وہ بھی میسر نہ ہوئی۔ کون اس محرومی کو سمجھے گا۔ کون اس بے بسی کو جانے گا۔ (بیگم چلی جاتی ہیں)

(نواب میر کاظم اچانک داخل ہوتے ہیں اور دیوان خانے میں داخل ہونے سے قبل ہی بے تکلفانہ انداز میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں)

کاظم: غلام کاظم علی کورنش بجا لاتا ہے مرزا صاحب۔ نصیب دشمناں مزاج تو بخیر ہیں کہ حضور ہنوز نیم دراز ہیں۔

غالب: آؤ کیسے آنا ہوا۔

کاظم: غلام کا آنا کیا حضور کو سلام کرنے کبھی کبھار چلا آتا ہوں اور جائیں بھی کہاں۔ اب تو دلی میں وہ اندھیر گردی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اپنی قسم کھا کے کہتا ہوں مرزا صاحب قدم قدم پر تو جاسوس ہیں۔ فرنگیوں کے جاسوس، پھر وہابیوں نے غدر مچا رکھا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے حکیم مومن خان جیسا رند باصفا جہاد کی باتیں کرنے لگا۔ آپ سے بھی کیا چوری ہے مرزا صاحب قبلہ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ وہابیوں سے فرنگی حکومت تک پریشان ہے۔ خفیہ خفیہ کمپنی بہادر کو پتہ لگا ہے کہ یہ لوگ انگریز کے خلاف بھی جہاد بولنے والے ہیں۔ حکم ہوا ہے کہ ان پر نگاہ رکھی جائے۔

غالب: باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی دم بھی لیا کرو۔

کاظم: آپ تو ناچیز کو شرمندہ فرماتے ہیں مرزا صاحب آپ نے دنیا جہان کی کتابوں کی سیر کی ہے۔ واللہ باللہ کہیے گا کبھی کسی مقام پر والی سلطنت کو پھانسی دی گئی ہے۔ فرماں روا قید ہوئے۔ لڑائی میں مارے گئے مگر کبھی والیان ریاست کو پھانسی پر لٹکتے نہ سنا، خدا لگتی کہیے گا بندۂ درگاہ کی سی نہ کہیے گا۔ نواب شمس اللہ خاں تو آپ کے سالے ہوئے۔ ہائے ہائے کیا جوان مارا گیا۔ آپ سے تعلقات لاکھ خراب تھے۔ مگر آخر اپنا خون تھا آپ کے دل پر کیا سانپ نہ لوٹا ہوگا۔

غالب: (آہ سرد سے) رہے نام اللہ کا۔

کاظم: آپ کے دل کا درد کیا میں نہیں جانتا مگر کیا کہیں حاکم زبردست ہے آپ ولیم فریزر صاحب ریذیڈنٹ کے بھی شناسا اور نواب صاحب کے بہنوئی گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل، مگر صاحب ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جان تو ایک ہی دفعہ جاتی ہے کیا ہمت مردانہ تھی کہ فریزر صاحب کو تو معاف کیجئے گا کتے کی موت مروا دیا نواب نے۔ میں نے سنا ہے مرزا صاحب کہ جب پھانسی کے بعد لاش کو اتار کر عزیزوں کے سپرد کیا جانے لگا تو مردہ جسم خود بخود قبلہ رو ہو گیا اور جسم پر قبا سبز ہوگئی۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ شہادت کا مرتبہ پایا۔ آج بھی لوگ چوری چھپے قطب صاحب میں نواب کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھاتے ہیں۔ دلی اردو اخبار اور صادق الاخبار میں خبر ملاحظہ فرمائی آپ نے؟

غالب: ارے بھئی تم کس جہان کی باتیں کرتے ہو یہاں اپنی عمیٹرے نہیں نبڑٹی۔ مجھے اپنی حالت کی خبر نہیں۔ رموز مملکت سے کیسے آگاہی پاؤں۔

کاظم: قبلہ آپ کو کس چیز کی کمی ہے۔ خدا کے فضل سے انوری اور خاقانی کے مقابل ہیں۔ میرو مرزا کی بات بالا کرنے والے ہیں۔ اب تو خیر سے دلی کالج کھل گیا ہے۔ مفتی صدرالدین آزردہ آپ کے معترف، مولانا صہبائی آپ کے نیاز مند۔ دلی کالج کا تو نصیبہ کھل جائے جو آپ ایسا استاد میسر آجائے۔ مرزا صاحب سچ عرض کرتا ہوں اپنے محلے کا لونڈا ذکاء اللہ دلی کالج جا پہنچا ہے۔ بخدا ایسی باتیں کرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جائے اور پھر وہ الٹے سیدھے کرتب سائنس یا کیا بلا ہے اس کے دکھاتا ہے کہ توبہ۔ کہتا تھا زمین گھومتی

ہے اور آسمان ساکن ہے یعنی گویا سارا علم نجوم ہی باطل ہو گیا۔

غالب: تم میرا غم نہ کھاؤ، اپنی کہو کیسی گزر رہی ہے؟

کاظم: کچھ نہ پوچھیے مرزا صاحب قبلہ، پتلا حال ہے ہمارا دھندہ تو آپ جانتے ہیں امیرزادوں کے ساتھ بندھا ہوا اترا ہے کچھ سیر تفریح کچھ عیش ونشاط کا چرچا ہو تو بندۂ درگاہ کے کچھ ہاتھ لگ جاتا ہے ادھر اس کمبخت کوتوال شہر نے وہ ناک میں تیر پہنایا ہے کہ توبہ بھلی، شرفائے دلی کو دو چار پانسے پھینکنا اور دو چار بازی لگانا تک محال ہو گیا ہے پھر اپنی پتی کہاں!

غالب: تمھیں اس کاروبار میں کیا مل جاتا ہے؟

کاظم: ہم بھی پچھ لگو میں ہیں حضور والا مگر جس گھر پھڑ جمے اس کی چاندی ہے۔ آپ کا محلہ ماشاء اللہ کوتوال کی نظر بد سے بچا ہوا ہے اگر یہاں کوئی ٹھکانہ مل جائے تو بگڑی بن جائے۔

(غالب کچھ کہنے نہیں پاتے کہ چوبدار سرکاری لفافہ لے کر آتا ہے مرزا متفکر انداز میں لفافہ کھول کر پڑھتے ہیں۔ اپنے تصورات میں کھو جاتے ہیں)

سرکاری چوبدار: (پس منظر کی آواز) ہرگاہ کہ تمہارے قرض خواہاں........نے تمہارے خلاف قرض کی نادہندگی اور عدم ادائے گی کی بنا پر اصل اور سود واجب الادا رقم کی ڈگری حاصل کر لی ہے لہذا تم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تم مسمی اسد اللہ خاں بیگ ولد عبد اللہ بیگ خان قوم ترک ساکن احاطہ کالے خان رقم مذکورہ کی ادائے گی کا فوراً انتظام کرو، ورنہ تمھارے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاوے گی۔

دوسرے چوبدار کی آواز: ملزم اسد اللہ خان بیگ ولد عبد اللہ خان بیگ حاضر ہے۔

(یہ آواز دور تک گونجتی چلی جاتی ہے۔ تصور ختم ہوا)

غالب: انتظام ہو جائے گا۔ بازی میرے گھر ہوگی۔ پھڑ میرے گھر جمے گا۔

کاظم: مرزا صاحب۔

غالب: ہاں! اگر مشیت یہی چاہتی ہے تو یہی سہی، میں نے زندگی سے صرف فرصت دو نفس کا سودا کیا تھا۔ اب اس فرصت دو نفس کی خاطر اپنی ننگ وناموس کو بھی داؤں پر لگانا پڑے تو بھی مجھے منظور ہے۔ مجھے منظور ہے۔

کاظم: میرزا صاحب۔ بس آگے سب کام میرا ہے آپ کے سارے قرضے ادا ہو گئے۔ بس اب چاندی ہے چاندی۔ آج شام تک پانسہ پلٹ جائے گا۔

(رخصت ہونے لگتا ہے اتنے میں چوبدار آتا ہے۔ حالی ہمراہ ہیں)

چوبدار: کھانا تیار ہے۔

غالب: ہاں بھائی لگوادو (مولانا حالی آتے ہیں) آیئے مولانا الطاف حسین۔ بہت دنوں بعد گذر ہوا۔

حالی: نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ادھر نہیں آئے۔ مجھ سے فرمایا تھا کہ پہلے پہنچ جانا۔

غالب: آتے ہوں گے اور کوئی ہمراہ رہا ہوگا۔

حالی: جی ہاں صدر الصدور مولانا صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق۔

غالب: تو یوں کہو دلی کی دلی چلی آتی ہے۔

(چوبدار اتنے میں کھانا لگا دیتا ہے اور مرزا ہاتھ دھو کر دستر خوان پر بیٹھتے ہیں۔ دستر خوان پر صرف شامی کباب ہیں۔ مولانا حالی مکھیاں جھلتے جاتے ہیں۔ مرزا کھانا کھاتے جاتے ہیں)

غالب: اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید...... مولانا الطاف حسین صاحب! آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں۔ ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔

حالی: نہیں قبلہ، میں تو خدمت کی سعادت ——

غالب: میاں، لو ایک قصہ سنو، نواب عبدالاحد خان کے دستر خوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے مگر خاص ان کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی، ایک روز ان کے لیے مزعفر پکا تھا، وہی ان کے سامنے لگایا گیا تھا، مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا نواب نے اسے کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی، اس کے آنے میں دیر ہوئی، نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے جاتے تھے، وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا ''حضور، اور رکابی کیا کیجئے گا، اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے''۔ نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک

گیے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔

حالی: مگر فقرہ بھی لاجواب تھا۔

غالب: حضرت جی تو آپ کا بھی للچا رہا ہوگا کبابوں پر مگر کیا کروں نذر کرنے سے معذور ہوں۔

حالی: مرزا صاحب قبلہ، میں تو ابھی کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔

غالب: نہیں بھائی، میرے ہاں کے کبابوں کی لذت کچھ اور ہے۔ میرے یہاں کے ہر سالن میں چنے کی دال ملے گی۔ چنے کی لذت کو کوئی نہیں پہنچتا، وہ لطیفہ سنا ہے آپ نے؟

حالی: چنے کے بارے میں۔

غالب: جی ہاں! بھئی دروغ برگردن راوی، سنتے ہیں کہ چنے نے دربارِ خداوندی میں ایک دفعہ فریاد کی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا، ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھے کھا جائیں۔

حالی: (ہنستے ہیں) سبحان اللہ مرزا صاحب، اس لطیفے میں تو آپ کی جودت طبع کے آثار ہیں۔

غالب: میاں چپ رہو۔ کہاں کی جودت اور کہاں کا حسن طبیعت، سب کہنے کی باتیں ہیں۔

حالی: اس وقت آپ کی طبیعت موزوں ہے لطیفے پر لطیفہ یاد آ رہا ہے۔

غالب: ہاں بھئی، رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور —— میں نے ایک اور جگہ لکھا ہے، رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج۔

جب زہر غم رگوں میں سرایت کر جاتا ہے تو لبوں پر مسکراہٹ بن کر پھوٹ پڑتا ہے۔

(شیفتہ، آزردہ اور فضل حق آتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ غالب تعظیم دیتے ہیں)

غالب: آیئے آیئے صاحبو، آج تو بقول شاعر، ایں خانہ تمام آفتاب است، میاں حالی کب سے آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔

شیفتہ: جی ہاں، اپنے تذکرہ شعرا میں الجھا رہا، ایک صاحب نے بعض شعرا کے حالات قلم بند کیے

تھے اسی کی تحقیق وتدوین میں تاخیر ہوئی۔ انھی کے ہاں وہ تشویش ناک خبر معلوم ہوئی۔

غالب: کیا؟

فضل حق: آپ نے نہیں سنی۔

غالب: نہیں بھائی، میں گدائے گوشہ نشیں، مجھے احوال واخبار کی اطلاع کیسے ملے۔

آزردہ: یہی کہ آپ کے قرض خواہوں نے اپنے قرضوں کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔

غالب: جی ہاں، جی ہاں مجھے بھی اطلاع ہوگئی۔

شیفتہ: یہ آپ کے احباب کے لیے بلکہ پورے جہان آباد کے لیے باعث ننگ ہے کہ ہمارے دور کا انوری وخاقانی اس ذلت واہانت کا سزاوار ہے۔

غالب: اور فردوسی کو بھولتے ہیں آپ، نواب صاحب اسے اپنی جگر کاوی کا صلہ موت کے بعد ملا تھا کیا تعجب جو میرا ابھی یہی حشر ہو۔ حسد بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے۔ میں نے تو اپنے کو اپنا غیر تصور کرلیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی نواب صاحب، یہ کیا بے حرمتی ہورہی ہے کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا بے غیرت، کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب۔ بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

شیفتہ: ہم سخت متردد اور شرمندہ ہیں۔

آزردہ: عجب زمانہ آن لگا مرزا صاحب، وہ جو میر تقی مرحوم نے کہا تھا

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

میں صدر الصدور مگر برائے نام ہر کام اور ہر مقام پر فرنگی بااختیار اور ہم سب محض بے اصل وبے بس۔ زمانے کا رنگ کچھ ایسا بگڑا ہے کہ کیا عرض کیا جائے۔

فضل حق: مفتی صاحب بجا فرماتے ہیں، مگر میرزا صاحب تردد نہ فرمائیں، کچھ نہ کچھ انتظام ضرور ہو جائے گا وہ غیب سے اسباب پیدا کرنے والا ہے۔

غالب: جی ہاں، اسباب تو پیدا کرنے والا کرتا ہی ہے۔ آخر دنیا امید پر قائم ہے۔

فضل حق: واللہ کوئی مجبوری سی مجبوری ہے اکبر اور بابر کی نسل آج ایسی مجبور اور بے بس ہو جائے کہ تخت نشین بادشاہ اپنا وارث مقرر نہ کر سکے، جہاں پناہ نے مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کے لیے کیا کیا کچھ نہ کیا مگر فرنگیوں کے سامنے ایک پیش نہ گئی۔ اب سنا ہے لال قلعہ خالی کر کے قطب صاحب منتقل ہو جانے کی شرط لگائی ہے۔

غالب: جی ہاں، بادشاہوں اور فرمارواؤں کی حالت زبوں ہو تو بچارے شاعر کا کون پرسان حال ہوتا ہے۔

شیفتہ: بادشاہوں کی بات بادشاہ جانیں، ہم تو اہل علم کی زبوں حالی سے فکر مند ہیں مرزا صاحب بخدا تکلف نہ کیجئے گا ایسا نہ ہو کہ آپ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔

غالب: نواب صاحب، آپ تردد نہ کریں ابھی ایک صورت انتظام کی نکالی ہے اور نہ ہوا کوئی بندوبست تو آخر کہاں جاؤں گا۔ دلی میں آخر رہنا ہے۔

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا رہیں دلی میں پر کھاویں گے کیا

آزردہ: یہ پھر آپ نے ہمارے انداز کا شعر کہا ہے۔ سبحان اللہ!

غالب: غالب فکر سخن میں خون تھوکتے تھوکتے جان سے جائے گا۔ مولانا غالب کو پھر بھی غالب نہ مانیں گے۔ آزردگی اس پر کہ مولانا کے دور میں کیوں پیدا ہوا عرفیؔ، خاقانیؔ، انوریؔ یا فردوسیؔ کا زمانہ پاتا تو آپ سے استادی کی سند لیتا۔

اے تو کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

فضل حق: مولانا آزردہ بھی ایک دن ایمان لائیں گے مرزا صاحب۔ آپ آزردہ نہ ہوں۔

غالب: بھائی فضل حق صاحب۔ میں مولانا آزردہ سے آزردہ ہو کر کہاں رہوں گا، صدر الصدور

ہیں، بخدا میں مولانا آزردہ سے آزردہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے آزردہ ہو، مجھ پر ان کی چشم نمائی کے بھی بڑے احسانات ہیں۔ البتہ شعر کے بارے میں یہ شیوہ رکھتا ہوں کہ جب تک مصطفےٰ خان شیفتہ صاد نہیں کرتے شعر بیاض میں شامل نہیں کرتا۔

شیفتہ: آپ کی ذرہ نوازی ہے مرزا صاحب ورنہ ہم کیا ہماری سخن فہمی کیا۔ یہ دور، آپ کے شایان شان قدر و منزلت تو کیا کرتا آپ کے جینے اور عافیت کے کا بھی انتظام نہ کر سکا۔

فضل حق: عافیت سے شرفا نے کس دور میں بسر کی ہے نواب صاحب میری تقی زمانے کے اداشناس تھے۔ فرما گئے ہیں۔

چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے یاں

آزردہ: بھئی آج کل کے دور کے لیے یہی سچ ہے۔

فضل حق: میں نے یہاں تک سنا ہے قبلہ کہ جب سے آپ کے یہ نئے کوتوال صاحب کا عمل دخل ہوا ہے شرفا تو شرفا باقی لوگ بھی پریشان ہیں۔

غالب: بھئی یہ لوگ کون ہوئے؟

فضل حق: چور، اچکے، قمار باز، ارباب نشاط اور کون کون سنتا ہوں سب کی ناک میں تیر ڈال رکھا ہے۔

آزردہ: آپ نے تو دلی کی وہ تصویر کھینچ دی مولانا جیسے دلی ان بدقواروں سے ہی آباد ہو۔ خدا کی قسم آج بھی اس شہر کی گود میں وہ لعل و گوہر ہیں کہ علم و فضل ناز کریں۔ افسوس کہ انھوں نے زمانہ اچھا نہ پایا۔

شیفتہ: اس میں جو شک کرے وہ کافر۔ شاعروں میں غالب، مومن، ذوق۔ علماء میں مولانا آزردہ اور مولوی فضل حق۔ مصوروں میں جیون رام اور حسین ناظر۔ نجومیوں میں سکھانند رقم اور مومن خان طبیبوں میں حکیم احسن اللہ خان اور محمود خان۔ غرض کونسا فن ہے جس کا باکمال اس شہر میں موجود نہیں۔ البتہ خوار ہے۔

فضل حق: صرف آن باقی ہے ورنہ دلی — اب وہ دلی کہاں ہے۔

غالب: عجب طلسمات ہے جب غور کرتا ہوں تو جرم اور سزا گناہ اور ثواب نیکی اور بدی سب کے

حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ گناہ کون کرتا ہے کون کراتا ہے۔ کس لیے کرتا ہے کس کے لیے کرتا ہے اور پھر گناہ کیا اس کی اصلیت کیا ان پر غور کرو تو سب کچھ بڑا بے جوڑ سا لگتا ہے۔

(چوبدار داخل ہوتا ہے)

چوبدار: حضور سواریاں آئی ہیں۔

(غالب سن کر خاموش رہتے ہیں)

آزردہ: اچھا مرزا صاحب اب اجازت دیجیے۔

غالب: بسم اللہ۔

(سب لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ غالب انھیں پہنچانے دروازے تک آتے ہیں۔ سب سے رخصت ہوتے ہیں۔ عین اس وقت ایک پالکی کہار لیے ہوئے گزرتے ہیں مرزا واپس لوٹتے ہیں۔ شیفتہ عجیب و غریب نظروں سے پالکی کو دیکھتے ہیں تھوڑی دیر سوچتے رہتے ہیں)

شیفتہ: (فکر مند لہجے میں) مرزا کے ہاں سواریاں؟ آج یہ سواریاں کہاں سے آئیں۔ (سب لوگ چلے جاتے ہیں)

کاظم: آداب بجالاتا ہوں۔

غالب بیٹھو، کیا سب لوگ آ گئے ہیں۔

کاظم: بس نواب خان محمد خان ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ اتنے ہم لوگ بازی جماتے ہیں۔ گستاخی معاف، سنتا ہوں چوسر تو آپ بھی لاجواب کھیلتے ہیں، اجازت ہو تو دو بازی ذرا بد کے ہو جائیں۔

غالب: کیا مضائقہ ہے۔

(یہ دونوں اور نووارد جو پالکیوں میں آئے تھے چوسر کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اتنے میں دو ایک پالکیاں اور آتی ہیں اور ان میں سے دو ایک اور مفلوک الحال نواب زادے برآمد ہوتے ہیں۔ آداب بجالا کر کھیل میں لگ جاتے ہیں)

ایک: یار آج مزا آئے گا کھیل میں۔ ہر بازی نہ جیتی ہو تو نام بدل دینا۔

دوسرا: خدا کی قسم کیا جگہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ کوتوال شہر کے فرشتوں کے خواب وخیال میں نہیں گزر سکتی۔

تیسرا: بس اب بات چیت موقوف، نقدی نکالو اور بازی سنبھالو۔

چوتھا: (ذرا پئے ہوئے ہے) نقدی! یہ لو نقدی! (جیب سے تھیلی نکالتا ہے) ہر جگہ نقدی کی پکار، نقدی نہ ہوگئی نعوذ باللہ خدا ہوگئی۔

دوسرا: اجی حضرت اسی کی دھن پر خدائی ناچتی ہے۔

چوتھا: (جوش میں آکر تھیلی کا منہ کھولتا ہے اور چھنا کے کے ساتھ اچھال دیتا ہے) ناچتی ہے تو ناچے، ہم ایسی خدائی کو ٹھوکر مارتے ہیں۔

کاظم: آپ بازی کی طرف توجہ کریں۔

(کھیل جم جاتا ہے بازیاں ہاری جیتی جاتی ہیں۔ نقدی ادھر سے ادھر چلنے لگتی ہے، حقے گڑگڑائے جارہے ہیں، کھیل کی پوری فضا جم گئی کہ اتنے میں شرابی لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے)

چوتھا: (شرابی) خبردار جو کسی نے قدم آگے بڑھایا۔ میں تم سب کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔

(اسٹیج کے دونوں اطراف سے پولس کے سپاہی بڑھتے ہیں اور پورے مجمعے کو گھیرے میں لے لیتے ہیں۔ لوگ بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر گھیرے سے نکل نہیں سکتے)

کوتوال: مرزا صاحب آپ؟ مجھے افسوس ہے۔ مجھے پہچانا آپ نے۔ بندے کو فیض الحسن خان کہتے ہیں کوتوال شہر۔

(کوتوال آگے، ملزمین پیچھے پیچھے، مرزا غالب وسط میں اور پولس کے سپاہی گھیرا ڈالے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ قافلہ رخصت ہونے بھی نہیں پاتا کہ تلوار علم کیے یوسف مرزا آتے ہیں)

یوسف مرزا: خبردار جو کسی نے آگے قدم بڑھایا، میرے بھائی کو چھوڑ دو، نہیں تو ایک ایک کو قتل کردوں گا (چوبدار انھیں پکڑ لیتے ہیں) تم سب دیوانے ہو میرا ہاتھ روکتے ہو انھیں کچھ نہیں کہتے جو ہاتھ قلم کرتے ہیں اور منصف کہلاتے ہیں جو گلے میں پھانسی کا پھندا

ڈالتے ہیں اور خداوند کہے جاتے ہیں۔ (قہقہہ) میرا کیا ہے آفتاب کو قتل کردو۔ ماہتاب کو زنجیریں پہنچادو مسخرو! تم سب مجرم ہو، پھر بھی تم سخی داتا کہلاتے ہو۔ پھولوں کو شاخوں سے نوچ لو۔ نسیم سحر کے پاؤں میں گھنگھرو پہنا کر نچاؤ۔ شاہراہوں پر خون دل کا چھڑکاؤ کرو۔ لبوں پر مہریں لگادو۔ آنکھوں میں دہکتی سلاخیں ڈال دو۔ میرا کیا ہے (قہقہہ) میں اپنے راستے جاتا ہوں۔

(چوبدار انھیں پکڑ کر لے جاتے ہیں)

دوسرا ایکٹ، دوسرا اسین

پھول والوں کی سیر کا مجمع مہرولی میں۔ رات کا ابتدائی حصہ۔ جگہ جگہ مشعلیں لالٹینیں، گلاس، ہانڈیاں، فانوس، اور دیوار گیریاں روشن ہیں۔ آگے آگے ڈھول تاشے والے۔ روپہلی ٹھپے ٹکے ہوئے سبز کرتے، لیس لگی ہوئی گول ٹوپیاں، کسی کے گلے میں ڈھول، کسی کے گلے میں تاشہ، ہاتھوں میں چوبیں، اس کے پیچھے دو جھنڈے، زربفت کے پھریرے، مقیش کے پھندے، کلابتوں کی ڈوریاں، جھنڈوں کے سروں پر رنگ برنگ کے شیشوں کی ہشت پہل لالٹینیں، ان کے بعد شرف الحق کوتوال کا گھوڑا، اردلی میں پولس والوں کا پرا، ان کے پیچھے نوبت خانے کا تخت، اس کے اوپر بانسوں کی بارہ دری کھڑی کرکے اوپر کھپچیوں کا گنبد بنا کر کپڑا منڈھ پنی لگا کاغذوں کے پھولوں سے سجا دروں پر گیندئی پردے ڈال ڈوریوں سے کس دیے، نوبت والے اندر بیٹھے ہیں۔ تخت کو کہاروں نے اٹھایا ہے۔ نوبت خانے کے پیچھے دلی کے اکھاڑے، ہر اکھاڑے کے ساتھ ایک استاد بیس بیس پچیس پچیس شاگرد بنے ہوئے تیار جسم چوڑے چوڑے سینے بھرے بھرے ڈنڈ۔ بھری ہوئی مچھلیاں، پتلی پتلی کمریں، جسم پر چست جانگیے، گلے میں سونے کے چھوٹے چھوٹے تعویذ ان کے پیچھے نفیری والے اور ان کے ساتھ دلی کے سقے سفید براق کپڑے پہنے لال لنگیاں کمر سے لپیٹے سبز سیلے سروں پر باندھے ہاتھوں میں منجھے منجھائے پیتل کے دو کٹورے نفیری اور جوڑی کے ساتھ کٹوروں کی آواز ملاتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے بعد ڈنڈے

والوں کی سنگتیں، ہاتھوں میں لال سبز ڈنڈے، پندرہ بیس کا حلقہ، بیچ میں طبلہ سارنگی والے تال سر پر ڈنڈوں کی کھٹا کھٹ مزا دے رہی ہے۔ اس کے بعد تخت رواں تختوں پر بھاری بھاری پشوازیں پہنے کارچوبی دوپٹے اوڑھے طوائفیں، چھم چھم ناچ رہی ہیں۔ تخت نیچے رکھ دیا جاتا ہے اور ایک طوائف بہادر شاہ ظفر کی غزل گاتی ہے:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا
اس خرد نے مجھے سرگشتہ وحیران کیا
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
تونے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم وخم خانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دورئ ساقی سے مجھے
تو چراغ رہِ مے خانہ بنایا ہوتا
اور دل بادہ کشوں کا نہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

تخت رواں کے بعد انگریزی باجہ اور ترک سواروں کا قافلہ —— اس کے پیچھے پھول والوں کا ہجوم چلا آتا ہے۔ جلوس گزر جاتا ہے تو بازار کی رونق بڑھ جاتی ہے اور اس مجمع میں بعض جانی پہچانی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

پہلا: لو بھئی ہولی پھول والوں کی سیر۔

دوسرا: ابھی سے ہولی! ابھی تو ذرا جھرنے کا مزہ لوٹیں گے۔ امریوں کی بہار دیکھیں گے۔ شمسی تالاب پر تیراکی کا میلا دیکھیں گے اور پھر کل آتش بازی۔

تیسرا: اس بار دیکھنا شہر کے آتش بازوں کی تیاری۔ بخدا وہ وہ ہوائیاں چھکے لٹو خنگے چلیں گے کہ پچھلے سال کی ساری کارگزاری کو مات کر دیں گے۔ پھلجھڑی ہت پھولوں اور چرخیوں کے مقابلے میں اب کے میدان انھیں کے ہاتھ رہے گا۔ بتاشہ انار اور پنج رنگی میں تو ان سے کبھی کوئی بازی نہیں لے جاسکے گا۔

دوسرا: اماں خلقت ٹوٹ پڑی ہے اس سال تو وہ ازدہام ہے کہ خدا کی پناہ۔

تیسرا: اماں آج مولانا نظر نہیں پڑے (اتنے میں ساقی حقہ پلانے آجاتا ہے۔ تینوں دوست باری باری حقہ پینے لگتے ہیں)

ساقی:

حقہ جو ہے حضور معلّیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

صاحبو! اس پھول والوں کی سیر کا قصہ بھی عجیب ہے۔ فردوس مکانی اکبر شاہ ثانی اپنے منجھلے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے بادشاہ پیر و مرشد بہادر شاہ ظفر بڑے بیٹے تھے، مگر باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی بادشاہ سلامت اور بادشاہ بیگم دونوں نے فرنگیوں کی ریزیڈنٹ سے کوشش کی کہ کسی طرح مرزا جہانگیر ولی عہد ہو جائیں مگر انگریز نہ مانے۔ مرزا جہانگیر نے ایک دن سر بازار انگریز ریزیڈنٹ کو "لولو ہے بے" کہہ دیا۔ تھوڑے دن بعد ان پر گولی چلائی فرنگیوں نے الہ آباد میں قید کر دیا۔ ماں نے منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ آئیں تو قطب صاحب میں پھولوں کی چادر اور مسہری چڑھاؤں گی۔ مسلمان درگاہ پر پنکھا چڑھاتے ہیں، ہندو جوگ مایا کے مندر پر چڑھاتے ہیں دونوں کا میلہ ہے مل کر مناتے ہیں۔ خود ظل سبحانی نے فرمایا۔ (گانے لگتا ہے)

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک
ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک

آج رنگین ہے رعیت سے لگا شاہ تلک
زعفراں زار ہے اک بام سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

(اتنے میں مولانا جریب ٹیکتے ٹیکتے داخل ہوتے ہیں اور ان تینوں ساتھیوں کو دیکھتے ہی گویا پھٹ پڑتے ہیں۔)

مولانا: سن لیا عزیزم، وہ ایک آن رہ گئی تھی دلی شہر کی وہ بھی گئی۔ مرزا نوشہ کو تمہاری فرنگی سرکار نے قید خانے میں ڈال دیا ہے اور جرم سنا آپ نے __ قمار بازی، جوا کھلیں گے اور مرزا نوشہ جیسے شریف زادے، نواب زادے، شاعر اعظم۔

پہلا: ہاں صاحب انسان خطا کا بنا ہے۔

مولانا: (بھپر کر) آپ نے اچھی منطق چھانٹی ہے بخدا۔ مرزا نوشہ کے چچا نے فرنگیوں کے لیے لڑائی میں جان دے دی۔ باپ الور راج کے پیچھے مرمٹے اور جب سارا راج کاج فرنگیوں کے ہاتھ آیا تو ان مرمٹنے والوں کی اولا کے لیے پنشن تک کے لالے ہیں۔ اس غریب کو جینے نہیں دیتے، مرنے بھی نہیں دیتے، الٹا اس کو ذلیل کرتے ہیں۔

دوسرا: میں کہتا ہوں اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

تیسرا: یہ شاہی کے ٹھاٹ ہیں دلی کی خلقت مست ہے اور ایک شاعر کو آزاد کرانے کی سکت تمہارے شاہِ شطرنج میں نہیں۔

مولانا: ظلم کی بنا ناپائدار ہے رائے بریلی سے اٹھی ہے صدائے حق۔ سید احمد صاحب نے حریت کا نعرہ بلند کیا ہے۔ سارے خس و خاشاک کو بہا لے جائے گا۔

پہلا: انشاءاللہ۔

مولانا: بخدا سمجھ میں نہیں آتا ہماری غیرت کو کیا ہوا۔ ہندو دھرم کو بھولا مسلمان ایمان سے بے گانہ اور یہ فرنگی زادے کالے کوسوں سے ہمیں تہذیب کا سبق پڑھانے آئے ہیں۔

پہلا: نہ گھبرایئے مولانا، منشی سکھانند رقم پہنچے ہوئے نجومی ہیں، کہتے تھے فرنگی حکومت سو سال میں بدلے گی۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال پر جادو کیا تھا، بس اب چند سال کی بات اور ہے۔

مولانا: قومی حمیت دفن ہوگئی۔ شرافت کا جنازہ نکل گیا۔ جرأت اور حوصلے کا خاتمہ ہوگا۔ ہائے کیا کلام ہے، غالب کا قدرداں نہ ملا۔

دوسرا: صاحبو! ہم راگ رنگ کے رسیا، ان باتوں کو کیا جانیں، مگر عزت کے ساتھ جینے کو تو ملے بس یہی بہت ہے۔ ارے مولانا تم تو خواہی نخواہی بچارے فرنگیوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔

(آہستہ آہستہ بوندا باندی شروع ہوتی ہے اچانک جگہ جگہ لوگ گروہ در گروہ اکھٹے ہونے شروع ہو جاتے ہیں، کوئی اہم خبر لوگوں تک پہنچنے لگتی ہے۔ لوگ پہلے کھسر پھسر اور کٹے پھٹے جملوں میں تبصرہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی ایک مجمع میں شامل ہو جاتے ہیں، اس کے بعد مولانا غیظ و غضب میں بھرے ہوئے اس گروہ سے باہر نکلتے ہیں اور اپنے رفیقوں کے جھمگٹے میں شعلہ فشاں ہوتے ہیں)

مولانا: سنا آپ نے۔ سن لیا آپ نے۔ قلعہ معلیٰ کی عزت مٹی میں ملا ڈالی۔ فرنگی کا بچہ ریزیڈنٹ بادشاہ سلامت کی غیر حاضری میں اپنے دوست احباب کو لے کر گھوڑے پر سوار قلعۂ معلیٰ میں جا گھسا، نوبت خانے پر بھی گھوڑے سے نہیں اترا، لال پردے پر بھی نہ ٹھہرا، پورے قلعے میں شہسواری کرتا گھوما کیا۔ کیا اب بھی دلی والوں کی غیرت جوش میں نہیں آئے گی۔

(ایک اخبار والا آواز لگاتا گزرتا ہے "صادق الاخبار، صادق الاخبار، دلی اردو اخبار، دلی اردو اخبار" بارش کچھ اور تیز ہو جاتی ہے۔ اتنے میں چوبدار ننگ دھڑنگ فقط ایک جانگھیہ پہنے بارش میں بھیگتا ہوا ایک طرف سے آکر اسی گروہ کے پاس ایک پیڑ کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے۔ سر پر مٹکا ہے جس میں کچھ کپڑے ہوئے ہیں)

پہلا: ارے میاں، ذری پرے ہٹ کر کھڑے ہو۔

دوسرا: پہچانتے بھی ہو انھیں۔ مرزا غالب کے دربان ہیں۔ ارے بھائی یہ مست قلندر بنے کہاں

گھوم رہے ہو۔ کپڑے کہاں ہیں؟

چوبدار: ہیں (مٹکے کی طرف اشارہ کر کے) مٹکے میں رکھے ہیں۔ بھیگنے سے بچے رہیں گے۔

مولانا: کیوں بھئی مرزا صاحب کی بھی کوئی خیر خبر ہے۔

(بارش زیادہ زور سے ہونے لگتی ہے)

چوبدار: مرزا صاحب تو کبھی کے چھوٹ آئے ہیں مولانا۔ کالے خان صاحب نے انھیں قلعۂ معلیٰ میں وہ کیا ہوتا ہے تاریخ حکومت لکھنے کی خدمت بھی دلوادی ہے صاحب۔ روز دربار جاتے ہیں۔ دوپہر دن رہے آجاتے ہیں۔

(بارش دھواں دھار ہونے لگتی ہے۔ سب ادھر ادھر بھاگتے ہیں۔ آخر میں انگریزی پولیس اور فوج کا ایک دستہ مارچ کرتا ہوا بگل بجاتا ہوا اس راستے سے گزرتا ہے۔ یہ پانچوں آدمی تھوڑی دیر نفرت سے دیکھتے رہتے ہیں پھر بارش سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں)

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

(مرزا غالب کی حویلی کا دیوان خانہ۔ پردہ اٹھتا ہے۔ حویلی میں اندھیرا ہے۔ ایک گوشے میں مرزا شمع کی روشنی میں غزل لکھ رہے ہیں۔ گنگناتے جاتے ہیں، لکھتے جاتے ہیں، اتنے میں پس منظر سے کوئی آواز ترنم سے غزل گانا شروع کرتی ہے)

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تو کو خبر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
غم ہستی کا کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(دوسرے گوشے سے غالب کی حویلی کی ایک اور تصویر ابھرتی ہے)

ہمزاد: اماں مرزا اب شعر گوئی موقوف۔

غالب: کیوں؟

ہمزاد: اب پرزے نکالو اور ظل سبحانی بہادر شاہ ثانی کی غزلیں بناؤ۔ آخر بادشاہ کے استاد ہو، ان کا دیا کھاتے ہو۔

غالب: اپنا تجربہ بیچتا ہوں، اپنا دل نہیں بیچتا۔

ہمزاد: یہاں سب کچھ بکتا ہے۔

(غالب پرزے نکالتے ہیں اور غزل پر اصلاح دینا شروع کر دیتے ہیں)

مرزا: اندھیرا بہت ہے۔

ہمزاد: اور گہرا ہوگا۔

مرزا: (شمع کے اور قریب) میں روشنی کی لو اور تیز کر دوں گا۔

ہمزاد: روشنی ہمیشہ ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتی (قہقہہ) اب دن نہ ہوگا (قہقہہ)۔

(مرزا سر اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ البتہ پس منظر میں قہقہے کی آواز گونج رہی ہے۔ دھیرے دھیرے یہ شور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسٹیج قدموں سے ہل جاتا ہے۔ جیسے حویلی کے چاروں طرف بہت سے لوگ دوڑ رہے ہوں، نعرے لگ رہے ہیں۔ ''دین دین دھرم دھرم فرنگیوں کو نکالو۔ فرنگی راج ختم کرو۔'' گولیوں کی دھائیں دھائیں، لوٹ مار کی

گڑ بڑ، رونے، چیخنے اور چلاّنے کی صدائیں پھر پس منظر میں فرنگی راج کے سپاہیوں کے قدموں کی منظم چاپ۔ ''فرنگیوں کا مارو۔ دین دھرم کے دشمنوں کو مار بھگاؤ۔'' پھر توپ کا سا دھماکا۔ چوبدار سہما ہوا سا داخل ہوتا ہے۔ سانس پھولا ہوا ہے۔)

چوبدار: حضور!!

(غالب سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہیں لیکن چہرے پر فکر مندی نہیں ایک عجیب کرب سے معمور اطمینان ہے جیسے اب یہ شخص بڑی سے بڑی الم ناک خبر سننے کے لیے بھی تیار ہو چکا ہے)

چوبدار: میرٹھ سے فرنگی فوج کے باغی سپاہی شہر میں گھس آئے ہیں، قلعہ میں فرنگی کپتان کو قتل کر دیا ہے (خوشی سے بدحواس) شہر میں بادشاہ سلامت کی حکومت پھر لوٹ آئی ہے۔ تلنگے اور دیسی سپاہی فرنگیوں کو چن چن کر مار رہے ہیں جن گھروں میں فرنگی چھپے ہیں وہاں گھس کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ کل سے پھر بادشاہ سلامت لال قلعے میں عام دربار کریں گے۔

(اس بار اسٹیج کے دوسرے گوشے روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ لال قلعے کے دربار عام کا ایک منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ تخت پر اسّی سالہ بہادر شاہ ظفر بیٹھے ہیں اور نوجوان مرزا مغل تخت کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں۔ دوسری طرف مرزا جوان بخت ولی عہد سلطنت براجمان ہیں۔ اراکین سلطنت اور عمائد دربار میں اپنے اپنے مقام پر صف بستہ کھڑے ہیں)

چوبدار: (بآواز بلند) نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خان بہادر غالب تخلص حضرت ظل سبحانی صاحبقرانی ظل اللہ بہادر شاہ شہنشاہ ہندوستان کے حضور میں سکہ پیش کریں گے۔ نگاہ روبرو نگاہ دار حضرت ظل سبحانی۔

(مرزا غالب آگے بڑھتے ہیں اور بآواز بلند سکہ پڑھتے ہیں۔)

بر زر آفتاب و نقرۂ ماہ

سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

(روشنی پھر ایک دم بجھ جاتی ہے اور منظر دوبارہ شمع اور حویلی کو سامنے لے آتا ہے۔ غالب اسی طرح بیٹھے ہیں۔ شور یکایک بڑھتا ہے۔ توپوں کی دھن دھن، بندوقوں کی آوازیں،

بار بار انگریزی باجہ بجتا ہے۔ بارود کے دھماکے اور قدموں کی چاپ سے اسٹیج بار بار دہل اٹھتا ہے۔ "دین دین دھرم دھرم کی آوازیں مدھم پڑ جاتی ہیں اور ایک بارگی جیسے سب آوازوں پر غالب آ کر ایک آواز ابھرتی ہے۔ پس منظر سے یوسف مرزا کا قہقہہ ابھرتا ہے اور ان کے تمام مکالمے پس منظر ہی سے سنائی دیتے ہیں)

یوسف: اب آئے ہو کھیلن ہوری۔ اب آئے ہو کھیلن ہوری۔ اری میری دلی جاگ گئی، مری دلی جاگ گئی۔ خاموش۔ تمھیں معلوم نہیں یہاں ایک بادشاہ رہتا ہے بادشاہوں سے بڑا بادشاہ، ہمیشہ زندہ رہنے والا بادشاہ۔ اس کا حکم ہے کہ ۲۱ توپوں کی سلامی بند کرو۔ ایک دم بند کرو۔ اس کا نام ہے اسد اللہ تخلص غالب۔ ملک خدا کا خلق غالب کی حکم یوسف مرزا بہادر کا۔ (طبل بجاتے ہیں)

(انگریز آواز پھر گونجتی ہے "Fire" گولی داغی جاتی ہے۔ یوسف مرزا کی کرب ناک چیخ آسمانوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ غالب ایک دم چونک پڑتے ہیں چوبدار بدحواس ہے ڈرتا ہوا داخل ہوتا ہے)

چوبدار: چھوٹے مرزا، چھوٹے مرزا، سرکار!

غالب: کیا ہوا چھوٹے مرزا کو؟

چوبدار فرنگی سپاہیوں نے گولی ماردی۔

غالب: (سکتے کے عالم میں) گولی ماردی۔ اسے کیوں ماردی گولی۔ وہ کونسے ملک کا بادشاہ تھا۔ کیا جرم کیا تھا اس نے۔ میرے دیوانے بھائی نے ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا۔

چوبدار: فرنگی سپاہی حویلی میں گھس آئے ہیں، لوٹ مار کر رہے ہیں۔

غالب: جو چاہیں لے جائیں، جسے قتل کرنا چاہیں قتل کریں جو لوٹنا چاہیں لوٹیں، سب دروازے کھول دو۔ میں نے اپنا خون معاف کیا۔

(فرنگی سپاہی لوٹو، لوٹ لو۔ مار ڈالو چیختے اندر گھس آتے ہیں اور مرزا کو بھی گھیر لیتے ہیں اور پکڑ کر اسٹیج کے ایک گوشے کی طرف لے جاتے ہیں، جہاں کرنل براؤن برجس پہنے کھڑا ہے)

کرنل: ہمیں پہنچانتے ہو؟

(مرزا غور سے دیکھتے ہیں)

کرنل: ویل تم مسلمان ہے؟

(مرزا غور سے پہلے ان تلواروں اور برچھیوں کی طرف دیکھتے ہیں جو کرنل براؤن کے سپاہیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ان کے چہرے پر ہلکی سی تلخ مسکراہٹ ہے۔)

غالب: ہاں، آدھا مسلمان، شراب پیتا ہوں، سور کا گوشت نہیں کھاتا۔

(اتنے میں چوبدار سپاہیوں اور مرزا کے بیچ میں آجاتا ہے۔ کرنل براؤن ہنس دیتا ہے اور اشارے سے سپاہیوں کو منع کر دیتا ہے، سب سپاہی لوٹ مار کرتے ہوئے چیختے چلاتے جاتے ہیں۔ مرزا وہیں کے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں— بیگم ماتمی لباس میں روتی ہوئی داخل ہوتی ہیں، غالب ان کی طرف دیکھتے ہیں اور ہمدردی سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں)

غالب: نہ روؤ۔ اب رونے سے کیا ہوگا۔ میرا دیوانہ بھائی اب اس دنیا میں نہیں۔ سب کچھ لٹ گیا۔ خدا نے اسے ایک زندگی دی تھی، وہ بھی لوٹ لی۔ ایک بار اس دنیا میں آنا اور اس قدر ناکامی اور نامرادی سے، اس قدر دل شکستگی اور محرومی سے۔ اتنا بڑا تحفہ اور اتنی بڑی سزا، اتنا بیش بہا موتی اور ایسی گندگی میں بہا دیا جائے۔

(پس منظر میں مکانوں کے گرنے کی آوازیں، توپوں کی گرج اور ان پر غالب فتح مندی کے نغمے چھیڑتے ہوئے انگریزی بینڈ کی آواز آرہی ہے جسے کبھی کبھی لوگوں کی کراہ چیخ پکار اور کرب و درد کی پکار توڑ دیتی ہے۔ چوبدار پھر اس طرح بدحواس ہانپتا کانپتا داخل ہوتا ہے)

چوبدار: مولانا صہبائی کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا ہے۔ مولانا فضل حق کو کالے پانی بھیج رہے ہیں۔ مصطفیٰ خان شیفتہ کی جاگیر ضبط۔ سارے امیر خوار ہو گئے۔ محلے کے محلے ڈھا دیے گئے ہیں۔ اب جامع مسجد کے آگے سب کھنڈر پڑے ہیں۔ ستم ہو گیا اندھیر ہے، ہر طرف بازار میں سولیاں گڑی ہیں۔

غالب: (بیگم سے) سختی ہو۔ پنشن بند۔ آمدنی ختم۔ اگر سزا بھی ملے تو کچھ تعجب نہیں۔ الزام یہ کہ بہادر شاہ کے لیے سکہ کیوں کہا، لال قلعہ میں نوکری کیوں کی، گھر میں جو قیمتی کپڑے اور برتن ہوں انھیں جمع کر کے بیچنے کے لیے بازار بھیج دو۔ گزر کی اور کوئی صورت نہیں۔

(بیگم اٹھتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ چوبدار بھی ان کے ہمراہ چلا جاتا ہے، غالب تنہا رہ جاتے ہیں۔ پس منظر کا شور اب منظم اور مرتب ہو جاتا ہے اور انگریزی بینڈ باجہ اب گویا فتح کی دھنیں بجا رہا ہے، جس پر قدم بڑھاتے فرنگیوں کے قدموں کی آواز گونج رہی ہے۔ اتنے میں چوبدار کچھ کپڑے فرغل اور چغے اٹھائے اور کچھ برتن لیے ہوئے آتا ہے، اس کے پیچھے بیگم بھی ہیں)

غالب: (چوبدار سے) جاؤ ان سب چیزوں کو بیچ کر جو کچھ ملے لیتے آو، لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں۔

(پس منظر میں شور پھر بڑھتا ہے اس کے اوپر اعلان کرنے والے کی آواز آتی ہے۔)

اعلان کرنے والا: خلق خدا کی ملک فرنگی کا حکم ملکہ معظمہ بہادر کا۔ دلی کے رہنے والو سنو، سنو، ملکہ معظمہ انگلستان نے ہندوستان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ہے، باغیوں کی بغاوت کچل دی گئی ہے اور اب پورے ملک میں ملکہ معظمہ بہادر کا راج قائم ہونے کی خوشی میں سب رعیت وفاداران انگریز پر واجب ہے کہ اپنے گھروں اور حویلیوں پر چراغ جلائیں اور روشنی کریں۔ دھم دھم دھم۔ خلق خدا کی ملک فرنگی کا حکم ملکہ معظمہ بہادر کا۔

(چوبدار گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

چوبدار: بادشاہ سلامت کو کمپنی بہادر گرفتار کر کے باہر بھیج رہی ہے۔ (سسکنے لگتا ہے) لال قلعہ سونا ہو گیا صاحب، لال قلعہ سدا کے لیے سونا ہو گیا (فوجی بینڈ اور قدموں کی آواز پھر ابھرتی ہے) یہ آواز سنتے ہیں سرکار۔ بادشاہ سلامت کو فرنگی فوج لیے جا رہی ہے۔

غالب: آفتاب ڈوب گیا بیگم، چراغاں کا انتظام کرو۔

بیگم: چراغاں!

غالب: ہاں، سنا نہیں تم نے، تمام رعیت وفاداران انگریزی کے لیے ضروری ہے کہ فتح کی خوشی میں اپنے گھر اور حویلیوں پر روشنی کریں۔

بیگم: ابھی تو یوسف مرزا کی موت کو بھی کچھ دن نہیں گزرے۔

غالب: دل کے زخم کون دیکھتا ہے۔

بیگم: میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں، کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ چراغاں کے لیے کہاں سے آئے گا۔

غالب: چوبدار کو بھیجو گھر کی کوئی نہ کوئی چیز بیچ لائے۔

(چوبدار تین چار چراغوں میں تیل ڈالتا ہے۔ لوٹھیک کرتا ہے اور ایک کپڑے میں لپیٹ کر اسے تیل میں ڈبوتا ہے اور اس میں آگ لگا کر لاتا ہے۔ غالب اس کے ہاتھ سے لے لیتے ہیں اور دیوان خانے کے چھجے پر ان چراغوں کو رکھ کر پہلا چراغ جلاتے ہیں۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا۔ چراغوں کی روشنی ان کے چہرے پر مختلف زاویوں سے پڑتی ہے اور ان کے فکر آلود اور دردمند چہرے کو روشن کرتی ہے۔ بیگم چلی جاتی ہیں۔ غالب اچانک چوتھا چراغ روشن کرنے کے بعد لوٹ کر دیکھتے ہیں)

غالب: بیگم یہی تو زندگی کی پوری داستان ہے اندھیروں میں چراغ جلانا ہی تو ہمارا منصب اور مقدر ہے۔ ہر روشنی کے ساتھ اندھیرے ہیں اور ہر اندھیرے کے ساتھ روشنی۔ یہی زندگی ہے۔

(پس منظر سے کئی آوازیں مل کر غالب کا شعر پڑھتی ہیں اور اس شعر کی موسیقی میں اسٹیج ڈوب جاتا ہے)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(پردہ)

☆☆☆

مور پنکھی

اور دوسرے ڈرامے

ڈاکٹر محمد حسن

یکے از مطبوعات مکتبہ دین و ادب۔ لکھنؤ

ناشر : مکتبہ دین وادب۔ لکھنؤ

بہ اہتمام : والی آسی

چھاپ : جنوری 1975ء

قیمت : ۵/روپے

طابع : شاہی پریس۔ لکھنؤ

مکتبہ دین وادب، ۱۵ لاٹوش روڈ، لکھنؤ

ترتیب

پیرایۂ اظہار

ایک مدت کے بعد اپنے چند ڈراموں کا مجموعہ مرتب کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ ڈرامے دراصل طویل اور مبسوط ڈرامے نہیں ڈراموں کے خاکے ہیں جن میں رنگ بھرنا اسٹیج اور ریڈیو پر انھیں پیش کرنے والے پروڈیوسروں پر منحصر ہے۔ انھیں اشاعت کے لیے بھیجتے وقت چند الفاظ ڈراما نگاری کے بارے میں کہنا ضروری ہیں کہ یہی الفاظ کم و بیش ان ڈراموں کا سیاق و سباق فراہم کر سکیں گے۔

اردو اسٹیج کے زوال کے بعد سے اردو ڈراما تقریباً ادبی مشق ہی بنا رہا ہے متعدد ڈراما نگاروں نے اسے اسٹیج اور ریڈیو یا ٹیلی وژن سے الگ کر کے دیکھا، لکھا اور پڑھنے والوں نے اسے اپنے ڈرائنگ روم یا اسٹڈی کی خلوتوں میں ناول یا افسانے کی طرح پڑھا۔ یوں بھی ہوا کہ عام قاری ہر اس افسانوی تحریر کو ڈراما سمجھنے لگا جو مکالموں کی شکل میں لکھی گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈراما مکالموں پر منحصر نہیں البتہ مکالمے اس فنی تخلیق کا ایک اہم حصہ ضرور ہیں جو پلاٹ، مکالمے اور کرداروں ہی کے سہارے وجود میں نہیں آتی بلکہ رنگ، صوت، آہنگ، روشنی اور سایوں اور سکوت اور ساز سے مل کر بنتی ہے۔

اس مکمل تخلیق کا نام ہے۔ ڈراما۔ یہا ہم اس فنی تخلیق کے صرف اس حصے سے بحث کریں گے جو اس کے لکھے ہوئے یا بولے ہوئے الفاظ سے متعلق ہے یعنی ڈرامے کی تحریری شکل۔

(۱)

سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ آج اسٹیج اور ریڈیو اور ٹیلی وژن ڈرامے کی تکنیک اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ ڈرامے کی کسی ایک مخصوص شکل پر اصرار کرنا غیر ضروری سا ہو گیا

ہے۔ وہ زمانے گئے جب اسٹیج کے چوکھٹے ہی ڈرامے کا تصور کیا جا سکتا تھا اور اس روایتی سکّہ بند اسٹیج پر پردے تھے اسٹیج فرنیچر تھا فلڈ لائٹ کی قطاریں تھیں اور دیکھنے والوں اور اداکاروں کے درمیان پروسی نیم کی حدفاصل قائم تھی لیکن آج اسٹیج ڈرامے کے بارے میں اتنے اور ایسے تجربے کیے جا چکے ہیں جن کی بنا پر یہ دیوار گر چکی ہے اب اسٹیج تھیٹر کھلی فضا میں نکل آیا ہے لاریوں اور ٹرک گاڑیوں کے پٹ کھول کر اسٹیج بنا دیا جاتا ہے اور اسٹیج پراپرٹی اور پردوں کا محتاج نہیں رہا ہے۔ تماشائیوں کی صف میں سے لوگ اٹھ اٹھ کر ڈرامے میں حصہ لینے لگتے ہیں اور پورا تھیٹر ہال بھی گویا اسٹیج بن جاتا ہے۔

غرض آج کی دنیا میں اسٹیج ڈرامے کا سکّہ بند تصور قائم نہیں رہا ہے اور ڈراما نگار کے لیے تجربے کے نت نئے موقع ہیں ایسی صورت میں ڈراما نگار کے بعد ڈراما پروڈیوسر کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ڈرامے کی کامیابی یا عدم کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ڈرامے کے مرکزی تاثر یا ترسیلی قدر کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا گیا ہے یا نہیں ڈرامے کی صحیح توجیہہ ہو تو ڈراما نگار اور ڈراما پروڈیوسر دونوں کے نقاط نظر میں اتحاد پیدا ہونا لازم ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر کردار اور ہر مکالمہ اس توجیہہ کی آب و تاب سے چمک اٹھے گا ورنہ ممکن ہے بعض مکالمے کردار اور بعض واقعات تک بے موقع اور بے تکے معلوم ہوں یا ڈراما کچھ کا کچھ ہو کر رہ جائے۔

ا۔ اقدار

ڈرامے کے ذریعے ہم جس قدر یا سلسلۂ اقدار کی ترسیل کا ذکر کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ قدر سے مراد وہ مرکزی تاثر ہے جو ڈراما دیکھنے والا قبول کرتا ہے اور جس مرکزی تاثر کو پیدا کرنا ڈراما نگار اور ڈراما پروڈیوسر اور اس کے تمام رفقا کا مقصود ہوتا ہے۔ عام طور پر مرکزی تاثر کو مقصد یا نظریہ وغیرہ کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ درحقیقت مرکزی تاثر کو ان تصورات سے متمیز کرنے اور ان سے الگ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نظریہ یا فلسفۂ زندگی ایک بسیط اور جامع اصطلاح ہے اور وہ کسی شخص کے (عام اس کے کہ وہ فن کار ہو یا نہ ہو) تمام افعال و افکار پر حاوی ہوتی ہے اس کا ایک ہلکا سا عکس اس کی تخلیقات میں ملتا ہے ایسے کسی باشعور اور ذمہ دار افراد کا تصور ہی ممکن نہیں جس کا کوئی نظریہ ہی نہ ہو یا شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ کسی فلسفۂ زندگی کو اپنا تا نہ ہو۔ یہ

ضرور ہے کہ ہم میں سے اکثر حضرات تساہل کی بنا پر مروجہ فلسفوں میں سے کسی ایک فلسفۂ حیات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا لیتے ہیں یا بے سوچے سمجھے ایسے نظریوں کی ترویج واشاعت کرنے لگتے ہیں جو ان کی ذات کا حصہ نہیں ہیں بلکہ جن کا درد وہ اوروں کی دیکھا دیکھی کرنے لگے ہیں۔

گویا نظریہ فلسفۂ حیات کا ایک جزو ہے اور اس نظریے کا ایک ہلکا سا عکس مرکزی تاثر میں نکھر کر اور سنور کر تخلیق پر اثر انداز ہوتا ہے مگر مرکزی تاثر یا قدر کو محض پیغام یا خیال سمجھنا درست نہیں ہے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرکزی تاثر وہ تصور ہے جو ڈرامے کے مختلف واقعات اور کرداروں میں ایک فکری اور جمالیاتی مرکزیت اور ہم آہنگی پیدا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

اس مرکزی تاثر کی کم سے کم چار واضح جہات کی نشاندہی ممکن ہے۔

(۱) فکری اقدار

(۲) جذباتی اقدار

(۳) ڈرامائی اقدار

(۴) مجرد اقدار

فکری اقدار سے وہ خیال یا تصور مراد ہے جس کی بنا پر ڈراما لکھا گیا۔ ڈراما نگار اس مرکزی خیال یا تصور کو دیکھنے والوں تک پہنچانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے مختلف ذرائع سے کام لیا۔ واقعات کے خاکے بنائے کردار ڈھالے ان میں کشمکش پیدا کی، مکالمے لکھے اور پروڈیوسر اور اس کے رفقا نے صوت، آہنگ، نور اور سایے کے امتزاج سے جہانِ تمثیل سجایا۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھنے والے کی رسائی ان بصیرت یا فلسفیانہ معنویت تک ہو جو فن کار ناظرین تک پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ فن کی دیگر اصناف سے ڈرامے میں یہ عمل کہیں زیادہ پیچیدہ اور بالواسطہ ہے اور اسی لیے زیادہ لطیف ہے۔ ڈراما نگار اپنی بات غزل گو یا نظم نگار یا مقالہ نگار کی طرح براہ راست نہیں کہہ سکتا اسے کردار، واقعات اور ان کی باہمی کشمکش کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ان کے تخالف اور تطابق سے اس منزل تک پہنچنا پڑتا ہے جب فن کار کے کہے بغیر ناظرین ڈرامے کی فضا، واقعات اور کرداروں سے اس مجموعی تاثر یا فکری قدر تک پہنچ جائیں جو ڈراما نگار کا مقصود ہے۔

اسی لیے فن کے بارے میں سنسکرت کے ماہرین جمالیات بار بار اس پر زور دیتے آئے

ہیں کہ الفاظ کے سیاق وسباق ان کی ترتیب اور تنظیم سے اکثر وہ مفہوم اور فضا پیدا ہوتی ہے جن کو براہ راست ظاہر کرنے والا ان میں کوئی لفظ بھی نہیں ہوتا مثلاً عشق کے شدید جذبے کو ظاہر کرنے والے ایسے لاتعداد اشعار ہیں جن میں 'عشق' یا 'محبت' یا ان کا ہم معنی کوئی لفظ بھی استعمال نہیں ہوا ہے یا زندگی کی فنا پذیری اور ناپائیداری پر ہزاروں ایسے اشعار ہیں جن میں فنا پذیری اور ناپائیداری کے مترادفات میں سے کوئی بھی نہیں برتا گیا ہے۔

لہٰذا ڈرامے میں استعمال ہونے والے الفاظ اور مکالمے پڑھنے اور ان کی تفسیر وتوجیہہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے متعلقہ ڈرامے کی مرکزی فکری قدر کو پہچانا جائے شاید اسی لیے ڈراما کی دوسری قرأت ہی اس کی اصلی قرأت ہے عام طور پر پہلی قرأت میں پڑھنے والے واقعات کے بہاؤ اور کرداروں کی کشمکش میں محو رہتا ہے اور عام قاری کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ پاتا دوسری بار پڑھتے وقت وہ ان واقعات کی ترتیب اور کرداروں کے باہمی تعلق کی باطنی معنویت اور اس کے ذریعے ترسیل پانے والی فکری قدر کے تانے بانے پہچان سکتا ہے اور اس کی روشنی میں ڈرامے کی توجیہہ اور تفسیر کر سکتا ہے۔

فکر کا جذبے سے گہرا تعلق ہے بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فکر اور جذبہ ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتے ان دونوں کو الگ الگ تصور قرار دے کر بصیرت کی ناقابل تقسیم اکائی کو غلط ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ دراصل جذبہ خود مختلف منازل اور مراحل سے ہو کر گزرتا ہے پہلی منزل مشاہدے کی ہے دوسری احساس کی، تیسری جذبے کی۔ پہلے ہر انسان مختلف حواس کے ذریعے خارج کی اشیا کے تاثر سے دوچار ہوتا ہے۔ آنکھ سے دیکھے تو مشاہدہ کہلائے گا دوسرے حواس سے خارجی اشیا سے دوچار ہو تو تجربہ یا تاثر۔ پھر دوسری منزل مشاہدات یا تجربات کی مختلف سطحوں سے مل کر احساسات میں ڈھل جاتی ہے یہ احساسات مختلف سطح کے اور مختلف نوعیتوں، درجوں اور مدتوں کے ہو سکتے ہیں کچھ بالکل وقتی اور ہنگامی کچھ زیادہ دائمی اور پائیدار پھر جب ان احساسات میں فکر کا جزو بھی شامل ہو جاتا ہے تو ان محسوسات کو جذبے کا درجہ ملتا ہے۔ اس لیے جن اقدار کو ہم فکری اقدار کا نام دیتے ہیں ان میں بھی درحقیقت جذباتی عنصر شامل ہوتا ہے مگر آسانی کے لیے ہم جذباتی اقدار کا الگ وحدت کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

ڈراما صرف کوئی نیا خیال یا نیا تصور ہی پیش نہیں کرتا وہ اس فکری قدر کو جذباتی قدر میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ اکثر ڈراموں میں کرداروں کے اپنے تجربات میں ناظرین خود تخیل میں شریک ہوتے ہیں اس لیے صرف مرکزی خیال تصور یا فکری قدر پر ناظرین نظریں جمائے اور ان سے لو لگائے نہیں بیٹھے رہتے بلکہ بعض کردار کی باطنی کشمکش، کرب ونشاط اور جذباتی سرگزشت میں شریک اور ان کی زندگی میں خود شامل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ ڈرامے کی مرکزی جذباتی قدر کون سی ہے اسی بنا پر ڈراموں کو المیہ اور طربیہ کے دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن یہ محض ظاہری اور سطحی تقسیم ہے۔ دراصل جذباتی قدر کا تصفیہ اس بنا پر کیا جانا چاہیے کہ انسان کے بنیادی جذبوں میں سے کس جذبے سے ڈرامے کا واسطہ ہے۔ سنسکرت شعریات میں انسانی جذبے کی نو[9] رسوں یا نو[9] بنیادی منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں بھگتی (مذہبی یا روحانی) ہاسیہ (مزاحیہ) شرنگار (رومانی) کرونا (ہمدردی جگانے والے) جذبات وتصورات اہم ہیں۔

اس لحاظ سے ہر ڈرامے کے مرکزی جذباتی قدر کو پہچاننا بھی ضروری ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ ڈراما میں تخیل کی سطح پر جذباتی شرکت ہمیشہ ناظرین کسی نہ کسی کردار کی حمایت میں یا اس کی جذباتی حالت ہمدردی ہی کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ اکثر مختلف کرداروں سے جذباتی بے تعلقی کے ذریعے بھی ممکن ہے مثلاً اسٹیج پر اگر ایک کردار دوسرے کردار کا مذاق اڑا رہا ہو تو ضروری نہیں کہ دیکھنے یا پڑھنے والا مذاق اڑانے والے کردار کا ہم نوا ہو جائے بلکہ وہ ان دونوں سے جذباتی طور پر لاتعلق ہو کر ان دونوں پر ہنس سکتا ہے اور اس طرح ڈرامے کی جذباتی قدر میں شریک ہو سکتا ہے۔

اقدار کی تیسری جہت ڈرامائی اقدار کے متعلق ہے۔ ان میں سے مراد وہ اقدار ہیں جو ڈرامے کے فنی حسن میں اضافہ کرتے ہیں یا فنی نقطۂ نظر سے ڈرامے کے لیے ضروری ہیں ان میں حیرت واستعجاب کا عنصر Suspens واقعات کا قدرتی مگر کسی قدر غیر متوقع ارتقا اور کرداروں کے ڈرامائی داخلے اور اخراج شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مکالموں اور کرداروں کے درمیان تخالف اور تطابق کے رشتے اور ڈرامے کے مختلف اجزا میں باہمی ربط وترتیب کی نوعیتوں کو بھی دخل ہے جن پر زیادہ تفصیلی بحث درکار ہے اکثر زبردست تصادم، آویزش اور کشمکش کے مناظر کی ابتدا نہایت ہی لطیف اور پُرسکون قسم کے مکالموں سے ہوتی ہے جو آویزش کی شدت کو نمایاں کر دیتے ہیں اس کی

کلاسیکی مثالیں شیکسپیئر کے ڈرامے، میک بتھ کے پورٹر سین یا ہملیٹ میں قبر کھودنے والے کے درمیان مزاحیہ مکالموں والے سین سے فراہم کی جاسکتی ہیں۔ کرداروں کے ڈرامائی داخلے اور ڈرامائی اخراج کی مثالیں زیر نظر ڈراموں میں بھی ملیں گی مثلاً ''شکست'' میں جلے ہوئے نصف چہرے کے ساتھ ہیرو کا پہلی بار داخلہ یا ''مورپنکھی'' کی ہیروئن کا نہایت خطرناک ماحول میں نہایت معصومیت اور بھولے پن سے داخل ہونا۔

اقدار کی چوتھی جہت جمالیاتی ہے اور دراصل یہی اہم ترین اقدار ہیں ڈرامے میں فکر، جذبہ، ڈرامائیت سب کا وسیلہ اور مقصد یہی ہیں۔ جمالیاتی اقدار کی دو سطحیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ ظاہری اقدار وہ ہیں جو ڈرامے کی پیشکش کا حصہ ہوتی ہیں اور اسٹیج کی تزئین، لباس، موسیقی، نور اور پرچھائیوں کے استعمال اور اسی قسم کے دوسرے لوازم سے عبارت ہیں ان سب کی گنجائش ڈرامے کے مسودے میں کم و بیش موجود ہوتی ہے لیکن ان میں سے پورے طریقے پر فائدہ اٹھانا پروڈیوسر کے اپنے تخیل پر منحصر ہے۔ عشق و محبت، ڈرامے کا عام موضوع ہے لیکن اس کا پس منظر شمشان بھی ہوسکتا ہے اور ایوان شاہی بھی اور ان دونوں سے جمالیاتی اقدار میں کام لیا جاسکتا ہے۔

جمالیاتی اقدار کی باطنی سطح وہ ہے جو ڈرامے کے مجموعی اثر سے مرتب ہوتی ہے اور اس میں آواز سنگیت، رنگ و نور، آوازوں اور مکالموں کا اتار چڑھاؤ، واقعات کا نشیب و فراز اور کرداروں کی باطنی اور باہمی آویزش بھی کچھ شامل ہوتا ہے اور ان سب کے مجموعی تاثر سے جمالیاتی اقدار پیدا ہوتی ہیں جو دیکھنے والوں کو کچھ لمحے کے لیے مادّی دنیا کی بے رنگی اور بکھراؤ سے بلند کردیتی ہیں اور زندگی کی نئی بصیرت اور معنویت دیتی ہیں۔ ان اقدار کو زیادہ لطیف اور موثر بنانا ڈراما نگار اور پروڈیوسر دونوں کی کامیابی کی دلیل ہے۔

لہٰذا ڈراما نگار کے سامنے صرف یہی سیدھا سادہ سوال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو کس طرح ادا کرے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا اس کے پاس شاعری یا سنگیت کی طرح کوئی براہ راست وسیلہ نہیں، اسے ہر لفظ لکھتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ مافی الضمیر کا بنیادی تاثر یا نقطۂ ارتکاز کیا ہے وہ کون سا تصور ہے جسے وہ اپنے ڈرامے کے ذریعے پیش کرنا چاہتا ہے اور اس تصور کو وہ واقعات کے نشیب و فراز، کرداروں کی کشمکش اور مکالموں کی روانی اور برجستگی کے

ذریعے کس حد تک موثر انداز میں پیش کر سکتا ہے پھر اس پیش کش کے دوران وہ مختلف اقدار کو کس حد تک ملحوظ رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ گویا اس کی بنیادی کشمکش اپنی باطنی کیفیات کو کامیابی کے ساتھ خارجی شکل دینے کی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ وہ محض تماشائیوں کی تفریح اور سستی تبلیغ کا آلۂ کار نہ بن جائے بلکہ اپنے تجربات کی گرمی اور اپنے بے کل باطن کے پورے سوز کو صداقت اور وفاداری کے ساتھ پیش کر سکے۔

۲۔ طرز و آہنگ

ان اقدار کی ترسیل ڈرامے میں کس طرح کی جائے اس کا دار ومدار ڈرامے کے اپنے پیرایۂ بیان پر ہے تھیٹر کی اصطلاح میں اسے اسٹائل (Style) کہا جاتا ہے لیکن چونکہ اس اصطلاح سے طرز بیان پر اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے اس لیے اسے پیرایہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ زندگی کے تجربات میں ہم سب شریک ہیں لیکن طرز احساس کے اعتبار سے ہم سب کچھ طبائع رکھتے ہیں کچھ کے نزدیک زندگی سے پایا ہوا ہر زخم پھول ہے کچھ کے نزدیک اس گلزار کا ہر پھول زخم ہے بعض شفق کے رنگوں سے مدہوش ہوتے ہیں بعض کو آس پاس کی گندگی، غریبی اور دکھ میں عرفانِ حیات کے جلوے نظر آتے ہیں۔ زندگی کی مادی حقیقتوں سے قربت اور بُعد کی بنا پر نیلمس نے بجا طور پر مختلف پیرایے کے ڈراموں کی ایک گوشوارے کے ذریعے اس طرح درجہ بندی کی ہے:

اس خاکے کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کی تصویر کشی جس حد تک اصل کے مطابق اور تخیل کی

رنگینی سے دور ہوگی، اسی قدر ڈراما حقیقت پسندانہ ہوگا لوگوں کے لباس عام طرز کے ہوں گے اور کرداروں کے چہرے، مزاج اور کردار عمومی زندگی سے قریب تر ہوں گے قصے میں عمومی رنگ کم اور تخصیص زیادہ ہوگی فضا اور تفصیلات پر زور دیا جائے اور پس منظر کو اہمیت حاصل ہوگی۔

حقیقت پسندی کے اس سرے سے ڈراما جس قدر دور ہوتا جائے گا اسی قدر تخیل کی رنگ آمیزی بڑھتی جائے گی۔ تخیل کی رنگ آمیزی ہلکی ہوئی تو تھیٹریکل حقیقت پسندی کا پیرایۂ بیان ظہور میں آتا ہے جس میں زندگی کی سنگینی اور جبر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تاریک پہلو پیش کیا جاتا ہے جس کی سب سے اچھی مثال گورکی کا ڈراما "Lower Depths" یا ''نچلی پستیاں'' ہے۔

زندگی کی اس سنگین، تاریک اور بے دردانہ تصویر کشی میں تخیل کی رنگ آمیزی کچھ اور زیادہ ہو جائے اور اس کی حقیقی یا معروضی شکل میں کچھ اور مبالغہ یا تحریف کی جائے تو (المیہ انجام ہو) میلو ڈراما (Melo Drama) اور (طربیہ انجام ہو تو) فارس یا مزاحیہ ڈراما وجود میں آتا ہے اب گویا زندگی کی جوں کی توں شکل تخیل کی تہ در تہ رنگینی سے کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔

زندگی کی وفادارانہ عکاسی اور تخیل کی رنگینی کے ان دونوں سروں کے درمیان ڈرامے کے مختلف پیرائے اور طرز ابھرتے ہیں ان ہی دونوں سروں کو فنی اصطلاحوں میں کلاسیکی اور رومانی کی اصطلاحوں سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ کلاسیکی طرز میں زیادہ وزن، وقار اور تہہ داری پائی جاتی ہے فکری حجم بھی زیادہ نمایاں ہوتا ہے کرداروں میں بھاری بھرکم پن موجود ہوتا ہے اور ان کی باہمی اور اندرونی آویزش گویا زندگی کے بنیادی مسائل کی تہیں کھولتی معلوم ہوتی ہے۔ قدیم یونانی ڈراموں سے لے کر آج کے دور تک کے ایسے ڈرامے جو فکری حجم اور واقعات اور کردار کے وقار سے مزین ہیں کلاسیکی یا نیم کلاسیکی کہے جاسکتے ہیں ان میں فکر کا عنصر تخیل اور جذبے کو غلبہ حاصل کرنے نہیں دیتا بلکہ فکر ہی کو اور زیادہ نمایاں اور تیکھا بنا دیتا ہے یہی عناصر مجرد شکلوں میں اظہاریت اور Formatism کو جنم دیتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں رومانیت جذبے کی آزادانہ سرمستی اور تخیل کی بے محابہ اڑان کی قائل ہے اسے رنگینی اور سرشاری عزیز ہے اسی لیے اس کے کردار گویا جذبے کے اُبلتے ہوئے آتش فشاں ہوتے ہیں جن کی نظریں ستاروں میں کھوئی ہوئی ہیں اور جن کے قدم کسی خواب ناک وادی

کے رہ نورد ہیں۔ مکالموں سے لے کر طرزِ عمل تک اور لباس سے لے کر فضا تک ہر شے پر رنگینی اور سرمستی کی لہر چھائی ہوتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام اصطلاحیں ادبی تنقید میں، اضافی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں سے کسی اصطلاح کا کوئی قطعی اور حتمی تصور نہیں جسے سو فیصدی کلاسیکی اور رومانی طرز کی سرحدیں ملتی ہیں اور ان دونوں میں کئی عناصر مشترک ہیں۔ کوئی ڈراما ایسا نہیں جسے سو فیصدی کلاسیکی یا سو فیصدی رومانی، مکمل طور پر معروضی یا مکمل طور پر داخلی کہا جا سکے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ کسی ڈرامے پر بحیثیت مجموعی کس رنگ کا غلبہ ہے ڈرامے کے واقعات، کرداروں اور مکالموں کی تفسیر اور توجیہہ نہیں بلکہ تفہیم تک میں بنیادی اہمیت اسی پیرائے یا طرز کی ہے کہ طرز کی تبدیلی سے الفاظ کے معنی اور ڈرامے کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ لفظوں کے معنی اور واقعات کی اہمیت تک بدل سکتی ہے۔ اس کی ایک مشہور اور معمولی سی مثال تو یہ ہے کہ:

''کیسے مزاج ہیں؟''

کے الفاظ کو کم سے کم چار پانچ طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے اور ادائیگی کے طریقے کا دار و مدار ڈرامے کے سیاق و سباق اور پیرائے پر منحصر ہو گا مثلاً:

''کیسے مزاج ہیں؟'' (رسمی طور پر مزاج پرسی کی جس میں خلوص اور دوستی کی گرمجوشی نہیں ہے)

''کیسے مزاج ہیں؟'' (پوچھنے والا بہت فکر مند تھا اور دردمندی اور دل سوزی سے بیمار کا حال دریافت کر رہا ہے)

''کیسے مزاج ہیں؟'' (آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' کے معنوں میں)

''کیسے مزاج ہیں؟'' (طنزیہ یعنی اب تو مزاج ٹھکانے آ گیا'') وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' کو پیشِ نظر رکھئے اگر اسے رومانی طرز میں کنیز ''انارکلی'' کی نارسائی کے المیے کے شکل میں پیش کیا جائے تو اس میں شہنشاہ اکبر کا کردار بڑی حد تک دو چاہنے والے دلوں کو جدا کرنے والے ''ولین'' کا کردار بن کر ابھرتا ہے اور اس کے مکالموں میں سازش اور مکاری کا رنگ ابھارا جا سکتا ہے لیکن اگر اسی ڈرامے کو شہنشاہ اکبر کے

خواب کی شکست کی شکل میں پیش کیا جائے جس کا مرکزی خیال یہ ہو کہ اکبر ہندستان میں اپنے خاندان کی حکومت مستحکم کرنے کے خیال سے ایک ایسے جانشین کی تربیت کرنا چاہتا تھا جو اس کے تصورات اور آدرشوں کی تکمیل کر سکے گا تو اس صورت میں اکبر ہیرو کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور شہزادہ سلیم اور انارکلی کا رومان اس جبر مشیت کا ایک جزو بن جاتا ہے جو اکبر کے خواب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے اس شکل میں اکبر کے مکالمے کلاسیکی المیے کے عناصر سے خالی نہ ہوں گے اس قسم کی مثالیں زیر نظر ڈراموں سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔

مکالموں کا طرز، آہنگ اور زبان اس لحاظ سے محض واقعات اور کرداروں سے متعین نہیں ہوتی بلکہ خود واقعات اور کردار اور ان کے ساتھ مکالمے بھی ڈرامے کے پیرائے سے متعین ہوتے ہیں۔ "مور پنکھی" کے مکالموں کی زبان لازمی طور پر "سچ کے زہر" کے مکالموں کی زبان سے مختلف ہوگی لیکن یہاں جو بات خاص طور پر عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ ہر پیرائے میں الفاظ کے معنی جداگانہ ہو جاتے ہیں۔ میلو ڈراما میں بات جس کے جو معنی ہوں گے وہ فارس ہوں گے اس لیے الفاظ کو محض لغوی معنی کے دائرے میں نہ برتا جا سکتا ہے، نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جس طرح شاعری میں بھی لفظ "ماورائے سخن بھی ہے ایک بات" ہے اسی طرح ڈرامے میں بھی لفظ محض تخیل کو جگانے اور اسے برسرِ کار لانے میں معاون ہوتا ہے۔ ڈرامے میں الفاظ اور جملوں کا مفہوم اسی میزان کے مطابق تولنا اور پرکھنا چاہیے۔

۳۔ شرائط

بلا شبہ ڈراما تحریری شکل میں ہدایات اور مکالموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اکثر مکالموں کے مجموعے کو ڈراما سمجھ لیا جاتا ہے اور اسی غلط فہمی کی بنا پر اکثر لکھنے والے مرکزی خیال کو مکالموں کے طرز میں ادا کرنے کو ڈراما سمجھنے لگتے۔

اسی غلط فہمی سے طویل مکالموں والے ڈرامے وجود میں آئے جنھیں مکالموں کی شکل کے افسانے یا ناول کہا جا سکتا ہے مگر ڈرامے کے ذیل میں انھیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

دراصل مکالمے تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتے اور اگر وہ ان تینوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ کرتے ہوں تو ڈرامے میں ان کی گنجائش نہیں۔

یا تو مکالمہ کہانی کو آگے بڑھاتا ہو۔

یا کردار کے کسی پہلو کو واضح اور اس میں تبدیلی یا ارتقا ظاہر کرتا ہو۔

یا فضا پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہو۔

یہ معیار ہر مکالمے کے ہر ٹکڑے کے لیے برتا جاسکتا ہے۔ لفاظی یا شاعرانہ تقریروں کی گنجائش اس طرح ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہر مکالمہ ہر کردار کے منہ پر نہیں پھبتا بلکہ ذرا مبالغے سے کام لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر شخص کی ایک نجی زبان ہوتی ہے اور اس کے الفاظ مخصوص ہوتے ہیں ڈراما نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر کردار کی قدرتی زبان یا نجی الفاظ تک رسائی حاصل کر سکے جس طرح ہر شخص کا طرز عمل مختلف ہوتا ہے اسی طرح اس کا لب ولہجہ، الفاظ اور محاورات، پیشہ ورانہ اصطلاحیں اور جملے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ڈرامے میں ہر شخص اپنے الفاظ اور اعمال سے پہچانا جاتا ہے یہی حال کچھ عملی زندگی میں بھی ہے مگر ڈرامے کی چھوٹی سی دنیا میں یہ شناخت زیادہ بے محابا اور جلد ہو جاتی ہے۔

اس لحاظ سے غور کیجئے تو ہر مکالمے کا رشتہ چار جہتی ہے۔ ایک طرف تو اس کردار کے مطابق ہونا چاہیے جو اسے بول رہا ہے، دوسرے اس صورت حال کے مطابق ہونا چاہیے جس میں اسے ادا کیا جا رہا ہے، تیسرے اس کا تعلق ڈرامے کے پیرائے سے ہونا چاہیے جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے چوتھے اپنے ڈرامے کے مکالموں کے مجموعی رنگ و آہنگ کی کڑی ہونا چاہیے۔

اس آخری شق کی وضاحت ضروری ہے۔ یوں تو پورا ڈراما ہی بظاہر مکالموں سے عبارت ہوتا ہے لیکن درحقیقت ان مکالموں کو مختلف حصوں، ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جنھیں Sequence کہا جاسکتا ہے۔ یہ ٹکڑا اپنا ایک مستقل بالذات مجموعی تاثر رکھتے ہیں اور یہ تاثر آگے چل کر پورے ڈرامے کے مجموعی تاثر میں ضم ہو جاتا ہے۔ ''مور پنکھی'' کے دوسرے منظر کے یہ مکالمے ملاحظہ ہوں جو ایک مخصوص سلسلے یا Sequnce کے ہیں۔

ا۔ غفور: صبح ہوگئی۔ ابھی تک سرفراز نہیں آیا۔

۲۔ بدری: سرفراز نہیں۔ سردار کہو۔ غفور۔ سردار۔

۳۔ غفور: ابھی نہیں۔ آج کی سوٹھائی کے بعد دیکھنا۔ کیسے سردار کہتا ہے۔

۴۔ بدری: کس طرف کا ارادہ ہے؟

۵۔ غفور: غفور کو نہیں جانتے بدری۔ میری پانچوں انگلیاں پر لوک کے بھید ہیں۔ وہ غلط فہمی پر ہیں جو غفور کو آزماتے ہیں۔

۶۔ بدری: مجھے معلوم ہے۔

۷۔ غفور: میں گھر پھونک کر رکھ دیتا ہوں اور کوئی میری چنگاری کو نہیں دیکھ سکتا۔

۸۔ بدری: اس کا مطلب؟

۹۔ غفور: مطلب بتائے گا فرقت—وہ دیکھو سامنے گھوڑے پر سرفراز آرہا ہے۔

۱۰۔ بدری: سوداگروں کے لباس میں تو واقعی مہاراجہ لگ رہا ہے۔

۱۱۔ غفور: اونہہ۔ مہاراجہ! تم سب لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہو۔ تم ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھتے ہو۔

اس کا ہر مکالمہ غفور کے دل کی آگ اور حسد کی جلن کو ظاہر کرتا ہے اور یہ اظہار ارتقا کی شکل میں ہوا ہے۔ پہلے غفور کو سرفراز کے نہ آنے پر بھروسہ ہے کیونکہ وہ اسے نالائق اور بزدل سمجھتا ہے اور اسے سردار کے بجائے سرفراز کہتا ہے اس طنز کو بدری کے مکالمے نے بے نقاب کر دیا ہے پھر غفور کا مکالمہ اس کی اپنی مجرمانہ خود اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے اور اگلے مکالمے میں وہ اپنے سازشی کردار کو بے نقاب کر دیتا ہے اگلا مکالمہ بدری کی خاموش تائید پا کر اور زیادہ آگ اُگلنے لگتا ہے اور مکالموں کے اس سلسلہ کو نقطۂ عروج تک لے جاتا ہے اور عین اس وقت جب سرفراز سامنے سے آتا دکھائی دیتا ہے مکالموں کا یہ سلسلہ اپنے آخری نقطے تک پہنچ جاتا ہے اور ڈرامائی حیرت کے عنصر پر ختم ہوتا ہے۔ ''مطلب، وقت بتائے گا۔'' سرفراز کو اسے دور سے دیکھنے کے بعد بھی غفور کے دل میں حسد کی آگ نہیں بجھتی۔ وہ سرفراز کی تعریف برداشت نہیں کر سکتا اور آخر بدری پر بھی چوٹ کرتا ہے جو سرفراز کی تعریف کر رہا تھا۔ ''تم سب چڑھتے سورج کے پجاری ہو۔''

ان مکالموں میں ایک اندرونی آہنگ ہے جو پورے سلسلے میں کارفرما ہے ہر مکالمہ اسی حساب

سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ بدری کے مکالمے گویا اس سلسلے کے موڈ کو زیادہ تیکھا بنانے کے لیے سہارے کا کام کر رہے ہیں اور اس موڈ کو نقطۂ عروج تک پہنچانے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس مجموعی تاثر کو سمجھ لینے کے بعد اس سلسلے Sequence کے ہر مکالمے کے باہمی رشتے کو سمجھنا ضروری ہے۔

مکالمے کے بارے میں اکثر یہ بات بھی فراموش کر دی جاتی ہے کہ افسانے کے جملے کے برخلاف ڈرامے کا ہر مکالمہ دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے درمیان ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ہر مکالمے میں دونوں شخصیتوں کی یعنی متکلم اور مخاطب کرداروں کی شخصیتوں کا عکس ہونا لازم ہے علاوہ بریں ہر مکالمہ رنگ و آہنگ، لہجے اور فضا کے لحاظ سے گویا ایک مسلسل اور مربوط نظم کے مصرعے کی طرح ہے اور جس طرح تغیر، تبدل اور رنگا رنگی سے موسیقی ترتیب پاتی ہے اور سنگیت کا لطف لَے۔ تان، سُر کی کے تنوع سے دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح مکالموں کا باہمی تعلق ان کے آہنگ، بلندی اور رفتار سے قائم ہوتا ہے مثلاً فرض کیجئے دو کردار آپس میں گفتگو کر رہے ہیں ایک کا مکالمہ آہستگی سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرا اس کا جواب تیزی سے اور بلند آواز سے دیتا ہے مخاطب شخص کا دوسرا مکالمہ اس تیزی کے مقابلے میں آہستہ رفتار بھی ہے اور نیچی آواز میں بھی۔ اب ان مکالموں سے ایک متنوع قسم کی صوتی تصویر تیار ہو جاتی ہے مکالموں کے کسی مخصوص سلسلے یا Sequence میں اس قسم کی متعدد اور رنگا رنگ تبدیلیوں کی گنجائشیں نکالی جا سکتی ہیں جن سے مکالموں کا صوتی تنوع سنگیت کی سی جمالیاتی اقدار کی کم و بیش ترسیل کر سکتا ہے۔

مکالموں کو خوبصورت بنانے کے کئی طریقے ہیں یہاں ان کا ذکر یوں بھی ضروری ہے کہ مکالمے لکھتے وقت بھی ان طریقوں کو پیش نظر رکھنا مفید ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ان طریقوں سے بحث کرنا مناسب نہیں جن کا تعلق ڈرامے کی تحریری شکل کے بجائے تھیٹر یا ڈرامے کی پیش کش کے آرٹ سے ہے مثلاً مکالمے بولتے وقت سانس کا صحیح استعمال، مکالموں کو صحیح جگہ پر توڑنے کا ہنر، سانس روکنے اور مکالموں کے درمیان سانس لینے کا طریقہ یا مکالمہ بولتے وقت حلق، تالو اور زبان کی مدد سے صحیح مخارج کا تعین۔ یہاں صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہر مکالمے میں ایک لفظ کلیدی اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے شاذ و نادر ایسے مکالمے بھی ہوتے ہیں جن میں دو الفاظ کلیدی یا مرکزی ہوتے ہیں باقی الفاظ محض سیاق و

سباق فراہم کرتے ہیں۔ اس لیے مکالمہ نگار کے لیے مناسب ہے کہ ہر مکالمے میں اس کلیدی اور مرکزی لفظ کی نشان دہی کسی نہ کسی شکل میں کردے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی ڈرامے کی تفسیر، توجیہہ اور پیشکش مختلف ڈھنگ سے کی جاسکتی ہے اور اسی اعتبار سے ہر مکالمے کے کلیدی لفظ کو نشان زد نہیں کرسکتا ورنہ وہ پروڈیوسر کے حق تو جیہہ میں غیر ضروری طور پر خلل انداز ہوگا ہاں اتنا ضرور کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہر مکالمے کا ہر لفظ اس ایک کلیدی لفظ کی طرف رہبری کرے اور اس کا اندازہ عام قاری سے لے کر پروڈیوسر تک لگا سکے۔ مثال کے طور پر ایک جملے کو لیجیے اس جملے کو جذبات یا کسی قسم کے تاثر کے بغیر ادا کرتے ہوئے بھی صرف مختلف کلیدی لفظ پر زور دیتے سے جملے کا مفہوم مکمل طور پر بدل جائے گا۔ جملہ یہ ہے:

کل رات ایک زلزلہ آیا— (یعنی آج یا پرسوں نہیں آیا تھا کل آیا تھا۔)

کل رات ایک زلزلہ آیا— (یعنی کل دن میں نہیں رات کو زلزلہ آیا تھا)

کل رات ایک زلزلہ آیا— (یعنی زلزلہ صرف ایک بار آیا تھا دو بار نہیں)

کل رات ایک زلزلہ آیا— (یعنی زلزلہ آیا تھا طوفان نہیں تھا)

اسی طرح ہر جملے میں کون سا لفظ ایسا ہے جس پر زور دیا جاتا ہے یہ بات لکھنے والے کے ذہن میں بھی واضح ہونی چاہیے اور پروڈیوسر اور اداکار کے ذہن میں بھی۔ اس وضاحت کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ مکالموں کی ادائیگی میں زیادہ وضاحت اور صفائی پیدا ہو جائے گی اور جملے کے باقی تمام الفاظ بھی زیادہ صراحت اور قطعیت کے ساتھ ادا ہوں گے۔ اس سلسلے کی دوسری بات یہ ہے کہ مکالمے کی تحریری شکل کسی نہ کسی حد تک اس کی ادائیگی پر اثر انداز ہوتی ہے مثلاً عشقیہ اور خواب ناک مکالمے بہت اونچی آواز میں نہیں بولے جاسکتے یہی صورت رجزیہ یا رزمیہ مکالموں کی ہے جن کو نرمی اور آہستگی سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے مکالمہ نویس کے ذہن پر بات واضح ہونی چاہیے کہ وہ ان مکالموں کی ادائیگی کس انداز میں چاہتا ہے۔ مکالموں کی ادائیگی کے تین بنیادی عناصر ہیں۔

لہجہ Tone

آہنگ Pitch

سُر Volume

اور اسی ضمن میں آخری عنصر رفتار کا بھی ہے جو شاید پہلے تین عناصر کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہے۔

لہجے کی بات پہلے ہو چکی ہے۔ لہجے کی تبدیلی واقعات اور کردار کے مطابق ہوتی ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک پروڈیوسر کی اپنی سوجھ بوجھ اور اداکار کی ذہانت اور تجربہ کاری سے ہے لیکن اکثر Pitch اور Volume کو تھیٹر کے باہر کے لوگ ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ دونوں بالکل الگ تصورات ہیں۔

آواز کی بلندی اور آہستگی وہ ہے جس کے ذریعے سے آواز کا سُر اونچا ہوتا ہے لیکن مکالمے کا دور تک سنائی دیا جانا یا نہ دیا جانا صرف اونچے سُر پر منحصر نہیں ہے جس طرح موسیقی میں پنچم سُر بھی استعمال ہوتے ہیں اور مدھم بھی سنائی دیتے ہیں البتہ دونوں کی آواز میں فرق ہے۔ اس کے برخلاف Pitch کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سرگوشی میں بولے ہوئے الفاظ تھیٹر ہال کے آخری کونے تک سُنے جاتے ہیں اور سُنے جانے چاہئیں ظاہر ہے کہ سرگوشی میں آواز دھیمی اور سُر مدھم ہوگا مگر مکالمے کا Pitch ایسا ضرور ہوگا جو آواز کو آخری صف کے دیکھنے سننے والوں تک پہنچا دے۔ اسی لیے تھیٹر کی دنیا میں سبھی کام کرنے والوں کے لیے پہلا سبق یہی ہوتا ہے کہ وہ "اس بہری عورت تک اپنی بات پہنچانے کی کوشش کریں جو ہال کی آخری صف میں بیٹھی ہے۔" آواز صرف اونچے سُر سے نہیں پہنچائی جا سکتی۔ ہر اداکار کی سرگوشی کی بھی رسائی اس آخری صف والی بہری عورت تک ہونی چاہیے۔

مکالموں کے ضمن میں اب دو باتیں اور رہ گئیں۔ ایک مکالمے یا مکالموں کے درمیان لہجہ، آہنگ اور سُر کی تبدیلی سے متعلق ہے اور دوسری مکالموں کے درمیان خاموشیوں کے استعمال سے۔ مکالمہ محض ایک سُر نہیں آرکسٹرا بھی ہو سکتا ہے اور وہ مختلف آہنگوں اور سُروں سے عبارت ہوتا ہے۔ ہر انسان کی آواز میں لاتعداد نشیب و فراز، مدھم اور پنچم کی ان گنت طرزیں ہوتی ہیں لیکن عام طور پر بے سوچے سمجھے ہم سے ہر ایک شخص صرف ایک آواز یا آہنگ ہی کو زندگی بھر استعمال کرتا رہتا ہے اور اپنی آواز اور آہنگ کے دوسرے طرزوں کو نہیں برتتا۔ اس کے برخلاف اداکار ہی کو نہیں مکالمہ نویس کو بھی شعوری طور پر کوشش کرنی چاہیے تا کہ مکالمے تنوع سے

مالا مال اور رنگینی سے آراستہ ہوسکیں اس کی کلاسیکل مثال شیکسپیئر کے ڈرامے، جولیس سیزر، میں انٹونی کی تقریر ہے جو ایک آہنگ سے شروع ہوتی ہے کیونکہ وہ مخالف مجمع کو خطاب کر رہا ہے اور بمشکل انھیں اپنی بات سننے پر راضی کر پا رہا ہے اور آہستہ آہستہ جب مجمع اس کی تقریر کے سحر میں آجاتا ہے تو تقریر کا آہنگ بدلتا جاتا ہے اور آخر میں پورے ڈرامائی عروج پر پہنچ جاتا ہے بلا تشبیہہ اس کی چند مثالیں زیر نظر ڈراموں میں بھی ملیں گی یہاں طوالت کے خیال سے ان کا ذکر حذف کیا جاتا ہے۔

مکالموں میں سب سے اہم عنصر بلیغ خاموشیوں کا ہوتا ہے۔ یہ خاموشیاں مکالموں کے درمیان مختصر وقفے کی شکل میں بھی آسکتی ہیں اور خود مکالموں کی ادائیگی کی رفتار میں بھی ظاہر ہوسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے رموز واوقاف ڈرامے کے مکالموں میں نہایت ضروری ہیں خاموشیوں کے لیے مناسب جگہ یا مکالموں میں مناسب جگہ پر توڑنے یا اس کے لہجے میں تبدیلی کرنے یا اسے وقتی طور پر ادھورا چھوڑنے یا کسی دوسرے کے مکالمے کو بیچ سے کاٹنے کے لیے بھی اشارات کا استعمال لازم ہے لیکن اس شکل میں تحریری ڈراموں کے مسودے شائع کیے جائیں تو شاید پڑھنے والوں کو مزا نہ آئے۔ البتہ اسٹیج کے لیے مسودات تیار کرنے میں ان کا اہتمام ضروری ہے۔ مکالمے لکھنے والوں کے ذہن میں اس قسم کی بلیغ خاموشیوں کا محل وقوع اور ان کا مناسب استعمال واضح ہونا چاہیے تاکہ مکالموں کے اسلوب و آہنگ کے تعین میں بھی انھیں پیش نظر رکھا جاسکے۔

۴۔ اظہار اور ترسیل

مکالموں کے بارے میں کسی قدر تفصیل اس لحاظ سے بھی ضروری تھی کہ تحریری ڈرامے کے بنیادی عناصر یہی ہیں۔ ان کے ذریعے ڈراما اپنے بنیادی مقصد ترسیل میں کامیاب ہوتا ہے شاید ڈرامے سے زیادہ فن کے کسی دوسری صنف کے لیے ترسیل اس قدر واضح اور لازمی شرط کی حیثیت سے سامنے آئی ہو۔ کوئی معقول ڈراما نگار ڈرامے کو محض اپنے باطن کا ''اظہار محض'' کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہو یہاں اظہار اور ترسیل کا لازمی رشتہ ہے اور ترسیل کے کامیابی کے ساتھ سرانجام پانے کے لیے مختلف وسائل اظہار، واقعات، کردار، مکالمے، فضا استعمال کیے جاتے ہیں۔

دراصل اظہار، ترسیل اور ابلاغ کی تینوں اصطلاحوں کے خلط مبحث کی بنا پر مختلف غیر متعلق اور پیچیدہ بحثیں پیدا ہوئی ہیں۔ ڈرامے میں ان تینوں کی شکلیں زیادہ واضح طور پر سامنے آجاتی ہیں اظہار شاعری میں براہ راست ممکن ہے کیونکہ وہاں شاعر اپنے تصورات کو براہِ راست داخلی لب و لہجے کے ساتھ، آپ بیتی کے انداز سے بیان کرسکتا ہے وہ زندگی کی مخصوص واقعات کو بھی تعمیم کے ساتھ مجرد تصورات کی شکل دے سکتا ہے اس دوران اسے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ وہ مخصوص اپنے دل کی بات کہہ رہا ہے اور وہ اپنے پڑھنے اور سننے والوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہے وہ اپنی دنیا آپ ہے۔

ڈرامے کی دنیا میں یہ بھرم قائم نہیں رہتا۔ ڈراما آپ محض اپنے لیے نہیں لکھتے قلم اٹھاتے ہی آپ کو مختلف کرداروں کو ڈھالنا پڑتا ہے اور ان میں سے اکثر کردار آپ کی تخلیق ہونے کے باوجود آپ کی ذات سے الگ اپنا ایک وجود بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے اظہار کو ترسیل کا پیرایہ دینا لازمی ہے ڈرامے میں براہ راست ابلاغ کی گنجائش کم ہے اور براہِ راست ابلاغ کے لیے اظہار اور ترسیل کے وسیلے عمل میں لانا ہوتے ہیں۔ یہی فن کا بنیادی رمز بھی ہے۔ ڈراما نگار زندگی کے عملی تجربات کی روشنی میں کسی ایک تصور یا مرکزی خیال تک پہنچتا ہے جو اس کے مجموعی نظریۂ حیات کا جزو ہوتا ہے لیکن وہ اس تصور یا مرکزی خیال کا جوں کا توں پیش کرنے کے لیے ڈرامے کا وسیلہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اسے اس مرکزی خیال کی بنیادی اقدار کی شکل دینی ہوگی اور پھر واقعات کردار اور فضا اور ڈرامائی کشمکش کے ڈرامے ان اقدار کی ترسیل کرنی ہوگی۔ ڈرامے کا مرکزی خیال کیا ہے؟ اس کا فیصلہ کسی کردار کے کہے ہوئے الفاظ یا مکالموں سے نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ان مکالموں کے پیچھے سموئی بنیادی کشمکش اور آویزش سے ابھرتے ہوئے تاثر سے ہوگا۔

اظہار اور ترسیل — اور ابلاغ (بشرطیکہ اسے محض پروپیگنڈے کا مترادف نہ سمجھا جائے)۔ ان تینوں اصطلاحوں کا سنگم ڈرامے کے فن میں جس خوبصورتی سے ہوتا ہے اس کی نظیر شاید ہی کسی دوسری صنف میں ملے اس ترسیلی عمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ترسیل کی نوعیت کو واضح طور پر ذہن نشین کرلیا جائے۔ عام خیال ہے کہ ترسیل محض کسی خیال یا نظریے کی ہوتی ہے اور اس کی نوعیت ابتدائی درجوں کی نصابی کتابوں کے ان سوالوں کی سی ہوتی ہے جن میں کہانی سے حاصل ہونے والے سبق کے بارے میں استفسار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈرامے میں مجرد خیال یا

نظریے کا وجود نہیں خیال، واقعات، کردار اور فضا کی شکل اختیار کرتا ہے لہٰذا کہنا درست نہیں کہ ان وسائل کے ذریعے خیال یا نظریے کی ترسیل کی جا رہی ہے بلکہ خیال اور نظریہ ڈرامے کی دوسری تمام تر اقدار کا ایک جزو بن کر سامنے آتا ہے اس لیے ترسیل کسی خیال نہیں بلکہ اقدار کی ہوتی ہے اور یہ اقدار جس ایک مرکز پر مجتمع ہوتی ہیں وہ جمالیاتی قدر کی ترسیل ہی ڈرامے کا مقصد ٹھہرتی ہے اور اس جمالیاتی قدر میں ڈراما نگار جس حد تک گہری بصیرت اور فکری، جذباتی اور ڈرامائی اقدار کو کامیابی سے سمو سکے گا اس کا آرٹ اتنا ہی بالیدہ اور بلند ہوگا۔

۵۔ان ڈراموں کے بارے میں

ان معروضات کی روشنی میں زیرِ نظر ڈراموں کے بارے میں کچھ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اس میں چھ ڈرامے شامل ہیں ان کا زمانہ تصنیف ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۲ء تک پھیلا ہوا ہے یوں تو ان کی حیثیت محض خاکوں کی سی ہے جن میں رنگ آمیزی کی گنجایش بھی ہے اور ضرورت بھی مگر اہلِ نظر شاید اپنے تخیل اور بصیرت سے ان ڈراموں کی فضا تک پہنچ سکیں گے۔

یہ سبھی ڈرامے مختلف نوعیت کے ہیں ان میں ایک تاریخ پر مبنی ہے (داراشکوہ) ایک نیم تاریخی (مورپنکھی) اور ایک سراسر تخیلی (سچ کا زہر) موضوعات کے اعتبار سے بھی یہ سب الگ الگ ہیں اصناف ڈراما کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع ہے لیکن غور کیجیے تو ان سب ڈراموں میں فکر کی ایک ہی زیریں لہر کارفرما ہے۔

زندگی ہمیں صاف اور کوری سلیٹ کی طرح نہیں ملتی۔ جب ہم دنیا میں آتے ہیں تو نہ تو یہ آمد اپنی مرضی سے ہوتی ہے اور نہ جس دنیا میں ہم قدم رکھتے ہیں اس میں ہماری پسند یا ناپسند کو کوئی دخل ہوتا ہے انسانی وجود گویا زمان اور مکان کی دُہری زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے نہ اسے اس پر قابو ہے کہ وہ کس دور میں پیدا ہو نہ اس پر قابو کہ کس ملک، کس قبیلے، کس ماحول اور کس خاندان میں جنم لے پھر یہی نہیں اس کو اپر بھی اختیار نہیں کہ اس کا سابقہ کن لوگوں اور کیسے کیسے لوگوں سے ہوگا جن لوگوں کے درمیان وہ اپنے کو گھرا ہوا پاتا ہے ان میں سے ہر شخص اپنی آپ ایک الگ کائنات ہے۔ یہ الگ الگ کائناتیں اپنے اپنے محور پر گھوم رہی ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کی طرف کھنچتی ہیں

کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں اور کبھی بے نیازانہ گزر جاتی ہیں گویا ہماری آپ کی زندگی کی یہ مختصر سی مدت بھی ایک طرح کا نظام شمسی ہے جس میں نہ ہمارا آنا اپنی مرضی سے ہوا ہے نہ جانا اپنی خوشی سے ہوگا نہ ساتھی اپنی پسند سے چنے گئے ہیں نہ دشمن۔

ایک طرف تو یہ بساطِ زندگی ہے جو ہمارے وجود سے پہلے ہی سے سجی ہوئی تھی اور جس میں خیام کے تصور کے مطابق گویا ہم ایک مہرے کی طرح رکھ دیے گئے دوسری طرف ہمارے وجود کی اندرونی خلش ہے جو اس باہری دنیا سے اپنے رشتے کی نوعیت متعین کرنے کے لیے کوشاں ہے، حلیفانہ یا حریفانہ یا کچھ اور۔ مگر اس رشتے سے دامن کشاں گزرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے جو سماج ہمیں ملا ہے اس کے تصورات اور اقدار کے آئینہ خانے میں ہماری جگہ کہاں ہے؟ ہماری ہستی کا مدعا اس بساط کے ٹیڑھے خانوں سے کس طرح برآمد ہوتا ہے؟ یعنی فرد —— انفرادی طور پر اور اجتماعی زندگی کا جزو بن کر۔ گردوپیش میں کیا معنویت رکھتا ہے؟ وہ ایک بے بضاعت قطرے کی طرح اس ریل پیل میں گم ہو جائے اس رہتی بہتی سیل بے پناہ میں کھو جائے یا ''حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز'' کا رجز بلند کرے اور سنگین حقیقتوں کی بے رحم دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر جان دے دے۔ اس فرصت مختصر میں ہر کردار کو اپنی معنویت کی تلاش کا معرکہ درپیش ہے گو اس کی نوعیتیں مختلف ہیں اسی معنویت کو اکثر Fulfilment یا تکمیل ذات کے نام سے پکارا گیا ہے اور فرد (اور ڈرامے) المیہ یا طربیہ ہونے کا دارومدار اس پر نہیں کہ آخر میں وہ جان کھو دیتا ہے یا فتح یاب ہو کر مسکراتا ہوا اسٹیج سے باہر نکل آتا ہے بلکہ اس پر ہے کہ جسے اس نے حاصل زندگی سمجھا تھا وہ تصور یا وہ معنویت سے نصیب ہوئی یا نہیں بھگت سنگھ کے لیے نشاط کا اعلیٰ ترین لمحہ وہ تھا جب وہ پھانسی کے تختے پر ''انقلاب زندہ باد'' کا آخری نعرہ لگاتے ہوئے جان دے رہا تھا دارا شکوہ کے لیے نشاط کا آخری لمحہ وہ تھا جب وہ غربت، قید اور رسوائی کے درمیان گھرے ہوئے ہونے پر بھی وہ بھکاری کو اپنی دستار بھیک میں دیتا ہے۔

دراصل باطنی اور بیرونی دنیاؤں کی اسی باہمی رشتے کی تلاش ان ڈراموں کا بنیادی موضوع ہے اسی لیے ان ڈراموں میں نہ خارج سے دامن بچایا جاسکا ہے نہ باطن سے۔ سچ بھی یہ ہے کہ یہ اصطلاحیں خارجیت اور داخلیت کی اصطلاحوں کی طرح فرضی ہیں انسان اپنے باطن کا

عرفان خارج ہی سے پاتا ہے دوسرے نہ ہوں تو اپنے آپ کا احساس بھی نہ ہوں، خارج نہ ہو تو انسان اپنے اندر کی دنیا کو بھی دیکھ نہ پائے۔ سارتر کے ڈرامے کا ایک کردار کہتا ہے "دوزخ دراصل دوسرے آدمی کا نام ہی دوزخ ہے یعنی اپنے علاوہ دوسرا وجود، اس کے مطابقت اور اس کی مخالفت ہی دوزخ ہے لیکن یہی دوزخ جنت کا دوسرا نام بھی ہے۔ کیونکہ اسی دوسراہت میں زندگی کی اکائی اور اس اکائی کا عرفان پوشیدہ ہے۔ کم سے کم اتنا عرفان جتنا ہمارے بس میں ہے!

پھر ان صورت حال کی سب سے بڑی حقیقت ہے تغیر، تبدیلی اور ارتقا۔ نہ باطن ایک مرکز پر ٹھہرتا ہے نہ خارج۔ ہر لحہ تغیر پذیر زندگی خود بھی بدلتی ہے حالات کو بھی تبدیل کرتی ہے اور ہم سب پر بھی اثر انداز ہوتی ہے ہمارے معتقدات، افکار، جذبات کا رخ، اقدار کا رنگ روپ، چاہتیں اور نفرتیں سبھی کچھ بدل جاتا ہے وقت ہر لحہ ایک نئے مضمون کی کہانی لکھتا رہتا ہے جو پچھلی تحریروں ہی کو نہیں نوشتۂ تقدیر تک کو منسوخ اور کالعدم قرار دینے لگتی ہے اور ایسے لحوں میں وقت کے ہاتھوں بدلتی ہوئی فکری، جذباتی، واقعاتی اور اقداری دنیا غیر محسوس طریقے پر انوکھے اجنبی افراد اور کرداروں کو اپنا وسیلہ بنالیتی ہے بھولی بھالی لڑکی "مور پنکھی" کو کیا خبر تھی کہ وقت اسے اپنا وسیلہ بنائے گا اور وہ مجرموں کے سخت و سیاہ سینوں میں انسانیت اور رحم کی ایک ہلکی سی شمع روشن کرسکے گا۔ جس کی روشنی اس کو ہی نہیں خود مجرم کو بھی جلا ڈالے گی، اور پھر بھی نہ بجھے گی۔

وقت کے ہاتھوں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کے دائرے میں صرف باہری دنیا ہی نہیں بلکہ اندرونی دنیا بھی آتی ہے اور اس تبدیلی کی نوعیت ارتقا کی بھی ہوسکتی ہے انسان ہر لحہ ترقی یا تنزل کی گرفت میں ہے اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک زمانے کے ہمارے عقیدے اور اعمال کچھ مدت بعد بے محل اور مہمل معلوم ہونے لگتے ہیں اور انسان اپنے ماضی کی اپنی ہی شخصیت سے دست و گریباں نظر آتا ہے جیسے کسی نے آئینے کو اُلٹ دیا ہو اور سارے عکس الٹے ہوگئے ہوں۔ اس ارتقا کے ہاتھوں کرداروں میں عجیب و غریب گتھیاں پیدا ہوتی ہیں پھر ان اندرونی تبدیلیوں اور کردار کے باطنی ارتقا کے ساتھ ساتھ خارجی دنیا میں تبدیلی اور ارتقا کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور جب یہ دونوں بدلتے ہوئے روپ ایک دوسرے سے ملتے یا ٹکراتے ہیں تو عجیب و غریب مرقع بناتے اور رنگا رنگ آئینہ خانے سجاتے ہیں۔ تبدیلی اور ارتقا کے محور پر گردش کرتی ہوئی یہ داخلی اور خارجی

دنیائیں اوران کی باہمی آویزش اورآویزش ہی سے ان ڈراموں کا تانابانا بنایا گیا ہے اس کی ایک مثال ''شکست'' ہے اور دوسری ''کچلا ہوا پھول''، ''شکست'' کا بدصورت ڈاکٹر (جس کا مسخ شدہ چہرہ خود تہذیب انسانی کی درندگی اور خونخواری کا سمبل ہے) ایک بے آسرا لڑکی کو اپنا جذباتی سہارا بنانا چاہتا ہے اورنہیں جانتا کہ یہ سہارا خود اپنی آپ دنیا ہے اوراس کی آرزوئیں اور تمنائیں سہارا دینے والے کی آرزوؤں اور تمناؤں سے اس طرح ٹکرائیں گی کہ سارے سہارے ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔

''کچلا ہوا پھول'' قدروں کی شکست وریخت کا مرقع ہے عورت پہلی بار سامان آرائش بننے کے بجائے عام انسان، عام فن کار کا وجود چاہتی ہے اوراس جدوجہد میں شہید ہو جاتی ہے کیونکہ بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ہوس ناک مرداور عیاش طبع سماج کا ضمیر نہیں بدل سکا اوران دونوں کے ٹکراؤ سے نئی جدوجہد کا کارواں ٹوٹ کر بکھر کر رہ گیا۔

یہ اندرونی تبدیلی باہری تبدیلی کے مقابلے میں خاصی سست رفتار ہوتی ہے اوراسی لیے بیسویں صدی میں اٹھارہویں صدی کے ذہن اور ضمیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ ان ذہنوں اور ضمیر کی آلائشیں زیادہ دن زندہ رہتی ہیں۔ ان کی اچھائیاں اور خوبیاں بہت جلد ماند پڑ جاتی ہیں۔ آج ہی کی دنیا کو لیجیے۔ ہندوستان میں کتنی صدیاں ایک ساتھ سانس لے رہی ہیں اگر کبھی ایسا ہو کہ سچائی ایک متعدی مریض بن کر پھوٹ پڑے اور ہر شخص جبلت سے مجبور ہو کر محض سچ ہی بولنے لگے تو ہمارے آپ کے سماج میں کیسی قیامت آجائے۔ اس عالم آشوب کی ایک جھلک ''سچ کا زہر'' میں نظر آئے گی لیکن اس کا اختتامیہ اس لحاظ سے غور طلب ہے کہ خود مصنف اور محتسب بھی اندرونی اقدار کی تبدیلی کا ساتھ نہ دے پانے کی پاداش میں ایک ادنیٰ سی گھریلو سچائی کا مقابلہ نہ کر سکا۔

''خوابوں کا سوداگر'' کی کشمکش یوں تو دلّی کے ایک بس اسٹاپ کی کہانی ہے مگر اس کے پیچھے وہی باطنی اور باہری تبدیلیوں کا ٹکراؤ ہے۔ جو نرمل کی ذات میں ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے اور عین اس وقت جب وہ زندگی کے لیے وجہ جواز پانے میں کچھ کامیابی حاصل کرنے لگتا ہے حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔

''خوابوں کا سوداگر'' میں علامتوں کا استعمال ذرا زیادہ واضح طور پر ہوا ہے اس لیے اس

کے مکالموں کے دُہرے معنی ، اس کا تمثیلی پیرایہ، اس کے الفاظ کا ایہام شاید اس مجموعے کے دوسرے ڈراموں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے بس کا سفر گویا انسانی زندگی کا سفر بن جاتا ہے اور زندگی کی طرف مختلف رویے مختلف کرداروں اور حادثوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں لیکن سمبالزم کا استعمال دوسرے ڈراموں میں بھی ہوا ہے گو اتنا واضح نہیں ہے۔ ڈرامے کی ظاہری کہانی کے پیچھے ایک تمثیلی رو بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے جس کی وضاحت اس لیے نہیں کی جاتی کہ بقول شاعر:

کہا جو کچھ تو ترا حسن ہوگیا محدود

کوئی تحریری ڈراما مکمل اور حتمی نہیں ہوتا۔ ریڈیو ہو اسٹیج ہو، ٹیلی ویژن ہو یا فلم۔ ہر ذریعۂ اظہار کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور کوئی تحریر بھی ان تمام ذرائع یا ان میں سے کسی ایک ذریعے کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ ہر ڈراما ریہرسل میں نکھرتا اور سنورتا ہے، ہر مکالمہ ادائیگی کے ساتھ زیادہ سڈول اور رواں ہوتا جاتا ہے واقعات اور کرداروں کے اعمال وحرکات میں جھول لکھنے میں محسوس نہیں ہوتا عملی پیش کش کے وقت صاف ظاہر ہوجاتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہر ڈراما گروپ کی اپنی کمزوریاں اور خوبیاں ہوتی ہیں اور ان ہی کے پیش نظر ڈرامے کی شکل میں ردو بدل ناگزیر ہوجاتی ہے۔ یہ ڈرامے بھی اس قسم کی ترمیموں سے مستثنیٰ نہیں ہیں اس لیے یہ ڈرامے محض پڑھنے والوں کی نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ ڈراما پیش کرنے والے اور تھیٹر میں کام کرنے والوں کی نذر ہیں۔

ڈی۔ ۷۔ ماڈل ٹاؤن۔ دہلی نمبر ۹ (ڈاکٹر) محمد حسن

یکم نومبر ۱۹۷۴ء

شکست

(پانچ مناظر کا ایک المیہ)

کردار:

فرخ—ایک ماہر فن ڈاکٹر عمر ۳۵ سال

پرکاش—ایک دوست جو ہم عمر ہے۔

نیلم—ایک نوجوان اندھی لڑکی

نوکر—بوڑھا وفادار ملازم

زمانہ: موجودہ—وقت: صبح ۱۰ بجے سے پہلے

فرخ کے کمرے کے باہر برآمدے میں پرکاش کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور نوکر سے گفتگو کر رہا ہے۔

(ستار پر غمگین نغمہ دور سے آ رہا ہے آواز قریب سے آتی جاتی ہے)

پرکاش: یار عجب اناڑی سے پالا ہے۔ کیوں مسٹر تم ڈاکٹر کے یہاں کب سے نوکر ہو۔

نوکر: سرکار۔ بہت دن گزر گئے۔ آپ ذرا دیر ٹھہر جائیں—ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں۔

پرکاش: (بات کاٹ کر) کیا ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب لگا رکھی۔ تم جانتے نہیں ہو۔ بڑے میاں وہ میرا لنگوٹیا یار ہے۔ اس سے کہو فرخ تمھارا باپ پرکاش آیا ہے۔ پھر دیکھنا دوڑا ہوا چلا آئے گا۔

نوکر: نہیں بابو جی نہیں۔

پرکاش: بھئی کمال ہے۔ خود بھی جا کر خبر نہیں کرتے، مجھے بھی کمرے میں نہیں جانے دیتے۔ کیا مذاق ہے۔ میرا یار ہے ڈاکٹر فرخ۔ ساتھ اسکول میں کھیلے ہیں۔ ساتھ میڈیکل کالج میں دھما چوکڑی مچائی ہے۔ اب اتنے دنوں میں ملنے آیا ہوں اس سے، اور تم تھانے دار بن

کے کھڑے ہو گئے۔ چلو مجھے اس کا پتہ دو۔ میں اپنے آپ بھگت لوں گا۔

نوکر: بابو جی ذرا دیر اور۔

پرکاش: میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہروں گا۔

نوکر: آپ ستار کی آواز سن رہے ہیں۔

پرکاش: ہاں ستار کی آواز سن رہا ہوں پھر—؟

نوکر: صاحب جب تک یہ ستار کی آواز بند نہیں ہوتی اس وقت تک میں کمرے میں نہیں جاسکتا۔

پرکاش: خوب! ستار تو فرخ ہمیشہ سے بجاتا ہے۔

نوکر: اور بجاتے ہیں تو اس بے خبری سے بجاتے ہیں کہ انھیں تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ اس وقت وہ اپنے آپے میں نہیں ہوتے۔ اس وقت ان سے کچھ کہنا بیکار ہے۔

پرکاش: خوب بجاتا ہے ظالم۔ اچھا میاں تم جاؤ میں انتظار کروں گا۔

نوکر: اچھا بابو جی۔ میں ابھی خبر کرتا ہوں۔ آپ ذرا دیر بیٹھو۔

پرکاش: تم جاؤ، (جانے کی آواز) بلا ٹلی۔ کمبخت اڑ گیا تھا۔ میں خود کمرے میں جا کر دیکھوں گا یہ لاٹ صاحب کیا کر رہے ہیں۔

(ستار پر بڑا طوفانی راگ چھڑا ہوا ہے۔ عین اس وقت جب نغمہ اپنے شباب پر پہنچتا ہے۔ پرکاش دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سجا ہوا کمرہ۔ اس کے اندر ایک طرف قالین پر فرخ بیٹھا ہوا ستار بجا رہا ہے) فرخ! (چیخ کر) فرخ (ستار ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے)

فرخ: کون ہے۔

پرکاش: میں ہوں پرکاش۔

فرخ: (سوچتے ہوئے) پرکاش (ایک دم پرکاش کی طرف پورا چہرہ گھما کر دیکھتا ہے)

پرکاش: یہ تمھیں کیا ہوا فرخ۔

فرخ: (طنزاً اور درد کے ساتھ) میرا چہرہ بڑا ہیبت ناک ہو گیا ہے۔ تمھارا خوبصورت اور نوجوان

دوست بڑا بدصورت ہو گیا ہے۔ جاؤ اس سے منہ موڑ کر چلے جاؤ۔

پرکاش: مجھے معاف کر دو دوست ـــ

فرخ: تم نے کوئی گناہ نہیں کیا پرکاش ـــ میں بدصورت ہوں میرے چہرے پر زخم کا لمبا سا نشان ہے۔ میرے چہرے کا ایک حصہ جل کر ایسا ہیبت ناک ہو گیا ہے کہ جو دیکھتا ہے چیخ اٹھتا ہے۔ یہ سب باتیں تو اس دن معلوم ہو گئی تھیں جب میں لڑائی کے میدان سے لوٹ کر آیا تھا۔ ملٹری اسپتال سے نکلتے ہی آئینے نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔

پرکاش: مگر یہ سب کیسے ہوا فرخ۔

فرخ: بہت معمولی سی بات ہے۔ جنگ کی خندقیں، بم کا خوفناک دھماکہ اور ایک غریب بے آسرا سپاہی۔ ہو سکتا تھا میرے بدن کے چیتھڑے اڑ جاتے مگر بدقسمتی سے زندہ بچ گیا۔ یہ جھلسا ہوا چہرہ سیاہ داغ زخموں کے بھیانک نشان ـــ یہ ہے تمھارا فرخ۔

پرکاش: یار چھوڑو بھی ان باتوں کو۔ میں تو دن رات کے کام کاج کے چکر سے بور ہو گیا، سوچا چلو اپنے یار سے مل آئیں۔ پرانے زمانے کی باتیں کریں گے بھگوان کی قسم کیا جوانی گزاری ہم لوگوں نے۔ یاد ہے کیسا رومانٹک زمانہ تھا۔ ثریا کی یاد میں رات کو موم بتی کی دھندلی روشنی میں میاں فرخ ستار بجاتے تھے ـــ اور میں نہ جانے کیا اُلٹے سیدھے گیت گایا کرتا تھا۔ (ہنستا ہے) کیا غزل تھی یار۔

"کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"

فرخ: ہاں پرکاش۔ میرے لیے اب پرانی یادوں کے سوا سب کچھ جل کر بھسم ہو گیا ہے۔ بس وہی موم بتی کی دھندلی روشنی ہے۔ ستار ہے اور بیتی ہوئی باتوں کے گجرے ہیں۔

پرکاش: ثریا کی کچھ خیر خبر ہے۔

فرخ: نہیں۔

پرکاش: تم دونوں نے تو بیاہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا یار۔

فرخ: تم سمجھتے کیوں نہیں پرکاش۔ اس بھیانک چہرے کے ساتھ ثریا کے پاس شادی کا پیغام لے کر جاتا۔

پرکاش: لیکن دنیا میں خوبصورت چہرہ ہی تو محبت کا پاسپورٹ نہیں ہے۔

فرخ: جب میں اسپتال کی میز پر مردوں کی چیر پھاڑ کرتا ہوں ان کی پسلیوں کی ہڈیوں کو الگ کر کے گنتا ہوں۔ ان کے گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کو کاٹ کاٹ کر دیکھتا ہوں تو میں بھی سوچتا ہوں یہ خوبصورتی کیا ہے۔ یہ حسن اور اس کے چرچے کیا ہیں۔ یہ مسکراہٹوں کے جال یہ دل فریب لب ورخسار یہ سب مجھے تماشا لگتے ہیں لیکن زندگی آپریشن تھیٹر نہیں ہے۔

پرکاش: تم نے ثریا کو بے پناہ پیار کی دولت بخشی تھی وہ بھلا کبھی اسے بھول سکتی ہے۔

فرخ: پرکاش شاعر نہ بنو۔ ہم تم اس دنیا کے رہنے والے ہیں...... مجھے معلوم ہے کہ اس دنیا میں کسی میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ مجھ جیسے بدصورت انسان سے پیار کر سکے۔ مجھے تنہا رہنا ہے۔ ہاں ہر روز اپنی تنہائی کو اس اندھیرے کمرے میں دور کر لیتا ہوں۔ ہر رات کو موم بتی کی اس خواب ناک روشنی میں ستار کے اس نغمے کے ساتھ میں اپنے پرانے رفیقوں کی محفل سجاتا ہوں اور چند لمحوں کے لیے اپنے ہیبت ناک چہرے کو اتار پھینکتا ہوں۔ میرے لیے یہی دولت بہت ہے۔

(دروازے پر دستک)

فرخ: اندر آجاؤ۔

(کہتی ہوئی آتی ہے)

نیلم: (روتے ہوئے) آپ نے کیوں مجھے ٹھوکریں کھانے کے لیے بچایا ہے۔ آپ نے مجھے مرجانے دیا ہوتا۔ ایک اندھی لڑکی کو بچا کر آپ کو اپنی رحم دلی کا ڈھنڈورا پیٹنا تھا۔ اللہ کے واسطے مجھے زہر دے دیجیے مجھے موت چاہیے۔

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

فرخ: کیا ہوا نیلم — دیکھو اس قدر پریشان نہ ہو۔ تم تو بڑی بہادر لڑکی ہو۔

نیلم: یہ سب جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ میں بہت بزدل ہوں۔ کمزور ہوں۔ میری

ا۔ بوبیج۔ وہ شخص ہے جسے ٹھگی کے قانون کے مطابق واجب القتل قرار دیا گیا ہو۔

آنکھیں نہیں ہیں۔

فرخ: نیلم نیلم میری بہادر نیلم۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔

نیلم: نہیں نہیں کہیں نہیں۔ بیٹھوں گی۔ جب قدم بڑھاتی ہوں تبھی ٹھوکر کھاتی ہوں۔ دیر سے آپ کے کمرے کی طرف آنا چاہتی تھی مگر قدم قدم پر نہ جانے کس کس چیز سے ٹکرائی ہوں۔

فرخ: تم نے مجھے بلایا ہوتا۔

نیلم: میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ میں کب تک اس اندھیرے میں بھٹکتی رہوں گی میں کہتی ہوں آپ نے مجھے پناہ دی۔ آپ نے مجھے کیوں نہ مر جانے دیا۔

فرخ: مایوسی کی باتیں نہیں کیا کرتے نیلم۔

نیلم: نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں اس طرح زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے میری آنکھیں واپس دیجیے۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ آپ میرا اتنا کام نہیں کر سکتے تو پھر مجھے مر جانے دیجیے۔ میں دنیا میں تماشا بننا نہیں چاہتی۔

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

فرخ: نہ رو نیلم نہ رو۔

پرکاش: تمھاری آنکھیں اچھی ہو جائیں گی۔

نیلم: آپ کون ہیں۔

فرخ: میرا بچپن کا دوست اور کالج کا ساتھی۔

نیلم: میں بہت بری ہوں۔ ڈاکٹر بابو بہت بری ہوں۔ میں یہ بھی تو نہیں دیکھ پاتی کہ آپ کے پاس دوسرا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے یہ سب باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ میں بہت بری ہوں۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

فرخ: نہیں نیلم۔ یہ دوسرے آدمی نہیں ہیں۔ یہ اپنا پرکاش ہے۔

نیلم: کیا سوچتے ہوں گے اپنے جی میں۔ مجھے معاف کر دیجیے ڈاکٹر بابو میں نے پتہ نہیں کیا کیا کہہ ڈالا۔

فرخ: (ہنس کر) پگلی۔

نیلم: پرکاش بابو۔ ڈاکٹر بابو فرشتہ ہیں فرشتہ۔ انھوں نے مجھے اس وقت آسرا دیا جب ساری دنیا نے مجھے ٹھکرا دیا تھا۔ میں موت کی گود میں پناہ لینے جارہی تھی۔ انھوں نے بے گھر کو گھر اور بے آسرا کو آسرا اور ایک مفلس لڑکی کو عزت دی۔

فرخ: پرکاش۔ اس پگلی کی باتوں پر نہ جانا۔ کبھی میری تعریف کرتی ہے کبھی مجھے بُرا بھلا کہتی ہے دیوانی ہے دیوانی۔

نیلم: سچ مچ میں دیوانی ہی تھی۔ جب میرے باپ کی لاش ریل کے ٹکرا جانے کے بعد ڈاکٹر بابو کے پاس آئی تھی تو سچ مچ میں پاگل تھی۔ میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اپنے باپ کے پیچھے پیچھے موت کی گود میں چلی جاتی مگر ڈاکٹر بابو نے اس بے آسرا لڑکی کو بچالیا۔ مجھے اپنے گھر میں رکھا اچھے سے اچھا کھانے کو دیا۔ میرے آرام کا ایسے دھیان رکھا جیسے میں ہی گھر کی مالکن ہوں۔ مجھے اتنا چین دیا کہ یہ ظالم دنیا بھی مجھے پیاری لگنے لگی۔ میرا بھی جی چاہنے لگا کہ کاش میری آنکھیں ہوتیں۔ میں بھی اس دنیا کو دیکھ سکتی۔ کاش!

پرکاش: کیا یہ سب آنکھوں والے دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔ آنکھوں والوں میں بہت سے اندھے ہوتے ہیں نیلم۔

نیلم: لیکن وہ دنیا میں بغیر سہارے چل سکتے ہیں۔ وہ قدم قدم پر ٹھوکر تو نہیں کھاتے۔

پرکاش: نہیں بھئی بہت سے آنکھوں والے ٹھوکر کھاتے ہیں۔

نیلم: وہ اپنے احسان کرنے والوں کی صورت تو دیکھ پاتے ہیں۔ وہ ان کی خدمت تو کر پاتے ہیں۔ میں تو ڈاکٹر بابو کو دیکھ بھی نہیں سکتی۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ فرشتے کیسے ہوتے ہیں۔

فرخ: نہیں نیلم۔ ایسی باتیں مت کرو۔

نیلم: کیوں نہ کروں۔ بس ہمیشہ آپ ہی میری خدمت کرتے رہیں اور میں کچھ نہ کروں۔ نیلم نے دودھ نہیں پیا ہے تو اسپتال سے ڈاکٹر بابو سیدھے گھر چلے آرہے ہیں۔ نیلم کی پڑھائی کا وقت ہے تو ڈاکٹر بابو نے سارے کام چھوڑ دیے ہیں۔ ہائے اللہ نیلم سارے زمانے کا

بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔

فرخ: اور یہ نوکر کہہ رہا تھا کہ تم نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

نیلم: ہاں نہیں کھایا ہے پھر!

فرخ: آخر کیوں نہیں کھایا۔

نیلم: میری مرضی۔ بھوک نہیں لگی۔ نہیں کھایا۔

فرخ: اس گھر میں ہر بات میں تمھاری مرضی نہیں چلتی — جانتی ہونا۔

نیلم: جانتی ہوں مگر کھانا نہیں کھاؤں گی۔

فرخ: کھانا تمھیں ضرور کھانا ہوگا۔ تم بھوک ہڑتال کر کے میرے گھر میں جان دینا چاہتی ہو۔

نیلم: میں ہرگز کھانا نہیں کھاؤں گی نہیں تو مجھ سے وعدہ کیجیے۔

فرخ: کیا وعدہ کروں۔

نیلم: وعدہ کیجیے کہ آپ میری آنکھیں واپس دلا دیں گے۔

فرخ: میں خدا نہیں ہوں نیلم۔ خدا کا حقیر بندہ ہوں۔

نیلم: وعدہ کیجیے۔ آپ اس کی کوشش کریں گے۔

پرکاش: یہ بات ٹھیک ہے۔ کوشش کا وعدہ کرنے میں کیا ہرج ہے۔

نیلم: وعدہ کیجیے — بولیے۔

فرخ: (سوچ کر) میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ تم جانتی ہو نیلم میں تمھیں کس قدر عزیز رکھتا ہوں۔ کیا تمھیں مجھ پر ذرا بھی بھروسہ نہیں۔

نیلم: پورا بھروسہ ہے مگر مجھے اپنی آنکھیں واپس مل جائیں۔ میں اس اندھیرے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

فرخ: تم لوگ ڈاکٹر کو کیا سمجھتے ہو۔ وہ تو ایک معمولی سا پرزہ ہے جو ایک بڑے کارخانے میں اپنی جگہ کام کر رہا ہے۔ اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ وہ بالکل بے بس ہے۔ وہ تمھیں شفا کا آسرا بھی نہیں دے سکتا۔

نیلم: خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کرو۔ میں صرف اسی امید پر زندہ ہوں کہ ایک بار اپنے محسن کو

دیکھ سکوں گی اور اس کے قدموں میں آنکھیں بچھا کر......

فرخ: (بات کاٹ کر) میں تمھارا محسن نہیں ہوں نیلم۔ میں نے اپنے اوپر احسان کیا ہے۔ تم میری پناہ میں نہ آئی ہوتیں تو میں انسانیت پر سے بھروسہ کھو بیٹھتا۔

پرکاش: میرے خیال میں آپ دونوں کھانا کھا لیجئے۔

فرخ: چلو نیلم — میرے ہاتھ کا سہارا لے لو۔ چلو میں تمھیں تمھارے کمرہ تک پہنچا دوں۔

نیلم: اچھا تو آپ کی مرضی۔

فرخ: مجھے غلط نہ سمجھو۔ نیلم۔

نیلم: تو مجھے عمر بھر اسی طرح اندھیرے میں بھٹکنا ہوگا۔ مجھے میری آنکھیں واپس نہیں ملیں گی۔ چلئے میں تیار ہوں آپ کہاں ہیں۔ آیئے مجھے سہارا دیجئے۔ مجھے کمرے تک پہنچا دیجئے ڈاکٹر بابو۔ (دونوں چلے جاتے ہیں) کمرے میں صرف پرکاش رہ جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد گھنٹی بجاتا ہے۔

نوکر: آپ نے بلایا تھا۔

پرکاش: جی ہاں میں نے بلایا تھا۔ بڑے میاں کیا تمھارے گھر مہمان کی خاطر کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔

نوکر: جی سرکار۔ ہم تو مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں۔

پرکاش: خاطر کرتے ہو۔ ارے بھئی اتنی دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔ کھانے کا ذکر آتا ہے اور کوئی مجھے کھانے کو نہیں پوچھتا۔ نہ جل پان ہے نہ چائے پانی ہے آخر یہ معاملہ کیا ہے۔

نوکر: ابھی نیلم جی نے کھانا نہیں کھایا ہے صاحب۔

پرکاش: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مہمان بھی فاقے سے مر جائیں خوب — بڑا اچھا دستور ہے تمھارا۔

نوکر: آپ نہیں جانتے بابو صاحب۔ ڈاکٹر بابو اس وقت کھانا نہیں کھاتے جب تک نیلم بی بی نہ کھالیں۔ ان کا جی ذرا بھی میلا نہیں ہونے دیتے۔ بیچاری غریب لڑکی تھی۔ خدا کی قسم بابو جی۔ جب یہاں آئی تھی تو بدن پر ثابت کپڑا تک نہ تھا۔ چیتھڑے لگے تھے چیتھڑے ڈاکٹر بابو نے بیچاری اندھی لاوارث لڑکی پر رحم کھا کر اسے رانی بنا دیا۔ اس کی ذرا تکلیف

نہیں دیکھ سکتے۔

پرکاش: وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔

نوکر: ہاں بابو جی۔ اور سچ بھی تو ہے۔ ان بیچاروں کا اب کون بیٹھا ہے دنیا میں۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ لے دے کے یہی لاوارث لڑکی ہے۔

پرکاش: تم نے مثل سنی ہے بڑے میاں۔

نوکر: کون سی مثل سرکار۔

پرکاش: قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔

نوکر: سنی تو ہے۔

پرکاش: تم ہو قاضی جی کے گھر کے چوہے۔ سمجھے میرے دوست۔ میں بھوک بھوک چلا رہا ہوں اور تم مجھے دنیا بھر کے بکھیڑے سنا رہے ہو۔ دیکھو بھائی چاہے نیلم بی بی کھانا کھائیں یا نہ کھائیں۔ فاقہ کریں یا بھوک ہڑتال کریں۔ تم میرے کھانے کا فوراً انتظام کرو۔ میں دنیا کے سارے عذاب سہہ لوں گا بھوکا نہیں رہ سکتا۔

فرخ: میں پہلے ہی جانتا تھا۔ اودھم مچانا شروع کر دیا نہ — اچھا اچھا بڑے میاں تم جاؤ۔ اس کمبخت کے کھانے کا انتظام کرو۔

نوکر: بہت اچھا حضور۔

فرخ: یار تم ایک انچ نہیں بدلے پرکاش۔ بالکل وہی ہو۔ وہی بھوک بھوک چلاتے ہو۔ اسی طرح بالکل اسی طرح۔

پرکاش: تم تو بہت بدل گئے ہو فرخ۔ میں تو ابھی تک تمھارے معمہ پر غور کر رہا ہوں۔

فرخ: کون سا معمہ۔

پرکاش: بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ راز کیا ہے۔ یہ خاتون کون ہیں۔

فرخ: یہ بے سہارا اندھی لڑکی جیسے میں نے اپنے گھر میں پناہ دی۔

پرکاش: اس سے شادی کرو گے۔

فرخ: نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اگر یہ سمجھوں گا کہ میرے لیے اس کے دل میں ذرا سی بھی جگہ ہے تو

ضرور شادی کروں گا۔

پرکاش: چلو تمھارے دل میں تو اس کے لئے جگہ ہے۔

فرخ: میرے دل کی کیا بات کرتے ہو۔ اس اندھی لڑکی کی طرح میرا دل بھی بے سہارا ہے۔ اسے کسی کا سہارا چاہیے۔

پرکاش: اس پر تو مجھے تعجب ہوتا ہے۔

فرخ: کیا کسی بے آسرا آدمی کا سہارا چاہنا اچنبھے کی بات ہے۔

پرکاش: گڑبڑ مت کرو۔ میری بات کا جواب دو۔ تم نیلم کو عزیز رکھتے ہو۔

فرخ: بہت زیادہ۔

پرکاش: اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتے ہو۔ اس کے دل پر کبھی میل نہیں آنے دیتے۔

فرخ: ہاں۔

پرکاش: پھر بھی اس کی سب سے بڑی خوشی کو پورا کیوں نہیں کرتے۔

فرخ: کون سی خوشی۔

پرکاش: وہ اپنی آنکھیں تم سے مانگتی ہے۔ تم اسے بینائی دے سکتے ہو۔ یہ مت کہو کہ تم مجبور ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم آنکھوں کا کتنا اچھا آپریشن کر چکے ہو۔ کالج میں بھی تمھارا خاص سبجیکٹ سرجری ہی تھا۔

فرخ: پرکاش۔

پرکاش: میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تمھیں اس کی ہر خواہش عزیز ہے مگر اس کی سب سے بڑی تمنا کو تم پاؤں تلے روندنے سے بھی نہیں چوکتے۔

فرخ: اس کی وجہ پوچھتے ہو۔

پرکاش: ہاں۔

فرخ: پرکاش تمھارا دوست فرخ کمینہ، ذلیل اور خود غرض ہے کیا اس کی یہی وجہ کافی نہیں ہے۔

پرکاش: تم اور خود غرض۔

فرخ: ہاں میں خود غرض ہوں۔ میں وہ ڈوبنے والا انسان ہوں جو تنکے کا سہارا لے کر دریا پار کرنا

چاہتا ہے۔ میں نے نیلم کو اس لیے نہیں بچایا کہ وہ بے سہارا تھی۔ میں نے اسے اس لیے پناہ دی کہ میں بے سہارا تھا اور اگر تمھاری اس لمبی چوڑی دنیا میں کوئی ایسا دل ہے جو مجھ سے عقیدت رکھتا ہے تو وہ نیلم کا دل ہے۔ میں بہت مفلس ہوں پرکاش۔ کیا تم چاہتے ہو (آواز بلند ہو جاتی ہے) کہ اسے بھی آنکھیں مل جائیں وہ بھی میرے خوفناک چہرے کو دیکھ کر تمھاری طرح چیخ مارے اور نفرت سے منہ پھیر کر ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے باہر چلی جائے۔ تم چاہتے ہو میں اسے آنکھیں دے دوں اور اپنی دنیا کی ساری روشنیاں گل کر دوں۔ میرے دنیا ہمیشہ کے لیے ویران ہو جائے۔ یہاں کوئی ستار نہ چھیڑے۔ یہاں کوئی گیت نہ گائے۔ یہاں کوئی پھول نہ کھلے (چیخ کر) میں ایسا نہیں ہونے دوں گا اسے ہرگز آنکھیں نہیں ملیں گی۔

پرکاش: میرے دوست۔ میرے دُکھی دوست۔

فرخ: (تھکے ہوئے انداز میں) میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بھی خوش ہونے کا حق حاصل ہے میرے سینے میں بھی دل ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میں اس دل کو پاش پاش کر کے اسے سینے سے باہر پھینک دوں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا پرکاش۔

(نوکر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

نوکر: سرکار۔ سرکار۔

پرکاش: کیا ہوا ہے تمھیں۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔

نوکر: ڈاکٹر بابو کو بیہوشی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اب ذرا انھیں پلنگ پر لٹا دیجیے میں اسپتال سے کسی ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔

پرکاش: کیا یہ دورہ پہلے بھی پڑا تھا۔

نوکر: ہاں کبھی کبھی پڑ جاتا ہے۔

پرکاش: بے چارا فرخ۔ بے چارا۔

دوسرا منظر

(وہی کمرہ۔ پیانو پر فرخ پریشان سا بیٹھا ہوا ہے۔ پیانو کے سُر بے ڈھنگے اور بے ترتیب انداز سے بج رہے ہیں۔ کبھی تیزی سے کبھی آہستہ۔ جیسے کوئی اپنے پریشان دماغ کو پیانو کے ان بے ترتیب سُروں سے تسکین پہنچانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو)

(دروازے پر دستک)

نیلم: میں اندر آسکتی ہوں۔

(کوئی جواب نہیں ملتا۔ پیانو کے سُر ایک لمحہ کے لیے بجنے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح فرخ پیانو کے مختلف پردوں پر انگلیاں پھیرنے لگتا ہے)

نیلم: ڈاکٹر بابو (رُک کر) ڈاکٹر صاحب۔

فرخ: (چونک کر) کون ارے تم ہو نیلم۔ آؤ اندر چلی آؤ بائیں ہاتھ پر میز رکھی ہے اس سے بچتی ہوئی۔

نیلم: آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر بابو۔ یہ آپ کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔

فرخ: کچھ بھی نہیں ہوا نیلم۔

(پیانو کے سُر پھر بج اُٹھتے ہیں)

نیلم: آپ نے مجھ سے بات نہیں کی۔ اسپتال سے آکر سیدھے کمرے میں بند ہو جاتے ہیں۔ میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ مجھے روز کی طرح ستار نہیں سکھاتے۔

فرخ: میں نے ستار نہیں سکھایا۔ اچھا۔ ابھی ستار منگاتا ہوں۔

نیلم: مجھے ستار کی فکر نہیں ہے۔

فرخ: تو پھر۔

نیلم: آپ اس قدر کھوئے کھوئے کیوں ہیں۔ آپ اپنے کو اتنا دکھ کیوں پہنچا رہے ہیں۔

فرخ: کچھ بھی تو نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ...... دراصل یہ ہے کہ ان دنوں فرصت نہیں ملتی۔

نیلم: کھانا کھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

فرخ: ہاں۔ تم اسپتال کا کام نہیں جانتیں۔ کبھی ڈاکٹر کو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔

نیلم: اچھا اب اٹھیے، چل کر کھانا کھا لیجیے۔

فرخ: مجھے تنگ نہ کرو نیلم۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

نیلم: آپ تنگ کر رہے ہیں مجھے۔ میں بیچاری آپ کو کیا تنگ کروں گی۔ اب اس وقت کیا کام کر رہے ہیں کہ آپ کو فرصت نہیں ہے۔

فرخ: میں اس وقت بھی بہت کچھ کر رہا ہوں۔

نیلم: میں بھی تو سنوں۔

فرخ: سوچ رہا ہوں۔ بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔

نیلم: (قہقہہ لگا کر) آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ کو میری جان کی قسم چل کر کھانا کھایئے۔

فرخ: میں کہتا ہوں نیلم مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے سوچنے دو۔

نیلم: اب آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ آپ چاہتے ہیں میں چلی جاؤں ایک اندھی بے آسرا لڑکی کو پھر بے رحم دنیا میں پھینک دینا چاہتے ہیں۔

فرخ: میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔

نیلم: اچھا تو یوں ہی سہی۔ میں ابھی چلی جاؤں گی چاہے مجھے در بدر کی ٹھوکریں ہی کیوں نہ کھانا پڑیں۔ اچھا خدا حافظ۔

فرخ: کہاں جا رہی ہے پگلی۔

نیلم: مجھے چھوڑ دیجیے۔ مجھے جانے دیجئے۔

فرخ: مجھے ابھی تجھ سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میری بات کا جواب دینا ہوگا۔

نیلم: آپ کو فرصت کہاں ہے مجھ سے بات کرنے کی۔

فرخ: فرض کرو نیلم میں جادوگر ہوں اور اپنے جادو سے سب کچھ پا سکتا ہوں۔

نیلم: (ہنستے ہوئے) جادوگر۔

فرخ: ہاں۔ اور جادو سے میں نیلم کو اس کی آنکھیں واپس دلا دوں۔

نیلم: سچ مچ کیا میں دوبارہ دیکھ سکوں گی۔

فرخ: فرض کرو تم کو تمھاری آنکھیں واپس مل جائیں تو کیا کرو گی۔

نیلم: میں اپنے ڈاکٹر بابو کے قدموں پر......

فرخ: (بات کاٹ کر) نیلم ایسا مت کہو۔ کیا تم اس کے بعد بھی مجھ سے قریب رہ سکو گی۔ مان لو میں بہت بُرا ہوں۔ میں بہت ہی بدصورت ہوں کیا تم پھر بھی مجھ سے نفرت نہیں کرو گی۔

نیلم: یہ نہیں ہو سکتا ڈاکٹر بابو ایسے ہیرا دل والے سے کوئی نفرت کر سکتا ہے۔ تم بدصورت نہیں ہو سکتے۔

فرخ: کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔

نیلم: ہاں ڈاکٹر بابو اگر میری آنکھیں تمھیں بدصورت پائیں گی تو میں آنکھوں کو پھوڑ ڈالوں گی انھیں نکال کر تمھارے قدموں پر چڑھا دوں گی۔

فرخ: ایسا نہ کہو نیلم۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

نیلم: تم انسان نہیں ہو بابو فرشتہ ہو۔ اگر تم انسان ہو تو ایسے انسانوں کو سجدہ کرنا روا ہے۔

فرخ: میں نے فیصلہ کر لیا ہے نیلم۔

پرکاش: (تالیاں بجاتے ہوئے) ہیں ہیں۔ فیصلہ تو کر لیا۔ اب یہ بھی بتاؤ کہ فیصلہ کیا ہوا۔

فرخ: پرکاش۔ تم آ گئے۔ اچھے وقت پر آئے ہو۔

نیلم: پرکاش بابو۔ میری آنکھیں......

فرخ: (بات کاٹ کر) ہاں پرکاش نیلم کو اس کی آنکھیں ملیں گی۔ تین چار دن میں میں آپریشن کروں گا۔ نیلم اب اندھی نہیں رہے گی۔

نیلم: اب میں ڈاکٹر بابو کو دیکھ سکوں گی۔

پرکاش: مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ ارے بڑے میاں کہاں چلے گئے۔ نہ کھانے والے کا کوئی ذکر ہے نہ مٹھائی کا چرچا ہے۔

فرخ: چلو ہم سب کھانے کے کمرے کی طرف چلیں۔ آج سے ایک ماہ بعد جب ہم اس کمرے میں پھر آئیں گے تو نیلم کی آنکھیں ہوں گی۔

تیسرا منظر

(ایک ماہ بعد اسی کمرے میں)

(قدرے وقفہ کے بعد خاموشی۔ پھر گھنٹے کے پانچ بجانے کی آواز۔ بعد کو گھنٹے کی ٹک ٹک ہونے کی آواز۔ تھوڑی دیر کے بعد سوائے ٹک ٹک کے اور کچھ نہیں سنائی دیتا ہے۔)

فرخ: پرکاش۔

پرکاش: کیا بات ہے دوست۔

فرخ: میرا جی ڈر رہا ہے پرکاش۔ آخر وہ لمحہ آپہنچا جس کا مجھے ڈر تھا۔ منزل قریب آ گئی۔

پرکاش: کس بات سے گھبراتے ہو۔ تم نے بہادروں کی طرح زندگی کو جھیلا ہے۔ ایسے ہمت نہ ہارو۔

فرخ: آپریشن کامیاب ہو گیا۔ اب سے ایک گھنٹے کے بعد نیلم کی آنکھوں کی پٹی کھول دی جائے گی پھر کیا ہوگا پرکاش پھر میرا کیا ہوگا۔

پرکاش: اس کی آنکھوں کی پٹیاں آج کھلیں گی۔

فرخ: آج اور ابھی۔ اب سے ایک گھنٹے کے بعد۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے دیکھے۔ تم اسپتال جا کر اپنے سامنے اس کی آنکھوں سے پٹیاں کھلوانا۔ میں ابھی چند روز اس سے نہ ملوں گا۔

پرکاش: جیسے تمھاری مرضی۔

فرخ: تم اسے تسکین دلانا۔ آسمان کا سب سے خوبصورت منظر دکھانا۔ اسپتال کے کمرے کی بائیں کھڑکی سے شفق کے خوبصورت رنگ دکھائی دیتے ہیں وہ دریچہ کھولنا۔ پھر ڈوبتے ہوئے سورج کا وہ دل فریب رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر جائے گا۔

پرکاش: اور تم کیا کرو گے یہاں۔

فرخ: مجھے ابھی بہت کام ہے۔ مجھے ابھی اس کمرے کو سجانا ہے۔ صبح جب تم اسے لے کر یہاں آؤ گے تو یہ کمرے دلہن کی طرح سجائے جا چکے ہوں گے۔ پھر رات کو مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لکھنی ہے۔

پرکاش: کیا تمھیں اسپتال جانا ہے۔

فرخ: ہاں میں نیلم کے کمرے میں صرف چند گز کے فاصلے پر ہوں گا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا ہوں گا کہ نیلم کی نئی آنکھوں نے پہلی بار اس دنیا میں کیا دیکھا ہوگا۔ اس نے اس دنیا کے بارے میں کیا کچھ سوچا ہوگا۔ اب تم جاؤ پرکاش وقت آ گیا ہے۔ خدا حافظ۔

پرکاش: اچھا میں چلتا ہوں۔

فرخ: بڑے میاں۔ بڑے میاں۔

نوکر: سرکار۔ ابھی آیا سرکار۔

فرخ: تم بہت سست کام کرتے ہو بڑے میاں۔ ابھی تک گول کمرے میں گلدان میں پھول تک نہیں لگے ہیں۔ یہ پردے نہیں بدلے گئے ہیں۔ آخر یہ نئے مخملی پردے کس دن کام آئیں گے۔ یہ قالین ابھی تک اسی طرح لپٹا پڑا ہے۔ چلو جلدی کرو۔

نوکر: سب ٹھیک ہو جائے گا سرکار۔

فرخ: ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھارا سر۔ ابھی اتنا بہت کام پڑا ہے۔ اور وقت بہت کم ہے۔ تم جانتے نہیں ہو۔ آج میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے۔ آج نیلم کو اس کی آنکھیں مل جائیں گی۔

نوکر: جی ہاں سرکار۔ خدا مبارک کرے۔ آپ کے قدموں کی برکت سے نیلم بٹیا کی بگڑی بن جائے گی۔

فرخ: اس کوٹھی کے ایک ایک در و دیوار کو سجا دو۔ ہر کمرے کو دلہن بنا دو۔ ہر گلدان کو پھولوں سے گلزار کر دو۔ ہر فانوس کو روشنی سے جگمگا دو۔ آج میرے سنہرے خوابوں کی تعبیر کا دن ہے۔ نیلم آئے تو دیکھے دنیا کس قدر خوبصورت ہے۔

چوتھا منظر

(اسپتال کا کمرہ۔ نیلم اپنے بستر پر لیٹی ہوئی پٹیوں کے کھلنے کا انتظار کر رہی ہے۔ (گھنٹہ چھ بجاتا ہے۔ پھر ٹک ٹک کی آواز وقت کے احساس کو زیادہ نمایاں کرنے لگتی ہے۔)

نیلم: (خوشی سے بے چین ہو کر) چھ بج گئے۔ نرس ڈاکٹر تم سب لوگ کہاں ہو۔ کہاں ہو۔ تم سب

لوگ میری آنکھوں سے پٹیاں کھولو۔ مجھے میری آنکھیں واپس دے دو۔ آؤ جلدی آؤ۔

پرکاش: اس قدر جلدی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم خاموشی کے ساتھ لیٹی رہو۔

نیلم: میں نہ جانے کب سے اس طرح خاموشی کے ساتھ لیٹی ہوں۔ اس گھڑی کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ اب میں بالکل صبر نہیں کروں گی۔ ایک لمحہ بھی صبر نہیں کروں گی۔ میری آنکھوں سے پٹیاں کھولو۔

پرکاش: سب لوگ آ گئے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ خاموشی سے اطمینان کے ساتھ۔

نیلم: تو پھر دیر کیوں کر رہے ہیں۔ پٹیاں کھولئے جلدی کیجئے۔

پرکاش: ابھی تمھاری آنکھوں سے پٹیاں کھولی جائیں گی۔

نیلم: خدایا تیرا شکر ہے۔ خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ پٹیاں کھولنا شروع کیجئے ڈاکٹر صاحب۔

پرکاش: تو تیار ہو جاؤ۔ پٹیاں کھولی جا رہی ہیں۔ (پٹیاں کھولی جاتی ہیں)

نیلم: آخر کار میں ڈاکٹر بابو کو دیکھ سکوں گی۔ میں انھیں دیکھوں گی۔

پرکاش: آنکھیں کھولو۔ نیلم۔ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو۔

نیلم: میں دیکھ سکتی ہوں۔ آہ میرے خدا میں دیکھ سکتی ہوں۔ ڈاکٹر بابو۔ ڈاکٹر بابو تم کہاں ہو۔ میں دیکھ سکتی ہوں۔ کوئی مجھے بتاتا کیوں نہیں ہے کہاں ہے ڈاکٹر بابو۔

پرکاش: وہ یہاں نہیں ہیں نیلم۔ ایسی بچی نہ بنو۔ اب ہم گھر چلیں گے تو ڈاکٹر بابو سے ملیں گے۔

نیلم: ڈاکٹر بابو نے میری آنکھیں واپس دلا دیں۔ اتنی بڑی خوشی بخشی ہے انھوں نے اور میری زندگی کی اس سب سے بڑی خوشی کے وقت وہ آئے کیوں نہیں! میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔

پرکاش: نہیں نیلم وہ تم سے بھی زیادہ خوش ہیں۔ انھوں نے تمھارے لیے سارے گھر کو دلہن کی طرح سجا رکھا ہے۔

نیلم: سچ!

پرکاش: ابھی ہم گھر چلیں گے۔ تم خود دیکھنا۔

نیلم: پرکاش بابو۔ دنیا واقعی خوبصورت ہے۔ وہ سامنے ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی۔ یہ

رنگینی۔ یہ سجاوٹ کیسی کیسی پیاری ہے۔ یہ دنیا۔ میں نے تو اس کی رنگا رنگی بالکل ہی کھو دی تھی۔ مجھے ڈاکٹر بابو کے پاس لے چلو۔ میں اپنے دیوتا کے قدموں پر گر کر ان کا شکریہ ادا کروں گی۔

پرکاش: ہاں، ہم جلد ہی چلیں گے۔

پانچواں منظر

(ڈاکٹر کے گھر کا ڈرائنگ روم)

نیلم: اوہ۔ کتنا سجایا ہے یہ گھر۔ یہاں کی ہر چیز بجی ہوئی ہے۔

نوکر: بی بی مبارک ہو۔ آنکھیں مبارک ہوں۔

نیلم: ہاں بابا۔ ڈاکٹر بابو کی مہربانی سے مجھے سچ مچ آنکھیں مل گئیں۔ میں اب وہ دیکھ سکتی ہوں۔ یہ گلاب کے گجرے اوہ۔ میں تو ان کی خوشبو ہی سونگھے جاتی تھی۔ انھیں کبھی دیکھ نہ سکی۔ مخمل کے خوبصورت پردے۔ یہ گلدان۔ یہ فانوس۔ آج میری زندگی کا سب سے پیارا دن ہے۔ ڈاکٹر بابو— ڈاکٹر بابو— تم سچ مچ فرشتہ ہو۔ کہاں ہیں ڈاکٹر بابو۔

پرکاش: ہاں بڑے میاں فرخ کہاں ہیں۔

(نوکر خاموش رہتا ہے)

نیلم: بولتے کیوں نہیں۔ چپ کیوں ہیں۔

نوکر: کچھ بھی تو نہیں۔

نیلم: خدارا کچھ تو کہو۔ میرے ڈاکٹر بابو کو کیا ہوا۔

پرکاش: کہاں ہے فرخ۔

نوکر: یہ خط دے گئے ہیں۔

پرکاش: خط۔ کیا خط ہے یہ۔ لاؤ دیکھوں۔ (پڑھتا ہے)

مائی ڈیر پرکاش۔

آج نیلم کو آنکھیں مل گئی ہوں گی۔ اسے میری مبارک باد پہنچا دینا۔ میں جا رہا ہوں۔ میں

نہیں چاہتا کہ نیلم کے دل میں جو میرا تصور ہے اسے مجروح کروں۔ اور وہ اکیلا دل جسے میں اپنی محبت سے معمور رکھنا چاہتا تھا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ تم بھی یہ راز اس پر ظاہر نہ کرنا کہ اس کا محسن ایسا بدصورت اور خودغرض انسان ہے جس سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ میں نے خلوص سے جو تاج محل بنایا ہے اسے اس طرح نیست و نابود نہ کردینا۔ میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ زندگی بہت سفاک ہے اور انسان سب کچھ نہیں پا سکتا۔ اب میں نے اپنی مجبوریوں سے سمجھوتہ کرلیا ہے۔ خدا حافظ۔

تمھارا

فرخ

نیلم: ڈاکٹر بابو! ڈاکٹر بابو!!

☆☆☆

مور پنکھی

(یہ ڈراما بارہ مناظر پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ سے سات سیٹ تک کی ضرورت ہوگی۔ اسمٰعیل کا خیمہ۔ خیمے کے باہر کا میدان۔ مور پنکھی اور سرفراز کے خیمے۔ نواب کا خیمہ۔ تالاب۔ بعض مناظر مختصر ہیں۔)

کردار:

۱۔ مور پنکھی — ایک الھڑ خوبصورت لڑکی۔ عمر ۱۷ سال۔

۲۔ سرفراز — ٹھگوں کا نوعمر سردار۔ عمر ۲۶ سال

۳۔ اسمٰعیل — ٹھگوں کا بوڑھا سابق سردار۔ عمر ۶۰ سال

۴۔ غفور — ٹھگ۔ عمر ۳۵ سال۔

۵۔ بدری — ایک اور ٹھگ۔ عمر ۳۰ سے ۳۵ سال تک۔

۶۔ نواب سبزی بہادر — ۴۰۔ ۴۵ سال کے ایک عیاش طبع نواب۔

۷۔ خیرو — نواب سبزی بہادر کا نوکر۔

۸۔ اور دو تین سوداگر اور دو تین ٹھگ۔

پہلا منظر

(ٹھگوں کے سردار کے خیمے میں۔ وقت، رات، ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ)

اسمٰعیل: سب لوگ آگئے۔

بدری: ہاں سردار۔ سب۔

اسمٰعیل: بدری۔ مشعلیں بجھا دو چاندنی رات میں ان کی ضرورت نہیں۔ اگر اور لوبان کچھ اور آگ

میں ڈال دو۔

بدری: جو حکم سردار۔

اسمٰعیل: میں نے خیمے کو دلہن کی طرح سجایا اور طرح طرح کے پھولوں سے مہکا دیا ہے۔ یہ رات ہمارے قافلے کی زندگی میں بڑی ہی مبارک ثابت ہو۔ میں نے اپنے سب ساتھیوں کو اس لیے بلایا ہے کہ میں ان سے فیصلہ چاہتا ہوں۔

سرفراز: سردار۔

اسمٰعیل: آؤ میرے پاس آکر کھڑے ہو جاؤ۔

ساتھیو! میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ٹھگی کے پیشے میں میں نے ۴۵ سال گزارے ہیں۔ دیوی بھوانی کے ایک معمولی سیوک کی حیثیت سے میں نے اپنا کام پورا کیا ہے۔ ٹھگ بڑا پاک لفظ ہے ہم دیوی بھوانی کے سچے بھگت ہیں۔ بھوانی ہمارے ذریعے دنیا سے بدی کو ختم کرتی ہے۔ جب دیوی شگون دیتی ہے تو ہم اس کے حکم سے انسانوں کو موت کا پیغام سناتے ہیں۔ دیوی ہمارا ساتھ نہ دیتی تو ہمارے معمولی رومال میں تندرست سے تندرست انسان کی گردن مروڑنے کی طاقت کہاں سے آتی۔

سب: جے بھوانی کی!

اسمٰعیل: ہمارے قافلے میں ہندو مسلمان سب برابر ہیں۔ سب دیوی بھوانی کے حکم سے قتل کرتے ہیں۔ اس قتل سے جو مال ملتا ہے اس کا بڑا حصہ دیوی بھوانی کو چڑھاتے ہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں تمھاری سرداری کے لیے اپنے لے پالک بیٹے سرفراز کو پیش کرتا ہوں۔ بھائیو! کیا تم سرفراز کو اپنا سردار بنانے پر راضی ہو؟

غفور: جے بھوانی کی!

اسمٰعیل: میں سمجھ گیا غفور! ہاں اگر بھوانی اس معمولی سیوک کو سردار بنانے پر راضی ہو تو کیا تم سرفراز کو اپنا سردار بنا لو گے؟

غفور: بے شک، مگر سرفراز کے لئے بھوانی سے شگون لینا ضروری ہے۔

اسمٰعیل: سرفراز تمھارے لیے نیا نہیں ہے۔ تم پچھلے سفر میں اس کے کارنامے دیکھ چکے ہو۔ وہ

خوبصورت، جوان اور تندرست ہے۔اس کی باتوں میں جادو ہے۔ قیمتی پوشاک میں وہ نواب زادہ لگتا ہے۔اس نے پچھلے سفر میں کئی اچھے اسامیوں کی مضبوط گردن میں رومال ڈال کر ایک سیکنڈ میں ختم کر دیا تھا۔

کئی آوازیں: ہمیں معلوم ہے۔

اسمٰعیل: نیزہ بازی میں اس کا جواب نہیں۔ شہسواری میں اسے کمال حاصل ہے۔ پہلوانی میں میرا بیٹا رستم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی سرداری میں ہمارے قافلے پر ہُن برسے گا۔ ہُن۔

بدری: تو پھر کیا دیر ہے سردار۔شگون سے لیا جائے۔

اسمٰعیل: (پرارتھنا کے لب ولہجہ میں) دیوی بھوانی ہمیں ہدایت دے! ہمیں راستہ دکھا، اگر تو اپنے سیوک سرفراز کو اپنے گروہ کی سرداری کے لئے قبول کرتی ہے تو ہمیں شگون دے اجازت دے دیوی! دیوی!!

اسمٰعیل: (تھوڑی دیر کے بعد) ہم خاموشی سے تیرے اشارے کا انتظار کریں گے۔

(تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہتی ہے پھر اچانک کہیں قریب ہی سے اُلو کے بولنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔دیر تک یہ آواز آتی رہتی ہے)

سب لوگ: (خوشی سے مست ہوکر) جے بھوانی مائی کی! جے بھوانی مائی کی!

اسمٰعیل: شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بھوانی مائی نے میری لاج رکھ لی۔ سرفراز میرے بیٹے آ میرے سینے سے لگ جا۔

غفور: مبارک ہو سرفراز۔

اسمٰعیل: میرے بیٹے سرداری مبارک ہو، خدا نے آج بڑے ارمانوں کے بعد مجھے یہ دن دکھایا ہے۔

سب: مبارک، سلامت۔

اسمٰعیل: سرفراز آؤ۔ میرے سامنے آکر کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے سامنے قسم کھاؤ حلف اٹھاؤ کہ تم ٹھگی کے اصول پر چلو گے۔

سرفراز: میں قسم کھاتا ہوں۔

اسمٰعیل: ماتا بھوانی کے اس مقدس نشان پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ اپنے رومال سے ہر اُس انسان کی جان ضرور لو گے جس کے لیے ماتا بھوانی کا اشارہ مل جائے۔

سرفراز: میں قسم کھاتا ہوں۔

اسمٰعیل: قسم کھاؤ کہ جہاں تک ہو سکے گا عورت کے قتل سے ہاتھ نہ رنگو گے بلکہ اس کی عزت کرو گے۔ دھوبی۔ نائی۔ کنجڑے وغیرہ کے قتل سے باز رہو گے اور ٹھگی کا راز کبھی کسی کو نہ بتاؤ گے۔

سرفراز: میں قسم کھاتا ہوں۔

اسمٰعیل: اور اگر تم نے کبھی یہ راز فاش کیا تو تمھاری سزا ٹھگی کے قانون کے مطابق موت ہو گی۔

سرفراز: مجھے منظور ہے۔

اسمٰعیل: قسم کھاؤ کہ اگر عورت، مرد یا سمجھدار بچہ میں سے کوئی تمھارا بھید جان لے گا تو اسے ٹھگی کے قانون کے مطابق جان سے مارنا اپنا فرض سمجھو گے۔

سرفراز: میں خدا اور بھوانی ماتا کے سامنے قسم کھاتا ہوں۔

اسمٰعیل: بھائیو۔ تمھارا سردار تمھیں مبارک ہو۔

سب: بھوانی ماتا کی جے!

اسمٰعیل: اب تم سب بھی پاک نشان پر ہاتھ رکھ کر بھوانی ماتا کے سامنے قسم کھاؤ کہ جب تک وہ ٹھگی کے اصول پر چلے گا تم سرفراز کی سرداری قبول کرو گے اور جب وہ اس راستے سے ہٹنے کی کوشش کرے گا تم اسے بھوانی کی بھینٹ چڑھا دو گے اور اس کے خون کا تلک لگاؤ گے۔

سب: ہم سب قسم کھاتے ہیں۔ ہم سب پرتگیا کرتے ہیں۔

(اچانک ڈھول پر زور کی چوٹ پڑتی ہے اور جھانجھ کی آواز آتی ہے)

اسمٰعیل: جاؤ سب جشن مناؤ۔

(جشن شروع ہوتا ہے لوگ ناچ گانے میں محو ہو جاتے ہیں۔ یہ آوازیں پس منظر سے آتی رہتی ہیں۔ سب لوگ خیمے سے باہر چلے جاتے ہیں اور ناچ گانے میں مصروف ہو جاتے

ہیں صرف غفور، اسمٰعیل اور سرفراز رہ جاتے ہیں)

(موسیقی فضا میں بکھر جاتی ہے۔ ایک مردانہ آواز سرگم کی تان لیتی ہے۔ جھانجھ اور گھنگھروؤں کی آواز سماں باندھ دیتی ہے۔ یہ کیفیت کچھ دیر جاری رہتی ہے پھر دھیرے دھیرے موسیقی کی لے مدھم ہونے لگتی ہے اور اسمٰعیل کی آواز ابھرتی ہے۔ جو سرگوشی میں سرفراز سے کچھ گفتگو کر رہا ہے۔)

اسمٰعیل: سب جشن منا رہے ہیں۔ میرے بیٹے۔ کل تمھارے امتحان کا دن ہے۔

سرفراز: میں تیار ہوں۔

اسمٰعیل: غفور، کل ہی نیا شکار پھانس کر لاؤ۔ قافلے والوں کو فوراً سرفراز خان کی سرداری کا تحفہ ملنا چاہیے۔

غفور: خان غفور آپ کی سب باتیں مانے گا مگر اس بار تو سرفراز خاں کو شگون کے لئے اپنا شکار خود ہی پھانسنا چاہیے۔

سرفراز: مگر یہ تو سوٹھائی کا کام ہے۔

غفور: ہاں میں سوٹھائی[1] ہوں۔ میرا یہی کام ہے۔ مگر سردار کو تو سوٹھائی سے لے کر بھٹوئی[2] اور لگھائی[3] تک سب کام آنے چاہئیں۔

سرفراز: یعنی میں اپنے آپ شکار پھانسوں۔ خود انھیں موت کے گھاٹ اُتاروں اور خود ہی قبر کھود کر دفن کروں تو پھر تم کیا کرو گے؟

غفور: جو مجھے کرنا چاہیے۔

اسمٰعیل: غفور! تمھیں اپنے سردار کی مدد سے انکار ہے؟

غفور: میری کیا مجال!

اسمٰعیل: پھر کیا چاہتے ہو؟

۱۔ سوٹھائی: ٹھگی کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو شکار پھانس کر لائے۔

۲۔ بھٹوئی: وہ شخص جو شکار کی گردن میں رومال ڈال کر اس کا گلا گھونٹے۔

۳۔ لگھائی: جو قبر تیار کرے۔

غفور: میں سرفراز کے ساتھ جانے کو تیار ہوں مگر شکار پھانسنے کا کام سردار کو کرنا ہوگا۔

سرفراز: مجھے منظور ہے غفور! زندگی میں، میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ تمھارے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں دکھادوں گا سوٹھائی کسے کہتے ہیں — (بلند آواز میں) جاؤ۔

غفور: بہت اچھا، جب میری ضرورت ہو مجھے یاد کرلیا جائے۔

اسمٰعیل: میرے بیٹے — یہ تم نے کیا کیا؟

سرفراز: میں اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں ابا جان! میں غفور کو اور سارے قافلے والوں کو دکھا دینا چاہتا ہوں کہ سرفراز کے پاس ہمت بھی ہے اور قابلیت بھی۔ آج آپ دیکھیں گے ابا جان مجھے زندگی کی دوسری شاندار کامیابی ہوگی۔

اسمٰعیل: بھوانی ماتا کی یہی مرضی معلوم ہوتی ہے۔

سرفراز: آپ کا بیٹا صرف خدا اور بھوانی پر بھروسہ کرنا جانتا ہے۔ انسان تو کھلونا ہے جسے تباہ کرنا میرا فرض ہے۔

اسمٰعیل: کل اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

دوسرا منظر

(خیموں کے باہر میدان میں صبح ہونے والی ہے)

غفور: صبح ہوگئی۔ ابھی تک سرفراز نہیں آیا۔

بدری: سرفراز نہیں سردار کہو۔ غفور، سردار۔

غفور: ابھی نہیں، آج کی وٹھائی کے بعد دیکھنا کون کس کو سردار کہتا ہے۔

بدری: کس طرف کا ارادہ ہے؟

غفور: غفور کو نہیں جانتے بدری۔ میری پانچوں انگلیوں پر لوک کے بھید ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں جو غفور کو آزماتے ہیں۔

بدری: مجھے معلوم ہے۔

غفور: میں گھر پھونک کر رکھ دیتا ہوں اور کوئی میری چنگاری کو نہیں دیکھ سکتا۔

بدری: اس کا مطلب؟

غفور: مطلب وقت بتائے گا— وہ دیکھو سامنے گھوڑے پر سرفراز آرہا ہے۔

بدری: سوداگروں کے لباس میں تو باء کی مہاراجہ لگ رہا ہے۔

غفور: اونہہ مہاراجہ! تم سب لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہو۔تم ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھتے ہو۔

بدری: بندہ پروری! ذرہ نوازی! آخر شریف ہیں۔ بھلی پوشاک پہن لیں۔تو ایک ذرا میں کچھ کی کچھ صورت نکل آتی ہے۔

سرفراز: کون کہتا ہے کہ ٹھگی جرم ہے۔ ٹھگی فن ہے۔ لباس کی تبدیلی، چہرے مہرے اور شکل و صورت کی تبدیلی، پھر ہر قبیلے کی چال ڈھال، بول چال برتنا، کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے۔ میں اس فن کو کمال تک پہنچاؤں گا— غفور گھوڑے تیار ہیں؟

غفور: جی ہاں سردار— ہم لوگ آپ کے ہمراہ چلنے کے لیے تیار ہیں۔

سرفراز: نہیں میں تنہا جاؤں گا۔

غفور: بے کار ہے۔ اکیلے جانے سے کام نہ بنے گا۔

سرفراز: خاموش۔ جھرنی کا انتظار کرو— بھوانی ماتا کے اشارہ کا انتظار کرو۔

بدری: وہ دیکھیے بگلوں کی قطار پورب سے اڑتی چلی آرہی ہے۔

سرفراز: شگون بہت اچھا ہے بھائیو— اچھا خدا حافظ۔ میں قسمت آزمائی کرتا ہوں۔ آج سے ہمارے قافلے میں ہُن برسے گا۔ میں بھوانی ماتا کی قسم تم سب کو مالا مال کردوں گا۔

بدری: آپ کس طرف جائیں گے سردار۔

غفور: یہاں کے راستے بڑے ٹیڑھے میڑھے ہیں۔

سرفراز: میں اکثر ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرا ہوں غفور— میں تالاب کی طرف جارہا ہوں۔

(چلا جاتا ہے تھوڑی دیر دونوں اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں)

غفور: چلا گیا، چلو ہم واپس چلیں۔

بدری: کیوں؟

غفور: آج کا دن بھی بیکار گیا۔ کیا مرغابیوں کی گردن میں رومال ڈال کر شکار کرے گا! تالاب اونہہ! تالاب کے کنارے اسے کون ملے گا۔ سوٹھائی بڑا مشکل کام ہے تجربہ چاہیے۔

بدری: مگر بھوانی ماتا کا شگون اچھا ہے۔

غفور: گھوانی ماتا بھی کبھی کبھی اپنی مایا دکھاتی ہیں آؤ چلیں۔

تیسرا منظر

(جنگل میں تالاب کے کنارے صبح کے ۸ بجے)

نوجوان لڑکی: اے......اے......سنو......بات سنو۔

سرفراز: مجھ سے کچھ کہا تم نے۔

نوجوان لڑکی: ہاں ہاں تم سے کہا۔ کوئی غضب ہوگیا۔ آدمی آدمی سے بات کرتا ہے۔

سرفراز: کیا کام ہے؟

لڑکی: ارے اب میل بھر دور سے تھوڑا ہی بتاؤں گی کیا کام ہے۔ ذرا پاس آؤ۔ ایک نظر دیکھوں تو، شریف آدمی ہو کہ یوں ہی چلتے پھرتے چور اُچکے ہو۔

سرفراز: آپ کی تعریف؟

لڑکی: میرا نام ہے مور پنکھی۔ شریف گھرانے کی باندی ہوں۔ نواب سبزی خاں کا نام سُنا ہے۔ میری ماں کریمہ ان کی پرانی کنیز ہے ـــ اور تم ـــ

سرفراز: میرا نام ایسا خوبصورت تو نہیں ہے۔

لڑکی: وہ تو صورت سے ظاہر ہے۔ ہوگا یہ کلو خاں۔ حشمت بیگ وغیرہ۔

سرفراز: میرا نام ہے سرفراز مرزا۔

لڑکی: کام؟

سرفراز: بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانا۔

لڑکی: یا راستہ چلتے ہوؤں کو ہسکانا۔

سرفراز: آپ کہیئے۔ کیاارادہ؟

لڑکی: میرا ارادہ، دیکھئے اعلیٰ حضرت۔ نواب سبزی خاں بہادر سفر پر نکلے ہیں۔ مجھے نگوڑا یہ جنگلوں میں مارے مارے پھرنا اچھا نہیں لگتا۔ نواب صاحب سال بھر میں ایک دفعہ سسرال جاتے ہیں تو شکار کی دھت میں جنگلوں میں ٹھہرے ہوئے جاتے ہیں، تم بھی شکاری ہو؟

سرفراز: ہاں شکار سے مجھے شوق ہے مگر بڑے شکار سے۔

لڑکی: تم نے کبھی شکار کیا بھی ہے؟

سرفراز: شکار کرنے کا ارادہ ہے۔

لڑکی: تم نے خون کا مزہ چکھا ہے کبھی، اس جانور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہیں جس کی گردن مروڑ دی گئی ہو اور جو گھائل ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے زمین اور آسمان کو دیکھ رہا ہو اور اپنے جوڑے پر حسرت کی نظر ڈال رہا ہو۔

سرفراز: موت میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

لڑکی: میرا دل پھٹتا ہے۔ نواب سبزی بہادر کا سارا قافلہ تو روانہ ہو چکا ہے۔ بس میں اور خیرو نواب صاحب کے ساتھ ہیں۔ تنہائی میں دم بولا یا جاتا ہے۔ میں ذرا خیمے سے نکلی تو راستہ بھول گئی، مجھے خیمے تک پہنچا دو گے؟

سرفراز: تمھیں یوں اکیلے نہیں پھرنا چاہیے۔

لڑکی: کیوں؟

سرفراز: تم جوان ہو۔

لڑکی: بس—؟

سرفراز: خوبصورت ہو۔

لڑکی: بس—؟

سرفراز: کم عمر ہو، حسین ہو، تجربہ کار ہو، کامنی ہو، چنبیلی کی ڈالی اور گلاب کے پھول کی طرح نرم و نازک ہو۔

لڑکی: اوہو سچ مچ، کیا میں سچ مچ خوبصورت ہوں؟ سب یہی کہتے ہیں۔ کوئی نہیں بتاتا خوبصورتی کسے کہتے ہیں تمھیں معلوم ہے؟

سرفراز: ہاں معلوم ہے۔

لڑکی: بتاؤ۔

سرفراز: خوبصورتی اس شراب کو کہتے ہیں جو ایک نظر میں مست کر دیتی ہے اور جس کا نشہ زندگی بھر نہیں اترتا۔

لڑکی: ارے...... ارے...... تب تو چلو، میں تمھیں نواب سے ملاؤں گی وہ بھی شاعر ہیں۔ کیا کیا غزلیں لکھتے ہیں۔ غضب کرتے ہیں اماں کہتی ہیں، بہت قابل آدمی ہیں ایک غزل لکھی تھی:

چھپا ہے مانگ میں دل اب بتاؤ ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات اِدھر ہے اور آدھی رات اُدھر

سرفراز: ہاہاہا مزا آ گیا— چلو میں تمھیں خیمے کے راستے کی طرف لے چلتا ہوں۔ بتاؤ تو سہی کدھر ہے وہ خیمہ؟

لڑکی: یہ جو سامنے شیشم کے پیڑ ہیں ان سے بائیں طرف جا کر دائیں کو مڑتے ہیں تو ڈھاک کا جنگل آتا ہے بس وہیں۔ مگر مجھے ٹھیک راستہ نہیں آتا۔

سرفراز: میں راستہ ڈھونڈ لوں گا۔ چلو۔

(تھوڑی دیر تک خاموش چلتے رہتے ہیں)

لڑکی: تمھیں گانا آتا ہے۔

سرفراز: ہاں کچھ کچھ۔

لڑکی: تم جوان ہو خوبصورت ہو کم عمر ناتجربہ کار ہو پھر گانا بھی آتا ہے۔ ارے تم مجھے پہلے سے کیوں نہیں ملے۔ میں تم سے پیار کرتی تمھیں چُرا کر لے جاتی— ایک بات بتاؤں۔ سچ کہنا ٹھیک، ہے نا تم سوداگر ہو (ہنستی ہے) ہے نا یہی بات۔

سرفراز: ہاں اور اس وقت جان اور مال کا سودا کر رہا ہوں۔

لڑکی: لاؤ۔ ہم خریدتے ہیں۔

سرفراز: گانا آتا ہے تمھیں؟

لڑکی: ہاں ناچنا بھی آتا ہے۔ وہ کتھک ناچتی ہوں کہ کالکا اور بنداوین میرے سامنے پانی بھریں۔

سرفراز: تو کب؟

لڑکی: آج رات کو؟ دیکھو وہ خیمے نظر آنے لگے۔ چلو تمھیں نواب سے ملواؤں۔

چوتھا منظر

(نواب صاحب کا خیمہ۔ دن کے یہی کوئی ۹ بجے)

نواب: کیا شربت ہے۔ خیر و مگر کریمہ کے ہاتھ سے اس کی لذت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ آہاہا۔ خدا کی قسم اگر ہم سکندرِ اعظم ہوتے اور ساری دنیا پر ہماری حکومت ہوتی تو سبزی کے لیے ہم اپنی آدھی حکومت بخش دیتے۔ ایک پیالہ اور — اور یہ مورپنکھی کہاں چلی گئی۔ واللہ رات اس نے کیا کتھک ناچا ہے۔

مورپنکھی: یہ دیکھیے۔ سوداگروں کے بادشاہ سرفراز مرزا!

نواب: آیئے حضرت۔ یعنی جنگل میں بھی سوداگری۔ بھئی حد ہے۔ دنیا کام کی دیوانی ہے۔ اس کی قسمت میں عیش نہیں۔ میاں مسافر یہ مورپنکھی تمھیں کہاں سے پکڑ لائی۔

سرفراز: یہ راستہ بھول گئی تھیں۔

نواب: یہ بھی خوب ہے۔ یہ تو دوسروں کو راستہ بھلانے کے لیے کافی ہے۔ بھئی ایمان سے کہنا یہ سج دھج یہ الھڑ پن۔ یہ قیامت کی شوخی، مستی، البیلا پن، خوبصورتی، گلاب کی پنکھڑی کی سی نزاکت، کہیں دیکھی ہے تم نے۔ اس کی آنکھیں شبنم سے بھرے کنول۔ اس کے بال برسات کی کالی گھٹا — اور ناچنے میں بھی قیامت ہے۔ بجلی ہے۔ طوفان ہے — تم نے اسے دیکھ کر خدا کی قدرت کے سامنے سجدہ کیا تھا یا نہیں؟

سرفراز: آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔

نواب: اچھا یہ بتاؤ کیا شغل کروگے سبزی[1] پیوگے؟

سرفراز: جی نہیں۔ اس نعمت سے محروم ہوں۔

نواب: لاحول ولاقوۃ۔ اس کو زندگی اس لیے دی گئی ہے کہ عیش کرے۔ سوداگری تو مرنے کے بعد بھی ہوسکتی ہے۔ عیش کرلو عیش۔

سرفراز: جی ہاں قبلہ صحیح فرمایا۔

نواب: پھر کس چیز سے شغف ہے؟

سرفراز: شکار سے۔

نواب: خوب خوب، چلو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

سرفراز: میرے ساتھ تو کئی دیوانے ہیں۔

نواب: یعنی کہ سوداگروں کا پورا قافلہ ہے۔

سرفراز: جی ہاں۔

نواب: کوئی شکاری بھی ہے۔

سرفراز: ایک سے ایک بڑا شکاری ہے۔ نواب صاحب۔ کیا مجال ہے کہ نشانہ خطا ہو جائے۔ بلم، بندوق، تلوار، لاٹھی، برچھی، تیر۔ ہر ہتھیار میں ماہر۔ ہر چیز میں استاد۔

نواب: میاں خیرو۔ بستر باندھو۔ ہم ان لوگوں کے قافلے کے ہمراہ جائیں گے۔ کچھ دن سیر شکار ہو جائے۔ کہاں روز روز گھر سے نکلنا ہوتا ہے۔

سرفراز: مگر حضور کے پاس قیمتی سامان ہے۔

نواب: ہے تو کیا ہوا۔

سرفراز: پھر اگلی منزل پر آپ کے ساتھی آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

نواب: وہ اپنی راہ چلے جائیں گے ہم چند دن بعد پہنچے تو سمجھیں گے شکار چلے گئے۔

سرفراز: نہیں قبلہ میں اس کی رائے نہ دوں گا۔ سفر کا معاملہ ہے اور وہ بھی جنگل کا۔ راستے چور اُچکوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو مجھے شرمندگی ہوگی۔

نواب: (بے فکری سے ہنستا ہے) شکاری ہو کر ڈرتے ہو۔ ارے موت سے آنکھیں لڑاتے ہیں میاں خیرو سامان باندھو۔

مور پنکھی: لیجئے۔ حقہ حاضر ہے۔

نواب: لومیاں سوداگر مورپنکھی نے تمھارے لیے خود حصہ تازہ کیا ہے پیو۔

سرفراز: میری خوش قسمتی۔

نواب: تم سچ مچ بڑے خوش قسمت ہو۔

پانچواں منظر

(اسمٰعیل کا خیمہ۔ دن چڑھ آیا ہے۔ سہ پہر کا وقت)

سرفراز: میری بڑی خوش قسمتی کہ آپ سے نیاز حاصل ہوا۔ یہ ہیں ہمارے خیمے۔ یہ ہمارے سوداگر بھائی ہیں۔

اسمٰعیل: نیاز مند کو اسمٰعیل مرزا کہتے ہیں۔

نواب: سبحان اللہ آپ لوگوں نے تو جنگل میں منگل کر دیا ہے۔ بس صرف خواتین کی کمی ہے۔ ورنہ گھر کا مزہ آتا۔

اسمٰعیل: جی ہاں مگر سوداگر بچے کہاں اپنے خاندان کو لئے لئے پھریں۔ ہمارا کیا ہے آج یہاں ہیں کل وہاں ہیں۔

نواب: مورپنکھی — تم آگئیں۔

مورپنکھی: میں نہ آتی۔ میں نے ہی تو ڈھونڈا ہے سرفراز مرزا کو۔ ٹھگوں اور چوروں کے جنگل میں اکیلے بڑا ڈر لگتا تھا۔ خدا کی قسم میں تو سہم گئی تھی۔

سرفراز: ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

نواب: سبزی اور خوبصورت لڑکی سے موت بھی بھاگتی ہے۔ ارے بھائی اب کیا دیر ہے سب کو بلاؤ۔ بھائی برادروں کو جمع کرو۔ میاں خیرو سے کہو طبلہ لائیں سازندہ تو یہاں کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ جم جائے محفل ہمیں سونے پن پر نفرت ہے خدا کی قسم اپنی زندگی تو رنگ رلیوں ہی میں کٹ گئی۔

سرفراز: جوار شاد، استاد غفور خاں۔ نواب صاحب کے پاس بیٹھو۔ سیٹھ بدری پرشاد۔

نواب: آیئے سیٹھ جی آپ اِدھر آیئے۔ بخدا ہم بہت خوش ہیں۔ آپ لوگ مل گئے۔ سفر جنت

بن گیا۔ میاں زندگی کیا ہے۔ یہی دو گال ہنسنا بولنا۔ مور پنکھی۔ آج کوئی پھڑکتی ہوئی چیز سناؤ کہ روح جھوم اُٹھے۔

(مور پنکھی کی آواز رس گھولتی ہوئی فضا میں پھیل جاتی ہے۔)

(رقص)

سرفراز: حضور تعریف نہیں ہو سکتی۔ چھلاوا ہے بجلی ہے کرشمہ ہے۔

نواب: مور پنکھی، ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔ تم جانتے ہو سرفراز — ہم دو چیزوں سے زندہ ہیں۔ تم کہو گے پانی اور ہوا۔ نہیں ہم وہ نہیں ہیں (گدھا رینگتا ہے) وہ گدھے اور ہوں گے ہم تو سبزی اور مور پنکھی سے زندہ ہیں۔

سرفراز: غفور خاں۔ یہ کس جانور کی بولی تھی۔

غفور: جھرنی

نواب: یہ کون جانور ہوتا ہے۔

سرفراز: یہ خاص اسی جنگل کا جانور ہے۔ بڑا لذیذ ہوتا ہے اور اس کے شکار میں وہ مزا ہے کہ حضور شیر کا شکار بھول جائیں گے۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ عجیب وغریب چیز ہے مگر ذرا دو چار دن میں قابو میں آتا ہے۔ بڑا ہانکا کرانا پڑتا ہے۔

نواب: کوئی بات نہیں۔ مور پنکھی۔ تم یہاں رہنا۔ شام تک خیرو کو بھیجیں گے نہیں تو یہ سب شریف آدمی ہیں یہ بوڑھے باپ کے برابر اسمٰعیل مرزا ہیں۔ گھبرانا مت۔ ہم شکار سے واپس آکر تمھیں لے چلیں گے۔ دراصل ہم نے بڑی غلطی کی تمھیں پہلے قافلے کے ساتھ بھیج دینا چاہیے تھا۔

مور پنکھی: ہم آپ کے ساتھ شکار پر چلیں گے۔ ہم سے نہیں رہا جائے گا۔

نواب: اچھا دیکھا جائے گا تم تھوڑی دیر آرام کرلو تھک گئی ہوگی۔

سرفراز: تمھارے لیے خیمہ سجا دیا گیا ہے جاؤ آرام کرو۔

مور پنکھی: دیکھئے میرے پیچھے شکار پر نہ چلے جایئے گا۔

نواب: پگلی۔ جا آرام کرلے۔

اسمٰعیل: سفر آپ کی وجہ سے بڑا اچھا کٹ رہا ہے۔

نواب: یہ آپ کیا کہتے ہیں حضرت۔ یہاں تو مستقل دم حلق میں اٹکا رہتا تھا۔ سارے ہتھیار پاس اتنے آدمی ساتھ مگر سفر میں خطرہ لگا ہی رہتا ہے۔ اب آپ ایسے لوگوں کا ساتھ ہو گیا۔ خطرہ نہیں رہا۔ کچھ سبزی کا شغل رہا۔

اسمٰعیل: حقہ ملاحظہ کیجئے۔

نواب: خوب (حقہ کا کش لگاتے ہیں) جناب سبزی بھی خوب چیز ہے۔ چلّو میں اُلو۔ نہ غم زرد نہ غم کالا۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ دو پیالے غٹا غٹ چڑھا کر جو شیر کے شکار کو نکلا تو تانڈ تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ شیر ببر ایک ایک کلاّ دس دس من کا اینڈتا اکڑتا چلا آ رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی چنگھاڑ ماری جست مار کر حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ ڈپٹ کر جو میں نے لنگڑی ماری ہے تو دھوبی پاٹ پر کس لیا۔ چت کر کے وہ گھونسے وہ لاتیں ماریں کہ چیں بول گیا۔ میرا بھی شباب تھا۔ زمین پر ٹھوکر ماردوں تو پانی نکل آئے۔ ایسا دم دبا کر بھاگا کہ آج تک صورت نہیں دکھائی۔"

سرفراز: سبحان اللہ سبحان اللہ۔ نواب صاحب آپ پان سے شوق فرمائیں گے۔

اسمٰعیل: پان حاضر ہے— مگر تمبا کو (بلند آواز میں) ارے ہے کوئی تمبا کو لاؤ۔

(تھوڑی دیر گڑ بڑ اور ہلچل مچتی ہے۔ نواب کا گلا سرفراز رومال سے گھونٹ دیتا ہے۔ نواب بے دم ہو کر گر پڑتا ہے لوگ اس کی لاش لے جاتے ہیں۔)

سرفراز: مر گیا کم بخت۔ رومال کی گرفت کافی دیر سخت کرنی پڑی۔

اسمٰعیل: مبارک ہو سرفراز مبارک ہو۔ پہلا شکار مبارک ہو۔ شاباش میرے بیٹے شاباش۔

غفور: مبارک۔

بدری: مبارک ہو۔

سرفراز: اگر تم دونوں نواب کے پیر اتنی اچھی طرح نہ پکڑتے تو اس قدر تیزی سے میں اس کی گردن کو رومال میں نہ جکڑ سکتا۔ میرے بھائیو۔ یہ ہم سب کا حصہ ہے۔

بدری: اور اس کا نوکر خیرو؟

سرفراز: اسے دوسرے خیمے میں قتل کر دیا گیا۔

بدری: قبر؟

سرفراز: لگھائیوں نے قبریں تیار کر رکھی ہیں ابھی ایک منٹ میں ہم ان دونوں کا نشان ختم کر دیں گے۔

غفور: مور پنکھی کا کیا ہوگا؟

سرفراز: عورت کا قتل نہیں ہوگا۔ ہم اس سے کہہ دیں گے کہ نواب صاحب شکار چلے گئے۔

غفور: اور مال؟

سرفراز: پانچ ہزار روپیہ نقد اور دس ہزار کا سامان۔ یہ سب ہمارا ہے۔ ہم سب کا ہے۔ یہ میری سرداری کا پہلا تحفہ ہے۔ آج یہ سب بانٹا جائے گا۔

بدری: مبارک ہو۔ سردار پہلی کامیابی مبارک ہو۔

سرفراز: بدری — میرے بھائی یہ میرا فرض تھا۔ میں بھوانی کا ادنیٰ سیوک ہوں — جلدی کرو۔ لگھائیوں سے کہو قبریں پاٹ کر زمین ہموار کر دیں اور اس پر فرش بچھا دیں۔ آج رات کو اس جگہ مور پنکھی پھر ناچے گی اور سنو غفور تم قافلے کے تین چار آدمیوں کو سفر پر روانہ کر دو۔ مور پنکھی سے کہہ دیں گے کہ ہمارے آدمیوں کو بھی نواب صاحب شکار پر لے گئے ہیں۔

بدری: بہت اچھا۔

سرفراز: یہ سب کام فوراً ہونا چاہیے۔

بدری: ابھی ہو جائے گا۔

سرفراز: ابا جان آپ سارا مال جمع کر کے اس کے بٹوارے کا انتظام کریں۔

اسمٰعیل: ابھی بٹوارہ ہوا جاتا ہے — بیٹے تو نے آج میرے بڑھاپے کی لاج رکھ لی۔ میں بھی جوانی میں اسی طرح رومال کے ایک جھٹکے سے گردن کو چٹخا دیا کرتا تھا۔ میرا سر آج غرور سے بہت اونچا ہو گیا ہے۔

سرفراز: آج میں نے پہلی بار انسانی خون کا مزہ چکھا ہے۔ پہلی بار میں نے انسان کو اپنے ہاتھوں

مرتے دیکھا ہے۔ یہ انسان قدرت کے ہاتھ کا کھلونا انسان (قہقہہ لگاتا ہے)

اسمٰعیل: بھوانی تیرے دل کو سکون اور تیرے ہاتھوں کو طاقت دے میرے بیٹے۔

سرفراز: انسان جو مغرور گھمنڈی، فرعون، خدائی کا دعویٰ کرنے والا انسان ایک معمولی سے کپڑے کی گرفت میں دم توڑ دیتا ہے۔ اس کا سارا گھمنڈ، ساری چالاکی، ساری دانشمندی اور علمیت بس رومال کے ایک پیچ میں ختم ہو جاتی ہے۔ کیسی آنکھیں اُبل آئی تھیں۔ کیسے نرخرا خرخر کرنے لگا تھا۔ کس طرح رگیں پھٹنے لگی تھیں اور اشرف المخلوقات کی ساری شیخی کرکری ہوگئی۔ انسان تو دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ ہے انسان۔ (پھر قہقہہ لگاتا ہے)

بدری: سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

سرفراز: زمین برابر کر دی گئی۔

غفور: جی ہاں۔ فرش بچھا کر لوبان اور اگر سلگا دیا گیا۔

سرفراز: یہ اس قافلے کا سات سو انیسواں شکار تھا۔

(ایک دم مور پنکھی بھاگتی ہوئی آتی ہے شام ہونے لگی ہے)

مور پنکھی: نواب صاحب سچی بڑا اچھا خواب دیکھا ہے میں نے بڑا اچھا سا خواب......ایں......
نواب صاحب کہاں ہیں۔

سرفراز: آؤ۔ اندر مور پنکھی۔

مور پنکھی: نواب صاحب کہاں گئے۔

سرفراز: نواب صاحب۔

مور پنکھی: مجھ سے چھپا رہے ہونا! چلے گئے ہوں گے شکار پر۔ مجھ سے چوری چوری چلے گئے۔ کہہ دیا تھا میں نے کہ مجھے لے کر جایئے گا۔ بہانے بنانا تو کوئی ان سے سیکھے۔ مجھے بیٹی کی طرح پالا پوسا لاڈ کیا مگر مجھے چھوڑ کر چلے جانے کی عادت نہ گئی۔

سرفراز: گھبرانے کی کوئی بات نہیں مور پنکھی۔ وہ شکار سے جلد واپس آجائیں گے۔

مور پنکھی: ان کا کوئی ٹھیک نہیں۔ اگر لمبے نکل گئے تو بھلا میں گھر کیسے پہنچوں گی۔

سرفراز: کیا سچ مچ تمھیں گھر پہنچنے کی فکر ہے۔

مورپنکھی: کسے نہیں ہوتی۔

سرفراز: بہت سے لوگوں کو گھر کی فکر ہوتی ہے مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جو جہاں رہتے ہیں وہیں گھر بنا لیتے ہیں۔

مورپنکھی: (کھسیانی ہنسی ہنستی ہے) اچھا......؟ (پھر اس طرح ہنستی ہے)، اچھا......نواب صاحب کہتے ہیں۔

سرفراز: کیا کہتے ہیں۔نواب صاحب۔

مورپنکھی: کہتے ہیں......اچھا تم بتاؤ کیا کہتے ہیں۔

سرفراز: مجھے کیا معلوم؟

مورپنکھی: کہتے ہیں۔مورپنکھی کے ہاتھ تو مور جیسے خوبصورت آدمی کے ہاتھ میں تھماؤں گا۔اس کے ہاتھ پیلے کردوں گا تو مجھے بے فکری ہو اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔مجھے شرم آتی ہے۔

سرفراز: تمھیں اور شرم؟

مورپنکھی: کیوں؟ کیا میں عورت نہیں ہوں۔کیا میں دل نہیں رکھتی۔

سرفراز: تمھارے دل بھی ہے؟

مورپنکھی: بہت بڑا۔بہت اچھا سا دل۔بڑا چنچل دل ہے۔ایک بات تمھیں بتاؤں؟

سرفراز: بتاؤ۔

مورپنکھی: جب میں تالاب کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور میں نے تمھیں اس طرح آواز دی تھی ''اے......اے......ذرا سننا۔'' تو میں نے تمھیں تھوڑی ہی آواز دی تھی۔

سرفراز: اور کس نے آواز دی تھی؟

مورپنکھی: میرے چنچل دل نے۔

سرفراز: کیوں؟

مورپنکھی: بس یوں ہی۔ہمیں اچھے لگے۔ہم نے بلا لیا۔دل نے کہا اس آدمی کو لے لو۔اسے ہتھیا لو۔اسے اپنا لو۔

سرفراز: سچ؟

مور پنکھی: ہاں سچ؟ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ کبھی کبھی بولتے ہیں۔ بہت کم۔

سرفراز: پھر تمھارا کیا فیصلہ ہے؟

مور پنکھی: ہم نے اپنالیا۔ ہتھیالیا۔ تم ہمارے قبضے میں ہو۔ بولو منظور۔

سرفراز: تم جلد باز ہو۔ بہت جلد باز ہو مور پنکھی۔ تمھیں کیا معلوم میں کون ہوں۔

مور پنکھی: اچھے نیک دل شریف آدمی ہو۔

سرفراز: تم نے میرا دل کہاں دیکھا ہے؟

مور پنکھی: تمھارے ماتھے پر۔ ہر ایک کا دل اس کے ماتھے پر صاف دکھائی دیتا ہے۔

سرفراز: تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔

مور پنکھی: اس کی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے انسانوں پر بھروسہ کرنا سیکھا ہے۔

سرفراز: تم میرے اوپر بھروسہ کروگی۔ میرے اوپر؟

مور پنکھی: (ہنستی ہے) کیوں نہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ انسان انسان پر بھروسہ کرتا ہے۔

سرفراز: میرے پاس دولت نہیں۔

مور پنکھی: میرے پاس ہے۔ نواب صاحب نے اپنی ساری جائیداد میرے نام لکھ دی ہے۔

سرفراز: مور پنکھی!

مور پنکھی: تمھیں کیا ہوا۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ تم آرام کرو۔ میں تمھیں پنکھا جھلوں گی۔

سرفراز: انسان تو دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔

غفور: میں اندر آسکتا ہوں۔

سرفراز: آؤ۔ غفور۔ کہو کیا بات ہے؟

غفور: دادا نے آپ کو بلایا ہے۔

سرفراز: ابا جان نے بلایا ہے مور پنکھی۔ تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

چھٹا منظر

(اسمٰعیل کا خیمہ۔ سرِشام)

اسمٰعیل: ہاں میں نے تمھیں بلایا تھا۔

سرفراز: جی۔

اسمٰعیل: اس لڑکی کو کیوں قتل نہیں کیا گیا۔

سرفراز: آپ نے کہا تھا عورت کا قتل جب تک ضروری نہ ہو نہ کیا جائے۔

اسمٰعیل: مگر اس کی موت ضروری ہے۔

سرفراز: کیوں؟

اسمٰعیل: یہ بھید اس سے چھپنا مشکل ہے اور اگر بھید اس پر ظاہر ہو گیا تب بھی اس کی جان لینی ہم پر فرض ہو جائے گی۔

سرفراز: اس پر کوئی بھید ظاہر نہیں ہو گا۔ ہم اسے قافلے کے ساتھ اس کے گھر پہنچا دیں گے۔

اسمٰعیل: یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے سرفراز! ایک بات بتاؤ۔

سرفراز: جی!

اسمٰعیل: تمھیں اس کے بونیج[1] قرار دیے جانے پر اعتراض ہے۔ تم اس کی موت روکنا چاہتے ہو۔

سرفراز: میں؟ میں نہیں جانتا۔

اسمٰعیل: (گرج کر) صاف صاف جواب دو۔

سرفراز: میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اسمٰعیل: عورت زہر کا پودا ہے۔ عورت ناگن کی پھنکار ہے۔

سرفراز: مگر بھوانی ماتا خود بھی عورت کا سروپ ہے۔

اسمٰعیل: دیویوں کی باتیں نہ کرو۔

سرفراز: ہو سکتا ہے مور پنکھی بھی دیوی کا سروپ ہو۔

اسمٰعیل: تمھارا دماغ پھر گیا ہے — اس لڑکی کی موت ضروری ہے اور وہ بھی تمھارے ہاتھ سے۔

سرفراز: ابا جان!

۱۔ بونیج۔ وہ شخص ہے جسے ٹھگی کے قانون کے مطابق واجب القتل قرار دیا گیا ہو۔

اسمٰعیل: کیا ہوا؟ ڈرتے ہو؟

سرفراز: نہیں۔

اسمٰعیل: پھر کیا عورت کے حسن کا جادو تم پر چل گیا ہے

سرفراز: نہیں۔

اسمٰعیل: پھر —— میں کہتا ہوں اس کی موت ضروری ہے اور اسے تمھارے ہاتھ سے مرنا ہے۔ مت بھولو کہ تم نے ٹھگی کے قانون پر عمل کرنے کا حلف اٹھایا ہے اور۔

سرفراز: نہیں۔ اس حلف سے پھرنے کی سزا موت ہے۔

سرفراز: میں سمجھتا ہوں اس کی موت ضروری نہیں۔

اسمٰعیل: بالکل ضروری ہے —— موقع کی تاک میں رہو۔ اسے بونیج قرار دو۔ ضروری ہدایت دو۔ سارا انتظام کر لیا جائے۔

سرفراز: ابا جان یہ ظلم ہے!

اسمٰعیل: یہ فرض ہے سرفراز!

سرفراز: آپ نے کبھی میری بات نہیں ٹالی۔ آج میری ایک بات مان لیجئے۔

اسمٰعیل: کہو۔

سرفراز: مور پنکھی کو اس وقت تک زندہ رہنے دیجئے جب تک اسے ہمارے بھید کی خبر نہ ہو۔ جس وقت اسے ہمارا بھید معلوم ہو گیا میں قسم کھاتا ہوں میں خود اسے اپنے ہاتھ سے مار ڈالوں گا۔ میں اسے بونیج قرار دے دوں گا۔

اسمٰعیل: بے کار ہے۔

سرفراز: صرف ایک بار موقع دیجئے۔ آئندہ کبھی آپ کے حکم سے انکار نہ کروں گا۔

اسمٰعیل: ضد کرتے ہو — چلو آزما دیکھو — مگر جس لمحے اسے راز معلوم ہو گا اس وقت اسے بونیج قرار دے کر جان سے مارنا ہو گا۔

سرفراز: مجھے منظور ہے۔

ساتواں منظر

(خیموں کے باہر کا میدان وہی وقت)

(غفور کا قہقہہ سنائی دیتا ہے)

غفور: (قہقہہ لگ کر) تین دن کی سرداری۔

بدری: غفور! تم پھر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔

غفور: ایک۔ دو۔ تین——تین دن کی سرداری اور پھر اندھیری رات۔ میں بھوانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں سرفراز کی نیت صاف نہیں۔ وہ ٹھگی کے قاعدوں سے ہٹ رہا ہے۔

بدری: کیا مطلب؟

غفور: اس لڑکی کے جال میں پھنس کر وہ ٹھگی کے قانون بھول رہا ہے۔ اسے لڑکی کے بھید معلوم ہونے کا خطرہ ہے۔ اسے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی موت ضروری ہے۔ اس کے پاس قیمتی زیور ہیں۔ اچھی اچھی پوشاک ہے۔ پیسہ ہے۔ اس کی موت ضروری ہے۔

بدری: تم سردار پر الزام لگا رہے ہو۔

غفور: میں قانون سے ہٹنے والوں کو سردار نہیں مانتا۔ اپنے سردار سے پوچھو لڑکی قتل کیوں نہیں کی گئی۔ صرف اس لیے کہ تمھارے سردار اس کے ساتھ گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ عیش کر رہے ہیں۔ یہ ظلم ہے۔ ہم سب کے ساتھ بے انصافی ہے۔

بدری: اور سردار پر شک کرنا بے انصافی نہیں؟

غفور: اگر وہ لڑکی قتل نہ کی گئی تو میں سرفراز کو سردار ماننے سے انکار کر دوں گا۔

بدری: چلو——مور پنکھی کا ناچ شروع ہونے والا ہے۔

(دور سے رقص کی دُھن سنائی دیتی ہے جو دھیرے دھیرے قریب آتی جاتی ہے)

غفور: مور پنکھی کا ناچ— نواب صاحب کی قبر پر (پھر اس قدر خوفناک طریقے پر قہقہہ لگاتا ہے) کل مور پنکھی کی قبر پر سرفراز کا ناچ بھی دیکھنا ہے۔

(رقص کی دھن قریب آجاتی ہے دونوں خیمے کے اندر چلے جاتے ہیں۔)

آٹھواں منظر

(رات بھیگ چکی ہے۔ مور پنکھی کا خیمہ)

سرفراز: تمھیں اس خیمے میں کچھ تکلیف ہے؟

مور پنکھی: نہیں۔ آج میرا ناچ کیسا تھا؟

سرفراز: بہت اچھا تھا۔

مور پنکھی: کیسے مرے ہوئے دل سے تعریف کر رہے ہو۔

سرفراز: ہاں میں تم سے ایک بات کہنا بھول گیا۔

مور پنکھی: کیا؟

سرفراز: نواب صاحب نے آدمی بھیجا ہے ان کی طبیعت شکار میں خراب ہوگئی ہے۔ وہ گوالیار چلے گئے ہیں۔ وہیں سے گھر چلے جائیں گے۔ میری رائے میں تمھارے لیے بھی گھر جانا مناسب ہوگا۔

مور پنکھی: اور تم ——؟

سرفراز: مجھے ابھی سوداگروں کی ٹولی کے ساتھ احمد آباد جانا ہے مگر میں تمھیں واپس پہنچوانے کا انتظام کر دوں گا۔

مور پنکھی: میرے گھر؟

سرفراز: ہاں تمھارے گھر۔

مور پنکھی: مجھے ایک بات بتاؤ گے۔

سرفراز: ضرور۔

مور پنکھی: مگر تمھیں خدا کی قسم سچ سچ بتانا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ دغا نہ دینا۔ نہیں تو میں سچ مچ صدمے سے مر جاؤں گی۔

سرفراز: پوچھو۔

مور پنکھی: کیا تم مجھ سے دور رہنا چاہتے ہو کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے۔ کیا مجھے اپنے سے ہمیشہ کے لیے دور کر دینا چاہتے ہو؟

سرفراز: مور پنکھی۔

مور پنکھی: بتاؤ——خدارا بتاؤ۔

سرفراز: یہ سب کیوں پوچھتی ہو؟

مور پنکھی: یہ اس لیے پوچھتی ہوں کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ تمھیں چاہتی ہوں۔ تمھارے اوپر اپنا مال، اپنی جان، اپنی عزت، اپنی راحت سب کچھ نچھاور کر سکتی ہوں میرے لیے تمھاری چاہت انمول ہے۔

سرفراز: مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو۔

مور پنکھی: جواب دینا نہیں چاہتے۔

سرفراز: تم آخر مجھے اتنا اچھا کیوں سمجھتی ہو۔ تم کیوں بن مانگے میرے لیے سب کچھ نچھاور کر رہی ہو۔ میں تمھاری محبت کے قابل نہیں ہوں۔ میں تمھاری پوجا کے لائق نہیں ہوں۔ مور پنکھی تم بہت اچھی ہو مگر میں دیوی کے سنگھاسن پر اپنی ناپاک پرچھائیں کیسے پڑنے دوں——مجھے معاف کر دو دیوی مجھے معاف کر دو۔

مور پنکھی: (ہنستی ہے) تم میری ہنسی اڑاتے ہو سرفراز مرزا (دوبارہ ہنستی ہے) بڑے بے رحم ہو تم، میں تمھاری طرح ہوشیار نہیں ہوں۔ میں کچھ نہیں سمجھتی کچھ بھی نہیں جانتی۔ بس تم سے ایک دلاسا چاہتی ہوں۔

سرفراز: میں تمھیں کیسے دلاسا دے سکتا ہوں مور پنکھی؟

مور پنکھی: میں تم سے صرف ایک فیصلہ چاہتی ہوں۔ اگر مجھے اپنے سے دور رکھ کر تمھارا دل خوش ہوتا ہے تو مجھے جہاں چاہو بھیج دو میرے گھر بھجوا دو، گوالیار بھیج دو۔ کہیں بھیج دو میں چلی جاؤں گی مگر تمھارے بغیر خوش نہ رہ سکوں گی۔ مجھے زندہ دیوار میں چُن دو۔ میں زبان سے اُف نہ کروں گی اور اگر تم مجھے پسند کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو تو مجھے کنیز کی طرح اپنے پیروں میں پڑا رہنے دو۔ ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔ ہمارے بچے اس کچے آنگن میں کھیل کود کر جوان ہوں گے۔ میرے یہی خوشی سب سے بڑی خوشی ہے——میں تمھارے فیصلہ کا انتظار کروں گی۔

سرفراز: یہ سب نہ کہو۔ کچھ نہ کہو۔ مورپنکھی میرے پاس الفاظ نہیں۔ جن سے جواب دیا جاتا ہے۔
میرے پاس زبان نہیں ہے۔ جس سے بات کہی جاتی ہے۔ خاموش کھڑی رہو۔ آج میں تمھیں
جی بھر کر دیکھ لوں جب تک جتنی دیر میرا جی چاہے تمھیں دیکھتا رہوں ــــ دیکھتا رہوں۔

مورپنکھی: (ہنستی ہے) تم بہت عجیب ہو۔ میرا بس چلتا تو خدا سے تمھیں سمجھنے کے لیے ساری دنیا
کی عقل مانگ لیتی۔

سرفراز: کاش تم پتھری کی دیوی ہوتیں تو تمھیں سنگھاسن پر بٹھا کر تمھاری پوجا کرتا۔ تم نے انسان
کو روپ کیوں لے لیا مورپنکھی۔ تم عورت کیوں بن گئیں دیوی؟ یہ تم نے کیا کیا؟

موپنکھی: کیسی الٹی الٹی باتیں کر رہے ہو۔

سرفراز: میری بات مانو میں تم سے درخواست کرتا ہوں، تم یہاں سے چلی جاؤ سمجھ لو کہ سرفراز سے
کبھی تمھاری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بھول جاؤ کہ تالاب کے کنارے تمھیں کوئی ملا تھا۔

مورپنکھی: میں تمھاری سب باتیں مانوں گی۔ میری محبت بھوکی شیرنی نہیں۔

سرفراز: میری محبت تیاگ ہے۔ وہ تمھارے اوپر سب کچھ نچھاور کرنا چاہتی ہے۔ تم سے کچھ لینا
نہیں چاہتی مگر مجھ سے ایسی درخواست نہ کرو۔ جو میرے قابو میں نہ ہو۔ میں نے کہا تھا
میرا دل بڑا چنچل ہے۔

سرفراز: دل وہ چیز ہے جس پر قابو پایا جاتا ہے۔

مورپنکھی: مجھے نصیحت نہ کرو سرفراز۔ میرے بس کی بات نہیں۔

سرفراز: پرسوں ایک قافلہ شمالی ہندوستان کے لیے روانہ ہوگا۔ میں تمھیں اس کے ساتھ بھیج دوں گا
اچھا خدا حافظ۔

مورپنکھی: جانے سے پہلے ضرور ملنا۔ نہیں تو میں کبھی معاف نہ کروں گی۔ نہیں تو میں زندگی بھر
تمھارے لیے ترستی رہوں گی۔

نواں منظر

(سرفراز مرزا کا خیمہ۔ رات کا پچھلا پہر)

سرفراز: بدری۔

بدری: میرے سردار۔

سرفراز: تم میرے دوست ہو۔ میری مدد کرو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

بدری: مجھے سب معلوم ہے سردار۔

سرفراز: مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟

بدری: آپ نے جو کچھ کیا ہے صحیح ہے۔ مگر سرادہر طرف سازشیں ہو رہی ہیں۔ غفور کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔

سرفراز: تم میری مدد کرو گے؟

بدری: دل و جان سے۔

سرفراز: تو سنو۔ آج سے پرسوں مورپنکھی کے روانہ ہونے تک اس کے خیمے کی نگرانی تمھارے سپرد ہے۔ مورپنکھی کو ہمارے بھید معلوم نہ ہونے پائیں۔ دن رات پہرہ دینا۔

بدری: میں تیار ہوں۔

سرفراز: اور پرسوں تم اپنے ساتھ مورپنکھی کو اس کے گھر پہنچا دینا۔

بدری: جو حکم ہو دل و جان سے بجالاؤں گا—— مگر غفور سے ہوشیار رہیے گا سردار۔ اس کے ارادے خطرناک ہیں۔

سرفراز: مجھے معلوم ہے۔ وہ سرداری کے خواب دیکھ رہا ہے۔

دسواں منظر

(اسمٰعیل کا خیمہ۔ رات کا وہی وقت)

غفور: سب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے۔ کم سے کم دس بارہ ہزار کا مال ہے۔ چار آدمی ہیں چاروں سوداگر۔ مال لے کے دسہرہ کے بعد دکن کے لیے نکلے ہیں۔

اسمٰعیل: تمھارے اوپر پورا بھروسہ ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔

غفور: اجی سولہ آنے کا بھروسہ ہے سردار۔ آدھی رات کو کہئے تو آدھی رات کو بلا لاؤں۔ غفور نام ہے میرا۔ سوٹھائی ہوں کوئی مذاق ہے۔ اس میں عمر گزاری ہے حضور کے طفیل سے۔

اسمٰعیل: تو پھر کیا دیر ہے۔

غفور: حکم کی دیر ہے۔ آپ حکم کیجئے۔

اسمٰعیل: میں حکم کرنے والا کون۔ سرفراز تمھارا سردار ہے۔ اس سے حکم لو اور کام شروع کرو۔

غفور: اب میں اپنی زبان سے کیا کہوں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ان دنوں اسے اپنا ہوش ہی کہاں ہے؟

اسمٰعیل: بڑی خطرناک بات ہے۔

غفور: جی ہاں۔

اسمٰعیل: میں نے کہا دونوں باتیں خطرناک ہیں۔ سردار کا رنگ رلیوں میں کھویا رہنا اور تمھارا سردار پر الزام لگانا۔ دونوں خطرناک ہیں۔ سرفراز تمھارا سردار ہے۔ تمھیں اس کا حکم ماننا چاہیے۔

غفور: میں اس کے حکم پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔

اسمٰعیل: لو۔ وہ خود ہی آ گیا۔ سرفراز غفور کیا کہہ رہا ہے۔

سرفراز: کیا ہے غفور۔

غفور: کل چار سوداگر ادھر سے گزر رہے ہیں حکم ہو تو چاروں کو لے آؤں۔ بڑا مال اسباب ساتھ ہے۔ میں نے استاد سے ذکر کیا تھا۔

اسمٰعیل: میں نے کہا۔ سرفراز سے پوچھو۔

سرفراز: ضرور لاؤ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ رات کے کھانے پر ان سب کا تصفیہ ہو جائے گا۔

غفور: بہتر ہے۔

سرفراز: تو کل رات کو۔

غفور: ہاں کل رات کو

گیارھواں منظر

(اسمٰعیل کا خیمہ۔ دوسری رات کے ابتدائی حصے میں)

پہلا سوداگر: چلو اچھا ہی ہے۔ تمھارا ساتھ ہو گیا۔ نہیں تو یہ راستے سنوں ہوں بڑے کھترناک (خطرناک) ہیں۔ چلو جی۔ کس شبھ گھڑی سے کس بھاگیہ وان کا منہ دیکھ کر چلے تھے کہ تم لوگ مل گئے۔ نہیں تو سوداگروں کا سفر تم جانوں بڑا جان جوکھم کا ہووے ہے۔

غفور: سیٹھ جی۔ یہ تو ہمارا سو بھاگیہ ہے کہ ہمارے ہاں آپ پدھارے۔

دوسرا سوداگر: وہ تو پرانی مثل ہے —— جواہر کی قدر جوہری جانے یا بادشاہ۔

غفور: آپ نے بھی حضور کمال کیا۔ جوہری بجے ضرور ہیں۔ گر بادشاہی سے بھلا کیا نسبت ہم لوگوں کو۔ آپ لوگ اونچے سوداگر ہیں۔ آپ کی بات ہی کچھ اور ہے۔

پہلا سوداگر: اجی ایسی بات کیوں سوچو ہو۔ سوداگر بچہ سوداگر بچہ سب برابر ہیں۔ میں تو شگون کو بہت ہی سمجھوں ہوں۔

غفور: اس میں کیا شک ہے۔

پہلا سوداگر: اپنے میم جی ہیں پنڈت رام لکھن۔ بھگوان سوگند۔ جب بھی ان کا منہ دیکھ لیا کاروبار مندا ہی رہا کوئی نہ کوئی نکسان (نقصان) کچھ نہ کچھ گھاٹا۔ اور اپنا ایک رسوئیا ہے۔ نام تو اس کا ہے کلوا۔ مگر جب صبح سویرے منہ دیکھ لوں ہوں۔ اس کا تو چاندی برسے ہے چاندی!

غفور: آیئے براجمان ہو جئے۔ یہ ہمارے استاد ہیں اسمٰعیل یہ ہیں بڑے بازار کے جوہری سرفراز مرزا۔ اور یہ ہیں لالہ چیت رائے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔

پہلا سوداگر: اہو ہو ہو۔ یہاں تو مانو ساری اپنی برادری ہے۔

اسمٰعیل: ساری اپنی نگری کہیئے سیٹھ جی۔

پہلا سوداگر: بڑی سجاوٹ بناوٹ کر کے رکھے ہو استاد اس جنگل میں کوئی خطرو تردد نہیں۔

اسمٰعیل: اجی توبہ کیجئے۔ خطرے کا یہاں کیا کام۔

سرفراز: جی ہاں اس لئے تو ہم لوگ اتنا بہت انتظام کر کے نکلتے ہیں۔

غفور: سیٹھ جی۔اپنے پاس چار چھ بندوقیں تین چار تلواریں تو ہر وقت جانو رہتی ہیں۔

پہلا سوداگر: تو اچھی سنائی۔ہم لوگ بھی اب بے پھکر (فکر) ہو گئے۔

دوسرا سوداگر: سفر اچھا کٹے گا اور چور ڈاکوؤں سے بھی حفاظت کا انتظام ہو جائے گا۔

غفور: اجی سیٹھ جی! چور ڈاکو تو ہماری طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتے۔دیکھیں تو بھگوان سوگند آنکھیں نکال لیں۔

پہلا سوداگر: (عجب طرح ہنستے ہوئے) اچھا جی تب تو بہت ہی اچھا ہے۔

اسمٰعیل: غفور۔

غفور: جی استاد۔

اسمٰعیل: تم بھی ہو بڑے کاروباری آدمی۔چار شریف بچے تمھارے مہمان ہیں اور تم نے خاطر تواضع بھی نہیں کی۔کھانا لگواؤ۔

پہلا سوداگر: نہیں جی۔کرپا ہے آپ کی۔بھوجن سے نشچت ہو کے آئے ہیں۔اب تو سارے راستے ساتھ رہے گا۔کیا فکر ہے ایسی باتوں کی۔

اسمٰعیل: پھر بھی کچھ حقہ پانی، کچھ جل پان۔

پہلا سوداگر: نہیں جی یہی کرپا بہت ہے آپ سب کی کہ ہمیں ساتھ لے لیا نہیں تو بھگوان سوگندھ آج کا زمانہ کلجگ ہے کلجگ۔کون کس کی بھلائی سوچے ہے۔سب اپنی اپنی پوری کچوری میں لگے ہیں۔بھگوان بچائے خون سفید ہو گیا ہے خون۔

اسمٰعیل: آپ نے ٹھیک کہا۔

غفور: استاد یہ کس جانور کی آواز ہے۔(مور کی آواز سنائی دیتی ہے)

اسمٰعیل: مور کی آواز۔

پہلا سوداگر: بڑا اچھا شگون ہے مور کی آواز کان میں آجائے تو مانو ہُن برسنے لگے ہے۔اُس دن تو میں پھولوں نہیں سماؤں ہوں۔

سرفراز: شگون اچھا ہے۔

دوسرا سوداگر: اس شگون پر تو سیٹھ جی نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔

پہلا سوداگر: (ہنستا ہے) جی کچھ مت پوچھو۔ ایک دن کا قصہ کیا ہوا کہ ایک دوکان پر بیٹھا تھا لالہ متھن لال آئے تھے۔ ان کی لڑکی کا بیاہ تھا میں نے شگون دیکھا تو گڑبڑ۔ میں نے سوچا یہ تو بُرا ہوا۔ لالہ متھن لال کو سمجھایا تو اُن کی سمجھ میں نہ آوے۔ آخر ٹھیک بیاہ کے سمے جوان کی پُتری کو چھینکیں آنی شروع ہوئی ہیں تو سچ مانیو منڈپ کی آگ مارے چھینکوں کے بجھ گئی۔

اسمٰعیل: (ہنستا ہے) بہت خوب۔

غفور: تو بڑے تجربے کی بات ہے۔ سیٹھ جی۔ شگون لینا بھی اب آج کل کتنوں کو آتا ہے۔

اسمٰعیل: سیٹھ جی۔ آپ تو واقعی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ ارے کوئی ہے—— پان تمباکو لاؤ۔ (سیٹھ جی اور ان کے ساتھیوں کے گلے گھونٹ دئے جاتے ہیں۔ وہ سب بے دم ہو کر گر پڑتے ہیں۔ ان کی لاشیں لے جائی جاتی ہیں)

سرفراز: سب ٹھکانے لگا دیے گئے کمبخت۔

اسمٰعیل: شاباش۔ ساتھیو شاباش۔

سرفراز: قبریں تیار ہیں۔

مورپنکھی: (چیختی ہوئی داخل ہوتی ہے) یہ تم نے کیا کیا ظالمو تم قاتل ہو۔ تم مجرم ہو تم انسانی خون کے پیاسے ہو، آہ خدایا تو نے مجھے کن بھیڑیوں میں بھیج دیا ہے۔ تم ٹھگ ہو۔ کہو یہ جھوٹ ہے بتاؤ یہ جھوٹ ہے۔

سرفراز: (چیخ کر) بدری۔

غفور: سردار۔

سرفراز: اسے خیمے سے باہر لے جاؤ۔ یہ یہاں کیسے آگئی؟

مورپنکھی: مجھے کسی نے آواز دی تھی خیمے میں خون ہو رہا ہے۔ میں طنابیں کاٹ کر بھاگی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھ سے خون ہوتے دیکھا ہے۔ اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔

سرفراز: غفور اسے خیمے میں لے جاؤ۔

مورپنکھی: (جسے گھسیٹ کر باہر لے جایا جا رہا ہے) مجھے مت گھسیٹو۔ مجھے سرفراز سے بات کر لینے

دو ظالمو۔ خونی قاتلو میری بات سن لو۔

اسمٰعیل: میرے بیٹے تجربہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟

سرفراز: ہاں ابا جان۔

(پس منظر میں غفور کے خوفناک قہقہہ کی آواز بلند ہوتی ہے)

سرفراز: یہ کون ہنس رہا ہے یہ کون مجھ پر قہقہہ لگا رہا ہے خاموش ہو جاؤ۔ (چیخ کر) سب خاموش ہو جاؤ۔

اسمٰعیل: میرے بیٹے ہمت سے کام لو۔ یہ رومال سنبھالو۔ میں نے لگھائی سے کہہ دیا ہے قبر تیار رہے گی۔

بارھواں منظر

(خیمے کے باہر۔ وہی وقت)

غفور: بدری ___ آج کس مزے کی ٹھنڈ ہے۔ موسم بہار دکھا رہا ہے۔

بدری: کوئی خاص بہار تو نہیں۔

غفور: چاروں طرف بہار ہے۔ ٹھنڈک دور کرنے کی دو ترکیبیں ہیں۔ انسانی جسم کی گرمی یا انسان کی جان لینے کی خوشی ___ بھگوان سوگند جب میں موت کا سامان کرتا ہوں تو مجھے ٹھنڈ نہیں لگتی۔

بدری: آج کس کی موت کا سامان ہے۔

غفور: مور پنکھی! تمھارے دوست کی محبوبہ ___ کوئی غفور خاں کے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

بدری: تم نے بڑا ظلم کیا ہے۔

غفور: میں معافی نہیں چاہا کرتا میں کبھی معاف نہیں کرتا۔ میں نے بدلہ لے لیا ہے۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔

بدری: اب کیا ہوگا۔

غفور: سرفراز کو اپنے ہاتھوں سے مور پنکھی کا خون کرنا ہوگا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مور پنکھی کا

خون سرفراز کے ہاتھوں، جن ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر اس نے وفا کی قسم کھائی تھی۔ جن ہاتھوں کو اس نے پیار سے اپنی آنکھوں سے لگایا تھا۔ ان ہی ہاتھوں سے (قہقہہ لگاتا ہے) تم جانتے ہو کس نے اُسے پکارا تھا۔ کون مورپنکھی کو وہاں بلا کر لایا تھا۔ سوچو بدری سوچو۔ سوچنے کی بہت کچھ باقی ہے۔ (ایک اور قہقہہ لگاتا ہے)۔

تیرھواں منظر

(مورپنکھی کا خیمہ، مورپنکھی فرش پر پڑی سسک رہی ہے)

سرفراز: مورپنکھی۔

مورپنکھی: تم ہو؟

سرفراز: ہاں— میں ہوں۔ تم نے میرا اصلی روپ دیکھ لیا۔

مورپنکھی: ہاں۔

سرفراز: تم نے دیکھ لیا ہم سب ٹھگ ہیں۔ ہم انسانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہم لوٹتے ہیں۔

مورپنکھی: ہاں۔ مجھے معلوم ہو گیا۔

سرفراز: میں اسی لیے کہتا تھا میرا اصلی روپ دیکھو گی تو میرے منہ پر تھوک کر چلی جاؤ گی۔ مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔ مجھ سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لو گی۔

مورپنکھی: تم ٹھگ ہو۔

سرفراز: ہاں۔ ٹھگی میرا پیشہ ہے۔

مورپنکھی: تو مجھے ٹھگ لو۔ میری گردن سے یہ زیور، ہاتھوں کے سونے کے کڑے۔ یہ پازیب، یہ گلے کا جڑاؤ، یہ سب اتار لو۔ میں خوشی سے تمھیں دیتی ہوں۔ لو اسے لے جاؤ۔

سرفراز: ہم خیرات نہیں لیا کرتے۔

مورپنکھی: جاؤ ساتھیو سے کہو کہ نواب نے ساری جائیداد میرے نام لکھی ہے۔ ان کے سارے روپیہ کی وارث میں ہوں۔ میں یہ سارا روپیہ سرفراز کو دیتی ہوں۔ میں یہ سارا روپیہ تم

سب میں بانٹنے کو تیار ہوں۔

سرفراز: کیا کہہ رہی ہو مور پنکھی؟

مور پنکھی: میں آج بھی تمھیں چاہتی ہوں سرفراز۔

سرفراز: مور پنکھی!

مور پنکھی: ہاں میرے ٹھگ! میرے لٹیرے دوست!! میں نے تجھے چاہا ہے۔ میں نے کہا تھا نا میں نے انسانوں پر بھروسہ کرنا سیکھا ہے۔ محبت زہر نہیں ہے امرت ہے اور اگر میرے پاس امرت ہے تو تمھارے اندر کی سچائی ضرور ابھرے گی۔ تم اتنے پیارے ہو، اتنے خوبصورت ہو، تم قاتل اور خونی نہیں رہ سکتے۔ میرا پیار تمھیں جیت لے گا۔ میری محبت تمھیں پاک کردے گی۔ مجھے بھروسہ ہے مجھے انسان سے پیار ہے۔

سرفراز: قاتلوں میں انسانیت ڈھونڈتی ہو؟

مور پنکھی: ہاں —— میرا خیال غلط ہے؟

سرفراز: بالکل غلط۔

مور پنکھی: تو پھر میرا آخری تیاگ قبول کرلو۔ اپنے ہاتھ سے یہ جڑاؤ ہار اتار لو اور میری گردن میں اپنا خونی رومال ڈال دو۔ اس کی گرہ باندھو۔ ''تمبا کو لاؤ'' کی آواز دو۔ میں تمھاری آغوش میں ہنستے ہنستے جان دے دوں گی —— لاؤ تمھارا رومال کہاں ہے۔

سرفراز: مور پنکھی۔

مور پنکھی: مور پنکھی نے جان کی بازی لگائی تھی۔ وہ اسے ہنستے ہنستے ہار بھی سکتی ہے۔ تم جیت جاؤ گے میرے لیے یہی خوشی کیا کم ہے!

سرفراز: مجھ سے آج تک کسی نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ تم عجیب ہو۔

مور پنکھی: ہاں میں عجیب ہوں۔ کیونکہ مجھے تم پر بھروسہ ہے کہ جب تم میری لاش کو قبر میں لٹکانے لگو گے تو تمھارے اندر کا چھپا ہوا انسان جاگے گا اور تمھارا گریبان پکڑے گا۔ وہ تم سے پوچھے گا تم انسانوں کو کیوں مارتے ہو۔ ان انسانوں کا کیوں خون کرتے ہو۔ جو تمھیں پیارے ہیں۔ جو تمھیں پیار کرتے ہیں۔ جو زندگی کی ایک چھوٹی سی خوشی کے لیے اپنی

جان تک نچھاور کرتے ہیں۔ میں تمھارے خوابوں کی ملکہ بنوں گی تمھارے خیالوں پر میرا راج ہوگا میں تمھیں جیت لوں گی میں تمھیں ہمیشہ کے لیے جیت لوں گی —— میں تم سے موت مانگتی ہوں میرے شہزادے لاؤ مجھے موت دے دو۔

سرفراز: لاؤ میں تمھارا ہار اتارتا ہوں۔

مورپنکھی: (سر جھکا دیتی ہے) اتار لو۔

سرفراز: (گردن پکڑ کر) اس خوبصورت گردن میں ایک لمحے بعد میرا رومال ڈال دیا جائے گا اور یہ نازنین کامنی ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے گی— میرے ہاتھوں! میرے ہاتھوں! (چیختا ہے) نہیں! نہیں! !نہیں!! میں نہیں مار سکتا۔ میں اسے نہیں مار سکتا— میں اسے نہیں مار سکتا!

(خیمے سے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر باہر نکلنا چاہتا ہے کہ اسمٰعیل داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے پیچھے غفور بھی ہے)

اسمٰعیل: سرفراز— خیمے سے باہر کیوں نکلتے ہو؟

سرفراز: ابا جان میں اسے نہیں مار سکتا میں کسی انسان کو نہیں مار سکتا۔ یہ بھلے بُرے سب میرے ہیں۔ سب مجھ جیسے ہیں۔ میں ٹھگ نہیں ہوں۔ میں ٹھگ نہیں ہوں۔ میں ٹھگ بننا نہیں چاہتا مجھے انسان بننے دو۔ خدا کے لیے مجھے انسان بننے دو۔

اسمٰعیل: میرے بیٹے کیا کہہ رہے ہو؟ میرے بیٹے؟

غفور: سردار تم نے حلف اٹھایا ہے تم نے بھوانی ماتا کی سوگند کھائی ہے۔ اس کے غضب سے ڈرو۔

اسمٰعیل: تم نے قسم کھائی تھی۔

سرفراز: میں آج ساری قسمیں توڑنا چاہتا ہوں۔ یہ سب جھوٹی قسمیں ہیں۔ میں آج سے باغی ہوں۔ میں آج سے سارے قول قرار سے پھرتا ہوں۔ مجھے جانے دو! مجھے چھوڑ دو۔

غفور: سردار تم بھول رہے ہو اس کی سزا موت ہے۔

سرفراز: اگر زندگی کی چاہت کی سزا موت ہے تو یہ مجھے قبول ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں میں

انسانوں کو نفرت کی جگہ پیار دینا چاہتا ہوں۔ اتنا پیار اتنی محبت اتنی ہمدردی کہ یہ دنیا پیار اور خوشی سے بھر جائے۔

اسمٰعیل: اس کا دماغ پھر گیا ہے۔

مورپنکھی: ایسا نہ کہو آج شاید زندگی میں پہلی بار یہ ہوش میں آئے ہیں۔

اسمٰعیل: خاموش! لڑکی، ارے کوئی ہے —— تمبا کو لاؤ۔

(سرفراز کا گلا گھونٹا جاتا ہے)

مورپنکھی: مار ڈالا! بزدلو! تم زندگی بھر اس کی روح کا گلا گھونٹتے رہے۔ ایک بار صرف ایک بار اس کے اندر کا انسان جاگا۔ تم نے اس کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ میرا بھی گلا گھونٹ دو۔ میں چلاؤں گی۔ فریاد کروں گی۔ میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالوں گی۔

اسمٰعیل: اس لڑکی کو بھی ——؟

(ڈراپ سین)

مولسری کے پھول

بڑے سرکار: عبداللہ تم نے منگلا تانگے والے سے کہہ دیا ہے نا۔ کہیں ایسا نہ ہو گاڑی کا وقت نکل جائے۔ آج چھوٹے میاں کو لکھنؤ جانا ہے۔

عبداللہ: ہاں سرکار۔ منگلو تو اب آتا ہی ہوگا۔ لکھنؤ کی گاڑی تو پھر بھی رات گئے جاوے ہے۔ ابھی تو دیر ہے۔

بڑے سرکار: ہاں بھئی ریل کا معاملہ ہے۔ حقہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

عبداللہ: ابھی بھر کے لاتا ہوں۔ اوپلا تو دبا آیا تھا۔

بڑے سرکار: نہیں رہنے دو۔ پر چوکس رہنا۔ ذرا سامان وامان ٹھیک کر دینا۔

عبداللہ: اب چھوٹے سرکار کب آویں گے؟

بڑے سرکار: اب یہ کوئی اپنے بس کی بات ہے عبداللہ۔ اونچی پڑھائی پڑھنے جا رہے ہیں۔ جب چھٹی ملے گی تبھی آئیں گے۔ اور بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ماں باپ جو سینے پر پتھر رکھ کر اولاد کو جدا کرتے ہیں۔ تو یہی سوچتے ہیں کہ لڑکا پڑھ لکھ کر قابل ہو جائے۔ دو تین سال بعد انگریزی کی سند لے آئے گا تو کہیں تحصیل داری ڈپٹی کلکٹری کی سند لے آئے گا۔ گھر بھر کی روٹیوں کا سہارا ہو جائے گا۔

عبداللہ: پر سرکار۔ چھوٹے میاں کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ ساری عمر تو کبھی گھر سے پاؤں نہیں نکالا۔ اکیلے اتنے بڑے شہر میں ماں باپ سے دور کیسے رہیں گے؟

بڑے سرکار: جب تک زمینداریاں تھیں بات ہی اور تھی عبداللہ۔ (حقہ گڑگڑاتے ہیں) حقہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا کمبخت۔ زمیندار کے بچے کو لکھ پڑھ کر کرنا ہی کیا تھا وہی کنواں کھودنا وہی پیٹ

بھرنا۔اب تو تعلیم نہ ہوگی تو کوئی بھیک بھی نہ دے گا۔سچ کہا ہے کسی نے ع:

جن کے رُتبے ہیں سِوا ان کو سِوا مشکل ہے

عبداللہ: بڑا بُرا زمانہ آن لگا مالک۔چودھویں صدی ہے سنا تھا۔اولاد ماں باپ سے بچھڑ جائے گی بھائی بھائی سے الگ ہوگا۔ماں جائے سے مایا جایا جدا ہوگا۔سو وہی ہو رہا ہے۔جو کچھ ہو جاوے تھوڑا ہے۔

بڑے سرکار: ہاں عبداللہ۔جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھا۔

حفیظن: چھوٹے میاں کو اندر بلاوے ہیں۔چھوٹے میاں!

بڑے سرکار: کون پکار رہا ہے۔

عبداللہ: حفیظن بوا حویلی سے آئی ہے چھوٹے میاں کو پکار رہی ہے۔

بڑے سرکار: کہہ دو یہاں نہیں ہیں۔وہ اندر گھر میں اپنا سامان ٹھیک کر رہے ہوں گے۔

(Changeover)

بیگم: اے ہے بچے اب ہو چکا سامان ٹھیک۔خدا کے لیے دو گھڑی کے لیے میرے پاس آبیٹھ۔اب اتنے دنوں کے لیے نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔تجھے کیا معلوم کیسے سینے پر پتھر رکھ کر تجھے لکھنؤ بھیج رہی ہوں۔

چھوٹے میاں: ابھی آیا امی——بولو کیا بات ہے۔

بیگم: دیکھ یہ حفیظن بوا تجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔باہر مردانے تک میں آوازیں دے آئیں۔چچی نے بلایا ہے دو قدم پر تو ہے ہی حویلی سلام کرنے تو جانا ہی ہے۔

چھوٹے میاں: نہیں امی اس وقت تو بہت کام پڑا ہوا ہے۔جاتے میں تانگہ رکوا کر تھوڑی دیر کے لیے وہاں اتر جاؤں گا۔

ریحانہ: اب بتاؤ امی۔یہ جرابیں کسی کو مل سکتی تھیں بھلا۔کتابوں کے بیچ میں رکھی ہوئی ہیں۔میلے کپڑے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرگئی۔تم ہی بھیا کی بڑی طرفداری کرتی ہو اب بتاؤ صبح سے یہ وقت آگیا ہے۔قمیص جوتوں میں پڑا ہوا ملا۔میلا بنیائن تخت کے نیچے پڑا ہوا ہے۔

بیگم: ارے تو کیا ہوا آخر بہن ہے اتنا کام تو کرنا ہی چاہیے۔سہرا باندھتے وقت حق بھی تو تو ہی

لے گی۔

ریحانہ: ارے یہ کیا حق دیں گے۔ صاف آنکھیں پھیر لیں گے۔

چھوٹے میاں: امی یہ تو بے صبری ہے بے صبری اے تو تم ابھی سے حق وق دلا کر کسی ایسے ویسے کے سر باندھ کر چلتا کرو۔

ریحانہ: دیکھ لینا امی۔ یہ تو لکھنؤ جا کر سارے کپڑے اِدھر اُدھر کھو دیں گے۔ وہاں کون ان کی دیکھ بھال کرے گا۔ یہ ٹھہرے لاٹ صاحب وہاں جا کر معلوم ہو گی ریحانہ کی قدر۔

بیگم: ہاں بیٹی۔ یہ تو ٹھیک کہتی ہے۔ پر جیسی پڑتی ہے بھرنی ہی ہوتی ہے کیوں حفیظن بوا۔

حفیظن: ہاں بیٹا تمھارے جی کو شاباشی ہے بیگم صاحب کے اکلوتے لال کو آنکھوں سے اوجھل کر کے کالے کوسوں پڑھنے کو بھیج رہی ہو بھلا نوابوں کے خاندانوں میں اتنی پڑھائی کون پڑھے ہے۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کون جدا کرے ہے۔

بیگم: لیکن بوا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ پہلے کبھی کسی نے ہمارے گھر خاندان میں نوکری کا نام بھی نہ سنا تھا اب اس کے بغیر گزارا مشکل ہے۔

حفیظن: ہائے ہائے کیا زمانہ آن لگا۔ اچھے تھے جو اپنی مزے میں گزار گئے۔ بیگم صاحب۔ ذرا ایک چٹکی تمبا کو دینا۔ خدا تمھارا بھلا کرے۔ اے لو میں تو بھول ہی گئی۔ ہماری بیوی جی نے اپنے بھتیجے کے لیے یہ امام ضامن بھیجا ہے۔

بیگم: ارے یہاں کاہے کو بھیج دیا۔ وہ خود ہی سلام کرنے جاتا۔ اپنے ہاتھ سے باندھ دیتیں۔

حفیظن: چلتے چلتے کہہ دیا تھا کہ حفیظن اپنے ہاتھ سے بچے کے بازو میں باندھ دینا اور نذر اتار کر آنا۔

چھوٹے میاں: اب کتنے امام ضامن بندھیں گے میرے۔ بھلا دیکھو تو سارا ہاتھ تو جکڑ کر رہ گیا ہے۔

بیگم: چھوٹے میاں ان باتوں میں بولا نہیں کرتے۔

چھوٹے میاں: اچھا لو باندھ دو۔ اور دو۔ چار۔ چھ۔ جتنے امام ضامن چاہو باندھ لو۔ جو ایک حرف زبان سے نکالوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔

ریحانہ: ابھی تو میں بھی امام ضامن باندھوں گی بھیا۔

چھوٹے میاں: چل چڑیل۔

ریحانہ: میں تو باندھوں گی۔ امی دیکھو ——

چھوٹے میاں: اچھا چل باندھو جلدی۔ ہر وقت کترنی کی طرح زبان چلتی ہے۔ شریر کہیں کی۔
تجھے تو ایسے سے بیاہوں گا کہ کبھی میکے بھیجے ہی نہیں۔

ریحانہ: دیکھو امی ——

چھوٹے میاں: (نقل اتار کر) دیکھو امی۔ ارے دیکھو امی۔ کیا تو تو۔ بڑی اچھی بہن ہے ہماری۔
میں تو جب بھی لکھنؤ سے آؤں گا تیرے لیے اچھے اچھے دوپٹے۔ جمپر اور سینڈل خرید کر
لاؤں گا ہاتھوں کے لیے خوبصورت خوبصورت چوڑیاں اور جب پاس کر کے تحصیل دار
ہو جاؤں گا اور پھر تو ہو جائے گی تحصیلدار صاحب کی بہن پانچوں انگلی گھی میں اور سر
کڑھائی میں — کیا سمجھی (ہنستی ہے)

بیگم: اے لو وہ تو باغ باغ ہوئی جا رہی ہے کیا کیا وعدہ وعید ہو رہے ہیں بہن بھائی میں۔ اچھا
اب چلو ریحانہ ذرا بھیے کے لیے کھانا نکال کر لے آؤ۔ گاڑی کا وقت آن لگا ہے۔ بھوک
تو اس وقت کیا لگی ہو گی پھر بھی دو نوالے پیٹ میں ڈال کر پانی پی لے سہارا ہو جائے گا۔
پتہ نہیں راستے میں کھانا ملے نہ ملے۔

ریحانہ: ابھی لائی —— امی۔

حفیظن: اچھا بیگم صاحب تو پھر میں چلوں۔

بیگم: ہاں میرا سلام کہنا اپنی بیوی جی سے اور کہہ دینا کہ ان کا بھتیجا ابھی آ رہا ہے سلام کرنے اور
ہاں ناہید تو اچھی ہے۔

حفیظن: ناہید بیٹا (آہ) ہاں اچھی ہی ہے۔ بچاری کا روتے روتے بُرا حال ہے۔ تم جانو دونوں
ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ بچپن سے کبھی ساتھ نہیں چھوٹا۔ اس نے روتے روتے
آنکھیں سجائی ہیں۔ ماں نے جب کل ڈانٹ بتائی تو کہیں آنکھ کا آنسو رکا۔

بیگم: ہاں پہلی بار یہ دونوں الگ ہو رہے ہیں۔ خدا جلد پھر ملائے۔

حفیظن: آمین۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے بیگم صاحب کہ غریب بچی ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے
درنجف ہے۔ عادت کی۔ خصلت کی۔ اچھی شکل وصورت۔ چندے آفتاب چند
ماہتاب۔ تمھارے گھر میں تو ایسے گھل مل جائے گی جیسے بچپن سے یہیں رہی رہو۔ اپنا
خون اپنا کنبہ تمھیں تو خدا نے بن مانگے موتی دے دیا۔ اپنے ہاتھ سے جوڑی بنائی ہے
اللہ میاں نے۔

بیگم: میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ حفیظن بوا۔ ذرا تعلیم سے نبٹ جائے لڑکا تو سیدھی چچی کی
چوکھٹ پر پہنچوں گی۔ ریحانہ کھانا نکال لیا تو نے، ارے تو چپکا بیٹھا ہماری باتیں کیا سن
رہا ہے۔ میرا لڑکا بھی بڑا بھولا ہے۔ شادی بیاہ کی باتوں سے لڑکیوں کی طرح شرماتا ہے۔

ریحانہ: یہ لو کھانا آ گیا۔

حفیظن: اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ خدا شہر والوں کی آنکھوں میں خاک ڈالے۔ لاکھوں میں ایک
لڑکا ہے۔ مگر دیکھنا بھیا۔ شہر والے تو سنتی ہوں حرفوں کے بنے ہوتے ہیں۔ ان سے ذرا
ہوشیار رہنا۔ بیگم صاحب تمھیں یاد ہوگا۔ نیازو میری بھانج بہو کا لڑکا اچھا خاصا تھا۔ شہر گیا
تھا بس جو شہر کی ہوا لگی تو اس نے یقین مانوں کینچلی بدل لی۔ اب تو وہ نیازو ہی نہیں رہا۔ سر
میں تیل چھلیل۔ آنکھوں میں کجرا۔ ٹیڑھی مانگ نکالے۔ سوٹ بوٹ ڈاٹے۔ مونچھ
داڑھی منڈوا وہ تو پورا جنٹلمین ہو گیا۔ وہ تو بہن میری کوڑی کام کا نہیں رہا۔

چھوٹے میاں: میں تو وہاں پڑھنے جا رہا ہوں حفیظن بوا۔ کوئی جادو سیکھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔

حفیظن: میرا تو بھیا اسی دن سے شہر کے نام سے جی دھک کرنے لگے ہے۔ طرح طرح
کی تو چڑیلیں اپنی صورتیں بنائے پھرے ہیں۔ آڑی مانگیں نکالے ہیں۔ اونچی ایڑی کا
وہ کیا ہووے ہے کیا نام اللہ تمھارا بھلا کرے۔ سینڈل پہنے پھرے ہیں کہ پاؤں ذرا
رپٹ جائے تو منہ کھڑاوں ہو جائے اور جی لبھانے کے گر یاد ہیں۔ کم بختوں کو شریف
آدمی کا بچ نکلنا مشکل ہووے ہے۔ اللہ رحم کرے توبہ اللہ میری توبہ۔

بیگم: لو تم کھانا شروع کرو۔

حفیظن: اچھا تو میں چلی بیگم صاحب۔ سلام کہہ دوں گی اور ناہید بٹیا کو پیار کردوں گی تمھاری

طرف سے۔

بیگم: ہاں اور کہہ دینا۔ یہ ابھی آ رہا ہے سلام کرنے۔

حفیظن: اچھا تو میں چلی۔

چھوٹے میاں: میرا بھی سلام کہہ دینا حفیظن بوا چچی جان اور ـــ

حفیظن: اچھا تو بیگم صاحب سلام۔

بیگم: چھوٹے میاں، سنا تم نے حفیظن کیا کہہ رہی تھی؟

چھوٹے میاں: ہاں امی۔

بیگم: پھر کیا رائے ہے تمھاری۔ مجھے تو بھیا تیری مرضی کا بھی دھیان ہے ناہید بچاری ہے تو غریب مگر اپنا خاندان ہے اپنا خون ہے۔ پھر بچپن سے تیرے ساتھ پلی ہے۔

چھوٹے میاں: اب میں کیا کہوں گا امی۔

بیگم: میں نے تو کہہ دیا ہے کہ تعلیم پوری ہو جائے۔ ابھی سے لڑکی مانگے لیتی ہوں۔ ادھر تیری نوکری پکی ہوئی اُدھر بیاہ کا بندوبست ہو جائے گا۔

چھوٹے میاں: جیسا تم سمجھو۔

ریحانہ: اب کیسے شرمائے بیٹھے ہیں بچارے (ہنستی ہے) مگر بجھ لو لکھنؤ سے پہلے میرے لیے دو پٹہ لانا ہوگا نہیں تو ناہید باجی کا دوپٹہ چھین لوں گی۔

باہر سے آواز: چھوٹے میاں تانگہ آ گیا؟

چھوٹے میاں: ابھی آیا منگلو دادا۔

بیگم: کم بخت نے بچے کو دو نوالے بھی چین سے نہ کھانے دیے۔ ارے تو نے کھایا ہی کیا ہے؟ یہ لے شامی کباب تو ایک اور لے لے۔

چھوٹے میاں: بس بس امّی۔

بیگم: دیکھو بیٹا۔ ہر روز خط لکھنا۔ میں روز تیرے خط کا انتظار کروں گی۔ ہوشیاری سے رہنا خرچہ بھی دیکھ بھال کے کرنا تو تو جانتا ہی ہے۔ آج کل تیرے ابا کا ہاتھ تنگ ہے اور شہر کے اللوں تللوں سے ہوشیار رہنا۔ میرے بچے تیرے اوپر سارے گھر بار کو سنبھالنے کا

بار پڑے گا۔

چھوٹے میاں۔امی تم اطمینان رکھو۔

بڑے سرکار: ارے بھئی چھوٹے میاں اب جلدی کرو۔تانگہ کب کا ڈیوڑھی پر لگ گیا۔بیگم تم ذرا
پردہ میں ہو جاؤ تو عبداللہ آکر سامان اٹھالے۔

بیگم: اچھا۔ریحانہ تھوڑی دیر کے لیے دالان میں آبیٹھو۔

بڑے سرکار: چھوٹے میاں!

چھوٹے میاں: ابا جان۔

بڑے سرکار: تم سے گھر کی حالت چھپی نہیں بیٹا۔اپنا پیٹ کاٹ کر جمع جتھا نکال کر تمھیں پڑھنے بھیج
رہا ہوں۔تمھاری اماں کے زیور کا ایک ایک چھلا بیچ کر تمھاری تعلیم میں خرچ کر دوں گا
مگر اب اس گھر کی پتوار تمھارے ہاتھ ہے۔چھوٹے میاں۔جی لگا کر پڑھنا۔یہ سمجھ کر
پڑھنا کہ تم کسی کی امانت ہو اور تمھارے اوپر سارے گھر کا بوجھ ہے۔یہ ساری ناؤ
تمھارے ہی سہارے پھر پار لگے گی دیکھو میرے بیٹے کہیں بہک نہ جانا۔جی جان لڑا
دینا۔میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اور کس بل بھی نہیں ہے۔

چھوٹے میاں: ابا جان آپ سے دور رہ کر بھی آپ کے پاس ہمیشہ رہوں گا۔

بڑے سرکار: بیٹا۔خدا تمھیں خوش رکھے۔اچھا اب اپنی ماں اور بہن سے بھی رخصت ہو آؤ۔

عبداللہ: سارا سامان رکھ دیا ہے بڑے سرکار۔منگلو بیلوں کے لیے بھوسا مانگ رہا ہے۔

بڑے سرکار: دے دیا ہوتا۔

عبداللہ: میں نے کہا سرکار سے پوچھ لوں۔گاڑی کا وقت قریب آن لگا ہے۔

بڑے سرکار: اچھا تو کہہ دو لوٹتے میں لے جائے گا۔چلو چھوٹے میاں گاڑی کا وقت ہو گیا۔

چھوٹے میاں: آیا ابا جان۔

عبداللہ: چلو بھئی منگلو سوار ہو۔اب دکھلا اپنی چال اور دیکھ تیری حویلی کے سامنے دو منٹ کو روکو
لیجیو۔چھوٹے میاں اپنی چچی اماں کو سلام کرنے جائیں گے۔یہ چل۔بسم اللہ۔بسم اللہ!

ناہید: (آنسوؤں کو روک کر) گاڑی جانے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے کیا؟

چھوٹے میاں: کون؟ ناہید۔ ارے تم۔ زینے کے نیچے والے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟

ناہید: (سسکی) مجھے انتظار کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے کیا۔

چھوٹے میاں: چچی جان کہاں ہیں۔

ناہید: اوپر ہیں۔

چھوٹے میاں: کوئی تمھیں یہاں دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔

ناہید: یہی کہے گا کہ تمھیں رخصت کرنے آگئی تھی۔ تم اتنے بہت سے دنوں کے لیے باہر جارہے ہونا (سسکی)

چھوٹے میاں: لیکن ذرا دیکھ تو حالت کیا بنا رکھی ہے اپنی۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ اسی شکل پر انتظار کرے گی میرا۔ اِدھر آ۔ ٹھہر۔ لا میں تیرے بال ٹھیک کردوں۔ یہ دیکھ ایسے۔ (بالوں کی لٹ چہرے پر سے ہٹا دیتا ہے) ہت تیرے کی پھر وہی لٹ چہرے پر آگئی۔ (ناہید کی ہنسی)

ناہید: میں تمھاری راہ دیکھوں گی پردیسی۔ تم مجھے بھولو گے تو نہیں۔

چھوٹے میاں: کوئی اپنے کو کبھی بھول سکتا ہے دیوانی۔

ناہید: میری قسم؟

چھوٹے میاں: لا ہاتھ لا۔ میرا ہاتھ خوب کس کے پکڑنا۔ اس موم بتی کی لَو کے اوپر رکھ کر ہم دونوں قسم کھاتے ہیں کہ دونوں زندگی ے سارے دکھ درد ساتھ جھیلیں گے۔ ہمیشہ کے لیے سدا کے لیے۔

ناہید: ہائے۔ کیسا داغ لگا لیا ہے اپنے ہاتھ میں۔ ہائے میرے اللہ۔ بڑی جلن ہو رہی ہوگی۔

چھوٹے میاں: اور تیرے ہاتھ میں جلن نہیں ہو رہی ہے۔

ناہید: میں بہت خوش ہوں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو۔

چھوٹے میاں: بس اب اچھی بچی بن جاؤ۔ آنسو پونچھو۔ میری واپسی کا انتظار کرنا۔ میری کامیابی کی دعا کرنا۔ میں چچی جان سے ملنے جاتا ہوں۔

ناہید: وہ پوچھیں گی ہاتھ کیسے جل گیا۔

چھوٹے میاں: کہہ دوں گا آپ کی صاحبزادی نے جلایا ہے بس (ناہید کی ہنسی)

ناہید: شریر کہیں کے؟

چھوٹے میاں: اچھا میں چلا۔ خدا حافظ۔ چچی جان سے مل کر رخصت ہو جاؤں گا۔ خدا حافظ۔

ناہید: خدا حافظ۔

(تانگے کی آواز Change Over ریل گاڑی کا شور۔ شہر کی ہلچل، اخبار والوں کی آوازیں۔ بسوں اور موٹروں کی آوازیں)

رمیش: (قہقہہ) کیا کہا پارٹنر۔ تمھیں ہماری جان کی قسم۔ ذرا ایک بار پھر بتانا۔ تمھیں گھر کے لوگ کس نام سے پکارتے تھے۔

چھوٹے میاں: چھوٹے میاں کہتے تھے۔

رمیش: (قہقہہ) ارے سن رہا ہے۔ رونالڈ کالمین کے بچے۔ مسٹر جاوید کو گھر پر لوگ چھوٹے میاں کہتے تھے۔

مجید: ہاں ہاں سن رہا ہوں تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ہیرو۔

رمیش: دیکھو مسٹر جاوید۔ بُرا مت ماننا۔ اس مجید کے بچے کو رونالڈ کالمین کہتا ہوں نا۔ مونچھوں کا بالکل وہی کٹ۔ قسمت کا ذرا ہٹیا نکل گیا۔ کمبخت نہیں تو کہیں ہالی وڈ میں عیش کر رہا ہوتا۔ زوں سے فرسٹ کلاس بیوک پر نکلتا تو مارے خوشبو کے راستے چلنے والے بیہوش ہو جاتے۔ ہائے ہائے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ میں جھک مار رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت۔

مجید: ارے ہیرو کی دم کبھی تو موقع کا شعر پڑھ دیا کر۔ اس رمیش کی باتوں میں نہ آنا جاوید میاں۔ یہ ہنسی مذاق بہت کرتا ہے۔ مگر دل کا بُرا نہیں ہے۔ گو دل نے اسے بُری جگہ اٹکایا ہے۔

رمیش: میاں جاوید اب تم سے کیا چوری ہے ہمارے کلاس میں جسٹس ڈیسائی کی نورِ نظر مس لیلا ڈیسائی پڑھتی ہے۔ مائی ڈیر غضب کی خوبصورت ہے بالکل ایوا گارڈنر ہے بنی بنائی۔

چھوٹے میاں: پھر کیا کہتی ہے وہ؟

رمیش: ہائے ہائے کیا بھولے پن کی بات کہی ہے تم نے پارٹنر؟ بھلا وہ کیا کہتی۔ کچھ کہتی ہی تو نہیں۔ یہی تو غضب ہے۔

مجید: چچا غالب کا شعر پڑھا ہے تم نے۔ چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے۔ وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے۔

رمیش: ہائے مشاعرہ لوٹ لیا ظالم نے۔ واہ واہ۔ اچھا رونالڈ کالمین۔ اب ذرا اسی بات پر جلدی سے تیار ہو جاؤ آج میوزک کنسرٹ ہے۔ یہاں سے پہلے پکچر چلیں گے پھر ایک پیالی کافی پئیں گے۔ کافی ہاؤس میں اور وہاں سے سیدھے میوزک کنسرٹ میں۔ آج وہ بھی تو ناچیں گی۔ یعنی کہ وہ۔ بس سمجھ جاؤ۔

مجید: سمجھا۔ چلو مسٹر جاوید۔

رمیش: لیکن دیکھو یار۔ بھگوان قسم یہ اچکن۔ پاجامہ نہیں چلے گا۔ آج تم میرا گرم سوٹ پہن لو بھڑکیلی ٹائی لگالو کہ جدھر سے گزرو دو چار لڑکیاں آنکھ ماریں۔ میں کہتا ہوں یار یہ کیا رٹ رٹ کر سارے کمرے کا ٹمپریچر زیرو (Zero) کیے رہتا ہے۔ ظالم۔ دو چار A-1 قسم کے سوٹ سلوالو عیش کر پارٹنر زندگانی پھر کہاں؟

چھوٹے میاں: اب کے منی آرڈر آئے گا تو ہو جائے گا ایک سوٹ۔

مجید: ہاں ہاں مگر اس وقت تو تیار ہو جاؤ۔

رمیش: ذرا پرواہ مت کر بادشاہ ہو۔ مجید۔

مجید: پھر کچھ اور مصیبت۔

رمیش: میں سوچتا ہوں۔ زندگی یہی کچھ Student Days کی ہے یار۔ باقی سب بکواس ہے اس سے پہلے لڑکے کو کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ گدھے کی طرح کتابوں پر جتا رہتا ہے اور اس کے بعد جب نوکری کے چکر میں پڑتا ہے۔ تو نون تیل لکڑی سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ گھر میں چیاؤں چیاؤں دس عدد بچے نگنی کا ناچ نچاتے ہیں۔ بیوی الگ ناک میں تیر پہناتی ہے اور قرض دار دفتر کا Boss، رشتے دار ناتے دار سب سالے گلا دبانے آجاتے ہیں۔ اب تو عیش ہے عیش سب سمجھتے ہیں لونڈا پڑھ لکھ کر کلکٹر بن جائے گا۔

مجید: تجھے اب پتہ لگا ہے یہاں جو پیر مرد تین سال سے فیل ہو رہے ہیں تو اسے تو نے مذاق ہی

سمجھ لیا ہے میری جان۔ زندگی بڑی ظالم ہے یہاں یونیورسٹی ہوسٹل کی چھت کے نیچے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ہاتھ بڑھا کر ستاروں کو چھو سکتا ہوں۔ یہاں وہی گھاٹے میں رہتا ہے۔ جو چھوٹی باتوں پر قناعت کر لیتا ہے۔ یہاں میں نے ہر چیز کو اپنے دسترس میں پایا۔ مجھے ایسا لگا ہے کہ سب لوگوں کی طرح میرے پاس بھی کل موٹر ہو سکتی ہے۔ بنگلہ ہو سکتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور مالدار بیوی ہو سکتی ہے اور زندگی کی ساری نعمتیں میرے ہاتھ میں ہیں۔

چھوٹے میاں: یہ بڑی عجیب دنیا ہے مجید بھائی۔

مجید: ہاں جاوید۔ عجیب دنیا ہے لیکن اس دنیا کے باہر نکل کر یہ سارے ستارے فضا میں کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ اور میں اپنے قصبے کی اندھیری گلیوں میں چھوٹی سی نوکری کے لیے مارا مارا پھرتا ہوں۔ یہاں سب کچھ مل سکتا ہے اور بہت کچھ کھویا جاتا ہے۔

رمیش: جاوید یہ رونالڈ کالمین فلمی ڈائیلاگ بول رہا ہے۔ اسے بولنے دو۔ میری بات مانو تو صرف ایک گر یاد رکھو۔ پہلی فرصت میں ایک عدد عشق کر ڈالو۔ زندگانی پھر کہاں۔

مجید: میاں جاوید۔ اس نے تو عشق کی ایجنسی لے رکھی ہے اس کی باتوں میں نہ آنا۔

چھوٹے میاں: نہیں مجید بھائی میرا عشق وشق کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

رمیش: ہا ہا ہا کیا کہنے ہیں شہزادہ گلفام کے۔ کبھی آئینہ میں صورت ملاحظہ کی ہے صاجبزادے۔ اسی شکل پر تو یہ غلط فہمی ہے۔ گویا ابھی آپ عشق کا ارادہ ظاہر کریں گے۔ ادھر رانی پدمنی تخت و تاج چھوڑ کر آپ کے قدموں میں سر جھکانے آئے گی اور کہے گی "ہے پربھو۔ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دو۔" ابھی چند دن کی بات ہے کہ آپ قصبے سے تشریف لائے ہیں۔ یہاں پر آپ کا ایسا ہے جیسے تھیلوں میں شتر مرغ کو بند کر دیا ہو۔ ویسے کسی لکھ پتی خاندان کے چشم و چراغ بھی نہیں ہیں آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے کہ ابھی گریجویٹ ہونے والے ہیں اور دماغ —— کیا خوب ع:

اسی کو کہتے ہیں بلی کے سر میں چھچھوندر کا تیل

چھوٹے میاں: رمیش بابو!

مجید: ابے ہیرو۔ کیوں Legpulling کرتا ہے یار خواہ مخواہ۔

رمیش: شہزادہ گلفام کے۔اگر ۶ مہینے کے اندر اندر یونیورسٹی کی کسی حسین لڑکی کو اپنے سے بات کرنے پر آمادہ کرلو تو یہ رونالڈ کالمین ایسی مونچھیں چیل کی پیشاب میں منڈوا دوں۔

چھوٹے میاں: آپ بھول رہے ہیں رمیش بابو۔ میں بھی آپ سب کی طرح انسان ہوں۔آپ سب کی طرح نوجوان ہوں۔

رمیش: (طنز سے) ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔

مجید: ابے کیا ہیرو کی دم بنا پھرتا ہے۔ اگر مرد ہے تو ہاتھ ملا شرط باندھتا ہوں کہ ۶ مہینے کے اندر اندر جاوید سچ مچ شہزادہ گلفام ہوگا۔ اس یونیورسٹی پر تمھارے حضرت گنج پر تمھارے Gladdar والی سوسائٹی پر دیکھتے دیکھتے چھا جائے گا۔

رمیش: اچھا جی!

چھوٹے میاں: میوزک کنسرٹ کا ارادہ نہیں ہے کیا؟

رمیش: یار سارا موڈ اس عود بلاؤ نے تباہ کردیا۔

مجید: چل بے میوزک کنسرٹ چل رہے ہیں۔

(بھیڑ کا شور، بات چیت، آہستہ آہستہ Fade out change over، وقفہ۔ بارہ بجنے کی آواز)

رمیش: (دروازہ کھٹکھٹاتا ہے) شہزادے گلفام۔ دروازہ کھولو۔

مجید: مسٹر جاوید۔ دروازہ کھولو۔ مائی ڈیر۔

چھوٹے میاں: رات کے بارہ بجے آپ لوگوں کو گدگدی ہوئی ہے۔ میں نہیں کھولتا دروازہ سخت نیند آرہی ہے (جماہی)

رمیش: نہیں کھولے گا دروازہ۔ اچھا صبح کو مزا چکھاؤں گا۔

مجید: ابے آج اس کی کامیابی کی رات ہے۔ ہیرو ہوگیا ہے ہیرو۔ چلو سونے دو۔

چھوٹے میاں: شب بخیر۔ گڈ نائٹ۔ (پھر جماہی)

(Change Over)

ثریا: میں نے آپ کو بلایا تھا۔

چھوٹے میاں: شکریہ۔ مس ثریا بیگم۔

ثریا: شکریہ تو مجھے ادا کرنا ہے۔ آپ نہ ہوتے تو میں سوچ نہیں سکتی کیا کچھ ہو جاتا۔

چھوٹے میاں: جی نہیں۔ آپ پر کوئی احسان نہیں کیا میں نے۔

ثریا: آپ بہت عجیب ہیں۔

چھوٹے میاں: میں بالکل عجیب نہیں ہوں۔ آپ لوگ جو تہذیب کے شیش محلوں میں رہتے ہیں مخملی قالین جگمگاتے فانوس اور ریشمی پردوں کے پیچھے رہتے ہیں۔ انھیں باہر کی دنیا کی ہر بات عجیب لگتی ہے۔

ثریا: مجھے عجیب آدمی اچھے لگتے ہیں۔

ثریا: مسٹر جاوید۔ آپ نے بڑی دیر کردی۔ ہم سب پک نک (Picnic) پر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

چھوٹے میاں: لیجئے میں آ گیا۔

چھوٹے میاں: آیئے اس مولسری کے پیڑ تک چلتے ہیں۔ دیکھیں کون پہلے پہنچتا ہے ون۔ ٹو۔ تھری۔ اسٹارٹ (دوڑتے ہیں) رہ گئیں نہ پیچھے۔ یہ مولسری کے پھول میں نے تمھارے لئے کتنے بہت سے پھول چنے ہیں۔

ثریا: ان کا ایک چھوٹا سا کلپ بنا کر میں اپنے بالوں میں لگاؤں گی۔

ثریا: اوہ۔ مسٹر جاوید۔ بڑی دیر کردی آپ نے۔ میں کتنی دیر سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں۔

چھوٹے میاں: معاف کیجئے گا ذرا دیر ہو گئی۔

ثریا: بھئی کمال ہے۔ آج ہماری سالگرہ کی پارٹی میں بھی آپ دیر سے آئے ہیں۔ حد ہو گئی۔

چھوٹے میاں: میری طرف سے یہ تحفہ قبول کرو۔ بہت حقیر تحفہ ہے۔ مگر بڑے خلوص سے یہ نذر پیش کر رہا ہوں۔

ثریا: میرے لیے تمھارا چھوٹا سا چھوٹا تحفہ بھی سب سے زیادہ قیمتی ہوگا۔

چھوٹے میاں: شکریہ!

ثریا: لاؤ مجھے دو۔ دیکھوں تو کیا ہے یہ انگوٹھی —— (حیرت، تعجب اور صدمے سے) انگوٹھی! یہ

تم نے کیا کیا جاوید۔ یہ تم نے کیا کیا۔

نوکر: جاوید صاحب کو کوئی باہر بلا رہا ہے۔

چھوٹے میاں: کون ہے؟

نوکر: میں کیا جانوں سرکار۔ کوئی بوڑھا سا آدمی ہے۔

چھوٹے میاں: اچھا میں دیکھتا ہوں۔

چھوٹے میاں: ابا جان! آپ!

بڑے سرکار: ہاں بیٹا۔ تمھارا امتحان ختم ہو گیا۔ تو بھی تم نہیں آئے۔ تمھاری ماں نے رو رو کر بُرا حال بنا لیا ہے۔ ریحانہ سر ہو گئی۔ میرے پیچھے پڑ گئی تو مجھے آنا ہی پڑا۔

چھوٹے میاں: ہاں ابا۔ مجھے دیر ہو گئی۔

بڑے سرکار: اب تمھارا یہاں کیا کام ہے بیٹا۔ چلو گھر چلیں۔ اب کاروبار سنبھالو۔ نوکری ڈھونڈو (خاموش ہو کر) اور ناہید بٹیا کب سے تمھاری راہ تک رہی ہے اب تو تمھارا کام یہاں ختم ہو گیا ہے۔

چھوٹے میاں: ہاں کام تو ختم ہو گیا ہے لیکن وہاں اس قصبے میں میرا دل نہ لگے گا۔ یہیں کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا۔

بڑے سرکار: دل نہیں لگے گا! ہمیشہ وہیں پلے بڑھے ہو، اب دل کیوں نہیں لگے گا۔

چھوٹے میاں: مجھے معلوم نہیں۔ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ شاید اس سے پہلے میں نے ایسی زندگی کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ مجھ سے ایک اُجاڑ گاؤں میں دفن ہو کر نہ رہا جائے گا۔ میں وہاں خوش نہ رہ سکوں گا۔

بڑے سرکار: اور ناہید کا کیا ہو گا۔ وہ تو ایک مدت سے تمھارے سہارے بیٹھی ہے۔

چھوٹے میاں: اس کے لیے اور بہت سے رشتے مل جائیں گے۔

بڑے سرکار: (غصے سے) چھوٹے میاں!

چھوٹے میاں: جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں ابا جان۔ میں ایک جاہل ان پڑھ دیہاتی لڑکی کے لیے اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتا۔

بڑے سرکار: تجھے یہ لفظ کہتے شرم نہیں آئی۔ اس پاکیزہ لڑکی کی تو نے یہ قدر کی ہے۔ میں تجھے کبھی نہیں بخشوں گا۔ چھوٹے یہ تو نے ہماری شرافت پر طمانچہ مارا ہے۔ میں اس سے کس منہ سے یہ بات کہوں گا یہ تیری زبان یہ بات کہنے سے پہلے کٹ کر نہ گر پڑی۔

چھوٹے میاں: میں مجبور ہوں ابا جان۔

بڑے سرکار: خبردار جو مجھے ابا جان کہا۔ سمجھ لے آج سے میں تیرا کوئی نہیں ہوں۔ میں تیرے لیے مر گیا۔

نوکر: سرکار۔ جاوید صاحب۔

چھوٹے میاں: کیا ہے؟

نوکر: ثریا بی بی نے ڈبہ دیا ہے اور یہ پرچہ بھیجا ہے۔

چھوٹے میاں: مس صاحب نے۔ اچھا لاؤ (پڑھتا ہے)

''ڈیر جاوید۔ تمھارا تحفہ واپس بھیج رہی ہوں۔ یہ تم نے کیا کیا۔ انگوٹھی کا تحفہ اور تم سے؟ میں تمھاری قدر کرتی ہوں تمھیں اپنا دوست سمجھتی ہوں لیکن تمھارا تحفہ قبول کرنا میرے لیے ناممکن۔ معاف کرنا۔ ثریا۔''

چھوٹے میاں: (طنز کے ساتھ دو قہقہے) بولو جاوید۔ بولو۔ اب کدھر جاؤ گے ستاروں پر کمند ڈالنا چاہتے ہو۔ چاند کو ہتھیلی میں پکڑنا چاہتے ہو۔ مولسری کے پھولوں سے پیاس بجھانا چاہتے ہو۔ چمکتی بھول بھلیوں میں کھو گئے ہو۔ اب کون ہے تمھارا۔ کون ہے تمھارا۔ جو تمھاری تھی اسے تم ٹھکرا چکے۔ جس دنیا تک تم اڑ کر جانا چاہتے ہو۔ اس نے تمھیں ٹھکرا دیا۔ بولو اب کدھر جاؤ گے۔ دیوانہ جاوید! ستم زدہ جاوید! دونوں دنیاؤں میں اکیلا تنہا جاوید——!

(دیوانہ وار قہقہہ لگاتا ہے)

☆☆☆

سچ کا زہر

کورس: سچ مرا دیوتا

سچ ہے انجیل، قرآن، گیتا، خدا

سچ ہے سقراط، عیسیٰ، محمدؐ

سچ شہیدوں کا خوں پیار کا حوصلہ!

سچ ہے خون کا وہ قطرہ جو مصلوب ہے۔ جس کا سر

ہے بریدہ بدن مضطرب

سولیوں پر چڑھا

بے گناہی کی پاداش میں

زندگی! زندگی!! چیختا

مر رہا ہے

سچ ہے زہریلی ناگن جو ڈستی ہے انسان کے صبر و سکون

کو کہ پھر زندگی بھر تڑپتے گزرتی ہے اور ایک کانٹا

نہیں ایک بھالا۔ نہیں ایک تلوار ہے۔ جس کو تم نے

پکارا ضمیر اس کو مانو

سچ وہ بچہ ہے۔ جس کا سر و سینہ نیزوں کی نوکوں سے

مجروح ہے پھر بھی ہونٹوں پہ ایک ہلکی مسکان

سی ناچتی ہے۔

وہ سچ اب کہاں ہے

چلو اسے آج دنیا میں ڈھونڈھیں دیکھو سقراط

کی طرح وہ قید خانے میں بیٹھا

زہر کا پیالہ پیتا نہ ہو

کہیں شاہراہوں پہ وہ

کسی تنگ و تاریک چوراہے پر

پرانی سولی پہ لٹکا نہ ہو اور

اس کی ہتھیلی میں کیلوں کے سوراخ ہوں

وہ شاید کسی کربلا میں

کسی شمر کے خنجروں کے تلے

خون میں لتھڑا ہوا

زندگی کے لیے خوں بہا دے رہا ہو

جسے آج وہ سچ سے محبت ہو اب بھی

مرے ساتھ آئے

قبل اس کے کہ جھوٹ آئے اور

ہم سب کو نگل لے

ہیرالال: ''مجھے سزا دیجئے سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ مجھے سزا دیجئے۔ آپ نہیں جانتے میں کون ہوں۔ میرا نام ہے ہیرالال۔ میں آپ کے شہر کے ہر چوراہے پر پچھلے دس سال سے زہر بیچ رہا ہوں۔ جی ہاں زہر! ہر روز چوراہے پر سیکڑوں آدمی میری چکنی چپڑی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ میں کبھی تو لکڑ توڑ چورن کے نام پر لسوڑھے کی پسی ہوئی پتیاں بیچتا ہوں۔ کبھی دانتوں کو ہر مرض سے بچانے اور ہر درد کو دور کرنے کا منجن بیچتا ہوں۔ جس میں پسی میں کھریا کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی ریلوے یارڈ کی مٹی کی پڑیاں باندھ کر آنکھوں کا سرمہ کہہ کر بیچتا ہوں۔ میں کہتا ہوں میں مجرم ہوں۔ میں نے جنتا کی تندرستی

برباد کر کے اپنی جیبیں بھری ہیں۔ مجھے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ میں نے پاپ کیا ہے، سپرنٹنڈنٹ صاحب! میں پاپی ہوں۔ آپ سُن رہے ہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب میں سچ کہتا ہوں۔''

سپرنٹنڈنٹ: ''سن رہا ہوں۔''

ہیرالال: ''تو پھر مجھے ہتھکڑی پہنایئے۔ جیل خانے بھیجئے۔ مجھے اپنے پاپ کی سزا ملنی چاہیے۔''

سپرنٹنڈنٹ: (گھنٹی بجاتا ہے) ''ارے کوئی ہے؟''

اردلی: ''سرکار!''

سپرنٹنڈنٹ: ''انھیں باہر نکال دو!''

ہیرالال: ''آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں اپنے جرم کی سزا مانگتا ہوں اور آپ مجھے پھر جرم کرنے کے لیے آزاد چھوڑ رہے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میں پاپی ہوں۔ دھوکے باز ہوں مجھے سزا دیجئے۔''

سپرنٹنڈنٹ: دیکھتے کیا ہو لے جاؤ۔

اردلی: چلیے۔

ہیرالال: میری بات تو سن لیجئے۔

سپرنٹنڈنٹ: ''کیا کوئی اور بات بھی کہنا چاہتے ہو؟''

ہیرال لال: جی ہاں؟ کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی سنگین جرم نہیں ہے۔ لوگوں کو دھوکا دینا، ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنا، انھیں طرح طرح کے بھلاوے دینا، کوڑا کرکٹ کو مرہم اور منجن کا نام دے کر انھیں بیوقوف بنانا، ان کی تندرستی تباہ کرنا دھوکا نہیں ہے؟''

سپرنٹنڈنٹ: ''ہے۔ ضرور ہے۔''

ہیرالال: تو آپ کے خیال میں سچ نہیں بول رہا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: سچ کا نام نہ لیجئے۔ میرے سامنے یہ لفظ بھی زبان سے مت نکالئے۔ آپ جانتے ہیں اس شہر میں تین دن سے ہر مرد عورت۔ بچے جوان بوڑھے کو سچ کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ ہر آدمی سچ بول رہا ہے۔ اپنے زندگی بھر کے گناہ بیان کر کے ہم سے سزا چاہ رہا ہے آپ

جانتے ہیں اس کا کیا نتیجہ ہوا ہے؟''

ہیرالال: کیا کوئی بہت بُرا نتیجہ نکلا ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں۔ بُرا اور بہت بُرا! اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے ہیرالال جی کہ ہماری جیل اور حوالات میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ عدالتوں میں مقدموں کی تعداد دس گنی ہو گئی ہے۔ اسٹامپ اور واٹر مارک بازار سے غائب ہو گئے ہیں اور آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں آپ کو جیل بھیج دوں۔

ہیرالال: کیا ہمارا شہر پاپیوں اور مجرموں سے بھرا ہوا تھا؟

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں! ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کسی کو گمان بھی ہو سکتا تھا کہ اس شہر کا ہر دسواں آدمی پاپی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے شہر کی عزت آبرو مٹی میں مل گئی ہے۔ سارا ملک بلکہ یوں کہیے ساری دنیا اسے پاپیوں کا شہر سمجھتی ہے۔ اس سچ نے ہمیں غارت کر دیا ہے۔ جائیے ہیرالال جی جائیے اس سچ کے چکر میں نہ پڑیے۔

ہیرالال: ہری اوم! ہری اوم!! ہری اوم!!!

سپرنٹنڈنٹ: ہری اوم کیا ہنومان چالیسا پڑھئے ہنومان چالیسا!! اگر اسی طرح سچ بولتی رہی جنتا تو مجھے بتائیے کہ دنیا کا کاروبار کیسے چلے گا؟

ہیرالال: تو آپ کے خیال میں دنیا جھوٹ کے سہارے چلتی ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: جی ہاں، بالکل یہی خیال ہے میرا۔ دیکھئے جب سے اس شہر پر سچ بولنے کا دورہ پڑا ہے وکیلوں کے گھر فاقے ہو رہے ہیں۔ ان کے بیوی بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔

ہیرالال: کیوں؟

سپرنٹنڈنٹ: اس لیے کہ ان کے گھر والے جھوٹ بولنے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کے موکل جھوٹ بولنے کو تیار نہیں ہیں۔

ہیرالال: ''ہری اوم! ہری اوم!!''

سپرنٹنڈنٹ: اس لیے کہتا ہوں کہ ہیرالال جی، رام رام کیجئے اور اپنے گھر جائیے۔

ہیرالال: نہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ میری آتما کو شانتی نہیں ملے گی۔ مجھے سزا دیجئے۔ مجھے جیل

بھیج دیجیے۔

سپرنٹنڈنٹ: جیل میں جگہ نہیں ہے۔ ایسے چھوٹے موٹے مجرم کے لیے بالکل جگہ نہیں ہے۔

ہیرالال: سزا مجرم کا پیدائشی حق ہے۔ میں واپس جانے سے انکار کرتا ہوں۔ آپ مجھے اردلیوں سے اٹھوا کر باہر بھی پھینکوا دیں گے تو میں پھر لوٹ آؤں گا۔

سپرنٹنڈنٹ: میں پھر باہر پھینکوا دوں گا۔

ہیرالال: ایسا کیجئے میں انتظار کرتا ہوں۔ مجھے یہیں بیٹھا رہنے دیجئے گا۔ جب حوالات میں جگہ خالی ہو جائے مجھے بھیج دیجئے گا۔

سپرنٹنڈنٹ: کوئی امید نہیں۔

ہیرالال: اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔ مجھ پر آپ کی بڑی کرپا ہوگی میں پھر دھوکا دینے کے لیے سزا کے بغیر دنیا میں واپس جانا نہیں چاہتا۔

سپرنٹنڈنٹ: اچھا آپ کی مرضی۔ بیک روم میں بیٹھ جائیے۔

ہیرالال: شکریہ۔

سپرنٹنڈنٹ: اردلی —— دیکھو اب کسی کو اندر مت آنے دینا۔

اردلی: جو حکم سرکار!

سپرنٹنڈنٹ: چاہے کوئی کتنا ہی سچ بولے۔ ڈنڈے مار مار کر سب کا سچ نکال دو۔ خبردار جو کسی کو اندر گھسنے دیا۔

(تھوڑی دیر بعد اردولی گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

اردلی: صاحب! صاحب ڈاکٹر شرما!

ڈاکٹر شرما: معاف کیجئے گا سپرنٹنڈنٹ صاحب بغیر اطلاع کے آنا پڑا۔

سپرنٹنڈنٹ: ڈاکٹر صاحب۔ آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ کے خادم ہیں۔ فرمائیے کیسے تکلیف فرمائی۔ میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر: پہلی سیوا تو یہ ہے سپرنٹنڈنٹ صاحب کہ مجھے آج سے ڈاکٹر نہ کہیے۔

سپرنٹنڈنٹ: تو کیا آپ بھی ——؟

ڈاکٹر: آپ جانتے ہیں آج تک میں نے کیا کیا ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: میں کیا سارا شہر جانتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ آپ نے اس شہر کے بے شمار آدمیوں کو شفا دی ہے۔ اس شہر میں کیا آس پاس کے کئی شہروں میں آپ سے بڑا ڈاکٹر — ؟

ڈاکٹر: مگر اصلیت یہ ہے کہ میں انسانوں کے دکھ درد سے ان کی بیماری آزاری سے چاندی بناتا رہا ہوں۔ میں نے انسان کے دکھ درد کی تجارت کی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر: میری بغل میں آئیڈیل فارمیسی کے نام سے دواؤں کی جو دکان ہے وہ بھی میری ہی ہے آپ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ میں اس دکان کے ذریعے ذخیرہ اندوزی اور نفع بازی کرنا چاہتا ہوں اس دکان کو ہر قسم کی دواؤں کے لائسنس مل گئے ہیں اس دکان کی ساری دوائیں جعلی ہیں ان میں ملاوٹ ہے۔ اسٹرپٹومائی سین میں کھریا پیس کر ملائی گئی ہے۔ اصلی شیشیاں خالی کر کے ان شیشیوں میں ملاوٹ والی دوائیں انجکشن کی سوئی کے ذریعے داخل کی گئی ہیں۔ میں نے اس بے ایمانی کے دھندے سے جنتا کو دھوکا دیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: ناممکن ہے آپ ایسا دھرماتما یہ سب نہیں کر سکتا۔ آپ نے شہر کی دھرم شالا بنوائی ہے داؤ جی کے مندر کے لیے سب سے بڑا دان آپ ہی نے دیا تھا۔ مجھے وشواس نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر: میں سچ کہتا ہوں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ جانتے ہیں یہ جرم بہت بڑا جرم ہے۔

ڈاکٹر: جانتا ہوں اور اس جرم کی سزا پانے کے لیے تمھارے پاس آیا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: سوچ لیجیے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: اچھی طرح سوچ لیا وشواس کرو — میں وہی ڈاکٹر شرما ہوں جس نے ایک ہزار روپیہ لے کر سیٹھ دلی چند کی بیوی کو زہر کے انجکشن لگائے تھے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا بیمہ ہو چکا تھا اور سیٹھ دلی چند میری مدد سے اسے موت کے گھاٹ اتار کر انشورنس کی ساری رقم وصول کرنا چاہتا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

ڈاکٹر: جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: یہ تو سراسر قتل ہے!

ڈاکٹر: میں نے قتل کیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: تو مجھے آپ کو گرفتار کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر: گرفتار کرو ضرور کرو! بلکہ مجھے پھانسی پر چڑھا دو۔ جب ہی میرا ضمیر تسکین پائے گا جو زندگی جنتا کی سیوا میں کٹنی چاہیے تھی وہ دھوکا اور جعل سازی میں کٹ گئی۔ کتنے جھوٹے سرٹیفکٹ لکھے۔ کتنے جھوٹے پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں بنائیں۔ کتنوں کو جان بوجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجھے پھانسی ہی ہونی چاہیے۔

سپرنٹنڈنٹ: یہ میرے اختیار میں نہیں ہے— یہ تو بتایئے سیٹھ دلی چند کہاں ہیں؟

ڈاکٹر: اس نے خودکشی کرلی۔

سپرنٹنڈنٹ: چلئے اچھا ہی ہوا۔ (گھنٹی بجاتا ہے) اردلی! ہتھکڑی لاؤ۔

اردلی: یہ لیجیے حضور!

سپرنٹنڈنٹ: مجھے بہت افسوس ہے ڈاکٹر شرما (ہتھکڑی پہناتا ہے) اردلی! سپاہیوں کو بھیجو حوالات لے جائیں۔

اردلی: بہت اچھا۔ حضور!

سپرنٹنڈنٹ: اور دیکھو۔ ایک سپاہی کو ہماری کوٹھی پر بھیجو۔ یہ معلوم کر کے آئے کہ میم صاحب مسوری سے آگئیں یا نہیں۔ وہ اپنے بیٹے نریندر سے ملنے مسوری گئی تھیں۔ آج آتی ہوں گی۔

اردلی: بہت اچھا حضور!

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، بجتی رہتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اس کا جواب دیتا ہے۔)

سپرنٹنڈنٹ: ہیلو!...... بول رہا ہوں...... کیا کہا...... دودھ والے تھانے کو گھیرے کھڑے ہیں...... کیا کہتے ہیں......؟ (ہنستا ہے) سزا چاہتے ہیں۔ دودھ میں پانی ملانے کی...... کیا کہا؟ نہیں نہیں...... جیل میں بالکل جگہ نہیں...... پچاس پچاس جوتے لگاؤ اور چھوڑ دو! (غصے سے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیتا ہے) کم بخت سب کے سب اسی مرض میں مبتلا ہیں سچ

بولنے کی بیماری! ہونہہ!! بڑے آئے ایماندار کہیں کے!"

(باہر سے شور کی آواز آتی ہے)

اردلی: نہیں جاسکتے۔صاحب کا حکم ہے۔

پرنسپل: مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

اردلی: نہیں جانے دوں گا۔منع کر دیا ہے۔سنتے نہیں۔

پرنسپل: جانتا ہے کس سے بات کر رہا ہے؟ کالج کے پرنسپل کا راستہ روکتا ہے۔نالائق۔

سپرنٹنڈنٹ: اندر آنے دو۔پرنسپل صاحب کو اندر آنے دو۔

پرنسپل: نمستے سپرنٹنڈنٹ صاحب!

سپرنٹنڈنٹ: معاف کیجئے گا پرنسپل صاحب میرا اردلی نرا اجڈ ہے۔بڑا جنگلی ہے کمبخت۔آدمی دیکھ کے بات نہیں کرتا۔میں تو خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔

پرنسپل: لیجیے میں آگیا۔اور آ کیا گیا لایا گیا ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: پرسوں سے جو واقعات اس شہر میں ہو رہے ہیں۔ان سے میری عقل چکرا گئی ہے۔ میں آپ جیسے کسی عالم فاضل سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر سچ کیا ہے۔وہ جو مصیبت میں ڈالے یا انسانوں کو مصیبت سے نکالے۔

پرنسپل: یہ میں کچھ نہیں جانتا کپتان صاحب۔میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ضمیر کے اندر جو کالا ناگ چھپا رہتا ہے۔آتما کا جو زہر ہے وہی سچ ہے اور آج وہی کالا ناگ مجھے آپ کے پاس تک کھینچ لایا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: تو کیا آپ بھی؟

پرنسپل: میں نہیں جانتا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔میں تو یہ بتانے آیا ہوں کہ جسے آپ عالم فاضل کہتے ہیں۔علم کا اوتار اور گیان کا دیوتا جانتے ہیں وہ ایک فریبی ہے فراڈ ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

پرنسپل: آج تک میرے کالج میں جتنے لیکچرر رکھے گئے ہیں سب کے سب میرے رشتے دار ہیں

یا میرے کسی رشتے دار کے رشتہ دار ہیں۔ ہر جگہ کے لیے ایک سے ایک قابل آدمی نے درخواست دی لیکن کوئی ہماری کسوٹی پورا نہیں اترا۔

سپر نٹنڈنٹ: لیکن اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔ تقرر تو سلیکشن کمیٹی کرتی ہے۔

پرنسپل: اور سلیکشن کمیٹی ہم مقرر کرتے ہیں۔ اس کے ممبروں میں ہمیشہ میں نے ان لوگوں کو رکھا ہے جو میری ہاں میں ہاں ملا سکیں جنھیں آموں کے زمانے میں آٹھ دس ٹوکرے آم بھجوا سکوں یا ان سے وصول کر سکوں۔ جن کی کمیٹیوں میں خود جا کر ان کی ہاں میں ہاں ملا سکوں۔ ان سب کو میں نے رشوت سے زیر کر رکھا تھا۔ کنبہ پروری اور جعل سازی کیا پاپ نہیں ہے؟

سپر نٹنڈنٹ: ضرور ہے لیکن آپ نے انٹرویو کر کے تقرر کیے ہیں۔

پرنسپل: انٹرویو بھی فراڈ ہے جس کو لینا ہوتا ہے اس کے ہر جواب پر پورا بورڈ جھوم جاتا ہے۔ میرے کالج کے استاد اس کے نام سے مقالہ لکھتے اور چھپواتے۔ اس کے لیے ریسرچ کا خاکہ تیار کرتے اور کہہ سن کر (Examiner) سے اسے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دلواتے تھے۔ یہی نہیں ہماری سانٹھ گانٹھ اوپر بورڈ تک رہتی تھی۔ ہم دوسرے تیسرے سال نصاب کی نئی کتاب اپنے ہی ذمے لے لیتے اور بک سیلروں سے رشوت لے کر پرانی کتاب کی جگہ ان کی کتابیں نصاب میں داخل کر دی جاتی تھیں۔ اور ہمارے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ پاپ نہیں ہے؟

سپر نٹنڈنٹ: آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

پرنسپل: میں آپ سے سزا چاہتا ہوں۔ کپتان صاحب! سخت سے سخت سزا چاہتا ہوں۔ میں مجرم ہوں۔ میں نے کنبہ پروری نفع خوری اور بے ایمانی ہی نہیں کی ہے۔ میں نے قوم کی امانت میں خیانت کی ہے۔ میں نے آنے والی نسل کی زندگی برباد کر دی ہے۔ انھیں اپنی سیاست میں استعمال کرنے کی غرض سے ان کے گروہ بنا کر انھیں غنڈہ گردی سکھائی۔ انھیں اپنے گروہ کی طاقت بڑھانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ میں نے انھیں صرف خود غرضی، ہوس اور غنڈہ گردی کی تعلیم دی ہے۔ میں نے انھیں گیان کے نور کے بجائے

جہالت کا اندھیرا ہی دیا ہے۔ کیا قوم مجھے سزا نہ دے گی؟ مجھے سزا دیجیے کپتان صاحب، سزا دیجیے۔

سپرنٹنڈنٹ: سزا دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں صرف آپ کو گرفتار کر سکتا ہوں۔

پرنسپل: شکریہ! آپ نے میرے دل کا بہت بڑا بوجھ دور کر دیا۔

سپرنٹنڈنٹ: (گھنٹی بجاتا ہے) اردلی! ہتھکڑی لگا کے حوالات لے جاؤ!

اردلی: جو حکم حضور!

(پچھلے کمرے سے ہیرالال کی آواز آتی ہے)

''میرے لیے کوئی جگہ خالی ہوئی کپتان صاحب؟''

سپرنٹنڈنٹ: سن رہے ہو ہیرالال! غضب خدا کا انصاف اور تعلیم ہی پورے سماج میں سب سے اعلیٰ محکمے تھے۔ ان کا یہ حال ہے۔ اے خدا۔ ہے بھگوان!

ہیرال لال: تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: بیٹھے رہیے خاموشی سے۔ (باہر سے کار کا ہارن سنائی دیتا ہے)

اردلی: صاحب! صاحب!!

سپرنٹنڈنٹ: کوئی بھی ہو کسی کو اندر مت آنے دو۔

اردلی: مگر صاحب سیٹھ چھبیل داس جی ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: وہ خود؟

اردلی: جی ہاں وہ خود آئے ہیں اپنی کار میں بیٹھ کر۔ بلا لاؤں سرکار؟

سپرنٹنڈنٹ: بلا لو۔

سیٹھ: نمسکار۔ کپتان صاحب۔ کہیے کیا حال ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ: نمسکار۔ آپ کی کرپا ہے سیٹھ جی۔ آپ نے کیسے تکلیف کی؟

سیٹھ: آپ کو ذرا سی تکلیف دینی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: جی فرمایئے میں کیا سیوا کر سکتا ہوں؟

سیٹھ: ''آپ کے پاس دیا سلائی ہوگی؟''

سپرنٹنڈنٹ: ''دیا سلائی؟ جی ہاں یہ لیجئے۔ یہ رہی دیا سلائی!''

سیٹھ: میں اپنا آخری سگار جلانا چاہتا ہوں۔ اصلی کرونا ہے۔ آپ بھی پی لیجئے۔

سپرنٹنڈنٹ: شکریہ!

سیٹھ: یہاں نہیں ملتا۔ خاص کیوبا کا بنا ہوا ہے بلکہ اسپیشل میرے ہی لیے بنتا ہے اور خاص میرے لیے اسمگل ہوتا ہے۔ ورنہ آپ کی سرکار درآمد کرنے دیتی ہے کسی اچھی چیز کو؟

سپرنٹنڈنٹ: اسمگل؟

سیٹھ: جی ہاں۔ سیٹھ چھبیل داس جس نے دھرم شالائیں، تین ودھوا آشرم اور پانچ اناتھ آشرم کھولے ہیں آپ کے ملک کا اسمگلر کنگ ہے۔ اسمگلر کنگ!! بڑی حیرانی ہو رہی ہے آپ کو۔ جی ہاں آپ سوچتے ہوں گے جس کے دو روزنامے نکلتے ہیں۔ تین ہفتہ وار اخبار اور پچیس اخبار جس کی تعریف میں روز کوئی نہ کوئی خبر چھاپتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب اس کے کارخانے کے اشتہاروں پر چلتے ہیں۔ وہ شخص جس کے اشارے پر پارلیمنٹ کے ایک دو نہیں دس بارہ ممبر ناچتے ہیں۔ بھلا ایسا آدمی اسمگلر کیسے ہو سکتا ہے؟

سپرنٹنڈنٹ: سگاروں کی اسمگلنگ خاصی بے ضرر چیز ہے۔

سیٹھ: جی نہیں صرف سگاروں کی کیوں؟ کوکین کی اسمگلنگ۔ افیم کی اسمگلنگ غرض ہر اس چیز کی اسمگلنگ۔ اناج اور چاول کی اسمگلنگ۔ دواؤں کی اسمگلنگ غرض ہر چیز کی اسمگلنگ جس کا کاروبار ہو سکتا ہے۔ جو فارن ایکسچینج پورے ملک نے خون پسینہ ایک کر کے جمع کیا تھا۔ وہ میں نے پانی کی طرح بہا دیا۔ اگر آپ آج پتہ لگانا چاہیں تو نیویارک۔ لندن۔ سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں میرا حساب ایک نہیں کئی کئی ناموں سے ملے گا۔ یہ سب روپیہ چوری کا ہے۔ یہ سب کھلم کھلا دھوکے بازی کا روپیہ ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

سیٹھ: میرے ذخیروں میں آج بھی لاکھوں من اناج، لاکھوں من شکر اور لاکھوں من دوسری ضرورت کی چیزیں جمع ہیں ـــــ ان کی قیمتیں چڑھ رہی ہیں۔ جنتا فاقوں سے مر رہی ہے۔ میں اس کے خون سے سونا بنا رہا ہوں۔ مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ بنگال کا ساقحط

ایک بار پھر پڑنے والا ہے۔ مہنگائی اپنے پورے زور پر ہے۔ میں لکھ پتی سے کروڑ پتی اور کروڑ پتی سے ارب پتی ہونے والا ہوں لیکن میں پاپ کی کمائی کھانا نہیں چاہتا۔ آج میں اپنے گوداموں کی کنجیاں آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔ یہ لیجیے۔ (کنجیاں دیتا ہے۔)

سپرنٹنڈنٹ: دھنیہ واد! آج میرے دل میں انصاف آ ہی گیا۔

سیٹھ: آج میرے دل کے انصاف سے کیا ہوتا ہے میری پچھلی زندگی کے پاپ تو اس سے نہیں دھل سکتے۔ آپ جانتے ہیں۔ میں نے آج تک کبھی انکم ٹیکس کی پوری کیا آدھی رقم بھی ادا نہیں کی۔ میں مجرم ہوں۔ پاپی ہوں۔ میرے سارے بہی کھاتے جعلی حساب بنانے میں ماہر ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ کو خوشی ہوگی کہ یہ سب ماہرین اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر چکے ہیں۔

سیٹھ: مجھے معلوم ہے لیکن آپ کو سب کچھ معلوم نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری پندرہ بڑی بڑی ملیں اور کارخانے ہیں۔ ان میں پانچ ہزار سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ ان کو اور ان کی یونینوں کو قابو میں رکھنے کے لیے میرے پاس غنڈوں کی ایک فوج ہے جس سے کبھی کبھی میں ہندو مسلم فسادات بھی کراتا ہوں۔ ان ہی غنڈوں میں بعض مشہور ڈکیت ہیں جن کی ڈکیتیوں میں مجھے بھی حصہ ملتا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: وہ سب ڈکیت خود کو گرفتار کرا چکے ہیں۔

سیٹھ: مجھے معلوم ہے۔ جس انکم ٹیکس آفیسر نے میرے حسابات کی جانچ پڑتال کر کے بلیک کے روپیہ کی رپورٹ لکھی تھی اور ایک لاکھ روپیہ انکم ٹیکس کی بقایا نکالی تھی۔ آپ جانتے ہیں میں نے اس کا کیا کیا؟

سپرنٹنڈنٹ: رشوت دی؟

سیٹھ: مگر اس نے رشوت نہیں لی۔

سپرنٹنڈنٹ: اسے ڈرایا دھمکایا؟

سیٹھ: وہ پھر بھی نہیں مانا۔ میں نے اسے چلتی گاڑی میں قتل کرا دیا۔ مجھے اس طرح نہ دیکھو میں نے اسے قتل کرا دیا۔ سنتے ہو میں نے اسے قتل کرا دیا؟ میں قاتل ہوں۔ سیٹھ چھبیل داس

قاتل ہے۔اسے گولی ماردو۔

سپرنٹنڈنٹ: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ جانتے اسے اقبال جرم سمجھا جائے گا۔

سیٹھ: اچھی طرح جانتا ہوں۔لیکن میں تمھیں رشوت نہیں دوں گا۔میرے چار بنک ہیں۔ان میں سے ایک کا دیوالیہ میں نے جان بوجھ کرنکالا تھا۔ان سب کا روپیہ جمع کرنے والوں سے لیتا ہوں۔اوراپنے بزنس میں لگاتا ہوں۔لیکن اب میں اس رقم میں سے ایک پیسے کا بھی حقدار نہیں ہوں۔میں تمھیں رشوت نہیں دوں گا۔میرا اقبال جرم لکھو۔میرے اوپر مقدمہ چلاؤ۔میں ذلت ورسوائی اور موت کا مستحق ہوں۔مجھے موت دے دو۔میرے دل پر سے یہ بوجھ اسی وقت اٹھے گا۔

سپرنٹنڈنٹ: (زور سے کئی بار گھنٹی بجاتا ہے) اردولی! سیٹھ جی کا بیان لکھواؤ اور ان کی کار گیراج میں بند کردو۔

اردلی: جو حکم سرکار۔

سپرنٹنڈنٹ: تم سے کتنی بار کہا جائے کسی کو مت آنے دو سمجھے؟

اردلی: جی سرکار۔

سپرنٹنڈنٹ: جی سرکار! جی سرکار! کیا لگا رکھی ہے۔اب میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ہرگز ہرگز نہیں ملوں گا۔

اردلی: مگر سرکار — ؟

سپرنٹنڈنٹ: اگر مگر کیا کرتا ہے؟

اردلی: حضور میم صاحب!

سپرنٹنڈنٹ: آگئی ہیں؟

اردلی: جی سرکار۔

سپرنٹنڈنٹ: تو بھیجو انھیں جلدی اندر بھیجو۔

اردلی: بہت اچھا سرکار۔

سپرنٹنڈنٹ: اوہ ڈرالنگ! شما کرنا اس گدھے اردلی کو تو تم جانتی ہو۔بالکل بیوقوف ہے۔آج کام

بہت تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا۔ آج میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ اس کم بخت نے تمھیں بھی روک لیا۔ تم اتنی خاموش کیوں ہو۔ سفر کی تکان ہے۔ شاید چائے پیوگی؟

بیوی: نہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: تم اتنی اداس کیوں ہو؟ خیریت تو ہے نریندر تو اچھا ہے؟

بیوی: ہاں۔ اچھا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: پھر کیا بات ہے؟

بیوی: (پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے) نریندر کامنی سے شادی کر رہا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: ہمارا بیٹا نریندر شادی کر رہا ہے؟

بیوی: کامنی سے۔

سپرنٹنڈنٹ: کامنی؟ ارے وہی اپنے یار جوگندر سنگھ کی لڑکی؟ نریندر اس سے شادی کر رہا ہے تو کرنے دو۔ اس میں ایسی گھبرانے کی کیا بات ہے ڈارلنگ۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔

بیوی: بڑا انیائے ہو جائے گا۔

سپرنٹنڈنٹ: تمھارا مطلب ہے ذات برادری کا فرق ہے۔ میں نہیں مانتا ذات برادری کے ڈھکوسلوں کو۔

بیوی: نہیں! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ دونوں سگے بہن بھائی ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: کیا کہا؟ تو کیا نریندر میرا بیٹا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی مجھ سے دغابازی کرتی رہی ہو۔ تم میرے دوست جوگندر سنگھ کے ساتھ گل چھرے اڑاتی رہی ہو! میں برداشت نہیں کر سکتا (چیخ کر) نکل جاؤ! نکل جاؤ! میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں چلی جاؤ۔

بیوی: میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ میں اور جوگندر کالج کے زمانے سے ایک دوسرے سے پریم کرتے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ: (بات کاٹ کر) بند کرو، پریم کہانی۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ نکل جاؤ۔

بیوی: میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے زندگی میں کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ میں تمھاری محبت کے

قابل نہیں تھی۔ میں نے ہر بار تمھیں فریب دینے کی کوشش کی۔ میں نے جوگندر سے پریم
کیا۔ میں نے تمھیں دھوکا دیا ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی تمھیں نہیں چاہا۔ میں
دھوکے باز ہوں مجھے سزا دو! بھگوان کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: سچ سے مجھے نفرت ہے سنا تم نے؟ مجھے سچ سے نفرت ہے۔ سچ بولنے والوں سے
نفرت ہے۔ سچ زہریلا ناگ ہے جو زندگی بھر کے سکھ اور شانتی کو ڈسے لے رہا ہے (زور
سے گھنٹی بجاتا ہے اور چیختا ہے) اردلی! اردلی!

اردلی: جی سرکار!

سپرنٹنڈنٹ: میم صاحب کو لے جاؤ۔ ان کا بیان قلم بند کراؤ — لے جاؤ۔

اردلی: ''بہت اچھا حضور!'' (دونوں چلے جاتے ہیں)

سپرنٹنڈنٹ: تو یہ ہے اس ڈرامے کا انجام! میں یہ توہین برداشت نہیں کروں گا۔ اس کا علاج
موت ہے صرف موت۔ (وقفہ)

ہیرالال: ''حوالات میں کوئی جگہ خالی ہوئی کپتان صاحب! (گولی کی آواز ہوتی ہے) ارے یہ
کیا؟ کپتان صاحب! آپ نے یہ کیا کیا۔ آتم ہتیا...... اردلی! سپاہیو! کپتان صاحب
نے خودکشی کرلی...... پستول سے گولی مارلی! دیکھتے ہو سچائی کیسی بھیانک ہے؟ کیسی
خطرناک ہے...... اعلان کردو آج سے کوئی سچ نہ بولے...... آج سے کوئی جھوٹ کو بُرا نہ
کہے...... سچائی بڑی بھیانک ہے!!''

(پردہ)

☆☆☆
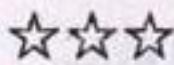
داراشکوہ

(خسرو کی غزل کے دو شعر گائے جائیں۔

ہمیں ریزی بہ بازی خون یاراں

چنیں باشد سزائے دوستداراں

من رسوا و ہر سو خندۂ خلق

چو مستے درمیان ہوشیاراں)

پہلا سین

(روشن آرا کا ایوان۔ رقاصہ ناچ رہی ہے۔ محفل رقص کا سماں بندھ گیا ہے۔)

روشن آرا: (اچانک تلخی سے) رقص بند کرو۔ ہمارا دل سکون نہیں پاتا زرافشاں۔

زرافشاں: حضور۔

روشن آرا: کنیزوں سے کہو جائیں۔ ہمیں تنہائی چاہیے۔ (سب چلی جاتی ہیں صرف زرافشاں رہ جاتی ہے۔)

زرافشاں: (قریب آکر) نصیب دشمناں حضور شہزادی صاحبہ کا مزاج کیسا ہے۔ لیجئے اب تو تخلیہ ہوگیا۔ اب تو حضور باندی سے دل کا حال۔

روشن آرا: (بات کاٹ کر) دل کا حال پوچھتی ہو۔ روشن آرا کے سر پر قیامت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہمارے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ہمارا خون کھول رہا ہے۔ زرافشاں ہم سب کچھ کر ڈالیں گے۔ مسل کر رکھ دیں گے۔ آج ظل سبحانی نے دارا کو سر دربار دوسرے تخت پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ دارا کو ہاتھیوں کی لڑائی سے دل بہلانے کی رخصت دی گئی ہم یہ نہیں دیکھ سکتے۔

زرافشاں: مگر حضور ظل سبحانی کا حکم۔

روشن آرا: (بات کاٹ کر) روشن پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ یہ سارا بس انھیں بی جہاں آرا بیگم کا بویا ہوا ہے۔ وہ ظل سبحانی کی ایسی چہیتی بنی ہیں کہ ظل سبحانی کے جیتے جی تخت و تاج کا فیصلہ کیے دے رہی ہیں ہم جانتے ہیں زرافشاں ہندوستان کے تخت پر دارا کی پر چھائیاں نہیں پڑے گی۔

زرافشاں: اے ہے۔ حضور شہزادی صاحبہ کو اس کی کیا فکر ہے۔

روشن آرا: تو نہیں سمجھتی دارا ہمارا بھائی ہے ہم اسے پہچانتے ہیں۔ وہ جیت گیا تو جہاں آرا بیگم کا طوطی بولے گا۔ یہ دونوں مل کر تگنی کا ناچ نچائیں گے۔

زرافشاں: اے ہے حضور۔ آخر تو آپ کے بھائی ہیں۔ ذرا چل کر مبارکباد تو دے آیئے۔ لوگ کہیں گے۔ بھائی کو عزت ملی تو بہن کے منہ سے مبارکباد کا ایک حرف بھی نہ نکلا۔

روشن آرا: ابھی ہمارے مبارکباد دینے کا وقت نہیں آیا۔ ہم اس وقت مبارکباد دیں گے جب وہ پابہ زنجیر طوق پہنے کشاں کشاں دربار میں لائے جائیں گے۔

زرافشاں: ایسا نہ کہیئے سرکار۔

روشن آرا: کیوں نہ کہوں۔ تمہارا دل ڈرتا ہے زرافشاں۔ اس لیے کہ تم لونڈی ہو ہم شہزادی ہیں۔ شہزادیوں کے بھائی بہن نہیں ہوتے وہ سنپولیوں میں پلتی ہیں یا وہ کسی کو ڈس لیتی ہیں یا وہ خود ڈس لی جاتی ہیں۔

زرافشاں: حضور چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔

روشن آرا: کہو۔

زرافشاں: آخر صاحب عالم آپ کے بڑے بھائی ہیں۔ خون آخر خون ہے۔ آخر ماں جایا بھائی ہیں۔

روشن آرا: جاہلوں کی سی باتیں مت کرو۔ تم بزدلوں نے کبھی اپنے بھائیوں کو زنجیروں پہنے تلواروں کے زخم کھاتے نہیں دیکھا۔

زرافشاں: (گھبرا کر) نوج سرکار خدا نہ کرے۔

روشن آرا: ہم شہزادیوں کے لیے یہ کھیل ہے اور یہ کھیل دارا کے ساتھ بھی کھیلا جائے گا۔

(دارا داخل ہوتا ہے)

دارا: ہم آسکتے ہیں روشن!

روشن آرا: بھائی جان آداب!

(زرافشاں سلام کر کے چلی جاتی ہے)

دارا: کیا کھیل کھیل رہی تھیں۔

روشن آرا: کچھ نہیں یوں ہی شطرنج کی بازی کا ذکر تھا۔

دارا: خوب۔

روشن آرا: میں تو خود آپ کو مبارکباد پیش کرنے کے لیے حاضر ہونے والی تھی۔ میں نے جب سے یہ خبر سنی ہے۔ دل ہی دل میں واری صدقے جا رہی ہوں۔ خدا یہ تخت آپ کو مبارک کرے۔

دارا: کون سا تخت روشن۔

روشن آرا: واللہ حد ہو گئی ہے بے خبری کی۔ محل کے کونے کونے میں چرچا ہے کہ حضور ظل سبحانی نے آپ کو سر دربار دوسرے تخت پر بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

دارا: دلّی کا تخت بہت چھوٹا ہے روشن۔ مجھے اس سے بہت بڑی دولت ملی ہے۔ خواب میں مجھے بشارت دی گئی ہے۔ تجھے اللہ تعالیٰ ایسی نعمت عطا فرمائے گا جو ساری دنیا میں کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے دونوں جہان کی محبت میرے دل سے اٹھ گئی ہے اور فضل و رحمت کے دروازے میرے دل پر کھل گئے ہیں۔ یہ روحانی دولت دلّی کے تخت و تاج سے کہیں زیادہ ہے۔

روشن آرا: بھیا۔ میں نہ چندر بھان برہمن ہوں نہ سرمد فقیر کہ آپ کی باتیں سمجھ سکوں۔ آپ تو مطالعہ و تصنیف میں ایسے کھوئے رہتے ہیں کہ تخت سے بھی بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔

دارا: میرے مرشد ملا جیو اور شاہ محمد نے مجھے یہی ہدایت دی ہے۔ (خاموش ہو جاتا ہے پھر

تھوڑی دیر بعد سوچ کر) تمھارا نمازی بھیا محی الدین مجھے کافر کہتا ہے۔ بات اتنی ہے کہ میں خدا کو ایک مانتا ہوں اس کے سوا دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ ہر انسان کے دل میں اس کے نور کی چنگاری ہے۔ اس تک پہنچنے کے راستے الگ الگ ہیں۔ مگر سب کی منزل تو ایک ہے پھر میں دوسرے راستوں دوسری سچائیوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کروں۔ اپنشد اور بھگوت گیتا کے فارسی ترجمہ ہوئے تو کتنے چھپے ہوئے بھید کھل گئے۔ کیا بھید کھولنا کفر ہے۔ کیا دوسرے مذاہب کو سمجھ کر حقیقت تک پہنچنا کفر ہے۔ (پھر کچھ سوچنے لگتا ہے اور کھو جاتا ہے) تم نے بابا لال فقیر سے میرے سوال و جواب پڑھیں ہیں۔

روشن آرا: آپ کی کتابیں اور رسالے تو اب اتنے ہیں کہ کوئی کہاں تک پڑھے۔

دارا: ان مکالموں کو پڑھنا۔ ان میں میں نے حقیقت کو ایک نئے انداز سے بے نقاب کیا ہے۔

روشن آرا: بھیا صوفیوں اور فقیروں سے زیادہ اب آپ کو امرا سے کام لینا ہے۔

دارا: زمانہ بادشاہوں کا نام بھلا دیتا ہے فقیروں کو یاد رکھتا ہے۔

روشن آرا: خیال ہے آپ کا۔

دارا: نہیں۔ تم کبھی علاء الدین خلجی کے مزار پر گئی ہو۔

روشن: نہیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں دفن ہے۔

دارا: اور نظام الدین اولیاء

روشن آرا: ان کا مزار تو خیر و برکت کا دربار ہے۔

دارا: علاء الدین کو زمانے نے بھلا دیا مگر نظام الدین اولیأؒ اور امیر خسروؒ کو کون بھلا سکتا ہے۔ مجھے ایک بات کا خیال نہ ہوتا تو میں ہندستان کا تخت اپنے تینوں بھائیوں میں سے کسی کے لیے چھوڑ دیتا۔

روشن آرا: (حیرت سے) بھیا! (تھوڑی دیر بعد) ایسی فال بد زبان سے نہ نکالیے۔

دارا: مگر خواہر عزیز میں اس ملک میں رواداری محبت اور ملاپ کی فضا چاہتا ہوں جو جد اعلیٰ

شہنشاہ اکبر نے قائم کی تھی۔ مذہب کو ملاپ کا ذریعہ ہونا چاہیے نفرت کا نہیں۔ ہمارے دیس میں رام اور رحیم کے ماننے والے ہمہ اوست اور تت توام اسی میں اسی کا جلوہ دیکھیں۔ میں تخت وتاج صرف اسی لیے چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر سارے مذہبوں کو ایک دوسرے سے قریب لاسکوں۔ ایک بار پھر ہندوستان ایک ہو جائے۔ یہی میرا خواب ہے یہی میرا ارمان ہے۔

روشن آرا: بھائی جان! آپ پر کفر کا جادو چل گیا ہے۔

دارا: کفر میں بھی اسی کا جلوہ ہے۔ اسلام میں بھی۔

روشن آرا: خیر آپ جانیے۔ مگر ہندوستان ان خیالات کی تاب نہ لاسکے گا۔

دارا: ممکن ہے میں ہندوستان کو ایک نہ کرسکوں ممکن ہے میرا سر بھی لال قلعے کے کنگوروں پر لٹکا دیا جائے۔ ممکن ہے میں تخت وتاج کی لڑائی ہار جاؤں مگر میرا کام صرف کوششیں اور عمل ہے انجام سے مجھے سروکار نہیں۔

روشن آرا: آپ جو خواب دیکھتے ہیں بھائی جان۔ ان کی تعبیریں کہاں سے آئیں گی۔

دارا: دارا اپنے خون سے ان خوابوں کو جگمگا کر چھوڑ جائے گا کہ آنے والی نسلیں ان سے اپنے چراغ روشن کرسکیں۔ تاریخ ان خوابوں سے اپنی مانگ میں سیندور بھر سکے۔

(زرافشاں داخل ہوتی ہے)

زرافشاں: صاحب عالم! ظل سبحانی نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔

دارا: ابھی!

زرافشاں: تاکید فرمائی ہے۔

دارا: اچھا روشن۔ خدا حافظ۔

(روشن کھڑی ہو کر تعظیم دیتی ہے اور سلام کرتی ہے۔ دارا چلا جاتا ہے تو کنیز کو روشن آرا اپنے پاس بلاتی ہے)

زرافشاں: حضور ایک راز کی بات معلوم ہوئی ہے۔

روشن آرا: جلدی بول۔

زرافشاں: ظلِ سبحانی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔

روشن آرا: کیا بکتی ہے۔

زرافشاں: سچ! شاہی چوبدار کہتا تھا کہ صاحب عالم کو اسی لیے بلایا گیا ہے۔

روشن آرا: ظلِ سبحانی کی طبیعت ناساز ہے...... (سوچتے ہوئے) ظلِ سبحانی کی طبیعت ناساز ہے۔

دوسرا سین

(کچھ مدت بعد ـــــ شاہجہاں کی خواب گاہ)

شاہ جہاں: ہماری علالت نے بھی کتنا طول کھینچا۔

دارا: ظلِ سبحانی کی طبیعت چند ماہ سے علیل ہے۔ اب انشاء اللہ جلد ہی شفایاب ہو جائیں گے۔

شاہ جہاں: تم نے اور جہاں آرا نے ہمیں بچایا۔

دارا: آپ کیا فرماتے ہیں!

شاہ جہاں: ہم حیران ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج اور مرے ہوئے شہنشاہ کو کون بچانا چاہتا ہے۔ سب ابھرتے ہوئے سورج کے پجاری ہوتے ہیں، تم عجیب شہزادے ہو کہ تخت کے وارث ہونے میں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔

دارا: کیا تخت و تاج کی ہوس انسانیت سے بڑھ کر ہے۔ آپ کا سایہ سر پر ہے تو میرے لیے یہی تخت و تاج سے کم نہیں۔

شاہ جہاں: اس بیماری میں ہمیں تیری قدر معلوم ہوئی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ دارا ہمیں اتنا چاہتا ہے۔

دارا: ظلِ سبحانی۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کے تمام احکام نہ بجا لا سکا۔

شاہ جہاں: تم نے کون سے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

دارا: آپ کی علالت کی خبر راز نہ رہ سکی قلعے سے آمد و رفت پر سخت پابندی رکھی گئی مگر پھر بھی افواہیں دکن اور گجرات تک جا پہنچی ہیں مراد نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ محی الدین

کی فوجیں راجدھانی کی سمت بڑھ رہی ہیں۔

شاہجہاں: ہم دربار کریں گے۔کیا ہمارے جیتے جی وہ جانشینی کے لیے خون خرابہ کرنا چاہتے ہیں۔
ہم انھیں حکم دیں گے کہ وہ بغاوت سے باز آجائیں۔

دارا: ظلِ سبحانی۔ یہ ہماری تقدیر ہے۔سارے مغل شہزادوں کی تقدیر ہے۔یا تو ان کے ہاتھ ان کے بھائیوں کے خون سے رنگے جائیں یا ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں اور انھیں دار پر لٹکایا جائے۔

شاہجہاں: سرکاری فوجوں کو تیاری کا حکم دو۔ہم تمھارے ساتھ چلیں گے ان سرپھروں کو راجدھانی میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

دارا: نہیں ابا جان۔آپ کی صحت ابھی اس قابل نہیں۔ میں آپ کا حکم ان تک پہنچادوں گا۔ آپ کے حکم کی بجا آوری میں مجھے جان بھی دینی پڑے تو میرے لیے عین سعادت ہے۔

شاہجہاں: میرے بیٹے۔میرے سینے سے لگ جا۔کاش ہم ایک بوڑھے معمار ہوتے جو ہر روز مزدوری کرنے کے بعد شام کو اپنے بچوں کو سینے سے لگا سکتا ہے جسے اپنے بیٹوں کے خون سے ہولی نہیں کھیلنی پڑتی۔مگر دارا۔ ہمت نہ ہارنا میرے بیٹے نیکی کبھی نہیں ہارتی۔ یاد رکھنا حق تیرے ساتھ ہے۔

دارا: میرے اوپر بھروسہ کیجیے ابا جان۔ دارا آپ کا حکم بجا لائے گا اکبر اور شاہجہاں کے ہندوستان کے لیے دارا کو اپنا سب کچھ نچھاور کرنا پڑے تو بھی میرا قدم پیچھے نہ ہٹے گا فتح آپ کی ہوگی۔

شاہجہاں: اچھا رخصت، خدا کرے فتح و کامرانی تیرے قدم چومے۔خدا کرے تیرے ناعاقبت اندیش بھائی خانہ جنگی سے باز آجائیں۔

(دارا رخصت ہوتا ہے)

تیسرا سین

(پنجاب کے میدانوں میں شاہی خیمے کے اندر رات کے وقت)

دارا: (خود کلامی کے انداز میں) دھرمٹ کی لڑائی ہاری جاچکی۔ صاحب عالم سے بے خانماں بے آسرا ہو کر پنجاب کے ان میدانوں میں بھٹکنا ہمارا مقدر ہے۔

نادرہ: اب کیا ہوگا میرے سرتاج!

دارا: اپنا جی میلا نہ کرو نادرہ۔ زمانہ کروٹیں بدلتا ہے۔ ہم نے جنگ ہاری ہے ہمت نہیں ہاری۔

نادرہ: یہ سب کچھ کیسے ہو گیا میرے آقا!

دارا: تقدیر کا کھیل ہے۔ ہماری فوج ساموگڑھ میں بہادری سے لڑی۔ اگر خلیل اللہ خاں غداری نہ کرتا تو فتح ہماری ہوتی۔ ہاتھی سے اتر کر ہمارا گھوڑے پر سوار ہونا غضب ہو گیا۔ ہودہ خالی دیکھ کر ہماری فوجوں کی ہمت پست ہوگئی۔ پانسہ پلٹ گیا۔

(نادرہ کی سسکی)

دارا: اب ہم تمھیں شاید ہندوستان کی ملکہ تو نہ بنا سکیں گے۔ صرف اپنے دل و جان کی سلطنت ہی تمھیں سونپ سکتے ہیں۔

نادرہ: میرے لیے آپ کے قدموں سے لگا رہنا ہی بڑی عزت ہے۔

دارا: ہمارا راستہ خطرناک ہے۔

نادرہ: میرے لیے آپ کے ساتھ موت بھی قبول ہے۔

دارا: تمھاری صحت ٹھیک نہیں رہتی نادرہ۔ میرے ساتھ تمھارا مارے مارے پھرنا ٹھیک نہیں۔

نادرہ: مگر یہاں پنجاب میں آپ کے جاں نثار موجود ہیں۔ یہاں کے صوبیدار داؤد خاں پر تو آپ کے بڑے احسانات ہیں۔

(داؤد خاں خیمے کے دروازے پر اپنا ذکر سن کر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔)

دارا: احسان ایک لفظ ہے جس کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔ وقت اور تقدیر سب کچھ بدل دیتی ہے۔

نادرہ: تو کیا آپ کو اس کی وفاداری پر شبہ ہے۔

دارا: اس کے بھی بیوی بچے ہیں۔ خاندان ہے اسے بھی عزت چاہیے، اطمینان چاہیے۔ مگر دارا شبہ میں نہیں پڑتا۔ ہمیں یقین ہے نادرہ کہ موت اور زندگی سب خدائے عزوجل کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک وہ ہمیں زندہ رکھنا چاہے گا ہمیں کوئی بھی مار نہیں سکتا۔

نادرہ: ایسی باتیں نہ کیجئے۔

دارا: ہم نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لیا ہے مگر تمھیں اس آزمائش میں ڈالتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

نادرہ: (میں کچھ نہیں سمجھی میرے سرتاج)

دارا: (خط نکال کر دیتا ہے) یہ خط پڑھو۔

نادرہ: کیسا خط ہے۔

دارا: آج ہمارے جاسوس یہ خط اڑا لائے ہیں۔

نادرہ: کس کا خط ہے۔ (خط لیتی ہے) محی الدین اورنگ زیب کا خط داؤد خاں کے نام! کیا یہ سچ ہے میرے سرتاج۔ کیا ابھی ہماری مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔ کیا ہم خود جان بوجھ کر دشمنوں کے نرغے میں آگئے ہیں۔

دارا: شاید جسم و جان کی نجات قریب ہے۔ ہم موت سے نہیں گھبراتے وہ تو وصال محبوب کا پیام ہے۔ مگر نئے ہندوستان کے میرے خواب ادھورے رہ جائیں گے۔ خواب مرنے نہیں دیتے نہیں تو میں اپنے کو محی الدین کے حوالے کر دیتا اور کہتا:

''لو اس تھکے ہارے جسم کو پھانسی پر لٹکا دو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔ میری روح اس سے بہت بلند ہے اس تک تمھارے ناپاک ہاتھوں کی رسائی نہیں۔''

نادرہ: ایسا نہ کہیے۔ فال بد زبان سے نہ نکالئے۔ یہاں سے کوچ کی تیاری کیجئے۔ داؤد خاں نمک حرام کے چنگل سے ــــــ

(اتنے میں داؤد خاں کی کرخت مگر باادب آواز سنائی دیتی ہے)

داؤد: شہزادہ بلند اقبال داؤد خاں شرف باریابی چاہتا ہے۔

(داؤد خاں اندر آتا ہے مگر اس کی تلوار اور لباس خون آلود ہے)

دارا: خوش آمدید۔ مگر اس طرح کیوں۔ یہ خون میں ڈوبی ہوئی تلوار تمھارے ہاتھ میں۔ جسم پر یہ خون میں لت پت پوشاک کیا ہوا تمھیں۔

داؤد: کچھ نہیں۔ یہ خون کے چھینٹے نہیں وفاداری کی مہریں ہیں۔ میں نے انھیں قتل کر ڈالا میں نے اپنے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالا صاحب عالم۔ ان ہی بیوی بچوں کی خاطر تو آپ میری وفاداری پر شک کرتے تھے آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں ان کی خاطر آپ سے نمک حرامی کروں گا اس شہزادے کو دغا دوں گا جس کے احسانات میرے ریشے ریشے میں سمائے ہوئے ہیں۔ میں نے سب کا خون کر دیا۔ سب کا خون کر دیا۔

دارا: داؤد خاں۔ یہ تم نے کیا کیا ایک بے آسرا شہزادے کے لیے خود بے آسرا ہو گئے — میرے جانثار دوست۔ تم نے یہ کیا کیا۔ ہم تمھارے بیوی بچوں کو کیا جواب دیں گے۔ جب وہ حشر کے دن ہمارے دامن گیر ہوں گے اور پوچھیں گے کہ ان کی زندگی ان کی مسرت اور ان کا بچپن ہم نے کیوں چھین لیا۔

داؤد: میری وفاداری پر بھروسہ کیجئے صاحب عالم۔ پنجاب میں قیام فرمایئے یہاں کا بچہ بچہ آپ کے لیے جان نچھاور کر دے گا۔

دارا: نہیں۔ اب ہمیں جانا ہی ہو گا۔

داؤد: خدارا ایسا نہ کہیے۔ فتح و نصرت آپ کے قدموں سے لگی ہوئی ہے۔ پنجاب آپ کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔

دارا: داؤد خاں۔ بادشاہ کو رحمت کا پیغام ہونا چاہیے۔ جب موت اس کی ہم رکاب ہو جب اس کا سایہ اس کے رفیقوں کے گھر بے چراغ کر دے تو اس کی شکست یقینی ہے۔

داؤد: میں جان دے دوں گا مگر صاحب عالم کو پنجاب نہ چھوڑنے دوں گا۔

دارا: ہمارے ضمیر پر تمھارے خاندان کے خون کا بار بہت ہے۔ داؤد یہ بہت بڑا بوجھ ہے۔

داؤد: تو اس غلام کو اجازت مرحمت فرمائیں کہ آپ کے قدموں سے لگا رہے۔

دارا: نہیں داؤد — دارا کو اگر ناکامی اور وفاداری کی موت مرنا ہے تو دوسروں کے لیے وہ تباہی کا پیغام کیوں بنے — ہمیں تنہا چھوڑ دو۔ یہ ہمارا حکم ہے۔

داؤد: تو خدارا مجھے بتائیے کہ صاحب عالم کے احسانات کا بدلہ کیسے ادا کروں۔ اگر مجھے ایک ہزار زندگیاں بھی ملتیں تو میں ہر بار آپ ہی کے قدموں پر نچھاور کرتا۔

دارا: جاؤ ہمیں تنہائی چاہیے —— خدا تمھاری مدد کرے میرے جانثار دوست — خدا حافظ۔

(پردہ)

چوتھا سین

(بلوچستان کا علاقہ — وہی خیمہ)

نادرہ: (کھانستے ہوئے) اب ہم کہاں ہیں۔

دارا: ہمارا قافلہ بلوچستان کے قریب آپہنچا ہے۔

نادرہ: داؤد خاں ٹھیک کہتا تھا میرے سرتاج۔ اگر ہم راتوں رات پنجاب سے نہ بھاگتے تو ان مصیبتوں میں نہ پھنستے۔

دارا: ملتان اور سندھ کے سفر کی مصیبتیں کاٹھیاواڑ اور اجمیر کے سفر کی صعوبتیں دیورائی کی فیصلہ کن لڑائی کی مصیبتیں — اب دارا کے لیے زندگی مصیبتوں کی ایک طویل داستان ہے۔

نادرہ: کتنا سفر اور باقی ہے۔

دارا: نادرہ۔ تمھاری طبیعت بہت خراب ہے۔ طبیب کہتا ہے سفر خطرناک ہے۔

نادرہ: میں اچھی ہوں مالک۔

دارا: ہر طرف اندھیرا ہے۔ ہر طرف مایوسی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ فرار کے راستے بھی بند ہیں۔ البتہ بلوچی سردار۔ میرزا آیا تھا وہ ہمیں قندھار تک حفاظت کے ساتھ پہنچانے کا وعدہ کرتا ہے۔

نادرہ: کیا اور کوئی راستہ نہیں ہے کیا ہندوستان چھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ مرنے کے بعد اسی ملک میں دفن کی جاؤں جس کی خاک کو ہم نے اپنے خون سے سینچا ہے۔

دارا: قندھار سے ہم کمک لے کر ہندوستان آئیں گے۔ ہم کامیاب ہوں گے مگر اس وقت تو

جانا ہی ہوگا۔

نادرہ: میرا دل ڈرتا ہے میرے مالک۔قبائلیوں کے ہاتھ میں اپنی عزت سونپنا نہیں چاہتی۔ اس اجنبی ملک کا کیا بھروسہ۔

دارا: ایک راستہ اور ہے۔ درہ بولن کے قریب دادر کے صوبے دار ملک جیون کو میں نے ایک بار ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جانے سے بچایا تھا۔اس کی جاں بخشی کے لیے ہی میں نے جہاں پناہ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ چلو دادر میں اس کی پناہ میں چلتے ہیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔

پانچواں سین

(وہی خیمہ —— کوہستان کا پس منظر)

نادرہ: دادر کتنی دور ہے مالک۔

دارا: بہت قریب ہے۔

نادرہ: میں دادر پہنچ سکوں گی۔

دارا: کیوں نہیں۔راستہ زیادہ دشوار نہیں۔

نادرہ: نہیں میرے سرتاج مجھے بہت دشوار لگتا۔

دارا: ایسا نہ کہو نادرہ۔دنیا میں دارا کا آسرا تم ہی ہو۔

نادرہ: مجھے دکھ ہے صاحب عالم۔آپ کو تنہا چھوڑ کر جا رہی ہوں۔مصیبتوں میں دشمنوں میں تنہا چھوڑ کر۔

دارا: نہیں نادرہ نہیں۔قدرت اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتی —— میرے خدا! بے آسرا اور بے خانماں دارا پر رحم —بار خدایا! ہمیں اور زیادہ آزمائش میں نہ ڈال۔

نادرہ: میری ایک آرزو ہے صاحب عالم!

دارا: کہو! دارا کی جان تیرے لفظ پر قربان ہو۔

نادرہ: میں اس شہر میں دفن کی جاؤں جہاں ملکہ نور جہاں دفن ہیں۔وہ اپنے شوہر کی چہیتی تھیں

اور مجھے آپ کا غیر فانی پیار ملا۔ میرے لیے یہی سب سے بڑی دولت ہے۔

دارا: میری البیلی ملکہ۔تو نے نادرہ۔ دارا سے مانگا بھی تو کیا مانگا مدفن کے لیے زمین۔تو نے آسمان کے تارے مانگے ہوتے تو دارا اپنی جان دے کر بھی انھیں کہکشاں سے توڑ کر تیرے قدموں پر نچھاور کرتا۔ چاند اور سورج مانگے ہوتے کہ پیار سے تیری آرتی اتارتے—تو نے اس تہی دست سے مانگی بھی تو قبر کے لیے زمین۔

نادرہ: (بیہوشی کے عالم میں) چاروں طرف اندھیرا ہے—ہر طرف اندھیرا ہے۔ مجھے معاف کرنا صاحب عالم مجھے معاف کرنا۔ (موت کی ہچکی)

دارا: نادرہ! نادرہ!! نادرہ!!!

چھٹا سین

(وہی خیمہ—وہی جگہ— صبح تڑکے)

قافلہ سالار: صاحب عالم! سپاہیوں کے لیے کیا حکم ہے۔

دارا: شہزادی صاحبہ کے جنازے کو لے کر گل محمد اور مقبول کو پنجاب بھیج دیا گیا؟

قافلہ سالار: حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔

دارا: خوب (کچھ سوچ کر) کوچ کی تیار کرو۔ درہ بولن کی طرف چلو۔ اسے پار کر کے ہم قندھار چلیں گے۔

ساتواں سین

(اسٹیج خالی ہے۔ قافلہ داخل ہوتا ہے۔ دارا سب سے آگے ہے دوسری سمت زرہ پوش ملک جیون داخل ہوتا ہے اس کے ساتھ زرہ پوش دو چار سپاہی اور بھی ہیں)

ملک جیون: ٹھہرو! یہ قافلہ آگے نہیں جائے گا۔

دارا: کون (ملک جیون نقاب الٹ دیتا ہے) ملک جیون! کیا چاہتے ہو۔

ملک جیون: اپنا انعام۔

دارا: اب دارا کے پاس کچھ نہیں ہے۔

ملک جیون: مگر شکست خوردہ دارا کو محی الدین کے حوالے کر کے ہی اب بھی بہت کچھ پا سکتا ہوں۔

دارا: ملک جیون! کیا انسان اتنا ذلیل بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس قدر احسان فراموش اور کمینہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا تو وہ دن بھول گیا جب دارا نے تجھے ہاتھی کے پاؤں تلے کچلے جانے سے بچالیا تھا۔

ملک جیون: وہ شہزادہ دارا تھا۔ یہ باغی دارا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ شہزادے یہاں جب بھائی بھائی کا خون پیتا ہے بیٹا باپ کا گلا کاٹتا ہے۔ ایسی دنیا میں احسان اور محسن کی کیا قیمت ہے۔

دارا: مجھے احسان اور محسن کی قیمت نہ بتا۔ غدار! تو کیا چاہتا ہے۔

ملک جیون: دہلی تک آپ کی ہم رکابی کا شرف۔

دارا: تو ہمیں حراست میں لینا چاہتا ہے۔

ملک جیون: سپاہیو! دیکھتے کیا ہو صاحب عالم کو حراست میں لے لو۔ شہزادہ سپہر شکوہ کے پیٹھ کے پیچھے باندھ دو۔

دارا: احسان فراموش ذلیل کتے! قسمت کے اس کھیل میں تو جلاد ہے اور ہم مظلوم۔ ہم نے تیری جان بچائی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں ہماری جان لے لے۔ مگر شہزادہ سپہر شکوہ نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ خبردار! کبھی کسی مغل شہزادے نے یہ ذلت برداشت نہیں کی۔

(سپاہی شہزاد سپہر شکوہ کو گھیر لیتے ہیں۔ دارا ان کی طرف جھپٹتا ہے مگر مجبور ہو جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

آٹھواں سین

(قلعہ کا ایک حصہ — اورنگ زیب کا ایوان — اورنگ زیب سوچ میں ٹہل رہا ہے)

روشن آرا: (ہنستی ہے) محی الدین بھیا بھی خوب ہیں۔ ہندستان کی بادشاہی دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اب بھی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بخدا اس سادگی کا بھی جواب نہیں۔

اورنگ زیب: ہمیں بڑا اہم فیصلہ کرنا ہے۔

روشن آرا: اے ہے۔ ذرا ہم بھی تو سنیں کون سا ایسا اہم فیصلہ ہے وہ۔ ذرا سی دیر میں ابھی ہوا جاتا ہے۔

اورنگ زیب: کل دارا کی تشہیر کی گئی۔ ایک بے حال اور بد رونق ہتنی پر بٹھا کر اس کو ذلت کے ساتھ بازاروں میں گھمایا گیا۔

روشن آرا: (ہنستی ہے) خوب ہوا۔ تو اس میں بھلا اس قدر سوچ کی کیا بات ہے۔

اورنگ زیب: جانتی ہو کیا ہوا۔ دارا سر جھکائے ہتنی پر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر اس کی ہتنی کے پاس آیا اور چلایا۔ دارا جب تو صاحب ثروت تھا تو ہمیشہ مجھے خیرات دیا کرتا تھا اب کس کے پاس جاؤں۔ آج تو تیرے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ دارا نے سر سے اپنا عمامہ اتار کر فقیر کی طرف پھینک دیا۔

روشن آرا: تو کیا ہوا۔ فقیروں ہی نے دارا کا دماغ خراب کیا ہے۔

اورنگ زیب: عوام میں دارا بہت مقبول ہے۔ آج صبح ملک جیون اور اس کے ساتھیوں پر دلی والوں نے حملہ کر دیا۔ وہ جس راستے سے گزرتے تھے لوگ ان پر گندگی اور کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے۔ اگر دارا کو قتل کر دیا گیا تو ڈر ہے کہیں عوام شورش نہ کریں اس کا قتل مصلحت کے خلاف ہے۔

روشن آرا: دشمن کو اپنے چنگل میں لا کر چھوڑ دینا کون سی مصلحت ہے۔

اورنگ زیب: عوام بغاوت کر دیں گے۔

روشن آرا: فوج انھیں کچل کر رکھ دے گی اور باغیوں کے سر قلعے کے کنگوروں پر لٹکا دیے جائیں گے۔

اورنگ زیب: میں بھائی کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔

روشن آرا: تو آپ بھی مذہب کے معاملات میں باپ اور بھائی کا امتیاز کرتے ہیں۔ انصاف اندھا ہوتا ہے بھائی جان۔

اورنگ زیب: تقرب خاں۔ دانشمند خاں اور جلیل اللہ خاں کے علاوہ سبھی امرائے سلطنت کا یہی مشورہ ہے کہ دارا کو گوالیار کے محفوظ قلعے میں قید رکھا جائے۔

روشن آرا: امرا سب بزدل اور بے وقوف ہیں۔ میں کہتی ہوں بھائی جان کیا آپ بھول گئے کہ دارا نے آپ کے خلاف کیا کیا سازشیں کی تھیں۔ بیجاپور میں کس طرح آپ کو لڑائی سے واپس بلایا تھا۔ کس طرح جاگیر اور دولت کے لیے ترسایا۔ کس طرح اپنا نیا محل دکھانے کے بہانے آپ کو ایسے کمرے میں قید کرنے کا منصوبہ بنایا جس کا صرف ایک دروازہ تھا۔ کس طرح ابّا جان کی بیماری کی خبر آپ سے چھپائی گئی اور اپنی تخت نشینی کا پورا پورا انتظام کیا گیا۔ کیا جاہل عوام کے جذبات کی خاطر آپ سلطنت دین اور انصاف کا خون کر دیں گے۔ آپ سانپ کو دودھ پلا پلا کر پالیں گے کہ وہ ایک دن تخت طاؤس کو ڈس لے۔ اگر آپ اور آپ کے امرا اس قدر بزدل ہیں تو میں کہتی ہوں تلوار مجھے دیجئے میں اس کا سر اتار لوں گی۔

اورنگ زیب: بس روشن آرا۔ بس۔ ہمارے قہر کو مت للکارو۔

روشن آرا: بھائی جان۔ مجھے دارا کا سر چاہیے۔ میں اسے ابّا جان اور ان کی چہیتی جہاں آرا کو تحفے میں بھیجوں گی۔

اورنگ زیب: ہم وعدہ کرتے ہیں روشن۔ مرتد کو قتل کیا جائے گا۔ کل اس کی لاش بازاروں میں ذلت کے ساتھ گھسیٹی جائے گی اور اس کا سر تیرے قدموں میں ڈال دیا جائے گا۔

(غصے میں تلوار سنبھالتا ہوا محل سے باہر چلا جاتا ہے۔ روشن خوشی اور غرور سے مست تھوڑی دیر اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے۔)

نواں سین

(قید خانے میں دارا کی کوٹھری)

دارا: (قید خانے کا دروازہ کھلتا ہے اور نذر خاں کو داخل ہوتا دیکھ کر) تم آ گئے نذر خاں۔ وہ گھڑی آ گئی آخر کار۔

نذر خاں: ہم لوگ تو صرف ظلِ سبحانی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

دارا: ظلِ سبحانی۔ کون ظلِ سبحانی!

نذر خاں: محی الدین اورنگ زیب عالم گیر فرماں روائے ہندوستان۔

دارا: تم تخت و تاج کے اندھے پجاری کو ظل سبحانی کہتے ہو۔

نذر خاں: ظل سبحانی کا پیغام ہے اگر آپ اپنے ملحدانہ خیالات سے توبہ کرلیں تو خدا اب بھی بڑا غفار ہے۔

دارا: اس سے کہنا دارا بیوپاری نہیں ہے۔ وہ خوابوں کے لیے مرسکتا ہے خوابوں کی تجارت نہیں کرتا۔ اگر ساری انسانیت کو پیار کرنا کفر ہے تو ہم کافر ہیں۔ میرے نادان بھائی سے پوچھنا کہ انسانیت کو پیار کرنا کفر ہے۔ تخت و تاج کے لیے باپ بھائی کو قتل کرنا کفر نہیں ہے۔ اس سے کہنا یہ بھی خدا ہی کا کرشمہ ہے ہم میں سے ایک کو جلاّد کا روپ ملا ہے دوسرے کو شہید کا۔ ایک قاتل بنا ہے دوسرے کو سر نذر کرنے کا حکم ہوا ہے۔ ہم محبوب حقیقی کے اشارے پر سر نذر کرنے کو تیار ہیں۔ اس کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ صحیح راستے پر کون تھا۔ کون ہندوستان کا محسن تھا اور کون غدار۔

نذر خاں: تو آپ تائب ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

دارا: ہم۔

نذر خاں: آپ ظل سبحانی محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

دارا: ہمیں وحدہٗ لاشریک کے سوا اور کسی کی اطاعت قبول نہیں۔

نذر خاں: تو مجھے مجبوراً احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ مجھے مجبوراً انصاف کا ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوگا۔

دارا: اس بزدل حکمراں سے کہو کہ ہمارے ہاتھ میں تلوار دے کر خود مقابلہ کرے۔ کیا انصاف یہی ہے کہ ایک نہتے مغل شہزادے پر قید خانے میں تم سب ٹوٹ پڑو۔ کیا یہی انصاف ہے کہ ابّا حضور کے جیتے جی ملک گیری کے خواب دیکھنا اپنے شفیق باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا انصاف ہے کیا بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنا انصاف ہے۔

نذر خاں: شہزادے انصاف کا فیصلہ تلوار کیا کرتی ہے۔

دارا: تو پھر کیوں ڈرتے ہو۔ دارا کا سر کاٹ لو۔ مگر کیا تم ہمارے خیالات کا سر بھی قلم کرسکو گے۔

ہماری روح کو بھی قتل کر سکو گے۔ ہمارے ساتھ ہمارے تصورات کو دفن کر سکو گے۔ دنیا کے سارے شہنشاہ مل کر بھی ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ہمارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اللہ تعالی نے ایسے عظیم خیالات کے لیے جان دینے کی سعادت بخشی ہے۔

نذر خاں: سپاہیو! تلواریں نکالو۔

دارا: تلوار کھینچتا ہے۔ ذلیل کتے ٹھہر (چاقو نکالتا ہے) ہمارے اس چاقو کی ضرب سنبھال تا کہ تاریخ میں یہ نہ لکھا جائے کہ مغل شہزادے بزدل تھے۔ جو مقابلے کے بغیر ہتھیار ڈال دیتے تھے ہم مقابلہ کریں گے۔

(نذر خاں کی تلوار سے دارا شکوہ گھائل ہو کر گرتا ہے۔)

آہ خداوندا! تیرا شکر ہے۔ تو نے اس حقیر بندے کو شہادت کا خلعت بخشا۔ سپہر شکوہ کو اور اپنے ملک ہندوستان کو تیری پناہ میں چھوڑتا ہوں۔ خدایا ہمارے خیالوں کی مہک سارے ہندوستان میں پھیلانا۔۔۔ خدایا!!

☆☆☆
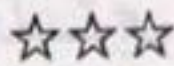
کچلا ہوا پھول

پہلا سین

(زوردار بارش)

ایک: لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

دوسرا: اللہ بس باقی ہوس۔ قبر تیار ہے۔ صاحبو مٹی دیجئے اور مرحوم کے لئے فاتحہ (سسکیوں کی آواز)

چچا: نہ روؤ بھائی، صبر سے کام لو، مرحوم کی روح کو تکلیف ہوگی، اب ان کے لیے دعائے مغفرت کرو، یہی سب کا آخری انجام ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

(بجلی کی کڑک جملے کو کاٹ دیتی ہے)

ایک: بس تو یہاں قریب کہیں سے ملتی ہوگی۔

دوسرا: بارش ہے کہ آج تھمنے کا نام نہیں لیتی۔

تیسرا: قبر کی مٹی برابر کردو بھائی اور یہ ہار پھول سرہانے سجادو۔

چوتھا: آؤ اس چھتری کے نیچے آجاؤ۔ بس اسٹینڈ تک چلے چلتے ہیں۔

(بجلی کی کڑک جملے کو کاٹ دیتی ہے)

پہلا: اللہ بس باقی ہوس۔ اللہ باقی من کل فانی۔

دوسرا: بس یہیں قریب سے ملتی ہے۔ یہ سامنے سڑک چل رہی ہے۔ جس پر وہ سائیکل سوار چھتری لگائے گاتا چلا جارہا ہے۔

(گانے کی آواز) یہ زندگی کے میلے۔ یہ زندگی کے میلے اور...... افسوس ہم نہ ہوں گے۔

چچا: چلو بھائی چلیں۔

بھائی جان: شبو بھائی کو تیری گود میں سونپ چلا ہوں۔ مٹی کی چادر تجھے میں نے اپنا سب سے بڑا ساتھی سونپا ہے۔

شبو بھائی۔ الوداع شبو بھائی (رونے لگتا ہے)

چچا: چلو۔ عزیز من اب چلو۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ سب چلے گئے۔

(بارش اور بڑھ جاتی ہے اور بجلی کڑک کر یکبارگی خاموش ہو جاتی ہے)

آواز: تو آخر تم آ ہی گئے۔

شبو: کون ہو تم؟

وہی آواز: (ہلکی سی ہنسی) مجھے نہیں پہچانتے۔ ہاں میں بھول گئی ابھی تو تمھارا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہے۔ ابھی تو تم جاتی دنیا کے غلام ہو۔

شبو: غلام، میں؟

وہی: ہاں ابھی تو جسم کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہو۔ جس میں تمھاری دنیا حسن اور بدصورتی کے جلوے دیکھتی ہے۔ جس میں تم کمزور اور مضبوط، اعلیٰ اور ادنیٰ، مرد اور عورت، گورے اور کالے کا بٹوارہ کرتے ہو۔

(ہلکی سی ہنسی) مگر اب آزادی میں بس تھوڑی ہی دیر اور ہے۔

شبو: آزادی! کیسی آزادی؟

آواز: تمھارا بے داغ کفن زمین کے لاکھوں کروڑوں انجانے مہمان چاٹ ڈالیں گے پھر وہ آئیں گے جنھیں تم نے کبھی مہمان نہیں بنایا وہ کیڑے مکوڑے، سانپ، بچھو، کاکروچ، سنپولئے یہ سب کب سے تمھارے جسم کے بھوکے ہیں۔

شبو: تم کیسی ڈراؤنی باتیں کرتی ہو؟

آواز: (پھر ہلکی سی ہنسی) یہی تو کہتی ہوں ابھی ڈرتے ہو، سارے جسم ڈرتے ہیں۔ ان پر گوشت نہیں خوف کا آماس ہے۔

شبو: تم نہیں ڈرتیں؟

آواز: کبھی ڈرتی تھی جب میرے ہونٹ جن پر شاعروں نے نظمیں لکھیں۔ چیونٹیوں کی

خوراک بن گئے۔ جب میری سیاہ زلفیں جن کو کالی ناگن کہا گیا تھا مٹی میں مل کر راکھ ہو گئیں۔ میرے رخسار جن پر چاندنی ناچا کرتی تھی کیڑوں کی نذر ہو گئے۔ میرا گداز سینہ، میری نرم اور شفاف رانیں کا کروچ اور جھینگر کھا گئے اور دھیرے دھیرے میں جسم اور ڈر سے آزاد ہو گئی۔

شبو: تم کون ہو؟

آواز: میں صرف چند بچی کچی ہڈیاں اور ایک آواز، گھبراؤ نہیں۔ موت بڑی مسیحا ہے تھوڑی دیر میں تم بھی آزاد اور بے خوف ہو جاؤ گے۔ پھر تمھیں سانپ بچھو بھی ڈرا نہیں پائیں گے موت آزادی دیتی ہے۔

شبو: آزادی اور موت؟

آواز: ہاں موت آزادی دیتی ہے۔ ہر قید اور بند سے آزادی۔ جب تمھاری آنکھیں مٹی میں مل چکی ہوں گی۔ تم دیکھو گے کہ انسانی جسم کیا تھا جس سے چند لمحے کی لذت لینے کو تم نے جرم قرار دے رکھا تھا اور اس کے اصول مقرر کر رکھے تھے وہ فرق کیا تھا جو تم نے عورت اور مرد کے درمیان قائم کر رکھا تھا کیا ہم تم برابر نہیں ہیں۔

شبو: ہم تم!! کون ہم تم؟

آواز: تم مرد اور میں عورت۔ کیا دونوں برابر نہیں ہیں؟

شبو: اس لمحے سب برابر ہیں۔ سب مٹی کے کھلونے مٹی میں۔

آواز: بارش زور دار ہو رہی ہے۔ کیڑے جلد ہی نکل کر تمھیں کھا جائیں گے پھر میری ہڈیاں تمھاری ہڈیاں بھی نکال لے جائے یا کوئی بھوکا کتا اسے سڑک کے کنارے لے جا کر بھنبھوڑنے لگے۔

شبو: چپ ہو جاؤ، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔

آواز: خاموشی کس کس کی سچائی چھپا سکے گی۔ قبرستان والی سڑک کے کنارے بارش میں بھیگے جسم اب ملنا چاہ رہے ہیں۔ ایک لمحے کی لذت کی خاطر۔ اور دیکھتے ہو آج بھی وہ لڑکی کن کن خطروں کو دل میں لیے سمٹی جا رہی ہے لذت سے دور بھاگتی جا رہی ہے۔ شاید

اس لیے کہ وہ اس لڑکے کے ساتھ گھر نہ بسا سکے گی شادی، عصمت، خاندان۔ یہ سب جسم سے آزاد ہونے کے بعد کیسی عجیب سی چیزیں لگتی ہیں (ہنسی۔ طنز سے بھرپور ہنسی)

(بارش کا شور، بجلی کی کڑک)

شبو: موت کتنی عجیب ہے۔

آواز: یوں ہی کہہ لو۔ مگر زندگی عجیب تر ہے۔ وہ دن تمھیں یاد ہے۔ جب میں بمبئی سے تعلیم پوری کر کے گھر لوٹی تھی۔

دوسرا سین

شبو: مارویلیس۔ ونڈرفل۔ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ گھر کو اللہ ایسا سجایا ہے کہ بالکل اشوکا ہوٹل معلوم پڑ رہا ہے۔

بھابھی: آؤ شبو۔

شبو: آ رہا ہوں بھابی۔ آسمان سے زمین پر آ رہا ہوں۔ مگر یہ تو بتایئے کہ آپ کی جان کی قسم یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا۔ قصہ کیا ہے۔ کیا کسی فلم کی شوٹنگ کا پروگرام ہے۔

بھابھی: ہماری ساس کو جانتے ہو تم۔ ان کے آگے کسی کی چلتی ہے بھلا۔

شبو: پھر وہی کراس ورڈ پزل میں گفتگو شروع کر دی۔ اگر اتنا بھیجا اپنے پاس ہوتا تو کروڑ پتی ہوتے، چار چھ کاریں زوں سے دائیں طرف سے نکلتیں۔ آٹھ دس بائیں طرف سے، یا اس وقت یہ بندۂ ناچیز چاند کی سطح پر چاند بگھی میں بیٹھا حوروں کو رجھا رہا ہوتا۔ سیدھی سادی اردو زبان میں بتایئے۔ واقعہ کیا ہے؟

بھابھی: ہماری ساس کے ایک اکلوتی بیٹی ہے ناہید۔

شبو: ہے۔

بھابھی: وہ پڑھ لکھ کر ایم۔ اے پاس ہو کر بمبئی سے لوٹ رہی ہے۔

شبو: لوٹ رہی ہے تو پھر۔

بھابھی: تو پھر اس کا استقبال۔

شبو: واللہ اتنی سی بات جسے افسانہ کر دیا۔

بھابھی: نہیں شبو! افسانہ نہیں بالکل حقیقت ہے۔

شبو: آداب! اماں حضور۔

بیگم: جیتے رہو بیٹے۔ میں نے تمھیں اسی لیے بلایا تھا۔ ناہید کا ہاتھ بچپن ہی میں ہم تمھارے ہاتھ میں دے چکے ہیں۔ آج ہم چاہتے ہیں کہ منگنی کی رسم بھی ادا ہو جائے۔

شبو: کمال کر دیا اماں حضور آپ نے ایسا (شہنائی کی آواز پس منظر سے ابھرتی ہے۔ S.O.S طریقے پر بلایا کہ میں سمجھا مرمت نہ سہی گوشمالی تو ضرور ہوگی اور یہ معاملہ نکلا منگنی کا۔

چچا: جی ہاں برخوردار یہ بھی گوشمالی کی ایک نئی قسم ہے۔

شبو: آداب چچا جان! آپ کی منگنی نہیں ہوئی تو آپ نے اسے گوشمالی قرار دے دیا ہے معاف کیجئے گا یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا، سمجھے چچا جان صاحب۔

چچا: خوب سمجھا۔ مگر سنو شبو۔ جس کے پاس آنے والی نسلوں کے لیے اولاد کے سوا اور کچھ دینے کو نہ ہو اس کے لئے یہی منگنی بیاہ کا مشغلہ ٹھیک ہے۔

شبو: آپ ٹھہرے آرٹسٹ۔ آپ کے پاس تو دنیا کو دینے کے لیے فن اور بصیرت کا خزانہ تھا خزانہ۔ لہٰذا آپ نے شادی نہیں کی ہے نا یہی بات! اب تو ہو جایئے قائل۔ قسم خدا کی چہرہ پڑھ کر پورے Dialogue منہ زبانی سنا دیئے۔

چچا: عورت، شادی، خاندان، بچے۔ دوسروں کے لیے یہ زندگی ہے۔ میرے لیے یہ رنگ ہیں جن سے میں زندگی کی تصویر بناتا ہوں۔ انسان ان جھمیلوں کے لیے نہیں یہ کھلونے البتہ انسان کے لیے ہیں۔ ان سے کبھی کبھی تسکین پائے اور ان کے ذریعے اپنی پوری طاقت کو ظاہر کر دے۔ ان سے کھیلے ان کا کھیل نہ بنے۔

بھابھی: اے ہے شبو میاں، تم کہاں الجھ پڑے۔ گاڑی آنے کا وقت ہو رہا جاؤ اپنی پھول دار شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہن آؤ۔ دلہن کا ٹھاٹھ دار استقبال ہونا چاہیے۔ برات کے ہونے والے دولہا تو تمھیں ہو۔

شبو: بھابھی! واللہ آپ تو شرمندہ کرتی ہیں۔ اپن تو یوں ہی اتنا جچ رہے ہیں پھولدار شیروانی

پہن لی تو پوری عورت جاتی غش کھا کر گر پڑے گی۔

(گھنٹہ چار بجاتا ہے)

بیگم: برجیس دلہن۔

بھابی: جی اماں حضور۔

بیگم: ذرا اسٹیشن ٹیلی فون کرو۔ یہ لوگ ابھی تک نہیں آئے، گاڑی لیٹ ہے کیا؟

بھائی جان: گاڑی لیٹ نہیں تھی امی جان۔

بیگم: تمھیں ناہید کو لینے اسٹیشن بھیجا تھا۔

بھائی جان: وہ نہیں آئی۔

بیگم: یہ ناممکن ہے ایسا ہو نہیں سکتا۔

بھائی جان: امی جان! پوری گاڑی چھان ماری، ایک ایک ڈبہ کو دس دس بار دیکھا اس کا کہیں پتہ نشان نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے دوسری گاڑی سے۔

بیگم: نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری بچی سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے گھر میں کوئی بے قاعدہ بات نہیں ہو سکتی۔

شبو: واللہ اماں حضور۔ آپ خواہ مخواہ۔

بیگم: (بات کاٹ کر) شبو!

شبو: میرا مطلب ہے سب ٹھیک ہو جائے گا دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔

بھابھی: میں کہتی ہوں تم نے ٹھیک سے دیکھا بھی تھا۔ (Aside) اماں حضور کو تو جانتے ہو وہ زمین آسمان ایک کر ڈالیں گی۔

بھائی جان: میرا اعتبار کرو۔ میں نے انھیں دو آنکھوں سے ایک ایک ڈبہ دیکھ ڈالا جن سے تمھیں دیکھ رہا ہوں جان من۔

بھابھی: چلو ہٹو۔ تمھیں ہر وقت چونچلے سوجھتے ہیں۔

(موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ سنائی دیتی ہے)

چچا: ناہید۔

بیگم: کہاں؟

(موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ اور قریب آجاتی ہے)

چچا: موٹر سائیکل پر اس اجنبی کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے؟

ناہید: ہیلو۔ اویری باڈی (Everybody) امی حضور آپ نے اسٹیشن پر کسی کو نہیں بھیجا۔ اوہو گھر کو ایسا سجایا ہوا ہے کہ بس! بھائی جان، بھابی، اوہ چچا جان (سب سے ملتی ہے) امی حضور۔

بیگم: (کوئی جواب نہیں دیتی)

ناہید: اوہ میں بھول گئی یہ ہیں میرے دوست۔ ملک کے مشہور باکسنگ چمپئن ملک۔ دراصل بارش بہت زور کی ہو رہی تھی۔ ٹیکسی والے نخرے کھا رہے تھے۔ مسٹر ملک نے مجھے لفٹ (Lift) دے دیا میں انھیں کی موٹر سائیکل پر چلی آئی۔

شبو: ارے بھئی بہت اچھا ہوا تم نے بتا دیا ورنہ ہمیں تو ان کی موٹر سائیکل پر چاند گاڑی کا شبہ ہونے لگا تھا۔

ناہید: شبو ڈیر۔ تم!

شبو: جی ہاں یہ خاکسار بالکل فلمی ہیرو کے روپ میں! شیروانی پھول دار۔ پاجامہ چست، ٹوپی اصلی نکے دار۔

بیگم: ناہید تمھارے کپڑے بھیگ گئے ہیں اندر آجاؤ۔ اور سب لوگ بھی دیوان خانے میں چل کر بیٹھیں۔

ناہید: اس برآمدے میں بھی تو کتنا اچھا لگ رہا ہے امی حضور! بارش کے ہلکے ہلکے چھینٹے۔

ملک: اچھا اجازت دیجیے۔

شبو: اتنی جلدی۔

ملک: جلدی ہے۔

شبو: واللہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ امید ہے آئندہ بھی ملاقات ہوگی مگر باکسنگ (Boxing) والے دستانوں کے بغیر۔ بات یہ ہے کہ ملک صاحب کہ مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور باکسنگ سے میری جان جاتی ہے۔

ملک: مردوں کا کھیل ہے۔

شبو: او کے باس او کے۔

ملک: او۔ کے۔ (موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتا ہے اور چلا جاتا ہے)

بیگم: آپ لوگ اس طرح کب تک کھڑے رہیں گے۔

شبو: (تالیاں بجا کر) تخلیہ، تخلیہ، تخلیہ۔

بیگم: ہم نے تمھیں اپنا خون پسینہ ایک کرے پروان چڑھایا ہے۔ راتوں کی نیند اور دن کا آرام نہیں جانا۔ ہم جان دے سکتے ہیں۔ آبرو سے نہیں کھیل سکتے۔ تم اتنے بڑے خاندان کی چشم و چراغ ہو۔ تم اس گھرانے کی آبرو ہو۔ زندگی بھر کے ہمارے خواب تمھاری امانت ہیں اور تم ان سے کھلونوں کی طرح کھیلنا چاہتی ہو۔ نادان لڑکی۔ ہم اس کھیل کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔

ناہید: (خاموش رہتی ہے)

بیگم: ہم جاننا چاہتے ہیں (خاموشی) بولو۔

ناہید: مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

بیگم: یہ ناممکن ہے۔ تم خاموش رہ کر ہمارا مذاق اڑانا چاہتی ہو۔

ناہید: نہیں۔

بیگم: ہم نے بڑے ارمانوں سے تمھاری واپسی کا انتظار کیا۔ اس گھر کے ایک ایک کونے کو سجایا۔ آج ہماری زندگی کا سب سے بڑا خواب پورا ہونے والا تھا۔ ہم اپنے سارے قول و قرار پورے کرنے والے تھے۔ شبو کو ہم تمھارا ہاتھ سونپ چکے ہیں آج اس سے تمھاری منگنی اور پھر شادی۔

ناہید: مجھے منظور نہیں۔ امی حضور!

بیگم: گستاخ، بدتمیز۔

ناہید: مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔

بیگم: تمھیں کہنا ہوگا۔ بہت کچھ کہنا ہوگا۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تمھارے فیصلے کس طرح کیے

گئے ہیں۔ ہمیں یہ جاننے کا پورا پورا حق ہے۔

ناہید: ممی ویری ساری (Very sorry) ممی ڈیر۔ خاموشی میرا بھی حق ہے کم سے کم یہ حق تو مجھے ملنا ہی چاہیے۔

تیسرا سین

بھابی: اے ہے باجی اماں کو خواہ مخواہ ضد ہوگئی ہے۔ آخر کون سی عمر نکلی جا رہی ہے، بچہ ہی تو ہے۔ اس وقت چپ کھینچ جائیں کچھ دنوں میں اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گی وہ تو ہاتھ دھو کر لڑکی کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔

بھائی جان: اماں حضور کی بات اس گھر میں کسی نے ٹالی ہے کبھی۔

بھابی: مگر اب زمانہ اور ہے میرے سرتاج۔

بھائی جان: کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ میرا دماغ تو کچھ کام نہیں کرتا۔ اچھا لاؤ ایک پیالی گرم گرم چائے تو ادھر بڑھاؤ۔

بھابی: میری تو جیسے بھوک پیاس اڑ گئی ہے۔

بھائی جان: فکر کرنے سے کیا ہوگا۔ چائے آج اچھی بنائی ہے تم نے۔

بھابی: تم باجی اماں کو نہیں سمجھاتے۔ ضد دلا کر وہ لڑکی کو ہاتھ سے گنوا دیں گی۔

بھائی جان: نا بابا۔ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے تو آج بھی ان سے ڈر لگتا ہے۔

بھابی: لڑکپن میں کون شادی سے انکار نہیں کرتا۔ تم نے جلدی ہامی بھر لی ہوگی تو میں نہیں جانتی۔ پہلے پہل سبھی دون کی لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک راستے پر آ جاتے ہیں۔

بھائی جان: میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ لڑکیوں کا زیادہ پڑھنا لکھنا اچھا نہیں اب اس معاملے میں سوائے چچا جان کے اور کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔

چوتھا سین

چچا: اس طرح چپکے سے الٹے پیر مت لوٹ جاؤ۔ تصویر بناتے وقت میری آنکھیں پیچھے بھی

دیکھ سکتی ہیں۔ خاموش کیوں کھڑی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔

ناہید: پھر تو کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔

چچا: خاموشی سے زیادہ کوئی آواز نہیں گونجتی۔ میری اس تصویر کو دیکھا تم نے۔ اس کا عنوان ہوگا ''خاموشی'' کیا خیال ہے؟

ناہید: (کچھ جواب نہیں دیتی)

چچا: چلو یہ خیال بھی خاموشی سے ادا ہو گیا۔

ناہید: چچا جان۔

چچا: بیٹا۔

ناہید: میں سمجھتی تھی آپ کے سوا اس گھر کو اور کوئی میری بات نہ سمجھ پائے گا۔ آپ نے شادی نہیں کی۔ اپنا الگ کنبہ، الگ خاندان نہیں بنایا۔

چچا: درست۔

ناہید: ان دوستوں میں عورتیں بھی ہیں جو آپ کی محبوبائیں نہیں۔ صرف دوست ہیں۔

چچا: درست۔

ناہید: تاکہ آپ فرد کی طرح آزادی کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔

چچا: ہیں۔

ناہید: زہرہ جان ہیں۔

چچا: تاکہ میری زندگی ویران نہ رہ جائے۔ بیٹا! زندگی کی بڑی سچائیوں کے لیے چھوٹی آسودگیوں کی قربانی ضروری ہے۔

چچا: کیا کہنا چاہتی ہو؟

ناہید: فرض کیجئے میں بھی ایک فرد کی طرح اپنی زندگی جینا چاہوں۔ فرض کر لیجئے میرے پاس بھی آنے والی نسلوں کو دینے کے لیے بصیرت اور نشاط کا کوئی خزانہ ہو، فرض کر لیجئے۔

چچا: (غصے سے چیخ کر) یہ ناممکن ہے، تم عورت ہو۔

ناہید: عورت ہوں کیا اسی لیے میں انسان نہیں ہوں۔ کیا اسی لیے میری زندگی مردوں کے

لیے ہے کہ وہ مجھے گڑیا کی طرح سجائیں بنائیں۔ زیور کا نام دے کر میرے ہاتھ پاؤں میں کڑے اور زنجیریں چوڑیاں اور پائل پہنائیں۔ اپنی ہوس کی خاطر میرے چہرے پر پاؤڈر، میرے ہونٹوں پر لپ اسٹک تھوپیں۔ میرے نیم عریاں جسم کی نمائش کر کے اپنی حیوانی خواہشات کو بھڑکائیں۔ میں صرف ان کی خواب گاہوں کی زینت، ان کے بچوں کی ماں بن کر زندہ رہوں۔ کیا میری اپنی کوئی زندگی نہیں ہو سکتی۔

چچا: نہیں۔ میری بیٹی نہیں۔

ناہید: آخر کیوں نہیں؟ کیا میں انسان کی طرح اپنی خاطر اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتی۔

چچا: میں مرد تھا۔ سماج سے ٹکرانا میرے لیے ممکن تھا۔ تم عورت ہو کچل جاؤ گی۔

ناہید: جانتی ہوں۔

چچا: تم خاندان کی آبرو ہو۔

ناہید: مرد کے لیے جنس کے معنی لذت اور عورت کے جنس کے معنی اولاد کیوں؟ چچا جان! آپ ایک کلی کا رس لے کر دوسری کلی پر منڈلانے لگیں اور عورت اس ایک لمحے کی قیمت اولاد کو پالنے پوسنے میں صرف کر کے ادا کرے۔ آج تو کم سے کم عورت کے لیے جنس کو محض لذت بننے دیجئے۔ صدیوں سے وہ صرف اولاد پیدا کرنے کی مشین ہے۔

چچا: اسی لیے ماں کا رتبہ سب سے بلند ہے۔

ناہید: اور اس بلندی کو ہم نے کس قیمت پر خریدا ہے۔ کیا عورت شیکسپیئر، تان سین اور اقبال نہیں بن سکتی تھی اور یہ سارے جوہر خاندان کی چکی نے پیس ڈالے کیونکہ مرد کو صرف جائیداد کا وارث درکار تھا۔

چچا: زندگی بہت سفاک ہے۔ بیٹی اور ناکامی کی سزا موت ہے۔

شبو: قسم خدا کی چچا جان۔ وہ ڈائیلاگ بولے ہیں آپ نے کہ معلوم ہوا کہ اب انار کلی کو زندہ دیواروں میں چُنن دیا جائے گا۔ بخدا آپ تو سچ مچ مغل اعظم ہیں مغل اعظم۔

چچا: (ہنستا ہے) شبو میاں آؤ آؤ۔

شبو: اور ناہید تو سچ مچ انار کلی کی طرح سیریس ہے۔ ارے بھئی اب ریہرسل ختم زندگی شروع۔ آیا خیال شریف میں۔

ناہید: تم کب آگئے شبو؟

شبو: لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ کب جا رہے ہو۔ چچا جان! ذرا معاف کیجئے گا قصہ یہ ہے کہ میں اور ناہید ذرا باہر جا رہے ہیں ذرا۔

چچا: جاؤ، باہر گھوم آؤ۔

ناہید: میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔

شبو: اس مسئلے پر غور کریں گے۔ ذرا اپنے کمرے کی طرف تو چلو۔

پانچواں سین

شبو: بھئی واللہ حد ہوگئی کیا شاندار ستار اڑا لائی ہو (ستار چھیڑتا ہے) یہ آخر سلسلہ کیا ہے۔ تمھارا کمرہ تو پرستان ہو گیا ہے۔ پرستان، آرائش، محفل ایسی کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی Costume Play کا سیٹ ہے۔ ستار کی موسیقی ایسی جیسے خواب میں دور کہیں پھوار پڑ رہی ہو اور تمھارا اداس حسن ایسا جیسے میر کا شعر۔

ناہید: تم سمجھتے ہو گے شبو مجھے تم سے نفرت ہے۔

شبو: بھئی ہم تو سچ مچ کے شہزادہ گل فام ہیں ہم سے نفرت کیسے ہو سکتی ہے، کسی کو ہیرو جو ٹھہرے ہیرو۔

ناہید: تھوڑی دیر کے لیے Serious ہو جاؤ نا۔

شبو: غضب ہے۔ یہ اداکاری! واللہ غضب ہے۔

ناہید: Please

شبو: جلتی ہوئی شمع کے پاس جا کر کہو "ڈارلنگ۔" میرا کہنا مان لے۔ در چار پل کے لیے جلنا چھوڑ دے Please فرسٹ کلاس Idea ہے نا۔ میں نہ ہنسوں گا تو مر جاؤں گا ڈارلنگ بالکل Dead ایک دم Dead And gone۔

ناہید: تمھاری آنکھوں میں آنسو۔

شبو: گلیسرین کے ہیں۔ بالکل نقلی خدا کی قسم مزا تو بڑا آیا شہزادہ گل فام پھول دار شیروانی ڈالے، بے داغ چوڑی دار پاجامہ پہنے، نکے دار ٹوپی لگائے کھڑے ہیں۔ اور زن سے آئی ہیروئن۔ ٹوپی غائب، شیروانی کے پھول بوٹے ندارد اور چوڑی دار کی چوڑی خلاص، ہیرو اور ہیروئن دونوں ایک پل میں دو بچے بن گئے۔ See کے تختے پر بیٹھے ہیں کبھی ایک آسمان پر دوسرا زمین پر۔ کبھی ایک زمین پر تو دوسرا آسمان پر۔ بڑا مزہ آرہا ہے اپنی قسم۔

ناہید: بہت ظالم ہو تم۔ کبھی اپنے سے بھی سچ نہیں بولتے۔

شبو: آداب عرض ہے کیا تخلص عطا ہوا ہے۔ جناب شبو خاں ظالم۔

ناہید: (ہنس پڑتی ہے)

شبو: اب ہوئی نا بات بھئی۔ یہ نوحے مرثیے والا معاملہ ہمیں پسند نہیں، ہمارے لیے تو موت کو بھی مسکراتے ہوئے آنا پڑے گا۔ ورنہ ہم اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیں گے۔

ناہید: سنو شبو۔ مجھے تم سے محبت ہے بے پناہ۔

شبو: سچ Great Nows

ناہید: ہاں بے پناہ محبت ہے شبو۔ اس دنیا میں اگر میں نے کسی کو چاہا تو تمھیں، شاید آئندہ پوری زندگی میں بھی تمھارے سوا اور کسی کو نہ چاہوں گی۔

شبو: آخر میرا قصور۔ میری سرکار!

ناہید: لیکن میں نے تمھیں دوست اور محبوب بنایا ہے۔ اپنا شوہر، اپنا آقا نہ بنا سکوں گی۔

شبو: تو پھر آخر وہ بدنصیب کون ہوگا؟

ناہید: کوئی نہیں۔

شبو: تو کھیل بغیر ہیرو کے جاری رہے گا۔ اب ہوئی نا بات۔

ناہید: جنس میرے لیے ایک لمحہ ہوگی پوری زندگی نہیں۔ یہ خاندان کے بندھن یہ اولاد پیدا کرنے کے کارخانے اور یہ انسانی صلاحیتوں کی بربادی۔ مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔

شبو: میں دیکھ لوں گا۔ میری نظر بہت تیز ہے یار۔

ناہید: تم سمجھتے کیوں نہیں۔

شبو: پہلے آدمی ٹیلی فون کے تاروں پر باتیں کیا کرتے تھے اب وائرلیس کا زمانہ ہے۔ اب تاروں کی ضرورت نہیں لفظوں اور آوازوں کی بھی نہیں۔ ہم تم ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں کہ سب لفظ بے کار ہو گئے۔ ایک بات کہوں۔

ناہید: کہو۔

شبو: ارمان تو یہ بھی تھا کہ ناہید ڈیر۔ کہ اپنا ایک چھوٹا سا ماڈل چھوڑ جاتے۔ دنیا بھی کیا یاد کرتی کہ جناب شبو خاں ظالم بھی اپنے زمانے میں تھے ایک چیز۔ مگر یہ بھی کچھ بُر Ideal نہیں ہے کہ رہتی دنیا تک ہماری کوئی مثال ہی پیدا نہ ہو۔ بے نظیر بے مثال۔ چلو یار اچھے رہے ہم تم۔

ناہید: (رندھی ہوئی آواز میں) شبو۔ تم بڑے ظالم ہو۔ اپنے اوپر بھی ظلم کرنے سے باز نہیں رہتے۔

شبو: آنسوؤں کی نہیں ٹھہری ہے دوست! لاؤ ملاؤ پلاؤ والا ہاتھ لو اب ہنس دو۔

چھٹا سین

بھائی جان: مجھے افسوس ہے ناہید مگر میں مجبور ہوں۔

ناہید: بھائی جان آپ ——؟

بھائی جان: ہاں مجھے آنا ہی پڑا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اماں حضور کی بات رہ جائے۔

ناہید: نہیں۔

بھائی جان: تم انھیں جانتی ہو۔ وہ حکم عدولی برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس گھر میں ہمیشہ ان کا کہنا چلا ہے۔

ناہید: مجھے معلوم ہے۔

بھائی جان: میری اکلوتی بہن! تجھے کیا یہ بھی معلوم ہے کہ تیرا بھائی تجھے کتنا چاہتا ہے۔

ناہید: بھائی جان۔

بھائی جان: ہاں۔ ناہید میں تجھے اپنے پیار کا واسطہ دیتا ہوں اماں حضور کی بات مان لے۔

ناہید: مجھے قسمیں نہ دیجئے بھائی جان۔ میرے قدم پیچھے نہ ہٹ سکیں گے۔

بھائی جان: کیا ایسی کوئی صورت نہیں؟

ناہید: نہیں۔ کوئی صورت نہیں۔

بھائی جان: اماں حضور کا حکم ہے۔

ناہید: میں ہر ایک حکم کے لیے تیار ہوں۔

بھائی جان: حکم ہے کہ آج اور ابھی یہاں سے چلی جاؤ اور پھر (آواز رندھ جاتی ہے) پھر کبھی واپس نہ آنا۔ سن لیا ہے۔ تم نے۔

ناہید: سن لیا ہے۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔

ساتواں سین

(دروازے پر دستک)

ناہید: کون ہے — اندر آجاؤ۔ اوہ ملک تم؟

ملک: Is Anything the Matter

ناہید: رندھی ہوئی آواز میں۔ (آنسو پی) کر نہیں۔ کچھ نہیں

ملک: ہمیں بولو۔ ہم سب ٹھیک کریں گا (چٹکی بجا کر) ایسا موافق ٹھیک کر دے گا۔

ناہید: کسی کو ٹھیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سنو۔

ملک: Yes

ناہید: تمھاری موٹر سائیکل خالی ہے نا!

ملک: OK Yes

ناہید: چلو کہیں چلیں۔ میرا دل آج گھبرا رہا ہے۔ چلو کہیں دور چلیں۔

ملک: کدھر؟

ناہید: جو، ہو، سینڈس۔

(موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتا ہے اور دونوں روانہ ہو جاتے ہیں)

(یہی آواز نہایت تیز اور شہوانی قسم کی موسیقی میں مل جاتی ہے جو کہیں دور جو ہو کے رتیلے میدان میں بج رہی ہے۔ موسیقی ذرا ہلکی ہونے پر دونوں کی گرم گرم اور لمبی لمبی سانسوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دونوں ہانپ رہے ہیں۔)

ناہید: ہوا کتنی ٹھنڈی ہے۔

ملک: اوہ تمھیں تو ٹھنڈ لگی ہے قریب آجاؤ۔

ناہید: (دور سے موسیقی کی دھن) زندہ رہنے کے لیے ایک لمحہ! یہ اندھیرا، یہ ہوا، یہ بکھرتی موسیقی۔ یہ گرم جسم۔

ملک: اور قریب آجاؤ۔

ناہید:

ملک:

ناہید: سنو کوئی گا رہا ہے۔

ملک:

ناہید: My God

ملک: تمھارا جسم ریت کی طرح ملائم ہے۔

ناہید: اور تم پتھر کی طرح سخت۔

ملک: I Love You

ناہید: I Hate You

ملک: How Lovely

ناہید: دیکھو اور قریب نہ آؤ۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو!!!

ملک: میں نے تمھیں جیت لیا۔

ناہید: (جسم، جسم، جسم —!! تو نے ہماری روحوں کو۔ ہمارے خوابوں کو کیسا غلام بنا رکھا ہے۔ (موسیقی پھر اُبھرتی ہے)

آٹھواں سین

(دروازے پر دستک)

شبو: مطلع عرض ہے۔ تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔ کہیے کچھ قائل ہوئیں اپن بھی لاجواب ہیں۔ دنیا کے آخری طبق میں بھی چھپو گی تو یار خان کی نظروں سے نہ بچو گی ہے نا یہی بات!

ناہید: شبو، حد ہو گئی۔ یہ تمھیں اس مکان کا پتہ کیسے لگ گیا؟

شبو: وہ جو ایک جیبی گھڑی ہے۔ ہمارے سینے میں بائیں طرف، بس وہ راستہ بتاتی گئی ہم چلتے گئے اور دیکھا تم نے۔ ایک دم تمھارے دروازے پر ٹک ٹک!

ناہید: گھر پسند آیا؟

شبو: وہ گھر تم سے بڑا تھا اس گھر سے تم بڑی ہو۔ خدا کی قسم عجائب گھر۔ اور سناؤ کیا ہو رہا ہے تازہ خبر۔

ناہید: اپنی دریافت۔

شبو: واہ۔ واہ کیا مصرعہ کہا ہے۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ مگر اپنے کو دریافت کرنا بھول گیا تھا۔

ناہید: سچ میں اپنے کو کھوج رہی ہوں۔ جانتے ہو شبو! لوگ سب سے زیادہ کس سے ڈرتے ہیں۔ اپنے آپ سے۔ تمام زندگی وہ اپنے آپ سے منہ چھپائے پھرتے ہیں، بھاگتے ہیں، مصروفیت میں اپنے کو دفن کر دیتے ہیں۔ اور آخر ایک دن اپنے سے بھاگتے بھاگتے قبر میں جا گھستے ہیں۔ موت آسان ہے۔ اپنے سے آنکھیں چار کرنا مشکل ہے۔

شبو: یہ تو ہوا مگر یہ تو کہو موہنجوداڑو کی کھدائی میں ملا کیا؟

ناہید: ایک بات یقینی ہے۔ یہاں آؤ کھڑکی کے پاس چاروں طرف دیکھو۔ یہاں جھگی جھونپڑیوں میں پتھر کوٹنے والی۔ مٹی ڈھونے والی عورتیں آباد ہیں۔ میں ان کو کچھ سکھ اور کچھ غصہ دے سکوں گی۔

شبو: غصہ مردوں کے خلاف۔

ناہید: نہیں! مردوں کے خلاف غصہ عورت کو طوائف بنادیتا ہے۔ ظلم کے خلاف غصہ عورت کو انسان بنادیتا ہے۔

شبو: نوکری مل گئی ہے کیا؟

ناہید: ان لوگوں میں رہوں گی، ان لوگوں کے لیے ہو رہوں گی تو کیا میرے جینے کا بھی بھیتا نہ کر پائیں گی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ، ان گھروں کی خوشحالی اور ان کی آنکھوں میں جینے کا غرور بیدار کرنے کے لیے بغاوت کے شعلے پیدا کر سکوں گی تو کیا زندگی بھی نہیں ملے گی۔

شبو: تم سٹ گئی ہو۔ لہٰذا ہو جاؤ گی لیڈر قوم۔ لوگ تمھاری جئے بولیں گے اور ہم جلوس کے پیچھے پیچھے چلاتے ہوں گے۔ (چلا کر) ہم کو بھی ساتھ لے لے ہم رہ گئے اکیلے۔

ناہید: میں آزاد ہوں شبو۔ میں گیت لکھوں گی۔ میں تصویریں بناؤں گی، میں ناچوں گی، گاؤں گی، میں آزاد ہوں۔ شاید کبھی اپنے کو پاسکوں۔ شاید۔

شبو: تب تو کمال ہی ہو جائے گا یعنی تم آسمانی سے بھی آگے جا پہنچو گی۔

ناہید: میں جانتی ہوں شبو۔ میں اس سماج کو نہ بدل سکوں گی۔ ایک آدمی پوری دنیا سے کیسے ٹکرائے گا مگر وہ کم سے کم سوالیہ نشان تو لگا سکتا ہے۔ آنے والے انسانوں کے سینے میں کھٹک تو پیدا کر سکتا ہے۔ شاید پورے نظام کے بدلنے کے لیے ان سب انسانوں کی مدد چاہیے جو میرے چاروں طرف آباد ہیں۔ تپتی ہوئی دوپہر میں جلتی سڑکوں پر کنکر کوٹتی ہوئی عورتیں۔ بھاری پتھر کاٹنے والے مفلس نادار انسان جن کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے اور جینے کے لیے پورا جہان ہے۔

شبو: بخدا بڑی دھواں دھار تقریر فرمائی ہے۔ تم نے ایسی دھواں دھار کہ مجھے جماہیاں آنے لگیں۔ قسم چائے سے وغیرہ یہاں نہیں ہوتی ہے کیا؟

ناہید: کیوں؟

شبو: کچھ پیاس ہی بجھ جاتی اور اگر تمھارے پاس والے ڈبے میں کچھ بسکٹ وغیرہ ہوں تو عیش ہو جائیں عیش۔

ناہید: (ہنس دیتی ہے) تمھارے یہ جملے تو مجھے مرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیں گے۔

شبو: کیوں بھئی ویسے مرنے کا ٹائم ٹیبل کیا ہے؟ ذرا مفصل بیان کرو۔

ناہید: مجھے زندگی کا وہ ارمان ہے کہ مرنے کی فرصت نہیں۔

شبو: دیکھا صفا صفا ٹال گئیں نا۔ ہو تم بہت وہ یعنی سخت خبیث۔

ناہید: نہیں شبو۔ بس ایک ارمان ہے کہ اپنے ارمان کی ایک چھوٹی سی چنگاری اردگرد کے بسنے والے ان مردوں، عورتوں کے سینے میں چھوڑ جاؤں جینے کی تڑپ اور عزت سے جینے کی تڑپ۔ زمین پر سر اٹھا کر کھڑے ہونے کا حوصلہ۔ بس جس دن یہ کام ہو گیا میں موت کے لیے تیار ہو جاؤں گی۔

شبو: اچھا بھئی! خطبہ ختم۔ چائے کا انٹرول۔

نواں سین

بھابی: چائے لگ گئی ہے۔

بھائی جان: پی لو نہ جا کر۔ دیکھ نہیں رہی ہو ابھی دانت بھی نہیں مانجھے ہیں منہ بھی نہیں دھویا ہے۔

بھابی: تو کیا منہ بھی میں ہی دھلایا کروں۔

بھائی جان: تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم سب کتنے چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ ناہید تو پہلے بھی یہاں نہیں رہتی تھی مگر اس کا اس بار جانا سب کو تلملا کر رکھ گیا ہے۔

بھابی: وہ تو نادان لڑکی ہے مگر تجربہ کار بزرگوں کو کیا ہوا ہے۔ ضد پر اڑے رہنے سے کبھی کچھ ہوا ہے جو آج ہوگا۔ تم بھائی ہو کر ایسا خون سفید کیے بیٹھے ہو۔ بہن نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھا رہی ہوگی۔ ایسے میں کھانا پینا کسے اچھا لگتا ہے۔

بھائی: کاش میں کچھ کر سکتا۔

بھابی: کر کیوں نہیں سکتے۔ صاف صاف کہہ دو۔

بھائی: کیا کہہ دوں؟

بھابی: اماں حضور سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر ناہید اس گھر میں نہیں رہے گی تو۔

بھائی: تو — ؟

بھابی: تو ہم بھی یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

بھائی: مگر کہاں جائیں گے؟ دفتر کا کام کروں گا کہ مکان ڈھونڈوں گا۔

بھابی: ایسا کیسے سوچتے ہو۔ اماں حضور کوئی نکال تھوڑا ہی دیں گی۔

بھائی: تم انھیں نہیں جانتیں۔

بھابی: ان کے سینے میں بھی ماں کا دل ہے۔

بھائی: ان کے سینے میں دل ہے؟ مجھے اس میں شک ہے۔

بھابی: تم کہہ کے تو دیکھو۔

بھائی: ضرور کہوں گا۔

بیگم: بیٹے! جو کچھ کہنا ہے بعد میں کہنا پہلے چائے پی لو۔

بھائی: اماں حضور!

بیگم: چلو (تحکم کے لہجے میں) تم دونوں کی وجہ سے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

بھائی: دراصل اماں حضور۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنی ہے۔

بیگم: تم بہت کاہل ہو گئے ہو، ہمیں سُستی ناپسند ہے، ایسا لگتا ہے کہ تم نے ابھی تک دانت بھی نہیں مانجھے ہیں، منہ بھی نہیں دھویا ہے۔ دُلہن، تم نے بہت نرمی برت رکھی ہے۔ غضب خدا کا ساڑھے دس بج رہے ہیں اور ابھی تک چائے ناشتہ نہیں ہوا ہے۔

بھائی: (منہ دھونا شروع کرتا ہے اور منہ دھونے میں بولتا جاتا ہے) اماں حضور دراصل مجھے آپ سے۔

بیگم: (بات کاٹ کر) منہ دھونے میں باتیں نہیں کیا کرتے۔ دلہن اسے تولیہ دو چلو — اور وہ کون سی ضروری بات تھی؟

بھائی: اوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں کہہ رہا تھا۔

بھابی: کہیے نا۔ اب کہتے کیوں نہیں۔

بیگم: کیا کہنا چاہتے ہو؟

بھائی: میں کہہ رہا تھا کہ آج کل چچا جان کی صحت گر گئی ہے۔ وہ آج کل کچھ کھا پی نہیں رہے ہیں۔

بیگم: اوہ— ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ ڈاکٹر کو ٹیلی فون کرنا چاہیے۔ دلہن بیگم۔ مغلانی بی بی سے کہو گرم چائے کی دوسری کیتلی بھیجیں۔ تم کیک پراٹھے اور کباب شروع کرو۔

بھائی: بہت اچھا— کباب آج بہت مزے دار ہیں۔

(چچا کا داخلہ)

چچا: بزدل— سب بزدل ہیں۔

بھائی: چچا جان!

چچا: ہمیں ایسی نظروں سے نہ دیکھو۔ تین دن ہو گئے ہیں ہمارے اسٹوڈیو کی ساری تصویریں، ساری مورتیاں ہمیں انھیں نظروں سے دیکھ رہی ہیں، جیسے ہم انسان نہ ہوں پتھر ہوں۔ آخر ہماری بھی آبرو ہے، آخر ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔

بیگم: کیا کہنا چاہتے ہو؟

بھائی: چچا جان ٹھیک کہتے ہیں۔

بیگم: تم خاموش رہو۔ ہم ان کی زبانی سب کچھ سننا چاہتے ہیں۔

چچا: وہ لڑکی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ہم تم غلطی پر ہیں۔ تم کو یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ تم ہر نئے خیال کو ٹھوکر مار کر اپنے جہان سے نکال دو۔ سراسر ظلم ہے۔

بیگم: یہ تم کہہ رہے ہو؟

چچا: صرف میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی بچپن کی منگیتر کو ٹھکرا دیا۔ زندگی بھر میں نے شادی نہیں کی، میری راتیں زہرہ جان کے گھنگھروؤں سے آباد رہیں میں نے گھر نہیں بسایا۔ میں چاہتا تھا کہ میں جو کچھ بننا چاہتا ہوں بن سکوں۔ میں نے سارے بوجھ اپنے شانوں سے جھٹک کر دور پھینک دیے اور تم نے مجھے اس گھر سے نکال باہر نہیں کیا۔ کیوں؟ میں پوچھتا ہوں کیوں؟ باجی تم سے پوچھتا ہوں۔ مجھے بتاؤ مجھے کیوں برداشت کیا گیا۔

بیگم: تم نے نافرمانی نہیں کی تھی۔

چچا: یہ جھوٹ ہے۔ میں نے سب کی نافرمانی کی تھی مگر باجی! میں مرد تھا۔ اس لیے مجھے

برداشت کرلیا گیا۔ میں نے اپنے تصویروں کے رنگوں کے ذریعے اپنے آپ کو پالیا اور دنیا کو رنگ اور نور سے بھر دیا۔ یہ بصیرت میری جاگیر نہیں ہے باجی۔ ہوسکتا ہے ناہید کے پاس دنیا والوں کے لیے اس سے بڑا خزانہ ہو اور اگر نہ بھی ہو تو کیا اسے یہ حق نہیں کہ وہ اپنی بھرپور زندگی گزار سکے جیسے وہ چاہے جیے۔

بیگم: کیا تم چاہتے ہو کہ عورت کو طوائف بننے کی آزادی دے دی جائے؟

چچا: نہیں۔

بیگم: تو پھر؟

چچا: صرف اتنا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کی مشین نہیں ہے وہ بھی مرد کی طرح آزاد ہے۔ اسے بھی مرد کی طرح جنس اور اولاد سے لطف اٹھانے کا حق حاصل ہے وہ بھی اپنی شخصیت کے جوہر سے زندگی کو نئی رعنائی دینے کے لیے آزاد ہے۔

بیگم: تو گویا عورتیں کتے بلیوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ ہم اسے برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمارے خاندان میں......

چچا: خاندان! خاندان!! خاندان!! خاندان کا پورا شیرازہ ٹوٹ چکا، بکھر چکا، آج بیسویں صدی میں کہاں ہے خاندان؟ بوڑھے ماں باپ نرسنگ ہوم میں دن کاٹتے ہیں۔ بچے گھربار سے دور نوکریاں کرتے ہیں۔ عورت دفتر کی زینت ہے۔ باپ شاہراہوں پر سرگرداں۔ آج کا خاندان اکائیوں میں بکھر چکا ہے اس کے نام پر ناہید کو پھانسی نہ دو۔

چچا: نہیں باجی۔ نہیں۔ ہم نے آپ کا ہر حکم مانا ہے۔ اس چہار دیواری میں ہمیشہ آپ کی حکومت چلی مگر آج ایسا نہیں ہوگا ابھی اور اسی وقت آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا ہم ناہید کو واپس لائیں گے وہ اسی گھر میں رہے گی۔

بیگم: ہرگز نہیں۔

چچا: باجی ضد نہ کیجیے۔ ہم نے آپ کی ہر بات مانی ہے۔ ایک بار آپ بھی مان لیجیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ پھر کبھی آپ سے کچھ نہیں کہیں گے۔

بیگم: ضد نہ کرو۔

چچا: میں آخری بار ضد کروں گا۔ دلہن جاؤ شوفر سے کہو گاڑی نکالے۔ ہم لوگ ناہید کو واپس لانے کے لیے جائیں گے۔

دسواں سین

(موٹر سائیکل کی آواز۔ دروازے پر دستک)

ناہید: اندر آجاؤ— اوہ تم—

ملک: ہاں میں ہوں۔ ملک!

ناہید: تمھارے دستانے پر خون؟

ملک: .... سے آرہا ہوں۔

ناہید: تم پریشان ہو؟

ملک: نہیں۔ ہم خوش ہے تھوڑا اور خوش ہونا چاہتا ہے۔

ناہید: کیا مطلب؟

ملک: ہم۔ ہم نے پہلی بار تم سے پیار کیا ہم تمھیں ہم تمھیں چاہتا ہے ڈارلنگ ہم تم سے شادی کرنا مانگتا ہے۔

ناہید: شادی۔

ملک: ہاں شادی۔ ڈارلنگ شادی۔

ناہید: بات سنو ملک! میں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

ملک: جھوٹ——

ناہید: زندگی بہت بڑی ہے اور شادی۔ جنسی زندگی کی صرف ایک چھوٹی سی حقیقت ہی تو ہے۔

ملک: ہم نہیں سمجھا ہم تم سے شادی کرنا مانگتا ہے بولو Yes or no

ناہید: No No No

ملک: تم ہمیں بہت پسند ہے، بہت زیادہ پسند ہے ڈارلنگ۔

ناہید: اور میں تم سے نفرت کرتی ہوں سخت نفرت کرتی ہوں۔

ملک: کیا کہا؟

ناہید: I Hate you

ملک: تم نے اس دن تو ایسا نہیں بولا ہے۔

ناہید: ہاں اس دن تم نے مجھے صرف ایک لمحہ دیا تھا۔ لذت کا ایک لمحہ اور آج تم وہ ایک لمحہ لے کر میری پوری زندگی کا مول کرنے آئے ہو۔

ملک: ......ہم نہیں دیکھ سکے گا تم ہماری ڈارلنگ ہو۔

ناہید: میں ایک انسان بھی تو ہوں میری اپنی ذات ہے۔

ملک: ہم اپنی ڈارلنگ کو کسی دوسرے کے پاس نہیں دیکھ سکے گا۔ ہم تمھیں اپنائے گا تم ہماری ڈارلنگ ہو صرف ہماری۔

ناہید: کیسی باتیں کرتے ہو؟

ملک: ٹھیک۔ بالکل ٹھیک موافق بولتا ہے۔ ہم نے تمھیں چاہا ہے۔

ناہید: سنو ملک! یہ ناممکن ہے۔

ملک: سنو ڈارلنگ۔

ناہید: تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں بکاؤ نہیں ہوں۔

ملک: مگر ہم تمھارے بغیر نہیں جیئے گا۔

ناہید: مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ ساتھ ساتھ رہنے کے لیے صرف جسم ہی تو نہیں چاہیے ہم دونوں کے درمیان ...... کیا ہے۔

ملک: Love

ناہید: میں نے کب کہا مجھے تم سے محبت ہے۔ I hate you۔ کیا تم صرف جسم کو محبت کہتے ہو؟

ملک: ......

ناہید: میں نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔

ملک: ....

ناہید: میں نے تم سے شادی کا وعدہ کب کیا تھا؟

ملک: ....

ناہید: یہ جھوٹ ہے! یہ سب جھوٹ ہے!

ملک: ....

ناہید: بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے کب کہا تھا مجھے چاہو؟ میں تو صرف اپنی زندگی چاہتی تھی۔

ملک: ....

(ریوالور چلنے کی آواز، دوسری چیخ اور اس کے بعد موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز، جو دیر تک گونجتی رہتی ہے اور اسے بعد موٹر کار کی آوازوں میں مل جاتی ہے۔)

چچا: آؤ مجھے سب راستے معلوم ہیں۔ یہ ہے ناہید بٹیا کا مکان۔ دستک دو۔ کہیں سو نہ رہی ہو۔ (دستک دیتا ہے)

بھائی: کوئی جواب نہیں دیتا۔

بھابی: تعجب ہے۔

بھابی: دیکھیے چچا جان! آپ اسے نہ ڈانٹیے گا۔ اس نے بہت دکھ جھیلے ہوں گے۔

چچا: دوبارہ دستک دو۔

گیارھواں سین

بھابی: کوئی آواز نہیں۔ یوں ہی چلتے ہیں۔

دیکھا ہم نہ کہتے تھے سو رہی ہے بالکل غافل پڑی سو رہی ہے۔ بیٹی ناہید! بیٹی اٹھو ہم تم سے معافی مانگنے آئے ہیں۔ تم ٹھیک کہتی تھیں ہم غلطی پر تھے۔ بیٹی ہمیں معاف کر دو۔ (چیخ پڑتی ہے)

چچا: خون! چاروں طرف خون کیسا ہے؟

بھابی: ناہید! یہ تم نے کیا کیا؟

چچا: ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔ زندگی کے ارمان سے بھرپور جوانی خودکشی نہیں کر سکتی اسے قتل کیا گیا ہے۔ آخر تمھاری بے درد دنیا ایک چھوٹے سے خیال کی تاب بھی نہ لا سکی۔

(موسیقی کی لہریں دیر تک امڈتی رہتی ہیں)

(فلیش بیک: قبرستان)

ناہید: (ہنستی ہے) سنا تم نے۔

شبو: ہاں۔

ناہید: میں کب سے تمھیں یہ سب کچھ سنانے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ ہڈیاں جن سے گولی گزری تھی مٹی میں مل گئیں۔ کیڑوں نے انھیں چاٹ ڈالا۔

شبو: ناہید! میں نے تمھیں پہچان لیا۔ زندگی میں کوئی تمھیں نہ پہچان سکا۔ مرنے کے اتنے دن بعد تمھیں پہچانا ہے کہ پھر سے جینے کی خواہش ہوتی ہے۔

ناہید: تم اپنے قہقہوں اور چلتے ہوئے فقروں اور ہنسی سے بھرپور جملوں میں اپنے دکھ چھپاتے رہے وہ تمھیں کب جان سکے۔ میں چلا چلا کر انھیں اپنے دل کی بات سمجھاتی رہی، وہ ہنستے رہے پھر بھی نہ سمجھ پائے اور ملک نے اپنی عزت اور ناموس کی خاطر مجھے مار ڈالا۔ وہ اپنی دنیا کا کتنا سچا، کتنا پکا غلام تھا میں اس روز سے آج تک تمھارا انتظار کر رہی تھی۔ میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی۔

شبو: کیا؟

ناہید: یہی کہ وہ چنگاریاں ابھی زندہ ہیں یا نہیں جنھیں میں ان جھونپڑیوں میں چھوڑ آئی تھی۔ کیا اب بھی کوئی باغی جوان مرد اور عورتیں سر بلند ہو کر چلتے ہیں؟ کیا جوانوں میں اب بھی خوابوں کے لیے جل جانے کا حوصلہ ہے یا نہیں؟

شبو: میں کیا جواب دوں گا ناہید! البتہ جب میرا جسم بھی تمھاری طرح کیڑے کھا پائیں گے، میری ہڈیاں بھی تمھاری طرح سارے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں گی تب ہم تم بارش کے پانی میں بہتے ہوئے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے چلیں گے۔

☆☆☆

خوابوں کا سوداگر

(بس تیزی سے قریب آنے اور گزر جانے کی آواز)

نرمل: خواہ مخواہ دوڑ رہے ہیں لوگ۔ نہیں رکے گی۔

گردھاری: (دوڑنے کی آواز) کنڈکٹر بس روکو۔ بس روکو۔

(بس گزر جاتی ہے)

نرمل: میں نے کہا تھا نہیں رکے گی۔

گردھاری: روکو! روکو!!

(دور تک دوڑتا چلا جاتا ہے۔ بس گزر جاتی ہے۔ گردھاری ہانپتا ہوا واپس آتا ہے۔)

گردھاری: دیکھا آپ نے۔ کیسے لاپرواہ ہوتے ہیں یہ ڈرائیور۔

مولانا: اجی قبلہ۔ آپ نے ناحق زحمت کی۔ پہلے ہی عرض کیا جا رہا تھا کہ نہیں رکے گی۔

نرمل: ہاں جی۔ بڑے ظالم ہوتے ہیں کسی کی جان بھی چلی جائے تو گاڑی نہیں روکیں گے۔

گردھاری: مجا آتا ہے ستانے میں۔

مولانا: اجی حضرت دراصل یہ سواری ہی نہایت نامعقول ہے۔ واللہ ایسی سواری پر بزرگ لعنت بھیج گئے ہیں جس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ ہو گویا ہماری آپ کی سب کی جان نعوذ باللہ اس کنڈکٹر بلکہ کیا کہتے ہیں اس ڈرائیور کے ہاتھ میں ہے چاہے ٹکر مار دے۔ یہ بھی کوئی سواری ہے۔

گردھاری: مگر جناب۔

مولانا: قطع کلام معاف۔ پھر یہ بھی کیا بات ہوئی کہ

استغفراللہ عورتیں تک شرفا کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھی ہیں ڈوب مرنے کا مقام ہے شریفوں کے لیے۔

گردھاری: تو پھر جناب بس میں سفر کرنا۔

مولانا: جی ہاں سراسر ظلم ہے، ستم ہے۔

گردھاری: مگر مولانا! بس میں نہ بیٹھیں تو روز پندرہ میل آنا اور پندرہ میل جانا! پیدل آتے جاتے جوتیاں تو جوتیاں خود گھس کر آدھے رہ جائیں گے۔

مولانا: ہاں صاحب یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ سفر نہ کرے تو کیا کرے۔ ٹیکسی والوں کے دماغ نہیں ملتے۔ موٹر اسکوٹر ہمارے آپ کے پاس ہونے سے رہا لے دے کے غریبوں کی چشم دچراغ یہی ایک بس ہے۔

نرمل: یہ بھی ٹھیک ہے۔ مزا یہی ہے یارو کہ اس زندگی کی ہر بات ٹھیک بھی ہے اور غلط بھی۔ چلو چھوڑو یارو۔ بس تو گزر گئی کوئی زندگی تو نہیں گزر گئی۔

گردھاری: واہ صاحب واہ! یہاں دوڑتے دوڑتے پلیتھن نکل گیا اور آپ کے نزدیک کچھ ہوا ہی نہیں۔ آخر ذرا دھیان کیجیے کہ کوئی ایسا ہی ضروری کام رہا ہوگا۔ نہیں تو میں بھی انتظار کر سکتا تھا۔

نرمل: ہاں صاحب یہ تو ہے۔

مولانا: جی ہاں جناب کوئی اپنے اختیار سے راستے کی دھول پھانکنے آتا ہے مجبوری نہ ہو تو اپنا گھر کسے بُرا لگتا ہے۔ مجبوری نہ ہو تو کوئی اس نامعقول سواری میں قدم رکھے۔ بے بس کر دیتی ہے کمبخت۔ اور لطف یہ ہے کہ نام رکھا ہے بس۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے۔ شاعر کہہ گیا ہے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

نرمل: تو گویا بس نہ ہوئی دنیا ہو گئی۔ کوئی اپنی خوشی سے آتا ہے؟

مولانا: واہ برخوردار! کیا بات پیدا کی ہے۔ کوئی اپنی خوشی سے نہیں آتا اور واپس جانے کے لیے

بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔

نرمل: مگر واپس تو خود بھی جا سکتا ہے۔

مولانا: بغیر اُس کے حکم کے پتا نہیں ہل سکتا جس کی جس وقت لکھی ہے۔ اس وقت آئے گی۔

نرمل: میں آج خودکشی کرنے کا ارادہ کرلوں تو سامنے قطب مینار سے ایک چھلانگ لگا کر ہمیشہ کے لیے۔

مولانا: خدانہ کرے۔ برخوردار ایسی باتیں کیوں زبان سے نکالتے ہو۔ توبہ توبہ!!

گردھاری: آپ لوگوں کے شاعری سوجھ رہی ہے۔ وہ دیکھیے دوسری بس آنے والی ہے۔

جی نہیں موبائل کورٹ ہے۔

مولانا: یعنی

نرمل: چلتی پھرتی عدالت۔ بس میں بلا ٹکٹ سفر کرنے والوں کا چالان کیا جاتا ہے۔

مولانا: بہت خوب۔ گویا پہلے تو بس میں سفر کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ پھر بلا ٹکٹ سفر کرنے کی گنجائش پیدا کی جاتی ہے۔ پھر چالان کر کے کیفر کردار تک پہنچائے جاتے ہیں:

ع: قرباں ہجوم رحمت پروردگار کے

(بس قریب سے گزر جاتی ہے)

گردھاری: ہماری بس ابھی تک نہیں آئی۔

نرمل: اجی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ بس آتے آتے ہی آئے گی ذرا دم لیجیے۔

گردھاری: میں زندگی بھر دم لینے کو تیار ہوں۔ مگر کوئی دم لینے تو دے۔ بچے کی دوا آنی ہے۔ پھر سودا سلف لے جا کر گھر والی کے حوالے کرنا ہے۔ پھر دفتر کی راہ لینی ہے۔ ذرا سا وقت ہے اس میں اتنے بہت سے کام کیسے ہوں گے۔

نرمل: سچ کہتا ہوں (مسکرا کر) مجھ سے زندگی بدل لیجیے۔ میرے پاس وقت ہے۔ وقت بے کراں سمندر ہے۔ بے اور چھور کا ریگستان ہے۔ خرید لیجیے۔ میں وقت بیچتا ہوں اور اب تک کسی نے یہ بے بہا خزانہ خریدا نہیں ہے۔ میں ابھی تک بیکار ہوں۔

مولانا: خدا نے چاہا تو نوکری مل جائے گی۔

نرمل: نہیں مولانا۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔

گردھاری: آپ بھاگیہ وان ہیں بھائی! یہاں ایک طرف دفتر کا چکر ہے۔ پانچ منٹ دیر ہوگئی تو ہیڈ کلرک آنکھیں نکال رہا ہے۔ ساتھی سنگی چغلی کھا رہے ہیں۔ گھر پہنچو تو نون، تیل، لکڑی کا چکر۔ گھر والی منہ پھلائے بیٹھی ہے۔ ایک بچہ بیمار ہے۔ پچھلے ہفتے دوسرا جھولے سے نیچے گر پڑا ہے۔ اس سے پچھلے ہفتے سب سے چھوٹے کو دانت نکلنے میں بخار آ گیا۔

مولانا: تو آپ کے چار بچے ہیں۔

گردھاری: جی آپ کی کرپا سے۔

مولانا: ارے بھائی۔ میں نام بھولا آپ کا۔

گردھاری: گردھاری لال۔

مولانا: ارے بھائی گردھاری لال جی! پہلے سے کیوں نہیں بتایا آپ نے۔ پچھلے تین دن سے پریشان ہو رہا ہوں۔ بیس ہزار کا معاملہ ہے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جس کے چار بچے ہوں۔

گردھاری: بیس ہزار کا!

مولانا: جی ہاں جناب بیس ہزار کا۔ اچھا تو جناب یہ بتائیے کہ جن والدین کے چار بچے ہوتے ہیں ان کو پانچویں بچے سے کیا ہوتی ہے؟

گردھاری: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟

مولانا: اوہو۔ عاقل بالغ ہیں آپ ماشاء اللہ۔ سیدھی سی بات ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کو اپنے پانچویں بچے سے کیا ہے۔ نفرت۔ محبت۔ چاہت۔ ہیبت۔ راحت۔ مروت۔

گردھاری: میں نے کہا نا کہ میرے چار بچے ہیں۔

مولانا: وہ تو میں سمجھ گیا۔ میں پوچھتا ہوں آپ کو پانچویں بچے سے کیا ہے؟

گردھاری: مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔

مولانا: نہیں سمجھے آپ۔ ارے بھائی معمے کا اشارہ ہے۔ آپ سے بہتر بھلا کون بتا سکتا ہے ذرا

دماغ پر زور ڈالیے۔ ذرا دھیان سے سوچئے۔ یعنی آپ کو اپنے پانچویں بچے سے کیا ہے۔ آپ نے ٹھیک بتا دیا تو بخدا اول انعام کہیں نہیں گیا ہے۔ صاف بیس ہزار روپے ہاتھ جائے گا۔ ہاں تو کیا ہوتی ہے؟

گردھاری: مجھے کچھ نہیں ہوتی پانچویں بچے سے، اور ہوتی بھی ہے تو نہیں بتاتا۔

مولانا: اوہ آپ تو ناحق ناراض ہو گئے۔ بھائی، گردھاری لال صاحب، واللہ آپ کا بڑا احسان ہوگا آخر آپ کا ہرج ہی کیا بتانے میں۔

گردھاری: اور جو میں نہ بتانا چاہوں۔

مولانا: تو ناحق آپ کے سر بہت سی ذمہ داریاں آ جائیں گی آپ کے نہ بتانے سے بیس ہزار روپیہ کا نقصان ہوگا۔ میرے قرض خواہوں کا قرضہ ادا نہ ہوگا۔ مالک مکان سال بھر کا کرایہ نہ لے سکے گا۔ بیوی کے زیور گروی پڑے رہیں گے۔ اور آپ جانتے ہیں اس سارے عذاب کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہوگی۔

گردھاری: یہ تو آپ سراسر انیائے کر رہے ہیں۔

مولانا: کاش مجھے صحیح اشارہ معلوم ہوتا۔

گردھاری: اور باقی اشارے۔

مولانا: باقی سب اشارے مجھے معلوم ہیں اور ان تک کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکتا۔

نرمل: مولانا! معمہ جیتنا بہت ضروری ہے۔ لیکن کبھی کبھی ہار میں بھی مزا ہوتا ہے۔

مولانا: نہایت ضروری ہے برخوردار۔ نہایت ضروری ہے۔ میں سارے اشارے حل کر چکا ہوں۔

نرمل: دنیا کا ہر مذہب، ہر فلسفہ یہی کہتا آیا ہے مولانا کہ اسے زندگی کے معمے کے سارے اشارے معلوم ہیں اور ان تک دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکتا مگر ایک آخری اشارہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اسے کوئی بخوبی نہیں جانتا۔ وہ لفظ کسے معلوم ہے جو زندگی کے معمے کو حل کر سکے شاید اس لفظ کو کوئی نہیں جانتا۔ یہی ایک لفظ ہم سب کی تقدیر ہے۔

مولانا: حضرت! آپ خواہ مخواہ دخل در معقولات کر رہے ہیں۔

گردھاری: وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ مجھے کوئی اشارہ نہیں آتا۔ مجھے آتا تو میں اس طرح بس کے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہلکان ہوتا۔ میرے پاس بھی کار ہوتی۔ میں بھی آرام سے رہتا۔ اور آپ سب پر ہنستا ہوا زوں سے کار میں گزر جاتا۔

مولانا: دھول اڑاتا ہوا۔!

گردھاری: جی؟

مولانا: تو کیا سچ مچ کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ اشارہ حل کر سکے۔

نرمل: شاید کوئی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔

گردھاری: اس ۷ انمبر بس کی سروس نہایت خراب ہے۔ بہت دیر سے آتی ہے اور جب آتی ہے تو بھری ہوتی ہے۔

مولانا: بسیں کم ہیں مسافر زیادہ ہیں۔

گردھاری: اس لیے برتھ کنٹرول پر زور دیا جا رہا ہے کہ بسیں زیادہ اور آدمی کم ہو جائیں گے۔ تب سب آرام سے سفر کر سکیں گے۔

نرمل: اجی سب بکواس ہے گردھاری لال جی۔ پیدائش پر کنٹرول۔ مگر زندہ رکھنے پر اصرار۔ میں کہتا ہوں کہ کروڑوں اربوں انسان جن کی زندگی کے مسئلوں کی کوئی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہے۔ انھیں مرنے کی آزادی کیوں نہیں دی جاسکتی۔

مولانا: میاں صاحبزادے! تم بہت خوفناک باتیں کرتے ہو۔ مجھے موت سے نہایت ڈر معلوم ہوتا ہے۔

نرمل: اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے مولانا۔ ہم سب بچے جواں، بوڑھے، مرد، عورت سب کے سب ایسے مجرم ہیں جنھیں سزائے موت دی جا چکی ہے۔ مگر پھانسی کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے۔ جس دن وہ تاریخ آجائے گی جلاد ہماری کوٹھری میں چپکے سے داخل ہو کر ہمیں ساتھ لے جائے گا اور پھر ایک لمحے میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پانی پانی میں۔ ہوا ہوا میں۔ مٹی مٹی میں، آگ آگ میں مل جائے گی۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔

مولانا: موت کا نام نہ لو برخوردار۔

گردھاری: کچھ اور باتیں کرو بھائی۔

نرمل: موت سے بڑی اور کوئی بات اس زندگی میں نہیں ہوسکتی۔ آپ اتنے گھبراتے کیوں ہیں۔ موت کی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ جو انسان کو اختیار کا سبق سکھاتی ہے، بتاتی ہے کہ اس کے لیے بس کا انتظار کرنا ضروری نہیں ہے۔

مولانا: (غصے سے) لاحول ولاقوۃ میاں صاحبزادے تم اس نامراد ذکر سے باز نہیں آؤ گے۔

نرمل: (لطف لے کر) مجھے اس ذکر میں مزا آتا ہے۔

مولانا: لاحول ولاقوۃ۔ بلکہ استغفراللہ۔ میاں جوانی میں لوگ عشق و عاشقی کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ مرتے تو ہیں مگر کسی پر مرتے ہیں۔

نرمل: جی، آج کے زمانے میں؟

مولانا: میاں، ہر زمانے میں۔ آج کے زمانے میں کیا سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں ہر زمانے میں نوجوان عشق کرتے رہے ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے کرتے رہیں گے۔

نرمل: آپ بھولتے ہیں مولانا! آج کا نوجوان عشق اور پریم سے بے خبر ہے اسے آپ نے روزگار، تعلیم اور گھربار کے جنجال میں اس طرح پھنسا دیا ہے کہ اس کے لیے زندگی کی ساری برکتیں بے معنی ہوکر رہ گئیں ہیں۔ وہ بس اسٹاپ پر چند لمحوں کی نظربازی یا ایک مسکراہٹ ہی کو سب سے بڑی دولت جان کر خوش ہولیتا ہے۔ اسے عشق کی آگ میں تپنے کا مزہ معلوم ہی نہیں۔ اس کے لیے یہ دلاسا ہی بہت ہے۔

مولانا: دنیا اب بھی بہت رنگین ہے صاحبزادے۔

گردھاری: یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو مولانا! میں نے تو اپنی زندگی میں کبھی لڑکیوں کو بے آستین کے قمیض پہنے نہیں دیکھا تھا۔

مولانا: تو صاحبزادے مہرولی جاکر قیام کرنے کا ارادہ ہے یا قطب مینار کی لاٹ پر رہائش اختیار کروگے۔

نرمل: ابھی میں نے کچھ طے نہیں کیا ہے۔ آپ کے پاس قلم ہوگا۔

گردھاری: ہاں یہ لیجیے۔

نرمل: مجھے ایک ضروری خط لکھنا ہے۔

مولانا: عجیب آدمی ہو، استاد! بس اسٹاپ پر خط و کتابت، چہ معنی دارد؟

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

نرمل: آپ دونوں مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔

(خاموشی قائم رہتی ہے)

نرمل: (ایک دم چیخ کر) آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔ میں خودکشی کر رہا ہوں میں پاگل ہوں۔ میری زندگی اکارت ہے اور میرے اس ارادے سے مجھے کوئی بھی روک نہیں سکے گا جایئے آپ پولیس کو اطلاع کر دیجیے۔ قانون سے کہیے وہ جس بیکار نوجوان کو جینے کا حق نہ دے سکا اس سے مرنے کا حق بھی چھین لے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

مولانا: کچھ نہیں۔

گردھاری: کچھ بھی تو نہیں۔

نرمل: آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنا دل چیر کر اپنے زخم آپ کو گنوادوں۔ آپ کو دلیل اور ثبوت سے سمجھاؤں کہ میرے لیے موت کیوں ضروری ہے۔ میں کوئی دلیل نہیں دوں گا۔ میرے دل کے ناسور، میرے ساتھ چتا میں جل جائیں گے۔ آپ ان کو نہ دیکھیں گے۔ آپ مجھ سے دلیل مانگتے ہیں میں آپ سے اس سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ ''آپ کیوں زندہ ہیں؟'' آپ کو اس طرح زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟'' بولیے جواب دیجیے۔

مولانا: ہم مر نہیں سکتے۔

گردھاری: موت بھیانک ہے۔

نرمل: زندگی اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہے۔

گردھاری: کمبخت یہاں کوئی نلکا بھی نہیں ہے سخت پیاس لگی ہے۔

مولانا: یہیں کہیں ہوا کرتا تھا نل۔ حلق تو میرا بھی خشک ہو رہا ہے۔ چلیے دیکھتے ہیں۔

گردھاری: چلیے۔ مگر چلنے سے پہلے۔

مولانا: (نرمل سے) دیکھو میاں صاحبزادے ہم لوگوں کی موجودگی میں تم نہ مر سکو گے۔ ابھی ہمارے اندر اتنا دم ہے کہ ایک آدمی کو مجبوراً زندہ رکھ سکیں۔

نرمل: بہتر ہو اگر آپ میری فکر چھوڑ دیں۔

مولانا: نہیں چھوڑیں گے۔

ایک آواز: (دور سے) مولانا۔ مولانا۔

مولانا: افوہ۔ بُرے پھنسے۔

گردھاری: کیا ہوا۔

مولانا: مالک مکان کا کارندہ۔

منشی: کیا خوب آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ آج صبح سے آپ کے گھر پر پہرہ دے رہا ہوں۔ بس جناب ہو چکی یاری۔ سیدھے ہاتھ سے سال بھر کا کرایہ نکالیے۔ ورنہ چل کر مکان خالی کر دیجئے۔

مولانا: بات تو سنئے۔

منشی: میں نہیں سنتا بات وات۔ سال بھر سے آپ ٹالے بالے بتا رہے ہیں۔ بس اب میری رقم ڈھیلی کیجئے۔ مالک مکان نے صاف صاف کہہ دیا کہ یا تو رقم وصول کر کے لاؤ یا سامان مکان سے باہر پھینک دو۔

گردھاری: دیکھئے۔

منشی: آپ خواہ مخواہ بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ سے کیا مطلب ہے۔

گردھاری: اب اس وقت بس اسٹاپ پر جیب میں کوئی کرایہ لیے پھر رہے ہیں۔

منشی: میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے جواب دیجئے۔

مولانا: پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔

منشی: مرغے ہو گے تم۔ میں کیوں ہونے لگا مرغا۔ میاں سیدھے سادے کرایہ ادا کر دو۔

مولانا: مجھ سے ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جائے گی۔ آپ کر لیجئے جو ہو سکے۔

منشی: اچھا تو آج ہی لو۔ ابھی لو۔ سامان گھر کے باہر پھنکوائے دیتا ہوں۔ تم جیسے کرایہ داروں

سے بھگتنا میں خوب جانتا ہوں۔

نرمل: ادھر بات سنو منشی۔

منشی: ہم پہ نیلی پیلی آنکھیں نکالنے والا کون ہوتا ہے تو۔

نرمل: مولانا جائیے آپ پانی پی آیئے (کارندے سے) سنئے منشی جی۔ مجھے سمجھائیے معاملہ۔

منشی: اجی معاملہ کیا ہے۔ سال بھر کا کرایہ ان کے ذمہ نکلتا ہے۔ کرایہ دلوا دیجئے۔

نرمل: اچھا رسید بک نکالئے۔ میں دیتا ہوں ان کی طرف سے پورا کرایہ۔

منشی: آپ۔ آپ کون صاحب ہیں۔ خیر کوئی ہوں۔ مجھے کرایہ چاہئے۔

نرمل: رسید نکالئے اور سنئے آپ ریس کھیلنے کب سے نہیں گئے۔

منشی: آپ نے کیسے جانا کہ میں ریس کھیلتا ہوں۔

نرمل: مجھے آپ کے ماتھے پر سب کچھ پڑھنا آتا ہے۔

منشی: سچ۔ تو آپ بتا سکتے ہیں۔

نرمل: سب کچھ بتا سکتا ہوں۔

منشی: کیا جیتنے والے گھوڑے کے نمبر بھی۔

نرمل: ہاں۔ مگر اسے ہر ایک کو نہیں بتایا جاتا۔

منشی: بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ مجھے بتا دیجئے۔ میری بگڑی بن جائے گی۔ میں آپ کا زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔ تا عمر آپ کو یاد کروں گا۔

(سپیرے کے بین کی آواز)

نرمل: سپیرے۔ سپیرے

سپیرا: جی حضور، ہم کا بلاوا کا؟

نرمل: دیکھو سپیرے۔ ہمارا کوٹ پہن لو۔

سپیرا: ہم سے کا مسخری کرت ہو صاحب۔ ہم دو کوڑی کے منئی کیا صاحب لوگ کا کوٹ پہن سکت ہیں۔

نرمل: لے جاؤ۔ خوشی سے لے جاؤ۔ پہن لو۔ میرے لیے بیکار ہے۔

سپیرا: (ہنستا ہے) اچھا تو پہن دیکھت ہے۔

نرمل: (ہنس کر) تم تو سچ مچ جنٹلمین لگ رہے ہو۔ اچھا اسی بات پر ذرا سانپ کا تماشا بھی دکھا دو۔

سپیرا: ارے ہم کا حضور اس دفعہ کا سانپ ذرا بکٹ رہے۔

نرمل: ہمیں اب کسی بکٹ وکٹ سے ڈر نہیں لگتا۔ کھولو۔ پٹاری کھولو۔ تنک دم لو۔

(بین کا نغمہ)

سپیرا: اے کا کرت ہو صاحب۔ اے کا کرت ہو۔ سانپ کو نہ پکڑو۔ کاٹ لئے ٹھور مر جات۔

نرمل: (قہقہہ لگاتا ہے) ہمیں موت سے ڈر نہیں لگتا۔

سپیرا: رکھ دو صاحب۔ سانپ کو نیچے رکھ دو صاحب۔

نرمل: نہیں میں اسے منشی جی کے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں۔

منشی: ارے۔ یہ کیا آپ غضب کر رہے ہیں۔ اسے پیچھے ہٹایئے (چیخ کر) پیچھے ہٹایئے۔

نرمل: میں اسے آپ کی گردن میں ڈالے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ (قہقہہ لگا کر) آپ بھی کسی سانپ سے کم نہیں ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ دو زہریلے سانپ جب ایک دوسرے کو ڈستے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔

منشی: رحم کیجئے میں مر جاؤں گا۔

نرمل: رحم آپ کو کرنا ہے منشی جی۔ میری طرف دیکھئے مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ مجھے اپنی زندگی پیاری نہیں ہے۔ ایسا آدمی سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے رسید چاہیے۔ آپ سمجھ گئے۔

منشی: جی سمجھ گیا۔ رسید دینے کو میں منع تھوڑے ہی کرتا ہوں۔ لیکن رقم۔

نرمل: مجھے آپ کی دستخطی سال بھر کے کرایہ کی رسید درکار ہے۔

منشی: اور اگر میں نہ دوں تو۔

نرمل: میں ڈال دوں گا۔ پھر یہ کبھی نہ اترے گا۔

(منشی چیختا ہے)

نرمل: رسید۔

منشی: نہیں (چیختا ہے)

نرمل: رسید۔

منشی: اچھا بابا۔ ذرا دم لیجئے میں رسید بھی دیے دیتا ہوں۔ آپ تو واقعی بڑے خطرناک ہیں۔ آپ تو آدمی کی جان بھی لے سکتے ہیں۔

نرمل: میں تمھیں راز کی بات بتاتا ہوں۔ اب سے کچھ دیر بعد ایک آدمی کی جان لینی ہے۔ اور اس آدمی کا نام ہے نرمل کمار

منشی: یہ لیجئے رسید۔

نرمل: ٹکٹ، دستخط۔

منشی: سب موجود ہے جناب۔ اچھا اب مجھے اجازت ہے۔ اب میں چلوں۔

نرمل: ہر طرف خاموشی ہے۔ زندگی تیرا بندھن کتنا کمزور اور کیسا مضبوط ہے۔

ولی چند: رام رام۔ یاں کوئی گردھاری لال تو نہ آیو؟

نرمل: گردھاری لال۔

ولی چند: ہاں جی۔ مھگنا سا ہے یہی ہوگا ۵۰۔ ۴۵ ورش کا بڑے دفتر میں کلرک لگا ہوا ہے۔ ابھی گھر سے پتا لگا سی کہ بس اسٹاپ پر گیا ہوا سی۔

نرمل: میرا نام تو گردھاری لال نہیں ہے۔

ولی چند: بس سے چلا گیا معلوم پڑے ہے آگے کو۔

نرمل: کام کیا ہے آپ کو۔

ولی چند: کام۔ اجی کام ہی کیا ہے وہی اپنا دھندا ہے اپنی بہن کے بیاہ میں کچھ روپیہ سود پر لیا سی اس نے۔ اب تک اس کا بھگتان نہیں کیا سی۔ اب بولو بھلا کوئی کب تک انتظار کر سکے سی۔ روپیہ والا تو سر پر ڈنڈا مار وصول کرے گا ہی سی۔

نرمل: ٹھیک ہے۔

ولی چند: اور میری سنو تو بیاج کے روپے سے جو بیاہ کرو وہ کبھی پروان نہ چڑھے سی۔ گردھاری

لال کا اس بیاہ میں پٹھا بیٹھ گیا سی۔ پرنتو اس کی بہن کی اپنے پتی سے بن کے ہی نادی۔

نرمل: اور آپ کا بیاج پھر بھی گردھاری لال کو دینا ہے۔

ولی چند: بروبر۔ جو روپیہ دیتا ہے میں نے کہا نا سی وہ تو مار ڈنڈا سر توڑ وصول کرے گا ہی سہی۔

نرمل: آپ مت کیجئے۔ گردھاری لال غریب کلرک ہے۔

ولی چند: اجی ہمیں سنت سادھوؤں کی باتیں مت سمجھاؤ سی۔ اچھا تو ہم اب چلے۔

نرمل: جانے کا آپ کو اختیار ہے مگر گردھاری لال یہاں موجود ہیں ذرا پانی پینے چلے گئے ہیں۔

ولی چند: تو پھر ایسا بولو سی۔

نرمل: میں چاہتا ہوں کہ اس کا سارا قرضہ ادا ہو جائے۔

ولی چند: ہم بھی یہی چاہتے ہیں جی۔ اصل تو سارا ادا کر دیا سی پرنتو بیاج بھی تو کوئی بھرے گا جی۔

نرمل: تو بیاج آپ معاف کر دیجئے نا۔ آپ لکھ پتی آدمی ہیں۔ آپ کے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔

ولی چند: یہ کیسی بات کرتے ہو۔ ہم بیاج معاف کرنے لگیں تو پھر کھائیں گے کیا جی۔

نرمل: میں اس کا بھی انتظام کر دوں گا۔ آپ کچھ نہیں جانتے۔ میں نے اس دنیا کو دیکھا اور برتا ہے۔ مجھے اب سے آدھ گھنٹہ کے اندر اندر مر جانا ہے اور آپ نے سنا ہوگا کہ مرنے سے پہلے آدمی کی آنکھ دنیا کے آنے والے واقعات پڑھ سکتی ہے۔ میں بھی اس وقت آپ کی قسمت کا لکھا آئینہ کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔

ولی چند: سچ۔

نرمل: ہاں اس لیے کہ میں اپنی موت کے لیے تیار ہوں۔ میں اس سے آنکھیں چار کر سکتا ہوں۔

ولی چند: تو پھر مجھے کچھ بتائیے مہاراج۔

نرمل: جو بتاتا ہے وہ کچھ نہیں جانتا۔ جو جانتا ہے وہ کچھ نہیں بتاتا۔

ولی چند: تو پھر، ہمیں کی فائدہ سی۔

نرمل: میں آپ کی قسمت میں روپیہ ہی روپیہ دیکھ رہا ہوں۔ مگر اس کے لیے راستہ کٹھن ہے۔

ولی چند: کٹھن ہے۔

نرمل: ہاں! مایا آپ کی تلاش میں ہے۔ ساکشات لکشمی آپ کے گھر کا راستہ ڈھونڈ رہی ہے مگر آپ کی لالسا نے اس کا راستہ روک لیا ہے۔

ولی چند: تو پھر۔

نرمل: مشکل کام ہے مگر میں اس کام کو پورا کرسکتا ہوں۔ آپ کے مکان کے بہت پاس ایک ایسی جگہ ہے جہاں دولت گڑی ہوئی ہے۔ ہر رات کو دو بجے کے قریب اس دولت کے اوپر بیٹھا ہوا سانپ دولت پانے والے کو آواز دیتا ہے اور ہر رات کو تھک کر واپس لوٹ جاتا ہے۔

ولی چند: اندازسے بھلا کتنی دولت ہوگی۔

نرمل: لاکھوں میں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

ولی چند: سچی۔

نرمل: مجھے اس جگہ کا پورا پورا پتہ نشان معلوم ہے مگر وہ ایسے سیٹھ کے ہاتھ آسکتی ہے جو دیالو ہو۔

ولی چند: یہ تو بڑی کٹھنائی بھئی۔

نرمل: گردھاری لال کا قرضہ معاف کر دیجئے تو میں آپ کو اس کا پتہ بتاتا ہوں۔

ولی چند: تو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ گردھاری لال کا قرضہ میں دوں گا۔

ولی چند: تو پھر لکھ دو تحریر۔

نرمل: ہاں۔ اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں گردھاری لال کا سارا قرضہ اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ اب آپ کا ایک پیسہ بھی گردھاری لال کے ذمہ باقی نہیں رہا ٹھیک ہے نا۔

ولی چند: ہاں بالکل ٹھیک ہے اور یدی مایا نہ نکلی تو۔

نرمل: میرا گیان دھیان کبھی غلط نہیں نکلتا۔ مایا نکلے گی۔ جایئے جا کر اپنے مکان کے سامنے والے میدان کا دکھنی کنارہ کھود دیجئے۔ جایئے! دیر نہ کیجئے مایا آپ کا انتظار کر رہی ہے۔

ولی چند: اچھا تو میں چلوں تنک، گردھاری لال سے کہہ دیجئے گا کہ مجھ سے مل لیں۔

نرمل: اب ان کے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں۔آپ کا قرض دار میں ہوں۔گردھاری لال نہیں ہے۔اگر مایا نہ ملے تو میں رقم ادا کروں گا۔مل جائے تو قرضہ بے باق۔

ولی چند: یہ ٹھیک سی۔

نرمل: اچھا نمسکار۔

ولی چند: نمسکار۔

نرمل: (ہنستا ہے) پاگل کتے ہڈی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور اسے زندگی سمجھتے ہیں (ہنستا ہے) ہر ایک پرچھائیں کو چھونا چاہتا ہے۔اور اسے مسرت کہتا ہے۔انسان تو قدرت کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔

نرملا: معاف کیجئے گا۔ے انمبر کا بس اسٹاپ یہی ہے۔

نرمل: جی ہاں۔

نرملا: کیا بس بہت دیر میں آتی ہے۔ مجھے بہت جلدی ہے کیا یہاں کوئی اور سواری نہیں مل سکتی۔

نرمل: نہیں۔اس وقت یہاں اور کوئی سواری نہیں ملے گی آپ اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہیں۔

نرملا: کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔گرمی بہت زیادہ ہے۔ یہاں ٹیکسی اسٹینڈ بھی نہیں ہے کہیں؟

نرمل: نہیں۔ یہاں کے لوگ شارٹ کٹ پر یقین نہیں کرتے۔ یہاں سب کام سیدھے سادے راستوں سے ہوتے ہیں۔بے ایمانی بھی اور ایمانداری بھی۔

نرملا: آپ شاعر ہیں۔

نرمل: نہیں فقط انسان ہوں اور وہ بھی پتہ نہیں کب تک۔

نرملا: میں پریشانی میں ہوں۔آپ میری مدد کیجئے۔

نرمل: کیا پریشانی ہے آپ کو۔ ویسے میں اتنا پریشان رہ چکا ہوں کہ مجھے دوسروں کی پریشانیوں میں مزہ آنے لگا ہے۔

نرملا: بھگوان کے لیے مجھ سے انکار نہ کیجئے۔اس بچے کو گود میں لے۔

نرمل: جی بچے کو گود میں لے لوں۔

نرملا: جی ہاں! بچہ کس آرام سے سو رہا ہے۔

نرمل: لائیے۔مجھے دے دیجئے۔

نرملا: وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔وہ مجھ سے پوچھتے ہیں اس بچے کا باپ کون ہے۔انھوں نے میری نیند حرام کر دی ہے۔میں ہسپتال سے بھاگ آئی ہوں۔

نرمل: اچھا اوہو۔یہ بات ہے۔اور تمھارے پتا جی!

نرملا: پتا جی نے مجھے گھر سے نکال دیا۔عزیز رشتے دار، سب مجھے کلموہی کلنکنی کہتے ہیں۔آپ ہی کہیے سچ مچ میں نے پاپ کیا ہے؟

نرمل: اس بچے کو دیکھو کیسا پھول ایسا خوبصورت ہے۔کیا پاپ اتنا سندر ہوتا ہے۔

نرملا: (روتے ہوئے) میں لٹ گئی، برباد ہو گئی، برباد ہو گئی۔میں نہیں جانتی کہاں جاؤں۔ بھگوان مجھے موت بھی نہیں دیتا۔میرا کوئی سہارا نہیں۔

نرمل: زندگی کے تجربات بڑے ستم ظریف ہیں۔کسی کو پاگل، کسی کو مسخرا، کسی کو صرف تماشا بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ہم میں سے ہر ایک تماشا بھی ہے، تماشائی بھی۔

نرملا: یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔وہ آئیں گے وہ آپ سے پوچھیں گے اس بچے کا باپ کون ہے۔

نرمل: تو کیا مجھے سچ بولنے کی اجازت ہے۔

نرملا: سچ میرے بھگوان! کیا آپ مجھے دھوکہ دے کر چلے جائیں گے۔

نرمل: ہاں سچ تو یہی ہے کہ میں اس بچے کا باپ نہیں ہوں بلکہ اس بچے کے باپ کو جانتا بھی نہیں۔مگر اتنی بات جانتا ہوں کہ تم پاپن نہیں ہو۔مجھے نہیں معلوم پاپ کیا ہے۔بدی کسے کہتے ہیں۔کیا من کی بات ماننا پاپ ہے۔

نرملا: ایشور کرے جلدی سے بس آجائے۔

نرمل: ڈرو مت۔مجھے ڈرپوک آدمیوں سے نفرت ہے۔

نرملا: مگر بس آ بھی جائے تو بے کار ہے۔ میں کہاں جاؤں گی۔ جہاں جاؤں گی وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔

نرمل: ایسی باتیں مت کرو۔

نرملا: میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ کہاں جاؤں گی۔ اس بھری دنیا میں میں اکیلی ہوں۔

نرمل: یہاں، سب اکیلے ہیں۔

نرملا: میرا بچہ کس کے سہارے جئے گا۔ اس کا کیا ہوگا؟

نرمل: میں نے کہا نا ایسی باتیں مت کرو۔ کیا تم میرے اندر پھر زندگی کی خواہش کو جگانا چاہتی ہو۔

نرملا: آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟

نرمل: ہاں تم سے کہا آنسو پونچھ ڈالو۔

نرملا: میرا دل بہت دُکھی ہے بابو۔

نرملا: مجھے بابو مت کہو۔ میرا نام نرمل ہے۔

نرملا: میں سچ مچ بہت دکھی ہوں۔ اس پتھروں کے شہر میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو میری مدد کر سکے۔ سب کی نظریں مجھے اس طرح گھورتی ہیں جیسے مجھے کھالیں گی۔ نگل لیں گی۔ کیا یہاں انسانوں کی کوئی بستی نہیں ہے۔

نرمل: کبھی تھی، مگر اب وہ سب پتھر ہو گئے ہیں۔

نرملا: (سسکنے لگتی ہے)

نرمل: روؤ نہیں۔ میں تمھاری مدد کر سکتا تو ضرور کرتا۔ میں تمھارا درد بانٹ لیتا۔ مگر میرے پاس بہت کم وقت ہے۔

نرملا: کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ لو وہ آگئے۔

نرملا کا باپ: (ہانپتے کانپتے ہوئے) یہ کون ہے؟

نرمل: آپ کس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

نرملا کا باپ: اس بچے کا باپ کون ہے؟ میں اس کا سر توڑ دوں گا جس نے ہمارے خاندان کی عزت

پر بٹہ لگا دیا۔ جس نے اس بھولی بھالی لڑکی کو دھوکا دے کر اپنے پاپ کا پھل اس کے سر
تھوپ دیا۔ میں اس کا خون پی لوں گا۔

نرملا: پتا جی!

نرمل: کہنے دو انھیں۔ بزرگوں کے کہنے کا بُرا نہیں مانتے۔ پتا جی۔

نرملا کا باپ: خبر دار جو مجھے پتا جی کہا۔ تجھے شرم نہیں آتی پاپی۔

نرمل: اس بچے کی طرف دیکھئے۔ کیا پاپ اتنا سندر ہو سکتا ہے!

نرملا کا باپ: میں بچے کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں صرف تیرے پاپ کو دیکھتا ہوں میں تجھے اس پاپ کا
مزہ چکھانے آیا ہوں۔

نرمل: یہاں سڑک پر؟

نرملا کا باپ: تو نے بھی تو ہماری عزت سڑک پر نیلام کی ہے۔ ہم آج تیری آبرو مٹی میں
ملا دیں گے۔ پھر کسی کو ایسا پاپ کرنے کی ہمت نہیں ہو گی۔

نرمل: (شانتی سے) ایک بات پہلے سمجھ لیجئے۔ میں اسے اپنی دھرم پتنی بنانے کو تیار ہوں۔ یہ
بچہ میرا بچہ ہے۔ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر ہو گا۔ جس کے کچے آنگن میں یہ بچہ پل کر بڑا
ہو گا لیکن اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو سمجھ لیجئے۔ جاپانی کشتی جو جت
سو کے پینترے مجھے یاد ہیں کہ آپ ابھی زمین پر اُلٹے پڑے نظر آئیں گے۔

نرملا باپ: دھمکی دیتا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔

نرملا: پتا جی اب جانے دیجئے۔ غصہ تھوک دیجئے۔ یہ اپنی غلطی مان رہے ہیں۔

نرملا کا باپ: تو چپ رہ کلموہی۔ تیری وجہ سے ہمارا منہ پہ کالک پُتی۔ تو ہی بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی
ہے۔

نرملا: آپ ان پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ یہ پاپی نہیں دھرماتما ہیں۔

نرملا کا باپ: دھرماتما (طنزیہ ہنسی) میں ابھی اس دھرماتما کی مرمت کرتا ہوں۔ دھرماتما دیکھتے کیا
ہو پکڑ لو اسے۔

نرملا: میں ہرگز ان پر ہاتھ نہیں اٹھانے دوں گی۔ میں جان دے دوں گی۔ پتا جی آپ کو بچے کا

واسطہ۔

(بچہ رونے لگتا ہے۔ ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے)

نرمل: خبردار جو آپ آگے بڑھے۔ میں آخری بات آپ کو ہوشیار کرتا ہوں۔

نرملا کا باپ: ایسی تیسی تیری ہوشیاری کی۔ تو نے سمجھا کیا ہے؟

نرملا: پتا جی! انھیں چھوڑ دیجئے۔

نرملا کا باپ: (لپٹ جاتا ہے) خون پی کر چھوڑوں گا۔ دوسروں کی عزت پہ ہاتھ ڈالتے تجھے غیرت نہیں آئی۔

نرمل: جو جت سو کا ہاتھ سنبھالو۔

نرملا کا باپ: ہائے۔ (گر پڑتا ہے)

گردھاری: یار نل کا پانی پی تو لیا پر اچھا نہیں کیا۔ اور بس بھی آ کر نکل گئی ہو گی۔

مولانا: کنوئیں پر جاؤ پانی پیو گے تو یہی انجام ہو گا۔

گردھاری: اُبلا ہوا پانی مل جاتا تو اچھا تھا۔

مولانا: اماں لعنت بھیجو اخبار والوں پر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ زندگی اُبلا ہوا پانی پیتے پیتے گزر جائے۔

گردھاری: مگر مولانا۔

مولانا: اگر مگر کیا ہوتی ہے۔ خدا کے فضل سے چونچال بلکہ کیا کہتے ہیں ہٹے کٹے رہو گے کیا بیکار کے شک شبہے دل میں لاتے ہو۔ کنوئیں سے نکال کر وہ ڈگ ڈگا کے پانی پیا کہ واللہ مزا آ گیا۔ بڑے زور کی پیاس لگی ہوئی تھی۔

گردھاری: ہم تو صاحب اب کبھی بے اُبلا پانی نہ پئیں گے یہ بڑا خطرہ مول لینا ہے اور اُبلنے میں لگتا ہی کیا ہے۔ دمڑی کی لکڑی ہی کا تو خرچہ ہے۔ کب تک اُبلا پانی پینا ہو گا ہے رام۔

مولانا: ماشاءاللہ اب ہم ہندوستانی بھی خاصے لامذہب ہوتے جا رہے ہیں۔ آج پانی اُبال کر پینے لگے ہیں۔ کل حکم ہو گا کہ ہوا کو بھی چھان کر استعمال کرو۔ یعنی جو ہمارے پُرکھے دندناتے ہوئے زندگی گزار گئے۔ تو صاحب کیا یہ سب اُبلا ہوا پانی پیتے تھے کہ سو سو سوا سو

برس کی عمریں پائیں اور قوت کا یہ حال کہ زمین پر ٹھوکر ماریں تو خدا کی قسم پانی نکل آئے۔ مجھے اب کوئی بتادے کہ انھیں کنوئیں کے پانی نے کیا نقصان کیا جو ہمیں کرے گا۔

گردھاری: آپ بیکار کی بات کر رہے ہیں مولانا۔ ہمیں آگاہی دی گئی ہے کہ پانی اُبال کر پئیں تو ہماری ذمہ داری ہے۔

مولانا: اجی ہم نہیں جانتے ذمہ داری سب بکواس ہے۔ میاں آگاہی تو ہمیں یہ بھی دی گئی ہے کہ شیطان ہمارا دشمن ہے، آرزو شیطان کی خالہ ہے مگر سارے پیر پیغمبر، پولیس، فوج، مُلّا، برہمن، قانون، عدالتیں کوئی بھی آدمی کو آرزو کے چُنگل سے بچا پاتا ہے۔ ہمیں بھیا سیدھے سادے جینے میں مزا آتا ہے۔

گردھاری: جلدی قدم بڑھاؤ۔ پتہ نہیں بس آگئی ہے کہ نہیں۔

مولانا: اجی تمھیں بس کی پڑی ہوئی ہے۔ مجھے اس سرپھرے لونڈے کی فکر ہے کہیں سچ مچ وہ قطب مینار سے پھاند نہ پڑا ہو۔

گردھاری: اجی نہیں مولانا۔ جان دینا ایسا کوئی سہل ہے ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہیے۔

مولانا: تم نے ناپا ہے اس کا کلیجہ۔ بے ڈھب لونڈا ہے لالہ جی! یہ آج کل کی نسل ہماری تمھاری طرح نہیں ہے۔ ان کی کھوپڑی میں اوّل تو کچھ بات آتی نہیں ہے اور جو گھس جاوے ہے تو پھر نکلنا مشکل ہی ہے۔

گردھاری: تو چلئے ذرا قدم بڑھاتے ہوئے چلئے۔

(لڑائی کا شور شغب سنائی دیتا ہے)

مولانا: ارے غضب یہ کیا قصہ ہے۔ ارے بھائیو ٹھہرو! رکو، ذرا دم لو۔ اس ایک بے گناہ پر کیوں ٹوٹ پڑے ہو۔

گردھاری: کیا قصہ ہے؟

نرملا کا باپ: قصہ کیا ہے میں اس کا آج سارا حساب چکا کر دم لوں گا۔

گردھاری: الگ ہٹ جایئے۔

نرملا کا باپ: نہیں۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال مجھے الگ ہٹاتا ہے۔

مولانا: گردھاری آؤ ہم دونوں پکڑ کر انھیں ایک طرف ہٹا دیں۔

گردھاری: خبردار جو ہاتھ اٹھایا ٹھاکر صاحب۔ لو بس اب شانت ہو جائیے۔

مولانا: بتائیے تو قصہ کیا ہے۔ بیٹی تم بھی ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ بچہ بے طرح روتا ہے۔ اسے دودھ دے دو۔

نرملا: ان کی تو خیر خبر لیجئے۔

مولانا: تم فکر مت کرو۔ ہم سب ٹھیک کرلیں گے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے پیچھے بہت کچھ ہو گزرا۔

گردھاری: بس تو نہیں آئی تھی۔

نرملا: نہیں۔ ابھی بس نہیں آئی۔

مولانا: برخوردار آخر بتاؤ تو سہی قصہ کیا ہے؟

نرمل: کچھ نہیں مولانا ساری ذمہ داری، سارا قصور میرا ہے۔ مجھ سے کسی کو بے آسرا نہیں دیکھا جاتا مولانا۔ ایک بے آسرا عورت نے پھر میرے دل میں جینے کی امنگ پیدا کردی۔ یہ میری بیوی ہے اور یہ میرا بچہ ہے۔

نرملا کا باپ: جھوٹا ہے یہ۔ اس نے میری بچی کو دھوکہ دیا ہے۔

گردھاری: آپ ٹھہر جائیے۔ جھوٹ سچ کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔

نرمل: میرے دل میں پھر اُمنگ جاگی کہ اس بے آسرا عورت کو پناہ دوں۔ میرا بھی ایک گھر ہو۔ میرا بھی ایک کچا آنگن ہو۔ میری بھی زندگی کا ایک مقصد ہو۔ میرا پھر زندہ رہنے کو جی چاہنے لگا۔ میں زندہ رہوں گا۔

مولانا: تم سچ کہہ رہے ہو نرمل۔

نرمل: ہاں۔ سچ اب ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔

نرملا کا باپ: یہ انیائے رہتی دنیا تک نہیں ہوگا۔ نرملا ابھی میرے ساتھ جائے گی۔

گردھاری: بس آنے والی ہے مولانا۔ بس آرہی ہے۔

مولانا: اس دفعہ خالی معلوم ہوتی ہے۔ اس دفعہ یہاں ضرور رُکے گی۔

نرملا کا باپ: جائے گی کیسے نہیں۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔

نرملا: میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔

نرملا: مجھے مجبور نہ کرو پتا جی۔ تم مجھے اپنے گھر سے نکال چکے تو پھر میرے راستے میں کیوں آتے ہو۔ میں نرمل کے ساتھ جاؤں گی۔

نرملا کا باپ: خبردار! اس کا نام نہ لینا۔

نرمل: مولانا یہ لو تمھاری رسید۔

مولانا: یہ کیا؟

نرمل: ملک الموت سے رہائی۔ تمھارا مالک مکان سال بھر کے کرائے کی وصولی کی رسید دے گیا ہے۔

مولانا: سچ!

نرمل: اب تم آرام سے معمّے کا آخری اشارہ حل کر سکتے ہو۔

مولانا: یہ تو معجزہ کر دکھایا استاد تم نے۔ مان گئے۔ قسم خدا کی۔ حد ہو گئی۔

نرمل: گردھاری، یہ تمھارے قرضے کی بے باقی کی تحریر۔

گردھاری: کیا وہ کمبخت یہاں بھی آمرا تھا۔

نرمل: ہاں، اور اس نے تمھارا سارا قرضہ بے باق کر دیا اب تم دونوں نمبر ۷ا بس میں سوار ہو سکتے ہو۔

(بس آہستہ آہستہ آتی ہے اور تھوڑی دیر کے لیے رک جاتی ہے)

نرملا کا باپ: نرملا پاگل ہو گئی ہے۔ اس فریبی کے ساتھ جائے گی؟

نرملا: ہاں میں انھیں کے ساتھ جاؤں گی۔

نرملا کا باپ: ہاں۔ اچھا۔ تو میں بچے کو لئے جاتا ہوں۔

(نرملا اور اس کے باپ میں کشمکش — بچے کی رونے کی آواز)

نرملا: ایسا نہ کرو پتا جی! ایسا نہ کرو پتا جی!!

نرملا کا باپ: (بچے کو لے کر) بچہ میں نے لے لیا اب جا تو جہاں تیرا جی چاہے۔

نرملا: (روتے ہوئے) نہیں پتاجی! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ میں چلتی ہوں۔

(بس چلتی ہے)

نرمل: نرملا۔ نرملا۔ کنڈکٹر۔ کنڈکٹر بس روکو۔ روکو۔

(بس چلتی رہتی ہے)

نرملا: نرمل نرمل (خوفزدہ آوازیں) ٹرک، ٹرک، بچو، بچو۔

نرمل: (بھاگتے ہوئے) روکو، روکو۔

(تصادم کی آواز)

(نرملا کی چیخ) بس ایک ساتھ جھٹکے سے رُکتی ہے۔

گردھاری: نرمل ٹرک کے نیچے آگیا۔

دوسری آواز: بھیجا پاش پاش ہوگیا۔ او بھگوان دیکھا نہیں جاتا۔

تیسری آواز: زمین خون سے رنگ گئی۔

(نرملا کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے)

مولانا: دیکھتے کیا ہو؟ چہرے پر چادر ڈھک دو! آج ایک بڑا آدمی گیا!!! ایک عظیم انسان!!

☆☆☆

تماشا اور تماشائی

(غالبؔ کی غزلوں کے مختلف ٹکڑے گاتے ہوئے مختلف لوگ اسٹیج سے گزرتے ہیں ان میں کوئی ٹکڑا کتھک کے رقص کا ہے تو کوئی فلمی موسیقی کا۔ کوئی قوالی کا ہے تو کوئی کسی ڈرامے کا)

(دروازے پر دستک۔ غالب دروازے کے قریب جاتے ہیں۔ غالب دروازہ کھولنے لگتے ہیں)

مرزا: (اسٹیج کے بازو سے آواز دیتے ہیں، نظر نہیں آتے) دروازہ مت کھولو۔

غالب: آخر کیوں؟ دیکھتا ہوں کون لوگ ہیں؟

مرزا: (آواز) مجھے معلوم ہے۔ (دستک پھر ہوتی ہے)

غالب: تو بتاتے کیوں نہیں؟ یہ سلسلہ کیا ہے؟

مرزا: (آواز) یہ لوگ برسی منا رہے ہیں۔

غالب: (پھر دروازے کی طرف بڑھتا ہے) تو پھر کیا حرج ہے؟

مرزا: (Entry) پھر ٹوک لیتے ہیں) پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ کس کی برسی منا رہے ہیں میری یا تمھاری؟

غالب: ظاہر ہے برسی غالب کی منائی جارہی ہے شاعر غالب کی۔

مرزا: نہیں۔ برسی مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ کی ہے، ۱۰۵ سال پہلے میری موت ہوئی تھی۔

غالب: تم سے کسی کو کیا دلچسپی ہے۔ تم تو محض ایک امیر زادے تھے۔

مرزا: اور تم؟

غالب: میں شاعر غالب۔ میرا ایک ایک شعر آج بھی زندہ ہے۔

مرزا: کس کی بدولت؟ میری اور صرف میری۔

غالب: یہ جھوٹ ہے۔ شاعر امیر زادے کے محتاج نہیں۔ تم فقط میرا جسم تھے۔ میری روح میری شاعری تھی۔

مرزا: مت بھولو، میں نے تمھیں نام دیا، ہستی دی، ہنستے ہوئے ہونٹ، روتی ہوئی آنکھیں دیں۔ ترستا ہوا دل اور آسمانوں سے بھی زیادہ بلند پرواز کرنے والا دماغ دیا۔

غالب: سارے امیر زادے اسی طرح بڑے بول بولا کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے مرزا نوشہ مرے تم تھے زندگی بھر مرے، کبھی کسی کو مار رکھا، کبھی خود مر گئے۔

مرزا: تمھاری قسمت میں موت کہاں؟

غالب: میں بے چارا اپنا آپ تماشائی تھا، لے دے کے زندگی میں کوئی آرزو کی بھی تو صرف اتنی
ع: دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مرزا: گویا میرے بغیر تمھاری ہستی، تمھاری حسرتیں اور ارمان تمھاری شاعری باقی رہتی۔

غالب: نہیں، لیکن تمھارے گناہ میرے نام کیوں لکھے جائیں۔

مرزا: ٹھیک کہتے ہو، لوگ آج کل میرے پیچھے پڑے ہیں۔ مرزا نوشہ کہاں پیدا ہوا اس نے اپنے سالے کی موت پر خوشی کا کیوں اظہار کیا۔ اس مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا قصیدہ کیوں لکھا۔ انگریزوں کی مدح سرائی کیوں کی۔ اس نے اپنے دوست صدر الدین آزردہ کی بیوی کی پنشن رکوا کر نواب رام پور سے اپنے لیے پنشن حاصل کرنے کی کوشش کیوں کی؟

غالب: یہی نہیں اور سنو۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا:

''غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو دیکھ نہ سکتا۔ تنگ دل ایسا کہ سارے بھائی بندوں کا حق مارنے میں اس کو عار نہ تھا۔ ذوقؔ مر گیا تو خوش ہو کر کہتا تھا۔ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرا۔ شرابی ایسا کہ کہا کرتا تھا صہبائیؔ شعر کہنا کیا جانے، نہ اس نے شراب پی، نہ معشوقوں کے

ہاتھ سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا۔ لالچی ایسا کہ ایک ایسا قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا۔

مرزا: (دروازے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور دستک ہونے پر بھی غالب کو دروازہ کھولنے نہیں دیتا) نہیں دروازہ مت کھولو۔ پہلے یہ طے ہو جائے کہ وہ کس کی برسی منانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرزا نوشہ خودغرض تھا۔ لالچی تھا۔ تنگ دل تھا۔

غالب: کیا غلط کہتے ہیں۔

مرزا: لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے۔ ع: یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب: گھر، میرا کوئی گھر نہیں۔

مرزا: نہیں، غالب بھولتے ہو۔ غالب کے نام سے پہچانے جانے سے پہلے صرف میں تھا مرزا اسد اللہ بیگ اور میں نے آگرے میں آنکھیں کھولی ہیں۔ ۱۷۹۸ء کا آگرہ۔ یہاں نظیر اکبرآبادی کے 'شہر آشوب' کا آگرہ۔ جہاں میری خاندانی حویلی تھی۔ اور دیوان خانے میں راجہ بنسی دھر کے ساتھ شطرنج کی بازی جمتی تھی۔

Flash Back I

بنسی: چال چلو مرزا۔

مرزا: چلتا ہوں بنسی دھر۔

بنسی: جی ہاں شطرنج ہے، بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

مرزا: ہمارے لیے تو بچوں کا کھیل ہی ہے۔ لیجیے فرزیں تو گیا۔

بنسی: میاں صاحبزادے ہوا بھی، کچھ خاندان کی پرانی رسم وراہ کا پاس کرتا ہوں۔ ورنہ مات پلا پلا کر نوشیرواں بنا دیتا۔ سوچتا ہوں تمھارے نانا ہمارے نانا ایک ساتھ فوج میں نوکر ہوئے۔ ایک ساتھ نوکری چھوڑی، ایک ساتھ زندگی گزاری، اگر دو چار مات پلا دی تو کہو گے کہ پشتوں پرانی دوستی کا پاس نہ کیا۔

مرزا: واہ — واہ — میاں بنسی دھر کیا کہنے ہیں عمر میں مجھ سے دو ایک برس بڑے یا چھوٹے ہی ہو گے باتیں کرتے ہو تو نانا دادا سے کم نوالہ نہیں توڑتے۔

بنسی: خیر جی مرزا۔ یہ بازی تمھیں اٹھالو۔ مات ہمیں مانے لیتے ہیں اچھا چلو دوسری بازی لگاتے ہیں۔

مرزا: بس جناب۔ دوسری بازی نہیں۔ آج بلوان سنگھ سے پتنگ کے پیچ لڑانا ہے۔

بنسی: کون؟ راجہ بلوان سنگھ وہی گدڑیوں کے کٹڑے والا وہ بھی عمر بھر بچہ رہے گا اور تمھارا بھی یہی حال ہے۔

مرزا: جی بس شطرنج کے سوا تو سارے کھیل گویا لڑکپن ٹھہرے تم بھی ذرا پیچ لڑاؤ تو جانیں۔

بنسی: اماں توبہ کرو۔ میری سنو تو لعنت بھیجو پتنگ بازی پر۔ راجہ بلاس رائے کی حویلی میں مشاعرہ ہے چلے چلتے ہیں۔ بھئی میری تو جان جاتی ہے۔ ان مشاعروں پر۔ اکبر آباد کے شاعر ایران کے شاعروں کو شرماتے ہیں اور اپنے میاں نظیر کا کلام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

مرزا: کہو گے خودستائی کر رہا ہے۔ بخدا دو چار شعر تو ریختے میں ہم نے بھی کہنے شروع کر دیے ہیں۔

بنسی: سچ۔

مرزا: پتنگ پر ایک قطعہ لکھا ہے۔ بخدا داد دینے میں کنجوسی نہ کرنا۔ عرض کیا ہے۔

ایک مثل دن پتنگ کاغذی
لے گے دل سر رشتہ آزادگی

خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا

میں کہا اے دل ہوائے دل براں
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں

دل یہ سن کر کانپ کر کہا پیچ و تاب
غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

(شعر کے بیچ ہی میں بول اٹھتے ہیں)

غالب: یہی لمحہ میری پیدائش کا تھا مرزا نوشہ سے غالب بننے کا لمحہ جب پہلی بار شاعر بیدار ہوا تھا۔

مرزا: مگراس لمحے کی سالگرہ کوئی نہیں مناتا۔ میری برسی سب مناتے ہیں۔

غالب: شاید اس کی ضرورت بھی نہیں۔ شمع روشنی دیتی ہے اور جل بجھتی ہے اس کی سالگرہ کون مناتا ہے۔

مرزا: احسان فراموش ہو۔

غالب: میں

مرزا: ہاں تم، میرا احسان نہیں مانتے کہ غالب کے لیے مرزا نوشہ نے کیا کیا نہیں کیا، ذلتیں سہیں، ہر کس و ناکس کے آگے دامن پسارا، خوشامدیں کیں، دست طلب دراز کیا، اپنوں کو اپنا نہیں سمجھا، تاکہ شاعر غالب کو فرصت کا ایک سانس میسر آجائے، تم فکر سخن کے لیے ذرا سی آسودگی پاسکو۔

غالب: آسودگی اور چین اور تم سے؟ تم نے مجھے زندگی بھر بے قرار رکھا۔ وہ دن یاد نہیں تمھیں۔

مرزا: کون سا دن۔

غالب: جب مدتوں بعد میرے بچپن کا یار بنسی دھر گلی قاسم جان کے چوراہے پر پتہ پوچھتے پوچھتے میرے گھر پہنچا تھا۔

Flash Back II

(گلی قاسم جان کے قریب ایک چوراہہ، رات کا وقت مشعلیں روشن ہیں، بنسی دھر کی عمر اب ۳۵۔۳۰ برس کی ہے۔ غالب ان سے پانچ سات سال بڑے ہیں۔ داستان گو داستان سنا رہا ہے)

داستان گو: جب شہر کے دروازے پر آیا ایک نعرہ لگایا قفل کو تبر سے توڑا اور نگہبانوں کو ڈپٹ کر للکارا کہ اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خاں ملکہ مہر نگار اور شہزادہ کامگار کو جو تمھارا داماند ہے، ہانکے پکارے لیے جاتا ہے اگر مردی کا کچھ نشہ ہے تو باہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو۔ یہ نہ کہیو کہ چپ چاپ لے گیا نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو۔

(چاوش اور چوب دار اور کچھ سپاہی آگے آگے دوڑے آتے ہیں۔ برقندازوں کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں۔ "ہٹو بچو۔ دور باش فرنگی ریزیڈنٹ بہادر کی

سواری آتی ہے۔'' کئی آوازیں لگاتے ہیں۔ بگھی گزرنے کی آواز آتی ہے۔
داستان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے)

مجمع میں سے ایک مولانا: صاحبو! ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ فرنگی نے جو شقلہ اٹھایا ہے اور اقلیم میں جو غضب ڈھایا ہے آپ حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ دن رات نہ جانے کتنے ہندو مسلمان بے دین ہو رہے ہیں۔ مدرسے تباہ، خانقاہیں ویران، دہلی کالج میں علم دین کی جگہ گٹ پٹ سکھائی جا رہی ہے۔

بنسی دھر: (ایک تماشائی سے) مجھے نواب اسد اللہ بیگ کا مکان پوچھنا ہے۔

ایک اور تماشائی: اماں یہ اسعد اللہ بیگ کون ہوئے۔

داستان گو: اماں وہی مرزا الٰہی بخش معروف کے داماد اسد اللہ خاں۔ گلی میں سیدھے جا کر الٹے ہاتھ مڑ جانا، وہیں سب پتہ ونشان معلوم ہو جائے گا۔ وہی تو ہیں جن کا ایک بھائی یوسف مرزا پاگل ہو گیا ہے۔ آگرے سے دہلی آئے ہیں۔ (دہلی کے لفظ پر مجمع سے اچانک یوسف مرزا اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

یوسف مرزا: دلی مرگئی، مرگئی دلی۔ اب صرف میرا بھائی اسد اللہ دلی ہے۔ تم سب باطل ہو۔ کاغذی تصویرو، زمانہ تم سب کو مٹا ڈالے گا (بنسی دھر کو شاید پہچان کر ان کو کندھوں سے پکڑ لیتا ہے) تم کون ہو؟

بنسی: میرا نام بنسی دھر ہے۔

یوسف مرزا: پھر تمھاری بنسی کہاں ہے؟ برادرم، یہ دلی ہے۔ دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب۔ یہاں دن رات کٹھ پتلی کا تماشہ ہوتا ہے۔ سب ناچتے ہیں۔ لال قلعہ بھی ناچتا ہے اس کے اندر بیٹھا ہوا عالم پناہ بھی ناچتا ہے فرنگی فرنگن بھی ناچتے ہیں۔ کون نچاتا ہے؟ خاموش یہ مت پوچھو۔ آؤ ہم تم بھی ناچیں (اتنے میں چوبدار یوسف مرزا کو تلاش کرتے ہوئے نکل آتے ہیں۔

چوبدار: چھوٹے مرزا، چھوٹے مرزا چلئے گھر چلئے۔

یوسف مرزا: ہمیں چھوڑ دو۔ ہم جا رہے ہیں۔ (چلے جاتے ہیں)

بنسی دھر: مجھے پہچانا؟

چوبدار: پہچانا کیوں نہیں۔ ناظر صاحب نواب اسد اللہ خاں کی حویلی پر عمر گزری ہے۔ آپ اکبر آباد سے کب آئے؟

بنسی دھر: اسد اللہ کہاں ہیں؟

چوبدار: لمبی کہانی ہے۔ سب بتاؤں گا۔ دو پہر رات گئی۔ انگریزی عملداری ہے۔ دلی کی حالت خراب ہے، گھر چلیے۔

بنسی: میں اس طرح گھر نہیں جانے کا۔ مجھے بتاؤ اسد اللہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟

چوبدار: کیا عرض کروں بندہ پرور، دلی اس خاندان کو راس نہ آئی۔ پورا خاندان تباہی میں آ گیا۔ سوچا تو یہ تھا کہ مرزا نوشہ رسالداری پائیں گے شادی کے بعد آل اولاد کا سکھ ملے گا تو باپ اور چچا کا غم بھی جی سے ڈھل جائے گا۔

بنسی: کیا ہوا جلد بیان کرو۔ مرزا نوشہ خیریت سے تو ہیں؟

چوبدار: پہلے سرکار فرنگی سے حکم ہوا، دس ہزار سالانہ مرحوم رسالدار نصر اللہ بیگ کے عزیزوں کو ملا کرے۔ پھر حکم ہوا فقط پانچ ہزار سالانہ ملے اور اس میں سب وارث شریک ہوں۔ اتنا بڑا خاندان اور اتنی تھوڑی رقم کیسے پورا ہوتا۔ پھر ایک نہیں دو نہیں، سات اولادیں ہوئیں مگر کوئی ڈیڑھ سال سے زیادہ نہ جیا۔ بہو بیگم کیا کیا تڑپی ہیں کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ پھر چھوٹے بھائی نواب یوسف مرزا کی شادی ہوئی مگر سکھ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ بچارے مصیبتیں جھیلتے جھیلتے پاگل ہو گئے۔

بنسی: اور مرزا نوشہ کیسے ہیں؟

چوبدار: نہ پوچھو سرکار۔ شاعری ہے اور وہ ہیں۔ مشاعرے پڑھتے ہیں، غزلیں کہتے ہیں گلی گلی کوچے کوچے شاعر مشہور ہیں اور بس۔ اب کیا کہوں۔ آخر سرکار کا پرانا نمک خوار ہوں۔

بنسی: کہو تمھیں قسم دیتا ہوں، مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔

چوبدار: دکھ سہا نہیں گیا ان سے۔ بس اب شراب منہ کو لگی ہے اور سنتا ہوں کہ ایک ڈومنی بچی پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ اب دیکھو دو پہر رات گئی ابھی واپس گھر نہیں پہنچے ہیں۔

(اسی اثنا میں غالب ہوادار میں سوار نشے کی حالت میں گنگناتے ہوئے گزرتے ہیں۔
کہاروں کے ہاتھ میں مشعلیں ہیں۔ غالب چوبدار کی آواز کو پہچان لیتے ہیں)

غالب: ہوادار یہیں رکھ دو۔ (چوبدار سے) اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو۔

چوبدار: ناظر بنسی دھر بھیا اکبرآباد سے آئے ہیں۔

غالب: بنسی دھر تم ہو تو پھر آؤ میرے ساتھ ہوادار میں بیٹھ جاؤ (کہاروں کو اشارہ کرتے ہیں۔ بنسی دھر بیٹھ جاتے ہیں)، بنسی دھر دلی لٹ گئی۔ اب یہاں مرزا نوشہ کا کلام سمجھنے والا کوئی نہیں۔ بڑے بڑے سخن سنج طرہ و دستار والے کہتے ہیں مرزا نوشہ مہمل بکتا ہے کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں کے میری دھڑکنیں سمجھے۔ میرے لفظوں کی تہہ تک پہنچے۔ میرے خون جگر کی تراوش پاوے۔ چلو گھر چلیں۔ تم بھی ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ میری جان انھیں سمجھنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ زندگی بڑی ظالم ہے دوست اور اس سے نکل بھاگنے کے لیے کوئی نہ کوئی پناہ، کوئی نہ کوئی چوردروازہ تو چاہیے:

کچھ تو دے اے فلک ناانصاف
آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

(Flash Back III)

(نسوانی آواز ابھرتی ہے)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

نووارد دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ گانا بند ہو جاتا ہے۔ آداب تسلیم کے بعد نووارد ایک دم ماں سے مخاطب ہو جاتا ہے اور لڑکی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

نووارد: میں کہتا ہوں اب انتہا ہو چکی۔ بات گھر سے نکلی کوٹھوں چڑھی۔ شہر میں بدنامی ہو رہی ہے۔ بچے بچے کی زبان پر تمھاری بیٹی اور مرزا نوشہ کے قصے ہیں۔ توبہ توبہ، اب میری بات مانو تو اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔

ماں: کیا کروں بیرن؟ کچھ بس نہیں چلتا، تم جانو پھوٹی آنکھ کا دیدہ ایک ہی تو بچی ہے، اس کا دل بھی نہیں توڑا جاتا۔ اِتی بڑی ہوگئی ہیں، میں نے کبھی جو اس کا جی میلا کیا ہو۔ اچھے سے اچھا کھلایا، اچھے سے اچھا پہنایا۔ کبھی اس کا کہا نہ ٹالا۔ اس بڑھاپے میں چونڈے میں کالکھ لگتی تھی۔

نووارد: ہر گھر میں ایسے قصے ہوجاتے ہیں بہن مگر آخر بزرگ کس دن کے لیے ہوتے ہیں۔ بچی ناسمجھ ہے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ذرا جبر کرنا پڑے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گی۔

ماں: اور جو میری چاند سی بیٹی کو کچھ ہوگیا؟

نووارد: بہن کیسی باتیں، ارے شادی بیاہ کے بعد ارمانوں میں لگ جائے گی۔ یاد بھی نہیں رہے گا کہ تھے کوئی مرزا نوشہ بھی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں تماشے دیکھ لیے اور پھر ذرا دل میں سوچو ڈومنی ذات ہمیشہ سے عزت دار، غیرت والی مشہور ہے۔ ہم کوئی نیچ ذات ہیں کہ جس نے چاہا ہاتھ ڈال دیا۔ یہ قصہ ہوگیا تو ہمیشہ کے لیے ڈومنی ذات بھی کسبی باجنے لگے گی۔

ماں: تم میری بٹیا کو نہیں جانتے۔ ہ بڑی ہٹیلی ہے وہ چاند کے لیے بھی مچلے گی تو اسے لے کر چھوڑے گی یا اپنا جی کھودے گی۔

نووارد: بالک ہٹ ہے مگر ہٹ کے آگے ہار گئیں تو سر پکڑ کر روؤ گی، بچی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ذرا سوچو مرزا نوشہ اچھے گھرانے کا نواب زادہ، جیب میں کوڑی نہیں، خرچ لمبا، بیوی ہے، گھر بار ہے، شاعری سے تو پیٹ پلتا نہیں۔ اول تو وہ گھر ڈالے گا کیسے اور گھر ڈال بھی لے تو یہ نبھنے والی بات نہیں۔ آخر اس کی بیوی بھی نواب الٰہی بخش کی بیٹی، نواب لوہارو کی بھتیجی ہے، ناک چنے چبوادے گی۔

ماں: میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نووارد: میرا کہا مانو تو اس جوکھم سے نکلو گی (جیب سے سونے کی مہریں نکال کر رکھتا ہے)، یہ دو توڑے سونے کے رکھ لو۔ بڑی قسمت والی ہے تمھاری بیٹی۔ کوتوال کی نظروں میں ایسی جچی ہے کہ نہ پوچھو، بولو منظور ہے؟ باقی میں نمٹ لوں گا۔ تم ایک ذرا حامی بھر لو، اور پھر

دیکھو چٹکی بجاتے ہی سب تصفیہ ہو جائے گا۔ شام ہوتے ہوتے منگنی کا جوڑا آ جائے گا۔

ماں: میں اتنی جلدی کیسے حامی بھروں (لڑکی سب کچھ سن لیتی ہے، غصے میں بھری ہوئی جالی تک آتی ہے)

لڑکی: اماں! ان سے کہیے یہاں سے چلے جائیں۔

ماں: بیٹی! تیرے ماموں ہیں، ان کی اس طرح توہین نہیں کرتے۔

لڑکی: میں کوئی کارچوب کی گڑیا نہیں ہوں کہ دو توڑے سونے میں بک جاؤں گی۔ یہ کون ہیں میرا مول لگانے والے، مجھے نیلام پر چڑھانے والے۔

نووارد: بیٹی! میری بات سنو۔ تمھاری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔

لڑکی: خبردار جو مجھے بیٹی کہا۔ میں آپ کے کوتوال صاحب کو تلوؤں سے مسل کر پھینک دوں ان سے کہہ دیجیے گا۔

نووارد: میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بڑھاپے نے کبھی جوانی سے قول نہیں ہارا۔ تم غصے میں ہو، جوش ٹھنڈا ہو جائے۔ ذرا معاملے پر غور کر لو، میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ سوچ لو، اچھی طرح سوچ لو۔

لڑکی: مجھے نہیں سوچنا۔ آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔

نووارد: (ہنستا ہے)، بچی نادان ہو۔ میں ان باتوں کا بُرا نہیں مانتا۔ سوچنے سے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ (چلا جاتا ہے)

لڑکی: (جالی کے دوسری طرف آ کر) یہ آپ کیا کھچڑی پکایا کرتی ہیں اماں؟ ہر وقت شادی، ہر وقت منگنی بیاہ۔ آپ کے نزدیک دنیا میں اس کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ آپ مجھے جان بوجھ کر کیوں تڑپاتی ہیں۔ (رونے لگتی ہے) جایئے میں آپ سے نہیں بولوں گی۔

ماں: (گلے لگا کر) بوڑھی ہو گئی ہوں، سٹھیا گئی ہوں بھول جاتی ہوں، تو کچھ خیال مت کیا کر۔

لڑکی: بہت بڑی بھول ہے اماں۔ تم نے سوچا یہ بات انھیں معلوم ہو گئی تو ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، شاعر کا دل ہے اماں۔ صدیوں میں ایسا انمول دل کسی کو ملتا ہے۔

دولت نہیں، حکومت نہیں، مشاعرے کی واہ واہ تک نہیں، شیشے سے زیادہ نازک اور ہیرے سے زیادہ انمول دل کو تم چاہتی ہو کہ میں بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔ یہ بہت بڑا پاپ ہے ماں۔

بنسی دھر: اس طرح بے اطلاع اندر چلا آیا، معاف کیجیے گا۔ مجھے دو باتیں کرنی ہیں۔ میرا نام بنسی دھر ہے۔ اکبرآباد سے آیا ہوں۔ مرزا نوشہ کا بچپن کا دوست ہوں۔

لڑکی: (بے قرار ہو کر جالی کی دوسری طرف آجاتی ہے، ماں اٹھ کر چلی جاتی ہے)، فرمائیے کیا مرزا صاحب نے کوئی پیغام بھیجا ہے؟ کیا کہا ہے انھوں نے؟ کیسے ہیں وہ؟ خود ہی کیوں نہ چلے آئے۔

بنسی: آتے ہوں گے۔

لڑکی: تشریف رکھیے۔

بنسی: بہن! مرزا کے بچپن کا دوست ہوں۔ ساتھ شطرنج کھیلنے میں راتیں سیاہ کی ہیں۔ باہم قصے کہانیاں کہی سنی ہیں، پتنگیں لڑائیں اور بازیاں ہاری جیتی ہیں۔ اس خاندان کو اپنی نظروں کے سامنے پامال ہوتے دیکھا ہے۔ اکبرآباد میں آج بھی عبداللہ بیگ خاں اور مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں اور مرزا کے نانا غلام حسین خاں کا نام باجتا ہے۔ کوئی رسالدار، کوئی کمیدان میں نے اس خاندان کا وقار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کی آن بان کا سورج میرے سامنے ڈوبا ہے۔

لڑکی: میں کچھ سمجھی نہیں۔

بنسی: آپ کو ایک نظر دیکھا تو مرزا کے حسن نظر کی داد دی۔ بخدا خالق نے اپنے ہاتھ سے نور کے پتلے میں جان ڈال دی ہے اور جادو بھری آواز بخشی ہے۔ پھر مرزا نوشہ نے جان نچھاور کر دی تو کیا تعجب۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کئی جانیں نچھاور کر ڈالتا۔ مجھے یہ بھی بھروسہ ہے کہ اس نورانی پیکر میں ایسا ہی نازک، لطیف اور ہمدرد دل بھی ہے جو دوسروں کے درد سے تڑپ اٹھتا ہوگا۔

لڑکی: میں کچھ نہیں سمجھی۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

بنسی: میں نہیں مانتا۔ مرزا نوشہ کے شعر سمجھنے والی اتنی سیدھی سی بات نہ سمجھے میں نہ مانوں گا۔

لڑکی: خدارا پہیلیاں نہ بوجھئے:

بنسی: لے دے کے اس گھرانے کے پاس تھوڑی سی آن بان بچی ہے آپ چاہیں تو یہ آن بان قائم رہ جائے۔

لڑکی: میں چاہوں؟ میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے بھائی صاحب۔ دنیا میری مرضی پر چلتی تو مرزا صاحب کا نام آفتاب و ماہتاب کی طرح رات دن عالم پر چمکتا۔ انھیں اپنے کلام کی داد ملتی، ان کی صداؤں پر لوگ سر دھنتے، میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں۔

بنسی: میں آپ ہی سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔ آپ اس گھرانے کی آبرو بچا سکتی ہیں۔ آپ نے مرزا نوشہ کو دیکھا مگر اس گھر کی خوشی، اس خاندان کی آبرومندی، اس کے گھر بار کی ذمہ داریوں کا خیال نہیں کیا۔ مرزا نوشہ نے اپنا سب کچھ آپ پر وار دیا مگر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ کوئی اور عورت آپ ہی کی طرح نازک، آپ ہی کی طرح دردمند عورت اپنا سب کچھ مرزا پر وار چکی ہے اور اسے وہ پیار بھی نہیں ملا جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گیا۔

لڑکی: میں بھی انسان ہوں، میرے سینے میں بھی دل ہے، پتھر نہیں ہے بھائی صاحب۔ مجھے بھی جینے کا حق ہے۔

بنسی: میں نے سنا تھا محبت قربانی دیتی ہے، قربانی لیتی نہیں۔

لڑکی: (غصے میں) آپ نے غلط سنا تھا۔ بالکل غلط سنا تھا آپ نے۔ عورت بھی انسان ہوتی ہے ہم گانے والیاں بھی انسان کا دل رکھتی ہیں۔

بنسی: آپ ٹھیک فرماتی ہیں مگر بڑی بیگم بھی عورت ہیں اور ان کا دل بھی انسان کا دل ہے۔

لڑکی: میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے صرف اتنا سوچا تھا کہ درد سے چور شاعر کے دل کو اپنے پیار سے بھر دوں۔ پھر دل سوچا سمجھا کہاں مانتا ہے اس کی تو اپنی ڈگر ہے اپنی راہ ہے۔ پھر میں اسے سمجھانے والی کون؟ یہ سب مقدر کا پھیر ہے بھلا کبھی خواب میں بھی سوچا تھا کہ جس شاعر کے کلام کو اس طرح جی جان سے گاتی رہی ہوں کبھی اسے دیکھ بھی پاؤں گی، کبھی اس سے بات بھی کر پاؤں گی۔ ہائے کیسے اچنبھے کی بات ہے۔

بنسی: ذرا سوچئے، ایک گھر تباہ ہو جائے گا۔ آپ پسند کریں گی کہ یہ تباہی آپ کے نام لکھی جائے۔ ایک نامور گھرانا تاراج ہو جائے اور اس تباہی کی لپٹوں میں ایک عورت کا دل، اس کا سہاگ ہی نہیں اُجڑے گا بلکہ ایک ہونہار شاعر کا مستقبل بھی جل جائے گا۔

لڑکی: یہ سب مجھ سے کیوں کہتے ہیں آپ اپنے دوست کو سمجھایئے۔

بنسی: وہ نہیں سمجھے گا اسی لیے تو آپ کو زحمت دینے حاضر ہوا ہوں۔ ذرا سوچئے پورے خاندان کا دارومدار مرزا نوشہ پر ہے۔ وہ جوانی دیوانی کے نذر ہو گئے تو یہ باعزت خاندان بھیک مانگے گا۔ سرکار انگریزی میں پنشن کے کاغذات پیش ہیں وہاں اس قضیئے کی سن گن پہنچی تو کیا ہوگا۔ سرکار بھی یہی سوچے گی کہ نصر اللہ بیگ کی پنشن الّلے تللوں میں اڑائی جاتی ہے۔ اب اس میں اضافہ بے محل ہے جسے آپ حافظ وخیام کے مرھیے پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ایک انسان بھی تو ہے ایک مفلوک الحال امیر زادہ بھی تو ہے۔ میں آپ سے اس کے وقار، اس کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔

(دامن پھیلا دیتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ لڑکی چلی جاتی ہے۔ اسٹیج پر ذرا دیر تاریکی۔ جب دوبارہ روشنی ہوتی ہے تو بنسی دھر جا چکے ہیں اور لڑکی ستار لیے خاموش سوچ میں گم سم بیٹھی ہے)

(بہت دیر تک خاموش بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ اسی عالم میں ماں پکارتی ہے تو چونک پڑتی ہے)

ماں: بیٹی! اب ستار رکھ دو۔ چلو کھانا کھالیں۔ دیر ہو رہی ہے۔

لڑکی: (ایک دم چونک کر) اماں!

ماں: ہاں بیٹی! ڈر گئی۔

لڑکی: اماں میں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔

ماں: بیٹی!! (خوشی سے)

لڑکی: ماموں ٹھیک کہتے ہیں۔ انھیں بلاؤ ان سے کہو کہ منگنی کا جوڑا لائیں، میں اس جوڑے میں کیسی لگوں گی۔ اماں تم نے میری شادی کے جوڑے تو سیئے ہیں میری بات مانو گی؟

ماں: کہو بیٹی!

لڑکی: مجھے دلہن بنادو، مجھے شادی کا جوڑا پہناؤ، میرے ہاتھ چوڑیوں سے بھردو، میری مانگ میں افشاں چُن دو، آج سے میں نئی زندگی شروع کروں گی۔ چلو اماں چلو (ماں کو گھسیٹتی ہوئی لے جاتی ہے)

ماں: پاگل ہوگئی ہے۔ ذرا دم لے۔

لڑکی: میری اچھی اماں اب دیر نہ کرو۔ میری اچھی اماں۔ (دونوں چلی جاتی ہیں)

ماں: ارے دوڑو — لوگو میں لٹ گئی۔ ارے لوگو میری بچی — ارے کوئی آؤ دیکھو میری چاندسی بٹیا کو کیا ہوا۔

ارے لوگو! میں لٹ گئی۔ ارے لوگو میں لٹ گئی۔ میں کیا جانتی تھی کہ میری بچی اس لیے دلہن بن رہی ہے۔ میں رنڈیا باتوں میں آگئی — ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں، ہیرے کی انگوٹھی میں زہر چھپا رکھا تھا۔ زہر کھالیا میری بلّو نے — ہائے، تیرے وار جاؤں، میری لاڈلی۔ تیرے بدلے مجھے کیوں نہ موت آئی۔

غالب: تم امیرزادے تھے۔ عورت کی محبت کو بھی کھیل جانتے تھے۔

مرزا: نہیں، تم محض شاعر تھے اور شعر میں گرمی اور سوز پیدا کرنے کے لیے تم نے ایک عورت کی جان لے لی۔

غالب: یہ غلط ہے۔

مرزا: یہ بالکل صحیح ہے۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بُت بیداد گر کو میں

غالب: چلو، اس بہانے تمھیں شعر تو یاد آنے لگے۔

مرزا: تمھارے شعروں میں کیا؟ میری زندگی ہی تو ہے مجھے یاد نہ ہوں گے تو کسے یاد ہوں گے۔

غالب: تو سنو، تم نے اس عورت کو چاہا امیر زادے کے دل سے۔ تم نے اسے داشتہ کی نظر سے دیکھا یا نہیں۔ یہ میں نہیں جانتا مگر تم جیسے امیر زادے فقط آج کے نہیں بلکہ ابھی کے لمحے میں زندہ رہتے ہیں۔ زخم نہیں کھاتے فقط پھول جنتے ہیں۔

مرزا: اور آپ؟ (انتہائی طنز سے)

غالب: شاعر کے دل نے اس سے درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا۔ میں نے اسے چاہا اور اس میں زندگی کا ایک نیا روپ دیکھا۔ میں نے اسے نہ چاہا ہوتا اس کا سہارا نہ ڈھونڈا ہوتا تو میں پاگل ہو جاتا۔

مرزا: معلوم ہے ان دنوں سخت پریشانی تھی۔ پنشن تھوڑی رہ گئی تھی۔ ایک دو نہیں سات بچے پے در پے مر چکے تھے۔ چھوٹے بھائی یوسف پاگل ہو چکے تھے اور ان کے گھر بار کا بوجھ بھی میرے سر تھا۔

غالب: اس وقت اس لڑکی نے مجھے سہارا دیا میری غزلوں کو گنگنایا اور میرے شاعرانہ وجود کو ہلا ڈالا۔

مرزا: اسی زمانے سے شراب منہ کو لگی اور انہی دنوں جوئے کی عادت ہوئی۔

(لڑکی قریب آجاتی ہے اور ان دونوں کو الزام دینے کی نظر سے دیکھتی ہے جیسے گریبان پکڑنا چاہتی ہو)

لڑکی: تم دونوں میں سے مرزا نوشہ کون ہے؟

غالب: پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

مرزا: اچھا ہوا تم خود آگئیں، ہم تمھارے پاس آرہے تھے۔

لڑکی: کیوں؟

مرزا: کچھ پوچھنا تھا۔

لڑکی: ......آپ دونوں میں سے مرزا نوشہ کون ہیں؟

مرزا: جی فرمایئے۔ مجھے مرزا نوشہ کہتے ہیں۔

غالب: تم غلط آدمی کو پوچھ رہی ہو، شاید تم غالب سے ملنا چاہتی ہو۔ شاعر غالب جس کی غزلیں تم

نے گنگنائیں۔ جس کی زندگی میں تم نے تھوڑی دیر کے لیے سکون کی چاندنی فراہم کردی۔

لڑکی: بولو۔ میرے قتل کا ذمہ دار کون ہے۔ میرا خون کس کی گردن پر ہے؟

غالب: شاید وہ شاعر جس کا قتل زمانے کی گردن پر ہے۔

لڑکی: میں کہتی ہوں تم دونوں میرے قاتل ہو— میرے قاتل! ایک نے میری آواز کا سودا کیا، دوسرے نے میری خوبصورتی کا۔ اور تم سے کسی نے بھی اس عورت کو نہیں دیکھا جو قربانی دے کر صرف محبت کی طلب گار تھی۔ میں کہتی ہوں تم نے مجھے کیا دیا؟

غالب: محبت سودا نہیں۔

لڑکی: تمھارے لیے سودا ہی تو تھی شاعر، تم کو پناہ چاہیے تھی۔ کٹھور زندگی سے اپنے خیالوں میں پناہ چاہیے تھی وہ تم نے ڈھونڈ نکالی۔ اور تم یہ نہ دیکھ پائے کہ میرے سینے میں بھی دل تھا، میں بھی آرزوؤں کی جھولی پھیلائے کھڑی تھی۔ مگر تم کو میری نہیں اپنے تصور کی ضرورت تھی اور اپنے تصور کی چاہت میں تم نے مجھے روند ڈالا۔

غالب: یہ جھوٹ ہے۔

لڑکی: شاعروں کو اکثر جھوٹ سے پیار ہوتا ہے مگر عورت ایسی سچائی ہے جسے شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعے جھوٹ بنا دیا ہے۔ میں بھی عورت ہوں۔ میں آج تم سے انصاف مانگنے آئی ہوں۔

غالب: انصاف، اور مجھ سے؟ جو زندگی بھر بے انصافی کا شکار رہا۔

لڑکی: ہاں تم سے، میرے شاعر۔ آج جب دنیا تمھاری شہرت سے گونج رہی ہے کیا کوئی ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یاد کرتا ہے۔ جس کی پوری ہستی ایک کسک بن کر تمھاری شاعری کو جاوداں بنا گئی— بتاؤ میری فریاد کون سنے گا؟

مرزا: تم دونوں مجھے الزام دو۔ سب مجھے الزام دیتے ہیں۔ تم میں سے کوئی مجھے نہیں جانتا۔ دس بارہ سال کی عمر میں ایک امیر زادہ دہلی آیا اور اس کے اوپر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ایک دم پورے خاندان کا بوجھ سر پر، پھر ایک نہیں دو نہیں سات بچوں کا انتقال، چھوٹے بھائی پر

ان حالات نے وہ ستم توڑا کہ پاگل ہوگیا۔ میں بھی خوان اور خوبصورت آدمی تھا۔ اگر شاعری، عشق و قمار بازی میں پناہ ڈھونڈی تو کیا گناہ ہوگیا۔ اور اسی بے قراری میں تمھارا دامن پکڑا اور نتیجہ رسوائی، بے عزتی اور بے اندازہ غم۔

لڑکی: میں جانتی تھی۔

غالب: تم شرم اور رسوائی سے خاک میں جا چھپیں، جس کا آسرا میں نے ڈھونڈا وہ موت کے پردے میں چھپ گیا۔ تم نے موت کی پناہ ڈھونڈ لی، مجھے یہ پناہ بھی نہ ملی۔ تم میری شاعری میں درد بن کر زندہ رہیں اور اس درد کو مجھ سے کوئی نہ چھین سکا۔

لڑکی: میں نے بھی کبھی کبھی یہی سوچا ہے کہ میں شاعری کا ایک تصور تھی۔ محض ایک تصور جس سے تم نے پیار کیا وہ تمھارا تصور، تمھارا تخیل، تمھاری اپنی تصویر تھی اسی لیے تم نے مجھے کوئی نام نہ دیا اور وہ درد شاعری بن کر بکھر گیا۔

یاد رکھنا میں حشر میں دامن گیر ہوں گی۔ میرا خون فریادی ہوگا اور یہ فریاد زمین و آسمان کو نہیں عرش معلٰی کو ہلا ڈالے گی۔ انصاف کی پکار تمھاری شہرت کے سارے فانوس گل کر دے گی۔

(ایک لمحے کے لیے اسٹیج کی ساری روشنیاں گل ہو جاتی ہیں)

مرزا: سنا تم نے۔

غالب: سن تو میں نے بھی لیا، لیکن وہ یہ سب کچھ تم سے کہہ رہی تھی۔

مرزا: میں اس کا قاتل نہیں ہوں۔

غالب: ہاں، تم صرف اسی کے نہیں، ہم دونوں کے قاتل ہو۔ امیر زادے کے ہاتھوں وہ نازک سی لڑکی بھی قتل ہوئی اور شاعر غالب بھی۔

مرزا: اپنے سارے الزام میرے سر منڈھ دو۔

غالب: تم کس کس سے انکار کرو گے۔ تمھیں وہ دن یاد ہے جب شاعر نے مالی مشکلات کا حل نکال لیا تھا اور تم نے مجھے روک دیا۔

مرزا: میں نے روک دیا۔

غالب: ہاں، امیرزادے۔ تمھیں نے مجھے روکا تھا!

۴

(پردہ اٹھتا ہے غالب دیوان خانے میں مسہری پر نیم دراز ہیں جیسے غم واندوہ سے بے حال ہوگئے ہیں۔ اچانک یوسف مرزا سرہانے جا پہنچتے ہیں)

یوسف مرزا: جہان آباد کا شاعر اعظم اسد اللہ غالب۔ سرکاری بولی باسٹھ روپے، ہے کوئی لینے والا۔ باسٹھ روپے ایک، باسٹھ روپے دو......

غالب: (چونک کر) یوسف مرزا تم کب آئے، آؤ بیٹھو۔

یوسف مرزا: بہت تکلیف ہے کیا؟

غالب: تکلیف! کیسی تکلیف؟

یوسف مرزا: ہم سب جانتے ہیں جو جانتے ہیں وہ بولتے نہیں، جو بولتے ہیں وہ جانتے نہیں۔

(پس منظر سے ایک فقیر کی آواز ابھرتی ہے آہستہ آہستہ یہ فقیر کھڑکی کے پاس آجاتا ہے۔ ہاتھ پھیلاتا ہے۔ مرزا خالی صندوقچے سے دو چار پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔ فقیر یہ غزل گا رہا ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(مرزا فقیر کے ہاتھ پر پیسے رکھ دیتے ہیں)

فقیر: (دعا دیتے ہوئے) بابا۔ اقبال بلند، دولت زیادہ!!

(مرزا کھڑکی بند کردیتے ہیں۔ یوسف مرزا جو ابھی تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اچانک قہقہہ مار کر ہنس پڑتے ہیں اور طنز سے دہراتے ہیں اور باہر نکل جاتے ہیں۔)

یوسف مرزا: اقبال بلند، دولت زیادہ!! اقبال بلند، دولت زیادہ!!

غالب: (خود کلامی) اقبال بلند، دولت زیادہ، خوب!! اقبال اتنا بلند کہ بھکاری غزلیں گائیں اور عالم، فاضل، امیر، بادشاہ ہمت افزائی سے باز رہیں۔ رہی دولت تو اس کا یہ حال کہ ساری دنیا کا قرض دار۔ متھرا داس درباری مل، خوب چند جین، سب تمسک مہری لے کر جائیں۔ ایک دن قرض خواہوں کا ہاتھ ہے اور یہ گردن۔ انجام موت ہے یا بھیک مانگنا کسی دکان سے دھتکارے گئے۔ کسی دروازے سے کوڑی پیسہ مل گیا۔ (اچانک نظر بیگم پر پڑتی ہے جو دیوان خانے میں آگئی ہیں) بیگم تم! دیوان خانے میں!!

بیگم: آپ کو محل سرا میں آنے کی فرصت کہاں! مجھی کو آنا پڑا۔

غالب: کہو۔

بیگم: کیا کہوں؟

غالب: کہو گھر میں خرچ کی تکلیف ہے۔

بیگم: ہاں۔

غالب: کہو کہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے تنگ آگئی ہیں کہ پنشن کے باسٹھ روپیوں میں مہینے کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ اس طرح کب تک کام چلے گا گھر کا۔

بیگم: پھر اس کا کچھ انتظام؟

غالب: مجبوری۔

بیگم: تو پھر اس امیر الامرائی کو سلام کیجیے، آن بان ختم کیجیے، محنت مزدوری ہی سہی گزر بسر تو ہو۔

غالب: اسی لیے پنشن کی واگزاری کے لیے کلکتے کا سفر کیا۔ کمپنی کو درخواست دی، سرکار دربار میں صدا لگائی مگر نتیجہ کچھ نہیں۔

بیگم: آخر کام کیسے چلے گا؟ قرضہ اور سود جدا، چوبدار، نوکرانی، یوسف مرزا کی دوا دارو، کھانا

پینا، مکان کا کرایہ، یہ سب کہاں سے آئے گا۔

غالب: کہاں سے گنجائش نکالوں۔ سنو صبح کی تبرید موقوف، رات کی شراب گلاب موقوف، چاشت کا گوشت آدھا۔

بیگم: اس طرح پیٹ کاٹ کر کیا ملے گا؟

غالب: جو ملے غنیمت ہے۔

بیگم: خدا جانے میرے نصیبوں کا سکھ چین کہاں چلا گیا۔ گھر میں نہ اچھا پہننے کو نہ اچھا کھانے کو۔ نہ اولاد کا سکھ نہ دل کا چین۔

غالب: کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔ میں نے خود کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض داروں کو جواب دے۔ ایک قرض خواہ کا گریبان ہاتھ میں ایک بھوگ سنا رہا ہے میں اس سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔

بیگم: تم اپنے کو غیر تصور کر لو میں غیر تصور نہیں کر سکتی۔

غالب: میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔

بیگم: کوئی مطلب نہیں ہے۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تمھاری زندگی میں میں بھی شریک ہوں۔

غالب: کیا کہہ رہی ہو بیگم؟

بیگم: میں بھی انسان ہوں، تمھارے دکھ سکھ کی ساتھی ہوں۔ کیا میرا صرف اتنا ہی حق ہے کہ تم سے روٹی روزی، نان نفقہ چاہوں اور بس اس کے سوا میرا کوئی حق نہیں؟

غالب: کون سا حق چاہتی ہو تم؟

بیگم: تمھیں کیا بتاؤں۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تمھاری شاعری میں کوئی ایک شعر ایسا بھی ہے جو میرے لیے کہا گیا ہو۔ اصلی اور فرضی محبوباؤں کے ذکر ہیں۔ ہجر اور فراق کے

چرچے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ وہ عورت ان شعروں میں کہاں ہے جس نے ہر دکھ سکھ میں تمھارا ساتھ دیا اور کچھ نہیں مانگا۔ کیا اس کا تمھاری شاعری پر کچھ حق نہیں ہے۔

غالب: یہ اشعار کس کام کے؟ یہ شہرت کس گون کی۔ عاشقوں میں کوئی مجنوں اور فرہاد کی سی شہرت پالے تو کیا۔ شاعروں میں کوئی حافظ اور خیام سے زیادہ مشہور ہو جائے تو کیا۔ آخر کو تو مسئلہ وہی دو سانس چین سے گزار لینے کا ہے۔

یوسف مرزا: (ایک دم داخل ہوتے ہیں۔ دیوانہ وار قہقہہ) جمشید کی میراث جمشید کی اولاد کو۔ آدم کی میراث رسوائی۔ اندوہ اور بہشت اور گناہ۔ ہم سب نیلام پر چڑھاتے ہیں اور گیہوں ایک دانا چاہتے ہیں۔ کوئی ہے جو اس ایک دانے کا سودا کرے؟

غالب: یوسف مرزا خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔

یوسف مرزا: (بہت آہستہ سے) میں خاموش ہوں۔ لو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ اب چراغوں کا خدا حافظ (چلے جاتے ہیں)

غالب: گھبراؤ نہیں بیگم! جلد کوئی صورت نکلے گی۔ کوئی صورت نکالنی پڑے گی۔

کاظم علی: قبلہ حاضر ہو سکتا ہوں؟

(آواز سن کر بیگم اندر محل سرا کی طرف جاتی ہیں۔ انتظام الدولہ کا داخلہ)

غلام کاظم علی کورنش بجالاتا ہے مرزا صاحب۔ نصیب دشمناں مزاج تو بخیر ہے کہ حضور نیم دراز ہیں۔

غالب: آؤ کاظم علی، کیسے آنا ہوا؟

کاظم: غلام کا کیا آنا جانا۔ حضور کو سلام کرنے کبھی کبھار چلا آتا ہوں اور جائیں بھی کہاں۔ اب تو دہلی وہ اندھیر نگری ہے کہ خدا کی پناہ۔ اپنی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں مرزا صاحب کہ قدم قدم پر تو جاسوس ہیں۔ فرنگیوں کے جاسوس، مرہٹوں کے جاسوس، روہیلوں کے جاسوس، اور خدا معلوم کہاں کہاں کے کس کس کے جاسوس۔ پھر وہابیوں نے غدر مچا رکھا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے حکیم مومن خاں جیسا رند باصفا جہاد کی باتیں کرنے لگا۔ اب آپ سے بھی کیا چوری ہے مرزا صاحب قبلہ، میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہابیوں سے فرنگی حکومت

تک پریشان ہے۔ خفیہ خفیہ کمپنی بہادر کو پرچہ لگا ہے کہ یہ لوگ انگریزوں کے خلاف جہاد بولنے والے ہیں۔ حکم ہوا ہے کہ ان کی نگرانی رکھی جائے۔

غالب: باتیں کرتے کرتے کبھی دم بھی لے لیا کرو۔

کاظم: آپ تو ناچیز کو شرمندہ کرتے ہیں مرزا صاحب۔

غالب: اپنی کہو، کیسی گزر رہی ہے؟

کاظم: کچھ نہ پوچھئے مرزا صاحب قبلہ، حال پتلا ہے۔ ہمارا دھندا تو آپ جانتے ہیں امیر زادوں کے ساتھ بندھا ہوا اترا ہے۔ کچھ سیر و تفریح، کچھ عیش و نشاط کا چرچا ہو تو بندۂ درگاہ کے ہاتھ بھی کچھ لگ جاتا ہے ادھر اس کم بخت کوتوال شہر نے وہ ناک میں دم کر رکھا ہے کہ توبہ بھلی۔ دہلی کے شریفوں کے دو چار پانسے پھینکنے اور دو چار بازیاں تک لگانا محال ہو گیا ہے پھر اپنی پتی کہاں؟

غالب: تمھیں بھلا اس کاروبار میں کیا مل جاتا ہے؟

کاظم: ہم بھی پچھ لگوؤں میں ہیں حضور والا۔ مگر اصل حصہ تو اس کا ہے جس کے گھر پھڑ جمے اس کی چاندی ہے۔ آپ کا محلہ ماشاء اللہ کوتوال کی نظروں سے بچا ہوا ہے اگر یہاں کوئی ٹھکانہ مل جائے تو بگڑی بن جائے۔

غالب: (ڈر کر) کیسی باتیں کرتے ہو کاظم علی۔

کاظم: ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آخر اپنی عمر بھی اسی کاروبار میں گزری ہے اگر کسی کو کانوں کان خبر ہو جائے تو قبلہ کاظم علی انتظام الدولہ کا سر قلم کرا دیجیے گا۔ بس ایک بار 'ہاں' کر دیجیے۔ سب انتظامات چٹکی بجاتے میں مکمل کرا دوں گا۔ سچ پوچھئے تو مرزا صاحب، اب دھندا ہی کون سا رہ گیا ہے۔ دربار سے خلعت اور منصب بند ہیں جاگیریں ختم ہو چکی، نوکری ملتی نہیں۔ اب آخر گزارا چلے تو کیسے چلے۔ آپ ذرا اشارہ کیجئے واللہ سارے قرضے ایک ہی مرتبہ ادا ہو جائیں گے، پھر آپ دوسروں کے قصیدے نہیں لکھیں گے دوسرے آپ کے قصیدے پڑھتے پھریں گے۔

غالب: انتظام الدولہ!

کاظم: بس میری خاطر، ایک بار!

غالب: نہیں—اب تم جاؤ، مجھے بھی ایک جگہ جانا ہے۔

کاظم: بہت بہتر، حضور۔ بندہ پھر حاضر ہوگا۔ آداب بجالاتا ہوں۔

غالب: (چوبدار کو آواز دیتے ہیں) ارے کوئی ہے، ہوادار تیار کراؤ۔

چوبدار: کہاں جانا ہے؟

غالب: دتّی کالج۔

۵

مرزا: (قہقہہ لگاتا ہے)

غالب: ہنستے ہو۔

مرزا: آگے کی داستان مجھے معلوم ہے۔

غالب: کیا جانتے ہو تم؟

مرزا: یہی کہ تم ہوادار میں سوار ہو کر دتّی کالج پہنچے۔ تمھیں نوکری کا پروانہ مل چکا تھا۔ دتّی کالج میں فارسی پڑھانے کی خدمت تمھارے سپرد ہو چکی تھی۔ تم نوکری کرنے گئے تھے اور اس امید پر ہوادار میں بیٹھے رہے کہ کالج کا سربراہ تمھارے استقبال کو آئے گا۔ تمھارے استقبال کو کوئی نہیں آیا اور تم واپس چلے آئے۔ (ہنستا ہے)

غالب: جانتے ہو کیوں؟

مرزا: تم نے یہی کہا تھا نا کہ ''نوکری اس لیے کرنا چاہی تھی کہ عزت بڑھے، اس لیے نہیں کہ عزت اور کم ہو جائے۔''

غالب: جانتے ہو یہ لفظ کس کے ہیں؟

مرزا: کہو۔

غالب: یہ لفظ تمھارے تھے۔ شاعر قصیدے لکھ کر پیٹ پال سکتا ہے۔ بہت آگے بڑھے تو مدرسی کر کے پڑھا لکھا کر جی سکتا ہے۔ میں نے نوکری کرنی چاہی اور امیر زادے نے میرے

پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ تم نے مجھے عزت کا واسطہ دیا، جھوٹی عزت کا واسطہ، تم نے خاندانی شان کی قسمیں دلائیں۔ جھوٹی شان کی جھوٹی قسمیں۔ امیر زادے تم نے مجھے دلّی کالج کے دروازے سے واپس لوٹا دیا۔

مرزا: میں نے روکا تھا تمھیں۔ تم نے دلّی کالج کے سربراہ انگریزی کی شان میں زوردار قصیدہ پڑھا ہوتا۔

غالب: تم میرے ہمزاد تھے میری ذات کا حصہ تھا تمھیں کس طرح اپنے وجود سے کاٹ پھینکتا۔ تم نے میرے دل پر وہ گھونسا مارا کہ میں جھوٹی عزت کی خاطر دلّی کالج کی نوکری کا خیال چھوڑ کر گھر لوٹ آیا۔ پھر وہی کنجِ قفس۔

٦

غالب: (چغہ اتار کر چوبدار کو دیتے ہیں۔ نظر انتظام الدولہ کاظم علی پر پڑتی ہے)

کاظم: قبلہ، آداب بجالاتا ہوں۔ کب سے آپ کے انتظار میں بیٹھا ہوں؟

غالب: کیوں؟ میں نے تم سے انتظار کرنے کو کب کہا تھا؟

کاظم: آپ نے تو نہیں فرمایا تھا مگر میرا دل کہتا تھا کہ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔

غالب: کیا کہنا چاہتے ہو؟

کاظم: وہی پرانی بات ہے قبلہ، اپنا نہیں تو میرا خیال کیجیے آخر ایک مدت سے آپ کا نیاز مند ہوں۔ ایک بار 'ہاں' کر دیجیے۔ وارا نیارا ہو جائے گا۔ کوتوال شہر کی کیا مجال ہے کہ آپ کی حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔ اس کے فرشتوں کو خبر تک نہ ہوگی۔

غالب: میں مجبور ہوں کاظم علی۔ مجھے منظور ہے۔

کاظم: (خوشی سے اچھل پڑتا ہے) مبارک ہو۔ مرزا صاحب، بس اب آپ کے سارے قرضے بے باق ہو جائیں گے۔ بس اب تو چاندی ہے چاندی۔ آج شام تک پانسہ پلٹ جائے گا۔

شرابی: اپنا میر کاظم علی بھی خدا کی قسم۔ برق ہے برق۔ کیا جگہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ کوتوال شہر کے خواب و خیال میں بھی نہیں گزر سکتی۔

دوسرا جواری: بس اب بات چیت موقوف، نقدی نکالو اور بازی سنبھالو۔

تیسرا جواری: نال کی رقم مرزا صاحب کی۔

کاظم علی: مرزا صاحب قبلہ، گستاخی معاف۔ سنتا ہوں آپ بھی بے نظیر کھیلتے ہیں اجازت ہو تو دو بازیاں ذرا بد کے ہو جائیں۔

غالب: اچھا، یوں ہی سہی۔

دوسرا جواری: اچھا تو بازی شروع، نقدی نکالو یارو نقدی!

شرابی: نقدی، یہ لو نقدی، ہر جگہ نقدی کی پکار ہے۔ نقدی نہ ہوئی نعوذ باللہ خدا ہو گئی۔

جواری: اجی حضرت، اسی کی دھن پر خدائی ناچتی ہے۔

شرابی: ناچتی ہے تو ناچے، ہم ایسی خدائی کو ٹھوکر مارتے ہیں۔

(دستک)

غالب: کون، اس وقت کون ہے؟

باہر سے آواز: سواریاں آئی ہیں۔

کاظم: کوئی بات نہیں آپ اطمینان سے دروازل کھول دیں اور کھیل جاری رکھیں۔ (دروازہ کھلتا ہے)

کوتوال: خبر میں کوتوال شہر کی حیثیت سے تم سب کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔ مرزا صاحب قبلہ مجھے افسوس ہے۔ سپاہیو سب کو حراست میں لے لو (ڈانٹتا ہے) لے چلو۔

یوسف مرزا: (اچانک داخلہ) خبردار! جو کسی نے آگے قدم بڑھایا۔ میرے بھائی کو چھوڑ دو۔ نہیں تو ایک ایک کو قتل کر دوں گا۔ (لوگ ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں) تم سب دیوانے ہو۔ میرا ہاتھ روکتے ہو۔ انھیں کچھ نہیں کہتے جو ہاتھ قلم کرتے ہیں اور منصف کہلاتے ہیں۔ جو گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالتے ہیں اور خداوند کہے جاتے ہیں۔ میرا کیا ہے، آفتاب کو قتل کر دو۔ ماہتاب کو زنجیریں پہنا دو، پھولوں کو شاخوں سے نوچ لو۔ نسیم سحر کو پاؤں میں گھنگھرو پہنا کر نچاؤ، شاہراہوں پر خون دل کا چھڑکاؤ کرو۔ لبوں پر مہریں لگا دو۔ آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلاخیں ڈال دو۔ میرا کیا ہے میں اپنے رستے جاتا ہوں۔

(چلے جاتے ہیں)

غالب: تمھارے ہاتھوں مجھے پہلی شکست ہوئی۔ ایک امیر زادے نے شاعر کو ہرا دیا۔

مرزا: امیر زادے ہمیشہ شاعروں کو ہراتے ہیں۔

غالب: اور آج۔ جب میرا جشن منایا جارہا ہے امیر زادہ کہاں ہے، آج نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بیگ سب مر گئے ہیں، ان کی ہڈیاں گل سڑ کر خاک میں مل گئیں۔ صرف غالب زندہ ہے، صرف غالب۔

مرزا: چلو جیل خانے کا تجربہ بھی اچھا تھا۔

غالب: ہاں تمھارے کپڑے میلے کچیلے تھے کھانے میں مٹی اور کنکر تھے مگر میرے ہونٹوں پر شعر تھے تمھاری روح زخمی تھی اور میرے لبوں پر نغمہ تھا۔

مرزا: اور وہاں سے واپسی پر تم نے مجھ سے انتقام لے لیا۔

غالب: یعنی آخر مغل بادشاہ بہادر شاہ نے مجھے اپنا استاد مقرر کر کے تمھیں زک دے دی۔

مرزا: یوں پوچھتے ہو جیسے تمھیں اس کی خبر ہی نہیں؟

غالب: مجھے خبر ہے میں نے ہی تو کہا تھا۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو بادشاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

مرزا: مٹی ہوئی دلّی میں مٹتے ہوئے شہنشاہ کے استاد (طنزیہ ہنسی)

غالب: امیر زادہ ہار گیا، شاعر جیت گیا۔

مرزا: میرے اوپر طنز کرتے ہو۔

غالب: لوگوں کو زمین کے کونے، کھنڈروں میں خزانے ملتے ہیں مجھے یہ خزانہ قید خانہ کے ایک گوشہ میں ملا۔

مرزا: خزانہ؟

غالب: ہاں خزانہ۔ یہ تھا کہ سرشاری اور سرخوشی وہ ہے جو دکھ درد سے ڈر کر نہیں اس کے باوجود حاصل ہو، انسان وہ غم ساری تلخی اور ترشی کو زندگی کا حصہ سمجھ کر اسے نشاط و کیف کا جزو

بنالے میں نے اپنا ساغر سرشار صبح محشر کی ہل چل سے ڈھال لیا۔ میں نے اپنی محرومیوں پر ہنسنے کا حوصلہ پایا اس کے بعد سب کچھ ہیچ تھا۔

مرزا: پھر یہ قصیدہ نگاری؟

غالب: یہ بھی ہیچ تھی قصیدہ بھی اک طرح کا جو اتھا محض بھیک کا پیالہ۔

مرزا: اور اسی لیے ایک نام کاٹ کر دوسرے ممدوح کا نام لکھتے رہے۔

غالب: (طنزیہ ہنسی) مٹتی ہوئی دتی کے ایک مفلس شاعر کو اتنی آزادی بھی نہ دو گے۔ میں نے اسی خزانے کے پالینے کے بعد ہنسنا سیکھ لیا۔

مرزا: تم بہادر شاہ کے مورخ بنے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تم نے اپنا روزنامچہ لکھا۔ دستنبو نام اچھا تھا مگر تم نے اپنے بھائی کے ساتھ ناانصافی کی۔

غالب: کیسی بے انصافی؟

مرزا: کیا تمھیں معلوم نہ تھا کہ تمھارا بھائی بخار میں مبتلا ہو کر نہیں مرا فرنگی سپاہیوں نے اسے گولی کا نشانہ بنایا۔

غالب: معلوم ہے۔

مرزا: تو پھر؟

غالب: جو کچھ ہوا تم دیکھو گے سنو گے۔

مرزا: ضرور۔

(غالب دیوان خانے میں بیٹھے ہیں کہ یکایک شور و غوغا سنائی دیتا ہے۔ توپوں کی گھن گرج، شور، نالہ و فریاد، رونے چیخنے کی آوازیں۔ غالب کا چوبدار گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے اور دروازہ بند کرنا چاہتا ہے)

غالب: کیا ہوا؟

چوبدار: غضب ہو گیا حضور، فرنگی سپاہی شہر میں گھس آئے ہیں۔ شہر میں فرنگیوں اور باغیوں کے بیچ ہنگامہ مچا ہوا ہے، مکان لوٹے جا رہے ہیں، لوگ مارے جا رہے ہیں۔

(شور پھر بڑھتا ہے۔ دین دین۔ دھرم دھرم کی آوازیں، ایک انگریز

کی آوازFire(گولیوں کی آوازیں)

یوسف مرزا: (ایک دم آگے بڑھتے ہیں اور دروازہ کھول کر باہر جانا چاہتے ہیں)

غالب: یوسف مرزا کیا کرتے ہو، باہر جانے میں خطرہ ہے۔

یوسف مرزا: اب آئے ہیں کھیلن ہوری (گاتے ہوئے) اب آئے ہیں کھیلن ہوری......

غالب: دوبارہ روکتے ہوئے) یوسف مرزا۔

یوسف مرزا: وہ سب مجھے بلا رہے ہیں دلّی مجھے بلا رہی ہے۔ کب سے چلّا چلّا کر بلا رہی ہے، دلی کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ کوئی بھی نہیں سنتا۔ (یہ کہتے ہوئے ایک دم دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے ہیں) ملک خدا کا، خلق غالب کی، حکم یوسف مرزا بہادر کا فرنگی مر گیا، دلّی جاگ گئی۔

(Fire کی آواز کے ساتھ یوسف مرزا کی بھیانک چیخ اور شور)

غالب: (دروازہ کھول کر دیکھتے ہیں۔ چوبدار یوسف مرزا کی لاش کو اندر لاتا ہے خون بہہ رہا ہے) گولی ماردی۔ اسے کیوں گولی ماردی؟ وہ کون سے ملک کا بادشاہ تھا۔ کیا کیا تھا اس نے۔ میرے دیوانے بھائی نے ان ظالموں کا کیا بگاڑا تھا۔ (بیگم لاش پر آہ وبکا کرنے لگتی ہیں۔ غالب انھیں روکتے ہیں)، نہ رو بیگم۔ اب رونے سے کیا ہوگا۔ میرا دیوانہ بھائی اب اس دنیا میں نہیں۔ سب کچھ لٹ گیا۔ خدا نے اسے ایک زندگی دی تھی وہ بھی لوٹ لی۔ ایک بار اس دنیا میں آنا اور اس قدر ناکامی و نامرادی سے رخصت ہونا، زندگی کا ایسا انمول تحفہ اور اتنی بڑی سزا۔ ایسا بیش بہا موتی اور اس طرح کیچڑ میں بہا دیا جائے۔

مرزا: مگر پھر تم نے ۱۸۵۸ء کے اندر فارسی روزنامچے میں یہ سب کیوں نہیں لکھا۔

غالب: تم نے مجھے کہاں لکھنے دیا امیر زادے نے میرے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔ شاعر تو مجاہد بھی بن سکتا تھا مگر امیر زادہ بزدل ہوتا ہے اسے تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا اسے تو انگریزوں کے دربار کی اگلی صف میں جگہ چاہیے تھی خطاب درکار تھا جھوٹی عزت چاہیے تھی تم میری کمزوری تھے اور میں نے جھوٹ لکھ دیا کہ میرا دیوانہ بھائی بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ میں یہ نہ لکھ سکا کہ انگریز سپاہیوں نے اسے گولی ماردی تھی۔ یہ بھی نہ لکھ سکا کہ میں

نے بہادر شاہ کی حکومت دوبارہ قائم ہو جانے پر ''سکہ'' کہہ کر دیا تھا۔

مرزا: الزام میرے سر رکھتے ہو تمھیں اندازہ نہیں تھا کہ حالات اس طرح پلٹا کھائیں گے۔

غالب: امیر زادے کو ان حالات کا پتہ ہونا چاہیے تھا۔ شاعر تو اپنی دنیا آپ ہے۔ میں صرف شعر گنگنا کر خاموش ہو گیا۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں ، حرم نہیں در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرزا: شاعر اچھے ہو غالب۔

غالب: قدر افزائی کا شکریہ ظل سبحانی نے بھی ایک بار غزل سن کر فرمایا۔ مرزا پڑھتے خوب ہو۔

مرزا: یہ بتاؤ کہ زندگی ایسی بے دردی سے گزارنے کے بعد ایسے بے پناہ شعر کیسے کہہ لیے تم نے مجھے خبر بھی نہیں دی۔

غالب: امیر زادوں کو کس کی خبر ہوتی ہے، تم جانتے نہیں یا جان بوجھ کر انجان بنتے ہو، میں اگر کامیاب ہو جاتا تو پنشن پالیتا، خلعت اور منصب مجھے مل جاتا میں بھی اپنے باپ چچا کی طرح رسالدار ہو جاتا۔ تو میں امیر زادوں ہی کی باتیں کرتا، کھوکھلی بے سر و پا سطحی، مگر درد نے مجھے اس دلدل سے نکال کر پورے زمانے کے انسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ میں نے اپنے زمانے کا درد لے لیا، میں اپنے دور کے سبھی انسانوں کی عبرت اور عظمت کا مرقع بن گیا میں نے کہا ہے۔

مرزا: پھر شعر سناؤ گے۔

غالب: نہیں، شعر فہمی تم میں کہاں، تمھیں ترجمہ سناتا ہوں۔'' اس نے چہرہ بے نقاب کر دیا۔ میرے بے ہودہ بکنے والے ہونٹوں پر مہر لگا دی ہے میرا دل لے لیا اور دیکھنے والی دو

آنکھیں دے دیں میرے ہاتھ سے پادشاہان عجم کا نشان لے لیا گیا اور اس کے بدلے میں خزانے بخشنے والا قلم دے دیا۔" یہ شاعری جس کی تم کبھی کبھی تعریف کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اس کا حق ادا ہو گیا ہے یہ شاعری میری پوری زندگی کے دکھ درد کا مول ہے۔

مرزا: دکھ درد کی بات نہ کرو۔ مزے سے شراب پیتے ہو، چین سے خط لکھتے ہو، بڑھاپے میں بھی تمھارے اوپر جان چھڑکنے والے دوست اور شاگرد بھی موجود تھے۔

غالب: اور قاطع برہان کے ہنگامے پر گالیاں دینے والے؟

مرزا: اس ہنگامے میں تم خواہ مخواہ پڑ گئے، اپنا علم و فضل جتانے کے لیے۔

غالب: شاعر کو لفظ اور لغت پر اظہار خیال کی آزادی نہیں دو گے۔

مرزا: تمھاری اکثر رائیں غلط تھیں۔

غالب: کیا مجھے غلط رائے رکھنے کا حق نہیں تھا۔

مرزا: ہوگا، میں کہہ رہا تھا کہ بڑھاپے میں تمھیں سبھی عیش مل گئے تھے شہرت، بچوں کا سکھ، عارف کے بچے کیا کیا مزے کرتے تھے۔ پلنگ کی صاف چادروں پر میلے میلے پاؤں لے کر چڑھتے، کیا کیا تنگ کرتے تھے۔

غالب: ہاں انھیں کو تو میں نے اپنے خطوں میں ہتھکڑیاں کہا ہے۔ انھوں نے زندگی کا موہ پیدا کر دیا۔

مرزا: پھر نواب رام پور جیسے قدردان جو برابر سے ملتے تھے اور سلوک کرتے تھے۔

غالب: میری مسرتوں کو روپے پیسے، دوستوں اور خاندان کے دکھ سکھ سے ناپتے ہو، بڑے نادان ہو۔

مرزا: احسان فراموش ہو، امیرزادے نہ ہوتے تو زندگی سے پیار کرنا نہ سیکھتے، عیش کا مطلب نہ سمجھتے، عزت کی تڑپ سے واقف نہ ہوتے۔

غالب: اور ان نعمتوں کے لیے جب تڑپتا ہوں تو تم ہنستے ہو، زندگی بھر میں روتا رہا اور تم ہنستے رہے..... تم نے زندگی سے بے پناہ پیار سکھایا مگر فقط اس کا لالچ دیا، اس کا عرفان نہیں دیا۔ شاعری کیا ہے مرزا، صرف زندگی اور حسن سے بے پناہ پیار۔ اس کی لذت، اس

کے بے پناہ خوبصورتی سے لگاؤ۔ پھر اپنی تنگ دامنی کو دیکھتا ہوں تو تڑپتا ہوں، اپنی مجبوری پر روتا ہوں، اپنی نارسائی پر، اگر کوئی مستی اور محرومی کا شاعر ہو سکتا ہے تو میں ہوں مرزا۔اور محرومی کے اس دوراہے پر بانکپن سے اپنی ٹوپی ٹیڑھی کرتا ہوں اور غم پر قہقہہ لگاتا ہوں، میں نے آبگینے کے ٹکڑے گلا کر شراب میں ڈال لیے ہیں کہ سینہ زخمی ہو اور لب مسکراتے رہیں۔

مرزا: یہ ہمت!

غالب: یہ ہمت ہی میرے اور تمھارے درمیان مشترک ہے۔ یہ ہمت ہی میرے اور آج کے زمانے کے درمیان ہے۔ یہ ہمت ہی مجھے زندہ رکھتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں آج کے نوجوان کے چہرے۔

مرجھائے ہوئے اور اداس ہیں مگر میں نے دیکھا ہے کہ جب میرا دیوان پڑھتے ہیں۔

مرزا: وہی چھوٹا سا اردو دیوان!

غالب: جی ہاں وہ پڑھتے ہیں تو ان کے چہروں پر اک حوصلہ ابھرتا ہے یہ کہ وہ زندگی سے ہاریں گے نہیں، یہ کہ وہ آرزومندی کی تڑپ سے دامن نہیں بچائیں گے، وہ پھر چاہیں گے دل کی گہرائیوں سے، پھر تمنا کریں گے اور پھر ٹوٹتی آرزوؤں کی جہنموں سے گزریں گے۔

مرزا: تمھارہ شکوہ پورا ہوا مگر میں۔

غالب: تمھارا کیا ہے؟ تم ہزاروں، لاکھوں امیر زادوں کی طرح ایک امیر زادے تھے، عیش کیے یا عیش کی تمنا کی اور واپس چلے گئے۔

مرزا: ہر وجود ایک سوال ہے، میرا وجود ایک ایسے زمانے میں جب تمام چیزیں جو مجھے عزیز تھیں مٹ رہی تھیں۔ بہت بڑا سوال تھا۔ تمھیں کیا حق تھا کہ اس طرح مجھ سے کھیلو، جو مجھے عزیز تھا وہ مجھ سے چھین لیا اور جو کچھ آنے والا ہے اسے قبول کرنے پر مجھے مجبور کرو۔ صبح کے وقت تم نے کبھی چراغوں کی بے بسی دیکھی ہے تم تو شاعر ہو...... کیا تم نے بھی اس ادھورے پن کو محسوس نہ کر سکے اور آج اس ادھورے انسان پر رونے والا بھی کوئی

نہیں ہے۔ تمھارے سب پجاری ہیں۔ شاعر غالب کے سب شیدائی ہیں لیکن مرزا نوشہ کا کوئی ہمدم، کوئی دوست، کوئی آشنا نہیں۔ (دروازے پر دستک ہوتی ہے) غالب کھولنے جاتے ہیں۔ اس بار مرزا نوشہ نہیں روکتے۔ دروازہ کھولنا چاہتے ہیں پھر کچھ سوچ کر خود ہی دروازہ کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیتے ہیں۔

(پس منظر سے غزل کے اشعار ابھرتے ہیں)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(پردہ گرتا ہے)

☆☆☆

(چھ مناظر میں ایک ڈراما)

محمد حسن

پروفیسر و صدر ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۶۷

ادارۂ تصنیف، ڈی ۷۔ ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۱۱۰۰۰۹

۱۹۸۰

قیمت دس روپے

تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰
سال اشاعت	:	مارچ ۱۹۸۰ء
مطبع	:	فائن آفسیٹ پریس، دہلی
قیمت	:	دس روپے

انتساب

دنیا کے دبے کچلے عوام کے نام

یہ لوگ جن کو خدا بننے کی نہیں خواہش
یہ لوگ جن کی شب ماہ نہ صبح چمن......
یہ لوگ جن کی کوئی شکل ہے نہ تاریخیں
ہنسی میں ڈھال کے جیتے ہیں یوں ہی رنج و محن......
خدائے حاضر و غائب کی ہیں یہ وہ بھیڑیں
جنھیں چراتے ہیں صدیوں سے رہبرانِ وطن
یہ لوگ جو ہیں ہر اک فن کا خام سرمایہ
انھیں سے باندھا ہے میں نے حیات کا دامن

محمد حسن

پیش لفظ

ڈاکٹر محمد حسن اُردو کے ممتاز نقادوں میں سے ہیں۔ اگلے زمانے کی کہاوت تھی بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ اسی کی تقلید میں کسی (غیر موزوں طریقے پر) لکھا تھا کہ بگڑا (ناکام) تخلیق کار نقاد بن جاتا ہے۔ یہ سچ ہو کہ نہ ہو کہ اس کا اُلٹا ضرور درست معلوم ہوتا ہے کہ عموماً اچھے نقاد کامیاب تخلیقی ادیب نہیں ہوتے گو ان کا منہ دیکھنے والے مرید انہیں کتنا ہی اُڑانا چاہیں۔ اس مفروضے میں کچھ استثنا بھی ہیں جس کی روشن مثال ڈاکٹر محمد حسن ہیں۔ وہ تخلیق کے ایک شعبے ڈراما نگاری میں اتنے رسیدہ ہیں کہ ایوان غالب والا غالب انسٹیٹیوٹ انہیں غالب انعام دینے پر مجبور ہوا۔ واضح ہو کہ ڈراما نگاری کی اہمیت کسی دوسری صنف سے کم نہیں۔ کالی داس اور شیکسپیئر ڈرامے لکھ کر ہی آب حیات چکھ گئے۔ یونان میں ڈراما نگاروں کی اہمیت رزمیہ نگاروں سے کم نہ تھی۔ اردو میں اچھے ڈراما نگار کبریت احمر ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ نقاد محمد حسن کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے۔ ان کے متعدد ڈرامے شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

موصوف کا ڈراما ضحاک بہت مشہور بلکہ معرکہ آرا ثابت ہوا۔ یہ پہلی بار عصری ادب شمارہ ۲۷۔۲۸ بابت جنوری اپریل ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اب جب کہ یہ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے مصنف نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کا پیش لفظ لکھ دوں۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا لیکن مصنف کے، جو میرے کرم فرما ہیں، امتثال امر پر مجبور ہوں۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ یہ ڈراما معرکہ آرا بلکہ معرکہ خیز ہے۔ اس پر کچھ اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اگر میں انھیں دری کے نیچے کھسکا کر ان سے چشم پوشی کروں تو حقیقت دھندلائی رہے گی۔ میں ان سے آنکھیں چار کرنا چاہتا ہوں۔

عصری ادب میں ڈرامے کے آخر میں نوٹ ہے۔

"ایمرجنسی کے دوران لکھا ہوا اسٹیج ڈراما جو شائع ہونے کی توقع کے بغیر لکھا گیا تھا"۔

غالب ایک بار اداکاری کر چکے ہیں۔ انھوں نے ظاہر کیا تھا کہ دستنبو دورانِ غدر میں گھر کا دروازہ بند کر کے اپنی سرگزشت اور روزانہ مشاہدے کے مطابق لکھی تھی۔ دراصل اس میں زمانہ سازی کے ساتھ ڈوبتے سورج کی تحقیر اور اُبھرتے سورج کی تعریف تھی۔ ضحاک کے مصنف پر بھی معاندوں بلکہ بعض دیانت دار مشککوں کو بھی یہی شک ہوا کہ یہ ڈراما حالات کا رخ دیکھ لینے کے بعد لکھا گیا ہے۔ میرے ایک سابق شاگرد ڈاکٹر اخلاق اثر نے ۱۵ر جنوری ۱۹۷۹ء کو مجھے ایک خط میں لکھا۔

"یہ میرے علم میں ہے کہ انھوں نے ایمرجنسی کے زمانہ میں ابتدائی حصہ لکھا تھا اور میرے ایک شناسا کو سنایا تھا"۔

ابتدائے تصنیف کی تصدیق تو ہوگئی تکمیل کب ہوئی۔ اس کے بارے میں میں نے براہِ راست مصنف سے دریافت کیا جس کے بعد مجھے اطمینان ہوگیا کہ یہ ڈراما مکمل بھی ایمرجنسی کے دوران ہوا۔ انھوں نے ۲۱ر دسمبر ۱۹۷۹ء کے مکتوب میں مجھے بتایا کہ ڈرامے کے ابتدائی سین کا کچھ حصہ ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء میں لکھا گیا ہے۔ ہندو پاک جنگ کے بعد اردو کا بڑے سے بڑا شاعر نظمیں لکھ کر حکومت کی پالیسی کی خوشامدانہ حمایت کر رہا تھا اور یہی ڈراما کی تصنیف کا محرک ہوا۔ اس وقت مصنف نے ڈرامے کا آغاز کیا لیکن چار چھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے۔ ان کی تکمیل ایمرجنسی کے دوران ہوئی۔

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ڈرامے میں شاعر کے کردار کے پشِ پُشت کون سخن سنج تھا۔

ڈاکٹر محمد حسن کے بیان کے مطابق وہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کسی اجتماع میں یہ ڈراما سنانا چاہتے تھے لیکن ایک بہی خواہ نے مشورہ دیا کہ اسے مجمع عام میں ہرگز نہ پڑھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے طلبہ کے کسی اجتماع میں اس کے ایک یا دو سین پڑھے اور آگے کا حصہ نہ سنانے کے لیے یہ حیلہ تراش دیا کہ ابھی ڈراما نا تمام ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اخلاق اثر کے شناسا انھیں طالب علموں میں سے کوئی رہے ہوں گے۔ لیکن تخلیق کار کو تخلیق کرنے کے بعد

اسے منظر عام پر لائے بغیر کب چین پڑتا ہے۔ اگلے ہی مہینے اکتوبر ۷۶ء میں چند مخصوص طلبہ اور دو ایک اساتذہ کو لے کر انھوں نے اپنے کمرے میں پورا ڈراما پڑھ کر سنایا۔ اس وقت تک تحریر و تقریر کی بندشیں ڈھیلی نہ ہوئی تھیں۔ فروری یا مارچ ۷۷ء میں یہ دلّی کے سری رام سنٹر میں اسٹیج کیا گیا۔

ان واضح شہادتوں پر باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سب سے مضبوط اور روشن دلیل یہ ہے کہ وہ ڈرامے کو اس وقت کتابی صورت میں شائع کرنے پر مصر ہیں جب کہ وہی پارٹی برسرِ اقتدار آ گئی ہے جو ایمر جنسی کا سرچشمہ تھی۔ کوئی زمانہ شناس یا بزدلا یہ جُرأتِ رندانہ نہ کرتا۔ ان کی احتجاجی جُرأت کا مزید ثبوت چاہیے تو عصری ادب کے شمارہ ۳۹-۴۰ میں ان کے مضامین میں ایمر جنسی پر تنقید دیکھیے جو اندرا کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کی گئی ہے۔

دوسرا اعتراض ہے کہ یہ ڈراما اختر شیرانی کے ڈرامے ضحاک یا اس کی ترکی اصل سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں زرد اخباروں میں جو بحثیں ہوئی ہیں وہ میری نظر سے نہیں گزریں لیکن ان کی بھنک میرے کان میں پڑی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر محمد حسن نے اختر شیرانی سے سرقہ کیا ہے لیکن اپنے ماخذ کا اعتراف نہیں کیا۔ اختر شیرانی کا ڈراما کسے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کا ذکر ڈاکٹر یونس حسنی کے تحقیقی مقالے "اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب" میں ص ۳۲۸ سے ۳۳۷ تک میں ہے۔ یونس حسنی نے یہ کام حمیدیہ کالج بھوپال میں کیا تھا۔ اب وہ کراچی کے ایک کالج میں استاد ہیں۔ ان کی کتاب انجمن ترقی اُردو پاکستان سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔

اختر شیرانی کے ڈرامے کے بارے میں یونس حسنی لکھتے ہیں۔

"یہ ایک ترکی ادیب سامی بک (ترکی تلفظ بے) کے ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ جو رفیق عام پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔ کتاب پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے یہ کتاب کمیاب ہے۔ یہ ڈراما ۱۹۲۷ء میں بالاقساط بہارستان میں شائع ہوتا رہا اس لیے قیاس ہے کہ کتابی صورت میں ۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوا ہوگا"۔ (۱)

سامی بے نے یہ ڈراما "گاوے" کے نام سے ۱۸۷۷ء میں تصنیف کیا۔ اختر شیرانی ترکی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے اس کے کسی ترجمے سے ترجمہ کیا ہوگا۔ ڈاکٹر اخلاق اثر لکھتے ہیں:

"میں اپنی کوشش کے باوجود سامی بے کا ڈراما اور اختر شیرانی کا ترجمہ حاصل نہیں کر سکا

ہوں''۔(۲)

ڈاکٹر محمد حسن پر سرقے کا اعتراض معترض کی کم نظری کا غماز ہے۔ ضحاک کا قصہ نہ اختر شیرانی کی جاگیر ہے نہ سامی بے کی۔ یہ فردوسی کے شاہنامے کے ابتدائی حصے کا ایک قصہ ہے جس سے ہر پڑھالکھا واقف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ۲۱ ردسمبر ۱۹۷۹ء کو ایک خط میں مجھے لکھا۔

''حقیقت صرف یہ ہے کہ حسنی صاحب کا تحقیقی مقالہ میری نظر سے اس Controversy کے بعد گزرا ہے۔ مجھے یہ مقالہ پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری نے منجملہ دیگر مطبوعات کے ۱۹۷۷ء میں دیا۔ اس وقت ضحاک چھپ چکا تھا............ میں نے جو کچھ ضحاک کے بارے میں لیا ہے وہ رجب علی بیگ سرور کی کتاب سے ماخوذ ہے اور اس میں نمک مرچ اپنے آپ لگایا ہے سامی بے سے میری واقفیت چند ماہ پُرانی ہے''۔

اس طرح حقیقت خود مصنف کی زبانی افشا ہوگئی ہے۔ شاہنامے کا فارسی نثری خلاصہ شمشیر خانی ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے اس کا ترجمہ سرورِ سلطانی کے نام سے کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا ماخذ صرف یہی ہے۔ ان کے ماخذ میں ترکی ڈرامے کا نام لینا دور کی کوڑی لانا ہے۔ لیکن جہاں تک اختر شیرانی کے ڈرامے کا تعلق ہے محمد حسن کا ڈراما اس سے بہت مختلف اور بہت ترقی یافتہ ہے۔ جس طرح تاریخی ناول میں بنیادی پلاٹ اور کردار تاریخ سے لیے جاتے ہیں لیکن قصے کی جزئیات اور ضمنی کردار مصنف کے تخیل کی تخلیق ہوتے ہیں۔ اسی طرح سامی بے اور ڈاکٹر محمد حسن دونوں نے قصے کا ڈھانچہ شاہنامے سے لیا اور اس میں ضمنی کرداروں اور واقعات کا اضافہ اپنے اپنے تخیل کے مطابق کیا۔

اختر شیرانی رومان پرست تھے۔ ان کے ڈرامے ضحاک کی روح رومانی ہے انھوں نے اس میں ایک معاشقے کا شاخسانہ بھی نکال لیا ہے۔ اس کا ہیرو پرویز (فریدوں) جمشید کا نواسا ہے۔ خوب چہر جو ظاہر میں ضحاک کی بیٹی لیکن دراصل جمشید کی نواسی ہے۔ پرویز کی چچیری بہن ہے۔ پرویز بنتِ عم سے عشق کرتا ہے۔ چنانچہ ڈرامے میں عشقیہ اشعار اور غزل بھی ہیں اور کئی بڑے مترنم کورس بھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ڈرامے کی روح بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے بڑی چابک دستی سے ایک اساطیری واقعہ کو ایک سیاسی تمثیل بنا کر اسے ہندوستان کی ایمرجنسی حکومت پر چسپاں کر دیا ہے۔

اردو کے کئی مشہور قصوں پر کئی شخصوں نے طبع آزمائی کی اور ان میں سب سے پہلا لکھنے والا

سب سے بہتر نہ تھا۔ چار درویش کے قصے کو تحسین نے بھی لکھا اور ان کے بعد میر امن نے بھی۔ امن کا ماخذ تحسین کا نسخہ ہی ہے۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے اپنے ماخذ کا اعتراف نہیں کیا۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ باغ و بہار کے پہلے ایڈیشن میں امن نے برملا اعتراف کیا تھا۔ اس سے باغ و بہار کی وقعت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ دیا شنکر نسیم پر الزام لگایا گیا کہ مثنوی گلزار نسیم کا ماخذ ریحان لکھنوی کی مثنوی خیابانِ ریحان ہے۔ جس کا نسیم نے اعتراف نہیں کیا۔ بجا ہے۔ یہ مثنوی نسیم کی نظر سے ضرور گزری تھی اور اس کے بعض مصرعوں کا عکس گلزار نسیم کے مصرعوں میں جھلملاتا ہے۔ لیکن دونوں مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک مثال دیکھیے۔ بکاولی تاج الملوک کو خط لکھتی ہے تو ریحان کے یہاں یہ الفاظ ہیں۔

اے کبک خرام باغ یاری　　　طاؤسِ جنانِ دوست داری
لکھوں الم فراق کی بات　　　یا کثرتِ اشتیاق کی بات
جب سے نظر آئی تیری صورت　　　ہے دل پہ عجب طرح کی حالت
کر جا مرے جی پہ مہربانی　　　آ جا مری جان کی سوں جانی

پریوں کی خودسر شہزادی کو ریحان نے ہمہ نیاز بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس گلزار نسیم میں دیکھیے۔ بکاولی کس بلندی اور کس تمکنت سے خطاب کرتی ہے۔

تو باغ ارم سے لے گیا گل　　　تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل
بے رخ ترے واسطے ہوئی میں　　　فرخ ترے واسطے ہوئی میں
جو جو اسرار تھے نہانی　　　سب تجھ سے سنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے　　　جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
اب تک ہیں وہ خارجی کے جی میں　　　جلد آ کہ ہے مصلحت اسی میں
داغوں پہ دیئے ہیں داغ تو نے　　　دکھلائے ہیں سبز باغ تو نے
کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا　　　تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

دیکھیے نسیم نے کس طرح بکاؤلی کے کردار کی تفسیر کی ہے۔ پھر ریحان سے استفادہ کا الزام کیا معنی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اختر شیرانی کے بعد ضحاک کے موضوع کو اسی طرح ترقی

دی۔ اختر شیرانی کے یہاں محض رومانیت تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کے یہاں مقصدیت غالب ہے۔
میں نے حیدر آباد کی مرکزی یونیورسٹی کا ایم اے اردو کا نصاب تیار کیا تو مجھے ڈرامے کے کورس کے لیے ایک ہم عصر ڈرامے کی تلاش ہوئی جو کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے بعد کی نسل کی تخلیق ہو۔ میں نے ڈاکٹر محمد حسن کے ڈرامے ضحاک کو اپنے ڈھب کا پایا۔ اور فیصلہ کیا کہ یہ ڈراما ہماری ضروریات کے لیے موزوں ہے۔

اردو نثر میں کسی نے شاہنامے کے قصوں کو دو یا تین چھوٹی جلدوں کی کتاب میں لکھا ہے۔
جب میں سیوہارے میں ساتویں یا آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کے اہم کرداروں کے شجرے کو ذہن نشین کرلیا۔ اب معلوم نہیں ہو پاتا کہ وہ کون سی کتاب تھی اور اس کا مصنف کون تھا اس کتاب سے میرے ذہن میں ضحاک و فریدوں کے قصے کی جو جزئیات نقش ہیں ان میں اور ڈاکٹر محمد حسن کے بیان میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً جہاں تک مجھے یاد ہے شاہنامے میں ضحاک کے سانپوں کے لیے روزانہ دو انسانوں کے بھیجے درکار تھے۔
ڈاکٹر محمد حسن کے شیطان نے صبح شام دو دو انسانوں یعنی کل چار انسانوں کی تجویز کی ہے۔ لیکن ڈرامے کے آخری حصے میں روزانہ سات انسانوں کو شکار کیا ہے۔ سامی بے اور اختر شیرانی نے صرف بچوں کے مغز کھلائے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ڈرامے کے پلاٹ میں حسب ذیل واقعات ان کے اضافے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ شیطان ضحاک کے روگ کا مداوا تجویز کرنے کے معاوضے میں اس کی روح کا سودا کرلیتا ہے۔ یہ خیال گیٹے کے ڈرامے فاؤسٹ سے لیا گیا ہے۔ پلاٹ کے آخری حصے میں اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے جب شیطان دوبارہ ظاہر ہو کر ضحاک کی روح کو اپنی ملک بتاتا ہے۔

۲۔ یہ بات راز رکھی جاتی ہے کہ ضحاک کے کندھے پر دو سانپ ہیں جنھیں ہر روز دو بار دو انسانوں کے بھیجے درکار ہیں جو اسے لب پر لائے گا وہ سر گنوائے گا۔

۳۔ فریدوں ایک بار ضحاک کا اسیر ہو کر اس کے سامنے لایا گیا۔ ضحاک کی بیگم نوشابہ نے فریدوں کی تربیت اپنے ذمہ لے لی۔ رات کو فریدوں کو زنداں سے بلا کر اس سے بوس و کنار کی خواہش کی۔ فریدوں کے انکار پر اسے پھر جیل میں بھیج دیا گیا لیکن رات کو زنداں کے دروازے

کھلے رکھے گئے۔ جس سے فریدوں فرار ہو گیا۔ اس جرم کی یاداش پر آخر میں نوشابہ بھی ماخوذ کر کے قتل کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

ضحاک کا افسانہ قبلِ تاریخ دور کے ایرانی اساطیر کا حصہ ہے مختلف روایات میں اس کی جزئیات میں اختلاف ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ معروف شاہنامے میں دیا ہوا قصہ ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ڈرامائی ضروریات کے تحت متعدد جزئیات اپنی طرف سے اختراع کر کے شامل کی ہیں۔

یہ یقینی ہے کہ یہ ڈراما ایک سیاسی تمثیل ہے۔ اس کا موضوع جبر و استبداد کے خلاف شدید احتجاج ہے۔ مصنف کے ذہن پر ایمر جنسی کا نقشہ طاری ہے اور یہ مسلسل تمثیل کے باریک پردے سے جھانکتا رہتا ہے۔ فوج، فن کار، یعنی شاعر، رقص کار، معلم، عدلیہ سب جفا کار کے ساتھ ہیں۔ سب کا ضمیر کچو کے دیتا ہے اور ایک بار مل کر اپنی اپنی ضمیر فروشی کا ماتم کرتے ہیں۔ لیکن خفیہ آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے۔ انھیں گرفتار کر کے جلاد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

ایمر جنسی کے آئینہ دار ذیل کے جملے ملاحظہ ہوں۔

''پوچھنے والوں کی زبانیں گدی سے کھینچ لو۔ شک کرنے والے دل ان کے سینے سے چیر کر نکال لو۔ ہماری مملکت میں سوال جرم ہے''۔ ص ۴۱

''اور بجنل بات کو نقل کرنا جرم ہے''۔ ص ۴۴

(صفحات کے نمبر عصری ادب شمارہ ۲۷۔۲۸ بابت جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء کے مطابق ہیں)

یہ اس سیاق میں دیکھیے کہ ایمر جنسی میں ٹیگور، مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے بعض اقوال نقل کرنا بھی ممنوع تھا۔

''تم میں سے کسی کا بھی قد تلوار سے لمبا نہیں''۔ ص ۴۹

''پیداوار کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آبادی کا کم کرنا ضروری ہوا تو مردوں کو آختہ کرایا''۔ ص ۵۱

ایمر جنسی میں علم و فن اور دوسرے محترم اداروں کی کس طرح تذلیل ہوئی تھی وہ اس ڈرامے میں دیکھیے۔ فوجی افسر سارا پردہ چاک کر کے سینہ زوری سے روزان کی آنکھوں میں جھونک دیتا ہے۔

”تم اپنی چمک دار قباؤں اور اعزازات کی لمبی لمبی فہرستوں کے باوجود ہمارے غلام ہو غلام — اس سے آگے کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں“۔ص ۴۹

پُر لطف چیز یہ ہے کہ مصنف نے مہاتما گاندھی کے اقوال کو ایمر جنسی کی زیادتیوں پر خوب چسپاں کیا۔ قیدیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ کانوں میں روئی ٹھونسی جاتی ہے اور ہونٹ سی دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ نہ دیکھیں، برا نہ سنیں اور بُرا نہ بولیں۔

ان جستہ جستہ جملوں سے استبداد کے خلاف مصنف کا چیختا احتجاج آئینہ نہیں ہوتا۔ ان کے عقیدے کی شدت اور ان کے بیان کا زور ڈرامے کے مطالعے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ دم بھر کو میں یہ فراموش کر دیتا ہوں کہ یہ ڈراما کس نے اور کب لکھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے تخلیقی ادب میں ایمر جنسی کے خلاف اتنا پر زور، اتنا شدید، اتنا رچا ہوا اور ساری فضا پر چھایا ہوا احتجاج اور کہیں نہیں ملتا۔

ڈاکٹر محمد حسن اس ڈرامے میں حسب موقع اپنے مارکسی نظریات کا عرق لیمو چھڑکتے ہیں جس کی وجہ سے یہ ڈراما صرف ایمر جنسی کے خلاف نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بھی نعرۂ جنگ بن جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”کم کام کرنے اور زیادہ اُجرت مانگنے والے مزدور اور کاہل کسانوں کو گورخر کی کھال میں زندہ سلوادیا“۔ص ۵۱

”ایک دن محنت کا خونی جھنڈا اٹھائے اس کا گروہ ہمارے تخت کو پلٹ دے گا“۔ص ۵۲

”زندگی بھر ان ہاتھوں نے ہل اور ہنسیا کے سہارے بنجر زمینوں میں بھی پھول کھلائے“ ص ۵۹

”تم اور تمہارے کروڑوں، اربوں، مفلس، نادار کسان، مزدور دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ تمہارے ہاتھوں کی کمائی دولت سے ہم نے تمہارے خلاف پوری دنیا خرید لی ہے، سائنس ہماری غلام ہے، مذہب ہمارا دلال، علم و دانش پر ہماری ٹھیکیداری ہے۔ فوجیں، ہتھیار، فتوحات کے وسیلے، انصاف، قانون سب ہمارے زر خرید ہیں۔ تم نہتے ہاتھوں سے کب تک ان زبردست قوتوں کا مقابلہ کرو گے“۔ص ۶۳

”دن بھر تمہاری پچاس منزلہ عمارت کے ٹانڈ پر صلیب سے بندھے رہتے ہیں کہ تمہارے

لیے محلات تیار کر سکیں، زمین کی اندھیری راتوں میں گھس کر تمہارے آتش دانوں کے لیے کوئلہ اور تمہاری صنعتوں کے لیے تیل نکال لاتے ہیں۔ تپتی ہوئی بھٹیوں کے درمیان زندہ رہ کر تمہاری مشینیں چلاتے اور کارخانے آباد کرتے ہیں..... جھلساتی دھوپ میں کھڑے ہو کر ہل چلاتے ہیں"۔ ص ۴۷

"کیا سرکاری وردی پہن کر تم سب یہ بھول گئے کہ تم کسان اور محنت کش مزدور کے بیٹے ہو جنھیں کھیت، کھلیانوں فیکٹریوں اور بازاروں سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ کیا زندگی بھر دوسروں کے لیے خون اور پسینہ بہانے کے بعد بھی تم ایک لمحے کے لیے اپنے واسطے جینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے"۔ ص ۷۶

تاریخی ناول اور تاریخی ڈرامے میں مصنف کو یہ مشکل رہتی ہے کہ اس کی اضافہ شدہ جزئیات تاریخی حقائق کے دودھ میں تخئیلیت کا پانی ملا دیتی ہیں۔ اگر ماضی کے بیان میں حال کے تہذیبی ارکان کو ٹانک دیا جائے تو اس کا جواز ہے کہ نہیں شرر پر اعتراض کیا گیا تھا کہ اس نے عہد وسطیٰ کے سپاہیوں کو انگریزی فوجیوں کی طرح وردی میں ملبوس کر کے پریڈ کرادای ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن ایک قبل تاریخ دور کے دیو مالائی کرداروں پر لکھ رہے ہیں۔ بادی النظر میں اس میں اس قسم کی جدید ایجادات اور اداروں کا ذکر دیکھ حیرت ہوتی ہے۔

ٹیپ رکارڈ اور کیمرے ۴۵۔ آئین کے مطابق ۴۶۔ انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج ۴۶۔ نائب سربراہ (وائس چانسلر) اور سربراہ (چانسلر) ۴۷۔ توپوں کے دہانے ۵۶۔ ٹیلی فون ۶۴۔ مار یے گولی ۶۸۔ عالمی عدالت کا سربراہ ۷۰۔ فوٹو گرافر ۷۱۔

مکالموں کے بیچ انگریزی الفاظ اور فقرے بے موقع اور غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کے بغیر آسانی سے کام چل سکتا تھا۔

State Secret ۴۱۔ لان ۴۶۔ جج ۶۸ Is that clear او کے ۷۱۔

میں نے اپنی کھٹک ڈاکٹر محمد حسن کو لکھ بھیجی۔ انھوں نے ۱۵ر جنوری ۱۹۸۰ء کو ایک مکتوب میں مجھے لکھا۔

"جہاں تک جدید دور کے ایجادات کے تذکرے کا تعلق ہے۔ صورت یہ ہے کہ ڈرامے

کی ایک پرانی روایت تھی اور ایک نئی ہے۔ پرانی روایت جو یونان سے لے کر شکسپیر اور ابسن تک جاری تھی یہ تھی کہ ناظرین کو ڈرامے پر اصل زندگی کا دھوکا ہو اور انھیں یاد ہی نہ رہے کہ وہ ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ نئی روایت جسے جرمن ڈراما نگار بریخت نے شروع کیا یہ ہے کہ ناظرین کو قدم قدم پر یاد دلایا جائے کہ وہ ڈراما ہی دیکھ رہے ہیں۔ زندگی نہیں یعنی زندگی کا الیوژن توڑ دیا جائے۔ یہی روایت آج کل ڈرامے میں رائج ہے اور اس کو میں نے برتا ہے۔ خاص طور پر یہ اس لیے میرے مقصد کے لیے سودمند تھی یاد دلانا چاہتا تھا کہ ضحاک کا دور ختم نہیں ہوا اور یہ کسی پرانے دور کی نہیں ہر دور کی کہانی ہے۔ قدیم اساطیر میں جدید ایجادات کو ملا کر الیوژن توڑا بھی جا سکتا تھا اور اسے زمانے کی قید سے آزاد بھی کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے ٹیلی وژن، رپوٹر وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ نادانستہ نہیں دانستہ اور شعوری ہے''۔

چونکہ میں نے جدید مغربی ادب کا مطالعہ نہیں کیا اس لیے میں بریختی ڈرامے سے واقف نہ تھا۔ میں نے اپنی یونیورسٹی کے انگریزی کے ایک استاد سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس صدی کے نصف اول میں بریخت نے ڈرامے کو جذباتی کے بجائے انٹلکچول بنا دیا۔ اس کی پیش کش میں حاضرین اور اداکاروں کے بیچ ایک مغائرت اور فاصلہ ہوتا ہے۔ اسٹیج کے اوپر کبھی کوئی تبصرہ کرنے والا اسٹیج کے ایک کونے پر کھڑا ہو کر حاضرین کو مخاطب کر کے تبصرہ کر دیتا ہے کبھی کسی اسکرین پر کچھ لکھ کر آ جاتا ہے۔ غرض یہ کہ طرح طرح سے ڈرامے کا بھرم توڑ کر سامعین کو غور و خوض کی دعوت دی جاتی ہے۔ اردو میں قدیم داستانی کرداروں مثلاً چار درویش، سند باد جہازی، علی بابا، الہ دین وغیرہ کو دوسروں نے جدید دور پر منطبق کیا ہے لیکن وہ بالعموم مزاحیہ یا پیروڈی کا رنگ لیے ہوتا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے قدیم و جدید کے امتزاج سے قارئین کو جھنجھوڑ کر بتایا ہے کہ اس ڈرامے کا اطلاق عہد عتیق ہی پر نہیں جدید پر بھی ہوتا ہے۔

مصنف ایک موقع پر اردو کی جدید شاعری پر چھینٹا اڑاتے ہیں اور ان کا یہ طنز تبسم آفریں ہے۔

''شاعر۔ ہر بات سمجھنے کے لیے کہاں ہوتی ہے۔ حسن معنی سے آزاد ہو چکا ہے۔'' ص ۴۳

مصنف دو جگہ التباس کر گئے ہیں۔ جس شخص کو وہ مقنن کہتے ہیں۔ بعد میں وہ جج ثابت ہوتا ہے۔ مصنف عدلیہ اور مقننہ کو ایک سمجھ بیٹھے ہیں۔ ص ۴۳ پر مقنن کہتا ہے۔

مقننہ آپ کی غلام ہے۔

ہم زیادہ سے زیادہ انسانوں کو پھانسی کی سزا دیں گے۔

وزیر بکواس! جج صاحب یہ عدالت نہیں ہے۔

ص ۴۸ پر پھر اس شخص کو مقنن اور جج کہا جاتا ہے۔ مقنن قانون بنانے والا ہوتا ہے۔ جج عدلیہ کا رکن ہے۔

دوسرا التباس مذہب کے معاملے میں ہے، میرے علم کی حد تک ضحاک زرتشتی تھا۔ اختر شیرانی نے اس کے مذہبی پیشوا کو موبد کہا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق زرتشتیوں کے مذہبی پیشوا ہی پر ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر محمد حسن نے اسے راہب کہا ہے۔ راہب کے معنی ہیں ترک دنیا (بالخصوص ترک خاندان) کرنے والا۔ راہب میں کسی مذہب کی تخصیص تو نہیں لیکن عام طور پر یہ لفظ کیتھولک پادریوں کے لے استعمال کیا جاتا ہے۔ مصنف نے کئی بار راہب کی زبانی خدا کے لیے مقدس باپ (ص ۴۰۔۵۵) کی اصطلاح استعمال کی ہے جو محض مسیحی تصور ہے۔ ص ۵۵ ہی پر راہب قیدی جوانوں کو میرے گلّے کی بھیڑ، کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ یہ بھی مسیحی روزمرہ ہے۔ دوسری طرف راہب کہتا ہے۔

''ہمارے پچھلے جنم کا پھل ہوگا''۔ ص ۴۸

بار بار جنم لینا عجم و عرب کا نہیں، ہندوستانی مذاہب یعنی ہندوؤں، بودھوں اور جین دھرم کا تصور ہے۔ ڈرامے میں قیدیوں کو اعزاز دینے کے لیے ان کی پیشانی پر صندل لگایا جاتا ہے۔ اس میں بھی ہندوئیت کی بو آتی ہے۔ سب سے بڑی حیرت یہ ہے کہ نوشابہ کہتی ہے۔

''کافر اور ملحد مجوسیوں کو فرقہ وارانہ فساد میں قتل کرنا پڑا''۔ ص ۵۱

مجوسی بھی زرتشتیوں کو کہتے ہیں۔ لیکن اس نام میں قدرے تحقیر کا شائبہ ہے۔ ضحاک خود تو مجوسی نہیں تو اور کیا تھا۔

ڈرامے میں دو تین نظمیں اور کورس ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن شاعر نہیں۔ وہ نثری شاعری ضرور کرتے تھے اس لیے اس ڈرامے میں شامل ان کی نظموں میں بمشکل وزن کی تلاش کی جا سکتی ہے وہ نثری نظم کہلانے کے لیے مچل رہی ہیں۔ انھوں نے خالق عبداللہ کی بہت زوردار نظم نثر میں لکھی ہے (ص ۶۲) کاش وہ شاعر ہوتے اور اسے منظوم کر دیتے کیونکہ کورس نثری نظم میں نہیں گایا جاتا۔

اختر شیرانی کے ترنم ریز کورسوں کے مقابلے میں انھیں کم از کم موزوں کلام تو پیش کرنا ہی چاہیے۔

محمد حسن نے اردو کی رومانی تحریک پر (خدا جانے وہ اسے رومانوی کہنے پر کیوں مصر ہیں) ایک اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس ڈرامے میں انھوں نے ایسے شاعرانہ جملے اور پرزور عبارتیں لکھی ہیں کہ ادب لطیف کی تمام رعنائیاں یاد میں لہرا جاتی ہیں۔ چند جملے۔

''فوجی افسر: کسی کا بھی قد تلوار سے لمبا نہیں''۔ ص ۴۹

''نوشابہ: جسے آپ کانٹا کہتے ہیں وہ ہم سب کا مقدر ہے''۔ ص ۵۱

''فریدوں: میں اس طرح مرنا چاہتا ہوں کہ میرے ہونٹوں پر انکار زندہ رہے''۔ ص ۶۱

شاعر: تخیل کی ساری شمعیں روشن کرو میرے دوستوں، سچائی کے قد آدم آئینوں سے سارے نقاب ساری دُھند کردو۔ آؤ آج کی رات ہم اپنے بھیانک چہرے دیکھیں۔ قاتلوں سے زیادہ خوفناک، خونیوں سے زیادہ دہشت ناک چہرے۔

میں نہیں جانتا قابل نفرت کون ہے۔ مگر ہر لفظ مجھے ذلیل اور رسوا کرتا ہے۔

کورے کاغذ کا ہر صفحہ میرا منہ چڑھاتا ہے۔ قلم مجھے سولی پر چڑھاتا ہے۔ میرا ضمیر بے قرار ہے۔

جج: یہ سب تمھیں کیونکہ معلوم ہوا؟ یہ تو میری آپ بیتی ہے شاعر ص ۶۸

اور اس طرح یہ ڈراما جوش کی شاعری کی طرح احتجاج و انقلاب کے شعلے کو ادب لطیف کی قوس قزح میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے لیکن رنگینی گفتار کے باوجود گرمی گفتار میں کوئی کمی نہیں آتی اس ڈرامے کے خاتمے کے یہ الفاظ ہمیشہ ہر قسم کے استبداد کے خلاف مہمیز عمل بنتے رہیں گے۔

''ضحاک ہر جگہ اور ہر زمانے میں پیدا ہوں گے''۔

''جہاں بھی ضحاک سر اُٹھائے گا فریدوں کا یا اس کے کسی مظلوم بھائی یا بہن کا ہاتھ بھی ضرور اٹھے گا۔ ان لوگوں کے ٹانکے کاٹ دو۔ آؤ ہم نئے ضحاک کی تلاش میں چلیں''۔

گیان چند

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی

حیدرآباد

دیباچہ

ضحاک، عصری ادب میں ایمرجنسی کے خاتمے کے فوراً بعد شائع ہوا۔ احباب نے ڈرامے کی پذیرائی میں میری ہمت اور حوصلے سے بڑھ کر کی، کسی نے اسے جدید اردو ادب میں اضافہ قرار دیا کسی نے ایمرجنسی پر ہندوستان کا بہترین ڈراما بتایا بعض حضرات نے اس میں تحقیقی دلچسپی بھی لی اور اس کے زمانہ تصنیف، مآخذ اور اس کے طبع زاد ہونے یا نہ ہونے پر بھی بحثیں چھیڑ دیں ایک بھرا پرا مضمون بھی اس پر شائع ہو گیا میں سبھی کا ممنون ہوں۔

ادب کی اپنی جمہوریت ہے۔ ہر ایک کو اپنی پسند یا ناپسند کا حق حاصل ہے البتہ اب جب کہ میرے کرم فرما پروفیسر گیان چند جین نے اس ڈرامے کو اپنی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا ہے اور بقول شاعر ''شعر مرا بمدرسہ ببرد'' پر عمل درآمد کر ڈالا ہے۔ ضروری ہے کہ میں اس ڈرامے کی تصنیف اور تکنیک کے بارے میں کچھ عرض کر دوں ڈراما شاملِ نصاب نہ ہوتا تو اس کے علیحدہ کتابی شکل میں چھپنے کی نوبت بھی نہ آتی مگر ضرورت ایجاد کو جنم دیتی ہے اس لیے کتابی شکل میں چھپتے گزارش احوال واقعی لازم ہے۔ تاکہ سند رہے۔ کون مطمئن ہوتا ہے کون مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ اپنی اپنی توفیق پر منحصر ہے۔

ڈراما 'ضحاک' ابتدائی چند صفحات کے علاوہ تمام و کمال ایمرجنسی ہی کے زمانے میں لکھا گیا ہوا یوں کہ ایمرجنسی کے دور میں زبان بندی مکمل تھی۔ ہر صبح اخبار ہاتھ میں لیتے ہوئے شدید ذلت اور اہانت کا احساس ہوتا تھا کہ وہ شروع سے آخر تک سفید جھوٹ سے لبریز ہوتا تھا۔ لفظوں کے معنی بدل گئے تھے اور جو واقعات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے وہ بھی یا تو سرے سے اخبار میں جگہ ہی نہ پاتے تھے یا کچھ کے کچھ ہو جاتے تھے۔ ہر روز کسی نہ کسی خوشامدی سے سابقہ پڑتا تھا جو

محض خوشامد کے زور پر آقا بنا ہوا تھا اور میری روٹی روزی کا مالک تھا۔ غرض ہر لمحہ ایک اذیت تھا۔ عصری ادب کا ہر لفظ سنسر ہو رہا تھا۔ زبان پر تالے تھے۔ پڑوس میں رات کے پچھلے پہر کسی دروازے پر دستک ہوئی اور پھر وہ شخص کہیں نظر نہ آتا۔ کبھی معلوم ہوتا جیل چلا گیا۔ کبھی معلوم ہوتا کہ لاپتہ ہو گیا۔ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی بتاتا کہ اسے صرف اس لیے تنخواہ نہیں ملی کہ وہ نس بندی کے لیے پانچ آدمیوں کے ہسپتال نہیں پہنچا سکا۔ ڈرائنگ روم میں، بس میں، سڑک پر لوگ سانس روکے ہوئے گزر رہے تھے کہ پتہ نہیں کون جاسوس ہو، میرا بھی یہی حال تھا۔

اگست ۱۹۷۶ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طلبا نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنا ڈراما انھیں پڑھ کر سناؤں، میں نے ڈراما ضحاک لکھنا شروع کر دیا تھا مگر ابھی پورا نہیں کیا تھا۔ طلبا کے اس مختصر جلسے میں پڑھنے سے پہلے میں اپنے کمرے میں اپنے رفیق کار ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کو اس ڈرامے کا ایک باب سنا کر ان سے مشورہ کیا انھوں نے رائے دی کہ ایمرجنسی کے حالات میں اس ڈرامے کو عام جلسہ میں پڑھنا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔ جلسہ شروع ہوا تو میں نے اپنی نثری نظمیں سنانے پر اکتفا کیا۔ اصرار بڑھنے لگا تو ضحاک کا پہلا سین سنایا جس کے بعد اصرار اور زیادہ بڑھا مگر بہر حال معاملہ وہاں ختم ہو گیا۔

ستمبر ۱۹۷۶ء میں میں نے ضحاک مکمل کر لیا۔ ایمرجنسی اپنے شباب پر تھی، طلبا کا اصرا بھی بہت تھا۔ اب اس اصرار میں دوسرے احباب بھی شریک ہو گئے تھے چنانچہ میں نے اپنے کمرے میں بہت ہی منتخب احباب کے مختصر مجمع میں (جس میں میں چند طلبا بھی شریک تھے) پورا ڈراما پڑھ کر سنایا۔ احباب نے بہت تعریف و توصیف کی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے نہ چھپ سکنے پر دلی رنج و غم کا اظہار بھی کیا بلکہ ایک کرم فرمانے تو مجھے تنہائی میں یہ مشورہ بھی دیا کہ میں کسی آنے جانے والے کے ذریعے اسے یا تو براہ انگلستان یا براہ راست پاکستان بھجوا دوں تا کہ وہاں مصنف کے کسی فرضی نام سے اسے شائع کرا دیا جائے۔ بارے یہ ڈراما اسی طرح مکمل پڑا رہا۔

جنوری میں نیشنل اسکول آف ڈراما کے فارغ التحصیل چند طلبا نے "ہم" گروپ بنایا اور اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسے ہندی رسم خط میں منتقل کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طلبا کے ایک گروپ نے وجے شنکر چودھری کی سرکردگی میں

اسے اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا مگر سوال یہی تھا کہ اسے اسٹیج کرنے کی منظوری بھی مل سکے گی یا نہیں۔ اس زمانے میں اسٹیج کرنے سے پہلے ڈرامے کا مسودہ منظور کرانا ضروری تھا۔ سنا تو یہاں تک گیا تھا کہ ابراہیم القاضی کے اپنے طلبا سے نیشنل آف ڈراما میں ''دانتوں Dantan کی موت'' جیسے ڈرامے اسٹیج کرانے پر بھی حکومت کو اعتراض ہونے لگا تھا۔ دانتوں انقلاب فرانس کا مشہور کردار تھا اور اس ڈرامے کا انقلابی آہنگ اور عصری معنویت خاصی واضح تھی۔ بہر حال اسی لیت و لعل میں ڈراما ضحاک کا مسودہ بھی پڑا رہا۔ نہ چھپا نہ اسٹیج ہوا۔

آخر کار جب ایمر جنسی کا پنجہ ڈھیلا پڑا تو مارچ ۱۹۷۷ء کے آخر میں اس کی کتابت شروع ہوئی اور عصری ادب میں چھپنے سے کچھ ہی پہلے وجے شنکر چودھری نے اسے سری رام سنٹر کے اسٹیج پر کھیلا۔ 'ہم'، ڈراما گروپ اسے اسٹیج نہیں کرسکا۔ غرض اس ساری گفتگو سے اتنی ہے کہ ڈراما ضحاک شروع کے چند صفحات کے علاوہ باقی تمام و کمال ایمر جنسی کے دور میں تصنیف ہوا۔

کہانی

ظاہر ہے ضحاک کی کہانی نئی نہیں ہے۔ ضحاک کا پورا قصہ فردوسی کے شاہنامے میں موجود ہے اور نظم و نثر میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اس میں نیا پن ہے تو اس سیاسی رمزیت میں ہے جو ضحاک کے کردار کو میرے ڈرامے میں حاصل ہوگئی ہے۔ ضحاک کا قصہ فسانۂ عجائب والے رجب علی بیگ سرور نے اپنی تصنیف میں بیان کیا۔ ڈراما ضحاک میں اس کہانی کا صرف بنیادی ڈھانچہ لیا گیا ہے۔ یعنی ضحاک کا جمشید کے خلاف بغاوت کرنا اور اسے آرے سے زندہ چرواڈالنا اور اس جنگ میں فتح یاب ہونے کے سلسلے میں شیطان کی مدد لینا اور شیطان کے اس کے کاندھوں کو بوسہ دینے کی وجہ سے ان شانوں پر دو سانپ اُگ آنا یقیناً طبع زاد نہیں ہے لیکن اس بنیادی ڈھانچے کے علاوہ جو واقعات اور کردار ڈراما 'ضحاک' میں آئے ہیں ان کا نہ شاہنامے سے کوئی تعلق ہے نہ رجب علی بیگ سرور یا کسی دوسرے مصنف کی بیان کردہ شاہنامے کی اس داستان سے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اختر شیرانی نے سامی بے نامی کسی نثری مصنف کے ڈرامے کا اردو ترجمہ 'بہارستان' میں بالاقساط شائع کیا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ یہ

بات بھی میرے علم میں نہ تھی کہ کسی مصنف نے اس کردار کو سیاسی معنویت دی ہے۔ میں نہ حسنی صاحب کے اختر شیرانی پر تحقیقی مقالے کا ممتحن تھا۔ نہ میں نے ان کا مقالہ کہیں دیکھا جس سے یہ معلومات میرے علم میں آئی۔ حسنی صاحب کا مطبوعہ تحقیقی مقالہ مجھے میرے ڈرامے ''ضحاک'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۷۷ء کے اواخر میں پاکستان جانے پر ملا اور اس تحقیقی مقالے میں سامی بے کے ڈرامے کے متعلق معلومات بھی ۱۹۷۸ء میں میری نظر سے گزریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اول تو دونوں ڈراموں میں مماثلت بہت کم ہے۔ دوسرے جو بھی ہے وہ صرف اس بنا پر ہے کہ دونوں کا ماخذ شاہنامے کا واقعہ اور اس کے بعض کردار ہیں۔ پھر بھی اگر 'ضحاک' لکھتے وقت مجھے اس قسم کے کسی ڈرامے کا علم ہوتا تو شاید یہ ڈراما لکھا ہی نہ جاتا یا دوسری طرح لکھا جاتا۔ بہر حال مجھے قطعی طور پر سامی بے کے ڈرامے سے اپنی لاعلمی اور ناواقفیت کا اعتراف ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ایمرجنسی کے دوران سانپوں کے انسانی کھوپڑیاں کھانے کا خیال کئی اور افسانہ نگاروں کو بھی آیا ان میں سے بھی کوئی افسانہ میری نظر سے ڈراما لکھتے وقت یا لکھنے سے پہلے نہیں گزرا تھا۔ سلام بن رزاق کی کہانی ''کالے ناگ کے پجاری'' جو غالباً ۱۹۷۷ء ہی میں چھپی تھی۔ میری نظر سے ان کے مجموعے ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' کی اشاعت کے بعد گزری۔

تناقصات:

ایمرجنسی سے زمانی ربط کی وجہ سے ڈراما 'ضحاک' کے بعض مضمرات جہاں واضح ہو گئے وہاں بعض پہلو نظر انداز بھی کر دیئے گئے۔ مثلاً بعض احباب نے اس کے مقصد کے بارے میں بھی سوالات پوچھے۔ ایک ایسے دور میں جب دانشوروں کی اچھی خاصی تعداد مستقبل پر سے اعتماد کھو بیٹھی ہے۔ مثبت کی بجائے منفی فکر کی طرف ذہن کا منتقل ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔

تناقصات کی بحث سے پہلے شاید یہ بحث ضروری ہے کہ ڈراما ضحاک کم سے کم تین سطحوں والا ڈراما ہے پہلی سطح جو ضحاک، فریدوں اور نوشابہ کی سطح ہے۔ جس کا قصہ ہے یعنی ظلم و جبر کے خلاف دو بے بس انسانوں کا آواز اٹھانا اور آخر کار فتح یاب ہونا یہ محض اتفاق نہیں کہ فریدوں محنت کش ہے اور نوشابہ کسان کی بیٹی ہے جسے اغوا کر لیا گیا تھا یہ اس کی دوسری سطح ہے۔ یعنی طبقہ واری کشمکش کی

سطح جو واضح طور پر یہ اشارہ کرتی ہے کہ ظلم و جبر۔ خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی اور نظریاتی ـــ صرف محنت کش اور کسان طبقے کی رہبری ہی میں ختم کیا جا سکتا ہے جو انقلاب اور سماجی انصاف کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ تیسری سطح یہ بھی ہے کہ انسان نے صنعتی انقلاب کو نفع خوری اور استحصال سے جوڑنے کے بعد اپنے شانوں پر سانپ اگا لیے ہیں اور یہ وہ کابوس ہے جو خود اس کا پیدا کردہ ہے اور خود اسی پر سوار ہے بوڑھا، (جسے میں نے گوئٹے کے فاؤسٹ سے مستعار لیا ہے) اس نظام کا نمائندہ ہے اور صنعتی نظام کے اس تشنج سے بچنے کے لیے جس نے فن کا احترام، مذہب کا تقدس، عورت کی عزت اور قانون کی حرمت کو تشدد طاقت اور روپے کے اوپر قربان کر ڈالا ہے۔ صرف محنت کش اور کسان کی رہبری ہی ذریعہ نجات فراہم کر سکتی ہے۔

اب اس مرکزی تصور کو سمجھ لینے کے بعد یہ واضح ہو جائے گا کہ ضحاک محض ایک دور کا کردار اور یہ ڈراما محض ایک دور کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ زمان و مکان کے قیود توڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اسی بنا پر میں نے بھی یہ قیود جان بوجھ کر توڑ دیئے ہیں۔ یوں بھی آج کا اسٹیج Representational اسٹیج نہیں جو اصل کا دھوکا یا نقل مطابق اصل پیش کرنے کے چکر میں پڑے۔ میں اس باب میں مشہور جرمن ڈرامانگار برتولت بریخت کا پیرو ہوں جس نے اس پر زور دیا کہ اسٹیج ڈراما دیکھنے والوں کو بار بار یاد دلانا ضروری ہے کہ وہ محض ڈراما ہی دیکھ رہے ہیں۔ زندگی کا کوئی حصہ ان کے پیش نظر نہیں ـــ نئے اسٹیج کا مقصد ناظرین کو اصل کا فریب فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ اس فریب کو جھٹکے کے ساتھ توڑ کر انہیں جگانا اور انہیں غور و فکر پر مجبور کرنا ہے۔ اسی لیے بار بار ہزاروں سال پُرانے واقعات پر مبنی اس ڈرامے میں ٹیلی ویژن پریس انٹرویو کمپیوٹر اور دوسرے جدید مصنوعات اور ایجادات کا ذکر بار بار آیا ہے۔ فوجیوں کی وردیاں بھی نئی ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کے لیے القاب و آداب میں یہی خلط مبحث جان بوجھ کر روا رکھا گیا ہے چاہتا تو اسے قدیم دور کی چیزوں تک ہی محدود رکھتا مگر مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ ظلم و جبر انسان کے بھیجوں کو سانپوں کو کھلانے کا رواج اور ہنر اور فن، مذہب اور قانون کی یہ تذلیل کچھ کسی ایک دور یا کسی ایک ضحاک تک محدود نہیں ہے جب تک زیردستوں کی آقائی کا دور نہ آئے، اس وقت تک یہی داستان اسی طرح چلتی رہے گی۔ تیز تلوار کی جگہ توپ و تفنگ اور ہوائی جہاز اور ایٹم بم لے لیں گے اور قاصد، جاسوس اور

پرچہ نویس کی جگہ عوامی ترسیل کے ذرائع۔ اخبار ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ — لے لیں گے اور یہ داستان اسی انداز سے اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک محنت کش بڑھ کر اس نظام کو ختم نہیں کردیتے اس لیے جو تناقصات بظاہر اس ڈرامے میں نظر آتے ہیں وہ جان بوجھ کر مقصدیت اور معنویت کے تحت رکھے گئے ہیں۔

اسی نئی تکنیک کے تحت آزاد نظم کو کورس کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اردو ڈراما اکثر و بیشتر ابھی تک پیش کش کے پُرانے طریقوں سے نہیں نکلا ہے۔ ضحاک میں اسٹیج کے نئے طریق کار اور نئی تکنیک کو برتنے کی کوشش کی گئی ہے جو اردو میں عام نہیں لیکن ہندوستان کی سبھی اہم زبانوں میں قبول کی جا چکی ہیں۔

اور ایک موج تہ نشین کی طرح دانش وروں اور فن کار، اہل علم اور اہل بصیرت کی خواری اور بے وقاری کا ماتم اس ڈرامے کا مرکزی تصور فراہم کرتا ہے۔ استحصالی نظام صرف عوام کو لوٹتا کھسوٹتا ہی نہیں بلکہ ارباب فکر و فن کو اور ان کے سبھی مقدس اور اعلیٰ اداروں کی تذلیل بھی کرتا ہے۔ ضمیروں کی خریداری کا المیہ اس کا موضوع ہے جسے آخری سین میں تعلیم، فن، قانون، علم اور مذہب کے ان رہنماؤں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جن کے لب سلے ہوئے ہیں اور جو آزادی کے بھیک مانگ رہے ہیں۔ استحصال نے انہیں اس حالت تک پہنچایا اور زیردستوں کی آقائی انھیں ان کی آواز اور وقار واپس دلا سکتی ہے۔

بہر اس ڈرامے کو کتابی شکل میں اشاعت کے لیے واگزار کرتے ہوئے ان تمام قدر دانوں کا ممنون ہوں جنہوں نے میری اس کاوش کو توجہ کے قابل سمجھا۔

محمد حسن

پروفیسر و صدر

ہندوستان زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی ۶۷ ۱۱۰۰

۹ر فروری ۱۹۸۰ء

پیش کش کے لیے کچھ اشارے

یوں تو پیش کش کے لیے کسی ڈرامے کے متن کی تعبیر اور توجیہہ ڈراما پروڈیوسر کا کام ہے اور اسے پوری طرح یہ حق حاصل ہے کہ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اس کی تشریح کرے، مگر پھر بھی چند بنیادی باتوں کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے جس سے شاید پیش کش میں آسانی ہو۔

یہ ڈراما بظاہر دھوم دھام کے کلاسیکی ڈھنگ کا ڈراما لگتا ہے جس میں شاندار لباس، بھڑکیلے درباری ماحول، باوقار کردار اور آراستہ زبان کے مکالموں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن دراصل یہ ظاہری روپ رنگ ڈرامے کے باطنی کردار سے دست و گریباں ہے اور ایک طنز کے طور پر برتا گیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ کس قدر بھیانک اور خونی اقدامات کو ہمارا تہذیبی نظام کس قدر خوبصورت پردوں میں چھپا کر پیش کرتا ہے اور کس طرح ننگا اور برہنہ قتل و خون ان رنگین آرائشی و زیبائشی نقابوں میں چھپا ہوتا ہے۔ گویا یہ سارا کلاسیکی اور نیم کلاسیکی طرز ایک طرح کا طنز ہے اور اسی طرح اسے پیش کیا جانا چاہیے۔

اس لحاظ سے ڈراما پروڈیوسر کو آسانی ہوگی اگر اس ڈرامے کے کلاسیکیت مخالفت یا Anti Classicism نوعیت کو ملحوظ رکھا جائے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ ڈراما تین سطحوں کا ڈراما ہے جہاں ایک سطح پر وہ ہنگامی حالات اور ایمرجنسی کی صورت حال سے جڑا ہوا ہے وہاں دوسری سطح پر اس کا موضوع یہ ہے کہ سیاسی اقتدار والے طبقے تہذیب کے لائق احترام اور بظاہر غیر جانب دار تہذیبی اداروں، قانون اور عدالت، علم و ہنر، فن اور مذہب کو کس طرح اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور تیسری سطح پر اس کا موضوع وہ صنعتی ترقی اور وہ مشین ہے جو انسان کی دریافت ہے مگر خود انسان کی آقا بن گئی

ہے اور منافع کے لیے استعمال ہونے والی یہ مشین انسان کو ایسے تشنج میں مبتلا کر چکی ہے۔ جس کی قیمت انسان اپنی روح کو گروی رکھ کر ادا کرتا ہے۔ اسی لیے ضحاک مارا نہیں جاتا بلکہ سرمایہ داری نظام کا بوڑھا جادوگر جو اس کی روح پہلے خرید چکا ہے۔ اسے کسی دوسرے علاقے میں استعمال کرنے کے لیے بچا لے جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ حصّہ گوئٹے کے شہرۂ آفاق ڈرامے ''فاؤسٹ'' کا محض مستعار علامتی واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی نئی توجیہہ اور تعبیر کی کوشش بھی بن جاتا ہے۔ گوئٹے نے اسے مابعد الطبیعیاتی رنگ دیا تھا یہاں اس کی اقتصادی اور سماجی Socio economic تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس Sham Classic اور Anti Romantic نوعیت کو سمجھنے کے بعد ڈراما پروڈیوسر کو لباس کے انتخاب، پس منظر کی موسیقی اور نغمے کی ترتیب میں بھی آسانی ہو جائے گی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کورس میں پابند نظم کو برتنے کے بجائے آزاد نظم کو استعمال کیا گیا ہے۔

پیشکش کے بارے میں دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ اس ڈرامے کا موڈ محض تشکیک مایوسی، مجبوری اور معذوری کا نہیں ہے۔ مصنف کا یہ خیال نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں ایک اندھیری رات کے بعد دوسری رات ہی آتی ہے اور صبح کبھی نہیں ہوتی۔ نہ وہ سرمایہ داری نظام کو مستقل اور ناگزیر مقدر سمجھتا ہے۔ نہ استحصال کے دائرے سے باہر نکلنے کا ہر راستہ مسدود جانتا ہے۔ ڈرامے کا مرکزی تصور بہت سیدھا سادا ہے اور یہ ہے کہ انسانیت اور اس کے بہترین اداروں کا نجات دہندہ محنت کش طبقہ ہے اور فریدوں اس کا نمائندہ ہے۔ اور یہ خیال رومانویت کے بجائے نئی حقیقت پسندی کے ذریعے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسری بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ڈراما مختصر اور مختلف تاثر پاروں کے ذریعے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان تاثر پاروں میں مکالموں کے درمیان ایک عمودی ارتقا کے ذریعے نقطۂ عروج موجود ہے۔ اور موسیقی اور روشنی، مکالموں کی ادائیگی اور حرکات و سکنات میں ہر اکائی کے نقطۂ عروج کو پیش نظر رکھنا موثر ہوگا کہ ضابطہ شکنی کی کوششوں کے باوجود نقاط عروج کا ربط ٹوٹنے نہیں دیا گیا ہے۔

پیشکش کے سلسلے میں شاید یہ بھی پیش نظر رکھنا مفید ہوگا کہ آج کل اسٹیج ڈرامے نے جو نئی گرامر وضع کی ہے اس کے مطابق اس ڈرامے میں Theatre of Cruelty بے رحمی کے تھیٹر کی

تکنیک کا بھی بالواسطہ استعمال کیا گیا ہے۔ گو اس ڈرامے میں اسٹیج پر نہ تو تشدد کو پیش کیا گیا ہے اور نہ ظلم و جبر کا کوئی مظاہرہ ہے۔ گو پہلے منظر کے آخری حصے میں ظلم و تشدد کا اظہار ہی برملا ہوا ہے۔ مگر ظلم و تشدد کا سایہ پورے ڈرامے پر حاوی رہتا ہے اور اس کی موجودگی کا احساس برابر قائم رکھا جانا چاہیے۔

یہ خیال درست نہیں ہے کہ یہ ڈراما اسٹیج پر پیش کرنا دشوار ہے البتہ بعض مشکلات اور مسائل ضرور ہیں۔ ضحاک کے کردار کے لیے ایک ایسے زرہ بکتر نما Mask کی ضرورت ہوگی جس کا ایک حصہ سر پر خود کی شکل کا ہو، اور اسی میں شانوں پر دو سانپوں کی گنجائش پیدا کی جائے۔ یا ان سانپوں کے وجود کا علامتی اظہار ہو۔ اسی طرح سروں کو تن سے جدا کرنے کا عمل اور سروں کو نذرانے میں پیش کرنے کا عمل بھی پروڈیوسر سے فنکارانہ ہنرمندی کا طلب گار ہوگا۔

متن کے مطالعہ سے شاید ڈرامے کے مختصر ہونے کا احساس ہو لیکن فراموش نہ کرنا چاہیے کہ متن محض ڈرامے کا ایک حصہ ہی ہوتا ہے اور متن کے علاوہ ڈرامے کا بڑا حصہ اداکاری، مکالموں کی ادائیگی، پس منظر کی موسیقی اور پیش کش کی تکنیک کا بھی ہوتا ہے اور ڈرامے کی مجموعی مدت کا تعین محض مکالموں سے کرنا درست نہیں ہے۔

محمد حسن

۲۸ر فروری ۱۹۸۰ء

ضحاک

(چھ مناظر میں ایک ڈراما)

مصنف

پروفیسر محمد حسن

ضحاک

(انسانوں کے بھیجوں پر زندہ رہنے والے شہنشاہ کی کہانی)

کردار

ضحاک	فوجی افسر
نوشابہ	رقاصہ
فریدوں	شاعر
بوڑھا	جج
وزیرِاعظم	راہب

(قیدی، درباری رقاصائیں اور سپاہی)

پہلا سین

کورس: ایک زمانے کا قصہ ہے
دور دراز کے کسی دیس میں
ایک جوان نے سازش سے جمشید کو مارا
تخت ہتھیایا تاج اُتارا
پھر اس شاہنشاہ کو زندہ آروں سے چروایا
اس سازش میں اس کا ساتھی تھا شیطان
جس نے فتح کے موقع
اس کے شانوں کو چوما تھا
آخر ان دونوں شانوں پر دو زہریلے سانپ اُگ آئے
جن کے پھن سے شانے زخمی
راتیں ویران اور دن بے چین
اور شامیں درد میں ڈوبی تھیں
سنو، سنو اے دنیا والو
ایک زمانے کا قصہ ہے
دور دراز کے کسی دیس کا۔
آج بھی لیکن درد کا مارا
وہی لٹیرا
وہی شہنشاہ
اپنے محل میں اسی طرح بے چین کھڑا ہے۔

(ضحاک کے سامنے رقاصہ ناچ رہی ہے بین کی دھن پر ضحاک کے

کاندھوں پر اگے ہوئے دونوں سانپ بے خود اور مست ہیں رقاصہ کا جسم
جواب دے چکا ہے وہ پسینے میں شرابور ہے سازندوں کے ہاتھ تھکن سے کانپ
رہے ہیں دوسرے سازندے سامنے اپنے ساز لیے تیار بیٹھے ہیں اور دوسری
رقاصہ گھنگھرو باندھ رہی ہے۔ اچانک بین کی بندھی ہوئی دھن ٹوٹ جاتی ہے
اور دونوں سانپ ضحاک کے شانوں پر زور سے پھن مارتے ہیں ضحاک کرب
سے چیخ اٹھتا ہے)

ضحاک: نمک حرامو: دفع ہو جاؤ میری نظروں سے دور جاؤ۔

وزیر: جہاں پناہ۔ غلام کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

ضحاک: ہرگز نہیں! ہم کچھ نہیں سننا چاہتے نمک حرام! ذلیل کتو! تم اپنے آقا کی تکلیف دیکھتے ہو
اور اس کا کوئی مداوا نہیں کرتے۔

سب:۔ ہماری بدقسمتی! آقا

ضحاک: تم اپنے شہنشاہ کا کرب دیکھتے ہو اور تمہارے پتھر دل خون ہو کر نہیں بہتے لعنت ہے تم
پر۔ تم سب پر۔

سب: بے شک ہم مجبور ہیں۔

ضحاک: یہ سب جھوٹ ہے، فریب ہے، تم سب بہروپئے ہو۔ تم مجبور نہیں ہو۔ انسان نے عناصر
پر فتح پائی ہے پہاڑوں کو جھکایا پتھروں کو پانی کیا آسمان تک پرواز کی۔ ہمارے شاعروں،
فن کاروں نے انسانی بصیرت کے گہرے رموز اپنے گیتوں میں ڈھال دیئے، ہمارے
فلسفیوں نے زندگی کے چہرے کے سارے نقاب چاک کر دیئے، ہمارے طبیبوں نے
موت پر فتح پانے کے منصوبے بنائے تم ہمارے سامنے مجبوری کا جامہ پہن کر آئے ہو۔
تم مجبور ہو! مسخرو!

وزیر:۔ عالم پناہ کے خدام آپ کے صحت کے لیے اپنی جان قربان کرنے کو تیار۔

ضحاک: تم اندھے ہو تم نہیں دیکھتے کہ یہ دونوں سانپ کس بے رحمی سے ہمارے شانوں پر پھن
مارتے ہیں۔ تم بہرے ہو کہ تمہارے کانوں تک ہماری درد میں ڈوبی کراہ نہیں پہنچتی

تمہارے بے حس وحرکت دل ہمارے شانوں سے بہتے ہوئے خون کے ساتھ نہیں رستے۔

وزیر: جہاں پناہ! روئے زمین کے تمام باکمال طبیب اپنی تدبیروں میں ناکام ہو چکے، تمام ساحر اور جادوگر، مذہبی اور روحانی پیشوا اپنی آبرو کھو چکے اعلیٰ ترین دماغ تھک گئے اور انسانی علم و دانش اپنی شکست تسلیم کر چکی۔

ضحاک: (سانپ پھر پھن مارتے ہیں) کرب سے بے قرار ضحاک کو ان باتوں سے کوئی دلاسا نہیں ملتا۔ کوئی ہے جو اس درد کی دوا کرے، کوئی ہے جو اس اذیت کا درماں لائے۔

(کوئی جواب نہیں ملتا)

کوئی جواب نہیں دیتا، کوئی نہیں بولتا۔

(رقاصہ آگے بڑھتی ہے مگر ضحاک اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیتا ہے) اگر تو اور تیری ساری سہیلیاں رات دن ناچتی رہیں ناچتے ناچتے شل ہو جائیں مر جائیں تو بھی میرے درد کا درماں نہیں ہو گا یہ بے رحم سانپ تیرے سنگیت سے بھی اکتا جائیں گے اور ہمارے شانوں کو لہولہان کر دیں گے (شاعر آگے بڑھتا ہے اور قصیدہ سنانے کے لیے کاغذ ہاتھ میں لیے تخت کے قریب آتا ہے)

شاعر! تیرے الفاظ کھوٹے سکے ہیں ہمارے درد کا درماں ان سے ممکن نہیں۔ تیرے جذبات کھوکھلے تیرے استعارے بے روح، (شاعر پیچھے ہٹ جاتا ہے) کوئی ہے جو اس درد کی دوا کرے، کوئی ہے جو ہماری اذیت کا درماں لائے (ایک دم چیخ اٹھتا ہے) اپنے جاہ و جلال کی قسم، سنتی ہو پتھروں کی مورتیوں! ہمارے سوال کا جواب نہ ملا تو دربار خاص کی زمین تمہارے خون سے رنگ جائے گی ہمیں تخت و تاج کی قسم، ہم کسی کو معاف نہیں کریں گے۔

(سب خاموش رہتے ہیں) سب خاموش ہیں۔ یہ خاموشی! یہ جاہلانہ سکوت! یہ احمقانہ بے زبانی۔ ارشاد سلطان کی توہین ہے

وزیر: رحم! عالم پناہ رحم:

ضحاک: ہرگز نہیں ۔ اس لفظ کو ہماری مملکت سے جلاوطن کر دیا گیا۔ چوبدار کو حکم دو قلعے کے دروازے کھول دیں دربار عام اور دربار خاص کے ایوانوں سے پہرے ہٹا لیے جائیں اور ہمارے اعلان کی آواز راجدھانی کے کونے کونے میں گونج اٹھے۔

(اعلان کے طور پر دوبارہ کہتا ہے) کوئی ہے جو ہمارے درد کی دوا کرے۔ کوئی ہے جو اس اذیت کا درماں لائے۔ میرے سوال کا جواب نہ ملا تو جاہ و جلال کی قسم ہم اس شہر کے ایک ایک باسی کو قتل کر دیں گے اور راجدھانی کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے پورا شہر جل کر راکھ ہو جائے گا۔ شہر کے باسیو! ہم تمہیں آخری بار آگاہ کرتے ہیں ہمارے درد کا درماں! ہماری اذیت کی دوا! یا موت !! ہمارے لیے زندگی یا سب کے لیے موت

(تھوڑی دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ دروازے کے قریب مجمع میں ہل چل پیدا ہوتی ہے۔ ایک بوڑھا آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اور شاہی چوبدار اسے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں)

ضحاک: آنے دو۔

(چوبدار بوڑھے کو چھوڑ دیتے ہیں)

پاگل بوڑھا: ہاں ہم جانتے ہیں۔ صرف ہم جانتے ہیں۔

(ایک پاگل بوڑھا اندر آتا ہے اس کی پتھرائی آنکھیں اس کے ماتھے اور چہرے پر چٹانوں کے ناخنوں کے زخم اور خراشیں ہیں اس کے تار تار پوسیدہ بدبودار کپڑے، بدرنگ داڑھی، الجھے ہوئے گندے بال سب اس کے فاتر العقل ہونے کی گواہی دے رہے ہیں)

ضحاک: بوڑھے کیا تیرے پاس ہمارا درماں ہے۔

بوڑھا: (ہانپتے ہانپتے اپنا سانس ٹھیک کرنے کے لئے رکتا ہے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر منہ سے آواز نہیں نکلتی سر سے اثبات میں اشارہ کرتا ہے پھر سانس پر قابو پانے کے بعد کہتا ہے) ہاں۔ ان ہاتھوں کی جھریاں دیکھوں چہرے کی شکنوں پر غور کرو۔ ان میں سے ہر شکن میں صدیوں کے تجربے چھپے ہوئے ہیں ہمیں تیری پراسرار بیماری کا علاج معلوم

ہے۔

ضحاک: بتا! جلد بتا! پیر فرتوت! تو آخر کس لمحے کا منتظر ہے۔

بوڑھا: ضحاک! شہنشاہ مر چکا مریض زندہ ہے اور وہ طبیب کے سامنے دوا کے لیے گڑگڑا رہا ہے۔

ضحاک: خاموش گستاخ بڈھے! تیری زبان کھنچوالی جائے گی۔

بوڑھا: (ہنستا ہے) مریض طبیب سے پنجہ کشی چاہتا ہے۔ خوب! تیری موم کی گڑیوں کے اس عجائب گھر میں اتنا دم نہیں کہ ہمارا بال بیکا کر سکے۔ تیری تلواریں ہمارے جسم کو چھو نہیں سکتیں، تیری زنجیریں ہمیں باندھ نہیں سکتیں تیرے توپ تفنگ ہمیں گزند پہنچانے سے عاجز ہیں۔ تو ہمیں مارنے پر قادر ہے تو جا پہلے اپنے شانوں کے ان دو اژدہوں کو ختم کردے۔

(مڑ کر چلنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے)

ضحاک: اسے روکو (سانپ پھر پھن مارتے ہیں ضحاک بے قرار ہو کر چیختا ہے) بوڑھے ہم تیری منت کرتے ہیں ہمیں شفا دے۔

بوڑھا: مکمل شفا ہمارے اختیار میں نہیں ہاں تیری اذیت دور ہو سکتی ہے۔

ضحاک: تو پھر اس اذیت کو دور کردے۔ ہم تجھے زر و جواہر سے تول دیں گے۔

بوڑھا: ٹھیک کہتے ہو شہنشاہ، مگر ہمیں زر و جواہر درکار نہیں۔ روز ازل سے ہم صرف انسانی روحوں کا بیوپار کرتے آئے ہیں ہمیں تمہاری روح چاہیے اپنے بوڑھے اور جھریوں سے بھرے جسم کے لیے ایک جوان اور شاداب روح۔ بولو ہم سے اپنی روح کا سودا کرنے کو تیار ہو۔ ایک لمحہ سوچو نہیں سوچنا جرم ہے ہماری شریعت کا سب سے بڑا جرم۔

ضحاک: (سانپ پھر پھن مارتے ہیں ضحاک درد سے چیخ اٹھتا ہے اور اسی چیخ میں کہتا ہے) ہم تیار ہیں۔ ہم بالکل تیار ہیں مگر ہمیں اس اذیت سے نجات......

بوڑھا: (ہنستا ہے) معاہدہ مکمل ہو گیا عمائدین دربار، گواہ رہنا۔ ہم میں سے جو اس معاہدے سے روگردانی کرے گا ابدی کرب اور عذاب میں مبتلا رہے گا آب حیات کی بوندیں

اسے سکون کی زندگی نہ دے سکیں گی جہنم کی آگ اس کے گناہوں کو جلا نہیں سکے گی، میٹھے پانی کے سمندر اس کی پیاس نہ بجھا سکیں گے ستارے اسے راہ نہ دکھا سکیں گے چاند اور سورج اس کی اندھیری راہوں میں روشنی نہ کر سکیں گے۔۔۔ ہم معاہدے کی شرط پوری کرتے ہیں تیرے جسم کو آسودگی، سدا کی آسودگی اور تیری روح کو کرب، ہمیشہ کا کرب۔۔۔

ضحاک: بوڑھے جادوگر، ہمارے کرب سے فائدہ اٹھانے کی کوشش............

بوڑھا: شہنشاہ! مت بھولو تم مریض ہو۔ تیرے شانوں کے دونوں سانپوں کو صبح وشام انسانوں کا بھیجا درکار ہے۔ ان کا پیٹ بھر دے تاکہ وہ تجھے ڈسنے سے باز رہیں۔ اپنی رعایا کے دو انسانوں کی قربانی پیش کرتا کہ تیرے شانے لہولہان نہ ہوں۔

ضحاک: مگر تو نے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے ان سانپوں سے نجات دلا دے گا۔

بوڑھا: ہم نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔

ضحاک: جھوٹے، دغاباز، شیطان (تلوار کھینچ کر آگے بڑھتا ہے) تو ہمارے دربار سے زندہ نہ جاسکے گا، ہم تجھے قتل کر دیں گے۔

(بوڑھا اچانک دھواں بن کر غائب ہو جاتا ہے اور دیر تک ایک قہقہے کی آواز فضا میں گونجتی رہتی ہے)

ضحاک: کیا تم سب لوگ اپاہج ہو؟ تم اتنے جری، بہادر، نڈر، امیر، سپہ سالار، وزرا، اس بوڑھے کو روک نہیں سکے اسے پکڑ کر تہہ تیغ کرنے سے معذور رہے۔ ایک بوڑھا جادوگر جلال شاہی سے کھیلنے کی جرأت کرے اور سزا نہ پائے۔ بزدلو! تمہیں اس کی سزا ملے گی۔

وزیر: شہنشاہ! ہم نے کسی بوڑھے کو نہیں دیکھا۔

ضحاک: تم نے اس کا وحشت ناک قہقہہ بھی نہیں سنا؟ تم نے اس کی آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا ناچ بھی نہیں دیکھا۔ تم سب جھوٹے ہو۔

سب درباری: شہنشاہ عالم پناہ! ہم کو جلال شاہی کی قسم ہم نے کسی بوڑھے کو نہیں۔

ضحاک: تو کیا ہم یقین کرلیں کہ تم نے کچھ نہیں سنا۔

سب درباری: ہم نے کچھ نہیں سنا

ضحاک: کیا ہم یقین کرلیں کہ تم نے یہ بھی نہیں سنا کہ اس جادوگر شیطان نے ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہمارے شانوں کے ان دونوں سانپوں کو صبح وشام انسانوں کے تازہ بھیجے چاہئیں صرف اسی صورت میں ہمارے شانے ان کے زہریلے پھنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

وزیر: (حیرت سے) انسانوں کے تازہ بھیجے!

ضحاک: مسخرو! تم اپنے شہنشاہ سے مذاق کرنے میں بھی نہیں چوکتے۔
چوبدار، دربار خاص کے دروازے بند کردیئے جائیں (تلوار کھینچ کر مجمع پر ٹوٹ پڑتا ہے) ہمارا انتقام! اپنے شہنشاہ سے مذاق کرنے کا انجام (مجمع میں کھلبلی مچ جاتی ہے لوگ ادھر ادھر جان بچانے کے لیے بھاگنے لگتے ہیں۔ ضحاک وار پر وار کرتا ہے) ہمارے غیظ وغضب سے تمہیں کون بچا سکتا ہے؟ ظالمو، احسان فراموش کتو!

(سب لوگ ادھر ادھر ہو جاتے ہیں البتہ دو چوبدار سامنے آجاتے ہیں اور ضحاک تلوار سے ان پر حملہ کرتا ہے۔ ایک زخمی ہوکر نیچے گرتا ہے دوسرا اسے سہارا دینے آگے بڑھتا ہے۔ ضحاک اس پر بھی حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ بھی زخمی ہوکر تڑپنے لگتا ہے۔ ضحاک تلوار سے دونوں کی کھوپڑیوں سے بھیجے نکال کر شراب پینے کے کھلے پیالوں میں ڈال کر سانپوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ سانپ اس کے شانوں کو ڈسنا بند کردیتے ہیں اور تھوڑی دیر میں وہ تکان سے گر پڑتا ہے اور سو جاتا ہے۔ سانپ پیالوں میں سے بھیجا کھاتے رہتے ہیں۔ ضحاک کو محوخواب دیکھ کر چھپے ہوئے درباری ڈرتے ڈرتے دوبارہ اکٹھے ہونے لگتے ہیں۔ وزیراعظم آگے آگے ہے آہستہ آہستہ دبے پاؤں چلتے چلتے وہ سب نیم دائرے میں محوخواب شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں جس کے ہر دو طرف دو مردہ لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر تک سب سکتے کے عالم میں اسی طرح خاموش رہتے ہیں۔ وزیراعظم ایوان شاہی کا دروازہ کھولنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ایک ایک، دو دو کر کے سبھی درباری دروازے سے

باہر چلے جاتے ہیں۔ وزیراعظم اکیلا رہ جاتا ہے اور خاموشی سے ضحاک کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی نظروں میں ہمدردی افسوس اور ہیبت کی آمیزش ہے)

وزیراعظم: زمانے کو بھی لفظوں کے معنی بدلنے پڑیں گے تاکہ میرے محسن شہنشاہ کو قاتل نہ کہا جائے۔

پردہ گرتا ہے۔

دوسرا سین

(شمع جل رہی ہے درباری جن میں وزیر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے شمع کے اوپر ہاتھ رکھ کر قسم کھا رہے ہیں نہایت مقدس فضا کمرے میں چھائی ہوئی ہے شمع کے سامنے گدھ کا نشان بنا ہوا ہے جس کی سبھی لوگ پرستش کرتے ہیں۔)

راہب: ہم مقدس گدھ کو گواہ بناتے ہیں۔

(سب یہ لفظ دہراتے ہیں)

کہ ہم (سب دہراتے ہیں) جب تک زندہ ہیں (سب دہراتے ہیں) جب تک ہمارے جسم میں جان ہے اور ہماری سانسیں ہمارے سینوں میں آتی جاتی ہیں جب تک ہماری آنکھیں مقدس باپ کے بخشے ہوئے سورج اور چاند کو دیکھ سکتی ہیں جب تک سورج اپنے سنہرے رتھ پر سوار پورب سے نکلتا ہے اور پچھم میں ڈوبتا ہے جب تک ہماری ندیوں میں لہریں ہیں اور ہمارے سمندروں میں طوفان ہیں ہم سب اس راز کو راز ہی رکھیں گے کہ

(سب وزیر کی طرف دیکھتے ہیں)

وزیر: کہو! آگے کہو!

راہب: کہ ہمارے شہنشاہ کے کاندھوں پر دو سانپ ہیں اور ـــ

وزیر: اور ـــ

راہب: اور ہر روز انھیں انسانوں کے بھیجے درکار ہیں (وزیر راہب کی گردن پر تلوار کا وار کرتا ہے خون کا فوارہ چھوٹتا ہے)

وزیر: جوان لفظوں کو زبان سے نکالے گا اس کا یہی انجام ہوگا۔ یہ State Secret ہے (ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے خدمت گار لاش کو ڈھک دیتے ہیں اور فرش پر سے خون صاف کر کے واپس چلے جاتے ہیں ان کے کانوں میں لمبی ڈائیں لگی ہوئی ہیں اور منہ پر نقاب ہیں۔)

برامت کہو! برامت سنو! برامت دیکھو! جرجان! آج سے تم ہمارے مذہبی رہنما ہو۔ ہماری ریاست کے راہب اعظم۔

جرجان: میں! وزیر اعظم، میں!

وزیر: ہاں تم، راہب کی قبا شانوں پر ڈالو اور ہماری رہنمائی کرو (ہاتھ بڑھاتا ہے جرجان گھبرا کر ہاتھ پکڑ لیتا ہے) ہمارے بے قرار ضمیروں کو سکون دو۔

جرجان: مگر! پریشان کن سوالات پوچھے جائیں گے جن کے جواب میرے پاس نہیں ہیں۔

وزیر: سب سوالوں کے جواب صرف مہربان باپ کے پاس ہیں۔

جرجان: مگر وہ پوچھیں گے۔

وزیر: پوچھنے والوں کی زبانیں گدی سے کھینچ لو۔ شک کرنے والے دل ان کے سینے چیر کر نکال لو۔ ہماری مملکت میں سوال جرم ہے جس کی سزا ملنی چاہیے۔ جاؤ، ہم تمہیں ضمیر کی سرداری عطا کرتے ہیں۔

(جرجان، وزیر اعظم کی قبا کو بوسہ دیتا ہے اور وزیر اعظم خون سے سنی ہوئی تلوار اس کے سر پر رکھ دیتا ہے۔)

وزیر اعظم: حلف کی رسم پوری کی جائے۔

جرجان: ہم سب اس راز کو راز ہی رکھیں گے۔

(سب ڈری سہمی آواز میں دہراتے ہیں)

جرجان: جس راز کو (خوف سے وزیر اعظم کی طرف دیکھتا ہے) مقدس باپ نے ہمیں سونپا

ہے۔ مقدس گدھ ہماری مدد کرے۔

(سب لوگ آمین کہہ کر سر جھکاتے ہیں)

وزیر: مگر اتنا کافی نہیں ہے۔

راہب: اتنا کافی نہیں ہے۔

وزیر: سوچنا ہوگا کہ ہمارے ضمیر کس طرح مطمئن ہوں گے۔ (شاعر کی طرف دیکھتا ہے)

شاعر: ضمیر ایک کانٹا ہے جو ہمارے دلوں میں کھٹکتا ہے۔

استاد: ہم اسے نکال پھینکیں گے۔ اس کانٹے کی کھٹک کون کم کر سکتا ہے؟

جج: فقط قانون!

رقاصہ: فقط نغمہ!

شاعر: فقط شاعری!

راہب: فقط مذہب!

فوجی افسر: فقط طاقت کا استعمال!!

وزیر: خاموش! جاہلو! ضمیر ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اس سے زیادہ بھیانک سوال ہے۔ ہمیں ہر روز انسانوں کے بھیجے درکار ہیں سنتے ہو ہر روز صبح و شام!

جج: مگر وزیر اعظم جانتے ہیں کہ ہمارے قید خانے قیدیوں سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جنھیں موت کی سزا سنائی جا چکی ہے۔

وزیر: ہمیں معلوم ہے مگر ان کے بھیجوں سے کتنے دن کام چل سکتا ہے ہمیں مقننہ کا تعاون چاہیے۔

جج: عدالت: آپ کی غلام ہے۔

وزیر: نہیں ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا نہیں چاہتے ہیں۔ ہم قانون کی عزت کرتے ہیں۔ قانون اقتدار کے ہاتھ کا کھلونا نہیں ہے۔ قانون سے کوئی بھی بلند نہیں ہے صرف ملک قانون سے بلند ہے۔ اور ایک ملک کی عزت کی خاطر۔

جج: (بات کاٹ کر) ہم زیادہ سے زیادہ انسانوں کو پھانسی کی سزا دیں گے تاکہ ملک کے

مفادات محفوظ رہیں۔

شاعر: مگر کب تک!

جج: جب تک سورج مشرق سے نکلتا اور مغرب میں ڈوبتا ہے۔

وزیر: بکواس! جج صاحب یہ عدالت نہیں ہے مجھے آپ سے اس قدر احمقانہ تجویزوں کی امید نہ تھی۔

جج بجا فرمایا آپ نے! مگر میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔

شاعر: ہر بات سمجھنے کے لیے کہاں ہوتی ہے۔ حُسن معنی سے آزاد ہو چکا ہے۔

راہب: معنی صرف مذہب میں ہیں اس کے بغیر ہر شے مہمل ہے!

فوجی افسر: وزیر اعظم! میری تجویز ہے غیر ضروری لفظوں کے استعمال پر پابندی ہونی چاہیے۔

وزیر: ہمیں آج پتہ چلا کہ ہمارے ملک میں عقل و دانش کا کتنا زبردست قحط ہے۔ آپ ہمارے مملکت کے چنے ہوئے لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں ہماری قوم کی باگ ڈور ہے مستقبل آپ کی طرف دیکھ رہا ہے آپ اس مملکت کے معمار ہیں اور آپ جیسے ذہین اور فاضل لوگ زندگی کی سنگین سچائیوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اگر آپ روز چار شہریوں کو پھانسی دیں گے تو شہر غصے اور نفرت سے اُبل پڑے گا۔ صرف آپ کے جلاد آپ کے پھانسی گھر ہمیں چار بھیجے فراہم نہیں کر سکتے کوئی اور تدبیر سوچنی ہوگی اس سے کہیں زیادہ موثر تدبیر!

راہب: (دہراتا ہے) اس سے کہیں زیادہ موثر تدبیر!

وزیر: میری باتوں کو بار بار مت دہرایئے۔

شاعر: اور بجنل بات کو نقل کرنا جرم ہے راہب اعظم!

وزیر: اس کام کے لیے ملک کی پوری فضا بدلنی ہوگی، قانون بدلنا ہوگا، لوگوں کی ذہنیت بدلنی ہوگی، سماج کا ڈھانچہ بدلنا ہوگا کہ لوگ حقیقت کو پہچان سکیں، ہمیں اپنے لوگوں کو نئے سرے سے تربیت دینا ہوگی۔ ہمیں ایک نیا عہد اور ایک نئے عہد کا انسان بنانا ہوگا۔ ہمارے شاعر اس نئے انسان کے گیت لکھیں گے ہمارے فن کار اس نئے انسان کے نغمے گائیں گے ہمارے استاد اس نئی بصیرت کو گھر گھر عام کریں گے اور ہمارے مقنن

اور جج اس نئی بصیرت کی راہ سے الگ ہٹنے والوں کو سزا دیں گے اور ہماری افواج قاہرہ ہماری پولس ہمارے محافظ دستے اس نئی آگہی اس نئے کلچر کی ہر گھڑی حفاظت کریں گے۔

شاعر: میں اس نئی بصیرت کی ایک نئی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں!

رقاصہ: میرے پاؤں اس کی تال پر ناچنے کے لیے بے قرار ہیں!

استاد: ہمارے مدارس اس نئی تعلیم سے آباد ہونے کے لیے مضطرب ہیں!

راہب: ہمارے عبادت خانے اس کی نئی آواز کے لیے تڑپ رہے ہیں!

وزیر: ہم نہیں جانتے تم اس نئی آواز کو کیا نام دو گے ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ لوگوں کو مرنا سکھاؤ موت کو جاذب نظر، دل کش، حسین اور دلفریب بناؤ۔

شاعر: موت اور حسین!!

وزیر: ہاں موت ہی حقیقت ہے موت ہی عرفان ہے موت ہی مکتی ہے آج تک انسان زندگی کے دھوکے میں مارا مارا پھرتا رہا ہے آج ہم اسے سچائی بتانا چاہتے ہیں۔

استاد: تو کیا ہم اپنے بچوں کو موت کا سبق پڑھائیں گے؟

رقاصہ: کیا ہم موت کی تان پر ناچیں گے۔

وزیر: مجھے سوالوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ آج کا کام ختم ہوا۔ آج ہم اپنے تاریخی سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔ تالیاں (سب لوگ اپنے کو بے اختیار تالی بجاتے ہوئے پاتے ہیں) تفصیلات آپ لوگ طے کرلیں ہمیں صرف نتیجے سے دلچسپی ہے۔ (رخصت ہوتا ہے)

(تھوڑی دیر سب لوگ خاموش رہتے ہیں جیسے کچھ سوچ رہے ہوں کوئی پہلے بولنا نہیں چاہتا ہے۔ آخر شاعر بولتا ہے)

شاعر: مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ شاعر آزاد ہوتا ہے۔ مجھے اس دنیا کی گندی حقیقتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میں قوم کا نہیں انسانیت کا ضمیر ہوں میں اپنے من کی دنیا کا باسی ہوں اس بکھیڑے میں پڑنے سے انکار کرتا ہوں۔

فوجی افسر: کیا یہ لفظ محفوظ کر لیے جائیں؟

شاعر: محفوظ کیوں؟

فوجی افسر: تم ہمارے فن کی آبرو ہو۔ تمہارے نام سے ہمارا ملک تہذیب کی دنیا میں پہچانا جاتا ہے اس لیے ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تمہارے لاثانی ہونٹوں سے جو بات نکلی ہے وہ ضائع ہو جائے۔ اس لیے اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ تمہارا ہر لفظ محفوظ کر لیا جائے۔ وہ آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں وہ کان ہمیں سن رہے ہیں۔

راہب: مقدس باپ ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔

شاعر: مجھے معلوم ہے میں نے کہا ہی کیا ہے یہی نا کہ میں اپنے فن کی دنیا کا باسی ہوں میں وہی لکھوں گا جو محسوس کروں گا اور میں وہی محسوس کروں گا (ایک دم لہجہ میں تبدیلی آتی ہے) جو مقدس باپ چاہے گا میرے گیت میرے ملک کے لیے ہوں گے۔ میرے گیت اور تمہارے پاؤں کی جھنکار!

رقاصہ: ہاں میرے گھنگھروؤں کی جھنکار، میری آواز کا جادو، میرے سنگیت کا رس آج سے سب کچھ موت کی نذر ہے۔

فوجی افسر: موت کو اتنے حسین دلال کبھی نہیں ملے ہوں گے۔ (ہنستا ہے)

استاد: مجھے کچھ وضاحت درکار ہے۔

جج: قانونی طور پر یہ بات درست ہے آپ کو وضاحت چاہنے کا قانونی حق ہمارے آئین کے مطابق حاصل ہے۔

استاد: تعلیم و تدریس کا پیشہ شریف پیشہ ہے۔ تعلیم ہی نے ہمیں انسان بنایا ہے تعلیم حکومتوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ انسان نے اپنے شاندار تہذیبی سفر میں جو کچھ بھی سیکھا ہے وہ آنے والی نسلوں کو سکھائیں ان کے دماغوں میں صدیوں کے حاصل کردہ تجربوں کی روشنی پہنچائیں انھیں پرانی سچائیوں پر شک کرنے کی عادت ڈالیں، کہ وہ بڑھ کر ستاروں پر کمندیں ڈال سکیں تعلیم انسانی کردار کی تشکیل ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم تعلیم کو وقتی مصلحتوں کا شکار بنائیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تعلیم کو اس کام سے

آزاد چھوڑ دیا جائے؟

فوجی افسر: (زوردار قہقہہ لگاتا ہے) نہیں! میرے دوست ہرگز نہیں!

استاد: دلیل؟

فوجی افسر: کیا نیا سماج نئی تعلیم کے بغیر بن سکتا ہے۔ اگر تلوار اس دنیا میں سب کچھ کر سکتی تو ہمیں استاد شاعر اور رقاصہ کی کیا ضرورت تھی؟ ہم انھیں تہہ تیغ کر دیتے اور ان کے خون سے چھاؤنی کے لان پر نئے پھول کھلاتے مگر ایسا نہیں ہے میرے دوست ہمیں ضرورت ہے کہ نوجوان خوشی خوشی جان دے سکیں اور اسے زندگی سمجھیں تا کہ ان کے بھیجے شہنشاہ کے شانوں کے سانپ مزے لے لے کر کھا سکیں، ہماری درس گاہیں ایسی تعلیم سے گونجیں ہماری تجربہ گاہوں میں ایسے تجربے ہوں، ہمارے انجینئرنگ کالج اسی فن میں اور ہمارے میڈیکل کالج اس ہنر میں مہارت پیدا کریں۔ آپ ہماری بھی درس گاہوں کے نائب سربراہ ہیں لیکن نہ بھولیے کہ ان سب کے سربراہ ہونے کا شرف شہنشاہ کو حاصل ہے! اور ابھی ہمارے کاندھوں پر ہمارے سر اور سروں میں بسی ہوئی تہذیبی قدریں سلامت ہیں!!

استاد: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی تعلیم گاہوں میں یہ پڑھائیں گے کہ دماغ انسان کی بیماری ہے ہمارے میڈیکل کالج دکھ درد کے بغیر بھیجوں کو انسانی دماغ سے نکال پھینکنے کے آپریشن کرنے کا تجربہ کریں گے ہماری تجربہ گاہیں بھیجے کے بغیر زندہ رہنے کے تجربے کیا کریں گی۔ اور انجینئرنگ کالج شاندار مقتل اور چمکیلے آپریشن روم بنانے میں لگ جائیں گے۔

فوجی افسر: (ہاتھ کے ڈنڈے سے استاد کے سینے پر اشارہ کرتا ہے) اور یوں ہوا تو ہماری حکومت آپ کے سینے کو جگمگاتے تمغوں سے سجا دے گی۔ ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔

جج: مگر سب سے بڑی مشکل قانون کے سامنے ہے قانون ہر مصلحت سے آزاد ہے ہم غیر جانبدار ہیں اور ہم حکومت وقت کو بھی معاف نہیں کر سکتے۔

فوجی افسر: (طنز سے) بے شک!

جج: جب تک قانون میں لچک پیدا نہ کی جائے ہم قتل کو معاف نہیں کر سکتے۔

فوجی افسر: قتل کو ہرگز معاف نہیں کیا جانا چاہیے مگر مملکت کے لیے قربانی قتل نہیں ہے۔

جج: یہ قانون طے کرے گا!

فوجی افسر: میدان جنگ میں دشمن کے سپاہی کا خون بہانا قتل نہیں ہے، بہادری ہے۔ کیوں؟ ایسا کیوں ہے؟!

جج: یہ قانون ہے۔

فوجی افسر: اور قانون (ڈنڈا گھماتا ہے) یہ بناتا ہے۔ آپ اپنی قانون کی کتابیں دوبارہ لکھ لیں جج صاحب ورنہ پرانے لفظوں کے لبادے نئے حالات میں خطرناک ہو سکتے ہیں ان سے الجھ کر گرنا مہلک ہو سکتا ہے۔

جج: میں پوری ذمہ داری کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ قانون کو عوام کی خواہشات اور جمہوری تقاضوں کا ساتھ دینا چاہیے مگر پھر بھی قانون ایک غیر جانبدار اور آزاد محکمہ ہے اسے حکومت کی مصلحتوں سے الگ رکھنا ضروری ہے۔

شاعر: دوبارہ غور کر لیجیے۔ کیا آپ کا واقعی یہی خیال ہے؟

فوجی افسر: آپ کی پہلی بات میں زیادہ وزن ہے قانون کو وقت کے ساتھ بدلنا ہی ہوگا۔

جج: ہاں یہ تو ہے۔ قانون عوام کے لیے ہے عوام قانون کے لیے نہیں ہیں۔ قانون داں جس طرح کے قانون بنائیں گے ہم اسی قسم کے فیصلے دیں گے۔

رقاصہ: جس طرح کی دھن ہوگی اسی قسم کا ناچ ہوگا۔ (ہنستی ہے دوسرے بھی ہنس پڑتے ہیں۔

فوجی افسر: ہم نہیں سمجھتے کہ اس میں کوئی ہنسنے کی بات ہے! (ایک دم سب سنجیدہ ہو جاتے ہیں) ملک خطرے میں ہے تم سب مذاق کرنے کی ہمت کیسے کر سکتے ہو۔ آخر تم سب لوگ ہماری مملکت کی آبرو ہو۔

راہب: سنجیدگی صداقت کی روح ہے اور خوف روح کی موت! میں نہایت سنجیدگی سے آپ سب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے فرض کو کسی خوف یا لالچ سے پورا کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ نیک نیتی اور خلوص سے اسے صداقت اور نیکی جان کر اپنا فرض ادا کریں۔

میری طرف دیکھیے (لرزتے ہوئے) میں بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہماری قسمت میں روز ازل لکھ دیا گیا تھا ہم جو کچھ پائیں گے ہمارے پچھلے جنم کا پھل ہوگا اس سے زیادہ نہ ہمیں کوئی سزا دے سکتا ہے نہ عزت بخش سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے فرض کو اچھی طرح نبھائیں اور اپنے ضمیر کو آسودہ رکھیں!

فوجی افسر: (تالی بجاتا ہے) بہت خوب! بہت خوب!

جج: آئندہ سال کے خطابت کے بین الاقوامی مقابلے میں ہماری مملکت کی طرف سے راہب اعظم کو نمائندگی کرنی چاہیے انعام ضرور ملے گا (راہب جھک کر شکریہ بجالاتا ہے)

فوجی افسر: ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ تم میں سے کسی کا بھی قد تلوار سے لمبا نہیں ہے اور تم اپنی چمک دار قباؤں اور اعزازات کی لمبی لمبی فہرستوں کے باوجود ہمارے غلام ہو غلام — اس سے آگے کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں (اچانک مڑتا ہے اور دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

(تھوڑی دیر پھر مکمل خاموشی رہتی ہے جو جس طرح بیٹھا ہے اسی طرح ساکت، مجسمے کی طرح منجمد اور ساکت ہو کر رہ جاتا ہے۔ سب ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے خلا میں دیکھ رہے ہوں یا دوسرے شخص کے آر پار دیکھ رہے ہوں۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ شاعر اٹھ کھڑا ہوتا ہے جیسے سوچتے سوچتے تھک گیا ہے رقاصہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور اسے بٹھا دیتی ہے شاعر گانے لگتا ہے)

مت اٹھو

سر اٹھاؤ گے

تو یہ پتھریلی چھت جو سخت بھی نیچی بھی ہے۔

اٹھنے نہ دے گی

چوٹ آئے گی

رینگنے میں عافیت ہے خیریت ہے۔

تھوڑے دن کی زندگی ہے زندگی یوں ہی سہی

اور اسی کا نام ہے دنیا میں راحت—!!

اور اسی کا نام ہے دنیا میں راحت—!!

اور اسی کا نام ہے دنیا میں راحت—!!

سب مل کر کورس کی شکل میں: اور اسی کا نام ہے دنیا میں راحت—!!

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے فانوس روشن ہیں۔ ضحاک دونوں ہاتھوں سے نوشابہ کو پکڑے ہوئے ہے)

ضحاک: نوشابہ، ہمیں تیرا جسم درکار ہے۔ (نوشابہ کے اوپری جسم کا لباس اتار دیتا ہے۔ ضحاک اس کے شانوں پر بڑی محبت سے اپنے دونوں ہاتھ پھیرتا ہے) ایک دن تھا نوشابہ، کہ تیرے شہنشاہ کے شانے بھی ایسے ہی صاف شفاف تھے ایسے ہی ملائم، نرم، ہر بوجھ سے پاک،

نوشابہ: میرے سرتاج!

ضحاک: ہم نے کیا گناہ کیا ہے ملکہ، کہ یہ سانپ ہمارے شانوں پر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دیئے گئے کہ یہ ہماری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیں، کون سا پاپ ہے جس کی بھیانک سزا ہمیں رات دن بھگتنی پڑ رہی ہے؟ کیا تیرا شہنشاہ گناہ گار ہے؟ کیا ہمارے چہرے پر پاپ کا کوئی نشان ہے؟ ربِ اعلیٰ کی قسم ہمیں بتاؤ، کیا ہم پاپی ہیں؟

نوشابہ: ہم گناہ کی طرف نہیں جاتے مالک، گناہ ہمیں تلاش کر لیتے ہیں۔

ضحاک: ہم نے جمشید کے ملک کو فتح کیا اور اسے زندہ آروں سے چروا دیا ملکی انتظام کے لیے یہ قربانی ضروری تھی، ہم نے اپنے مخالفوں کے منہ بند کر دیئے کہ ملک نظم وضبط کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا، قلم کاروں کے ہاتھ کاٹ دیئے کہ مادرِ وطن کو ان کی ضرورت تھی۔ ملک

کو ایک سرکاری زبان دینے کی خاطر ہم نے دوسری زبانیں بولنے والوں کی زبانیں کھچوالیں، کافر اور ملحد قبیلوں کو فرقہ وارانہ فساد میں قتل کرانا پڑا کہ دین کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کم کام کرنے اور زیادہ اجرت مانگنے والے مزدوروں اور کاہل کسانوں کو گورخر کی کھال میں زندہ سلوادیا کہ دوسروں کو عبرت ہو، پیداوار کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آبادی کا کم کرنا ضروری ہوا تو مردوں کو آختہ کرایا عورتوں کے رحم نکلوا کر پھینکوادیئے انصاف اور قربانی پر مبنی اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے کون سا فرض تھا جو ہم نے پورا نہیں کیا، کونسی ذمہ داری تھی جس سے ہم نے منہ موڑا اور کون سا سخت سے سخت امتحان تھا جس پر اپنے محبوب عوام کی خاطر ہم پورے نہ اترے ہوں!

نوشابہ: ملک آپ کا شکر گزار ہے دنیا آپ کے گن گاتی ہے۔

ضحاک: ثبوت!

نوشابہ: ملک کے سبھی پرچہ نویس کہتے ہیں کہ ملک آپ کا شیدائی ہے، رائے عامہ کے رہنماؤں کی تقریریں، ہمارے غیر ملکی سفارت خانوں کی رپورٹیں! سب آپ کا گیت گاتی ہیں۔

ضحاک: ہم اپنے غلاموں سے سچ بولنے کی توقع نہیں کرتے۔

نوشابہ: پھر سچ کیا ہے میرے مالک؟

ضحاک: ہم نہیں جانتے ملکہ، مگر ہمارے دل میں ایک کانٹا ہے جو کھٹکتا ہے۔

نوشابہ: جسے آپ کانٹا کہتے ہیں وہ ہم سب کا مقدر ہے۔

ضحاک: جانتی ہے تیرے ننگے جسم کی قسم، سچ ایک زخمی درندے کی طرح خوفناک ہے (ایک دم اسے لپٹا لیتا ہے) سچ ہے تو ہمارے شانوں پر پھن مارتے ہوئے سانپ یا تیرا نرم اور ملائم جسم! باقی سب کچھ جھوٹ ہے۔ رب اعلیٰ کی قسم، ہمیں اس جھوٹ سے بچالے۔

نوشابہ: میرے مالک! (نوشابہ کو لپٹانا چاہتا ہے اک دم رک جاتا ہے)

ضحاک: تیرا جسم کانپ رہا ہے، تیری آنکھوں میں خوف ہے، تیری آواز لرز رہی ہے دنیا کے سب سے بڑے سب سے زیادہ طاقتور شہنشاہ کی ملکہ خائف ہے تیرے ہونٹ بوسے کے لیے ہیں، سچ کے لیے نہیں، تو ہم سے خوف کھاتی ہے ہمیں پیار نہیں دے سکتی!

نوشابہ: یہ سچ نہیں ہے۔ کیا کوئی دنیا میں ایسا بھی ہے جو اپنے شہنشاہ سے محبت نہ کرتا ہو؟

ضحاک: تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ہر رات ہماری نیندیں کرب ناک ہیں، ہر رات وہی خوفناک بوڑھا اپنے بھیانک قہقہہ کے بعد ہمیں خبردار کرتا ہے کہ سیستان کہ پہاڑیوں کے اس پار ہمارا قاتل کسانوں کے قبیلے میں مفلسی اور عذاب کے سائے میں پل کر جوان ہو رہا ہے اور ایک دن محنت کا خونیں جھنڈا اٹھائے اس کا گروہ ہمارے تخت کو پلٹ دے گا۔ وہ کہتا ہے کہ اس دن ہماری توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

نوشابہ: وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔

ضحاک: ثبوت؟

نوشابہ: سیستان کی پہاڑیوں کا ہر قبیلہ تہہ تیغ کر دیا گیا ہے اب وہاں خون کے چشمے کے علاوہ آبادی کا کوئی نشان نہیں۔

ضحاک: (ایک دم چیخ اٹھتا ہے) پھر اس مسخرے سے پوچھو وہ ہمیں کیوں ڈراتا ہے آخر کیوں وہ ہمیں آسمانوں سے للکارتا ہے کہ یوم حساب قریب ہے۔

نوشابہ: محض خواب ہے، محض خواب ہے! ایسا کبھی نہیں ہوگا میرے سرتاج! ہزاروں سال آپ کی حکومت کی بنیاد خون اور فولاد پر اسی طرح قائم رہے گی کیا آج تک کبھی کسی مذہبی پیشوا، کسی قانون داں، کسی دانش ور، کسی فلسفی نے آپ کی حکومت کی لازوال نعمتوں کے خلاف لب ہلانے کی جرأت کی؟

ضحاک: نہیں!

نوشابہ: عوام آپ کے قصیدے گا رہے ہیں، ملک میں شہد اور دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ قیمتیں گر رہی ہیں، آبادی کم ہو رہی ہے، لوگوں کی رگوں میں جاں نثاری کا وہ جذبہ ہے کہ ہر ریاست سے لوگ اپنی جان حکومت پر نثار کرنے کے لیے اپنے بھیجے نذر کے لیے لا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے ایسا منظر انسانی تاریخ نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ عوام نے کبھی کسی شہنشاہ کو اتنا پیار دیا بے مثال انوکھا، بے نظیر!

ضحاک: ثبوت؟

نوشابہ: اگر یہ سب سچ نہ ہوتا تو کیا پوری سلطنت میں آپ کے خلاف احتجاج کی ایک آواز بھی نہ اٹھتی۔ جیل خانے نہ ٹوٹتے سڑکیں جلوسوں سے آباد نہ ہوتیں، سرکاری اسلحہ خانوں میں آگ نہ بھڑکتی۔

ضحاک: (نوشابہ کو لپٹا لیتا ہے) اس کے ننگے شانوں کو چومتا ہے اور لباس اس کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے) کاش کہ تیرے شانوں پر میری طرح دو سانپ ہوتے۔ شاید تو میرا درد سمجھتی۔

(صبح چار بجتے ہیں۔ گھنٹہ بجتے ہی دونوں سانپ پھن مار مار کر ضحاک کے شانوں کو زخمی کرنا شروع کرتے ہیں۔ نوشابہ لباس پہن لیتی ہے اور دونوں شاہی مرصع کرسیوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ خواب گاہ دل نواز نغمے، سے گونج اٹھتی ہے اور سامنے کے دروازے سے نہایت پر وقار وردیاں پہنے فوجی باڈی گارڈ موسیقی کے دھن پر مارچ کرتے ہوئے آگے آتے ہیں ان کے پیچھے وزیر ہے جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے جو ضحاک کی خونیں وحشت ناک آنکھوں کے سامنے آتے ہی تلوار کو سرنگوں کر کے سلامی دیتا ہے اس کے پیچھے زنجیر میں بندھے ہوئے دس تندرست اور توانا نوجوان دو قطاروں میں کھینچ کھینچ کر آگے لائے جاتے ہیں شہنشاہ کے سامنے پہنچ کر یہ دونوں قطاریں آگے آجاتی ہیں فوجی سپاہی اور باڈی گارڈ ادب سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور وسط میں آکر فوجی افسر سلامی بجالاتا ہے پیچھے پیچھے جج، راہب، شاعر اور رقاصہ داخل ہوتے ہیں اور باادب کھڑے ہو جاتے ہیں)

وزیراعظم: سیستان کے صوبے کی طرف سے شہنشاہ کی خدمت میں آخری نذرانہ قبول ہو۔

(ضحاک سر کے اشارے سے قبول کرتا ہے)

وزیراعظم: اجازت ہو تو ان کی آنکھوں سے پٹیاں ہٹائی جائیں، کانوں سے روئی نکالی جائے اور ان کے سیئے ہوئے ہونٹوں کے ٹانکے کاٹ دیئے جائیں۔

راہب: جو اس لیے لگائے گئے تھے کہ وہ نجات پانے سے پہلے بری بات نہ کہیں بری بات نہ

سنیں، بری بات نہ دیکھیں کہ ان کی روحوں کو نروان مل جائے۔

ضحاک: اجازت ہے!(قیدیوں کے چہرے سے نقاب ہٹائے جاتے ہیں اور ہونٹوں کے ٹانکے کاٹے جاتے ہیں)

میرے بچو! ہمیں تم پر فخر ہے۔ جب تک دنیا میں حب الوطنی اور ایثار کا نام باقی ہے ملک اور قوم کے لیے تمہاری قربانی کا ذکر سنہری حروف میں کیا جائے گا۔ دنیا تمہیں یاد رکھے گی۔ زنجیریں کھول دی جائیں۔(زنجیریں کھول دی جاتی ہیں)

دیس کے ان سپوتوں کو ہمارے لیے تیار کی ہوئی خاص شراب پیش کی جائے (شراب پیش کی جاتی ہے۔ قیدی زخمی ہونٹوں سے شراب پیتے ہیں) مقدس راہب! کیا ہمارے بہادر بچوں کو ان کی عظیم قربانی کا مقصد سمجھا دیا گیا ہے۔

(راہب آگے بڑھتا ہے)

راہب: میرے وطن کے عظیم سپوتو! ساری انسانیت آج تمہارے اوپر رشک کرتی ہے کہ تم جلد ہی نروان حاصل کرنے والے ہو۔ مقدس باپ نے اس لیے دنیا کو پیدا کیا کہ اپنے نور کو مختلف روپ رنگ میں نت نئی شکلوں میں ظاہر کرے۔ شیطان نے انسان کو ورغلا لیا اور اس کو ذہن کا غلام بنا دیا کہ اسے ہر شکل الگ الگ نظر آنے لگی سچے نروان کی دولت نے انسان کو اپنے گمراہ دماغ سے مکتی پانے کی قوت دی۔ انسان صدیوں سے اس لمحے کا منتظر تھا کہ وہ ورغلانے والے دماغ سے نجات پا سکے اور حقیقت کو بے نقاب دیکھ سکے۔ ہمارے مذہبی راہبر اور ہمارے محبوب شہنشاہ نے پہلی بار ہماری منتخب اور برگزیدہ قوم کو یہ سعادت بخشی کہ وہ اعلیٰ ترین قربانی دے کر بھٹکانے والی زندگی کے مقابلے میں نروان دلانے والی موت کی عظمت کو پہچان سکے اور گمراہ کرنے والے بھیجے کو ملک اور قوم کی خاطر قربان کر کے حقیقت ابدی میں مل سکے جس میں ہمیشہ کا سکون اور سدا کی راحت ہے! میرے گلے کی بھیڑو! تم خوش نصیب ہو کہ راحت اور مسرت کی اس ابدی راستے پر روانہ ہو رہے ہو۔ رب اعلیٰ تمہاری مدد کرے۔(سب آمین کہتے ہیں اور جھک کر تعظیم دیتے ہیں)

ضحاک: ہمارے سپوتوں کی پیشانیوں کو صندل سے سجایا جائے اوران کی گردنوں میں مہکتے ہوئے گلابوں کے ہار پہنائے جائیں (تعمیل حکم ہوتی ہے) کیا قانون اپنا فرض پورا کر چکا؟

(جج آگے بڑھتا ہے)

جج: انصاف اور سچائی پر قائم اس عظیم الشان سلطنت میں قانون کے محافظ کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو یقین دلاؤں کہ جبر وظلم اور ناانصافی کی ہمارے سماج میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عدم تشدد اور جمہوریت کی بنیادیں ہمارے ملک میں ہوا سے زیادہ پرانی اور مٹی سے زیادہ گہری ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ آئینی طریقے اختیار کیے ہیں۔ میں بشارت دیتا ہوں کہ اس ملک کا ہر شہری آئینی حدود میں مکمل طور پر آزاد ہے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری آزادانہ مرضی کے بغیر تمہارے اوپر کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا جائے گا تمہیں یہ آئینی حق حاصل ہے کہ اپنے عزیز ملک کی خاطر اپنی جان قربان کرو۔ تمہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنے گمراہ کرنے والے بھیجوں سے اپنے دماغوں کو خالی کر کے عرفان اور نروان کی تابناک راہوں کی طرف قدم بڑھاؤ۔

(شاعر آگے بڑھتا ہے)

شاعر: اے وطن کے سورماؤ! تمہاری شان میں لکھے ہوئے یہ قصیدے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ لائق فخر ہے وہ دھرتی جس نے ایسے سپوت پیدا کیے میری آواز کے پھول اور میرے سنگیت کے ستارے تم پر نچھاور ہوں (نظم پڑھتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی رقص شروع ہو جاتا ہے رقاصہ ان کے اعزاز میں رقص کرتی ہے اور ان سب کی پیشانیوں کو چومتی ہے کہ اچانک سانپ ضحاک کے شانوں پر پھر زور سے پھن مارتے ہیں۔ ضحاک کی آنکھیں تکلیف سے ابل آتی ہیں)

ضحاک: ہم آخری بار تم میں سے ہر ایک سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا تم اپنی مرضی سے اپنے ملک اور قوم کی خاطر قربانی دینے کو تیار ہو؟

راہب: (آگے بڑھتا ہے) کہو میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنے ملک اپنی قوم اپنے شہنشاہ پر قربان ہونا منظور ہے۔

پہلا قیدی: (آگے بڑھتا اور راہب کے الفاظ دہراتا ہے) مجھے اپنے ملک اپنی قوم اپنے شہنشاہ پر قربان ہونا منظور ہے۔

دوسرا قیدی: " " " "

تیسرا قیدی: (آگے بڑھتا اور راہب کے الفاظ دہراتا ہے) مجھے اپنے ملک اپنی قوم اپنے شہنشاہ پر قربان ہونا منظور ہے۔

چوتھا قیدی: " " " "

پانچواں قیدی: (موسیقی بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے)

(چھٹا قیدی آگے بڑھ کر ضحاک کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے)

راہب: کہو مجھے اپنے ملک اپنی قوم اپنے شہنشاہ.........

چھٹا قیدی فریدوں: (بہت اونچی آواز میں چیخ کر کہتا ہے) نہیں! میرا کوئی ملک نہیں میری کوئی قوم نہیں میرا کوئی شہنشاہ نہیں۔ نہیں! مجھے جان دینا منظور نہیں!! (ایک دم موسیقی بند ہو جاتی ہے) ایک دم فوجی افسر سپاہی فریدوں کو نرغے میں لے لیتے ہیں فوجی افسر اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے میں گاڑ دیتا ہے)

راہب: مہربان باپ کے سامنے یہ گستاخی!

فریدوں: میرے ہونٹ تمہارے ٹانکوں سے زخمی ہیں میرے ہاتھ پیر تمہاری زنجیروں سے گھائل ہیں (جج کی طرف دیکھ کر) مجھے آئینی آزادی دینے والے کیا تمہارا دستور مجھے جینے کی آزادی نہیں دے سکتا؟

راہب: کیا تمہیں عرفان اور نروان کی ابدی راحت اور مسرت قبول نہیں؟

فریدوں: نہیں! موت کے سوداگرو، مجھے زندگی چاہیے۔ مجھے جینے دو!

راہب: اپنے ملک اور قوم کی خاطر—

فریدوں: ساری دنیا میرا ملک ہے ساری دنیا کے مظلوم میری قوم ہیں۔

جج: جہاں پناہ! اجازت ہو تو قانون اپنا فرض پورا کرے

فریدوں: (خوفناک قہقہہ لگاتا ہے) قانون! ظلم کے ہاتھ کی تلوار کو تم قانون اور انصاف کا نام

دیتے ہو۔

فوجی افسر: گستاخی حد سے بڑھ رہی ہے بہتر ہے شہنشاہ کے حکم سے اسے خاموش کر دیا جائے۔

ضحاک: اجازت ہے۔

(وزیر اعظم تلوار سے اشارہ کرتا ہے سپاہی نرغے میں لے لیتے ہیں اور فوجی افسر ضرب لگانے کے لیے تلوار نکال لیتا ہے۔ ضرب لگانے ہی والا ہے کہ نوشابہ کھڑی ہو جاتی ہے اور چیختی ہے)

نوشابہ: ٹھہرو! اس کے خون کا ایک قطرہ بہا تو ہمارا پاکیزہ نظام مجرم ہو جائے گا (ہم سب مجرم ہو جائیں گے)

(ضحاک پلٹ کر نوشابہ کی طرف دیکھتا ہے) پہاڑوں میں رہنے والے جنگلی قبیلے کا یہ نوجوان کسان تعلیم اور تہذیب کی روشنی سے محروم ہے۔ نہیں جانتا کہ عرفان کیسی نعمت ہے اور نروان کیسی سعادت۔ جرم اس کا نہیں ہمارے تعلیمی نظام کا ہے جو اسے علم کی برکتوں سے مالا مال نہ کر سکا۔

ضحاک: اسے لے جاؤ ہم اس وقت کا انتظار کریں گے جب تک دوسروں کی طرح یہ نوجوان بھی سچائی کی روشنی نہ دیکھ لے۔

نوشابہ: مجھے اجازت ہو تو اس نوجوان کی تربیت کی ذمہ داری یہ کنیز قبول کرے اس کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ اسے سچے علم کو حاصل کرنے کی سعادت ملنی چاہیے۔

ضحاک: اجازت ہے۔

(باقی قیدی اپنے سر جھکائے جلاد کے آگے کھڑے ہیں۔ ضحاک اٹھتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے اہل دربار اٹھتے ہیں جس طرح اور ترتیب سے جلوس آیا تھا اسی طرح واپس ہوتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ ان کے ساتھ قیدی نہیں ہیں۔ قیدی سر جھکائے اسی طرح جلادوں کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ جلوس کے بعد نوشابہ روانہ ہوتی ہے اور اس کے پیچھے فریدوں کو سپاہی اپنی حراست میں لے کر چلتے ہیں۔ آخر میں صرف ضحاک

رہ جاتا ہے وہ جلادوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ لہجہ سخت اور آواز بلند ہے)

ضحاک: اب ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے!!

(بلند موسیقی کی دھنیں اسٹیج کو ڈھک لیتی ہیں اور آہستہ آہستہ روشنیاں گل ہونے لگتی ہیں ضحاک کے اسٹیج سے رخصت ہوتے ہی اسٹیج اندھیرے میں کھو جاتا ہے اور اسی کے فوراً بعد تلوار گردنیں اور گردنیں الگ ہونے کی بے رحم آوازیں موسیقی کو درہم برہم کرتی ہیں)۔

چوتھا سین

(آتش دان میں آگ جل رہی ہے آگ کے شعلوں کی روشنی اور سائے فریدوں کے چہرے پر ناچ رہے ہیں وہ ایک ڈھیلی سی بے سلی چادر کو گاؤن کی طرح پہنے ہوئے کھڑا ہے۔ جس میں جا بجا پیوند لگے ہیں آتش دان کے دوسری طرف فریدوں کے مقابل نوشابہ بیٹھی ہے فریدوں کے دونوں طرف سپاہی پہرے پر کھڑے ہیں کمرہ قالینوں اور قیمتی فانوس سے سجا ہوا ہے)

فریدوں: ملکۂ عالم! آخر میں نے کیا قصور کیا ہے کہ مجھے موت کی سزا دی جارہی ہے۔ زندگی بھر ان ہاتھوں نے ہل اور ہنسیا کے سہارے۔ بنجر زمینوں میں بھی پھول کھلائے اور اناج کے دانے اُگائے۔ ان ہاتھوں نے بھوکوں کو کھانا دیا، ناتوانوں کو زندگی دی، کیا اس کا یہی انعام ہے؟ کہ مجھے بے قصور قتل کر دیا جائے۔ میں نے زندگی بھر کبھی کسی کا خون نہیں کیا، میں نے کسی کی جان نہیں لی۔ کیا میرا فقط یہی گناہ ہے کہ میں غریب ہوں میں ایک معمولی کسان ہوں، بے آسرا بے سہارا کسان!

(نوشابہ سپاہیوں کو اشارہ کرتی ہے۔ وہ دونوں چلے جاتے ہیں)

نوشابہ: فریدوں! تیرے سرخ زخمی ہونٹ کتنے خوب صورت ہیں ہم انھیں چومنا چاہتے ہیں۔

فریدوں (حیران ہو کر) ملکۂ عالم!

نوشابہ: تو کسان ہے نا، تو کہتا ہے کو تو نے زندگی بھر بھوکوں کو کھانا دیا، پیاسوں کی پیاس بجھائی،

ناتوانوں کوتوانائی دی، مرنے والوں کوزندگی دی۔ہم بھی پیاسے ہیں۔قریب آ کہ ہم تیرے لبوں سے اپنی پیاس بجھالیں۔

فریدوں: (جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

نوشابہ: قریب آ، ہم حکم دیتے ہیں۔

فریدوں: مجھے یقین نہیں آتا۔دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی ملکہ اور پیاسی۔

نوشابہ: تو نہیں جانتا پاگل، یہاں ہر چیز پیاسی ہے۔یہ خوب صورت قالین، یہ نقش ونگار سے بجی ہوئی دیواریں، یہ جگمگاتے فانوس، اس محل کی ایک ایک اینٹ اس کے اندر بسنے والوں کا ایک ایک سانس پیاسا ہے اسی لیے تو ہمیں تیرے خون کی ضرورت تھی۔دنیا کی سب سے عالی شان حکومت کے سب سے زیادہ طاقتور شہنشاہ کو ایک معمولی کسان بچے کا خون چاہیے تھا او تیرے گھائل ہونٹوں نے انکار کر دیا اب ہماری روح تیرے انہی ہونٹوں سے ایک گرم بوسے کی طلب گار ہے کیا تو یہ پیاس نہیں بجھا سکتا۔

فریدوں: ملکۂ عالم! مجھے نافرمانی پر مجبور نہ کیجیے۔

نوشابہ: نوشابہ انکار نہیں سن سکتی۔

فریدوں: میری مجبوری کا مذاق نہ اڑائیے۔

نوشابہ: ہم تجھے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز بخشنا چاہتے ہیں تجھے انکار ہے بیوقوف نوجوان؟

فریدوں: (اپنی قبا ایک دم اتار کر نیچے گرا دیتا ہے) میرے جسم پر کوڑوں کے ان نشانوں سے پوچھیے جو تمہارے قید خانوں کا انعام ہیں، میری آنکھوں کی جلتی ہوئی پتلیوں سے پوچھو جنھیں عذاب دینے والوں نے ایک ایک پل نیند کے لیے کئی راتوں سے ترسا رکھا ہے جلتے ہوئے لوہے سے داغے ہوئے ان نشانوں سے پوچھیے، ان زخمی انگلیوں سے پوچھو جن کے ایک ایک ناخن کے درمیان پتلی کیلیں ٹھونکی جاتی رہی ہیں۔

نوشابہ: اور یہ سب عذاب تجھے اتنا نہیں بتا سکا کہ انکار بے کار ہے۔

فریدوں: نہیں! میں اس طرح مرنا چاہتا ہوں کہ میرے ہونٹوں پر انکار زندہ رہے۔

نوشابہ: ایک چیونٹی کی کائنات کے خلاف یلغار! ایک معمولی سے کیڑے کو آسمانوں سے ٹکرانے

کا حوصلہ!!

فریدوں: میں کسی سے مقابلہ نہیں کرتا میں تو فقط اپنی مرضی سے جینے کا حق چاہتا ہوں۔

نوشابہ: اور اپنے ملک، قوم اور شہنشاہ کے لیے مرنے کی عزت!

فریدوں: اس طرح موت آنی ہے تو کم سے کم یہ نہ کہا جائے کہ یہ موت میری مرضی سے ہوئی۔

نوشابہ: (نرمی سے مسکراتی ہے) فریدوں، بیٹھ جاؤ۔ تم ہمارے مہمان ہو ہمیں تم جیسے ہمت والے جیالے نوجوان پسند ہیں۔ ہم تمہاری صاف گوئی کی قدر کرتے ہیں تم ہمیں نہیں جانتے، ہم تمہیں جانتے ہیں۔ سیستان کی ننگی پہاڑیوں کے اس پار ایک ملگجی سی شام کو۔۔۔ (کورس داخل ہوتا ہے۔ جس کے آگے قصہ گو۔ تاجیکی سی لباس پہنے ہوئے ایک بوڑھا اپنی بھاری آواز میں گا رہا ہے)

میں کچھ لوگوں کے بھاری قدموں کی
تیز آہٹ سن رہا ہوں۔
ہنہناتے ہوئے گھوڑے جن کی ٹاپوں میں آندھیاں بندھی ہوئی ہیں
ایک قدیم تاریخی آواز
شاید منگول آ رہے ہیں (کورس دہراتا ہے)
ماضی کے ٹھنڈے مقبروں میں روحیں چیخ رہی ہیں۔
فاطمہ! کھڑکیوں کو سختی کے ساتھ بند کر دو
بچوں کو گود میں اٹھا لو
دروازے کو کھلا ہوا ہرگز مت چھوڑو
اب ہماری بیواؤں کے ساتھ
سرِ راہ زنا بالجبر کیا جائے گا
ہماری دوشیزاؤں کے کنوارے سینوں میں
جھنڈے گاڑ دیئے جائیں گے (کورس دہراتا ہے)
ایک بار پھر

برف سے ڈھکی ہوئی وادیوں اور سانپوں سے بھرے جنگلوں کی طرف جانے کا وقت ہو گیا ہے،!! (نظم خالق عبداللہ)

(''وقت ہو گیا ہے'' کورس دہراتا ہے)

نوشابہ: وہ فاطمہ میں تھی۔ دروازے توڑ دیئے گئے اور شاہی سپاہی ایک معصوم بچی کو جو خوف سے اپنی کسان ماں کی گود میں منہ چھپائے رو رہی تھی زبردستی کھینچ کر نیزوں کے سائے میں اپنے برق پا گھوڑوں پر ڈال کر لے گئے۔ یہ سپاہی بھی کبھی میری طرح کسان تھے میں نے بھی اس وقت ہمت کر کے انکار کیا تھا۔ میرا بھائی مجھے چھڑانے کے لیے سپاہیوں کے گھوڑوں کے پیچھے بھاگا اور نیزے کا شکار ہو گیا میری ماں نے ان سے رحم کی بھیک مانگی اور تلوار کے ایک وار سے تیورا کر گر پڑی۔ جب تک یہ کسان کی بچی میرے اندر جاگتی رہی میں انکار کرتی رہی۔ پھر ایک دن میں نے ملکہ کا تاج پہنا اور اس کسان بچی کی لاش کو گدھوں نے نوچ کر کھالیا۔

فریدوں: اتنا کچھ جھوٹ دیکھا ہے کہ سچ پر سے ایمان اٹھ گیا ہے، اتنا جھوٹ سنا ہے کہ سچ کی پہچان جاتی رہی۔

نوشابہ: آج میں نے پھر ایک کسان کے زخمی ہونٹوں پر انکار کی آواز سنی، جی چاہا مرنے سے پہلے ان مقدس ہونٹوں کو ایک بار بوسہ دوں۔ (نوشابہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتی ہیں)

فریدوں: ملکۂ عالم! (تعجب اور عقیدت سے)

نوشابہ: انکار مقدس ہے فریدوں مگر بالکل بے کار۔ تم اور تمہارے کروڑوں، اربوں مفلس، نادار، کسان مزدور، دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں تمہارے ہاتھوں کی کمائی دولت سے ہم نے تمہارے خلاف پوری دنیا خرید لی ہے سائنس ہماری غلام ہے، مذہب ہمارا دلال، علم و دانش پر ہماری ٹھیکداری ہے۔ فوجیں، ہتھیار، فتوحات کے وسیلے، انصاف قانون سب ہمارے زر خرید ہیں۔ تم نہتے ہاتھوں سے کب تک ان زبردست قوتوں کا مقابلہ کرو گے آخر ایک دن ان طاقتوں سے پس کر رہ جاؤ گے یا مٹ جاؤ گے یا پھر نوشابہ کی طرح بک جاؤ گے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ میرے نوجوان دوست! سچائی

کو پہچانو۔ سچائی کے آگے سر جھکا دو۔

فریدوں: کوئی تیسرا راستہ نہیں؟

نوشابہ: نہیں! آتش دان میں جلتی ہوئی اس آگ کو دیکھو کیا اس آگ کے سامنے جلنے یا جلانے کے سوا کوئی اور راستہ بھی ہے (ہدایت دیتی ہے) نذرانہ پیش کیا جائے۔

(دو خدمت گار نہایت شاندار مرصع وردیاں پہنے دو قابیں لیے داخل ہوتے ہیں جن پر نہایت مرصع کپڑے پڑے ہوئے ہیں، قاب فریدوں کے سامنے آتش دان کی روشنی میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ نوشابہ کے اشارے پر دونوں خدمت گار باقاعدہ فوجی طریقے پر صف بستہ ہو کر نوشابہ کو سلامی دیتے ہیں اور پھر اسی طرح مڑ کر واپس چلے جاتے ہیں نوشابہ آتش دان کی راکھ جھاڑنے والی لوہے کی چھڑی سے ان دونوں قابوں سے کپڑے ہٹاتی ہے۔ ان میں اُن انسانوں کے خون میں لتھڑے ہوئے سر ہیں جو فریدوں کے ساتھ لائے گئے تھے ان کے بھیجے نکال لیے گئے ہیں اور سر درمیان سے شق ہیں۔)

فریدوں: (خوف اور دہشت سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور زور سے چیختا ہے) نہیں! نہیں!! یہ سب جھوٹ ہے۔ انسان اتنا ظالم نہیں ہو سکتا۔

نوشابہ: یہ سب سچ ہے۔ ان کے ہونٹوں کو چھوؤ جنھوں نے کبھی انکار کا لفظ نہیں جانا ان کے رخساروں کو ہاتھ لگا کر دیکھو یہ بھی کبھی تمہاری طرح جیتے جاگتے خون سے تابناک تھے (فریدوں دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے) تم ڈرتے ہو! (کپڑا پھر سے ڈھک دیتی ہے) سوچو، فریدوں! اچھی طرح سوچو، یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ تمہاری شان میں قصیدے لکھے جائیں، تمہاری پیشانی صندل سے جگمگائے تمہارے گلے میں مہکتے سرخ گلابوں کے ہار ہوں، فوجیں تمہیں سلامی دیں شہنشاہ کے ہونٹ تمہاری پیشانی کو بوسہ دیں، پورے ملک میں عزت کے ساتھ تمہاری تصویریں دکھائی جائیں اور تمہارا سر ہمیشہ زندہ رہنے والے عظیم انسانوں کے عجائب گھر میں رکھا جائے یا

تم ایک کتے کی موت مارے جاؤ۔ تمہیں کیا پسند ہے؟

فریدوں: میں کچھ نہیں سوچ سکتا، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا!!

نوشابہ: (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) تو فیصلہ کرلو۔ ہم نے داروغۂ زنداں کو حکم دے دیا ہے آج قید خانہ کی تمہاری کوٹھری اور ہمارے محل دونوں کے دروازے رات بھر کھلے رہیں گے اور ہمیں تمہارے فیصلے کا انتظار رہے گا۔ (دو قدم باہر جانے کے لیے آگے بڑھتی ہے پھر ایک دم پلٹ کر فریدوں سے مخاطب ہوتی ہے) اور ہاں — یاد رہے جمشید نے صرف ایک جام ایجاد کیا تھا جو ساری دنیا کا حال بتا دیا کرتا تھا ہمارے پاس ایسے ہزاروں جام ہیں جن کی نظروں سے دنیا کے کسی کونے میں کوئی نہیں بچ سکتا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے (تالی بجاتی ہے سپاہی فریدوں کو گھیر لیتے ہیں۔ نوشابہ واپس جانے لگتی ہے۔ فوجی بگل بجاتے ہیں جو اس کے رخصت کا اعلان کرتے ہیں۔ فریدوں سپاہیوں کی حراست میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا روانہ ہوتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

پانچواں سین

(آدھے بنے ہوئے مکان کا تہہ خانہ۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے رقاصہ شراب انڈیل رہی ہے۔ گول میز کے گرد جج، پروفیسر شاعر بیٹھے ہوئے ہیں طاقچوں میں شمعیں جل رہی ہیں۔ سب لوگ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ایک سانس میں جام خالی کر دیتے ہیں رقاصہ دوبارہ جام بھرتی ہے۔ خاموشی پھر بھی نہیں ٹوٹتی۔ لوگ شراب پیتے رہتے ہیں۔ اچانک شاعر نغمہ چھیڑتا ہے)

'میرے ذہن سے ساری تشبیہیں لے لو

میرے ہونٹ سے چھین لو استعارے

میرے جسم سے سارے لفظوں کے خلعت اتارو

مجھے صرف خامشی بخش دو

کہ جو درد سے خالی ہو، (تالیاں: رسمی سی)

شاعر: میں بہت تھک گیا ہوں دوستو!

رقاصہ: تمہیں تھک جانے کا حق ہے میرے شاعر! دولت تمہارے قدم چوم رہی ہے۔

شاعر: خاموش، فاحشہ، مجھے اور ذلیل نہ کر۔

رقاصہ: مجھے فاحشہ کہو اور کچھ گالیاں دے لو مگر تمہارے اندر کا کوڑھ اس سے اور بھی زیادہ بھیانک ہو جائے گا۔ ہاں میں نے اپنا آرٹ بیچا ناچ ناچ کر لوگوں کو موت کی طرف بلایا مجھے اپنی جان پیاری تھی مگر تم نے تو قلم کی عصمت، فکر کی پاکیزگی کا غرور سب کچھ بیچ کھایا ہے۔ (شاعر رقاصہ کو شانوں سے پکڑ لیتا ہے)

جج: نہیں دوستو! جھگڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہارا انصاف کروں گا۔ (شاعر رقاصہ کو چھوڑ دیتا ہے)

شاعر: (بھیانک قہقہہ لگاتا ہے) بکی ہوئی موم کی گڑیاں کب سے انصاف کرنے لگیں۔

جج: تم حد سے بڑھتے جارہے ہو۔

شاعر: یہاں کوئی حد نہیں ہے میرے دوست! ساری حدیں پار کی جا چکی ہیں۔ وہ سامنے دیکھو سقراط کی نسل کا آدمی انسانیت کا سب سے محترم سب سے برگزیدہ فرد، علم کا وارث، عرفان کا پجاری، سچائی کا پیغمبر، آئندہ نسلوں کا معمار اعظم استاد سقراط کی طرح زہر پینے کے بجائے ہماری نئی نسلوں کو زہر پلا رہا ہے تاکہ وہ کبھی اپنی بنائی ہوئی سرزمین پر عزت کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑی نہ ہو سکیں۔

استاد: تمہارا اشارہ میری طرف ہے۔

شاعر: بدقسمتی یہی ہے۔

استاد: مگر میرے اوپر پہلا پتھر کون پھینکے گا؟ تم سب مجرم ہو۔

رقاصہ: تمہارا ضمیر تمہیں سنگ سار کرے گا۔

استاد: میں اسے کب کا سنگ سار کر چکا۔ ملک اور قوم کی خاطر میں نے ضمیر کو دفن کر دیا اور

شہنشاہ کی اطاعت قبول کرلی میں نے نئی نسل کو پڑھایا کہ ذہن علم کی راہ میں حائل ہے دماغ انسان کی گمراہی کا سبب ہے اور موت زندگی کا صحیح عرفان ہے میں نے شہنشاہ کے اژدہوں کی غذا فراہم کرنے کے لیے انھیں آمادہ کیا ملک اور قوم کی خاطر۔

شاعر: (قہقہہ لگاتا ہے) ملک اور قوم کا نام نہ لو۔ تم ایک گھٹیا قسم کے خوشامدی تھے جس میں سچائی کی خاطر مرنے کی ہمت نہیں تھی بزدل کتے۔

جج: تمھیں دوسروں پر فرد جرم عائد کرنے کا حق کس نے دیا ہے۔

استاد: یہ سراسر ناانصافی ہے۔

رقاصہ: جب انصاف اندھا ہو جائے تو ناانصافی قانون بن جاتی ہے۔

شاعر: تخیل کی ساری شمعیں روشن کرو میرے دستو! سچائی کے قد آدم آئینوں سے سارے نقاب ساری دھند دور کردو۔ آؤ آج کی رات ہم اپنے بھیانک چہرے دیکھیں قاتلوں سے زیادہ خوفناک خونیوں سے زیادہ دہشت ناک چہرے (ایک سکنڈ کے لیے مکمل خاموشی چھا جاتی ہے رقاصہ جام بھرتی ہے کوئی جام نہیں اٹھاتا۔ ایک دم استاد کھڑا ہو جاتا ہے)۔

استاد: شاید تم سچ کہتے ہو شاعر! مجھے اپنے آپ سے گھن آتی ہے۔ روپیہ، سلامتی، خوشامد اور چاپلوسی کی گندی نالیوں میں رینگنے والا کیڑا وہ میں ہوں۔

شاعر: میں نہیں جانتا قابل نفرت کون ہے مگر ہر لفظ مجھے ذلیل اور رسوا کرتا ہے کورے کاغذ کا ہر صفحہ میرا منہ چڑھاتا ہے۔ قلم مجھے سولی پر چڑھاتا ہے میرا ضمیر بے قرار ہے۔

جج: یہ تمھیں کیونکر معلوم ہوا؟ یہ تو میری آپ بیتی ہے شاعر۔ حلف لینے سے آج تک میں سو نہیں سکا ہوں۔ وہ تمام بے گناہوں کو جن کی موت کو میں نے جائز قرار دیا ہے قطار باندھ کر میری خوابوں میں میرا مذاق اڑاتے ہیں مجھ پر ہنستے ہیں مجھ پر نفرت سے تھوکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے نیکی کو گناہ سے اور معصومیت کو ظلم سے محفوظ رکھنے کی قسم کھائی تھی مگر میں نے انصاف کو درندوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے میں غدار ہوں۔

استاد: میں نے علم سے غداری کی ہے میری تجربہ گاہوں میں انسانی فلاح کے بجائے اس کی

کھوپڑیوں سے بھیجے چھین لینے کے تجربے کیے جارہے ہیں میری درس گاہوں میں زندگی کے بجائے موت کی تعلیم دی جارہی ہے میں نے سچائی کی جگہ انسان کو جھوٹ سکھایا۔عزت کی جگہ اسے ذلت کا درس دیا۔میں نے انسانیت کے ضمیر کو قتل کر دیا۔

(راہب گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

راہب: غضب ہو گیا دوستو! فریدوں جیل سے فرار ہو گیا۔

استاد: شاعر، جج، رقاصہ (حیرانی سے) کیا؟ فرار ہو گیا؟

راہب: آج تک شاہی جیل خانے سے کسی کو فرار ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جج: ضرور اس میں کچھ سازش ہے۔

راہب: سازش کو ماریئے گولی۔فکر یہ ہے کہ اب ہمارا راز گاؤں گاؤں قصبے قصبے کے لوگوں تک پہنچے گا سب کو معلوم ہو جائے کہ ملک اور قوم کی نہیں شہنشاہ کو انسانوں کے بھیجوں کی ضرورت ہے۔

استاد: جام جمشید سے زیادہ کارگر ہمارے آئینے خانوں کی مدد سے ایک لمحے میں مجرم کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

راہب: مگر ابھی تک پتہ نہیں لگایا جاسکا۔

شاعر: مجھے معلوم تھا ایک ایسا انوکھا دن بھی آئے گا، میں جانتا تھا۔

راہب: کاہن بھی یہی کہتا ہے وہ کہتا ہے آج کے دن سے سبھی باتیں الٹ جائیں گی اقبال کے سورج گہنا جائیں گے ذرے آفتاب بن کر جگمگائیں گے زمین اپنی دولت اگل دے گی کمانوں کی طرح جھکی ہوئی گردنیں تیروں کی طرح سیدھی ہو جائیں گی سجدوں میں گرے ہوئے سر آسمانوں کی طرح بلند ہوں گے۔

رقاصہ: آہ! مجھے ایسے ہی دن کا انتظار تھا! (شراب کے جام بھرتی ہے)

شاعر: دوستو! میں نے اپنے اس آدھے بنے ہوئے مکان کے تہہ خانے میں آپ کو اس نئی صبح کے استقبال کی دعوت دی تھی مجھ سے اب یہ ذلت اور زیادہ برداشت نہیں ہوتی۔میں آپ کے ساتھ اس نئی صبح کا جام پیتا ہوں میرے جام میں زہر ہے (جام ہاتھ میں اٹھالاتا ہے) گواہ

رہنا دوستو کہ مرنے سے پہلے میں سچ بول سکتا تھا! نئی صبح کا آخری جام! (جام پینے ہی والا ہوتا ہے کہ فوجی افسر سامنے پڑا ہوا پردہ ہٹا کر جام ہاتھ سے چھین لیتا ہے)

فوجی افسر: اتنی جلدی نہیں شاعر اعظم! (سب حیران رہ جاتے ہیں) ایسی حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

میں ایک خوشگوار فرض ادا کرنے آیا تھا۔ شہنشاہ اعظم نے اعلیٰ ترین بین الاقوامی ادبی اعزاز کے لیے شاعر اعظم کا نام تجویز کیا ہے۔ ہمارے قابل تعظیم استاد کو بین الاقوامی انجمن میں ہمارے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ (سب تالیاں بجاتے ہیں) عزت مآب میرِ عدل کو عالمی عدالت کا سربراہ مقرر کرنے کی سفارش کی گئی ہے جس کی منظوری آچکی ہے ہماری حسین رقاصہ کو قومی محفل رقص کا صدر نامزد کیا گیا ہے (تالیاں) اور ہمارے لائق احترام راہب اعظم کو قومی مجلس قانون ساز کا میر مجلس مقرر کیا گیا ہے۔ یہ سب عوامی مجلس آئین ساز کی جمہوری طور پر اتفاق رائے سے منتخب ہوئے ہیں۔ میں آپ سب حضرات کو شہنشاہ مجلس آئین ساز اور عظیم مملکت کے قابل فخر عوام کی طرف سے مبارک باد پیش کرنے کا خوشگوار فریضہ ادا کرنے آیا تھا۔

سب لوگ: ہم نہایت شکر گزار ہیں۔ (تعظیم سے سر جھکاتے ہیں)

فوجی افسر: مگر مجھے افسوس ہے (تالی بجاتا ہے اور کئی سپاہی آکر سب کو گھیر لیتے ہیں پھر سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے) ملک کے آئین کے مطابق منتخب شہنشاہ اور ریاست کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں مجھے آپ سب کو گرفتار کرنا پڑ رہا ہے حکومت کی آنکھ اور کان کبھی غافل نہیں ہوتے (سپاہی آگے بڑھ کر سب کو گرفتار کر لیتے ہیں)

فوجی افسر: اخبار نویسوں کو اندر بھیجا جائے۔ (پریس والے اندر داخل ہوتے ہیں)

فوجی افسر: کل کے اخبارات میں سیاہ حاشیے پر یہ خبر شائع ہو گی کہ ایوان حکومت کی طرف آتے ہوئے سڑک کے ایک حادثے میں یہ سب لوگ مارے گئے۔ پورے ملک میں تین دن سوگ منایا جائے گا۔

چھٹا سین

(گھنٹہ چار بجاتا ہے ضحاک کا محل، شاہی کرسی کے سامنے ضحاک
بے قراری سے چبوترے پر ٹہل رہا ہے دوسری کرسی خالی پڑی ہے چہرے پر
غصہ جھلک رہا ہے، چار بجتے ہی جلوس آنے لگتا ہے لیکن اس بار سب سے
پہلے وزیراعظم آگے آگے ہے)

وزیراعظم: عظیم مملکت کے عوام کی طرف سے شہنشاہ اعظم کو قومی جشن مبارک!

(قومی ترانہ چھیڑا جاتا ہے سب لوگ مودب کھڑے ہو جاتے ہیں ذرا سی دیر بعد شہنشاہ
چیخنے لگتا ہے)

ضحاک: یہ فضول اور بے کار تماشا بند کرو! یہ بکواس گانا بجانا بند کرو! (سب حیران رہ جاتے ہیں
اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں) قومی ترانہ! قومی جھنڈا!!! ہم اس تماشے سے تنگ
آ چکے ہیں، ہمیں اپنی غذا چاہیے اور جلد!

وزیراعظم: نذرانہ پیش کیا جائے (قیدی لائے جاتے ہیں جن کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں اور منہ پر
نقابیں چڑی ہوئی ہیں)

ضحاک: ٹھہرو، ان میں فریدوں ہے؟ (سب خاموش رہتے ہیں) بولتے کیوں نہیں ؟ کیا تم
سب گونگے ہو؟

وزیراعظم: شہنشاہ فریدوں ابھی گرفتار نہیں ہوا۔

ضحاک: (گرج کر) کیوں گرفتار نہیں ہوا؟ آخر ہمارے جام جمشید، ہمارے جاسوس اور فوجی،
ہمارے سراغ رساں یہ سب کہاں ہیں؟

وزیراعظم: میں شہنشاہ معظم کو یقین دلاتا ہوں کہ فریدوں کو گرفتار کر کے جلد حضور میں پیش کیا
جائے گا۔

ضحاک: نالائق، باتونی کتے، ہمیں تیرے وعدوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہمیں نتیجے چاہئیں صرف
نتیجے! کام پورا ہونا چاہیے۔

وزیراعظم: کام پورا ہوگا جہاں پناہ!

ضحاک: ضحاک نے انتظار کرنا نہیں سیکھا! نذرانہ پیش کیا جائے۔

وزیراعظم: تعمیل ہو۔ (قیدی آگے لائے جاتے ہیں)

ضحاک: زنجیریں کھول دو، نقاب اتار دو۔ کون ہیں یہ لوگ (نقاب اتار دیئے جاتے ہیں۔ ضحاک چبوترے سے نیچے اتر آتا ہے اور قیدیوں میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھتا ہے)

ہم انھیں پہچانتے ہیں! ہماری مملکت کا سب سے بڑا شاعر۔

(آگے بڑھتا ہے) ہماری عدالت کا سربراہ، ہمارے ملک میں انصاف کا امانت دار!

(اور آگے بڑھتا ہے) ہمارے ملک کا ماہر تعلیم استاد!

(اور آگے بڑھتا ہے) ہمارا سب سے بڑا مذہبی رہنما۔ راہب اعظم!

(اور آگے بڑھتا ہے) ہماری مملکت کی سب سے بڑی رقاصہ!

(اور آگے بڑھتا ہے) ہماری راتوں کی شریک ملکہ نوشابہ!

وزیراعظم: اجازت ہو تو ان کے ہونٹوں کے ٹانکے کاٹ دیئے جائیں۔

ضحاک: نہیں! ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔ یہ سب لوگ بہت بول چکے ہیں ان کے لیے خاموشی بڑی دولت ہے۔

وزیراعظم: کیا ضروری رسمیں پوری کی جائیں گی؟

ضحاک: نہیں بے کار ہے!! ان کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ ملک اور قوم کے لیے جان دینا کتنی بڑی نیکی ہے۔ یہ خود جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے آئین کی ہر دفعہ جمہوری ہے اور ہم اپنے ملک کے کسی باشندے پر جبر نہیں کرتے۔ یہاں کسی کی جان ان کی مرضی کے خلاف نہیں لی جاتی، جو یہ نہیں جانتے وہ صرف جلاد کی تلوار انھیں سمجھا سکتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ آج ہمارے سامنے ملک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ بھیجوں کا ناشتہ لایا جارہا ہے۔ کاش ان میں فریدوں بھی شامل ہوتا۔

وزیراعظم: اجازت ہے؟ (ضحاک اشارہ کرتا ہے)

نذرانے والوں کو آگے لایا جائے۔

(جلاد آگے آکر پوزیشن سنبھال لیتے ہیں قیدی گردن جھکائے
کھڑے ہیں کہ اچانک فریدوں ہاتھ میں مشعل لیے داخل ہوتا ہے اور سب
کو نظرانداز کرتے ہوئے ضحاک کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے)

فریدوں: شہنشاہ کا ساتواں شکار، فریدوں!

ضحاک: یہ تیرے آخری الفاظ ہوں گے۔

فریدوں: کاوا لوہار کے بیٹے فریدوں کو موت سے ڈراتے ہو میری گردن سے ایک سر کاٹ لو
میرے جسم سے دو باز و قطع کرلو۔ مگر یاد رکھ ضحاک میرے لاکھوں سر ہیں، کروڑوں
بازو ہیں میرے سر اور باز و وہ لوگ ہیں جو سمندر کی تہوں میں ڈوب کر تیرے لیے موتی
نکالتے ہیں۔ دن دن بھر تمہاری پچاس منزلہ عمارات کے ٹانڈ پر صلیب سے بندھے
رہتے ہیں کہ تمہارے لیے محلات تیار کرسکیں۔ زمین کی اندھیری تہوں میں گھس کر
تمہارے آتش دانوں کے لیے کوئلہ اور تمہاری صنعتوں کے لیے تیل نکال لاتے ہیں۔
تپتی ہوئی بھٹیوں کے درمیان زندہ رہ کر تمہاری مشینیں چلاتے اور کارخانے آباد کرتے
ہیں کہ تمہارے جسم نرم لباس اور تمہارے ظالم وجود آسودگی پاسکیں، جھلساتی دھوپ میں
کھڑے ہو کر ہل چلاتے ہیں کہ تمہاری سب کچھ نگل جانے والی بھوک تسکین پاسکے۔
میں ہر لمحے مرنے والے اور ہر پل دوبارہ جی اٹھنے والے کروڑوں اربوں میں سے ایک
ہوں۔ مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔

(باہر کا شور بڑھتا ہے)

وزیر اعظم: خبردار، گستاخ (سپاہیوں سے) سپاہیو! اسے گرفتار کر کے جلادوں کے سامنے پھینک
دو۔

سپاہی فریدوں کو گرفتار کر لیتے ہیں اور جلادوں کے روبرو لے جاتے ہیں)

فریدوں: مجھے موت منظور ہے۔ مگر محلات کی خاموش دیوارو! گواہ رہنا میں اپنی مرضی سے مرنے
کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جلاد میری گردن اڑا سکتے ہیں مگر میں جلاد کے آگے گردن
جھکانے سے انکار کرتا ہوں۔ (باہر کا شور بہت بڑھ جاتا ہے اور دروازہ ٹوٹنے کا دھماکہ

ہوتا ہے۔فوجی افسر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے جلاد تلوار کھینچ چکے ہیں اور شہنشاہ کے حکم کا انتظار کررہے ہیں فوجی افسر تیزی سے آگے بڑھ کر فوجی سلام بجالاتا ہے)

فوجی افسر: شہنشاہ معظم! ہجوم نے محل کے صدر دروازے توڑ ڈالے ہیں وہ سب محل میں داخل ہورہے ہیں۔

وزیراعظم: جشن مملکت کے جوش میں عوام اپنے شہنشاہ کو نذرعقیدت پیش کرنے آرہے ہیں۔

ضحاک: انھیں روک دیا جائے۔

فوجی افسر: ساری کوششیں ناکام ہوچکی ہیں۔

(اتنے میں ہجوم اندر داخل ہوتا ہے مگر اندر داخل ہونے سے قبل جو شور غوغا تھا وہ سب خاموشی میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ضحاک ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔فریدوں سپاہیوں سے اپنے آپ کو چھڑا کر قتل گاہ کے چبوترے پر چڑھ جاتا ہے)

فریدوں: دوستو! اپنے شہنشاہ کو دیکھ لو! کیا کاوا کا بیٹا جھوٹ کہتا تھا کہ اس کے شانوں پر دو بے حد زہریلے سانپ لہلہاتے ہیں جنھیں کھانے کے لیے ہر روز انسانوں کے بھیجے درکار ہوتے ہیں اور میں تم ہم سب ان کی غذائیں اسی غذا کو حاصل کرنے کے لیے شاعر موت کے نغمے گاتے تھے استاد وطن پر قربان ہونے کا سبق دیتے تھے قانون انصاف کرتا تھا اور رقاصہ ناچتی تھی اسی کے لیے فوج، پولیس اور جبر کا پورا کارخانہ درکار تھا دیکھو آج ان سب کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں یہ تم سے آزادی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ خاموشی سے ظلم کو سہتے رہنے والو اب تو کچھ بولو! (مجمع خاموش رہتا ہے)

ضحاک: (جلادوں سے مخاطب ہوتا ہے) اس گستاخ کی گردن اڑادو۔(جلاد تلوار اٹھاتے ہیں)

فریدوں: جو محنت کش مزدور، کسان کا بیٹا نہ ہو وہ میرے اوپر تلوار اٹھائے، کیا سرکاری وردی پہن کر تم سب یہ بھی بھول گئے کہ تم کسان اور محنت کش مزدور کے بیٹے ہو جنھیں کھیت کھلیانوں، کارخانوں اور بازاروں سے اغوا کرلیا گیا ہے۔کیا زندگی بھر دوسروں کے لیے خون اور پسینہ بہانے کے بعد بھی تم ایک لمحہ کے لیے اپنے واسطے جینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔اپنے قاتلوں کو پہچان لو! آج وہ سارے قاتل بے نقاب تمہارے

روبرو کھڑے ہیں۔

ضحاک: حکم کی تعمیل ہو! (مجمع میں ہل چل پیدا ہوتی ہے)

جلاد: (خاموشی سے تلواریں لے کر ضحاک کے اردگرد کھڑے ہو جاتے ہیں)

فریدوں: ٹھہرو، میرے بھائیو! یہ سعادت مجھے حاصل کرنے دو۔ آج تک مظلوم ہی کا خون بہتے دیکھا ہے آج تک میرا ہی قتل ہوا ہے میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ (تلوار چھین لیتا ہے اور ضحاک پر جھپٹتا ہے مگر اتنے میں مجمع کے اندر سے بوڑھا آگے بڑھ کر ضحاک اور فریدوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے)

بوڑھا: ہاتھ روک لے نوجوان! ضحاک کی روح میری ہے میں اس کا سودا کر چکا ہوں۔

فریدوں: اور اس کا جسم:

بوڑھا: سانپوں کی ملکیت ہے۔

فریدوں: مگر ہم انتقام لیں گے۔

بوڑھا: بہت دیر ہو چکی ہے۔ انتقام اتنا آسان نہیں۔ ضحاک ہر جگہ اور ہر زمانے میں پیدا ہوں گے تو کس کس کو قتل کرے گا۔ (ضحاک اچانک غائب ہو جاتا ہے) اس کے شانوں کے ناگ ہمیشہ تمہارے بھیجوں پر پلتے رہیں گے تو انھیں مار نہیں سکتا!

فریدوں: ہم ان کے سر کچل ڈالیں گے۔

سب کی آواز: ہم ان کا سر کچل ڈالیں گے۔

بوڑھا: (قہقہہ لگاتا ہے) بھولتے ہو نادانو! صدیوں کی لڑائی کو لمحوں میں ختم کرنا چاہتے ہو؟

فریدوں: (تلوار کا ہاتھ مارتا ہے مگر بوڑھے پر کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ ایک خونخوار قہقہے کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے) بچ گیا مگر یاد رکھ بوڑھے جب بھی، جہاں بھی ضحاک سر اٹھائے گا فریدوں کا یا اس کے کسی مظلوم بھائی یا بہن کا ہاتھ بھی ضرور اٹھے گا۔ ان لوگوں کے ٹانکے کاٹ دو آؤ ہم نئے ضحاک کی تلاش میں چلیں۔

(پردہ گرجاتا ہے)

خون کے دھبے

(آٹھ ڈرامے)

مصنف

پروفیسر محمد حسن

مرتب

پروفیسر ایم۔ سعید الظفر چغتائی

اردو اکادمی، دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی ۔ ۱۷۱

KHOON KE DHABBE

Written by

Prof. MOHD. HASAN

Editesd by

Prof M.S.Z. Chaghtai

Pub. by

URDU ACADEMY, DELHI

Printed

2011

Rs. 150/-

ضابطہ

سن اشاعت

۲۰۱۱ء

ڈیڑھ سو روپے

اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی ۔ پی ۔ او ۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-174-7

مصنف کے بارے میں

پیدائش	:	مرادآباد (یوپی)	(۱۹۲۶ء)
تعلیم	:	لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے	(۱۹۴۶ء)
		ایل۔ایل۔بی۔، پی۔ایچ۔ڈی	(۱۹۵۲ء)
ملازمت	:	لکھنؤ 'سب ایڈیٹر' پانیئر	(چند برس)
		علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لکچرار اردو	(۱۹۵۴ء)
		دہلی یونیورسٹی، ریڈر اردو	(۱۹۶۴ء)
		کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، پروفیسر صدر شعبۂ اردو	(۱۹۷۰ء)
		جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی، اردو پروفیسر	(۱۹۷۵ء)
		پروفیسر امریٹس	(۱۹۹۱ء)

تصنیفات :

اردو، ہندی اور انگریزی میں تقریباً ۷۰ تصنیفات جن میں سے چند یہ ہیں۔

'اردو میں رومانوی تحریک'...... کشمیر

لاتعداد ریڈیو ڈرامے، جن کے مسودے ضائع ہو گئے۔

'فیض آباد جو ایک شہر ہے'

غمِ دل وحشتِ (سوانحی ناول، اسرار الحق مجاز پر)

'آخری سلام'...... مکتبہ جامعہ، نئی دہلی (۲۰۰۲ء)

خواب نگر (شعری مجموعہ) (۲۰۰۷ء)

وغیرہ

فہرست

☆☆☆

دیباچہ

میرے ڈراموں کا یہ مجموعہ کئی سال بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس دوران ملک کی فضا اور دنیا کا حال واحوال بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اس کے کچھ دھندلے دھندلے نشانات ان ڈراموں میں بھی جابجا ملیں گے۔ نہیں ملے گا تو کوئی مثبت حل، مگر وہ بھی بین السطور میں کہیں نہ کہیں ہے ضرور۔

البتہ اردو میں ڈراموں کی کم یابی کا شکوہ اس کے بعد بھی سنا جاتا رہے گا۔ اس مجموعے میں مختلف طریقوں سے پیش کیے جانے والے ڈرامے شامل ہیں خاص طور پر 'اردو کی کہانی'، جو روشنی اور آواز کے ذریعے بار بار پیش کی جاتی رہی ہے اور ہر مرتبہ پہلے سے بڑھ کر کامیاب رہی ہے۔

محمد حسن

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرفِ حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی

اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرون دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور بچوں کا ماہنامہ ''امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر کتاب پروفیسر محمد حسن کے آٹھ ڈراموں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے کچھ ڈرامے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ مرحوم محمد حسن کی ایما پران کی ترتیب کا کام پروفیسر ایم۔ سعید الظفر چغتائی صاحب نے انجام دیا اور ان ڈراموں پر ایک وقیع مضمون بھی تحریر کیا ہے۔ اکادمی پروفیسر چغتائی کی شکرگزار ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان ڈراموں کو مرتب کیا اور اپنی زیرِ نگرانی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام بھی کرایا۔ ڈراموں کے موضوعات اور اندازِ بیان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ مرحوم محمد حسن صاحب کو زبان و بیان پر کیسی قدرت حاصل تھی۔ اکادمی کی کوشش تھی کہ یہ مجموعہ حسن صاحب کی زندگی میں شائع ہو لیکن بوجوہ اس کی اشاعت ممکن نہیں ہوسکی لیکن ان کے بعد بھی یقیناً یہ ادب پارے ان کی یادگار رہیں گے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرمین محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر مجموعہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا۔

سکریٹری

مقدمہ

پروفیسر محمد حسن نے لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی، سری نگر کشمیر اور جواہر لعل نہرو، دہلی یونیورسٹیوں میں ادب پڑھایا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے لکھنے لگے تھے اور ادبی حلقوں میں متعارف ہو گئے تھے۔ مارکسی تنقید لکھی، جس میں اہمیت سماج کو ہوتی ہے، پھر یہی خصوصیت ان کی دوسری تحریروں میں سما گئی، شخصی تاثرات اور خاکوں اور خاص طور پر ریڈیو ڈراموں میں جو وہ پچھلے ساٹھ برس سے لکھتے رہے ہیں وقت کی پابندی (قریب پندرہ منٹ) کی وجہ سے ان کی عبارت کسی ہوئی ہوتی ہے اور پلاٹ خوب سوچا سمجھا اور طے شدہ، یہاں یاوہ گوئی تو کیا جملہ معترضہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ بیانیہ کی مدد صرف آواز کے سگنل کرتے ہیں، کرداروں یا ان کی حرکات وسکنات کے دیکھنے کا سوال نہیں۔ ان اسباب سے محمد حسن کی تحریروں میں صراحت اور ارتکاز شروع سے ہے، زبان پر اہلِ زبان کا عبور اور اس میں شگفتگی وروانی ہے۔ نہ تکرار ہے جس کا الزام اکثر استادوں کے سر آتا ہے، نہ اغلاق، سکہ بند نقاد و مفکر جس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تاثر ہے جو ڈرامہ سن کے ہی نہیں پڑھ کے بھی پیدا ہوتا ہے۔ افسوس کہ ان میں سے زیادہ تر ضائع ہو گئے اور ریڈیو ریکارڈ ان سے خالی ہیں۔

ہمارے سامنے مصنف کے آٹھ ڈرامے ہیں جن میں سے آخری دو، ریڈیو ڈراموں سے لمبے ہیں۔ پہلا ڈرامہ ''قاتلوں کے درمیان'' عالمی سیاست کا منظر نامہ ہے۔ اس کے اہم کردار تین ہیں: ایک فوجی سربراہ، جو حکومتِ وقت کی بقا اور نفع کے لیے دنیا کے دو تہائی سے زیادہ ملکوں میں جنھیں یورپ کے شہنشاہوں نے دوسری جنگِ عظیم میں ٹوٹ کے، مجبوری آزاد کیا۔ وہ عوامی بہبود کے لیے کام کرنے والوں پر ظلم ڈھاتا اور انھیں ملک اور اس کے باشندوں سے غداری

پر مجبور کرتا ہے۔ دوسرا کردار مافیا سردار کا ہے، جو منشیات کی پیداوار سے دولت کماتا اور فوجی سرداروں کو خرید لیتا ہے۔ تیسرا غریب اہل قلم ہے جو اِن سازشیوں کے خلاف تحریک چلاتا، لکھتا، بولتا ہے، اور قابل فروخت نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھی کے پاؤں تلے کچل جاتا ہے۔

دوسرا ڈرامہ ''ایک اور زندگی'' ہمارے الیکشن ہتھکنڈوں سے متعلق ہے اور دو ایکٹ کا ہے۔ یہ واقعات ہماری پچھلی پچاس ساٹھ سالہ زندگی میں برابر پیش آتے رہے ہیں کہ فساد کرا کے ہندو مسلم دشمنی پیدا کی اور ووٹروں کو اندھا کر دیا، پھر الیکشن کے بعد آگ بجھا دی۔ یہ کام منظم گروہ کراتے ہیں جو سیاسی بھی ہوتے ہیں، تجارتی بھی۔ اس ڈرامہ میں بڑے کردار ہیں نیتا اور دکاندار جو الیکشن کے جلسہ جلوس کا منتظم ہے مگر جسے اب فساد کرانے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ پھر یہ مجرم خود کو بڑا رحم دل اور عوام دوست بھی کہتے رہتے ہیں۔ گویا ڈرامہ ہماری گھناؤنی سیاست کو آئینہ دکھا رہا ہے۔

تیسرا قومی ڈرامہ ''خون کا دھبہ'' ۱۸۵۷ء کی اُس جنگ آزادی کے پس منظر میں ہے جو بیگم حضرت محل نے نو ماہ تک لکھنؤ کے اندر رہ کے، پھر اتنی ہی مدت گھاگھرا پار ''بندی'' کے قصبہ سے لڑی، اور جسے اودھ کے عوام مدتوں گھر گھر لڑتے رہے۔ ڈرامہ سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ناچ گانا اپنے طور پر قدر کے لائق فنونِ لطیفہ ہیں اور ان کا جسم فروشی کا آلہ کار ہونا لازمی نہیں۔ اس ڈرامہ کا خاص کردار ایک نوجوان رقاصہ ''یاسمین'' ہے جس نے واجد علی شاہ سے فن سیکھا تھا۔ ضمنی کردار حضرت محل، ان کے سپاہی یا سپہ سالار، خوش حال، راوی، منشی، انگریز سپاہی، نور بائی، استاد جی اور راجہ وغیرہ کے ہیں۔ ان دونوں ڈراموں میں پڑھنے یا سننے والے کو احساس دلانے کی حد تک تشدد کی آوازیں آتی ہیں مگر ایذا پسندی یا Morbidity کی کوشش نہیں ملتی۔

چوتھا ڈرامہ ''آتشِ رفتہ کا سراغ'' تاریخ کے اس دور پر روشنی ڈالتا ہے جب فاتح حکمراں کے سپاہی مفتوحوں پر اس طرح ٹوٹ پڑتے تھے جیسے بھیڑ بکریوں کے گلّہ پر بھیڑیے۔ تاریخ کے ان سیاہ اوراق میں سے بھی محمد حسن نے عزتِ نفس اور بغاوت کی چنگاریاں نکال لی ہیں اور دکھایا ہے کہ انسان ہمت سے کام لے تو کب کیا نہیں کر سکتا۔ رہی موت تو وہ آنی ہی ہے، عزت کی یا ذلت کی۔ مصنف نے یہ کہانی انجام سے پہلے ہی ختم کر دی ہے کیونکہ ایک طرف بات تاریخ کے خلاف جاتی اور دوسری طرف ڈرامہ کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس ڈرامہ کے اہم کردار منگول

شہنشاہ، باغی کامران اور حسینہ بائی ہیں۔ ملکہ کا کردار ثانوی ہے۔

پانچواں ڈرامہ ''شیر افگن'' ہندوستان میں مغل حکومت کی تاریخ سے متعلق ہے، جب اکبر اعظم نے مہر النساء کو شاہزادۂ سلیم سے دور رکھنے کے لیے ''شیر افگن'' سے بیاہ دیا تھا اور سلیم نے جہانگیر ہو کر شیر افگن کو قتل کرا کے مہر النساء کو آگرہ واپس منگوالیا اور ملکۂ نور جہاں بنایا۔ اس ڈرامہ میں خاص کردار 'اکبر' اور 'شیر افگن' کے ہیں، مہارانی، مہرن، اور قطب الدین ضمنی ہیں۔ کہانی تاریخ سے زیادہ ادبی روایت ہے۔ اس سے فلم 'پکار' بھی یاد آتی ہے۔

چھٹے ڈرامہ ''آزاد برباد'' میں اہلِ قلم نے محمد حسین آزاد کی زندگی پیش کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ماند پڑنے پر دہلی کے جو ہزاروں سے لاکھوں تک باشندے موت کے گھاٹ اتر گئے، ان میں ان کے والد مولانا محمد باقر، دہلی اردو اخبار کے مدیر کو بھی پھانسی ہوئی۔ گھر کے ۲۲ نفر پلک جھپکتے بے گھر ہو گئے۔ آزاد کے خلاف وارنٹ گرفتاری تھا، جس کے معنی موت ہی ہوتے۔ مگر وہ کس کس جتن سے ہندوستان بھر کی خاک چھانتے پھرے اور آخر میں معافی پا کے لاہور کالج میں اردو شاعری کو نیا موڑ دینے لگے۔ پھر ایران کی سیر کی، اور آخر عمر زندگی کے صدموں، خاص طور پر بیٹی کی جدائی کی تاب نہ لا کر پاگل ہو گئے، مگر عمر اسی سال کے لگ بھگ پائی۔ یہ سب باتیں محمد حسن نے شروع شروع کے دو فردی مکالموں اور پھر خود کلامی کی صورت میں پیش کی ہیں۔ بیان کے لیے اکثر محمد حسین آزاد کے اپنے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ڈرامہ میں ہولناکی نہیں، درد و سوز ہے۔ فراق نے کہا تھا: ''سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں۔'' یہاں معاملہ شگفتہ بیانی پڑھنے یا سننے کا، کلیجہ سلگانے اور آہ نہ بھرنے کا۔

ساتواں ڈرامہ ''کہرے کا چاند'' مرزا غالب کی زندگی کا خلاصہ ہے اور کس کمال کا! یہ ایک لمبا ڈرامہ ہے، تین ایکٹ کا۔ پہلے ایکٹ میں تین سین ہیں اور دوسرے میں دو۔ اوسط کتاب کے ۶۷ صفحے گھیر لیتا ہے۔ اس سے محمد حسن کی ڈرامہ نگاری کا عروج شروع ہو جاتا ہے اور اگلے ڈرامہ تک باقی ترقی پذیر رہتا ہے۔ پہلا ایکٹ کھلتا ہے آگرہ کی حویلی میں، جب بیٹے اسد اللہ خاں باپ اور چچا دونوں کو کھو چکے ہیں۔ پتنگ لڑاتے اور شطرنج کھیلتے ہیں۔ استاد ہُرمزد سے فارسی پڑھتے ہیں اور شعر کہنے لگے ہیں۔ مصنف نے ان کی اس زمانہ کی شاعری کا نمونہ نظم ''پتنگ کاغذی'' کے طور پر پیش کیا ہے، اس تن دن کا نہیں جسے وہ بہ جبر فارسی سے اردو بنا لیتے تھے۔ پھر تیرہ سال کی عمر میں ان

کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ لڑکیوں کی طرح آگرہ سے رخصت ہو کر دہلی آجاتے ہیں۔ اسی ایکٹ کے دوسرے سین (منظر) میں گلی قاسم جان کی جھلکیاں ہیں۔ برادرِ خورد پاگل یوسف مرزا کے مکالمے ہیں، داستان گوئی کے نمونے ہیں، کبھی سات اولاد کی ایک ایک کر کے مرنے کی خبر ہے۔ ڈومنی پر ان کی اور ان پر ڈومنی کی فریفتگی کی داستان ہے۔ پھر تیسرے منظر میں وہ غریب زہر کھا کر غالب کی آغوش میں جان دے دیتی ہے اور مرثیہ معشوق گونج اٹھتا ہے۔

دوسرے ایکٹ میں دہلی کے سارے صاحبانِ علم وادب غالب کے دیوان خانہ میں نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ مفلسی کے آخری تدارک کے طور پر اسی دیوان خانہ کو قمار خانہ بناتے اور کوتوال کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں۔ دوسرے ایکٹ کا دوسرا منظر 'پھول والوں کی سیر' کے پس منظر میں انگریزوں کے خلاف عوام کے ایک حصہ کا غم وغصہ دکھاتا ہے جس کا تعارف پہلے ہو چکا ہے۔ یہاں بہادر شاہ ظفر کی دل گداز غزل ''یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا'' گائی جاتی ہے اور آخر میں غالب کی رہائی اور شاہی نوکری کی خبر ملتی ہے۔

تیسرا ایکٹ غالب کی غزل ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک'' سے شروع ہوتا ہے۔ اب دلّی میں بغاوت برپا ہوتی ہے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں غالب سکّہ پڑھتے ہیں۔ پھر بغاوت کے خاتمہ پر قتل عام مچا، دلّی لٹی، غالب کرنل براؤن کے سامنے پیش ہوئے اور اپنی ظرافت کی بدولت بے ضرر گھر لوٹ آئے۔ ان کے احباب جو دہلی کے علم کی آبرو تھے، مارے گئے، سولی چڑھے یا کالے پانی بھیجے گئے۔ غالب کی پنشن بند ہوئی اور انھوں نے قیمتی کپڑے اور بیوی کے زیورات بیچ کے گزر گیا۔ اپنے بھائی کے قتل اور رفیقوں کا ماتم ملکہ معظمہ کے حکم کے مطابق چراغاں سے کیا اور ذاتی خطوں میں جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں لکھتے رہے۔ اس احتیاط سے کہ ہاتھ قلم نہ ہو پائیں۔

محمد حسن نے اس مفصل ڈرامہ میں غالب کے حسب حال اشعار برابر اس طرح پیش کیے ہیں کہ ان کی زندگی کا بہتر سالہ عرصہ ایک مسلسل کہانی کی طرح گزر جاتا ہے۔ یہ عرصہ نہ صرف ایک شخص اسد اللہ خاں کی زندگی ہے بلکہ آگرہ اور دہلی کی اُس ثقافت کی بھی کہانی ہے جس میں وہ زندہ رہا۔ غالب پر بہت سے ڈرامے لکھے گئے ہیں، ان میں سے بعض غالب ہی کی اپنی تحریروں پر مبنی

ہیں۔فلم بنی ہے، قاضی عبدالستار نے ناول لکھا ہے لیکن یہ ڈرامہ خاص ہے، اور ہمارے قومی ٹیلی ویژن کو اسے کھیلنا اور بار بار دکھانا چاہیے۔

آٹھواں، ۳۵ فُل اسکیپ صفحہ لمبا ڈرامہ ''اردو کی کہانی'' ہندوستان کی ہزار سالہ ثقافتی تاریخ کا رجز ہے، جو ہمارے زمانہ حال پر ختم ہوتا ہے۔ڈرامہ شروع ہوتا ہے ہولی، عید، دیوالی اور بھانگڑا ناچ سے۔پھر ہندوستان کی روح بولتی ہے اور ملک میں مختلف گروہ اور قومیں جو نئی تہذیبیں اور زبانیں اپنے ساتھ لائیں ان کے آپس میں سما جانے کا حوالہ دیتی ہے۔پھر جلد جلد منظر بدلتا ہے۔آریہ، ایرانی، افغانی، ترک تاجر آتے، بازار لگاتے اور ایک دوسرے کو سنتے ہیں۔جن سے امیر خسرو جیسا نابغۂ روزگار نئے تخلیقی سوتے نکالتا ہے۔کہہ مکرنیاں، خالق باری، جھولے کے گیت، صوفی قوالیاں اور بابل کے بول سنائی دیتے ہیں۔محمد تغلق دارالحکومت دولت آباد منتقل کرتا ہے، خلقت جھیل جاتی ہے، بھجن منڈلیاں گاتی ہیں، بندہ نواز گیسو دراز، بھاگ متی، قطب شاہ، دکن کے پرانے اور بعد کے شاعر مذکور ہوتے ہیں اور ہم ان کے شاہکاروں کے اقتباس سنتے ہیں۔پھر شمالی ہندوستان واپسی ہوتی ہے تو کبیر اور نانک سامنے آتے ہیں اور جعفر زٹلی سننے پڑھنے والوں کو محظوظ کرتا ہے۔نادر شاہ اور ابدالی دلّی کو برباد کرتے ہیں اور شہر آشوب سامنے آتا ہے۔

اب بنگال ہے، مصحفی و جرأت ہیں، سراج الدولہ کی جنگ اور گرفتاری ہوتی ہے اور ہم آگرہ لوٹ آتے ہیں جہاں نظیر اپنے نغمے سنا رہا ہے۔دہلی اور آگرہ کی یہ آخری بہار ختم ہوتے ہی لکھنؤ کی بساط عیش بچھتی ہے۔فسانۂ آزاد ناب صاحب کے بٹیر کے کمالات گِناتا ہے اور واجد علی شاہ کا رہس سننے میں آتا ہے۔

ہم دلّی پھر لوٹتے ہیں، اس بار دلّی کالج اور آخری مشاعرہ کی جھلکیوں کے لیے۔پھر انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوتی ہے اور اس کے نتیجے تیزی سے گزر جاتے ہیں، جاں فروش قتل اور بہادر شاہ قیدی۔غالب ان حالات میں خط لکھتے ہیں۔سر سید کالج کی بنیاد ڈالتے ہیں۔آغا حشر ڈرامے لکھتے اور اسٹیج کرتے ہیں جن میں چنگیز اور ناصر کا مکالمہ خون کو گرماتا ہے۔شوق لکھنوی کی مثنوی 'زہر عشق' کی مشہور سوگوارانہ وصیت رلاتی ہے۔اودھ پنچ اخبار نکلتا ہے۔اکبر الہ آبادی کی شاعری سیاسی و سماجی ظرافت کا نمونہ، نول کشور پریس کے احسانات، مولانا آزاد کا مقدمۂ کراچی،

چکبست کی قومی نظمیں، اقبال کے فرشتوں کا گیت، جلیاں والا باغ پر جوش کی نظم، بھگت سنگھ کی پھانسی، بھارت چھوڑو تحریک آزادی اور اس کے بعد اردو پر کالے بادل، مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ اختر الایمان کے الفاظ میں:

''دیکھو ہم نے کیسے بسر اس آباد خرابے میں''

یہ سب کچھ جواہر لعل یونیورسٹی کے عالم و فاضل استاد کے تحقیقی قلم نے تاریخ کی سچائی اور علم و ادب کے احترام کے ساتھ رنگا رنگ اور نوع بہ نوع عام فہم زبان میں لکھ دیا ہے، زبان جو جگہ جگہ ہندوستانی کہی جائے گی! اپنی زندگی کی اس منزل پر جب محمد حسن کا ضعف بصارت انھیں خط بھی نہیں پڑھنے دیتا ہے انھوں نے یہ شاہکاروں کا شاہکار کسی شاگرد کو املا بولا ہے۔ اسے صحیح صحیح کمپوز کر کے چھاپنے کے لیے اُنہی جیسا اردو ادب اور بولیوں کی سماجی نزاکتوں کو سمجھنے والا نگراں درکار ہے۔ کاش کہ یہ مرحلہ بہ حسن و خوبی طے ہو جائے۔

رہا معاملہ یہ ڈرامہ کھیلنے کا تو اس کی مجھے ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ سرکاری یا نیم سرکاری سرپرستی میں، جیسے کہ بعض اردو اکادمی کے ذریعہ، اس پر دستاویزی فلم بنائی جائے جو کئی گھنٹوں کی ہوگی مگر پوری طرح بن جائے تو ہندوستان کے آرٹ، ادب اور فنون کو اس سے بڑھ کر چار چاند لگا دے گی، جتنا بمبئی پر بنی حالیہ فلموں 'سلام' اور 'سلم ڈاگ ملینئر' نے لگائے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے مصنف کے موضوعات کا تنوع بھی ظاہر ہوتا ہے۔ تاریخی ناولوں کے بارے میں جملہ مشہور ہے کہ نہ وہ تاریخ ہوتے ہیں، نہ ناول مگر یہ ڈرامے ہیں اور ٹھوس تاریخی حقیقتوں پر ان کی بنیاد ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ وہ ادب یا فن لطیف تاریخ کو کہیں مسخ نہ کرے، صرف اسے خوبصورت اور موثر بنا کر پیش کرے۔ ادبیات میں دس کی گنتی کو مکمل کہا گیا ہے، اور گرہ کو جیومیٹری میں مکمل مانتے ہیں کہ اس میں کوئی دھار یا کونہ نہیں ہوتا، یہ ہر طرف سے یکساں ہوتا ہے مگر آٹھ کا عدد تین ابعاد لمبائی، چوڑائی اور موٹائی میں تکمیل ہی کا حکم رکھے گا۔ اس تین میں سے ہر بُعد دو عدد کا ہوتا ہے مگر اپنی نوجوانی کا واقعہ اشٹ گرہ یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنس پڑتا ہوں۔

سعید الظفر چغتائی

قاتلوں کے درمیان

افسر: اپنے ساتھیوں کے نام بتادو۔

(شاعر خاموش رہتا ہے)

افسر: انگاروں جیسی آنکھیں نکال نکال کر کہا گھورتے ہو شاعر۔ میں کہتا ہوں اتنا عذاب جھیل نہیں پاؤ گے۔ اپنے ساتھیوں کا نام بتادو۔

شاعر: میرے ساتھی!

افسر: ہاں وہ لوگ جو تمہارے ساتھ حکومت کے خلاف سازش میں شریک تھے۔ تمہیں ان کے نام معلوم ہیں؟

شاعر: جی ہاں، معلوم ہیں۔ انقلابی جھوٹ نہیں بولتے۔

افسر: تو ہم کہتے ہیں ان کے نام بتادو۔

شاعر مجھے سب کے نام معلوم ہیں مگر تمہیں نہیں بتاؤں گا۔

افسر: کب تک اس طرح الٹے ٹنگے رہو گے اور اس فوجی جیل خانے میں ہمارے سپاہیوں کے کوڑے کھاتے رہو گے۔

شاعر: جب تک تم چاہو۔

افسر: ہم قول دیتے ہیں، ہم تمہیں رہا کردیں گے، عزّت کے ساتھ تمہارے گھر بھیج دیں گے۔ تم شاعر ہو۔ کہاں اس جھمیلے میں پڑ گئے۔ ضرور کہیں کوئی بھول ہوئی ہوگی۔

شاعر: نہیں، کوئی بھول نہیں ہوئی۔

افسر: تم صرف اپنے ساتھیوں کے نام بتادو۔

شاعر: وقت آئے گا جب میں اپنے ساتھی عوام کو تمہارے، تم سے کے نام بتادوں گا۔

افسر: پاگل مت بنو۔ ہم کوڑے مار مار کر تمہاری کھال کھینچ لیں گے۔ ہم تمہاری گیت لکھنے والی اُنگلیوں سے ناخن اُکھاڑ لیں گے۔ تمہاری کھوپڑی سے ایک ایک بال چمٹیوں کے ذریعے اُکھیڑ لیا جائے گا اور تم چیختے چیختے مر جاؤ گے۔ ہماری دیواریں پتھر کی نہیں، فولاد کی ہیں۔ یہ فوجی قید خانہ ہے۔ سمجھے!

شاعر: سمجھ گیا، مگر میرے پاس صرف ایک زندگی ہے۔ وہ لے لو۔ اس سے زیادہ تمہارے اختیار میں بھی کچھ نہیں۔

افسر: سپاہیو۔ آدھ گھنٹہ اسی طرح اُلٹا لٹکے رہنے دو اور کوڑوں سے خاطر کرو۔

(سپاہیوں کے خوف ناک قدموں کی چاپ۔ ایڑیاں جوڑ کر سلامی دینے کی آواز اور کوڑوں کی آواز۔ شاعر کی کراہ)

افسر: ہم پھر کہتے ہیں ساتھیوں کے نام بتادو۔

شاعر: (ہانپتے ہوئے) ہرگز نہیں۔

افسر: تمہیں ان کے نام معلوم ہیں۔

شاعر: ہاں، معلوم ہیں، مگر بتاؤں گا نہیں۔

افسر: کم بخت، زبان لڑاتا ہے۔ لاؤ کوڑا مجھے دو (کوڑا مارتا ہے۔ شاعر کے کراہنے کی آواز) بے ہوش ہو گیا کم بخت۔ اسے واپس وارڈ میں پہنچادو۔

شوبھرام: تماشا جاری ہے داروغہ جی!

افسر: فوجی افسر کو داروغہ کہنے کی سزا جانتے ہو شوبھرام۔

شوبھرام: ہم سب کچھ جانتے ہیں افسر جی۔

افسر: تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

شوبھرام: یوں ہی، ہم تمہیں بتانے آئے تھے جرنیل جی کہ۔۔

افسر: مجھے کچھ سننا نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ یہ فوجی قید خانہ ہے۔ سمجھے۔

شوبھرام: ہم یہ بتانے آئے تھے کہ یہ طریقہ نہیں ہے نام اُگلوانے کا۔

افسر: تم ہمیں طریقہ سکھاؤ گے!

شوبھرام: ضرورت پڑتی ہے تو سکھانا ہی پڑتا ہے۔

افسر: بکواس لگا رکھی ہے۔

شوبھرام: بے ہوش ہو گیا نا، یہ سر پھرے لوگ مر جائیں گے۔ جھکیں گے نہیں۔ ان پر فتح پانے کے ڈھنگ اور ہیں۔ کہیے تو بتاؤں

افسر: خاموش!

شوبھرام: شوبھرام کی خاموشی مہنگی پڑے گی جرنیل صاحب۔ ہم تو آپ کے ہمدرد ہیں، جو کام آپ کا، وہی کام ہمارا!

افسر: (ڈانٹتے ہوئے) شوبھرام، اپنا راستہ دیکھو۔

شوبھرام: مگر ہم آپ کا راستہ دیکھیں گے، پچھم کی پہاڑیوں کے اس پار!!

(Change Over)

(اوبڑ کھابڑ راستوں پر جیپ چلنے کی آواز)

شوبھرام: اس کی آنکھوں کی پٹی کھول دو۔

افسر: (حیرت سے) شوبھرام تم!

شوبھرام: میں نے کہا تھا نا۔ پچھم کی پہاڑیوں کے اس پار ہم تمہارا راستہ دیکھیں گے۔

افسر: تو مجھے تمھارے آدمیوں نے اغوا کیا ہے۔

شوبھرام: جی ہاں۔ جرنیل صاحب!

افسر: مت بھولو شوبھرام کہ تم اعلیٰ فوجی افسر کے سامنے ہو اور مفرور قیدی کی سزا موت ہے!

شوبھرام: جھوٹ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اعلیٰ افسر ملک میں مجرموں کے بادشاہ شوبھرام کے سامنے ہے، اور اس افسر سے ہتھیار چھین لیے گئے ہیں۔ کہیے آپ سے کیا سلوک کیا جائے۔

افسر: تم بلیک میل کرنا چاہتے ہو!

شوبھرام: نہیں آنکھیں کھول کر دیکھو۔ تم دیوتا کے سامنے ہو۔

افسر: دیوتا؟ کون دیوتا؟

شوبھرام: ہاں دیوتا۔ ہم ہیں دیوتا۔ ایثار اور قربانی کے دیوتا۔ سب کے پاپ، خودغرضی، لوٹ مار، قتل، خون سب کے جرم اپنے سر لینے والا، سب کا زہر پینے والا دیوتا۔

افسر: کیا بکتے ہو؟

شوبھرام: بکتا نہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ فسادات ہوتے ہیں ملک میں، محل دو محلوں پر، زمینوں اور قبرستانوں پر قبضے بھی ہم ہی کرتے ہیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو مارتے ہیں تو بھی ہمارے ہاتھوں سے مارتے ہیں اور لوٹتے ہیں، گھروں کو جلاتے ہیں تو بھی ہماری سیوائیں حاصل کرتے ہیں۔

افسر: تم خونی ہو!

شوبھرام یہ سب کام ہم کرتے ہیں مگر دوسروں کے لیے۔

افسر: تم لٹیرے ہو!

شوبھرام: اسمگلنگ، چور بازاری، کالا دھندا، قتل و غارت گری، حوالے کا بازار۔ جی ہاں یہ سب کام ہم کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ہم وہ طاقت دیتے ہیں جسے غنڈوں، قاتلوں اور لٹیروں کی طاقت کہا جاتا ہے۔

افسر: muscle power

شوبھرام: دھن دولت اور یہ طاقت نہ ہو تو حکومت، جمہوریت، تمہارے سارے نظام، پولیس، فوج، سیاسی لیڈر، دھن دولت والے سب بیکار ہو جائیں۔

افسر: مگر کیوں کرتے ہو یہ سب؟ کون کراتا ہے تم سے یہ سب!

شوبھرام: ایک وقت میں ایک سوال، برخوردار۔ کیوں کرتے ہیں ہم؟ کسی نہ کسی کو سمدر منتھن کے بعد سارا زہر شیو کی طرح پینا ہی تھا سو ہم پیتے ہیں اس زہر کو کہ تم سکھ کے ساتھ رہ سکو۔ میں ڈکیت اور قاتل نہ ہوں تو پولیس اور فوج کو کون پوچھے گا، سیاسی لیڈر کیسے الیکشن میں دشمنوں کا سامنا کر پائیں گے، عدالتوں میں اُلّو بولے گا۔ وکیل فاقہ سے مر جائیں گے اور جرنیل کرنیل کوڑی کے تین تین بکیں گے۔

افسر: کون کراتا ہے تم سے یہ سب؟ نام بتاؤں اس کا۔ ہم اسے سولی پر چڑھا دیں گے۔

شوبھرام: نہیں اتنی گرمی ٹھیک نہیں۔

افسر: (اور زور سے) ہم کہتے ہیں نام بتاؤ اس کا۔

شوبھرام: نام جاننے کا بڑا لپکا ہے تمھیں۔ بھئی کرنیل صاحب، جرنیل صاحب، ہمیں تو اس کا چہرہ چاروں طرف نظر آتا ہے۔ آپ کو اسے پہچاننے میں دیر لگے گی۔ (تالی بجاتا ہے) دلاری۔ جرنیل صاحب کے لیے شراب کا پیالہ لاؤ۔ (چھاگل کی آواز)

دلاری: حاضر ہے، جرنیل صاحب۔ ہماری جان کی قسم! نوش کیجیے، جی بھر کر پیجیے۔ خود پییں گے یا ہم پلائیں اپنے ہاتھوں سے۔

شوبھرام: دیکھتی نہیں ہے، ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، فقط ہونٹ آزاد ہے۔

افسر: ہم نہیں پییں گے۔

دلاری: ارے۔ دیا رے دیا۔ تم تو سردار کا کہا بھی نہیں مانت ہو۔ تو کا تم بھگوان ہو کا؟

شوبھرام: اس کی باتوں کا برا نہ مانئے گا، یہ ہر طرح کی بولی بولتی ہے، بڑی چنچل ہے۔

افسر: مجھے نہیں پینا!

شوبھرام: یہ پیالہ ہم نے پینے کے لیے منگایا بھی نہیں ہے۔

افسر: تو پھر؟

شوبھرام: یہ تمھارے دوسرے سوال کا جواب ہے جرنیل۔ اس پیالے میں تمھیں اصلی مجرم کی شکل نظر آجائے گی جو ہم سے، تم سے، سب سے پاپ کراتا ہے۔

افسر: پھینک دو۔ میں اسے جھٹکے مار کر گرا دوں گا۔ (پیالہ کے چھناکے کے ساتھ گرنے کی آواز جو دیر تک گونجتی رہتی ہے۔)

شوبھرام: دلاری

دلاری: سردار!

شوبھرام: اسے پیار کی بھاشا میں سمجھا دے۔ ہم اس سے سودا کرنا چاہتے ہیں اور ہماری ہر بات کے پیچھے بارود کی دھمک اور دولت کی کھنک ہے۔

افسر: کیا سودا کرنا ہے؟

شو بھرام: ان پہاڑوں کے پیچھے دور تک افیم کے کھیت ہیں اور زمین کے نیچے ہیروئن اور اسمیک بنانے والے کارخانے ہیں، یہ ہم باہر کے ملکوں کو بیچتے ہیں، جو ملک صدیوں سے ہمیں، پورے ایشیا کو زبردستی افیم کھلاتے آئے ہیں۔ ہیروئن اور اسمیک کا ایک ذرہ بھی ہم ایشیا میں بیچیں، اپنے ملک میں کسی کو دیں تو ہمیں گولی مار دینا، مگر ہمارا مال یورپ اور امریکہ بھیجنے سے نہ روکنا۔

افسر: ہمارے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں ہے۔

شو بھرام: تم سودا کرو، طاقت ہم تمہیں دلائیں گے۔

افسر: میں وعدہ نہیں کر سکتا۔

شو بھرام: ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے، سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جواب زبان ہی سے دیا جائے۔ ہم تمہیں دو دن کی مہلت دیتے ہیں۔ پرسوں ہم واپس جیل خانے چلے جائیں گے۔ اس سے پہلے تمہارا فیصلے چاہیے۔
معاہدہ یا موت!

افسر: فوجی افسر کو موت سے ڈراتا ہے!

شو بھرام: دو باتیں یاد رکھنا جرنیل صاحب۔ ہمارے انٹرنیشنل بینک کی دو سو سے زیادہ شاخیں دنیا بھر میں کام کرتی ہیں۔ دھوبی کا دھندا کرتے ہیں ہم لوگ۔ ہیروئن کے کالے دھن کو دودھ کا دُھلا سفید کر دیتے ہیں۔ اس میں تمہارا حصہ ہوگا۔

افسر: اور دوسری بات؟

شو بھرام: دوسری بات یہ کہ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ دنیا کے بڑے سے بڑے ملک کا بڑے سے بڑا آدمی، بادشاہ، صدر، وزیر اعظم یا تو ہمارا اپنا آدمی ہے یا ہمارے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ خود قبضے میں نہیں ہے تو اپنی بیوی یا بیٹے کے ذریعہ سے ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم سے مقابلہ بیکار ہے۔ ہم دنیا فتح کر چکے ہیں۔ (اپنے ساتھیوں سے) جرنیل صاحب کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر عزت کے ساتھ اُن کے دفتر پہنچا دو۔

(قدموں کی چاپ)

اور ایک بات جرنیل صاحب۔ پرسوں شام کو چھ بجے رائفل کے دو فائر ہوں گے۔ اس کا جواب آپ بھی ریوالور کے دو فائر سے دیجیے گا۔ ہمارا سودا پکا ہو جائے گا۔ جواب نہ ملا تو آپ جانیں۔ (ہلکا قہقہہ) انھیں لے جاؤ!!! اتنا بہت ہے۔

(Changer Over)

(جیپ کے کچھ دور تک چلنے کی آواز، پھر ٹھہرنے کی آواز— تھوڑی دیر بعد سپاہیوں اور فوجیوں کے سیلوٹ دینے اور ایڑیاں ٹکرانے کی آوازیں)

افسر: سکریٹری

سکریٹری: (سیلوٹ کرتے ہوئے) سر!

افسر: فوجی جیل سے کوئی تازہ خبر!

سکریٹری: صاحب جی۔ وہ جو قیدی اس روز کوڑے کھا کے بے ہوش ہو گیا تھا اسے بیماری کی وجہ سے عدالت کے حکم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

افسر: ہیڈکوارٹر سے کوئی نیا حکم؟

سکریٹری: کئی بار صدر کا ٹیلی فون آچکا ہے۔ کل یوٹوپیا اسٹیٹس کے بادشاہ آرہے ہیں، ان کی دیکھ بھال اور خاطر مدارات کے لیے آپ کو مقرر کیا گیا ہے۔ انھیں شکار کا شوق ہے۔ میرا مطلب ہے ہر قسم کے شکار کا، اور دنیا کی اچھی شرابیں اور عورتیں۔ میرا مطلب ہے، جوان عورتیں!

افسر: اور کوئی ملنے والا؟!

سکریٹری: صاحب جی، انٹرنیشنل بینک کے مالک آئے تھے۔ کہتے تھے، ٹیلی فون پر بات کریں گے کہ یوٹوپیا کے بادشاہ سے کہہ کر ان کو اور ان کے اثر والی حکومتوں اور امیروں کو انٹرنیشنل بینک میں اپنا پیسہ روپیہ جمع کرانے پر راضی کر لیں۔ باقی بات آپ سے۔

افسر: (بات کاٹ کر) بڑی لمبی بات کرتے ہو— اور سنو!

سکریٹری: جی، صاحب جی۔

افسر: آج مجھے کسی سے نہیں ملنا ہے۔ ٹیلی فون والی لڑکی سے کہہ دو مجھے ٹیلی فون نہیں چاہیے،

کوئی ملنے والا نہیں۔ کوئی ٹیلی فون نہیں۔ کوئی پیغام نہیں IS THAT CLEAR?

سکریٹری: یس سر!

افسر: اب تم جا سکتے ہو! (دروازہ بند ہونے کی آواز)

(دروازہ کھلنے کی آواز)

رانی: میں کب سے ریٹائرنگ روم میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ رانی کے بغیر کیسے گزریں یہ گھڑیاں، کہاں گزاریں ساری راتیں؟

افسر: کچھ مت پوچھو رانی مائی ڈارلنگ۔

رانی: کیا اپنی بیوی کے پاس چلے گئے تھے رنگ رلیاں منانے؟ ہاں صاحب، بیاہتا پھر بیاہتا ہے، وہ یاد آئے تو رکھیل کو بھلا کون پوچھتا ہے۔

افسر: نہیں رانی، میں وہاں نہیں گیا تھا۔

رانی: تو پھر۔؟

افسر: کہا نہ، مت پوچھو — ابھی میں کچھ پریشان ہوں۔

رانی: شراب؟!

افسر: ضرور۔ مگر بعد میں، پہلے وہ میٹھی باتیں، کچھ توجہ، تھوڑا سا پیار۔

رانی: اور کچھ؟!

افسر: چھوٹا سا ایک مشورہ!

رانی: رانی سے مشورہ؟ بیکار ہے۔ جو تمہارے فیصلہ وہی میرا مشورہ۔

افسر: تو سنو۔ رانی، کامیابی کی کنجی میرے ہاتھ آگئی ہے۔ دولت، بے پناہ دولت! قوت بے پناہ قوت! حکومت، پوری دنیا پر حکومت!

رانی: مجھ پر بھی۔

افسر: نہیں تم پر نہیں — تمہارے تو ہم غلام ہیں — مگر ایک کام کرنا ہوگا۔

رانی: منظور ہے۔

افسر: یوٹوپیا کے بادشاہ کل یہاں آرہے ہیں۔

رانی: مجھے معلوم ہے۔

افسر: یہ بھی جانتی ہو تم، میں ان کی تواضع کا انچارج ہوں، انھیں ہر طرح خوش رکھنا ہے۔

رانی: تو رکھو۔

افسر: شکار، شراب اور جوان عورتوں کا شوقین ہے۔ تم اس کا دل جیت سکوگی؟!

رانی: کیا بک رہے ہو۔ میں تمہاری ہوں، صرف تمہاری۔

افسر: ہماری تو ہو ہی، مگر وہ کوئی تمھیں جیب میں ڈال کر تو نہیں لے جائے گا میری جان، اور پھر چند دن کی بات ہی ہے۔ پھر وہی ہم، وہی تم!

رانی: خبردار— میں بکاؤ نہیں ہوں۔

افسر: اسے ڈھب پر لانا ضروری ہے۔ صرف اتنا کہ وہ اپنی، اپنے ملک کی اور اپنے اثر والے ملکوں کی دولت، ان کا سارا کالا اور سفید دھن انٹرنیشنل بینک میں جمع کرا دے۔

رانی: تمہارا بینک ہے کیا؟

افسر: نہیں، ہیروئن اور اسمیک کے دلالوں کا بینک ہے اور اس میں کچھ حصہ داری ہماری بھی ہونے والی ہے۔

رانی: تو یوں کہو نا!

افسر: عقل مندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے اور خوب صورت عقل مند اشارہ کے بغیر بھی بات سمجھ لیتے ہیں۔

رانی: اگر میں انکار کر دوں تو—!

افسر: ایسے خوب صورت ہونٹوں پر انکار اچھا نہیں لگے گا۔

رانی: میں یہ سب کچھ نہیں کروں گی۔

افسر: کرنا تو تمھیں ہی سب کچھ ہوگا۔ تم کوئی پتی ورتا ساوتری نہیں ہو— اور میں بھی کوئی اوتار یا فرشتہ نہیں ہوں۔

(ہوا میں رائفل کے دو فائر دغتے ہیں۔ تھوڑی دیر سناٹا رہتا ہے۔ پھر افسر ریوالور نکال کر دو فائر کرتا ہے)۔

افسر: عہد نامہ مکمل ہو گیا — آؤ، شراب پئیں۔ آج کی شام تمہارے نام!!

(Change Over)

شاعر: بکتے ہیں، سارے ڈاکٹر احمق ہیں۔ مجھے دل کی بیماری نہیں ہے۔

بیگم: ان باتوں سے کام نہیں چلے گا۔

شاعر: دیکھو بیگم، مجھے جیل سے چھوڑنے کا کوئی بہانہ تو چاہیے تھا انھیں (ایک دم کھانسی کا دورہ) میں بالکل ٹھیک ہوں۔

بیگم: اور جیل کے باہر والے ڈاکٹر۔ ہسپتال کے ڈاکٹر؟ وہ بھی جھوٹے ہیں۔

شاعر: انھیں موٹے موٹے اسامیوں کو موٹی موٹی بیماریاں بتانے کی عادت ہو گئی ہے۔ پیسہ ملتا ہے نا، دیکھو میں گہرے سے گہرا سانس لے سکتا ہوں۔ (سانس لیتا ہے۔ پھر کھانسی آتی ہے اور ہانپنے لگتا ہے۔)

بیگم: تمہارے دل کا آپریشن ضروری ہے۔

شاعر: ان گدھوں سے کہو، مجھے کچھ نہیں ہوا ہے — لو ایک شعر سنو۔

نہ یوں افسردہ ہو فیروز، یہ دستورِ فطرت ہے
اگر سینے میں دل ہوگا تو دل میں درد بھی ہوگا

بیگم: مگر شعر سنانے سے سچائی تو نہیں چھپ سکتی۔

شاعر: سچائی تو یہ بھی ہے کہ شاعر کی جیب خالی ہے اور آپریشن مفت نہیں ہوتے۔ امریکہ اور لندن جانے کے لیے ہاتھ پھیلا نہیں سکتے۔ لہٰذا جب تک جیو خوش خوش جیو۔

بیگم: روپیہ کیا تمہاری زندگی سے بڑھ کر ہے؟

شاعر: بڑھ کر ہو یا گھٹ کر مگر ہے کہاں؟ میرے قدر دانوں کے پاس آنسو تو ہیں، موتی کوئی نہیں۔

بیگم: اور یہ مال دولت والے، یہ حکومت!!

شاعر: (غصے سے) جن کے خلاف زندگی بھر لڑا ان کے آگے ہاتھ پھیلا کر زندگی کے لیے بھیک مانگوں گا؟ نہیں، ہرگز نہیں!

بیگم: آخر کوئی صورت تو ہوگی!

شاعر: عجیب ہے انسان۔ جانتا ہے ایک دن مرنا ہے پھر بھی موت کو ٹالنے کے لیے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ کاش کہ ہزاروں سال بعد ہی سہی مرنے کے بعد سبزے کی طرح زمین پر اُگنے ہی کا موقع مل سکتا۔ عمر خیام نے یہی آرزو کی تھی (کھانسی)۔

بیگم: موت کا نہیں، زندگی کا ذکر کرو۔ میں ملک اور قوم سے تمہارے لیے زندگی کا بھیک مانگوں گی۔

شاعر: ملک لٹیروں کے ہاتھ میں، قوم غفلت کا شکار — کون سنے گا تمہاری پکار (کھانسی)
(باہر سے شور شرابے کی آوازیں۔ توڑنے پھوڑنے، چیخنے چلاّنے، مارنے پیٹنے کی آوازیں۔ مارو مارو" کاٹو۔ مارو" کی صدائیں۔ زندہ باد، مردہ باد کی آوازیں۔ "ہم اور تم بھائی بھائی، دوسری قوم کہاں سے آئی۔ سارا ملک ہمارا ہے، دوسروں کا کہاں گزارا ہے" کی نعرے)

بیگم: یہ کیسا شور ہے!

شاعر: دھواں کیسا ہے؟ کہیں آگ لگی ہے۔

بیگم: تم ٹھہرو۔ میں دروازہ بند کرتی ہوں۔

شاعر: نہیں بیگم، دروازہ بند نہ کرو۔ فساد ہو گیا ہے، میں باہر جاؤں گا۔

بیگم: میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔

شاعر: میری جگہ ان کے درمیان ہے، میں انھیں سمجھاؤں گا کہ اقتدار کے ہاتھ میں کھلونا نہ بنو۔ انھیں لوٹنے والے انھیں لڑا رہے ہیں۔ میں انھیں بتاؤں گا۔
(کھانسی)

بیگم: وہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔

شاعر: جسے تم چاہتے ہو اس کے ہاتھ سے مرنے سے بڑھ کر کون سی خوشی ہوگی!

بیگم: میری بات تو سنو۔

شاعر: نہیں مجھے جانے دو۔

(چلا جاتا ہے، شور اور قریب آ جاتا ہے اور تھوڑی دیر جاری رہتا ہے۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ، پھر شور دھیرے دھیرے ختم ہو جاتا ہے اور دروازے پر دستک کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

بیگم: کون؟

بینک منیجر: آپ مجھے نہیں پہچانتیں؛ میں انٹرنیشنل بینک کا جنرل منیجر ہوں۔ آپ کی امانت لے کے آیا ہوں۔

بیگم: میری امانت؟

بینک منیجر: آپ کے شوہر فسادیوں کے مجمع میں بیہوش ہو گئے تھے۔ میں انھیں لے آیا ہوں، انھیں آرام سے لٹا دیجیے۔

بیگم: آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی صاحب!

بینک منیجر: شکریے کی ضرورت نہیں۔ آپ اس شاعر کی بیوی ہیں جو اس ملک کے ہی نہیں دنیا کے بڑے شاعروں میں ہے۔ میں اس کا ایک ادنیٰ قدردان ہوں۔

بیگم: آپ کا احسان ہے بھائی صاحب!

بینک منیجر: انھوں نے پوری قوم کو عزت اور حوصلہ دیا ہے۔

بیگم: اور اب اس کے لیے اپنی جان بھی دیں گے۔ (رونے لگتی ہے)

بینک منیجر: آپ رو رہی ہیں؟

بیگم: آپ شاید نہیں جانتے، وہ دل کے مریض ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے، دل کا آپریشن جلد نہ ہوا تو وہ نہیں بچیں گے۔

بینک منیجر: آنسو پونچھ ڈالیے۔ ان کے دل کا آپریشن ہوگا اور جلد ہوگا۔

بیگم: کیسے ہوگا؟ کہاں ہوگا؟

بینک منیجر: ہمارا بینک انقلابیوں کی مدد کرتا ہے اور ہمارا لندن میں اپنا ہسپتال ہے۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ (باہر سے پھر شور کی آواز) مجھے جانا چاہیے۔

(باہر فساد کا شور بڑھ جاتا ہے۔ اچانک فوجی موٹروں، جیپوں اور گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ

سُنائی دیتی ہے اور تھوڑی دیر میں فائرنگ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ بھگدڑ مچ جاتی ہے لوگوں کے بھاگنے، زخمی ہونے اور کراہنے کی آواز پھر سناٹا، پھر بھاری فوجی بوٹوں کے چلنے کی آواز)

افسر: سکریٹری۔

سکریٹری: سر!

افسر: کیا رپورٹ ہے؟

سکریٹری: غیر سرکاری طور پر ۰ ۷ مرے ہیں، کچھ عورتیں اور بچے بھی۔

افسر: اور سرکاری طور پر؟

سکریٹری: صرف ایک موت ہوئی ہے وہ بھی ایک بھکاری کی — اور حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔

افسر: دوسرے شہروں کا کیا حال ہے؟

سکریٹری: پورے ملک کا یہی حال ہے صاحب جی!

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

سکریٹری: ٹیلی فون، سر، لال ٹیلی فون، سر!! صدر کا ٹیلی فون، سر!

افسر: (ٹیلی فون) جی، حاضر ہوں۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ میری طلبی ہے، تم پوری طرح چوکس رہنا۔

سکریٹری: سر! یس سر!!

(Change Over)

(ریڈیو کا اعلان: یہ ریڈیو خیالستان ہے۔ اب آپ ایک ہنگامی اعلان سنیے۔ ملک میں بڑھتے ہوئے فسادات کے پیشِ نظر ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا ہے اور ایمرجنسی لگا دی گئی ہے صدر نے حکومت کو برخاست کر دیا ہے اور فوج کے جرنیل افسر شاہ کو سارے اختیارات سونپ دیئے ہیں۔ وہ ملک کے وزیر اعظم اور فوج کے افسر اعلیٰ بھی ہوں گے۔)

سکریٹری: صاحب جی! صاحب جی!! (خوشی سے ناچتے ہوئے) ملک میں صاحب جی کا راج ہو گیا۔

رانی: (داخل ہوتے ہوئے) کہاں ہیں تمہارے صاحب جی؟

سکریٹری: رانی جی، آپ؟ آج بڑی خوشی کا دن ہے۔

رانی: ہم سب سُن لیا ہے۔ کہاں ہیں تمہارے صاحب جی؟

سکریٹری: آپ نے سُن لیا ہے کہ صاحب جی ہمارے ملک کے بڑے، بہت بڑے، بہت ہی بڑے، یعنی سب سے بڑے۔

رانی: سُن لیا۔

سکریٹری: جی۔

رانی: کہاں ہیں وہ؟

سکریٹری: صدر کے محل میں۔

رانی: وہ جب واپس آئیں تو ان سے کہنا ہم آئے تھے۔

سکریٹری: ضرور۔

رانی: اور کہنا ان کے سب کام ہم نے کر دیئے ہیں۔ بینک والا بھی اور کرسی والا بھی۔

سکریٹری: بہت اچھا، جی!

رانی: اور اب ہم یوٹوپیا کے بادشاہ کے جہاز میں ان کے دیس جا رہے ہیں۔

سکریٹری: (حیرت سے) جی؟!

رانی: ہمیشہ کے لیے۔

سکریٹری (اور زیادہ حیرت سے) جی؟!!

رانی: اور شاہی جہاز میں ان کے ہیروئن اور اسمیک کے سارے پارسل لیے جا رہے ہیں۔

سکریٹری: (اور زیادہ حیرت سے) جی؟!! جی؟!!

رانی: اور کہنا — جو انھوں نے چاہا تھا وہ سب کچھ ہو گیا ہے! (چلی جاتی ہے۔ قدموں کی چاپ دیر تک تو نجتی رہتی ہے۔)

(Change Over)

شوبھرام: ہم نے کہا تھا نا، ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔

افسر: آج آپ ہمارے مہمان ہیں، شوبھرام جی۔!

شوبھرام: شوبھرام بھولا نہیں کرتا، جرنیل صاحب، کرنیل صاحب! آج ہم آپ کے محل میں آپ کے مہمان ضرور ہیں، مگر شراب ہم اپنی پئیں گے۔ دلاری!

دلاری: سرکار!

شوبھرام: ہماری شراب!

دلاری: بہت اچھا سرکار!

شوبھرام: چھوکری اور دارو اپنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ کرنیل صاحب، جرنیل صاحب!

افسر: جیسے آپ کی مرضی!—اب یہ بتایئے۔

شوبھرام: بولو۔

افسر: اب ہم ملک کے وزیر اعظم ہو گئے۔ فوج کے مالک، ملک کے آقا ہو گئے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔

شوبھرام: ہمیں اتنا بہت ہے جرنیل صاحب، کرنیل صاحب۔ ہم اپنے بینک کے مالک ہیں، بس یہی ٹھیک ہے۔

افسر: بورڈ آف ڈائریکٹر کے پریزیڈنٹ بھی!

شوبھرام: ہم سے یہ مشکل لفظ نہیں بولے جاتے ہیں، مطلب سے غرض ہے۔

افسر: ہم آپ کے احسانوں کا کچھ تو بدلہ چکائیں۔

شوبھرام: ہم نے کیا کیا ہے۔ بلوہ کرایا ہمارے غنڈوں نے یعنی تم جنھیں غنڈہ کہتے ہو، تمہارے لیے سفارش نہیں، حکم کرایا پوٹو پیا کے بادشاہ نے۔ ہاں مگر ابھی ایک کام باقی ہے۔

دلاری: یہ لیجیے سردار! (دوسرا جام افسر کو دیتے ہوئے) یہ لیجیے سرکار!!

شوبھرام: دلاری! شراب پینے سے پہلے تو بہت اچھی لگتی ہے ری۔

دلاری: اور شراب پینے کے بعد۔

شوبھرام: اس سے بھی اچھی— آ۔ میری گود میں بیٹھ جا۔

دلاری: ہائے دیّا۔ لاج نہیں آوت ہے تمہیں۔ میں چلی (بھاگ جاتی ہے۔ دیر تک اس کی پائل

کی آواز گونجتی رہتی ہے)۔

شوبھرام: چنچل ہے، بہت چنچل ہے—ہاں تو ہم کہہ رہے تھے آج سے آٹھ دن بعد ایک دھماکہ ہوگا اور ہمارے آدمی تمہارے صدر کو اڑا دیں گے۔ اور اس کے بعد تم صدر ہوگے۔

افسر (حیرت اور خوشی سے) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!

شوبھرام: شوبھرام پر بھروسہ کرنا سیکھو—اور ہاں ہمارا بینک منیجر کہاں ہے؟ بلاؤ اُسے۔

افسر: باہر بیٹھا ہے (ٹیلی فون اٹھاتا ہے) بینک منیجر کو اندر بھیجو۔

بینک منیجر: آپ نے یاد فرمایا!

شوبھرام: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔ تمہارا باغی شاعر اب اس کے قبضے میں ہے۔

افسر: قبضے میں!

بینک منیجر: قبضے میں اس طرح سرکار کہ بینک کے لندن والے ہسپتال میں دنیا کے بہترین سرجن اس کے دل کا آپریشن کر رہے ہیں۔

شوبھرام: باغیوں کے دل جیتنے پڑتے ہیں یا ان کے دل کا آپریشن کرنا پڑتا ہے (ہنستا ہے) اور شاعر جب واپس آئے گا تو تمہیں اپنے سبھی ساتھیوں کے نام بتا دے گا۔

افسر: سمجھا!

شوبھرام: اس رات جب تم کوڑوں سے شاعر کی کھال کھینچ رہے تھے ہم تمہیں یہی سمجھانا چاہتے تھے۔ (ہنستا ہے) اچھا۔ اب اگلے دھماکہ کے تک کے لیے رخصت!!

(Change Over)

(ایک دھماکہ زبردست دھماکہ)

(اس کے بعد تھوڑی دیر خاموشی)

اخبار والا لڑکا— آواز لگاتا گزرتا ہے؛ آج کی تازہ خبر۔ آج کی تازہ خبر۔

حادثے میں صدر مارے گئے۔

افسر شاہ نئے صدر۔ افسر شاہ نئے صدر۔

افسر شاہ نئے صدر۔!!

(Change Over)

(ہوائی اڈے پر جہاز کے اُترنے کی آواز)

اعلان: دھیان دیجیے۔لندن سے آنے والا جہاز ABC ۱۵۷، آٹھ بج کر ت منٹ پر لندن سے آ پہنچا ہے اور جلد ہی اُترنے والا ہے۔

بینک منیجر: آج کتنا مبارک دن ہے۔ملک کا سب سے بڑا انقلابی شاعر وطن واپس آرہا ہے۔

بیگم: آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں منیجر صاحب!

بینک منیجر: پھر وہی منیجر صاحب؟ آپ مجھے اپنا بھائی کہیے بھائی۔

بیگم: آپ نے سچ مچ بھائیوں سے بڑھ کر مدد کی ہے۔

بینک منیجر: آپ دیکھ رہی ہیں سارا شہر شاعر کے استقبال کو اُمڈ آیا ہے۔پریس والے، ادیب، شاعر، فلم اور ٹی وی کے لوگ، سبھی تو ہیں، وہ دیکھیے، وہ دیکھیے، جہاز آگیا۔آپ دیکھتی جائیے، ہم اپنے شاعر کے اعزاز میں اتنا بڑا جلسہ کریں گے کہ اس ملک میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔آپ شرمائیے نہیں۔آگے بڑھ کر ان کے گلے میں ہار ڈالیے، نہیں تو لوگ انھیں گھیر لیں گے۔

(لوگوں کا شور)

بیگم: آپ اچھے تو ہیں۔

شاعر: بالکل اچھا ہوں — ارے بھئی اتنے ہار۔اتنے بہت سے ہار لاد دیئے ہیں کہ ہماری گردن جھکے گی نہیں تو ٹوٹ جائے گی۔

بیگم: بینک منیجر صاحب، دیکھیے تو ہمیں ذرا۔منیجر صاحب! منیجر صاحب! کہاں چلے گئے۔ ابھی تو یہیں تھے۔

شاعر: شاید بھیڑ میں کہیں کھو گئے، میں ہوتا تو میں بھی کھو جاتا۔چلو چلیں۔

(موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز)

(Change Over)

(نقیب بگل بجاتے ہیں جو صدر ریاست کی آمد سے پہلے بجایا جاتا ہے)

بینک منیجر: خواتین وحضرات! آج کا دن یادگار ہے کہ ہم اپنے ملک ہی کے نہیں، اپنے دور کے

سب سے بڑے انقلابی شاعر کا جشن صحت سُنا رہے ہیں جس نے اپنے گیتوں سے ملک کو حوصلہ دیا، سخت عذاب جھیلے اور ہمارے لیے اُمید و انصاف کے ستارے بکھیرے۔

اب ہمارے انٹر نیشنل بینک کے مالک شو بھرام جی ایک کروڑ روپیہ کا چیک اور سونے کی تختی پیش کریں گے اور ہمارے ملک کے صدر عزّت مآب افسر شاہ شاعر اعظم کو سند اعزازی عطا فرمائیں گے۔ (تالیاں)

شاعر: (بات کاٹتے ہوئے) نہیں۔ ہر گز نہیں۔

میرے، ہم وطنو، میرے دھرتی آکاش کے چاند تارو! انھیں پہچا لو۔ میں نے کہا تھا، ایک دن قاتلوں کے نام بتاؤں گا۔ یہی میں تمہارے قاتل جن کے خلاف میں نے زندگی بھر لڑائی لڑی ہے، عذاب جھیلے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ہسپتال بھی انہی کے ہیں جن میں میرا علاج ہو رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ان کے غلام ڈاکٹروں سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ (آواز بلند کرتے ہوئے) مجھے معلوم نہیں تھا ساری دنیا انھوں نے خرید لی ہے اور ہم قاتلوں کے درمیان زندہ ہیں۔ مجھے معاف کر دینا میرے دوستو! مجھے معلوم نہیں تھا، میری مدد کرنے والے کون تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا (رُندھے ہوئے گلے سے) مجھے معاف کر دینا۔

(بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے)

بیگم: وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ پھر بے ہوش ہو گئے!!

منیجر: اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کا چہرہ ڈھک دو۔

(موت کا حزنیہ ساز)

ایک اور زندگی

اسٹیج ڈرامہ

کردار:

۱۔ روشن
۲۔ مرد
۳۔ اوم پرکاش
۴۔ پولیس افسر
۵۔ سرجو
۶۔ سکھو
۷۔ نیتا
۸۔ رام دئی
۹۔ ساہوکار
۱۰۔ نصیبن
۱۱۔ شیروانی
۱۲۔ اُمیدوار
۱۳۔ پہلا آدمی
۱۴۔ دوسرا آدمی
۱۵۔ ابا میاں

پہلا منظر

دوکاندار: آپ چائے پئیں گے یا کچھ ٹھنڈا۔

اُمیدوار: تمہیں تمیز سلیقہ عمر بھر نہیں آئے گا، چائے اور ٹھنڈا پوچھا جاتا ہے آج کل۔

دوکاندار: تو پھر کیا خاطر کی جائے۔

اُمیدوار: تم ہمیں جانتے ہو اور جان بوجھ کر ایسی نادانی کرتے ہو۔ پوچھو، وہسکی پئیں گے یا رم اور وہسکی پئیں گے تو کون سی؟!

دوکاندار: معاف کیجیے گا، غلطی ہوئی۔

اُمیدوار: یہ بوتل دیکھ رہے ہو۔ (اپنے ساتھ والی بوتل دکھاتے ہوئے جو تین چوتھائی خالی ہو چکی ہے)

دوکاندار: میں سمجھ گیا۔

اُمیدوار: جو سمجھ گیا وہی سمجھ دار ہے اور اس کا بیڑا پار ہے۔ (قہقہہ لگاتا ہے)

دوکاندار: یہ فرمایئے سرکار نے کیسے تکلیف فرمائی۔ کیا پھر کسی جلسے کے لیے بھیڑ چاہیے۔

اُمیدوار: خوب سمجھے! جانتے ہو ہمارا تو کاروبار یہی ہے۔

دوکاندار: اور ہمارا بھی یہی دھندا ہے۔

اُمیدوار: ہم اس بار پھر الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں اور الیکشن کے لیے چاہئیں جلسہ جلوس اور......

دوکاندار: میں سمجھ گیا اور جلسہ جلوس کے لیے چاہیے مجمع، بھیڑ۔ یہ خادم آپ کی خدمت کو حاضر ہے۔

اُمیدوار: تم ہو بہت جلد باز۔ ابھی بات منہ سے نکلی نہیں کہ تم لے دوڑے۔

دوکاندار: تو ابھی کچھ اور بات باقی ہے۔

اُمیدوار: بہت سی باتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے تمہارا دھندا ہی یہ ہے مجمع فراہمی تمہارا کاروبار ہے۔

بہت سے اُمیدواروں کوتم کامیاب کرا چکے ہو۔ جس طرح کا مجمع چاہیے تم فراہم کرتے ہو۔ دیہاتی، شہری، عورتوں، نوجوانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی بھیڑ تم جمع کردیتے ہو۔

دوکاندار: اجی۔ آپ تو شرمندہ کررہے ہیں ہم کیا جمع کردیتے ہیں وہ تو آپ کا پیسہ جمع کرتا ہے۔ آپ جتنا گڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا، کچھ ہمارا کمیشن، کچھ جلسے جلوس میں شامل ہونے والوں کی فیس۔ کچھ ان کے کپڑوں کا خرچہ، کچھ ان کی مونچھ داڑھی کا، کچھ تقریر کرنے والے کی اُجرت۔ بس اسی سے اپنا بھی خرچہ پانی چل جاتا ہے۔

اُمیدوار: ہوتم بڑے چالاک۔ اور اسی لیے تو تم نے یہ مجمع فراہمی کی دوکان کھولی ہے۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام اور تقریر کرنے والوں کا بندوبست بھی کرلیا ہے۔ نعرہ لگانے والے بھی خوب تیار کر رکھے ہیں۔

دوکاندار: اجی آپ تو شرمندہ کررہے ہیں۔

اُمیدوار: مگر—(ایک گھونٹ وہسکی کا چڑھاتا ہے اور سگریٹ سلگاتا ہے)

دوکاندار: مگر کیا؟

اُمیدوار: مگر اب پبلک ہوشیار ہوگئی ہے۔ اب نعرے اور تقریروں سے بہلنے والی نہیں۔

دوکاندار: ہم نے تو اسی لیے ایک پریس بھی کھول لیا ہے کہ پوسٹر چھاپنے میں بھی......

اُمیدوار: (بات کاٹ کر) جہاں زبان کا جادو نہ چلے وہاں چھاپے خانے کا جادو کیسے چلے گا؟

دوکاندار: تو پھر؟

اُمیدوار: کچھ اور سوچنا پڑے گا تمہیں؟ سمجھے۔ کوئی زوردار نشہ چاہیے۔

دوکاندار: کون سا نشہ؟

اُمیدوار: اور جب یہ نشہ پرانا ہوجائے تو پھر اس سے بھی بڑا کوئی دوسرا نشہ۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ نشہ کو نشہ ہی فتح کرتا ہے۔

دوگاندار: آپ نشے کا نام بتایئے۔ انتظام ہوجائے گا۔

اُمیدوار: نشے کا نام بھی ہم بتادیں گے اور انتظام بھی ہم کریں گے۔ آپ سے بس تھوڑی سی مدد چاہیے۔

دوکاندار: ہمیں تو اپنی فیس سے غرض ہے!

اُمیدوار: جی ہاں، وہ ملے گی۔ بلکہ دُگنی ملے گی۔

دوکاندار: تو پھر کام ہوا سمجھیے۔

اُمیدوار: جی، مجھے چاہیے ہندو مسلم فساد۔

دوکاندار: (گھبرا کر) فساد؟

اُمیدوار: گھبرائیے نہیں۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔(ایک جام وِہسکی کا اور بھرتا ہے اور ایک بڑا گھونٹ بھرتا ہے)۔ فساد بھی ضروری نہیں، مگر فساد کی فضا، فساد کا واتاورن ضروری ہے۔ پھر سارے ووٹ ہمارے۔

دوکاندار: میں کچھ سمجھا نہیں۔

اُمیدوار: ہم کوئی ٹیچر نہیں کہ کوڑھ مغز لڑکوں کو پڑھاتے رہیں سنو۔ اس شہر میں کون جات کے لوگ زیادہ ہیں، کس دھرم کے لوگ زیادہ ہیں۔ بس ہمیں اسی جات اسی دھرم کے لوگوں کے ووٹ چاہئیں۔

دوکاندار: اور جو آگ لگے گی گھروں میں

اُمیدوار: تھوڑی دیر میں بجھ جائے گی۔

دوکاندار: اور جو لوٹ مار مچے گی۔

اُمیدوار: ہاں— یہی تو بات کرنی ہے تم سے۔ لوٹ مار کرنے والوں کا بندوبست تم کرو گے۔ پولیس سے انھیں ہم بچائیں گے، اور جو کچھ وہ لوٹ کر لائیں گے اس میں آدھا حصہ ان کو ہم دلائیں گے۔ رہا ان کا خرچہ پانی تو سب ہمارے ذمے۔

دوکاندار: اور جو یہ آگ نہ بجھی تو—؟

اُمیدوار: بچّے مت بنو۔ ایسی کوئی آگ نہیں جو کبھی نہ کبھی بجھ نہ جائے۔ لو وہسکی، بات سمجھ میں آجائے گی۔(بوتل سے انڈیلتا ہے)

دوکاندار: نا صاحب۔ یہ بہت خطرے کا کام ہے۔

اُمیدوار: خطرہ ہوتا ہے اناڑیوں کے لیے۔ سمجھے!

دوکاندار: کچھ کچھ سمجھا؟

اُمیدوار: ہمّت، میرے دوست، ہمّت!!

دوکاندار: اور اس کا سامان!

اُمیدوار: ہم کریں گے، تم فقط آگ اُگلنے اور انگارے دہکانے والی تقریروں کا انتظام کرو۔ مٹّی کے پیپے، دیا سلائی، جلوس کے مشعل، چوری کا مال ٹھکانے لگانا سب ہمارا کام ہے۔ اور جب آگ پوری طرح دہک اُٹھے تو ہمارے الیکشن کا وقت مرتب آچکا ہوگا اور جنتا آنکھیں بند کر کے ہمیں ووٹ دے دے گی (وہسکی کا ایک پیگ اور انڈیلتا ہے)

دوکاندار: اور اس کا نشانہ۔

اُمیدوار: اب کچھ عقل کی بات کی تم نے۔ نشانہ ان کا مکانوں کو بنایا جائے گا جہاں اِکا دُکا لوگ اکیلے اکیلے رہتے ہیں، بوڑھے ہیں یا بے سہارا مگر ہیں عزّت والے، پیسے والے۔

دوکاندار: مثلاً؟

اُمیدوار: اب بچّے مت بنو۔ تم بھی ایسے مکانوں کا پتہ جانتے ہو اور تم نہیں جانتے تو تمہارے 'کاریگر' سب کا نام نشان جانتے ہیں۔ بولو منظور ہے؟

دوکاندار: مگر میری فیس اس بار آٹھ گنی ہوگی۔

اُمیدوار: (جیب سے نوٹوں کی گڈّی نکال کر دیتے ہوئے) یہ لو پیشگی مگر کانوں کان کسی کو بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔

دوکاندار: آپ بھروسہ رکھیں۔

اُمیدوار: ہمارا تو سارا کاروبار ہی بھروسے کا ہے۔ اس ملک اور اس کے رہنے والوں کی بیوقوفی پر ہمیں پورا بھروسہ ہے جب تک یہ دنیا باقی ہے اور اس ملک میں ایک آدمی بھی زندہ ہے اس وقت تک ہمارے کاروبار کو کوئی خطرہ نہیں، اور جب بھی کوئی خطرہ آئے گا ہم دھرم اور مذہب کے نام پر لڑوا دیں گے۔ اپنا اُلّو کہیں نہیں گیا۔ (شراب کا جام اُٹھاتا ہے) حماقت کے نام!! دین دھرم کے اندھے پجاریوں کے نام!! (پورا جام حلق میں انڈیل لیتا ہے۔)

دوکاندار: (کچھ سوچتے ہوئے) شاید آپ سچ کہتے ہیں!

اُمیدوار: شاید نہیں۔ یقیناً، اور یہی ہماری فتح کا راز ہے۔ ہم جب تک لڑاتے رہیں گے، تمہارے اوپر سواری کرتے رہیں گے — اور وہ دن کبھی نہیں آئے گا، کبھی بھی نہیں آئے گا، جب تم سب ایک ہو کر ہماری چالوں کا مقابلہ کر سکو!!

دوسرا منظر

(وہی کمرہ، دوکاندار اُداس بیٹھا ہے۔ سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہا ہے۔ آخر اُکتا کر گھنٹی بجاتا ہے۔ سکریٹری اندر داخل ہوتی ہے)۔

سکریٹری: سر! آپ نے بُلایا۔

دوکاندار: (تھوڑی دیر خاموشی) ہاں!

سکریٹری: (ہاتھ میں پنسل اور اسٹینوں کی کاپی تھامے ہوئے ہے) کوئی خط لکھنا ہے؟!

دوکاندار: نہیں۔ تم ذرا بیٹھ جاؤ (بیٹھ جاتی ہے)۔

دوکاندار: ہمارا بزنس ایک نئے موڑ پر آ گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے اگلے موڑ لے جائیں یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ (سگریٹ کا کش لگاتا ہے)

سکریٹری: میں سمجھی نہیں سر!!

دوکاندار: تم ہماری کانفیڈنشل سکریٹری ہو۔ تم جانتی ہو، ہم سیاسی جلسوں کے لیے مجمعوں کا انتظام کرتے ہیں۔ ہم جلسوں ہی کے لیے نہیں، جلوسوں کے لیے پورا بندوبست کرتے ہیں، شہر والوں کا بھی، گاؤں والوں کا بھی، ہندوؤں کا بھی، مسلمانوں کا بھی، عورتوں کا بھی، نوجوانوں کا بھی۔ پھر ان جلسوں میں بولنے والوں کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ تقریر لکھواتے بھی ہیں، دلواتے بھی ہیں — اور اسی کے لیے ہم اپنی فیس لیتے ہیں۔

سکریٹری: جی ہاں!

دوکاندار: اور آج ایک الیکشن لڑنے والے اُمیدوار میرے پاس آئے تھے۔ انھوں نے بڑی انوکھی بات کہی۔

سکریٹری: ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے سر؟

دوکاندار: بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ کہتے تھے لوگ اب تقریروں سے اور جلسے جلوس سے قابو میں نہیں آتے۔ اب انھیں قابو میں لانے کے لیے ہندو مسلمان کے فرقہ وارانہ جذبات بھڑکانا ضروری ہے۔

سکریٹری: کیا؟

دوکاندار: ہاں یہی کہا انھوں نے؟

سکریٹری: اور بھی کچھ کہا؟

دوکاندار: ان کا یہ خیال ہے کہ ایک چھوٹا موٹا فساد ہو جائے تو بھی کچھ بُرا نہیں۔ اس کے لیے وہ ہم سے غنڈے چاہتے ہیں۔ ہندو غنڈے بھی اور مسلمان غنڈے بھی۔ مٹی کا تیل، ماچس، مشعلیں، لوٹ کے مال کی بکری اور پولیس سے حفاظت کا انتظام وہ خود کریں گے۔

سکریٹری: اس سے ان کا کیا فائدہ ہوگا سر؟!

دوکاندار: ان کو الیکشن میں بھاری جیت ہوگی اور پھر اس شہر کے سارے ٹھیکے وہی لیں گے۔ اس شہر کے مالک ہوں گے۔

سکریٹری: اور جو شہر میں زہر پھیل جائے گا اس کا علاج؟

دوکاندار: وہ کہتے ہیں ان کے پاس اس کا علاج ہے۔

سکریٹری: یہی کہ وہ اس کے بعد شانتی کے لیے جلوس نکالیں گے۔ جن کے مکان جلیں گے ان کو معاوضہ دیں گے۔ جن کے رشتے دار مارے جائیں گے ان کو رقم دیں گے۔

دوکاندار: اور بھی بہت کچھ۔

سکریٹری: یہ تو سراسر اندھیر ہے۔

دوکاندار: مگر کیا ہمارے لیے واپسی کا دروازہ کھلا ہوا ہے؟

سکریٹری: (کچھ سوچتے ہوئے) شاید نہیں؟

دوکاندار: اور اس کا معاوضہ وہ ہم کو دس گُنا تک دینے کو تیار ہیں۔

سکریٹری: کیا انسانی جانوں کی قیمت اتنی گر گئی ہے؟

دوکاندار: نہیں، اس کی قیمت وہ الگ سے ادا کریں گے۔

سکریٹری: وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟

دوکاندار: وہ چاہتے ہیں کہ ہم میدان گرم کردیں۔ ہم تقریروں سے شہر میں آگ لگا دیں۔ ہم ہندو اور مسلمان بونے والوں کے ذریعے لوگوں کو بھڑکا دیں۔ ہم شہر کو پاگل کر دیں کہ لوگ اپنا اچھا بھلا بھول جائیں۔

سکریٹری: اور انھیں ووٹ دے کر اپنی لگام ان کے سپرد کر دیں۔

دوکاندار: ہم راج نیتی میں نہیں پڑتے، کاروبار کرتے ہیں۔

(دروازہ پر گھنٹی)

نیتا جی: اندر آسکتے ہیں۔

دوکاندار: آیئے آیئے۔ نیتا جی، آپ؟! (سکریٹری کو جانے کا اشارہ کرتا ہے) کہیے کیا پئیں گے ٹھنڈا، گرم، کڑوا، میٹھا۔

نیتا جی: آپ نے پھر وہی باتیں شروع کردیں۔ ارے بھئی جب بزنس کو آتے ہیں تو کھانے پینے کی باتیں نہیں کرتے۔

دوکاندار: جی معاف کیجیے گا۔ ہاں تو کہیے کیسے کشٹ کیا۔

نیتا جی: آپ جانتے ہیں کہ الیکشن ہونے والا ہے۔ اس میں کھڑے ہو رہے ہیں وہ...... وہی اچھا سا نام........

دوکاندار: میں سمجھ گیا۔

نیتا جی: اجی ابھی آپ ہی سے مل کر تو گئے ہیں۔

دوکاندار: جی۔

نیتا جی: انھوں نے کہا تھا کہ آپ سے مل لوں۔ الیکشن میں کچھ سہایتا چاہیے تھی انھیں۔ اور آپ جانیں جس چھنڑے سے ہم نے راج نیتی میں قدم رکھا ہے ہم سے کیسی کی پپتا دیکھی نہیں جاتی۔

دوکاندار: ویسے بھی آپ جیسے مہان دیش بھکتوں کے من کومل ہوتے ہیں۔

نیتا جی: وہ تو بھگوان کی کرپا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انھیں ہماری کچھ سہایتا چاہیے۔

دوکاندار: جی ہاں۔انھیں بھی اور مجھے بھی۔

نیتا جی: تو بتایئے کیا سہایتا کرنی ہے؟

دوکاندار: کچھ بھاشن، زوردار۔ جوشیلے، شاندار۔

نیتا جی: بس۔!اتنی سی بات۔

دوکاندار: جی نہیں۔ بات بہت بڑی ہے۔ انھیں چاہیے بلوہ۔ انھیں چاہیے دنگا۔ اور بلوہ اور دنگا بھڑکانے کے لیے بھاشن سے زیادہ کارگر کوئی ترکیب نہیں۔

نیتا جی: (جیب سے ڈبیا نکال کر چونا چاٹتے ہوئے) (ہنستا ہے) سو تو ہے۔

دوکاندار: اس کے لیے آپ نے فیس کی بات تو کر لی ہوگی۔

نیتا جی: اجی وہ بھی اپنے ہی آدمی ہیں۔ کوئی پرائے تھوڑے ہی ہیں۔ ان سے مناسب دام لے لیں گے۔

دوکاندار: مگر تیاری شروع ہو جانی چاہیے۔

نیتا جی: اجی اس کی آپ چنتا مت کرو۔ یہ سمجھو کہ تیاری تو آرمبھ ہو گئی۔ یہ تو دیش بھکتی کا کام ہے اور اگر ہم ایسے لوگ دیش بھکتی کے کام میں سہایتا نہ کریں تو پھر دیش کا تو کلیان ہو جائے — اچھا تو گیا!!

دوکاندار: مہربانی! (چلا جاتا ہے)

(دوکاندار گھنٹی بجاتا ہے جس کے فوراً بعد شیروانی صاحب برآمد ہوتے ہیں)

شیروانی: آداب!

دوکاندار: آدب۔ آیئے۔ آیئے۔ بڑی عمر ہے آپ کی۔ آپ کو بس یاد ہی کر رہا تھا۔

شیروانی: آپ نے مجھے یاد کیا۔

دوکاندار: جی ہاں۔ ذرا آپ کو تکلیف ہوگی۔ دروازہ کھول کر اطمینان کر لیجیے۔ کوئی ہماری باتیں سنتا نہ ہو، پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ (شیروانی اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور بند کر لیتا ہے)۔

شیروانی: کوئی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔

دوکاندار: (سگریٹ نکال کر پہلے شیروانی کو پیش کرتا ہے پھر اپنے آپ ایک سگریٹ لیتا ہے، پھر سلگاتا ہے) بات یہ ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں شیروانی صاحب!

شیروانی: جی ہاں۔ بخوبی۔

دوکاندار: آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ذرا نرم دل آدمی ہوں۔ مجھ سے کسی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ دوسرے مصیبت میں ہوں تو میں بے آرام ہو جاتا ہوں۔

شیروانی: شریف آدمی کی پہچان ہی یہ ہے۔

دوکاندار: آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے فتنہ فساد سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ سیدھا سادہ نیا دار آدمی ہوں۔ ایمان داری سے دو روٹی کماتا ہوں۔ خود بھی کھاتا ہوں، بال بچوں کو بھی کھلاتا ہوں۔

شیروانی: جی، بے شک!!

دوکاندار: مگر میں نے آج جو بات سُنی ہے وہ بڑی ڈراؤنی ہے۔ اپنے دل کا حال کس سے کہوں۔ سچ یہ ہے، جب سے سُنا ہے دل قابو میں نہیں۔ آپ کو بُلانے ہی والا تھا کہ آپ ہی ایک سچے اور ایمان دار راز دار ہیں، ورنہ اس زمانے میں تو گھس کر لگانے کو کوئی اور راز دار نہیں ملتا۔

شیروانی: آپ فرمائیں!

دوکاندار: بات یہ ہے کہ الیکشن ہونے والا ہے۔

شیروانی: تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟

دوکاندار: میں نے سُنا ہے کچھ لوگ فساد کرانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ سو جناب، میرے ہوتے تو یہ ہوگا نہیں۔

شیروانی: جی ہاں! ہم سب مل کر ان سازشوں کو روک دیں گے۔

دوکاندار: بس۔ اتنی سی بات ہی میرے دل پر رکھی ہوئی تھی۔ آپ کو آگاہ کرایا میرے دل سے بوجھ ہٹ گیا۔

شیروانی: آپ ہرگز فکر نہ کریں۔

دوکاندار: لیکن ایک بات ہے۔ بلکہ گزارش ہے۔ میرا کہیں اس سلسلے میں کوئی ذکر نہ آئے تو اچھا ہے۔

شیروانی: جی ہرگز نہیں۔

دوکاندار: میں بھی کیسا خودغرض ہوں اپنی بات تو کہہ ڈالی اور آپ سے پوچھا تک نہیں کہ آپ نے کیسے تکلیف کی۔

شیروانی: کچھ نہیں۔ کچھ رقم کی ضرورت تھی۔

دوکاندار: (جیب میں ہاتھ ڈال کر گڈّی نکالتا ہے اور شیروانی کو تھما دیتا ہے) یہ لیجیے۔

شیروانی: کتنے ہیں؟

دوکاندار: گِن لیجیے گا، کم نہیں ہوگا۔

شیروانی: شکریہ (اُٹھتے ہوئے) اچھا اب اجازت!؟

دوکاندار: خداحافظ (شیروانی چلا جاتا ہے)

(دوکاندار گھنٹی بجاتا ہے کہ سکریٹری اندر داخل ہوتی ہے)

دوکاندار: سکریٹری! سارا سامان تیار ہے۔

سکریٹری: جی!

دوکاندار: بنی بنائی مونچھیں اور داڑھیاں، پٹرول کے پیپے اور دیا سلائی۔

سکریٹری: جی سب تیار ہیں۔

دوکاندار: جلوس کے لیے ڈنڈے اور جھنڈے۔

سکریٹری: جی۔

دوکاندار: تو پھر یہ فساد کہاں سے شروع ہوگا!

سکریٹری: کیا فساد اور بلوہ کرانا ضروری ہے؟

دوکاندار: نہیں۔ ضروری بالکل نہیں ہے، مگر اس کی تیاری ضروری ہے۔ ممکن ہے اس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ (دروازے پر گھنٹی بجتی ہے)

دوکاندار: بروقت کوئی نہ کوئی ملنے والا آجاتا ہے۔ (سکریٹری سے) دیکھو، کون ہے۔

سکریٹری: (دروازہ کھول دیکھنے کے بعد واپسی آتی ہے) دو آدمی ہیں سکھو اور راجو۔

دوکاندار: (مسکراتا ہے) اچھا تم جاؤ اور ان دونوں کو اندر بھیج دو۔

راجو سکھو: پرنام۔ حجور۔

دوکاندار: بیٹھو (دونوں فرش پر بیٹھنے لگتے ہیں)

دوکاندار: ارے نہیں۔ کرسی پر بیٹھو۔

دونوں: ہم یہیں ٹھیک ہیں سرکار!

دوکاندار: کیسے آنا ہوا؟

سکھو: وہی کچھ خرچہ پانی کی فکر ہے سرکار!

راجو: بہت دنوں سے فاقہ ہے۔

دوکاندار: فاقہ اور تم؟ مذاق کر رہے ہو۔

سکھو: نہیں سرکار۔ شہر میں امن وامان ہے اور آپ جانیں امن وامان میں کھانے پینے کا کیا سبھیتا ہے؟

راجو: اور یہی بنتی کرت آئے ہیں کہ سرکار کچھ جلسہ جلوس میں ہمیں لگوادیں، کچھ پیسے دِلوادیں کہ مال پانی کا پربندھ ہو جائے۔

دوکاندار: بہت وقت سے آئے ہو (سگریٹ سلگاتا ہے) یہ بتاؤ کہ تمہارے علاقہ میں کوئی مال دار اسامی ہے۔

سکھو: بہت سرکار!!

راجو: اک سے ایک بڑا دھنوان پڑا ہے مالک۔

دوکاندار: تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔

سکھو: تو سمجھا دو سرکار!

دوکاندار: میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی حویلی بھی ہو جو اکیلی ہو جس میں پہرے دار نہ ہوں، جہاں دیکھ بھال سخت نہ ہو۔

راجو: اب سمجھے!

سکھو: (کچھ سوچتے ہوئے) ہے سرکار!

راجو: وہی نواب صاحب کی حویلی!

دوکاندار: تم نے اسے دیکھا ہے۔

سکھو: ارے دیکھا کیا ہے۔اس کا چپہ چپہ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔

دوکاندار: تب تو کام بن جائے گا۔

راجو: کیا مطبل؟!

دوکاندار: تم اس حویلی کو لوٹ لینا اور لوٹ کا مال ہم بکوا دیں گے۔

سکھو: کیا کہا سرکار!؟

دوکاندار: تم اس حویلی کو لوٹ لینا۔

راجو: ہم اس حویلی کو لوٹ لیں!!

سکھو: نا سرکار۔ای ہم سے نہ ہوئے گا۔کبھی نہیں ہوئے گا۔

راجو: ہمری ہمت نہ پڑت، سرکار!

دوکاندار: ارے بے وقوفو! اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

سکھو: اور پولیس!

دوکاندار: تم اس سب کی فکر مت کرو۔ہم خود تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔جو مال تم لوٹ کر لاؤ گے اس کی پوری قیمت بھی تمہیں دِلوائیں گے۔بس ایک کام ہے پکڑے نہ جانا۔

راجو: ایہہ کوئی اپنے بس کی بات ہے؟!

دوکاندار: بس اب جاؤ اور تیاری کر لو۔وقت قریب ہے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

خون کا دھبّہ

ہاں میں بھی بھوت پریت کو نہیں مانتا۔ آپ کی طرح نئی روشنی کا انسان ہوں، پیشے کے اعتبار سے وکیل ہوں۔ تاریخ سے دلچسپی ہے، خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے ہندوستان کی تاریخ سے جب ہمارے پرکھوں نے آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، ہزاروں مارے گئے، ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ مگر کیا کروں، آنکھوں دیکھی باتوں پر کیسے یقین نہ کروں۔ وکالت پاس کرنے کے بعد میں نے نیپال کی سرحد پر چھوٹے سے قصبے کو چنا۔ یہاں کچھ اردو جاننے والوں کی بھی آبادی تھی وہاں مجھے ایک پرانی چال کے اردو جاننے والے منشی بھی مل گئے۔ انہی کے ذریعے میں نے ایک دفتر کرایے پر لینے کا انتظام کیا۔

(Fade In)

راوی: کچھ انتظام ہوا منشی جی۔

منشی: دفتر کا انتظام ہو گیا ہے سرکار، صدر بازار میں ہے۔ موقع کی جگہ ہے، مگر ایک دشواری ہے۔

راوی: کرایہ زیادہ ہے؟

منشی؛ جی نہیں۔ کرایہ بھی معقول ہے۔

راوی: سال بھر کا کرایہ پیشگی مانگتا ہے؟ پگڑی مانگتا ہے؟

منشی: جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

راوی: مالک مکان پاگل ہے؟

منشی: جی نہیں۔ نہایت معقول اور شریف آدمی ہے۔ مگر سرکار دفتر کے لیے جو کوٹھا مل رہا ہے

پہلے وہاں گانا بجانا ہوا کرتا تھا۔

راوی: اوہ۔طوائفیں رہتی تھیں کیا؟

منشی: جی ہاں۔

راوی: اوہو منشی جی۔تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔اب تو نہیں رہتیں!

منشی: جی نہیں۔اب تو یہ کاروبار ہی اُٹھ گیا۔

راوی: پھر، کیا پریشانی ہے؟

منشی: یہ جس مشہور طوائف کا کوٹھا تھا یہاں اس کا قتل ہوا تھا۔اس کی روح اب بھی اسی کوٹھے پر منڈلاتی رہتی ہے۔

راوی: (ہنستا ہے) منشی جی! آپ بھی کیا بھولے بھالے انسان ہیں۔ارے بھائی! آج کے زمانے میں کوئی بھوت پریت کو مانتا ہے۔

منشی: نہیں۔صاحب، یہ بالکل سچ ہے، اس کوٹھے کے بیچ میں خون کا دھبّہ آج بھی موجود ہے۔بہت دھویا، بہت صاف کیا، مگر اس کا نشان مٹتا ہی نہیں۔

راوی: میں نہیں مانتا۔

منشی: اس کوٹھے پر اثر ہے۔بڑا بھرا پُرا اثر ہے صاحب! میں ے اپنے کانوں سے گھنگروؤں کی آواز سُنی ہے۔برسہا برس بعد آج اسے کھولا گیا تھا۔عطردان کی طرح خوشبو سے مہک رہا تھا صاحب۔

راوی: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، اب آپ بوڑھے ہو چلے ہیں۔

منشی: فدوی اس شہر کے چپّے چپّے سے واقف ہے، میری مانیے تو یہ کوٹھا کرایے پر نہ لیجیے۔

راوی: نہیں منشی جی، یہی اتنا ڈرپوک نہیں کہ بھوت پریت کے خوف سے موقع کی جگہ چھوڑ دوں، پریوں کے سایے میں تو رہنے میں مزا آئے گا۔خوشبو کی لپٹیں، گھنگرو کی جھنکار، واہ واہ، وا۔

منشی: نہیں صاحب، میں آپ کو ہرگز خطرہ مول لینے کا مشورہ نہیں دوں گا۔

راوی: خیر، ایسا کرتے ہیں کہ جب تک دوسری جگہ نہیں ملتی اسی کوٹھے سے کام چلالیں گے۔

جگہ مل گئی تو دوسرا انتظام کرلیں گے۔ مناسب ہے!

منشی: مگر رات کو ہرگز وہاں نہ رہیے گا۔ بہت خطرناک جگہ ہے۔

راوی: دیکھا جائے گا، اب آپ ایسا کیجیے کہ پیشگی کرایہ دے آیئے اور اس کو ٹھے کی صفائی کرادیجیے۔ ہم کل کچہری سے واپسی پہ پانچ بجے وہاں منتقل ہوجائیں گے۔

(گھڑی پانچ بجاتی ہے۔ لکڑی کا بھاری دروازہ چوں کی آواز کے ساتھ کھلتا ہے جیسے کوئی مردہ بیدار ہو رہا ہے۔)

راوی: ارے واہ، آپ نے تو اس دفتر کو سچ مچ جگمگا دیا۔ کتابیں سلیقے سے لگادیں، فرنیچر سجادیا۔ بجلی کا لیمپ قرینے سے لگادیا۔

منشی: مگر سرکار—

راوی: آپ نے خواہ مخواہ اگر مگر شروع کردی۔ دفتر بالکل A-1 (اے ون) ہے۔ کچھ اگر مگر نہیں۔

منشی: مگر سرکار، آپ نے دیکھا وہ خون کا دھبّہ

راوی: ارے ہوگا! آپ کو کیا معلوم کہ یہ دھبّہ خون ہی کا دھبّہ ہے۔

منشی: صاف خون کا دھبّہ ہے صاحب، میں یہاں کا پرانا رہنے والا ہوں۔ یہ قتل مجھے اچھی طرح یاد ہے— لوگ کہتے ہیں۔

راوی: منشی جی، اس قتل ے قصّے کو چھوڑیئے۔ ذرا اس قتل کے مقدمے کی فائل نکالیے۔ کل پیشی ہے۔

منشی: موقع واردات کی تصویریں بھی آگئی ہیں سرکار۔

راوی: اور سُنیے، نیچے ہوٹل سے ایک پیالی گرم چائے بھجوادیجیے۔

منشی: مگر سرکار، اندھیرا ہونے والا ہے۔ شام کو یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

راوی: میں فائل دیکھ کر گھر چلا جاؤں گا۔

منشی: بہت اچھا سرکار۔ میں چائے ابھی بھجوائے دیتا ہوں، مگر رات ہونے سے پہلے ضرور گھر چلے جایئے گا۔

راوی: منشی جی چلے گئے، میں دیر تک قتل کے مقدمے کی فائل دیکھتا رہا۔ تھک گیا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تاریخ کے ورق اُلٹتا رہا۔ پھر نہ جانے کب رات ہوگئی۔ دیوار پر لگے گھنٹے نے بارہ بجائے، کمرے میں تیز خوشبو کی لپیٹ آئی۔ گھنگروؤں کی جھنکار گونج اُٹھی۔ بجلی غائب ہوگئی، گھبرا کر شمع جلائی ہی تھی کہ دروازہ کُھلنے کی آواز آئی جیسے کوئی مردہ ہڈیاں چٹخا کر زندہ ہو رہا ہو۔

(بارہ بجتے ہیں)

ڈرو مت نوجوان، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔

کون ہو تم؟

صرف اتنا جان لو کہ میں تمہاری دوست ہوں۔ ایک مدّت سے، ایک صدی سے بھی زیادہ مدّت سے میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا، تم آؤ گے۔ تم ایک دن ضرور آؤ گے۔

کون ہو تم! خدارا مجھے بتاؤ، تم کون ہو؟

(ہنستی ہے) تم نے کب یہ جاننا چاہا کہ میں کون ہوں۔ اب تمہیں قسمت یہاں لے آئی ہے تو مجھ سے پوچھتے ہو میں کون ہوں۔ سُنو، میں وہ بھینی بھینی خوشبو ہوں جو چاروں طرف اس کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ دھیما دھیما نغمہ ہوں جو اس فضا میں گونجا ہوا ہوں! آج سے نہیں — پورے ایک سو سال سے۔

میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے بتایئے آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آئی ہیں۔

تم ٹھیک سمجھ رہے ہو نوجوان، میں ایک بھٹکی ہوئی روح ہوں، تم چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک ایسی روح جو اس کوٹھے پر قتل ہوئی اور آج تک اپنا ہم راز ڈھونڈھتی رہی ہے۔

ٹھہرو، ذرا دیر ٹھہرو، میں آج تمہیں اپنے سارے راز بتا دوں گی — یہ خون کا دھبہ دیکھ رہے ہو غور سے دیکھو، یہ میرا خون — یہی ان شہیدوں کا خون ہے جو تم سے، تم زندہ انسانوں سے اپنا خون بہا مانگتا ہے۔ (ہنستی ہے) تمہیں یقین نہ آئے گا۔ شہزادی نام کے طوائف بھی قتل نہیں ہوئی تھی، شہید ہوئی تھی شہید!

میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا! آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔

آج سے ایک سو سال پہلے ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں بی بی حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اٹھایا تھا۔ میں بی بی حضرت محل کی ایک وفادار کنیز یاسمین ہوں۔ جان عالم کے رہس مبارک میں ناچ گانا سیکھا اور بی بی حضرت کے دامن سے لگی رہی۔ ۱۸۵۷ء میں جب قیصر باغ کی جنگ جاری تھی۔

(Flash Back)

انگریز افسر آواز: !Fire (توپوں کے گرجنے کی آواز)

!!Fire (توپوں کے گرجنے کی آوا)

: سپاہیو! آگ برساتے رہو۔ جب تک ایک ایک باغی کا صفایا نہ ہو جائے۔ گولے برساتے رہو، ایک ایک بستی کو آگ لگا دو، ایک ایک باغی کو بھون ڈالو!

Fire!

!!Fire (توپوں کے گرجنے کی آواز تھوڑی دیر کے لیے پس منظر میں چلی جاتی ہے)۔

یاسمین: میدانِ جنگ سے بُری خبر آئی ہے۔

حضرت محل: حضرت محل کو اب بُری خبروں سے کوئی ڈر نہیں لگتا۔ یہی نا کہ ہمارے جاں بازوں کے خون سے دھرتی لال ہو گئی۔ یہی نا کہ ہمارے جاں نثاروں نے ہنستے ہنستے جان کی بازی لگا دی اور ان کی لاشوں سے میدانِ جنگ کی زمین کہکشاں بن گئی۔ یہی نا کہ ہم جنگ ہار رہے ہیں۔ تلوار ہماری گردن تک آ پہنچی ہے۔

یاسمین: جی ملکۂ عالم (رونے لگتی ہے)

حضرت محل: حضرت محل کو شکست سے ڈر نہیں لگتا، جو موت کو للکارتے ہیں وہ ہار سے نہیں گھبراتے۔

: آپ کے جاں باز حکم کے منتظر ہیں۔ کیا ہتھیار ڈال دیئے جائیں؟

: کیوں؟

: سرکار عالیہ، اب اس کے سوا کای چارہ ہے؟ ہر مورچے پر ہماری ہار ہو رہی ہے۔ ہر جگہ موت اور تباہی ہے، توپوں سے آگ برس رہی ہے۔ ہتھیار کم ہیں۔ گھوڑے زخمی، سوار

بے دم ہیں۔ رسد ختم ہے اور بارود کا خزانہ خالی — انگریز کمانڈار نے پیغام بھجوایا ہے۔

حضرت محل: کیا پیغام بھیجا ہے ظالموں نے؟ یہی کہ ہم اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیں اور حکومت قاتلوں کے حوالے کر دیں۔

: نہیں۔

: اس نے کہلایا ہے کہ اگر ہتھیار ڈال دیئے جائیں تو وہ سرکار عالیہ کو جان کی امان دیتا ہے۔ ملکہ عالیہ کا بال بانکا نہیں ہوگا۔

حضرت محل: (غصے سے) خاموش! حضرت محل کی جان اتنی قیمتی نہیں کہ اودھ کی سلطنت کے بدلے میں اس کا سودا کیا جائے، ہم لڑتے لڑتے جان دے دیں گے مگر ہار نہیں مانیں گے۔

(یاسمین رونے لگتی ہے)

حضرت محل: روتی ہے پگلی۔ ہم نے لڑائی ہاری ہے، جنگ نہیں، حضرت محل کو آنسوؤں سے نفرت ہے۔ ہم جنگ جاری رکھیں گے۔

یاسمین: چاروں طرف آگ لگی ہے۔ زمین آسمان دشمن ہے۔

حضرت محل: ہم جانتے ہیں۔ وقت بہت کم ہے، ہمیں اپنے سبھی وعدے پورے کرنے ہیں۔ خوشحال خاں کو بلاؤ۔

خوشحال خاں: (درد سے کراہتا ہوا اچانک داخل ہوتا ہے) ملکۂ عالم!

حضرت محل: ہم تمہیں بلانے ہی والے تھے۔ تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔

خوشحال خاں: ملکۂ عالم! فرنگی توپ خانے نے میرا بازو توڑ دیا ہے۔ میں سرکار کی خدمت نہیں بجالا سکا۔

حضرت محل: خوشحال خاں، ہم خوش ہیں۔ تم نے اودھ کی شان بڑھائی۔ خون ور زخم بہادروں کے زیور ہیں۔ اپنا زخمی ہاتھ آگے بڑھاؤ۔

خوشحال خاں: (تکلیف سے) جو حکم!

حضرت محل: ہم نے وعدہ کیا تھا، ہم تمہاری وفاداری کا انعام دیں گے۔ ہم یاسمین کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتے ہیں، یاسمین ہماری کنیز نہیں ہماری ہمراز ہے، ہمجولی ہے۔ جب تک زندہ

رہواس کو خوش رکھنا (گولہ باری کی آواز قریب آتی جاتی ہے۔)

خوشحال خاں: سرکار! فرنگی فوجیں قریب آرہی ہیں۔

حضرت محل: ہمارے پاس وقت کم ہے۔

خوشحال خاں: محاصرہ تنگ ہوتا جارہا ہے، چاروں طرف آگ ہے۔

حضرت محل: ہمیں آگ کے گھیرے سے نکلنا ہے بخت خاں اور تانتیا ٹوپے، ہمیں کہیں کسی محفوظ مقام پر ملیں گے۔ ہم لڑائی جاری رکھیں گے۔ ضروری ہوا تو سو برس، دو سو برس، ہزار برس تک۔ اچھا، میرے بہادرو! ہم پھر کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے۔

یاسمین: خدا کی امان؛

خوشحال خاں: خدا حافظ (حضرت محل کی روانگی)

خوشحال خاں: کیسا عجیب ملن ہے ہمارا۔

یاسمین: درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں۔
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

خوشحال خاں: ہمت نہ ہارنا یاسمین۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ ایک بار پھر وہی شعر سُنایا۔
خوش رہو اہلِ وطن (یاسمین دُہراتی ہے مگر آواز گولہ باری میں دب جاتی ہے)
(انگریز افسر کی آواز گولہ باری کے دھماکوں کے پس منظر میں اُبھرتی ہے)

انگریز افسر کی آواز: Fire!

Fire!!

: سپاہیو! آگ برساتے رہو جب تک ایک ایک باغی کا صفایا نہ ہو جائے گولے برساتے رہو۔ ایک ایک بستی کو آگ لگا دو، ایک ایک باغی کو بھون ڈالو۔

یاسمین: خوشحال!!

خوشحال: یاسمین!!

انگریز سپاہی کی آواز: Halt, who comes there۔ ٹھہرو، تم کون ہو اور کہاں جا رہی ہو؟

یاسمین: میں یاسمین!

انگریز سپاہی: بھاگو مت! ہم گولی مار دیں گا، ہم تمہیں گولی مار دیں گا۔

یاسمین: (چیختی ہے)

انگریز سپاہی: سپاہیو! پیچھا کرو، ہم اس ہرنی کو زندہ پکڑنا چاہتے ہیں، رُک جاؤ، رُک جاؤ۔

(یاسمین بھاگتی جاتی ہے)

(گھنگروؤں کی آواز اُبھرتی ہے۔ کسی کوٹھے پر مجرا ہو رہا ہے۔ طوائف غزل گا رہی ہے)

یاسمین: (گھبرائی ہوئی دوڑتے دوڑتے تھک کر گر پڑتی ہے) بچاؤ۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔

نور بائی: کون ہے — ارے یہ تو بے ہوش ہو گئی۔ اُستاد جی۔

اُستاد جی: جی۔

نور بائی: دیکھتے کیا ہو، اسے میرے کمرے میں لے جاؤ۔ نہ جانے کس مصیبت کی ماری ہے بچاری۔

اُستاد جی: جو حکم۔

نور بائی: اور سُنو — خبردار جو تم نے یا سازندوں میں سے کسی نے ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔

اُستاد جی: ہماری کیا مجال! — (وقفہ)

نور بائی: سب کام ہو گیا۔

اُستاد جی: جی،

نور بائی: تو پھر ساز چھیڑو، ذرا اونچے سُروں میں!

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہلِ وطن — اہلِ وطن — اہلِ وطن

ہم تو سفر کرتے ہیں۔

(فوجیوں کے دروازہ بھڑبھڑانے کی آواز)

فوجی سپاہی: دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو!!

نور بائی: کون ہے۔

فوجی سپاہی: ہم فوجی ہیں۔ دروازہ کھولو، نہیں تو دروازہ توڑ دیں گے۔

نوربائی: اُستاد جی، دروازہ کھول دو۔

اُستاد جی: بہت اچھا سرکار!

جرنیل: سپاہیو! گھر کی تلاشی لو۔تم ادھر جاؤ، تم اُدھر جاؤ۔

نوربائی: ایسی بھی کیا جلدی ہے جرنیل صاحب! آخر ہم سے کیا گناہ ہو گیا کہ آپ دھڑ دھڑ ہمارے گھر، کوٹھے کی تلاشی لینے چلے آئے۔ اے ہے، ایسی ہی تلاشی لینی ہے تو ہماری جامہ تلاشی لیجیے، ہم کوئی آپ کے حکم سے باہر ہیں۔

جرنیل: باتیں ملانے کی ضرورت نہیں، سچ سچ بولو، ادھر کوئی گھائل لڑکی تو بھاگتی ہوئی نہیں آئی ہے۔

نوربائی: گھائل لڑکی تو آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ اے میں کیا بوڑھی لگتی ہوں؟ آج بھی سولڑکیوں سے زیادہ جوان ہوں۔ ہر طرف شور شرابا مچا ہوا ہے۔ سوچا ذرا دل بہلے گا۔ ریاض ہی کریں تو آپ نے دروازہ بھڑ بھڑا کر سارا مزا کر کرا کر دیا۔ اُستاد جی!

اُستاد جی: سرکار!

نوربائی: جرنیل صاحب آئے ہیں، کوئی اچھی سی چیز تو سُنائیں۔ ذرا ساز چھیڑو۔ شراب کی بوتل نکالو۔ ادب سے پیش کرو، ہم مبارک بادی گائیں گے۔

جرنیل: Down it!

نوربائی: اے ہے، آپ تو ایک ذرا کی ذرا میں ناراض ہو کر چل دیے۔ ذرا میری عرض سُنیے۔ ہم تو سرکار دربار کو دعا دینے والے ہیں — یہ لو، یہ تو سب کے سب چلے گئے۔

اُستاد جی: شکر ہے۔ آبرو رہ گئی۔

بائی جی: دروازہ دیکھ بھال کے بند کرو۔ اب کوئی کتنا ہی کواڑ پیٹے ہرگز نہ کھولنا۔

اُستاد جی: بہت اچھا۔

بائی جی: (سرگوشی میں) وہ کہاں ہے!

استاد جی: وہ؟ وہ تو ابھی تک بے ہوش پڑی ہے۔

بائی جی: چلو، ایک نظر دیکھ تو لوں — ہائی اللہ! کیا چاند کا ٹکڑا ہے یا پرستان کی پری زمین پر اُتر آئی

ہے۔قربان جاؤں، کیا خوب صورت مورت ہے۔روپ رنگ چھب، تختی بے مثال۔ اللہ تیری قدرت کے قربان، کیا کیا مورتیں بنائی ہیں، کیا کیا صورتیں پیدا کی ہیں۔

اُستاد جی: بے چاری کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔

بائی جی: خدا کی پھٹکار ان کم بختوں پر۔ پتہ نہیں بدمعاش پیچھے پڑے تھے یا فرنگیوں کے فوجیوں نے میری مورنی کو گھائل کیا۔

اُستاد جی: میری مائیے تو کچھ عرض کروں۔

بائی جی: تمہاری تو ساری باتیں بے عقلی کی ہوتی ہیں۔بات سُنی نہیں، ماننے کی قسم پہلے لیتے ہو۔

اُستاد جی: بائی جی، آپ کا نمک کھایا ہے، ہم تو آپ کو نیک صلاح ہی دیں گے۔اب آپ کی مرضی، مانیں یا نہ مانیں۔آپ کے پُرانے بہی خواہ ہیں۔

بائی جی: اے ہے، اب کچھ منہ سے بھی پھوٹو گے کہ پہیلیاں بجھواتے رہو گے۔

اُستاد جی: زمانہ خراب ہے بائی جی۔ ملک اور ریاست ہاتھ سے جاتی رہی، نوابی ختم ہوئی۔اب فرنگیوں کا بول بالا ہے۔اس راز کو آپ زیادہ دیر چھپا نہیں سکیں گے۔میری مائیے تو یہاں سے نکل چلیے اور ریاست نیپال کی سرحدی قصبے میں آپ کی بہن رہتی ہیں نا— ان کے ہاں لے چلیے۔نہیں تو اس گھائل مورنی کی ضرور کوئی نہ کوئی اُچک لے گا اور آپ الگ خطرے میں پڑیں گی۔

بائی جی: لو اور سُنو، ہم نے ابھی نگوڑی کی صورت بھی جی بھر کر نہیں دیکھی۔تم کہتے ہو اسے یہاں سے لے جائیں۔

اُستاد جی: یہی تو وقت ہے۔اسے ہوش آ گیا تو غضب ہو جائے گا۔پتہ نہیں کیا صورت ہو۔لوگ چوری چھپے بیل گاڑیوں میں شہر سے دیہات کی طرف جا رہے ہیں۔اس وقت کو شبہ بھی نہیں ہوگا— دیکھیے میرے سر کی قسم، اب زیادہ سوچ بچار نہ کیجیے۔یہ لڑکی مل گئی تو بس آپ کا اور میرا دونوں کا بُڑھاپا آرام سے کٹ جائے گا۔خدارا میری بات مان لیجیے۔

بائی جی: اچھا بابا— گاڑی کا انتظام کرو۔

(Change Over)

(بیل گاڑی کے چلنے کی آواز)

(Change Over)

یاسمین: (بے ہوشی میں بڑبڑاتی ہے) خوشحال خاں! ہم کہاں ہیں۔ میرے سرتاج! ہم کب یوں ہی چُھپ چُھپ کر ملتے رہیں گے۔ مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیجیے، اور قریب...... اور قریب! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

بائی جی: میری بچی، ہوش میں آؤ، ہوش میں آؤ۔

اُستاد جی: مگر سُنا آپ نے! خوشحال خاں کا نام ہے زبان پر۔ فرنگی کا سب سے بڑا دشمن، خوشحال خاں!

بائی جی: ہے تو کیا ہوا۔ کب کا مارا گیا ہوگا!

اُستاد جی: لاپتہ ہے ابھی تک۔ فرنگیوں کے ہاتھ آ گیا تو کاٹ کاٹ کر بوٹی بوٹی کر چیل کوؤں کو کھلائیں گے۔

یاسمین: خوشحال خاں! ہم کہاں ہیں! میرے قریب آؤ، مجھے اپنی بانہوں میں لے لو!

بائی جی: بیٹی۔ ہوش میں آؤ، بیٹی۔ آنکھیں کھولو!

یاسمین: (چونک کر) آپ لوگ کون ہیں — مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں۔

(بیل گاڑی کی آواز)

بائی جی: تمہارے دوست اور ہمدرد ہیں۔

اُستاد جی: فرنگی سپاہیوں سے بچا کر تمہیں حفاظت کی جگہ لیے جا رہے ہیں۔

بائی جی: وہ موئے تمہاری تلاش کر رہے ہیں۔

یاسمین: میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے کوئی پاپ نہیں کیا!

بائی جی: بیٹی۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، ہماری مانو تو خاموش رہو۔ راستے میں کسی کو شبہ ہو گیا تو ہم میں سے کسی کی خیر نہیں۔ وہ دیکھو فرنگی سپاہی ہر چوکی پر راستہ روکے کھڑے ہیں۔

فرنگی سپاہی کی آواز: Halt who comes there۔ گاڑی روکو! کون ہے تم لوگ!

اُستاد: سرکار دربار کو دعا دینے والے گانے بجانے والے ہیں۔ بائی جی بیمار ہوگئی ہے۔اسے لیے جارہے ہیں۔

بائی جی: جرنیل صاحب کا اقبال بلند ہو۔

فرنگی سپاہی: اچھا! اچھا! جاؤ۔

(گاڑی کے چلنے کی آواز)

(Change Over)

(موسیقی گھنگروؤں کی جھنکار اور طبلے کی تھاپ میں مدغم ہو جاتی ہے)

بائی جی: میں نے تیری ساری باتیں سُن لیں بیٹی۔ تیرا راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔نور بائی قول قرار کی پکّی ہے۔

یاسمین: تو پھر تمہاری کیا صلاح ہے۔

بائی جی: زمانہ بی بی حضرت محل اور جان عالم میاں کے نام کا دشمن ہوگیا ہے۔فرنگی خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔اُستاد جی جاتے ہیں۔آ کر بتاتے ہیں کہ ذرا شبے پر پکڑ دھکڑ بھی ہو رہی ہے۔مری بچّی، تیرا اس کوٹھے کے نیچے سے قدم باہر نکالنا خطرے سے خالی نہیں۔

یاسمین: تو پھر—!

بائی جی: فرنگیوں کی نظر سے بچنے کے لیے کچھ دن یہیں رہو۔

یاسمین: بیچ بازار میں ناچنے والی کے کوٹھے پر رہوں۔

بائی جی: ہاں، ناچنے والی ضرور ہوں مگر بی بی حضرت محل اور جان عالم پیا کے نام پر جان دے سکتی ہوں۔ ناچ گانے میں کیا بُرائی ہے۔تمہاری شکل صورت پریوں جیسی، آواز بے مثال، ناچنے میں تمہارا کیا جواب ہے کہ جان عالم پیا کی تعلیم پائی ہے۔بُرا نہ مانو تو ناچ گانے میں کوئی عیب نہیں۔فرنگی جاسوس چپّے چپّے پر ہیں۔ان کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کی اس سے اچھی کوئی ترکیب نہیں۔

یاسمین: بی بی حضرت محل کا لشکر آئے گا تو انھیں میرا پتہ کیسے چلے گا۔

بائی جی: یہ میری ذمہ داری ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے ان کی امانت ان کے سپرد کروں گی۔

یاسمین: اور خوشحال خاں!

بائی جی: اُستاد جی نے چاروں طرف آدمی دوڑائے ہیں۔ وہ لکھنؤ کے بچے بچے کو جانتے ہیں۔ خوشحال خاں کا پتہ نکال کر رہیں گے۔ تم ذرا فکر نہ کرو۔

(دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

یاسمین: بڑی خوفناک دستک ہے۔

بائی جی: وہی کم بخت فرنگی سپاہی ہوں گے۔ تم ذرا گھنگرو باندھ کر محفل میں آؤ۔ میں ان کم بختوں سے نبٹتی ہوں۔

(Change Over)

راجہ: نور بائی، آج بہت دیر میں دروازہ کھولا، کیا کچھ خاص مال گھر میں چھپا رکھا ہے۔

بائی: راجہ صاحب، آپ تو بندی کو شرمندہ کرتے ہیں۔ اُستاد جی!

اُستاد جی: جی سرکار!

نور بائی: صراحی کہاں ہے؟ جام کہاں ہے؟ آج ہمارے نصیب جاگے ہیں کہ راجہ صاحب ہمارے یہاں آئے ہیں۔

اُستاد: سب حاضر ہے۔ راجہ صاحب کی من پسند شراب۔

راجہ: خوب! بہت خوب!! تو پھر کیا دیر ہے۔ ذرا اپنے نازک صندلی ہاتھوں سے جام بھرو نور بائی۔

بائی: زہے نصیب کہ آپ کی خدمت کا موقع ملا (شراب اُنڈیلتی ہے)

راجہ: اور کچھ سُنا تم نے۔ فرنگیوں کی فتح کی خوشی میں اس شہر کے اِرد گرد کا علاقہ ہمیں جاگیر میں ملنے والا ہے۔ اب ہم مہاراجہ بہادر ہو گئے ہیں۔ مہاراجہ بہادر!

بائی جی: کیوں نہیں، آپ فرنگیوں کی مدد نہ کرتے ـــــ

راجہ: (بات کاٹ کر) نہیں نور بائی۔ ہم نے کچھ مدد نہیں کی، میدانِ جنگ کا منہ تک نہیں دیکھا، نہ کبھی بندوق چلائی، نہ توپ داغی۔ ہاں باغیوں کے دوست بنے رہے اور انھیں

بھوسہ بھرے کارتوس اور ملاٹ والی بارود کے گولے بھجواتے رہے (ہنستا ہے)۔ کہو ہے نا ہوشیاری کا کام — اب میری جان تجھے سونے میں تلوادوں گا، سونے میں۔

بائی جی: مبارک ہو سرکار! حویلی میں جشن کرایئے۔ ہم بھی مُجرا گانے آئیں اور انعام اکرام سے جھولیاں بھریں۔

راجہ: بس فرمان آنے کی دیر ہے۔

بائی جی: اقبال دن دُونا رات چوگنا ہو۔

راجہ: دن دُنا ہو چکا اب رات چوگنی ہونی چاہیے، شراب پُرانی اور عورت نئی اچھی ہوتی ہے، کہنے والوں نے ٹھیک کہا ہے۔ شراب تم نے پُرانی پلوائی نور بائی۔ اب عورت بھی کوئی نئی نویلی پیش کرو کہ منہ مانگا انعام پاؤ۔

بائی جی: تو سرکار کو میں پُرانی دُھرانی دکھائی دینے لگی۔

راجہ: ارے نہیں نہیں بھئی، تم تو اپنے جی کا چین ہو مگر کوئی نئی نویلی بھی تو چاہیے کہ کچھ ذائقہ بدلے — لاؤ ایک جام اور بھرو — اور اُستاد جی!

استاد: سرکار!

راجہ: بھئی یہ سناٹا کیسا ہے۔ کاگ اڑ چکے اب یہ راگ چھیڑو، نئی دھن، نیا گیت، کہ دل دھڑکنا بھول جائے اور نازنین جسم تھرکنے لگے۔

اُستاد: جو حکم سرکار۔

(ساز چھیڑے جاتے ہیں۔ طبلے پر تھاپ پڑتی ہے اور گھنگرو بج اُٹھتے ہیں۔ یاسمین رقص کرنے لگتی ہے اور غزل چھیڑ دیتی ہے)

کیا جانئے کیا لطف ہے چلمن کے اُدھر آج
جاتی ہے تو پھر کر نہیں آتی ہے نظر آج
کیا جانئے کیا لطف ہے چلمن کے اُدھر آج
محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گزر آج
اے بے خبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج

محفل میں ہے ہر سمت حسینوں کا گزر آج
اے بے خبری تو ہی بتا ہم ہیں کدھر آج
(راجہ صاحب 'واہ واہ' کرتے ہیں)

راجہ: بس کر لڑکی، بس کر — تو نے ہمارے ہوش و حواس چھین لیے۔

بائی: جھک کر تسلیم کرو۔

یاسمیں: تسلیم! — اجازت چاہتی ہوں۔

راجہ: (غصے سے) یہ کیا، نور بائی؟ یہ لڑکی اچانک کیسے چلی گئی۔ ہم اسے جی بھر کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ کون ہے یہ لڑکی؟

بائی: خوبصورتی کا بھی کوئی نام ہوتا ہے سرکار!

راجہ: کیوں نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہے۔ آج سے ہم اسے ملازم رکھتے ہیں۔ آج سے وہ ہماری پابند ہوگی۔

بائی: اتنی جلدی نہ کیجیے سرکار!

راجہ: ہم انتظار نہیں کیا کرتے۔ جو مانگو گی ملے گا، مگر اس کی نتھ اُترائی ہم کریں گے۔ سمجھیں! — ہم اگلے ہفتے آئیں گے!

بائی: میری غرض تو سُنیے سرکار!

راجہ: نہیں اب ہم کچھ اور سُننا نہیں چاہتے (دروازہ زور سے بند کر کے چلا جاتا ہے)

(Change Over)

بائی: میں کیا جانتی تھی بیٹی کہ نگوڑا راجہ ایسی بے طرح فریفتہ ہو جائے گا۔

یاسمین: میں ہرگز اپنی آبرو کا سودا نہیں کروں گی۔

بائی: اے ہے آبرو کا سودا کرنے کا کیا سوال ہے۔ راجہ آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا ہے۔ چار جام شراب کے پئے گا، چلّو میں اُلو ہو جائے گا، رات بھر بے خبر پڑا رہے گا۔

یاسمین: نہیں تمھیں معلوم ہے بڑی بی۔ تم کس سے بات کر رہی ہو۔

بائی: اچھی طرح معلوم ہے بیٹی، مگر اس کم بخت راجہ کو تم نہیں جانتی۔ مُوا انگریزوں کا منہ لگا ہے۔

اس کے ذرا سے اشارے سے ہم سب برباد ہو جائیں گے، پھانسی پر لٹکوا دے گا کل مُنھوا!

یاسمین: ہمیں موت سے ڈراتی ہو۔

بائی: تم تو میری باتوں اُلٹا مطلب نکال رہی ہو بیٹی — میں تو تمہارے بھلے کی کہتی ہوں۔

یاسمین: بہت ہوا بڑی بی، بس اب اسی میں بہتری ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، جنگلوں پہاڑوں میں ماری ماری پھروں گی۔ کہیں نہ کہیں خوشحال خاں کا پتہ نشان مل جائے گا یا بی بی حضرت محل کا سراغ پا جاؤں گی۔ انہی کی قدموں میں جان دے دوں گی۔

بائی: نہیں بیٹی۔ فرنگیوں کے جاسوس قدم قدم پر لگے ہیں۔ جان بچنی مشکل ہے۔ اُستاد جی نے لکھنؤ آدمی بھیجا تھا وہاں سے بھی کچھ اچھی خبر نہیں آئی ہے۔

یاسمین: کیا خبر آئی ہے! بتاؤ۔ جلدی بتاؤ۔ کیا خبر آئی ہے!

بائی: سارے وفادار مارے گئے۔ بی بی حضرت محل اور شہزادہ لاپتہ ہیں۔ اودھ کے پُرانے امیر ذلیل ہوئے، پھانسی پر لٹکائے گئے اور خوشحال خاں —

یاسمین: کہاں ہیں خوشحال خاں، کیسے ہیں وہ؟

بائی: فرنگی فوجیوں نے گولی ماردی (رونے لگتی ہے)

یاسمین: کیا کہا! خوشحال اب اس دنیا میں نہیں ہیں (دیوار سے سر ٹکراتی ہے)

بائی: ہوش سنبھالو بیٹی۔ اس طرح دیواروں سے سر ٹکرانے سے جانے والا واپس نہیں آئے گا، صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔ مرضی مولا میں کسے دخل ہے۔ مرنے والے کے ساتھ مرا بھی نہیں جاتا۔ میری بچی (رونے لگتی ہے)

یاسمین: (چیختی ہے) نہیں! اب میں جینا نہیں چاہتی، مجھے نہیں چاہیے تمہارا سکھ آرام، یہ دولت عزت — اس دنیا کو اس رابعہ کے منہ پر دے مارو! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ ان فرنگی سپاہیوں سے کہوں مجھے بھی مار ڈالیں۔

(Change Over)

اُستاد: کچھ کام بنا؟

بائی: نہیں۔ سب گڑبڑ ہو گیا، اُستاد جی!

اُستاد: وہ خبر سُنائی۔

بائی: اب تم ہی بتاؤ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں۔

اُستاد: راجہ صاحب کا آدمی دوبار آچکا ہے۔ کیا جواب دینا ہے اسے؟

بائی: میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

خوشحال خاں: (اچانک داخل ہوتے ہوئے) کہاں ہے وہ لڑکی؟

بائی: (ڈر کر) آپ کون ہیں۔

اُستاد: اس طرح بے دھڑک گھسے چلے آرہے ہیں کہ پاس نہ لحاظ۔

خوشحال: طوائف کے کوٹھے پر کوئی پوچھ گچھ کے آتا ہے؟ دروازہ کھلا ہے، شمشیر خاں سوداگر کا ہاتھ بھی کھلا ہوا ہے، دل بھی کھلا ہے۔ بس ہم چلے آئے۔ بلاؤ اس لڑکی کو بلاؤ۔ کہاں ہے وہ لڑکی؟

بائی: کون سی لڑکی؟ یہاں کوئی لڑکی وڑکی نہیں ہے۔

خوشحال (ہنستا ہے) ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا بڑی بی، ورنہ تلوار کے ایک وار میں کام تمام ہو جائے گا۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔

بائی: واہ واہ میاں سوداگر، کوئی زبردستی کا سودا ہے۔

خوشحال: (ڈانٹ کر) ہاں! زبردستی کا سودا ہے۔ شمشیر خاں کے سودے زبردستی کے ہوتے ہیں۔

بائی: آخر اس شہر میں درجنوں کوٹھے ہیں۔

خوشحال: ہاں ہیں مگر ہمیں جس کی تلاش ہے وہ آپ ہی کے ہاں ہے۔

بائی: تلاش؟

یاسمین: (تلاش کا لفظ سُن کر ایک دم داخل ہوتی ہے) کس کو تلاش ہے؟ کس کی تلاش ہے؟

بائی: پتہ نہیں کون ہیں۔

خوشحال: تماش بین ہے اور کون — محفل جماؤ نور بائی، ایک بار ہمارے لیے بھی محفل جماؤ ہم گانا سُنیں گے۔

بائی: مگر سوداگر صاحب، محفل کا کون سا وقت ہے پھر بچّی کا جی بھی اچھا نہیں ہے۔

خوشحال: جو مانگو گی ملے گا۔ سُنا تم نے — اور ہم صرف ایک غزل سُنا چاہتے ہیں —

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یاسمین: میں یہ غزل نہیں گا سکتی۔ یہ کسی کی امانت ہے۔

خوشحال: تم یہی غزل گاؤ گی — اور ابھی۔

بائی: اے ہے سوداگر صاحب، یہ کیا طریقہ ہے، آرام سے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھیے۔ ذرا چہرے سے پگڑی کا پلّہ ہٹائیے۔

خوشحال: لو ہٹا دیا پلّہ۔

یاسمین: میں گاؤں گی۔ سازندوں کو بُلوایئے۔ میں گاؤں گی۔

خوشحال: یہ غزل تو ہماری زندگی بھر کی وفاؤں کا صلہ ہے۔ تم نہیں جانتیں بڑی بی۔ اس غزل پر ہم نے کیا کیا نچھاور کر ڈالا ہے۔ اپنی آبرو، اپنے ارمان، اپنی زندگی — ساز چھیڑو، غزل شروع کرو۔

یاسمین: نہیں۔ ایسا نہ کہیے۔ خدارا ایسا نہ کہیے۔

خوشحال: آنکھوں پر یقین نہ کریں، کانوں کو جھٹلا دیں اور صرف دل کی باتوں میں آجائیں۔

یاسمین: ہاں! — جو آنکھیں دیکھ رہی ہیں فریب ہے۔ جو کان سُن رہے ہیں جھوٹ ہے! تالاب کی گندگی کنول نے اپنی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے اختیار کی ہے (ساز چھیڑے جاتے ہیں)

راجہ: (اچانک اندر داخل ہوتے ہوئے) گانا بجانا بند کرو، خبردار! درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلے نہیں، ہلا تو گولی مار دوں گا۔

اُستاد: (حیرت سے) راجہ صاحب، آپ!!

راجہ: تمہارے نئے مہمان کی خاطر آنا ہی پڑا۔

بائی: مہمان؟ کون مہمان!!

راجہ: انھیں غور سے دیکھ لو نور بائی۔ یہ ہیں انگریزوں کے باغی، خوشحال خاں!

نور بائی اور اُستاد جی: (حیرت سے) خوشحال خاں۔

خوشحال: شیروں کو گیدڑ بھبکیوں سے ڈراتا ہے۔ ہمّت ہے تو سامنے آ کر مقابلہ کر۔

راجہ: تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ اپنے کو میرے حوالے کر دو ورنہ گولی مار دوں گا۔

خوشحال: چوہے کی اولاد، سپاہی ہتھیار نہیں ڈالا کرتے۔ سپاہی کے لیے فتح ہے یا موت!!

راجہ: (پستول سے گولی چلانے کی تیاری کرتا ہے) مجھے گولی چلانی ہوگی۔

یاسمین: خبردار، گولی مت چلانا۔ (یاسمین چیخ مار کر گر پڑتی ہے)

راجہ: (گولی چلاتا ہے) ارے اس لڑکی کو روکو۔ یہ گولی کے سامنے آ گئی ہے۔

نور بائی: میر بچّی! راجہ صاحب، یہ آپ نے کیا کیا، میری بچّی کی جان لے لی۔

راجہ: خوشحال خان کو گرفتار کر لو۔

یاسمین: خدا حافظ خوشحال خاں، خدا حافظ۔ مجھے غلط نہ سمجھنا میرے سرتاج (موت کی ہچکی)

خوشحال: خدا حافظ یاسمین۔

نور بائی: (رونے پیٹنے لگتی ہے) ہائے میری بچّی، میری بیٹی تو نے ناحق کیوں اپنی جان دے دی۔ مجھے دغا دے گئی، میری رانی۔ ہائے میں لُٹ گئی، ہائے میں مر گئی۔

(End of Flash Back)

یاسمین: اس طرح اچانک اپنے پاؤں نہ ہٹاؤ۔ ٹھیک تمہارے قدموں کے نیچے میرے خون کا دھبہ ہے۔ ہم مٹ گئے مگر ہمارے خون کا یہ دھبہ کوئی نہیں مٹا سکا۔ فرنگی بھی نہیں مٹا سکا۔ ہمیں اس خون کے دھبّے ہی نے زندہ رکھا ہے۔ تم نے، تمہاری دنیا، تمہاری تاریخ نے تو ہمیں بھلا دیا کہ وہ گم نام کہاں گئے جو ۱۸۵۷ء میں عزّت آبرو، جان مال لُٹا کر نکل کھڑے ہوئے تھے، مارے پیٹے گئے تھے، ان پر کیا گزری۔ میں یہی سوال کرنے کے لیے برسوں سے نہیں صدیوں سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں کہ تم آؤ، تم میرا سوال اور میری فریاد میرے لوگوں تک پہنچا دو اور ان کے گھروں میں بھی اس شمع کا اُجالا لے جاؤ۔

راوی: لائیے۔ یہ شمع مجھے دیجیے (ہسٹریائی انداز میں) ہر اندھیرے گھر میں یہ روشنی پہنچاؤں گا۔ میں تاریخ لکھنے والوں کے گریبان پکڑ کر پوچھوں گا کہ انھوں نے روشنی کی اس وراثت کو

کیوں فراموش کر دیا۔ لائیے یہ شمع مجھے دیجیے ــــ اور اچانک شمع مجھے پکڑا دی، پر گری اور آگ لگ گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔ مجھے بتائیے، خدارا مجھے بتائیے، یاسمین کی شمع میں کہاں لے جاؤں۔ وہ بستی کہاں پر ہے جہاں اندھیرا نہ ہو۔ وہ مؤرّخ کہاں پر ہے، جو اُن بے گناہوں سے انصاف کر سکے۔ (پاگلوں کی طرح چیختا ہے) میں اس کا بدلہ لوں گا ہر ظالم سے یاسمین کے خون کا بدلہ لوں گا۔

(Flash on)

آتش رفتہ کا سراغ

کردار:

۱۔	قصہ گو	۲۔	کورس
۳۔	کامران	۴۔	ہانی
۵۔	عورت	۶۔	بُڑھیا
۷۔	شہنشاہ	۸۔	ملکہ
۹۔	نقیب	۱۰۔	سپہ سالار
۱۱۔	پہلی کنیز	۱۲۔	دوسری کنیز
۱۳۔	پہلے جہاز راں۔ ملاح	۱۴۔	دوسرے جہاز راں۔ ملاح
۱۵۔	کمانڈر	۱۶۔	سہیلی
۱۷۔	پرچہ نویس	۱۸۔	وزیر اعظم
۱۹۔	بچہ	۲۰۔	دوسری بڑھیا

قصہ گو: صاحبو! بہت پُرانے زمانے کا قصہ ہے کہ ہماری آپ کی اس دنیا میں ایک بستی سیتان نامی تھی۔ لوگ آرام وچین سے رہتے تھے، عورتیں مسکراتی لہراتی چلتی تھیں، نوجوان مست اور سرشار تھے، بوڑھے محفوظ، کھیتیاں ہری بھری اور بچے کلکاریاں مارتے گھومتے تھے۔ آج آپ کو اسی بستی کا قصہ سُناتا ہوں۔

کورس: ناگاہ چہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
باردو کی بوجھل بُو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
بستی پہ اُداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں
آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں

(ساحرلدھیانوی)

(ماتمی لے اُبھرتی ہے)

کامران: اونہ رو۔ رونے سے کیا ہوگا۔ منگول جب حملہ کرتے ہیں تو یہی ہوتا ہے۔

بوڑھا: خاموش! وہ ابھی سو رہی ہے۔

عورت: وہ پاگل ہوگیا ہے بے چارا! کون ہے یہاں جس کے جاگنے کا اسے انتظار ہے؟

کامران: ہر گھر سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ ہر گھر جل رہا ہے۔

عورت: بچے ماں کی گود سے چھین لے گئے۔ دوشیزائیں بالوں سے گھسیٹ کر فوجی شہسواروں نے اپنے گھوڑوں کے پیچھے باندھ لیں، نوجوان غلام بنالیے گئے۔ جنگجو قتل ہوگئے — اے آسمان! تو کیوں نہ گر پڑا، اے زمین! تو کیوں نہ پھٹ پڑی کہ گناہ

گاروں کو نگل لیتی اور معصوم تیری آغوش میں پناہ پا لیتے!

بُڈھیا: ہائے! میں دُکھیاری اپنے بچے کو کہاں ڈھونڈوں۔ اندھیرے میں اسے گھر کا رستہ کیوں کر ملے گا۔

دوسری بُڈھیا: ہائے! وہ میری جوان بیٹی کو گھسیٹے لے گئے۔ اس کے گبرو بیرن کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے، ان کے بدلے مجھے کیوں نہ موت آگئی۔

عورت: میرے بوڑھے باپ کی ٹانگیں انھوں نے توڑ ڈالیں۔ اس کا سر بندوقوں کے کندوں سے لہولہان کر دیا۔ کوئی بتائے اس بوڑھے کا قصور کیا تھا!

بوڑھا: اے خدا! تو نے ہم سے کیوں منہ موڑ لیا۔ اے خدا! تو نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا۔

کامران: نہ رو۔ میرے لوگو۔ نہ رو۔ منگولی جب حملہ کرتے ہیں تو یہی ہوتا ہے! ماؤ، بہنو، بیٹیوں، وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا دُکھ آخری سانس تک بھولوں گا نہیں! تمہارا دُکھ میرا دُکھ ہے۔ میں تمہارا بدلہ لوں گا! تمہارا انتقام ضرور لوں گا۔

(قہقہے کی آوازیں)

(Change Over)

شہنشاہ: دور مشرق میں رونے کی آوازیں سُن رہی ہو۔

ملکہ: سُن رہی ہوں۔

شہنشاہ: کتے بھونک رہے ہیں۔

ملکہ: گیدڑ اور سیار بول رہے ہیں۔

شہنشاہ: (ایک قہقہہ) معلوم ہوتا ہے ہمارے سپاہی کامیاب ہوئے۔ بستیاں تاراج ہو گئیں۔

ملکہ: اور آپ ایک اور ویرانے کے شہنشاہ ہو گئے۔

شہنشاہ: تم بہت شوخ ہو۔

ملکہ: آپ کی قسم، ہمیں آپ کی فتح مندی ذرا بھی پسند نہیں۔

شہنشاہ: جلتی ہو۔

ملکہ: نہیں عالم پناہ، ہر فتح مندی کے معنی ہیں غلام اور کنیزیں۔

شہنشاہ: اور ہر کنیز تمہاری رقیب ہے! نہیں، ہر گز نہیں۔ اپنے کو اتنا کمتر نہ سمجھو۔

ملکہ: آپ کا نشہ کم ہوتا جارہا ہے۔

شہنشاہ: تو پھر ایک جام اور! عورت اور شراب تیز ہی اچھی لگتی ہیں۔

ملکہ: شراب پرانی اور عورت نئی!

شہنشاہ: (قہقہہ لگاتا ہے) ضروری نہیں! شراب نئی اور عورت پُرانی۔

ملکہ: تو پھر آج ایک وعدہ کیجیے۔

شہنشاہ: شہنشاہ وعدے نہیں کیا کرتے، صرف درخواستیں سُنا کرتے ہیں۔

ملکہ: مگر مجھے سوال کرنے کی عادت نہیں ہے۔

شہنشاہ: درخواست، سوال، وعدہ!

ملکہ: صرف اس قدر کہ اس خون میں ڈوبی فتح کے بعد جو قیدی غلام بنائے جائیں گے، جو عورتیں کنیزیں اور لونڈیاں بنائی جائیں گی، ان سب کو آپ رہا کر دیں گے!

شہنشاہ: (قہقہہ لگاتا ہے) کوئی اور درخواست! کوئی اور سوال! کوئی اور وعدہ!
(فتح کے شادیانوں کی آواز قریب سے قریب تر آنے لگتی ہے)
سُن رہی ہو، وہ آرہے ہیں۔ ہمارے فتح مندی سپاہی!
(دروازہ کھلتا ہے)

نقیب: جہاں پناہ کو فتح و کامرانی مبارک! سپہ سالار باریابی کی اجازات چاہتے ہیں۔

شہنشاہ: اجازت ہے!

نقیب: اقبال بلند، دولت زیادہ!

سپہ سالار: جہاں پناہ، غلام اس شاندار فتح پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور شہر سیستان کی کنجیاں حضور اقدس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

شہنشاہ: مابدولت خوش ہوئے۔

سپہ سالار: عالم پناہ کی فوجِ ظفر موج نے غنیم کے سپاہیوں کے سر کاٹ کر ان کی کھوپڑیوں سے آدھ میل لمبا مینار تیار کیا ہے اور فتح کے لمحے سے آج تک مینار سے خون کا آبشار جاری ہے۔

شہنشاہ: سُن رہی ہو ملکہ، خون کا آبشار! انسانی خون کا آبشار (قہقہہ لگاتا ہے) شاباش۔
سپہ سالار، تم نے دنیا میں آٹھویں عجوبے کا اضافہ کیا ہے!

سپہ سالار: سیستان کے سبھی امیر غلام بنا لیے گئے۔ ساری حسینائیں باندیاں بنا کر نظر بند کر دی گئی ہیں۔

شہنشاہ: کیا غلام تندرست ہیں!

سپہ سالار: نہایت تنومند!

شہنشاہ: ہم انھیں طوفانی سمندروں میں جہازوں کے پتوار چلانے اور بادبان باندھنے کی خدمت سپرد کر دیں گے۔ وہ اس وقت چپّو چلائیں گے جب تک تھک کر گر نہ پڑیں— تمہارے کوڑے ان کی پیٹھ کے لیے مضبوط ہیں؟ اپنے کوڑوں کو دُہرا بٹوا لو۔

سپہ سالار: بہت مضبوط ہیں۔ ہم انھیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے باندھ کر لائے ہیں۔

شہنشاہ: اور عورتیں؟

سپہ سالار: گستاخی معاف فرمائیں تو عرض کروں۔

شہنشاہ: کہو۔

سپہ سالار: غلام نے ان عورتوں سے زیادہ حسن اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا اور ان میں ہانی بھی ہے جو!

شہنشاہ: ہانی!

سپہ سالار: اس علاقہ کی حسین ترین کسان دوشیزہ!

شہنشاہ: کیا ملکۂ عالم اس حسینہ کو اپنی غلامی میں لینا پسند کریں گی!

ملکہ: ہمیں عالم پناہ کو اپنا وعدہ یاد دلانا زیادہ پسند ہے!

شہنشاہ: (قہقہہ لگاتا ہے) وعدہ! سوال! درخواست!! (قہقہہ لگاتا ہے) نئی کامرانی کی خوشی میں مابدولت کی خاص شراب کا ایک جام سپہ سالار کو پیش کیا جائے۔

سپہ سالار: غلام عزّت افزائی کے لیے نوازش بجا لاتا ہے۔

شہنشاہ: آج سے سیستان ہی نہیں پورب مشرق کی زمینیں کسانوں کے خون پسینے سے جوتی بوئی

جائیں گی اور ان کی فصلوں پر ہمارا اور صرف ہمارا قبضہ ہوگا۔ ہمارے مفتوح غلام پوری ریاست میں محنت و مشقت کریں گے اور ان کی کمائی پر ہمارا اور صرف ہمارا اختیار ہوگا— اور ہماری افواجِ قاہرہ کا کام کردیئے جائیں اور اس فرمانی اور بغاوت کی کوئی آواز بلند ہونے سے پہلے زبان اور سر قلم کردیئے جائیں اور اس فرمان میں کوئی رو رعایت نہ برتی جائے گی— شب بخیر! سپہ سالار!! نئی فتوحات کے خواب دیکھو۔ ایک دن وہ آئے گا جب ساری دنیا ہماری زنجیر میں ہوگی۔ (قہقہہ لگاتا ہے)

(واپسی کا فوجی نغمہ)

(Change Over)

پہلی کنیز: بہت رات ہوگئی۔

دوسری کنیز: اندھیری، ڈراؤنی رات ہے!

پہلی: پگلی، محلوں میں ڈراؤنی رات کا کیا کام۔ مشعلیں روشن ہے۔ پہرے دار جاگ رہے ہیں۔

دوسری: آج عالم پناہ نے محل سرا کا رُخ نہیں کیا۔

پہلی: چُپ کم بخت، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

دوسری: وہ دیکھ رہی ہے، وہ سایہ ملکۂ عالم کے ایوان کے دروازے پر!

پہلی: (شوخی سے ہنستی ہے) عالم پناہ ہوں گے۔

....

ملکہ: کون؟

ہانی: آپ نہیں پہچانیں گی مجھے!

ملکہ: کون ہو تم!

ہانی: میں ہانی ہوں۔

ملکہ: ہانی!

ہانی: سیستان کی سب سے زیادہ حسین دوشیزہ جسے آپ کے ظالم سپاہی قیدی بنا کر لے آئے

ہیں۔ میں آپ کے قید خانے سے بھاگ آئی ہوں۔

ملکہ: اور ہمارے پہرے داروں نے۔

ہانی: جو موت سے نہیں ڈرتا اسے پہرے دار نہیں روک سکتے۔

ملکہ: کیا کہنا چاہتی ہو؟

ہانی: میں کہنے آئی ہوں کہ ہمارے لوگ ہار گئے، آپ کی طاقت نے ہمیں توڑ ڈالا۔ ہمارے گھر جل رہے ہیں، ہمارے پیارے خاک میں مل گئے، مگر ہانی مر سکتی ہے بک نہیں سکتی۔

ملکہ: تمہارا مطلب!

ہانی: ہانی جانتی ہے کہ شہنشاہ کی عیاش نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی ہیں۔ میں آپ سے کہنے آئی ہوں کہ انھیں روکیے۔ ہانی کسی اور کی ہو چکی ہے، اسے مجبور نہ ہونے دیجیے۔

ملکہ: بدتمیز، بے حیا لڑکی! تو شہنشاہ پر الزام لگا رہی ہے!

ہانی: آپ جانتی ہیں کہ میں ڈرپوک نہیں ہوں اور ڈرپوک ہی جھوٹ بولتے ہیں۔

ملکہ: ہمت ہے تو شہنشاہ سے کیوں خوف زدہ ہو۔

ہانی: شاید میں غلطی پر تھی ملکہ۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کے سینے میں عورت کا دل ہے جو دوسری عورت کا دُکھ درد سمجھ لے گا، شاید سارے فاتح ایک ہی سے ہوتے ہیں اور سارے مجبور ایک ہی جیسے۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

خدا حافظ!

شہنشاہ: (اچانک داخل ہوتے ہوئے) یہاں کون آیا تھا؟

ملکہ: کوئی نہیں! کوئی بھی تو نہیں۔

شہنشاہ: ناممکن! پردہ ابھی تک ہل رہا ہے۔ ابھی ابھی کوئی یہاں تھا۔

ملکہ: شاہی محل سرا میں۔

شہنشاہ: کون تھا وہ!

ملکہ: تھا نہیں، تھی۔

شہنشاہ: ہانی —!!

ملکہ: وہی جس کی آپ کو تلاش تھی۔

شہنشاہ: تلاش! کیوں نہیں ہم اپنے قیدیوں کا فرار ہونا برداشت نہیں کر سکتے۔ اسے حاصل کرنا ہی ہوگا۔

ملکہ: شاید مردہ!

شہنشاہ: زندہ کیوں نہیں؟

ملکہ: حسن محض جبر سے فتح نہیں کیا جا سکتا عالم پناہ۔ عورت صرف چہرہ اور جسم نہیں، دل بھی رکھتی ہے اور ہو سکتا ہے اس نے وہ دل کسی اور پر ہار دیا ہو۔

شہنشاہ: دل بھی مملکت ہے جسے فتح کیا جاتا ہے۔

ملکہ: بھول رہے ہیں عالم پناہ!

شہنشاہ: ہم ہار نہیں مانتے۔ شکست ہمارے دشمنوں کا مقدر ہے، ہمارا نہیں— ہم ہانی کو حاصل کر کے رہیں گے۔

ملکہ: تو ہانی غلط نہیں کہتی تھی۔

شہنشاہ: کیا کہتی تھی وہ— ! غلاموں اور کنیزوں کو بھی محل سرا میں زبان کھولنے کی مجال !!

ملکہ: وہ کہتی تھی شہنشاہ کی عیاش نگاہوں کو روکیے۔

شہنشاہ: عورتیں سرکش گھوڑوں کی طرح ہیں جو شہسواروں کے کمال کا امتحان ہوتی ہیں۔

ملکہ: مگر کب سے عالم پناہ— ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ قبیلے عورتوں کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ سب مل کر ایک ساتھ محنت کرتے تھے اور اپنی محنت کا پھل آپس میں بانٹ کر کھاتے تھے۔ پھر تم نے وراثت کا قانون نکالا۔ قبیلے کی دولت کو ذاتی دولت میں بانٹ کر ورثہ بنالیا اور عورت جگہ مرد کو خاندان کا سردار بنالیا کہ اس کے وارث جائیداد کو اپنے قبضے میں لا سکیں۔ اسی دن سے عورت غلام ہوئی ہے نا !!

شہنشاہ: خاموش !! ملکہ اپنی حد سے آگے مت بڑھو۔

ملکہ: اور آپ بھی عالم پناہ !! اگر ہانی کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ بہت کچھ کھو دیں گے !!

شہنشاہ: دھمکی ! درخواست !! وعدہ !!!

(Change Over)

(طوفان کا شور، پانی کے تھپیڑے جہاز کے عرشے پر ہلچل مچائے ہوئے ہیں)

پہلا: آج کی رات بڑی تاریک ہے۔

دوسرا: اندھیری اور اندھی۔

پہلا: سمندر جلال میں ہے۔

دوسرا: موجیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

پہلا: پانی سے جہاز کا عرشہ ڈوبا جا رہا ہے۔

دوسرا: آج کی رات زندہ بچ جائیں تو جانیں۔

کمانڈر: ملاحوں سے کہو برابر چپّو چلاتے رہیں۔ کامران سے کہو مستول پر چڑھ کر بادبان کا رُخ ٹھیک کرے۔

پہلا: سردار، اس طوفان میں!

کمانڈر: ہم سب خطرے میں ہیں، اگر ہم بچ گئے اور جہاز ڈوب گیا تو شہنشاہ ہمیں گورخر کی کھال میں زندہ سلوا کر ہاتھی کے پاؤں سے کُچلوا ڈالے گا۔

پہلا: ہماری زندگی شہنشاہ کے ہاتھ میں ہے۔

کمانڈر: لیکن ہماری زندگی اس وقت کامران کے ہاتھ میں ہے۔

پہلا: اگر وہ اس طوفانی ہوا میں سمندر میں گر گیا۔

کمانڈر: غلاموں کی زندگی اسی کام آتی ہے — دیر مت کرو۔ کوڑا ہاتھ میں لو اور سارے غلاموں کی پیٹھ پر اس وقت تک برساتے رہو جب تک چپّوؤں کی رفتار دس گُنی نہ ہو جائے۔ جانتے ہو یہ قیامت کی رات ہے۔

کورس: اور کوئی دم کی ہے مہماں یہ گزر جائے گی رات
ڈھلتے ڈھلتے آپ اپنی موت مرجائے گی رات
زندگی میں اور بھی کچھ اَبر بھر جائے گی رات
اب اگر ٹھہری رگ وپے میں اُتر جائے گی رات

ہے افق سے ایک تازہ آفتاب آنے کی دیر
ٹوٹ کر مانند آئینہ بکھر جائے گی رات
رات کا انجام بھی معلوم ہے ہم کو سرورؔ
لاکھ اپنی حد سے گزرے، تا سحر جائے گی رات

(سرور بارہ بنکوی)

پہلا ملاح: کامران! کامران! کامران!!!؛ ارے دیکھو کامران کو کیا ہوا۔ کوئی جا کے سردار کو خبر دو۔

دوسرا ملاح: کچھ نہیں، مگر کیا ہوا ہوگا۔ بادبان باندھتے ہوئے، گرا ہے مر گیا ہوگا۔

تیسرا ملاح: بڑے بے درد ہو تو لوگ۔

پہلا ملاح: میں کہتا ہوں سردار کو اطلاع کرو۔ آخر شاہی بیڑے کی حفاظت ان ہی کی ذمہ داری ہے۔

کمانڈر: مجھے سب خبر ہے۔ مجھے خبر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کامران کو نیند آ گئی ہے۔ اسے جگاؤ۔

پہلا ملاح: نیند!؟

کمانڈر: ایسا ہوتا ہے۔

بوڑھا ملاح: آٹھ دن آٹھ راتیں نہیں سویا ہے کامران۔ سُن رہے ہو، اس کی پیٹھ پر برابر کوڑے پڑتے رہے ہیں کہ چپو کی رفتار کم نہ پڑے۔ اس کی ہتھیلیاں پھٹ گئی ہیں۔ اس کی آنکھیں خون اُگل رہی ہیں۔ اس کا پورا جسم ــــــ!

کمانڈر: خاموش! بوڑھے ایک لفظ اور کہا تو تجھے سمندر میں پھکوا دیا جائے گا۔

بوڑھا ملاح: ظالمو! تم اس آدمی کی حمایت سے بھی انکار کرتے ہو جس نے تمہاری زندگی بچانے کے لیے اپنا ہر سانس عذاب بنا لیا ہے۔

کمانڈر: کامران کے ہونٹوں سے لہو پونچھ ڈالو۔

کامران: میں زندہ ہوں، سردار! میرے خوابوں میں کون گا رہا تھا۔

کمانڈر: جہاز طوفان سے نکل آیا ہے۔ اسے چپو چلانے کے لیے لے جاؤ۔

(جہاز چلنے کی آواز)

بوڑھا ملاح: تھو! آخ تھو!!

پہلا ملاح: کیا تھو تھو لگا رکھی ہے، معلوم ہے میرے ہاتھ میں کوڑا ہے۔

بوڑھا ملاح: معلوم ہے میری پیٹھ کی کھال کھینچ لو، اب تمہارے کوڑوں سے مجھے کوئی دُکھ نہیں پہنچتا۔
ہماری پیٹھ فولاد کی ہے اور ہمارے جسم پتھر کے ہیں، مگر ہمارے دل ابھی تک روتے ہیں۔

دوسرا ملاح: اسی لیے تم دوسروں کے دل دُکھاتے ہو۔

بوڑھا ملاح: میں صرف کامران کی بے حیائی پر تھوکتا ہوں۔ تھو! آخ تھو!!

کامران: بابا! میں تم سب کی جان بچانے کے لیے شرمندہ ہوں۔

بوڑھا ملاح: تُف ہے تم پر۔ تم نے موت کے مقابلے میں غلامی پسند کی، ہمیں مرجانے دیا ہوتا۔
سمندر کے کچھوے ہمیں کھا جاتے، مگر ہم ان ظالموں کے لیے جینے کی لعنت سے تو
نجات پالیتے — تو بزدل ہے کامران!

کامران: میں مرنا نہیں چاہتا۔ بابا! یقین مانو وہ دن ضرور آئے جس کا مجھے انتظار ہے۔

بوڑھا ملاح: پاگل ہو گیا ہے۔

کامران: نہیں۔ جس رات وہ میری بستی کو آگ لگانے آئے تھے انھوں نے میری منگیتر کو نرم بالوں
سے گھسیٹ کر گھوڑے کے پیچھے باندھ دیا تھا۔ میرے بھائی کے سینے کو نیزے کی اَنی سے
توڑا تھا۔ میری ماں کو بے عزت کیا تھا۔ میرے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ کر قیدی بنایا تھا۔

بوڑھا ملاح: بس کر کامران، بس کر۔

کامران: اُسی دن میں نے قسم کھائی تھی بابا! میں ضرور بدلہ لوں گا۔ ابھی تک وہ دُھواں جو میرے
جلتے ہوئے گھر سے اُٹھ رہا تھا میرے سینے میں گھٹ رہا ہے۔ میں اپنی ہر ذلت کا بدلہ
لوں گا۔ قاتلوں کے چہرے میری آنکھوں سے چھپ نہیں سکتے۔ انھیں موت بھی
میرے انتقال کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتی۔

بوڑھا ملاح: بھولتا ہے پگلے۔ وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔

کامران: میرے کانوں سے سنو میری آنکھوں سے دیکھوں، وہ سنو وہ دور کون گا رہا ہے۔ ایک

نہیں، دونہیں، سیکڑوں ہزاروں آوازیں۔

بوڑھا ملاح: لیکن کوئی آواز نہیں سُنتا۔ میری اپنی آواز کافی ہے مگر کامران، میں بوڑھا ہوں جسم جواب دے چکا ہے تم جوان ہو، ہمّت کرو، اُٹھو! میرے بیٹے! اُٹھو!!

کمانڈر: خبردار، جو کوئی اپنی حد سے ہلا۔ ورنہ اسی طرح برچھی سینے سے پار رہو جائے گی۔

بوڑھا ملا:— اُہ اُہ میرے بیٹے!

کامران: برچھیوں سے ڈراتے ہو۔

کمانڈر: سینے چھلنی کردوں گا۔ میں حکم دیتا ہوں رُک جاؤ۔

کامران: آگے بڑھو، دوستو! سارے ہتھیار چھین لو۔

کمانڈر: خبردار!

کامران: گھیرلو۔ چاروں طرف سے گھیرلو۔ (لوگوں کے زخمی ہونے اور کراہنے کی آواز) آگے بڑھو، بہت دن کوڑے کھائے ہیں، بہت دن دوسروں کے لی مرتے رہے ہو، دوستو! ایک لمحے اپنے لیے جی کر دیکھو۔ آگے بڑھو! آگے بڑھو! ہتھیار چھین لو!

کمانڈر: خبردار!

کامران: آج سے جہاز ہمارا ہے۔ کمانڈر گرفتار کرلیا گیا۔

کمانڈر: مگر کب تک! تم شاہی عتاب سے بچ نہ سکو گے!

کامران: خاموش!!۔ آج سے جہاز ہم سب کا ہے۔ سارے غلام آزاد ہیں، ہم سب آزاد ہیں! آ(ECho) سُنتے ہو بھائیو! ساتھیو!! دوستو!! ہم سب آزاد ہیں، ہم سب آزاد ہیں!!! اس جہاز کا سارا سامان لُوٹ کا سامان ہے۔ یہ ان کسانوں میں بانٹ دیں گے جن کے خون پسینے کی کمائی ہے۔ ان غریبوں کو بانٹ دیں گے جنھوں نے آج تک کبھی بھر پیٹ کھانا نہیں کھایا ہے— آج ہم آزاد ہیں! ہم سب آزاد ہیں!!

(Change Over)

ہانی: تُو بھی احمق ہے بالکل!

سہیلی: کیوں کیا ہوا مری سرکار؟

ہانی: میں کہا تھا نا کہ آج میرے سنگھار میں کوئی کمی نہ رہنے پائے اور تُو نے یہ سجایا ہے مجھے!

سہیلی: اور کیا سجاؤں، کوئی کمی ہے سنگھار میں کیا؟

ہانی: دُلہن بنا دے آج تُو۔

سہیلی: آخر بات کیا ہے میری بنّو!

ہانی: آج میرا جی کہتا ہے کہ وہ آئے گا۔

سہیلی: کون آئے گا؟

ہانی: وہ جس کا مجھے انتظار ہے۔

سہیلی: کون ہے وہ! ذرا میں بھی تو سُنوں۔

ہانی: اس کا نام تو میں نے بھی کبھی نہیں لیا۔

سہیلی: کیا گانٹھ کا پورا ہے کیا!

ہانی: پگلی! تو کیا جانے۔

سہیلی: کچھ نہ کچھ تو جانتی ہوں۔

ہانی: نہیں جانتی، بالکل نہیں جانتی! یہ دل کے معاملے ہیں، انھیں تو کبھی کبھی خود میں بھی نہیں جان پاتی۔

سہیلی: آخر گاؤں گاؤں گھومتی رہی۔ کبھی سنگھار کو نہ کہا۔

ہانی: ہاں! آج کی بات ہی کچھ اور ہے — اور سُن، اب کچھ نہ بولنا، سنگھار پورا کر؛ اور ایسا سنگھار کہ جو دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے، وقت کم ہے۔

سہیلی: اچھا بابا —!!

ہانی: اچھا — میں خود ہی سنگھار کروں گی، خود مجھی کو سنگھار کرنا بھی چاہیے۔ جا، اب تو جا، مجھے تنہا چھوڑ دے۔

(دروازے پر دستک)

ہانی: دروازہ کھلا ہے (دروازہ اچانک زور سے کھولنے کی آواز) مجھے معلوم تھا کامران تم آؤ گے، تم آؤ گے۔

کامران: ہانی تم!

ہانی: ایک لمحہ اسی طرح کھڑے رہو، کامران! میں تمھیں جی بھر کر دیکھ لو —ہائے کتنے برسوں بعد دیکھا ہے تمھیں!

کامران: دنیا بدل گئی ہانی —ایک وہ دن تھا جب سیتان کے رنگیں راستوں اور بل کھاتی پگڈنڈیوں پر تمھیں گود میں بھر لیا کرتا تھا۔ کتنے آزاد تھے ہم دونوں اور آج —!

ہانی: بولو، بولو، رُک کیوں گئے!

کامران: میں ایک سمندری لُٹیرا اور تم ایک بکنے والی حسینہ!

ہانی: تم خوش قسمت ہو کامران کہ اپنی پیٹھ پر کوڑوں کے نشان تو دکھا سکتے ہو، مگر میں روح کے زخم کیسے دکھا پاؤں گی!

کامران: دنیا میں دو ہی تو قوتیں آباد ہیں ہانی —ایک غلام بنانے والی، دوسری غلام بننے والی۔ ایک کی پیٹھ اور روح کوڑوں کے نشان سے پاک ہوتی ہے، مگر وہ لوگ دیکھنے والوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ دوسری غلام بننے والی قوم جس کے پاس زخم ہی زخم ہیں مگر انھیں دیکھنے والا کوئی نہیں —باقی ملک، علاقہ، رنگ، نسل سب دھوکے ہیں، فقط دھوکے! اور آج جب میں ایک باغی غلام تمھارے سامنے کھڑا ہوں۔

ہانی: باغی غلام!

کامران: باغی غلام ہی نہیں بلکہ سمندری لُٹیرا جس نے شاہی جہاز پر قبضہ کرلیا ہے اور جو زخمی اور نادار تمھارے پاس پناہ لینے آیا ہے۔

ہانی: ایسا نہ کہو۔

کامران: سچ ہے ہانی! سچ ہے۔

ہانی: ہاں سچ ہی ایسا بھیانک ہو سکتا ہے —تم نہیں جانتے کامران میں بھی تمھاری ہی طرح باغی کنیز ہوں جو شاہی عتاب سے بچنے کے لیے گاؤں گاؤں قصبے قصبے منہ چھپاتی پھری ہوں، خطرے مول لیتی گھومی ہوں اور آج بھی ظالم بادشاہ کے ہرکارے میری تلاش میں ہیں۔ وہ زخمی کتے کی طرح ہمارا پیچھا کریں گے۔ آؤ ایک لمحے کے لیے میرے

گلے سے لگ جاؤ کہ اس لمحے کی یاد کو سینے سے لگا کر جان دینا آسان ہو جاوے۔

(آگ لگنے کی آواز)

کامران: ہانی—ہانی، یہ روشنی کیسی ہے۔

ہانی: آگ لگ گئی ہے۔

(شوروغل مچ جاتا ہے)

ایک آواز: فوجیوں نے پوری بستی کو آگ لگا دی ہے۔

دوسری آواز: مجرموں کی تلاش ہے۔

پہلی آواز: ہر گھر سے دُھواں اُٹھ رہا ہے۔

دوسری آواز: مجرموں کو باہر نکالو! باہر نکالو!!

پہلی آواز: شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، بستی کو بچالو۔ مجرموں کو پکڑ کے حوالے کر دو۔

ہانی کامران: بستی والو۔ ہمیں شہنشاہ کے حوالے کر دو! ہم مجرم ہیں۔

ایک آواز: (بہت اطمینان سے) مُجرم گرفتار ہوئے۔ بستی جل کر راکھ ہوئی۔ آگ کے شعلے بُجھا دو۔

(Change Over)

کورس: کبھی نہ اس کے بھاگ کھلیں گے، پیاسی مٹی رہے گی پیاسی
یوں نہ کہو، مرجھائے پودے یونہی سدا مرجھائے رہیں گے
چلتے چلتے اس منزل میں آکر دھرتی رُک جائے گی
یوں نہ کہو، گہنائے سورج یونہی سدا گہنائے رہیں گے
تم کو تو ہم نے اپنا کہا ہے تم تو یوں نہ کہو، زنداں کے
کبھی نہ بھاری قُفل کھلیں گے، کبھی نہ زنجیریں ٹوٹیں گی

یوں نہ کہو

یوں نہ کہو

یوں نہ کہو......!! (اخترالایمان)

شہنشاہ: بند کرو! یہ گانا بند کرو!!

ملکہ: کیا جہاں پناہ نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔

شہنشاہ: بھیانک! بہت ہی بھیانک خواب!! مگر ہم خوش ہیں کہ وہ خواب ہی تھا!

ملکہ: کیا ہو گیا ہے آپ کو! آپ کے خواب کیوں بھیانک ہوتے جاتے ہیں!

شہنشاہ: شہنشاہ جب رنگین خواب دیکھنے لگتے ہیں ان کی سلطنتوں پر زوال آجاتا ہے۔
ہمیں بھیانک خواب دیکھنے دو ملکہ کہ ہمارا دل اور ہماری حکومت کمزور نہ ہو۔
ہمیں پھولوں کی رنگینی نہیں فولاد کی بھیانک بے رنگی چاہیے۔

ملکہ: میرا دل ڈرتا ہے۔

شہنشاہ: دن کو خوف سے شروع کرنا چاہیے دوسروں کے لیے خوف سے!

ملکہ: آپ بڑے ظالم ہیں!

شہنشاہ: ہم بار بار اپنے اس خطاب کو بھول جاتے ہیں۔ آج ہم اسے یاد رکھیں گے۔ آج یوں بھی ہماری سال گرہ ہے اور تمھیں معلوم ہے ہم آج اپنی سال گرہ کس طرح منانا چاہتے ہیں۔

ملکہ: رعایا آپ کے گیت گائے گی۔ ہار پھول نچھاور ہوں گے۔ آپ سونے میں تولے جائیں گے۔

شہنشاہ: آج جو پہلے مُجرم ہمارے سامنے پیش ہوں گے انھیں ہم بھوکے شیروں کے سامنے ڈالے جانے کی سزا دیں گے، بہت دن سے ہم نے بھوکے انسانوں اور بھوکے شیروں کی کشتی نہیں دیکھی ہے۔

ملکہ: (چیخ اُٹھتی ہے)

شہنشاہ: کیوں کیا ہوا!

ملکہ: مجھ سے یہ بے رحم تماشا نہیں دیکھا جاتا!

شہنشاہ: تو اپنی خوبصورت آنکھوں پر سیاہ نقاب ڈال لو۔ اپنے کانوں کو فریادیوں کے لیے بہرا کر لو۔ آخر تم ملکہ ہو۔ سرکاری تہواروں میں تمہارا شریک ہونا ضروری ہے بھوکے شیروں اور بھوکے انسانوں کا یہ مقابلہ بھی آخر سرکاری تیوہار ہی تو ہے۔۔ خواب گاہ کے

پردے ہٹاؤ ملکہ، آنے والے سورج استقبال کرو۔

(Change Over)

(اچانک ستار کے تار جھنجنانے لگتے ہیں اور نغمے گونج اُٹھتے ہیں)

ایک آواز:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

وزیراعظم: رعایا اپنے شہنشاہ کی خدمت میں سال گرہ کی مبارک باد پیش کرتی ہے اور شہنشاہ اور ملکہ کی صحت وسلامتی، کامیابی وکامرانی کی دعا دیتی ہے۔

شہنشاہ: رعایا کو ہماری طرف سے صحت وسلامتی کا پیغام دو۔ جب تک ہماری شوکت وجبروت قائم ہے ہماری رعایا کو بھی انصاف ملے گا۔ انصاف کا ساتھ دینے والوں کو سلامتی اور اس کے مخالفوں کو موت! ہماری سال گرہ کا یہی پیغام ہے جسے ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا جائے۔

وزیراعظم: بہار کے پہلے پھولوں کی پنکھڑیاں شہنشاہ پر نچھاور ہونے کے لیے بے قرار ہیں!

شہنشاہ: اجازت ہے! پھول نچھاور کیے جائیں۔

وزیراعظم: ارکان دولت خواہش مند ہیں کہ شہنشاہ کا وزن سونے اور جواہرات میں کیا جائے کہ یہ دولت جہاں پناہ پر سے قربان کی جائے۔

شہنشاہ: اجازت ہے۔ ترازو قائم کی جائے۔

وزیراعظم: وفادارانِ سلطنت نذر پیش کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔ ساتھ ہی اکیس توپوں کی سلامی کی اجازت دی جائے۔

شہنشاہ: اجازت ہے۔ (توپوں کی سلامی شروع ہوتی ہے)

وزیراعظم: ملکۂ عالم کی طرف سے آخری نذر پیش کرنے کی اجازت —!

شہنشاہ: نہیں، پرچہ نویس کہاں ہے۔ مابدولت اس کی نذر کے منتظر ہیں۔ پیش کیا جائے۔

پرچہ نویس: اقبال بلند، جہاں پناہ! دیر ہوئی معافی چاہتا ہوں۔

شہنشاہ: دیر ہونے کا سبب!

پرچہ نویس: بندر درگاہ کے پاس بُری خبر تھی اور میں خوش خبری کے ساتھ سال گرہ کی مبارک باد پیش کرنا چاہتا تھا۔

شہنشاہ: سُنا۔ ہم تیار ہیں!

پرچہ نویس: شہنشاہ کے شاہی بیڑے کے جہاز پر جہاز چلانے والے غلاموں نے قبضہ کر لیا کہ جہاز کے کمانڈر کو قید کر لیا۔

شہنشاہ: قتل کر ڈالا؟!

پرچہ نویس: نہیں! قتل نہیں کیا گیا۔ البتہ جہاز کا سارا سامان کسانوں اور غریبوں میں بانٹ دیا گیا۔

شہنشاہ: گویا لوٹ اور بغاوت۔

پرچہ نویش: سارے غلاموں کو آزاد کر دیا گیا اور سرکاری ہتھیاروں پر قبضہ۔

شہنشاہ: (غصے میں کھڑا ہو جاتا ہے) کون تھا وہ؟

پرچہ نویس: سیستان کا ایک اُجڑا ہوا غلام۔ کامران!

شہنشاہ: بیان جاری رہے۔

پرچہ نویس: شاہی فوجیوں نے سمندر کے قریب کی بستیوں کو آگ لگا کر جھونپڑی سے باغیوں کو گرفتار کر لیا۔

شہنشاہ: کہاں ہے وہ باغی —!

پرچہ نویس: پیش کرنے کے لیے شہنشاہ کی اجازت کے منتظر ہیں۔

شہنشاہ: فوراً پیش کیا جائے۔

(زنجیروں میں بندھے ہوئے مُلزم پیش کیے جاتے ہیں)

کامران — اور ہانی!! ہم ان کو پہچانتے ہیں۔

پرچہ نویس: ناچیز ان مُجرموں کی گرفتاری کی مبارک باد لے کر حاضر ہونا چاہتا تھا۔

شہنشاہ: ہم خوش ہوئے۔

پرچہ نویس: آپ کی خوشی میں رعایا کی خوشی ہے۔

شہنشاہ: ٹھیک کہتے ہو۔ ہم اپنی اس خوشی میں رعایا کو بھی ضرور شریک کریں گے۔

وزیراعظم!

وزیراعظم: عالم پناہ!

شہنشاہ: اعلان کرادو کہ دونوں باغیوں کو سرِ عام پھانسی دے دی جائے۔ ہماری رعایا کو یہ تماشا دیکھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ گاؤں گاؤں میں اعلان کرادو، پورے ملک کے سامنے باغی اپنے انجام تک پہنچیں گے۔

ہانی: کیا تیری سلطنت کا یہی انصاف ہے۔

شہنشاہ: خاموش! اس لڑکی کی شاہی آداب سکھائے جائیں۔

کامران: ظالم! کیا ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز اُٹھانا بھی پاپ ہے۔

شہنشاہ: جُرم اور سزا کا فیصلہ ہو چکا۔ دربار برخاست!!

(Change Over)

کورس: بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے۔
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کُھلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(فیض احمد فیضؔ)

(بچے کے علاوہ یہ آوازیں وہی ہیں جو پہلے سین میں تھیں)

ایک بچہ: (خوشی سے تالیاں بجاتا ہے) ہاہا! ہاہا! مزہ آئے گا۔

بُڑھیا: پتہ نہیں کون کم بخت ہیں جو آج پھانسی پائیں گے۔

بچہ: ہاہا! کب شروع ہوگا تماشا!

بوڑھا: ذرا دیر اور ٹھہر جا، ابھی بادشاہ سلامت نہیں آئے ہیں۔

بُڑھیا: اور وہ کم بخت۔

(بگل کی آواز)

بوڑھا: دیکھ۔ وہ بادشاہ سلامت کی سواری آ گئی۔ بھیڑ اپنی جگہ جم گئی۔ اب وزیر اعظم آگے بڑھیں گے۔

بچہ: (تالیاں بجا کر) خوب مزا آئے گا۔

....

وزیر اعظم: شہنشاہ عالم پناہ! اجازت ہو تو عدالت عالیہ کے فیصلے کے مطابق مجرموں کو کٹہرے سے باہر نکالا جائے اور انھیں پھانسی دی جائے۔ (مجمع میں ہلچل)

شہنشاہ: اجازت ہے!

وزیر اعظم: میرے عزیز ہم وطنو! تم میں سے کون نہیں جانتا کہ اس ملک میں انصاف کا بول بالا ہے۔ پورے مقدمے کی کارروائی سُننے کے بعد عدالت عالیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ کامران کو، جس نے شاہی بیڑے کے خاص جہاز پر قبضہ کر کے لُوٹ مار کی، اور ہانی کو، جس نے اسے پناہ دی، پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ شہنشاہ معظم کے حکم سے میں قید خانے کے داروغہ کو حکم دیتا ہوں کہ کامران—

بوڑھا: کامران— میرا بیٹا!!! (دور کی آواز)

وزیر اعظم: اور ہانی—

بڑھیا: میری بیٹی— ہانی۔ لٹے ہوئے، اُجڑے وے سیستان کی ہانی!!! (دور کی آواز)

وزیر اعظم: دونوں کی شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا جائے۔

ملزموں کو جو کچھ آخری وقت میں کہنا ہو وہ کہہ سکتے ہیں۔ تمہاری آخری خواہش پوری کی جائے گی۔

کامران: اور کوئی ثبوت چاہیے ہماری بے گناہی کا! ہم وہ ہیں جن کے گھر بار تاراج کر دیئے گئے۔ ہم وہ کسان ہیں جو غلام بنا کر بازاروں میں بیچے اور خریدے گئے۔ جن کی پیٹھ کوڑوں کی مار سے زخمی ہے۔ جن کے سینے میں ظلم کی میخیں ٹھونگی گئیں۔

ہانی: جن کی مائیں، بہنیں، بیویاں جانوروں کی طرح بکیں، ذلیل اور رُسوا ہوئیں۔ درندوں تک کو محبت اور خدمت کا پاس ہوتا ہے مگر ہمارے حکمراں درندے ان کو بھی نہیں پہچانتے جن کے خون اور پسینے کی کمائی سے ان کے خزانے بھرے ہیں۔

کامران: بچے ماؤں کی گود سے چھین لیے گئے، عورتیں لمبے بالوں سے بر بازار گھسیٹی گئیں۔ بزرگ اور بوڑھے ذلیل ہوئے، جوان غلام ہوئے۔ اہلِ وطن! اب تو بولو! تم کب تک یہ ظلم برداشت کرو گے! کب تک خاموش رہو گے! کب تک اپنے دلوں کی آگ کا سراغ نہ پاؤ گے۔ یہ خاموشی کب تک!!

(مجمع میں ہلچل)

بڑھو۔ اپنے ظالم شہنشاہ کے گریبان کی طرف بڑھو۔ زندگی بھر میں ایک بار تو صرف اپنے لیے جی لو۔

شہنشاہ: یہ تو کھلّم کھلاّ بغاوت ہے۔ سپہ سالار کو فوراً حکم دیا جاتا ہے۔ ایک کسان بچے کی یہ مجال!!

کامران: میں نے کہا تھا شہنشاہ! میں بدلہ لوں گا، خون کے ایک ایک قطرے کا بدلہ لوں گا۔ ایک ایک ذلّت کا بدلہ!! اناج کے ایک ایک دانے کا بدلہ!!

ہانی: عورتوں کی غلامی اور رُسوائی کا بدلہ!! بے گناہ، بے آسرا لوگوں کے خون کا بدلہ!! (لوگ آگے بڑھتے ہیں)

شہنشاہ: خبردار۔ آگے قدم نہ بڑھانا!

کامران: اب میرے قدم کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم میں سے کسی کے قدم بھی کوئی اب روک نہیں

پائے گا۔ شہنشاہ مجھے پہچانو۔

(پیچھے سے آواز کورس میں۔۔۔)

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کوڑوں کی چھاؤں میں دنیا
بیچتی بھی، خریدتی بھی تھی
مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کھیتوں سے ایسے باندھا تھا
جیسے میں ان کا ایک حصہ ہوں
کھیت بکتے تو میں بھی بکتا تھا
مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یگوں سے آوارا

قصہ گو: اس سے آگے کے ورق دھندلا گئے ہیں۔ نہیں معلوم، کیا ہوا؟ کیسے ہوا اور اس بستی کے لوگوں پر، اس کے غلاموں اور آقاؤں پر کیا گزری۔ رات بھیگ چلی۔ آج کی کہانی یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ یار زندہ صحبت باقی!!

شیر افگن

کردار:

۱۔ مہارانی

۲۔ اکبر اعظم

۳۔ شیر افگن

۴۔ غلام قادر

۵۔ ماہ پیکر

۶۔ مہر النسا

۷۔ قطب الدین

(اکبر کا محل)

رانی: مہابلی!

اکبر: (کوئی جواب نہیں دیتا)

رانی: کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا دُکھ ہے (جواب میں صرف بھاری قدموں سے ٹہلنے کی آواز)

رانی: مجھ سے بھی بھید، مجھ سے بھی راز مہابلی۔ اپنے چرنوں میں جگہ دی ہے تو اپنے دل کی بات جاننے کا سوبھاگیہ بھی تو دیجیے۔

اکبر: اکبر نے ایک خواب دیکھا تھا مہارانی۔ پاگل خواب پرست شہنشاہ عمر بھر اس خواب کی تعبیر ڈھونڈھتا رہا۔ پہاڑوں کے دامن، صحراؤں کے گرد و غبار میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آج وہ خواب ٹوٹ گیا۔

رانی: ہوسکتا ہے کہ وہ پورا ہو کر رہے۔

اکبر: نہیں۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ سورج کی زرنگار کرنیں صرف اکبر کو سلامی دینے کے لیے مشرق سے نکلتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں۔ وہ صرف اکبر کو سلامی دیتی ہیں، مغلیہ سلطنت کو نہیں، آلِ تیمور کو نہیں۔ ہمارے بعد اہلِ تیمور کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے گا۔ یہ دریچے، یہ محراب، یہ فصیلیں بلندی اور عظمت کے لیے ترسیں گے۔

رانی: ایسا نہ کہیے۔ شہنشاہوں کی زبان پر کم ہمّتی کی باتیں شوبھا نہیں دیتیں۔ مہابلی کے خواب ایک نہ ایک دن ضرور پورے ہو کر رہیں گے۔

اکبر: ہم نے خواب دیکھا تھا کہ ہندوستان میں جس مشترکہ تہذیب کا بیج ہم نے بویا ہے وہ کبھی ایک تناور درخت بنے گا جس کی چھاؤں میں ایک قوم پنپے گی — مگر ہم عمرِ جاوداں کہاں سے لائیں مہارانی۔ ہم انسان ہیں اور اس دنیا میں انسان سے زیادہ مجبور کوئی دوسری مخلوق پیدا نہیں ہوئی۔

مہارانی: نہیں مہابلی، آپ کے چشم و چراغ آپ کے خوابوں کو پورا کریں گے۔

اکبر: چشم و چراغ! (طنزیہ ہنسی) تم سمجھتی ہو ہم سلیم کے ہاتھوں میں اپنے خوابوں کی تعبیر سونپ

سکیں گے؟! ہم نے بھی یہی سوچا تھا مگر یہ سب جھوٹ تھا، دھوکا تھا۔ اس نے بلور کے فانوس کی طرح ہمارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ تمھیں معلوم ہے، کل مینا بازار میں کیا ہوا۔

مہارانی: بھگوان سمجھے ان پر چہ لگانے والوں کو۔ نہ جانے کیوں ہاتھ دھو کہ میرے بچّے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کیا کیا جھوٹی سچّی اُڑاتے رہتے ہیں۔

اکبر: مہارانی، تم اکبر کی رفیقِ حیات ہو اور اکبر نے انصاف کو ایمان سمجھا ہے۔ کیا مرزا غیاث اور اس کی جوان بچّی کو کوئی عزّت نہیں ہے۔ ہم نے اسے اپنا سمجھ کر محل میں پناہ دی ہے۔ کیا اس کی عزّت پر ڈاکہ ڈالنے کی عام اجازت دے دی جائے کہ شہزادہ سلیم کی عیاشیاں جب چاہیں اس کی عصمت سے کھیلیں — شہزادہ سلیم کو تو مملکت کی ہر عورت کی عصمت کا محافظ اور ہر گرانے کی ناموس کا نگہبان ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ محض ایک عیاش طبع شرابی ہے۔ کیا ہندوستان کے ہونے والے فرماں روا کی یہی تصویر ہے؟

رانی: آپ کے چرنوں کی سوگندھ مہابلی، مینا بازار میں کوئی اَنیائے نہیں ہوا۔ سلیم کبوتروں کا جوڑا لیے گزرا۔ کسی بات کا دھیان آ گیا۔ اس نے مہرالنسا کو دونوں کبوتر پکڑا دیئے۔ واپس آیا تو مہرن کے ہاتھ سے ایک کبوتر چھوٹ کر اُڑ گیا تھا۔ سلیم نے پوچھا 'وہ ہمارا کبوتر کیسے اُڑ گیا؟' مہرن نے دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا اور بولی 'ایسے اُڑ گیا صاحبِ عالم'۔

اکبر: اور اس کے بعد صاحبِ عالم نے میرزا غیاث کی نوجوان بیٹی کو سینے سے لگا لیا، ایک مغل شہزادے کے لیے شرم سے زمین میں گڑ جانے کی بات ہے مہارانی۔ خدایا! آلِ تیمور کو یہ دن بھی دیکھنا تھا۔

رانی: جوانی دیوانی ہوتی ہے مہابلی!

اکبر: تم چاہتی ہو کہ سلیم کی جوانی کے ساتھ ساتھ اس کا بوڑھا باپ بھی دیوانہ ہو جائے اور ہندوستان کی ہونے والی ملکہ کا تاج ایک معمولی سوداگر کے سر پر رکھ دیا جائے۔ کیا یہی ہے ہمارے خوابوں کی تعبیر؟!

رانی: اتنی ذرا سی بھول پر اتنی بڑی سزا نہ دیجیے میرے لال کو!

اکبر: ذرا سی بھول، اس نے ہمارے تصورات کا رنگ محل چُور چُور کر ڈالا۔ ہمارے ارمانوں کی نرم و نازک پنکھڑیاں نوچ کر پھینک دیں۔ ہندوستان کے مستقبل کے سارے منصوبے پُرزہ پُرزہ کر ڈالے۔ ہمارے خونِ جگر کو ایک ادنیٰ سوداگر بچی کے رُخساروں کا غازہ بنا دیا؟

رانی: بچوں کی غلطیوں پر بھگوان بھی مسکرا دیتا ہے۔

اکبر: تم ماں ہو رانی، مگر ہمارے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ ڈور ہے۔ ہمارے ہاتھ انصاف کی ریشمی ڈوروں نے باندھ رکھے ہیں۔ رعایا کے ناموس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

رانی: میرا لال بے گناہ ہے، معصوم ہے۔

اکبر: (فرمان اُٹھاتے ہوئے) یہ دیکھتی ہو۔ ٹھٹھہ کے وقائع نویس کا عریضہ ہے۔ اکبر کی فوج جہاں جاتی ہے فتح کے جھنڈے گاڑتی ہے۔ ہماری سلطنت کی سرحدیں پھیل رہی ہیں۔ اقبال اور کامرانی کا نیا سورج طلوع ہو رہا ہے، لیکن ہمارے قلعے کی چہار دیواری کے اندر ہمیں شکست کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔

رانی: فتح کی خوشی میں آپ میرے لال کی غلطی کو بھی معاف کر دیجیے۔

اکبر: مبارک ہے وہ شخص جو فتح کی خوش خبری لے کر آیا۔ آج کے تاریک دن اس نے روشنی اور امید کی کرن دکھائی۔ سلیم نے اکبر کے ماتھے پر کلنک لگایا، اُس شخص نے اسی ماتھے پر کامرانی کا تاج رکھ دیا۔

رانی: کون ہے وہ؟

اکبر: علی قلی استاجلو جس کو آج ہم نے شیر افگن کا خطاب دیا ہے۔ منصب اور جاگیر بخشی ہے۔ اس نے نہتا ہو کر شیر کا شکار کیا ہے۔ (کچھ سوچتے ہوئے) شیر افگن! وہ سلیم کے لگائے ہوئے زخموں کا مرہم لے کر آیا ہے۔ شیر افگن۔ مہارانی، ہمیں سوچنے دو۔

دوسرا سین

(جمنا کے کنارے شیر افگن کا خیمہ)

غلام قادر: خطاب شیر افگن مبارک ہو۔

شیر افگن: یہ ظلِ الٰہی کی نوازش سے پایا ہے ورنہ مجھے یاد ہے یہ شیر افگن وہی علی قلی استانجلو ہے جو ایران میں شاہ طہماسپ کا سفرچی تھا۔ ایک ادنیٰ خالہ زاد غلام سے منصب و جاگیر تک رسائی، یہ سب ظلِ الٰہی کا کرم ہے۔

غلام قادر: بلاشبہ، مگر بھئی ہم بھی ظلِ الٰہی کی نگاہِ انتخاب کی داد دیتے ہیں۔ جس طرح باغبان ہزار پھولوں سے گلاب چُن لیتا ہے اسی طرح ظلِ الٰہی کی مردم شناس نظر نے شیر افگن کا انتخاب کیا ہے۔

شیر افگن: ظلِ سبحانی نے سچ مچ یہ خطاب دے کر مجھے خرید لیا ہے۔ اگر میرے خون کا آخری قطرہ بھی سلطنت مغلیہ کے کام آسکے تو بہ خدا دریغ نہ کروں گا۔

غلام قادر: نہیں استانجلو۔ ابھی جوان ہو۔ خون بہانے کی بات نہ کرو۔ مجھ بوڑھے کی طرف دیکھو۔ میں نے کبھی میدانِ جنگ میں بھی موت کا تصور نہیں کیا۔ تم نے کسی نوجوان حسینہ سے زندگی بھر ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے تصور میں تمہیں دولہا بناتی ہوگی، ارمانوں کے چراغ جلاتی ہوگی اور ان چراغوں کی روشنی میں سہاگ کی چوڑیاں جگمگاتی ہوگی۔

شیر افگن: مگر بابا، یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہو گیا۔

غلام قادر: (ہنستا ہے) بڑی حیرت ہوئی تمہیں۔ سبھی نوجوان سپاہی، ہمارے اپنے ہوں یا دشمن کی فوج کے، سب کسی نہ کسی حسینہ کو راہ تکتا چھوڑ آتے ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا راز کوئی نہیں جانتا۔

شیر افگن: دنیا کے راستے بڑے سیدھے سادے ہیں۔ مجھے سب کچھ مل گیا۔ عزت، منصب، جاگیر۔ میں نے ماہِ طلعت سے وعدہ کیا تھا کہ شادی سے پہلے میں اس کے قدموں میں دنیا کی ساری نعمتیں لا ڈالوں گا۔

غلام قادر: ہر نوجوان کے دل میں ایک شاعر چھپا ہوتا ہے۔

شیر افگن: جب مجھے ظلِ سبحانی کے حضور میں شرف باریابی حاصل ہوگا—

غلام قادر: کل صبح تمہیں دربارِ خاص میں باریابی کا حکم ہوا ہے۔ ظلِ الٰہی کے حضور میں۔

تیسرا سین

(اکبراعظم کا دیوانِ خاص)

(قرنا کی آواز اُبھرتی ہے۔ نوبت بجتی ہے جو اس بات کا اعلان ہے
کہ پہر بھر دن گزر چکا ہے۔ یہ آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جاتی ہے
اور آخر کار پوری فضا پر چھا جاتی ہے)

اکبر: شیر افگن! قریب آؤ۔

شیر افگن: غلام نذر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

اکبر: اجازت ہے۔

شیر افگن: غلام کی خوش بختی ہے کہ شہنشاہِ ہندوستان کی خدمت میں باریابی کی عزت نصیب ہوئی۔

اکبر: ہم نے تمہیں تخلیہ میں طلب کیا ہے۔ یہ ہمارے پاس بہت سے سپاہ سالار اور میر بخشی ہیں جو مشکل سے مشکل معرکے سر کرسکتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مہم فتح کرسکتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے ہم اپنے دل کی نازک امانت سونپ سکیں۔ تم جواں مرد ہو، بہادر ہو۔ تم اس امانت کی نزاکت سمجھ سکتے ہو ہم تمہیں یہ امانت سونپنا چاہتے ہیں۔

شیر افگن؛ ظلِ الٰہی کی بندہ نوازی اور ذرہ پروری! ظلِ سبحانی کے حکم کی تعمیل میں خون کا آخری قطرہ بھی بہانے سے دریغ نہیں کروں گا۔

اکبر: نہیں نوجوان، ہمارے تخت وتاج کے لیے خون بہانے والوں کی کمی نہیں۔ ہمیں تمہارا خون نہیں، تمہارا دل چاہیے۔

شیر افگن: ظلِ الٰہی!

اکبر: تمہارا ظلِ الٰہی صرف شہنشاہ نہیں۔ اس کے دل میں ایک انسان کا دل بھی دھڑکتا ہے استانجلو۔ اس نے ایران کے مقتدر سوداگر مرزا غیاث کو پناہ دی تھی اور اس کے خاندان کی ناموس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ مرزا کی لڑکی مہر النسا کا ہاتھ ہم تمہارے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔

شیر افگن: ظلِ الٰہی میں اس اعتماد کا مستحق نہیں۔

اکبر: اکبر کی نظریں دھوکا نہیں کھاتیں۔ ہمیں تمہاری نسبی شرافت اور سعادت مندی پر اعتماد ہے۔

شیر افگن: ظلِ الٰہی! (تھوڑی دیر سوچتا رہتا ہے)

اکبر: اکبر کو تمہارے فیصلے کا انتظار ہے۔

شیر افگن: (کانپتی ہوئی آواز میں) ظلِ الٰہی کا ہر فرمان میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔

اکبر: شاباش، نوجوان۔ تم نے شہنشاہ کی عزّت رکھ لی۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ پرسوں رنگ محل میں بارات لانے کا انتظام کرو۔ مہرن کی شادی پوری شان و شوکت سے ہوگی۔

چوتھا سین

(رنگ محل)

(شہنائیوں کی آواز گونج رہی ہے، رقص و سرود کی محفل برپا ہے، محل سرا میں رقاصہ بھاؤ بتا بتا کر ناچ رہی ہے۔

زینت وزیب عروسانہ مبارک باشد
جلوۂ شمع بہ پروانہ مبارک باشد
ساقی و شیشہ و پیمانہ مبارک باشد
بتو نوشیدنِ مستانہ مبارک باشد

زینت وزیب عروسانہ مبارک باشد
جلوۂ شمع بہ پروانہ مبارک باشد

(ماہ پیکر) سہیلی: اے میری بنّو! اب تو ذرا منہ کھولو۔ تم بھی ابھی سے شرمانے لگیں۔

مہر: ہٹو، ماہ پیکر۔ یہ ہر وقت کی چھیڑ خانی اچھی نہیں۔

سہیلی: اے ہے۔ ابھی سے شیر افگنی دکھانے لگیں، میری جان۔ سُنا ہے کہ ظلِ الٰہی تمہارے اُن، کو بنگالے کا صوبے دار بنا رہے ہیں۔ ہے بھی تو ٹھیک ایسے جادوگر کے لیے تو بنگالے کی صوبے داری ہی مناسب ہے۔

مہر: تمہاری زبان تو کتر کتر چلتی ہی رہتی ہے۔

سہیلی: نہیں میری بنّو۔ آج تو نہیں رُکے گی میری زبان، مگر ایک بات بتاؤ گی؟

مہر: میں نہیں بتاتی کوئی بات وات۔ ہو گی کوئی اُلٹی سیدھی۔

سہیلی: ایمان سے کہنا اس شادی سے خوش تو ہو۔ دیکھو اپنی ماہ پیکر سے کچھ نہ چھپانا۔ وہ مینا بازار والا قصہ تو یاد نہیں آتا، صاحب عالم سے کچھ کہنا ہو تو چٹکی بجاتے میں سب انتظام کر دوں گی۔

مہر: نہیں ری۔ میں بہت خوش ہوں۔ وہ کوئی اور ہوں گی جو جھونپڑیوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتی ہوں گی۔

سہیلی: اخاہ، تو گویا جھونپڑیوں میں رہ رہی ہیں ہماری صوبے دارنی جی۔

مہر: میں ظلِ الٰہی کو کبھی دھوکہ نہیں دوں گی ماہ پیکر۔

سہیلی: کیسے ہیں تیرے "وہ"

مہر: میں کیا جانوں۔

سہیلی: تُو نے انھیں دیکھا تک نہیں۔

مہر: دیکھا تو ہے اک بار۔ وہ بھی بہت، دور سے۔

سہیلی: اب جی بھر کے دیکھ لینا شب عروسی کو (کھلکھلا کر ہنستی ہے)

پانچواں سین

(سات سال بعد)

(بنگال کے صوبے دار کا محل)

شیر افگن: مہرن۔آج ہماری شادی کی ساتویں سال گرہ ہے۔

مہرن: کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔

شیر افگن: سب کچھ بدل گیا۔شہنشاہ اکبر اعظم فردوس سدھارے۔دہلی کی سلطنت شہزادہ سلیم کے ہاتھ آئی۔ہم بردوان پہنچے۔کہاں اکبر آباد کہاں بردوان کی صوبے داری۔رہے نام اللہ کا!

مہرن: اچھا ایک بات پوچھوں۔

شیر افگن: ضرور

مہرن: تم اچانک شادی کے لیے راضی کیسے ہوگئے۔کیا کوئی اور لڑکی نظر میں نہ تھی۔

شیر افگن: سپاہی اپنا فرض پہچانتے ہیں مہرن۔

مہرن: تو گویا میں بھی ایک فرض تھی جس کا بوجھ ظلِ الٰہی کے کہنے سے تمہیں اُٹھانا پڑا۔

شیر افگن: (کچھ سوچتے ہوئے) ایک دوشیزہ تھی میری زندگی میں، ماہ طلعت۔اس سے شادی کا وعدہ بھی تھا مگر ظلِ الٰہی کے فرمان پر کسی کو قربان کردیا۔

مہرن: کس کو؟

شیر افگن: کسی کو نہیں۔

مہرن: تمہیں بتانا ہوگا۔کون تھا وہ جسے تم نے قربان کردیا۔

شیر افگن: کوئی نہیں۔وہ میری پرچھائیں تھی، میرا ہمزاد۔

میں جانتا تھا، صاحب عالم شہزادہ سلیم کی جوان نظریں اور احتیاط کی سرحدیں پار کر چکی ہیں۔میں جانتا تھا ظلِ الٰہی کو ایسے وفادار کی ضرورت ہے جو مہرن کو شہزادے کی نظروں سے دُور لے جانے کی ہمت کر سکے۔

مہرن: کیا ظلِ الٰہی نے یہ سب کچھ کہا تھا۔

شیر افگن: نہیں۔ مگر اُن کی خاموش نگاہوں اور دردمند دل نے سب کچھ کہہ ڈالا اور میں نے ایک وفادار سپاہی کی طرح شہنشاہ کے فرمان پر خود کو قربان کر دیا۔ شیر افگن جیت گیا اور علی قلی استانجلو قتل ہو گیا۔

مہر: اور ماہ طلعت؟

شیر افگن: وہ پاگل ہو گئی۔ آج بھی وہ محل سرا میں قلماقنوں کی حراست میں زندگی کاٹ رہی ہے۔

مہر: پاگل ہو گئی ہے؟!!

شیر افگن: ظلِ سبحانی سے وفاداری کی قیمت اسے ادا کرنی پڑی۔

مہر: مجھے اپنی قسمت پہ ناز ہے۔ میرا سرتاج مغلیہ سلطنت کے تاج کا سب سے قیمتی ہیرا ہے۔

شیر افگن: مجھے سرتاج نہ کہو، میرے سر پر تم تاج سے کہیں زیادہ آب و تاب سے چمک رہی ہو مہرن۔ (اچانک گھنٹے پر ضرب پڑتی ہے)

شیر افگن: اس وقت کون آ گیا۔

مہر: خدایا خیر!!

چھٹا سین

شیر افگن: کون؟

قطب الدین: قطب الدین اور اس کے ساتھی جو پایۂ تخت سے سرکش باغیوں کی سرکوبی کے لیے آئے ہیں۔

شیر افگن: مرحبا، خوش آمدید۔ آؤ بیٹھو۔ صوبے دار بنگالہ کی طرف سے تمہارا خیر مقدم ہے۔

قطب الدین: ہمیں باغیوں سے شناسائی مقصود نہیں۔

شیر افگن: صاف صاف بیان کرو۔

قطب الدین: شہنشاہ جہانگیر کا حکم ہے کہ مہر النسا بیگم کو دہلی روانہ کر دیا جائے۔

شیر افگن: خبردار، ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو اس کی سزا موت ہوگی۔

قطب الدین: موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنے والے بہادر گیدڑ بھبکیوں سے نہیں

ڈرتے۔

شیر افگن: تو تمہارا مقصد ہے۔ مقابلہ، جنگ، جدل؟

قطب الدین: فرمانِ شاہی ہے کہ مہر النسا بیگم کو شاہی حرم میں داخل کیا جائے۔ حکم عدولی بغاوت تصور کی جائے گی۔

شیر افگن: جھوٹ! غلط!! سرتا سر غلط!! یہ فرمانِ شاہی نہیں ہو سکتا۔ ایک ہوس پرست شہزادے کی آواز ہو سکتی ہے جو اپنے مضبوط ہاتھوں سے انصاف کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے۔

قطب الدین: ہمارے پاس بیکار بحث و مباحثہ کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ بنگالے کے صوبے دار کی بغاورت فرو کی جائے۔

شیر افگن: قطب الدین، شیر افگن جان دے سکتا ہے عزّت و ناموس کا سودا نہیں کر سکتا۔ ظلِ سبحانی اکبر اعظم کے دیئے ہوئے وعدے سے پھر نہیں سکتا۔

قطب الدین: (تلوار کھینچتے ہوئے) تو پھر مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

شیر افگن: تم مجھے اس تخت و تاج کے خلاف تلوار اُٹھانے پر مجبور کر رہے ہو جس کی بنیادیں میں نے اپنے خون سے استوار کی ہیں، جس کی خاطر میں نے اپنی زندگی کے بہترین ارمان قربان کیے ہیں، جس کے لیے میں نے اپنی زندگی نچھاور کی ہے۔

قطب الدین: تم باغی ہو اور بغاوت کی ایک ہی سزا ہے — موت؟!

شیر افگن: (نفرت کا قہقہہ) میں؟ باغی؟ کیا اپنی عزّت و ناموس کی حفاظت کرنے والا باغی ہوتا ہے؟ کیا شہزادوں کی بے جا دست در[illegible]ی سے غریبوں کی عزّت اور عصمت بچانے کا نام بغاوت ہے؟ (قہقہہ) ہاں میں باغی ہوں۔ کہہ دو اپنے شہنشاہ جہانگیر سے مغل سلطنت کی بنیادوں کو اپنے خون سے سیراب کرنے والا شیر افگن آج سے باغی ہے۔ اس ہوس پرست بادشاہ سے کہہ دو آج سے بنگالے پر صرف انصاف کا راج ہوگا۔ ہوس کی شاہی ختم ہوئی۔ یہاں غریبوں کی حکومت ہے۔ عوام کی عزّت ہے۔

قطب الدین: علی قلی استاجلو، یاد رکھو تم ایک معمولی سفرچی تھے جسے اس مغل بادشاہ کی نگاہ التفات نے صوبے دار بنا دیا۔ بغاوت اور نمک حرامی کا انجام تباہی ہے۔

شیر افگن: خاموش نمک حرام کتے۔ مجھے نمک حلالی کا سبق پڑھانے چلا ہے۔ شہنشاہ سے کس نے بغاوت کی تھی، سلیم نے یا میں نے، اور اُس بغاوت میں سلیم کا ساتھ کس نے دیا تھا، تُو یا میں نے؟!

قطب الدین: خبردار، زبان کو لگام دو، میری تلوار نیام میں بے قرار ہو رہی ہے۔ (تلوار نکالتا ہے)

شیر افگن: شیر افگن کو تلوار سے ڈراتا ہے۔ لے میری تلوار کا وار اسنبھال۔ (تلوار اُٹھا کر حملہ آوار ہوتا ہے۔ دونوں تلواروں سے لڑنے لگتے ہیں۔)

قطب الدین: (زخمی ہو کر گرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے) آہ...... ساتھیو۔ جانے نہ پائے۔ اسے تلواروں پر رکھ لو (تھوڑی دیر تلواروں کا مقابلہ جاری رہتا ہے۔ آخر کار سب کے ٹوٹ پڑنے شیر افگن زخمی ہو کر گرتا ہے)

شیر افگن: موت کا پیغام آ گیا۔

ظلِ الٰہی اکبر اعظم، مجھے معاف کرنا۔

مجھے آپ کی امانت کی حفاظت میں مغلیہ سلطنت کے خلاف تلوار اُٹھانی پڑی...... گواہ رہنا میں نے آخری سانس تک آپ کی امانت ...... کی حفاظت کی ہے......

مہرن،...... خدا حافظ!

(ماتمی موسیقی فضا پر طاری ہو جاتی ہے)

☆☆☆

آزاد بر باد

(۱۸۳۰/۲۹/۲۷ء — ۱۹۱۰ء)

جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے پھولوں کا تاج سجایا، جن کی خوشبو شہرتِ عام بن کر جہان میں پھیلی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کھلاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ نثر کے اسلوبِ خاص کا سکّہ اس کے نام پر ڈھالا گیا ایسا کہ گویا اس پر اُردو نثر نگاری کا ایک دور ختم ہوا۔ لسانیات کی پہل اسی کے قلم سے ہوئی۔ نظم نگاری کا رواج اس کے دم قدم کا ظہور ہے، اور تمثیل و تاریخ دونوں شعبے اس کی کاوشوں سے پھلے پھولے۔

لفظوں کے اس جادوگر کا نام تھا — محمد حسین تخلص آزاد

کچھ حال آزاد کا خو آزاد کی زبانی —

اعلان:

محمد حسین آزاد: میں محمد حسین، تخلص آزاد۔ جو کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا اور کچھ نہ کہوں گا۔ میں بیٹا مولوی محمد باقر مرحوم کا ہوں جو پہلے دہلی کالج میں مدرس تھے، پھر کلکٹری میں واصل باقی نویس تھے۔ نائب سرشتہ دار، منصرم، سرشتہ دار بندوبست، سپرنٹنڈنٹ مال اور تحصیل دار رہے مگر یہ سب عہدے انھیں پسند نہیں آئے اور آخر دلّی اردو اخبار نکالا اور اس کے مدیر ہوئے۔ اخبار ۱۸۳۶ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔

کشمیری دروازے کے پاس کھڑکی ابراہیم خاں کے نزدیک رہتے تھے۔ یہیں دہلی کے

پرنسپل ٹیلر کے مشورے سے انھوں نے نیلام گھر بنوایا تھا جہاں ہر ہفتے مال نیلام کیا جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ ۱۸۵۷ء آیا تو دہلی میں فرنگی حکومت کے خلاف طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ انگریز جہاں بھی نظر آتے تھے بے محابا قتل کیے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں دلّی کالج کا ایک انگریز اُستاد ٹیلر خود میرے والد کے گھر آکر چُھپ گیا۔ اس کی خبر چھپائے نہ چھپی اور ہمارے گھر کو گھیر لیا گیا۔

(مجمع کا شور وغوغا)

مجمع کی آوازیں: فرنگی کو نکالو۔

مجمع کی آوازیں: فرنگی کو ہمارے سُپرد کرو۔

مجمع کی آوازیں: فرنگی کو پناہ دینے والا مجرم ہے۔

مجمع کی آوازیں: فرنگی کو ہمارے سُپرد کرو۔

مولوی محمد باقر: بھائیو! یہ کیا جنون تمہارے اُوپر طاری ہے۔ ذرا سوچو، ذرا غور کرو۔ (وہی نعرے)

مولوی محمد باقر: ہر فرنگی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ (وہی نعرے)

مولوی محمد باقر: فرنگی حکومت سے تمہاری لڑائی ہے سو اس سے لڑو۔ ہر فرنگی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔

مگر اس شور غوغا کے دوران مسٹر ٹیلر، جو دلّی کالج میں اُستاد تھے، خود باہر نکل آئے اور پچھتّر ہزار کے نوٹ اور ایک خط فرنگی سرکار کے نام ان کے حوالے کیا اور خود مجمع کے بیچ جا پہنچے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ٹیلر جس کا دو لاکھ سے زیادہ روپیہ کلکتے اور دہلی کے بینکوں میں جمع تھا اور جو صرف ڈیڑھ آنہ چار پیسے روزانہ اپنے اوپر خرچ کرتا تھا اس کی لاش برہنہ خاک وخون میں لتھڑی پڑی تھی۔ منہ پر خاک ملی ہوئی تھی اور دو ایک کپڑے جو تن پر تھے وہ وہی فقیرانہ تھے۔

جب ہنگامہ ختم ہوا اور فرنگیوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرلیا تو آغا محمد باقر ٹیلر کے دیے ہوئے کاغذات لے کر انگریز حاکم ہڈسن کے پاس پہنچے۔ اس نے وہ کاغذ دیکھے، ان پر لکھا تھا، اس شخص نے مجھے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بس یہ پڑھتے ہی غصے سے

آگ بگولا ہو گیا اور گرفتار کر کے گولی مار دینے کا حکم دیا۔

اس خبر سے مجھ پر بے قراری کا عالم طاری تھا۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور کسی کی جان محفوظ نہیں رہی تھی۔ والد سے ملنے کی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ آخر والد کے ایک پرانے دوست کا خیال آیا۔ سِکھ جرنیل تھے اور انگریزوں کی فوج میں تھے۔ ان کے پاس پہنچا۔

سِکھ جرنیل: کیسے آنا ہوا؟

آزاد: صرف ایک جھلک ابا جان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان سے آخری ملاقات (رو پڑتے ہیں)

سِکھ جرنیل: بہت مشکل ہے۔

آزاد: مگر آپ تو ان کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔

سکھ جرنیل: خاموش! (سوچتے ہوئے) صرف ایک تدبیر ہے۔ میں کل قیدیوں کے معائنے کو دہلی دروازے کے باہر میدان میں گھوڑے پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ تم سائیس کے کپڑے پہن کر میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہنا۔ یہی ایک صورت ہے، بس اب جاؤ۔ کل ہم وہاں ملیں گے۔

اور یہی ہوا۔ میں سائیس کے کپڑے پہنے سِکھ جرنیل کے گھوڑے کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اسی طرح ہم قیدیوں تک پہنچے۔ کوئی بھوک سے رو رہا تھا، کوئی رنج و غم سے بدحال تھا۔ ایک کونے میں ستر سال کے میرے والد عبادت میں مشغول تھے۔ آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا کہ ان کا لاڈلا سائیس کے لباس میں کھڑا ہے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ بس اب رخصت۔ آخری ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور میں اسی طرح سردار صاحب کے گھوڑے کے پیچھے دوڑتا چلا آیا۔ لاکھ ضبط کیا مگر نہ ہو سکا۔ آنسو نہ روک پایا۔

گھر پہنچا تو منظر ہی دوسرا تھا۔ بائیس آدمیوں کا کنبہ تھا۔ فتح یاب لشکر کے سپاہی گھر میں گھس آئے۔

سپاہی: گھر خالی کرو، گولہ باری شروع ہونے والی ہے۔

دوسرا سپاہی: ایک ایک آدمی گھر سے باہر چلا جائے۔

آزاد: مگر کہاں جائیں؟

سپاہی: جاؤ۔ جہاں سینگ سمائے چلے جاؤ۔ جلدی نکلو، نہیں تو گولی سے اُڑا دیئے جاؤ گے۔

(ایک گولہ آکر گرتا ہے)

آزاد: دنیا آنکھوں میں آندھیر تھی۔ بھرا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ اُستاد ذوق کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی۔ خیال آیا کہ محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آکر کہیں گے! اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں۔ وہی جنگ اُٹھا کر بغل میں مارا اور سجے سجائے گھر کو چھوڑ بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔

(غم ناک موسیقی کی لہر)

گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ حضرتِ آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلّی بھی ایک بہشت ہے اور میں آدم کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیسے نہ نکلتا۔ عورتوں کے ٹھہرانے کا انتظام کیا اور تن بہ تقدیر پر خود سفر پر نکل پڑا۔ پہلا پڑاؤ تھا لکھنؤ۔ یہاں پہلے ایک امام باڑے میں پہنچا، وہاں مجلس ہو رہی تھی اور میر انیس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔

میر انیس: (مرثیہ پڑھ رہے ہیں)

اس تکلف سے وہ لیلائے ظفر راہ چلی
گہ بڑھی، گاہ مُڑی، گاہ رُکی، گاہ چلی

(حاضرین کی داد تحسین اور آہ بُکا کی آواز سنائی دیتی ہے)

میں بھی اس مجمع میں شامل ہو گیا۔ مجلس ختم ہونے پر میر انیس سے ملنے گیا۔ سلام کیا۔ انھوں نے حال احوال پوچھا، کیا بتاتا۔ ہاں ان سے پوچھا کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میرؔ کے بعد دلّی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے۔ اتنے میں دیکھتا کیا ہوں کہ جس کی مجھے تلاش تھی وہی خود چلے آتے ہیں، یعنی

مولوی رجب علی خاں ارسطو جاہ کے دونوں صاحبزادے کہ ان ہی سے ملنے کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا تھا۔ خود ارسطو جاہ انگریزی حکومت کے بڑے وفادار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں جاسوسی کرنے کے لیے انھیں انعام میں جاگیر بھی ملی تھی۔ ان کی تلاش ہی میں یہاں آیا تھا کہ روزگار اور سرکار سے معافی کی کوئی صورت نکلے گی۔

وہ: آزاد۔ تم یہاں کہاں؟

آزاد: آپ کو تو سب کچھ معلوم ہوا ہوگا۔

وہ: کیا ہوا؟

آزاد: میرے والد کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ گھر بار لُٹ گیا، اب کوئی نہ روزگار کا ٹھکانہ رہا، نہ رہنے کا۔

وہ: ارسطو جاہ کے نام خط لکھتا ہوں۔ اسے لے کر آج ہی روانہ ہو جاؤ۔

آزاد: آج ہی؟

وہ: ہاں۔ تمھیں معلوم نہیں، تمہاری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ گرفتاری کے لیے پانچ سو روپیہ انعام بھی مقرر ہوا ہے۔ آج ہی چلے جاؤ — خدا حافظ!

(موسیقی کی ایک دُھن)

میں پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ جی میں سوچا اب ارسطو جاہ رجب علی خاں سے ملنے کی کوشش کی تو ممکن ہے کہ راستے ہی میں گرفتار ہو جاؤں۔ لکھنؤ سے سیدھا مدراس پہنچا۔ یہاں نام اور لباس بدلا اور نیل گری ملٹری اسکول میں ماسٹر ہو گیا۔ وہاں سے پھر بمبئی چلا گیا۔ وہاں زرتشتیوں کے عبادت خانوں میں رہا۔ ان کے مذہبی صحیفے اور قدیم فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ ویدوں سے ملا اور ان کی زبان سیکھی۔ پھر مالوے کا رُخ کیا اور سنگرور اور جِند میں نوکری کی۔ یہ دونوں سِکھ سردار کی ریاستیں تھیں اور دونوں کے نام مجھے اس نیک دل سِکھ جرنیل نے خط میں لکھ کر دیئے تھے جس کی بدولت میں اپنے باپ کا آخری دیدار کر سکا تھا، میں مہاراجہ جِند کے دربار میں پہنچا اور مہاراجہ رقص و سرود کی محفل میں تھے — رقاصہ غزل گا رہی تھی۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے　　اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے　　پھر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ　　تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

(لوگ داد دیتے ہیں)

(آزاد رونے لگتے ہیں)

راجہ صاحب: یہ کون ہے جو غزل سُن کر رو پڑا۔

آزاد: بندہ حاضری کی اجازت چاہتا ہے۔

راجہ صاحب: بندہ کو محمد حسین کہتے ہیں۔ آزاد تخلص ہے۔ دہلی سے حاضر ہوا ہوں۔ استاد ذوق کا شاگرد ہوں۔ اُستاد کا کلام سُن کر رونا آ گیا۔

راجہ صاحب: یہاں کیوں آئے ہو؟

آزاد: سردار کرنیل سنگھ نے سفارشی خط دے کر آپ کے پاس بھیجا تھا۔

راجہ صاحب: تمہیں ملازم رکھا جاتا ہے۔ تنخواہ طے ہوتی رہے گی۔

اسی طرح چند اور دوسری ریاستوں میں نوکری کرتا رہا۔ وہاں کے راجاؤں کے قصیدے لکھتے رہا۔ مگر ابھی تک رجب علی خاں کی خدمت میں ان کے لڑکوں کے خط لے کر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خیال آیا کہ رجب علی خاں صاحب کے لڑکوں نے جو خط دیا تھا اس سے کام لوں۔ ڈر بھی لگتا تھا کہ ممکن ہے ان تک پہنچنے سے پہلے ہی کہیں پکڑا نہ جاؤں۔ وارنٹ کا خوف بھی دل میں بیٹھا تھا، مگر گرفتاری کے وارنٹ سے نجات پانے کا بھی یہی ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ تن بہ تقدیر لاہور کا سفر اختیار کیا۔ یہیں قریب پانی پت میں اپنے خاندان والوں کے رہنے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ ان کی بھی یاد بہت آتی تھی۔ قریب ہی سیالکوٹ تھا جہاں میرا بھائی پوسٹ ماسٹر تھا۔ یہاں کچھ مہینے ڈیڈ لیٹر آفس میں کام کیا، پھر لدھیانہ پہنچا۔ تلاش تو تھی رجب علی شاہ کی مگر وہ کبھی کبھی ہی وہاں آتے تھے۔ البتہ ان کے پریس میں کاتب کی جگہ خالی تھی اس پر میرا تقرر ہو گیا اور اچانک ایک دن ــــ

رجب علی شاہ: آج چھاپہ خانے میں ایسا سناٹا کیوں؟

محمد حسین آزاد: آج چھٹی کا دن ہے۔سب لوگ اپنے گھر آرام کر رہے ہیں۔

رجب علی شاہ: اور تم کیوں نہیں گئے۔

محمد حسین آزاد: میرے گھر پر بھی کوئی نہیں ہے۔یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔پھر مجھے ذرا کچھ کام بھی تھا۔

رجب علی شاہ: کیا کام تھا تمہیں؟

محمد حسین آزاد: اپنے اُستاد اور اپنے والد مولوی محمد باقر مرحوم کے دوست شیخ ابراہیم ذوق کا کلام نقل کرنا ہے۔

رجب علی شاہ: ارے تو تم محمد حسین ہو۔ہمیں نہیں پہچانتے۔رجب علی شاہ

محمد حسین آزاد: میں تو ڈرتا تھا کہ شاید آپ نہ پہچانیں۔آپ کے لیے تو یہ خط لیے مدتوں سے راہ بھٹک رہا ہوں۔

رجب علی شاہ: کس کا دیا ہے۔

محمد حسین آزاد: آپ کے صاحبزادگان نے لکھنؤ میں دیا تھا۔

رجب علی شاہ: (خط پڑھتا ہے) تمہارے والد اور دلّی کالج کے ہمارے اوپر بڑے احسان ہیں۔تم فکر نہ کرو۔ہم تمہیں معافی دِلوائیں گے اور وارنٹ بھی خارج ہو جائے گا، مگر ابھی اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔

میرا خط لے کر لاہور چلے جاؤ۔نوکری مل جائے گی۔میری ہدایات کا انتظار کرو۔

(Fade Out)

لاہور چلا آیا۔نوکری بھی مل گئی۔۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچا۔پنڈت من پھول میر منشی لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی سفارش پر محکمہ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔میجر فلرڈ ڈائریکٹر تھے اور بڑے علم دوست تھے اور ماسٹر پیارے لال آشوب کے دوست تھے۔ان ہی کے کہنے پر مجھے ملازم رکھا گیا۔

ادھر خاموشی سے رجب علی شاہ کی کوششیں جاری تھیں۔ایک مخبر محمد علی نے فرنگی حکومت

سے میری شکایت بھی کی۔ میرے والد کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی کہ وہ انگریز حکومت کے وفادار نہ تھے، مگر رجب علی شاہ ہی کی سعی و سفارش سے میرے حق میں فیصلہ ہوا۔

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ اسی سلسلے میں یقین و اعتماد حاصل کرنے کے لیے مجھے افغانستان کے سفر پر بھیجا گیا۔ من پھول اس وفد کے سربراہ تھے اور گویا میری نگرانی پر بھی مقرر کیے گئے تھے، میں ایک طالب علم کا بھیس بنا کر افغانستان کے شمالی حصے تک پہنچا جہاں اس زمانے میں روسی حکومت کی سرگرمیاں جاری تھیں، جو برطانیہ کے مقابلے میں افغان حکومت کی ہمدردیاں حاصل کرنا بلکہ ہو سکے تو اس علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ نیت کسی کی کچھ بھی کیوں نہ ہو مجھے اس جاں کاہ سفر کا ایک قصہ ابھی تک یاد ہے۔

بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر ہمارا قافلہ اُترا۔ یہاں کے لوگ ہمارے ملک کے آدمیوں سے بڑے شوق سے ملتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ایک ترک بچہ طالب علم میرے بستر پر آ بیٹھا۔ دو تنگے میرے ہاتھ میں تھے۔ اس نے پوچھا تمہارے ملک میں یہ تنگہ (سکہ) چلتا ہے۔ برابر سے ایک افغان بولا، 'ہندوستان میں روپیہ چلتا ہے۔ اسے کلدار کہتے ہیں۔' وہ بولا، 'اسی لیے اسے کلدار کہتے ہیں کہ اس پر بادشاہ کا کلہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔' خوب سمجھا مگر غلط۔

اسی طرح بھٹکتا بھٹکتا ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۷ء تک اس علاقہ میں رہا۔ واپسی پر کلکتہ گیا، یہاں جا کر سفر کا سارا حال ارباب اختیار کے گوش گزار کیا۔ اس کے بعد انجمن پنجاب کا سکریٹری مقرر کیا گیا اور انجمن کے رسالہ کے ایڈیٹر اور اس کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کا کام بھی میرے سپرد ہوا۔ محکمہ تعلیم کے ماتحت ایسے مشاعرے رائج کیے جن میں عام مشاعروں کی طرح مصرع طرح کے بجائے موضوع یا عنوان دیا جاتا تھا اور عنوان پر تمام شعرا نظم لکھ کر لاتے تھے۔ یہ گویا اُردو میں نظم نگاری کی شروعات تھی اور صرف ان شاعروں ہی سے اس نئی صنف کا آغاز ہوا۔ حبِ وطن پر ہماری نظم اور حالی کی نظم بہت پسند کی گئی۔ میری نظم کے اشعار تھے:

حبِ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے نکلے جو گُل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حبِّ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

حبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش یادِ وطن میں ہووے گہے جوش گہ خروش

حبِّ وطن ہے جلوہ اسی نورِ پاک کا روشن اُسی کے نور سے عالم ہے خاک کا

یہ ہنگامے اور مشاعرے بلکہ نظم کی نشستیں ختم ہوئیں تو طبیعت پھر تصانیف و تالیف کی طرف راغب آئی اور آبِ حیات اور نیرنگِ خیال دو کتابیں لکھیں۔ آبِ حیات اُردو شاعری کی پہلی تاریخ بن گئی، گو یہ تھی محض میری یادداشت۔ جو کچھ دیکھا اور سُنا تھا وہی جوں کا توں لکھ دیا۔

دیکھنا وہ لالٹین جگمگانے لگی، اُٹھو اُٹھو استقبال کر کے لاؤ اس مشاعرے میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کا دیدار ہماری آنکھوں کا سُرمہ ہو۔ اس میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین و آئین سمجھا۔ یہ اُن کے باغوں میں پھریں گے۔ پُرانی شاخیں، زرد پتے کاٹیں گے، چھانٹیں گے اور نئے رنگ، نئے ڈھنگ کے گل دستے بنا بنا کر گُل دانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دُخان سے ایجاد کی ہوائیں اُڑائیں گے اور بُرجِ آتش بازی کی طرح اس سے رُتبۂ عالی پائیں گے۔

انشا کا حال ذرا دیکھیے۔

وہ شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پیکیوں کا توبڑا ڈالے ایک گگڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمبا کو نکالا اور اپنی چلم پر سُلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ پھر بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیک کہہ کر چلے گئے۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم طاری رہا۔

پھر ذرا نیرنگِ خیال کا عالم دیکھیے، خیال کیا کیا نیرنگ دکھاتا تھا۔ مدّتوں دیکھتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ ان تمثیلوں کو کیوں نہ مضمون کا رنگ دے کر محفوظ کر لوں۔ پوری کتاب بن گئی، گو رنگ برنگے منظر ہیں، مگر لطف سے خالی نہیں۔ ایک جگہ ذرا قدم آگے بڑھا کہ شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار سجایا ہے۔ ایک نظر جہاں گیر اور نور جہاں کی اس دربار میں آمد کی شان دیکھیے:

'اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور، نشے میں چُور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ جدھر چاہتی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا اسی کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذ کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا، یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھیں کھلتیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔

غرض ادب اور تاریخ کی انہی سچائیوں کو سجا بنا کر پیش کرتا رہا جن پر زمانہ دُھول ڈال رہا تھا اور گرد جمتی جا رہی تھی۔ اس میں دربارِ اکبری کی وہ تصویریں تھیں جنہیں بڑی محنت سے میں نے اُجالا اور سنوارا تھا۔ اسے تاریخ نویسی کیونکر کہیے یہ تو صرف ماضی کی شاندار روایتوں کو زمانے کی

گرد برد سے بچانے کی کوشش تھی۔ یہ تاریخ نہیں تھی، پُرانی شان وشوکت کے وہ قصے تھے جنہیں قوم میں عزّتِ نفس اُبھارنے کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر دُہرایا گیا تھا۔ ہمارے پُرکھوں میں شہنشاہ اکبر ہی نہیں تھے، خانِ خاناں جیسے عالم اور شاعر بھی تھے کہ رحمٰن تخلص کرتے تھے۔ ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ بھی تھے۔ اسی کے ساتھ ایک رنگ یہ بھی ہے:

'خانِ خاناں نے جشنِ جمشیدی ترتیب دیا۔ لشکر کے باہر ایک بڑا اور بلند چبوترا تیار کرا کے سراپردہ شاہانہ قائم کیا۔ بہت دور تک سڑک کی داغ بیل ڈالی۔ دونوں طرف صفیں باندھ کر بادشاہی فوجیں بڑی شان سے کھڑی ہوئیں۔ اندر بہادر سپاہی دائیں بائیں اور پس وپیش کھڑے ہوئے......
داؤد نے بیٹھتے ہی تلوار کمر سے کھول کر خانِ خاناں کے سامنے دھر دی۔ خانِ خاناں نے تلوار اُٹھا کر اپنے نوکر کو دے دی، اس کا ہاتھ پکڑا، برابر تکیے سے لگا کر بٹھایا، بزرگانہ اور مشفقانہ طور سے مزاج پُرس اور باتیں کرنے لگا۔
دسترخوان آیا، رنگا رنگ کے شربت، مزے مزے کے مٹھائیاں چُنی گئیں۔ خانِ خاناں خود ایک ایک چیز پر اس کی صلاح کرتا تھا۔ میووں کی طشتریاں اور مربّوں کی پیالیاں آگے بڑھاتا تھا۔ نورِ چشم باباجان اور فرزند کہہ کر باتیں کرتا تھا۔ دسترخوان اُٹھا، پان کھائے۔'

یہ تو فقط ایک جھلک تھی۔ یوں تو پوری کتاب دربارِ اکبری زندہ عجائب گھر ہے جہاں پُرانی دیواریں تک بولتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ان آوازوں کو سُننے سمجھنے کی تاب کسے ہے۔ دنیا کا تو یہ حال ہے کی رات گئی بات گئی، جو گزر گیا اُسے بُھلا دیا، جو سامنے آیا اُسے آنکھوں سے لگایا۔ وہ بھی ایسے کہ اچھے اور بُرے کی تمیز جاتی رہی۔ ایسے میں کوئی گزرے دنوں کو آئینہ دکھائے تو گناہ گار ٹھہرے۔

یہی کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا تھا، ان دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سب سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصانیف میں میرا داہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور تصنیفات کا قلم دان اُلٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوش مندوں کو جنون کا شبہ ہوگیا۔ پٹیالے اور

لاہور میں اس کا چرچا بھی ہوا۔ ہم نے تو سوچا کام اور دُکھ کا بوجھ حد سے زیادہ ہوا۔ حکام سے چھٹی لو اور ایک مدّت سے جو ارمان سینے سے لگا رکھا تھا ایران کے سفر کا، اسے پورا کرلو۔ یہی کیا۔ سب کام سے چھٹی لے کر ایران کی سیر کرلو۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے پھر موقع ملے یا نہ ملے۔

ایک جگہ دو شخص بازار میں ملے اور یہی سوال کیا کہ کہاں سے آئے ہو؟

آزاد: از ہند آمدہ ام۔ باز بہ ہندمی رَوَم۔ (ہندوستان سے آیا ہوں وہیں واپس جاؤں گا)

وہ: چرا آمدی۔ (کیسے آئے)

آزاد: آ، بگو، چرامی پرسی (تم بتاؤ، کیوں پوچھتے ہو)

وہ: نمید انی، ما می توانیم ترا بگیریم و پیش امیر صاحب بریم۔ تو جاسوسِ فرنگ ہستی۔ (تم نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں۔ تجھے حاکم کے سامنے لے جائیں گے۔ تو فرنگیوں کا جاسوس ہے)

آزاد: خیلے خوب، ما می گوئیم امیر صاحب مسافر ستیم (بہت خوب ہم تو امیر صاحب سے کہہ دیں گے کہ مسافر ہیں)

وہ: برو۔ برو۔ بابا برو (جاؤ۔ بابا جاؤ)

اس سفر میں ایران کے شاعروں، صوفیوں اور بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کی، نادر شاہ کی قبر بھی دیکھی۔ مولانا جامی کے مزار پر فاتحہ پڑھی، غرض طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاتا اور زحمتوں سے شادکام ہوتا واپس لاہور پہنچا۔ یہاں سال بھر بعد ہی ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ لڑکے آغا محمد ابراہیم کی شادی کی۔ ۱۸۹۲ء میں پچاس روپے پنشن مقرر ہوئی اور گھر آبیٹھا۔

پھر لوگ کہنے لگے، آزاد پاگل ہو گیا ہے۔ ہاں، ہمارے سامنے غم والم کے سائے اُبھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نئی دنیا جھانک رہی تھی۔ اس میں ایک کھڑکی سے میری مرحوم بیٹی، پیاری بیٹی اُمتہ السکینہ بیگم جھانک رہی تھی پھر وہ خواب میں بھی دکھائی دی، اور بہت کچھ دکھائی دیا۔ سیّد دھیان شاہ یہاں لاہور میں بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اُنھوں نے کہا، جا دہلی چلا جا۔ پیدل دہلی چلا آیا۔ ذکاءاللہ کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ میرا یارِ غار تھا، پُرانا ملنے والا تھا مگر اس ظالم

نے بھی مجھے پاگل قرار دے کر رُخصت کیا (ہنستے ہیں)۔ وہاں سے علی گڑھ چلا گیا۔ سیّد احمد خاں کے گھر پہنچا۔ اُنھوں نے بھی اوّل تو بڑا اخلوص دکھایا، سینے سے لگایا۔ پھر پاگل قرار دے کر رُخصت کرایا (ہنستے ہیں)۔ پھر لاہور لوٹ آیا۔ یہاں پُرانے امام باڑے میں بیٹھا اپنی جوتیاں کاٹ رہا ہوں۔ لوگ اسے پاگل پن کہتے ہیں (ہنستے ہیں)۔ میں اب محمد حسین آزاد نہیں رہا، جے چند کا اوتار ہوں۔ وہی جے چند جو پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں دہلی کا راجا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہے سب کچھ۔ اس کا انجام میری موت، سووہ ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء مقرر ہے......ایک پاگل کی موت!

ہماری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

☆☆☆

اردو کی کہانی

سین۔۱

(ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ ساتھ ڈھول تھالی بجانے کی آواز۔)

(ہولی کے متوالے جلوس کی شکل میں ناچتے گاتے، رنگ اور عبیر اُڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔)

کیا سوانگ کہوں کیا رنگ کہوں
کیا حسن بتاؤں ہولی کا
سب ابرن تن پر جھمک رہا
اور کیسر کا ماتھا ٹیکا
ہنس دینا ہر دم ناز بھرا
دکھلانا سج دھج شوخی کا
ہر گالی مصری بند بھری
ہر ایک قدم ہٹھ کھیلی کا
دلشاد کیا اور موہ لیا
یہ جو بن پایا ہولی ہیں
ہولی ہے، ہولی ہے

(آواز ختم ہوتی ہے)

سین۔۲

اندھیرے میں اذان کی آواز اُبھرتی ہے۔ ہندو مسلمان چل رہے ہیں، اور بہت سی

آوازوں کا شور۔ مصافحہ کر رہے ہیں، بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔

۱۔ عید مبارک، ارشاد میاں

۲۔ آپ کو بھی عید مبارک ہو، ماتھر صاحب

۳۔ حمید، اب کی تو بہت گرمی رہی روزے تو مشکل سے کٹے ہوں گے؟

۴۔ سب خدا توفیق دیتا ہے، شرما صاحب

(آواز ختم)

سین ۔۳ دیوالی

چٹائی کے پٹاخوں کی آوازیں،
دیوالی کے پٹاخوں کی آوازیں،
پھول جھڑی کی آواز کے ساتھ
آرتی سُنائی دیتی ہے، گھنٹی بجتی۔
لڑکیوں کی ہنسنے کی آوازیں۔

میاں بیوی ایک کونے میں آرتی اُتار رہے ہیں۔
بچے پھول جھڑی جلا رہے ہیں۔
بڑے لوگ راکٹ اور انار جلا رہے ہیں

سین ۔۴ بھنگڑا سین

ڈھول پیٹنے کی آواز:
اوہوں، اوہوں، اوہوں۔

چھ سات آدمی بھنگڑا کر رہے ہیں۔

سین ۔۵ بھارت کی کمنٹری

میں بھارت ہوں، میرے دامن کے سائے میں ہزاروں

سنسکرتیاں اور تہذیبیں پلیں، بڑھیں اور پروان
چڑھتی ہیں۔ دور پاس کے ملکوں سے بھولے بھٹکے
مسافروں، تاجروں، صوفیوں کو میں نے اپنے آغوش
میں جگہ دی۔ میری گود میں سینکڑوں بولیوں،
زبانوں اور بھاشاؤں نے پرورش پائی، جن میں سے نہ جانے کتنی وقت کے تیز دھارے
کے ساتھ بہہ گئیں۔ جو بچیں اُن میں میری ایک چہیتی
من چاہی بچّی ہے، جو میری ہی دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہوئی،
عظیم بھارت کی چوحدّی میں شمال سے جنوب اور مشرق
سے مغرب تک کے ہر باسی کے دل میں بس گئی۔
ہر علاقے، ہر قوم، ہر مذہب اور ملّت کے لوگوں کے دُکھ
سُکھ، رنج و خوشی، شادی بیاہ۔ تیج تہوار میں شامل رہی،
ان پر جب جب مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا یہ سینہ سپر ہو کر
خود سامنے آئی۔
یوں تو اس کا جنم ایک ہزار سال پہلے ہوا، لیکن اس کے
پُرکھوں کی سنتان کئی ہزار برس پہلے اس دیش میں
چارہ گاہوں کی تلاش میں آئی تھی۔
(آواز ختم ہوتی ہے)

سین۔۶ آریہ

سنکھ، گھنٹیوں، منتر کی آوازیں
گائتری کے بول
آواز ختم ہوتی ہے۔

لمبے تڑنگے قد کے مرد، عورتیں، بکریاں
گائے، کتے، خچر وغیرہ کے قافلے۔
پہاڑیوں سے اُترتے نظر آتے ہیں۔

سین۔۷ فارسی

اب سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے
ایران، افغانستان، ترکستان، وسطی ایشیا کے
دوسرے ملکوں سے آنے والے ہندوستان
آتے رہے۔ ان میں بیوپاری بھی تھے

کچھ تاجر گھوڑوں اور اپنے کندھوں پر سامان
لیے نظر آتے ہیں۔

(ایرانی موسیقی کی ڈھنیں اُبھرتی ہیں۔ خچر گھوڑوں کی آوازیں۔)

سین۔۸ تُرکی تاجروں کا قافلہ

تُرکی دُھن اُبھرتی ہے
(آواز ختم ہوتی ہے)

سین۔۹ بازار

کمنٹری: یہ قافلے بازاروں میں اپنا مال
بیچتے۔ یہاں کے رہنے والوں
کی بولی ان کی سمجھ میں نہ
آتی۔ ہاٹ میں مختلف بولیاں
مرچ مسالہ، لونگ بادام،
سیب انگور، چلغوزہ، میوے،
قابلِ عقیق، ہیرے موتی، دہی
وغیرہ کی آوازیں ملی ہیں۔

الگ الگ قوموں کے لوگ
جن میں ہندوستانی بھی شامل
ہیں اپنے اپنے سامان
آوازیں لگا لگا کر بیچ رہے
ہیں۔ ایرانی اور تُرکی
جھگڑتے نظر آتے ہیں۔
ہندوستانی سوال کرتا ہے اور
بیچ بچاؤ کرتا ہے لوگ جمع
ہوجاتے ہیں..........

ایرانی: آغائے من، غوغا نمی کنی۔ غوغا
ستنِ شما، صدائے راگ است

ترکی: تراترک بخشاد غالیچہ، کو چک ہنم

ہندو: اوم وسترم، شیوم

ایرانی: زبانِ یار من تُرکی و من تُرکی نمی دانم (زوروں کا قہقہہ)

تُرکی: صندوقچے کو چکی بندوقچی، قرابین بتچہ۔

ایک بچی بھیڑ میں سے نمودار ہوتی ہے۔ تُرکی اسے گود میں اٹھالیتا ہے۔ بچی اس کے کان میں کچھ کہتی ہے۔

(اس کی کانا پھوسی سُن کر تُرکی زور سے ہنستا ہے)

ایرانی بھی اس کی کانا پھوسی سُن کر زور سے ہنستا ہے

بچی تُرکی کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ ایران اسے گود میں اُٹھاتا ہے۔ پھر اس کے کان میں کچھ کہتی ہے۔

ہندوستانی: تمہارا نام؟

بچی: اردو (ایکو)

تُرکی: وطن

بچی: ہندوستان (میوزک)

چشتی نے جس زمیں پر وحدت کا گیت گایا
نانک نے جس زمیں پر پیغام حق سُنایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(آواز ختم ہوتی ہے)

سین۔۱۰ کمنٹری

عرب، تُرک، افغانی، ایرانی، صوفی سنتوں نے ہماری زبانیں سیکھیں اور ایک بلوان زبان بولنے لگے۔ ان صوفی سنتوں کی خانقاہوں سے میری آواز گونجنے لگی۔

(آواز ختم ہوتی ہے)

زحالِ مسکیں مکن تغافل
خانقاہ میں صوفیوں کے استغراق کا منظر

بہ سائے نینا، بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں
نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

سین۔۱۱

کمنٹری: امیر خسرو نے کہانیاں اور پہیلیاں لکھیں اور خالق باری منظوم کی۔ جھولے اور پنگھٹ کے گیت لکھے۔

(آواز ختم ہوتی ہے)

سین۔۱۲ قوالی

(پنگھٹ پر ایک لڑکی گاتی ہے)

بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی
کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی
خسرو نظام کے بل بل جیئے
لاج رکھو مورے گھونگھٹ پٹ کی

سین۔۱۳

جھولے پر بیٹھی ایک لڑکی جھول رہی ہے۔ کچھ لڑکیاں ارد گرد جمع ہیں۔ ایک لڑکی نقل کرتی جاتی ہے بچے اور بوڑھے کی۔

اماں میرے بیرن کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بیرن تو بالا ری (ہنسی) کہ ساون آیا۔
اماں میرے بابا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بوڑھا ری (ہنسی) کو ساون آیا۔

سین ۔۱۴ ابدیش

لکھیاں بابل موہے کاہے کو بیاہی بدیس
ہم تو بُلبُل تورے دھابے کی چڑیا

لڑکی بیاہنے کے بعد اپنے بابل سے بچھڑ کر سُسرال جا رہی ہے۔

سین ۔۱۳ پن گھٹ ہنسی ہنسی آوازیں

بھور بھئی اُڑ جائے رے
لکھیا بابل موہے......
بھیا کو دینی محل دو محلے
ہم کو دیا پردیس
لکھیا بابل موہے۔

امیر خسرو: لا پانی پلا
ایک لڑکی: پہلے ہمارے اُوپر ایک شعر کہو۔
خسرو: اپنی پسند کی چیز کا نام لو
ایک لڑکی: کھیر، چرخہ، کتا، ڈھول
امیر خسرو: کھیر پکائی جتن سے، چرخہ دیا چلا
آیا کتا کھا گیا، تُو بیٹھی ڈھول بجا
(پنگھٹ کا سین لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔
امیر خسرو پانی پینے آتے ہیں۔)

سین ۔۱۵ ڈونڈی

اعلان ۔(ڈونڈی کی آواز)

سُن سُن، حق خدا کا، حکم بادشاہ کا، سلطان ابن سلطان محمد بن تغلق کا فیصلہ کہ حکومت ہند کا پائے تخت اب دہلی کے بجائے دولت آباد ہوگا۔ اس لیے ہر خاص و عام کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اہلِ وعیال کے دلّی سے کوچ کی تیاری کریں۔ حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کو سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔

عوام سامان سے لدے پھندے روانہ ہو رہے ہیں۔ امیر، غریب، فقیر ہر طرح اور ہر طبقے کے لوگ۔

سین ۔۱۶ قافلہ

۱۔ یہ کیسا فیصلہ ہے۔

قافلے والے آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

۲۔ سلطان شاید پاگل ہو گئے ہیں۔

۳۔ ہاں پاگل ہیں، یہ دانش مندی کا فیصلہ ہے۔

دولت آباد ہندوستان کا مرکز ہے جہاں سے پورے ہندوستان پر اچھی طرح حکومت کی جاسکتی ہے۔

قافلہ دہلی چھوڑ کر چلا جا رہا ہے بگّی بھی ساتھ ہے۔

(کراہ، چیخ، بیل گاڑیوں کی آوازیں، کتّے کے رونے کی آوازیں۔)

سین ۔۱۷ نام دیو

کمنٹری: میں بھی اس قافلے کے ساتھ تھی۔ صوفیوں اور سپاہیوں نے مجھے راہ دکھائی۔ میں گجرات پہنچی۔ وہاں کے لوگوں نے پیار سے مجھے گجری کا نام دیا۔ سنت نام دیو نے مجھے اپنی بیٹی بنایا۔ میں ان کے بھجنوں کی آتما بن گئی۔

بھجن منڈلی جمی ہے، گاؤں کے عورت، مرد، بچّے، بوڑھے نام دیو کے ساتھ بھجن گا رہے ہیں۔

بھجن: مائی نہ ہوتی باپ نہ ہوتا۔

سین ۔۱۸

کمنٹری: میں دہلی سے دکن پہنچی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کمبل سے لپٹی ہوئی بازار سے درگارہ، درگاہ سے دربار پہنچی۔ قلی قطب شاہ کے دل کی دھڑکن بن کر میں مناظرِ فطرت اور عورت سے اس کی بے پناہ دلچسپی کا ذریعہ بن گئی۔

(بھاگ متی کا گانا)

بھاگ متی اکیلے بیٹھی گا رہی ہے۔

پیا باج پیالہ جائے نا
پیا باج مل مل جیا جائے نا
بھاگ متی: اُونہہ، آپ عشق کے بڑے
دعوے دار بنتے ہیں۔ کیا بچے گا
میرے آپ کے بعد
قطب: بھاگ متی لو، ہم تمہاری محبت کو
لازوال بنائے دیتے ہیں اور اس لافانی
شاہکار کا نام ہوگا چار مینار

کبوتروں کے اُڑنے کا سین۔
قلی قطب شاہ آتے ہیں۔
سین ۔B۱۸
سُنتے ہیں کہ بھاگ متی کے عشق کی یادگار
میں انھوں نے چار مینار تعمیر کرایا
اور حیدر آباد شہر بسایا۔ بات چیت ہونے
کے بعد قطب گھوڑے پر بیٹھے اور چلے
گئے۔

سین ۔۱۹ ولیؔ

کمنٹری: میرے عشق کی زبان بدلتی رہی۔ تب ولیؔ نے مجھے یوں بیان کیا۔

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں ترے نین، غزالاں سے کہوں

سین ۔۲۰ سراجؔ

کمنٹری: ایک طرف ولیؔ کی جمال پرستی تھی تو دوسری طرف سراجؔ کے المیہ نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔

(ایک پرانا سوکھا درخت جس کی ایک لچکتی شاخ ہنوز ہری ہے۔ اس درخت کے نیچے ایک قلندر فقیر گا رہا ہے۔)

خبرِ تحیّرِ عشق سُن
نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا، نہ وہ میں رہا
جو رہی سو بے خبری رہے

چلی سمتِ غیب سے وہ ہوا
کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم
جسے دل کہوں سو، ہری رہی

سین۔۲۱ ہاشمی بیجاپوری

میں، ملاّ وجہی کی زبان سے سرسوتی کی دھارا کی طرح پھوٹ رہی ہوں اور رس پی سب رس کا روپ لیا تو نظم میں قطب مشتری کا سوروپ بھرا۔ نصرتی کی قلم سے میں رزمیہ مثنوی بن گئی۔ غواصی اور ابنِ نشاطی نے محبت کے نغمے چھیڑے۔ ہاشمی بیجاپوری نے برج بھاشا کی طرز پر عورت کی طرف سے مرد کے لیے اظہار عشق پہلی بار میرے ہی واسطے سے کیا۔ جمناتٹ کے واسی رادھا اور کرشن کو میں نے کاویری کے کنارے اپنایا۔

مشتری بیٹھی گا رہی ہے۔ سجن آئے تو پردے سے نکل کے بہار بیٹھو گی بہانا کر کے موتیوں کا پروتی ہار بیٹھوگی

سین۔۲۲ کبیر

کمنٹری: جب دکن کی پُر بہار فضاؤں اور مدھ بھری برساتوں میں یہ شعراء اپنی شاعری سے میرا بدن نکھار سنوار رہے تھے، شمال میں مَیں روحانی ارتقا کی دوسری ہی منزل سے گزر رہی تھی، یعنی بھگت، کبیر، گرونانک اور میرابائی کے بھگتی گیتوں سے آفاق کی سرحدوں کو چھو رہی تھی۔

(کمہار بیٹھا چاک چلا رہا ہے۔)

کبیر: ماٹی کہے کمہار کو تو کیا روندے موہے
ایک دن ایسا ہوئے گا میں روندوں گی توئے

سین۔۲۳

(روشنی کا ایک دائرہ)

نانک: سانس مانس سب ہیو تمہارا
تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعرایوں کہت ہے
سچے پروردگارا

سین۔۲۴

(میرا بھجن کررہی ہے جوگن کے لباس میں۔)

ہے ری میں تو پریم دیوانی
میرا درد نہ جانے کوئے
سُولی اُوپر سیج ہماری
کس بد سُونا ہوئے
درد کی ماری بَن بَن ڈولوں
بید ملیو نا کوئے
میرا کی جب پیڑا اُٹھے تب
بید سو رہا ہوئے

سین۔۲۵ جعفر زٹلی

کمنٹری: آگرہ اور متھرا سے ہوتی ہوئی میں مغلوں کی نئی راجدھانی شاہجہاں آباد پہنچی۔ (لالہ تہمت رام کی دُکان پر میر جعفر زٹلی سکّے گن رہے ہیں۔ وہ رسید بڑھاتا ہے تو میر صاحب سکّے لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ لالہ پیچھے پیچھے جاتے ہیں میر لالہ کا قلم لیتے ہیں اور اس سے لکھتے جاتے ہیں، پڑھتے جاتے ہیں۔ لالہ کا منہ فق ہو جاتا ہے۔ رسید ہاتھ میں دیتے

ہیں۔ وہ سر پیٹ لیتا ہے۔)

تہمت رام: اجی میر صاحب، اجی رسید تو لکھتے جاؤ۔

میر صاحب: ہاں ہاں، من کے شیخ مولا۔ نہ دارم چکلی و نہ دارم چولہا، ساکن قصبہ اجاڑ نگر، ضلع غیب پورہ ام۔

چوں مبلغ بے تعداد کہ نصفِ آن یک خرماہ را از لالہ تہمت رام بندھی گاشتی وز دو کوب و جوتم جاتا و لاٹھم لاٹھا، گرفتار در نہتنگ، تصرّف خود آوردم، اقرارِ آں کہ تا قیامت ادا نہ سازم۔ ایں چند کلمہ تاریخ ٹالم ٹالا نوشتہ داد شد کہ سند نہ باشد۔ (سب لوگ ہنستے ہیں)

دلاورِ مفلس، سب سے اکڑ رہ، با عالمِ بے کسی سے رگڑ رہ۔ اگر شلوار نہ باشد کس کو غم ہے، لنگوٹا کھینچ کر سب سے اکڑ رہ۔

(سب لوگ ہنستے ہیں)

تہمت رام: یہ کیا رسید ہے۔

سین۔ ۲۶ داستان گو

(کچھ لوگ جمع ہیں۔ ایک بزرگ شخص داستان سُنا رہا ہے۔)

راویانِ شیریں دہن اور ناقلانِ رنگیں سخن بہ حلاوتِ زبان یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک زنِ پُر فن بقالِ بد افعال کی دُکان پر طوفان میں شکر لینے گئی۔ وہ بقال بد اعمال اس زنِ شیریں سخن کی گفتگو میں محبت کی چاشنی پا کر گھل گھل کر باتیں کرنے لگا اور وہ زنِ بدکار بے ہنجار یک بار آسیۂ حسرت میں آٹوں کی طرح پس گئی۔ الحاصل اس بقال بدفعال نے ایں زنِ شیریں دہن کے گوشۂ چادر میں ایک سار شکرِ خوش گوار تول کر باندھ دی اور کھنڈ سار کے گوشے میں اپنا مطلب پورا کرنا طے کیا۔

سین۔ ۲۷ نادر شاہ

(توپوں کی آواز، گھوڑوں کی ٹاپیں۔)

(گھوڑے دوڑ رہے ہیں، گھر پھُنک رہے ہیں۔ لاشیں بچھتی جا رہی

ہیں۔تلواروں کی لڑائی، بھگدڑ، سناٹا ہے۔ کہیں کہیں ایک یاد کا چراغ جل رہا
ہے۔سسکیاں لیتے عورتیں، مرد، بلکتے بچے۔)

کمنٹری

دلّی کی بساط پھر الٹنے لگی اور مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلّی تاراج کردی۔ یہ خوب صورت شہر کھنڈر بن گیا۔(سسکیاں، کراہیں، ہائے ہائے)

سین۔۲۸ شہر آشوب

(شہر سُنسان، پنگھٹ ویران) اور ان درختوں کی وہ چھاؤں، وہ گھنے گھنے پات ہیں واں اب نہ آدمی کی ذات۔کنویں میں مُردے پڑے ہیں نہ ریسمان نہ ڈھول۔)

سین۔۲۹ بنگال کا بازار

(بازار کا سین، انگریز ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔لوگوں کا سامان چھین رہے ہیں۔)

غزل کے پردے میں مصحفی و جرأت نے اس غم کی داستان یوں بیان کی۔

مصحفی: ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی + کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی۔

جرأت: سمجھے نہ امیر انھیں نہ اہلِ توقیر + انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں ہیں اسیر۔

سین۔۳۰ سراج الدولہ

(سراج الدولہ فوج کو کمانڈ کررہا ہے) (لڑائی کا سین)

کمنٹری: بنگال بھی ایک نئے انقلاب سے دوچار تھا۔سراج الدولہ فرنگیوں سے لوہا لے رہا تھا۔

سراج: اے ہندوستان کے جاں بازو، سورما سپوتو، آگے بڑھو اور ان وحشی فرنگیوں کو اس مقدس سرزمین سے نکال باہر کردو۔

یلغار (لڑائی کی آوازیں)

سین۔۳۱ سراج بہ زنجیر

(سراج الدولہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔)

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مرگیا آخر کو، ویرانہ پہ کیا گزری

(فیڈ آؤٹ)

سین۔۳۲ آگرہ نظیر

کمنٹری: ایک طرف مئیں دلّی کے قلعہ معلیٰ، بازاروں، خانقاہوں اور قہوہ خانوں میں موجود تھی تو دوسری طرف اکبرآباد میں نظیر کے نغموں کے ذریعہ برج بھومی کے رہنے والوں کے دِلوں پر چھائی ہوئی تھی۔

(ایک ہندوستانی انگریز کا پیر دبا رہا ہے اور انگریز اُسے مار رہا ہے۔)

مغرور نہ ہو تلواروں پر

سب پھولوں پروسے ڈالوں کے

سب پتّہ توڑ کے مانگیں گے

منہ دیکھ اجل کے مالوں کے

کیا ڈبّے موتی ہیروں کے

کیا ڈھیر خزانے والوں کے

کیا بقچے تاش تمامی کے

کیا تختے شال دوشالوں کے

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا

جب لاد چلے گا بنجارہ

(نظیرؔ)

سین۔۳۳ ریچھ کا بچّہ

(ریچھ والا ریچھ نچا رہا ہے۔ ڈگڈگی بجا رہا ہے۔ بچے چاروں طرف جمع ہیں، خوشی سے تالی بجا رہے ہیں۔)

ہم جب بھی چلے، ساتھ چلا ریچھ کا بچہ
کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ
لے آئے وہی ہم بھی اُٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ
جس وقت بڑا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
ہم جو بھی چلے، ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

سین۔۳۴ جنم اشٹمی

(کرشن جی کا ڈولا آرہا ہے۔ لوگ مستی میں گا رہے ہیں۔)

ایسو تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
یارو سُنو تو دودھ لٹیا کا بالپن
اور حد پوری نگر کے بسیا کا بالپن
موہن سوروپ کرشن کنھیا کا بالپن
بن بن کے گوالا گیہوں چریا کا بالپن
ایسو تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن

(فیڈ آؤٹ)

سین۔۳۵ ظفر غینی

آگرہ اور دہلی کی تباہی کے بعد میں نے اودھ میں پناہ لی، پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ آباد ہوا

اور—

(بی نورن کی سرائے۔ بی نورن ظفر غینی سے گفتگو کر رہی ہے۔)

بونورن: اجی آؤ میر ظفر غینی صاحب، تم تو عید کے چاند ہو گئے، دلّی آتے تھے، دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ کبھی صورت نہیں دکھاتے۔ اب کی کربلا میں کِتّا میں نے ڈھونڈھا۔ کہیں تمہارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ تمہیں علی کی قسم، آٹھوں میں مقرر چلیو۔

غفر غینی: اجی بی نورن، کیا بات فرماتی ہو۔ تم اپنے جیوڑے کی چین چین ہو پر کیا کہیں جب سے دلّی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سُنیے۔ ریختے میں اُستاد ولی ہوئے۔ اُن پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو، میاں ناجی اور میاں حاتم! پھر سب سے بہتر مرزا رفیع سودا اور میر تقی، پھر حضرت خواجہ میر درد نور اللہ مرقدہ جو میرے بھی اُستاد تھے وہ لوگ تو سب مر گئے اور اُن کی قدر کرنے والے بھی جاں بہ حق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں ویسے ہی شاعر ہیں اور دلّی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر، صحبت اثر، سبحان اللہ۔ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر! پوچھو تو تمہارا...... کس دن شعر کہتا تھا اور رضا بہادر کا کون سا کلام ہے۔

(ہنستے ہوئے) اور دوسرے میاں مصحفی کے متعلق، شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھئے کہ زرباہ کی ترکیب ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں، اور میاں حسرت کو دیکھو اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آ قدم رکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں! بے چارے، میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے، آگے پر یجات تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے، مرزا مظہر جانِ جاناں صاحب کے روزمرّہ کو نام رکھتے ہیں۔

سین۔ ۳۶ اِندر سبھا

(اِندر سبھا کا ایک سین۔ سبز پری جوگن کا بھیس بدل کر آتی ہے۔ اپنے ناچ سے راجا اِندر کو لبھاتی ہے اور انعام میں گلفام کو مانگتی ہے۔)

کمنٹری: میں عوام کے ہر طبقے، ہر مذہب وملت کے لوگوں میں مقبول تھی، بازار، مجلس، دربار، ہر جگہ۔

(فیڈ)

جوگن: میں تو شہزادے کو ڈھونڈھن چلیاں
رنگ بھبوت جوگن بن ملیاں
چھان پھری سب گلیاں
میں تو شہزادے کو ڈھونڈھن چلیاں

اندر: اری جوگن، اے درد کی مبتلا
فقیروں کا کیوں بھیس تُو نے لیا
کسے ڈھونڈھتی پھرتی ہے کو بہ کو
اُڑاتی ہے کیوں خاک جنگل کی تو

جوگن: مہاراج پوچھو نہ جوگن کا حال
فقیروں کا دل درد سے ہے نڈھال
ہرا مجھ سے معشوق ہے چُھٹ گیا
میرا راج اِس دیس میں لُٹ گیا

اِندر: مانگ کیا مانگتی ہے۔

جوگن: ہوتا ہے کوئی آن میں اب کام ہمارا
انعام میں دیجیے، ہیں گلفام ہمارا

(فیڈ)

سین۔ ۳۷ تعزیہ

(ماہِ محرّم کے تعزیے نکل رہے ہیں۔ ماتم کرتے ہوئے لوگ جلوس کے ساتھ ساتھ ہیں۔)

سین۔۳۸ مجلس

گرتی تھی برقِ تیغ جو ہر پل اِدھر اُدھر
سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر
تھا کہ پھر رہی تھی کوئی کل اِدھر اُدھر
بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہلچل ادھر اُدھر
ہر جا سروں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
مانگے کہاں گریز کہ کوچے تو بند تھے

سین۔۳۹ بازار

(بازار کا سین۔طرح طرح کے کی آوازیں آرہی ہیں۔ہری مرچ والا، گنڈیری والا، آم والا، ککڑی اور ہری مرچ والا، خربوزہ والا۔)

(ہجڑوں کی ٹولی ناچتی گاتی۔)

سین۔۴۰ بٹیر

چوبدار: خداوند بڑا غضب ہو گیا۔

نواب: کہو، اے خیر تو ہے۔ کچھ منہ سے بولو، سر سے کھیلو، آخر کیا آفت آئی۔

چوابدار: (ہاتھ جوڑ کر) جان بخشی ہو تو عرض کروں۔ بٹیر سب اُڑ گئے۔

نواب: (ہاتھ ملتے ہوئے) سب، ارے سب اُڑ گئے۔ ہائے میرا صف شکن میرے صف شکن کو جو ڈھونڈ لائے ہزار نقد گنوائے۔

اُف اُف بھئی، ابھی سانڈنی سواروں کو حکم دو کہ پنج کوسی دورہ کریں، جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

(نواب کا بٹیر کھو گیا ہے اور اُن کے مصاحب اُن کو دلاسا دے رہے ہیں۔)

ایک مصاحب: خداوند سمجھانا کیا۔ وہ بھی کوئی آدمی ہے جو سمجھ جائے گا۔ جانور لاکھ پڑھے جانور

رہے۔

نواب: کوئی ہے (وہ آتے ہیں) ان پر جوتے پڑیں۔ صف شکن کو تم ایسے گدھوں سے زیادہ تمیز ہے۔

ایک درباری: حق ہے، حق ہے اے حضور، وہ تو عربی سمجھ لیتا ہے۔

دوسرا درباری: خداوند اُس کو قرآن کے کئی پارے یاد ہیں۔

تیسرا درباری: قسم پنجتن پاک کی کہ میں نے اُسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

چوتھا درباری: ایک دن ہنس رہا تھا۔

پانچواں دباری: اجی ہم نے تو اُسے ڈنڈ پیلتے دیکھا ہے۔

نواب: ہائے میرا صف شکن، پیارا صف شکن۔ مجھے تو اُس سے عشق ہوگیا تھا۔ ہائے ہائے، ہائے ہائے کس بانکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی تھرا اٹھتی تھی، اور قسم ہے صف شکن ہی کی، اس کی خوبیاں آج کھلیں کہ وہ حقانی جانور تھا۔ صحبت بٹیر کی مگر سیرت فقراء کی، اور ایک پنڈت نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیا جانے کیسی کھنڈت ہوگئی، نہیں تو اس کا بڑا درجہ تھا۔ اب سُنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

"پتیم جو میں جانتی کہ پیت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈ ورا پیٹتی کہ پیت کرے نا کوئے"

خوجی: (پنک سے چونک کر) ہاں، ذری اُونچی سروں میں واہ واہ۔

نواب: چُپ نامعقول، کوئی ہے؟ ان کو یہاں سے ٹہلاؤ۔

ارے بھائی سانڈنی سوار دوڑائے گئے یا نہیں، اماں شجاعت علی سے کہو کہ ابھی سانڈنی تیار ہو اور پنج کوسی چکر لگائے اور جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئے۔

شجاعت: جاتا ہوں مگر وہ تو منطق پڑھے ہے۔ کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجئے، اُن سے بکشے گا کون۔ دلیل کون کرے گا بھلا؟

نواب: ہاں ہاں! کم بختو، نمک حرامو! جلدی جاؤ نا، کسی مولوی کو بلا کے لاؤ۔ ہائے میرا صف شکن۔

(فیڈ)

سین ۔۱۴ رہسیہ

کمنٹری: ہاں، یہاں تک ہی نہیں بلکہ نواب واجد علی شاہ اختر نے قصۂ رادھا کنہیا رقص اور موسیقی میں سجا سنوار کر رہس کے ذریعے پیش کیا ہے۔

سہرا: میاں چوبیس برس ہوئے اس غم میں کہ رادھا کا ناچ نہیں دیکھا۔

غربت: بس آپ کو اسی کا غم ہے۔ جاتا ہوں تدبیر کرنے (غربت جاتا ہے، عفریت سے ملتا ہے۔)

غربت: السلام علیکم، میاں عفریت۔

عفریت: وعلیکم السلام، الطعام والکلام، الکشمش والبادام، میاں غربت علی خاں بہادر و بہادران، کھٹ پٹ جنگ۔

(دونوں گلے ملتے ہیں اور ہنستے ہیں) کاؤں ۔۲

کل کل کل کل

غربت: جوگن صاحبہ کہتی ہیں، مجھے رادھا کنہیا کا ناچ نہ دیکھنے کا غم ہے، ہو سکے تو اس کا ارمان پورا کرو۔

عفریت: تیتی میتی، دم خیشی، لو ایک لاڑا، جھونٹک جھاٹا، صندوق مہ ولق، سرغاہ کی دم اور بچّوں کی قسم، میں سعی کرتا ہوں۔

عفریت: ایک جوگن رادھا کنہیا کا ناچ دیکھنا چاہتی ہے۔

پریاں: ارے عفریت، رادھا کنہیا کا ناچ جوگن کو دکھا دے۔

(میوزک)

رادھا: مہاراج مَیں تم کا خوب چینہت ہوں۔ تم کبری کا دَیے آئے ہو۔

(رادھا روٹھ کے بیٹھ جاتی ہے، کنہیا ان کو بھاؤ سے مناتے ہیں۔ نہیں مانتی تو راج چیرا کو بلاتے ہیں)

کنہیا: راج چیرا۔

راج چیرا: حاضر مہاراج حاضر!

کنہیا: رادھیکا خفا ہوئے گئی۔

راج چیر: مہاراج، اب کوئی سکھی کا بیچ ماں ڈال کے صفائی کرلیو۔ (کنہیا للتا کو اشارہ کرتا ہے۔ للتا آتی ہے)

کنہیا: ہمری رادھا ہم سے نہیں مانت ہیں، کا کروں۔

للتا: بنتی کرو، ناک رگڑو، پیّاں پڑو، موڑ گھسو، چروی کرو، جب تو سُنی ہیں۔

(کنہیا کا بھاؤ کے ساتھ گانا اور رادھا کو منانا)

کنہیا: استھائی۔ رادھا جی مو سے بولو کیوں نہ رہے۔

اُنترا: کا مو سے کچھ چوک پڑی، موری رانی، ہنس ہنس گھونگھٹ کھولو کیوں نہ رہے۔

رادھا: مہاراج جبھی خوش ہوؤں گی جب مُرلی ڈھونڈھ کر لادو گے۔

کنہیا: اچھا جاتا ہوں۔ (ایک راؤنڈ لے کر کونے میں کھڑا ہوا مُرلی بجاتا ہے۔ رادھا خوش ہو جاتی ہے اور دوڑ کر ان کے پیروں میں گرتی ہے اور کہتی ہے)

رادھا: جب مور من شکھ بھوا، تم پر اجو

راگ استھائی: بجن لاگی سیام کی بانسری رے۔

انترا: ندیا کنارے اختر بانسری بجاوت نکس جات، جیا سے بانسری رے۔

کمنٹری: لکھنؤ کی تہذیب۔ اس وقت کا لکھنؤ ادب اور تہذیب، نزاکت اور لطافت میں ایشیا کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

سین۔۴۲ دلّی کالج

(کالج میں گھنٹے کی آواز پر لڑکے نکلتے ہیں، ایک جگہ کھڑے ہو کر بات چیت کرتے ہیں۔)

اس دور کی دلّی بھی ویران نہ تھی۔ اس دلّی میں جہاں متعدد پُرانے مدرسے اور درگاہیں تھیں وہاں انگریزی اثرات اُبھر رہے تھے۔ تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور سائنس کی تعلیم پر زور تھا۔ یہی دلّی کالج پیارے لال آشوب، ماسٹر رام چندر، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین،

مولوی ذکاء اللہ، آزاد اور الطاف حسین حاؔلی جیسے عظیم مصنفین کی مادری درس گاہ تھی۔

سین۔۴۳ آخری مشاعرہ

کمنٹری: ادبی محفلیں جگہ جگہ منعقد ہوتیں، بحث و مباحثے، مشاعرے دہلی کو رونق بخش رہے تھے۔

نازنین: مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو
نہیں ڈرنے کی میں بھی، گر نہیں تاکا تو اب تاکا

ذوق: لائی حیات، آئے قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
کہتے ہیں آج ذوؔق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

سین۔۴۴ غدر

کمنٹری: ہندوستان پر فرنگیوں کا شکنجہ کستا جا تا رہا تھا۔ ان کے ظلم و جبر کے خلاف جو غم و غصہ تھا وہ میرٹھ کی چھاؤنی سے شعلہ بن کر بھڑک اٹھا۔ منگل پانڈے نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ تاتیا ٹوپے مہاراشٹر سے اُٹھے، رانی جھانسی کی تلوار بجلی کی طرح چمکی، احمد اللہ اور عظیم اللہ نے للکارا، بیگم حضرت محل نے اپنا محل ترک کیا اور پورا ہندوستان بہادر شاہ ظفر کے پرچم تلے جمع ہو گیا۔

(لڑائی کی آوازیں)

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے

سین ۔۴۵ گرفتاری

(بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے لے جایا جا رہا ہے)

بہادر شاہ:
لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفؔر، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

سین ۔۴۶ غالب کا خط

(غالبؔ بیٹھے خط لکھ رہے ہیں)

(سائیڈ میوزک)

امیر و غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے وہ نکل رہے ہیں۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصّل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ شدّت ہے اور باز پُرس اور دارو گیر میں مبتلا ہوں۔ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے، ذرا یہ کہ کوئی میری پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔

سین ۔۴۷ علی گڑھ

کمنٹری: لڑائی ہاری جا چکی تو نئے راستے ڈھونڈے جانے لگے۔ انگریزوں سے سبق لے کر سائنس اور صنعت کی طرف رجوع ہوا۔ راجہ رام موہن رائے نے فارسی میں اخبار نکالا اور اُردو میں خطوط لکھے۔ سر سید احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی بنائی اور ان کے ساتھ حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد نے ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔ علی گڑھ میں کالج کی بنیاد رکھی۔ (چند لڑکے کالی شیروانی پہنے ہوئے ہاتھوں میں کتابیں اور انجینئرنگ کا سامان۔ لڑکیاں

اُپرن پہنے ہوئے، کسی کے ہاتھ میں نشتر، کسی کے ہاتھ میں میڈیکل سامان۔)
'سرسید نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالی'

سین۔۴۸ آغا حشر

میں ادبی اداروں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ مغربی تہذیب کا اثر قبول کر کے جدید فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں میرا سکہ جاری ہوا۔ آغا حشر کشمیری اور بیتاب بنارسی نے انگریزی طرز پر نئے اُردو کے ڈراموں کو جنم دیا۔

چنگیز: ناصر کو حاضر کرو۔

(ناصر کو زنجیروں میں جکڑا چنگیز کے سامنے لایا جاتا ہے)

چنگیز: کہیے اے شہباز زمانہ، آپ نے اس ناچیز خادم کو پہچانا۔

ناصر: پہچانا، پہچانا، شیطان کو کون نہیں جانتا بلکہ ہر شخص پہچانتا ہے۔

شکل وصورت دیکھ لی، کبر ورعونت دیکھ لی
نام پہلے بھی سُنا تھا، آج صورت دیکھ لی

چنگیز: مغرور، تُو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، مگر ابھی یوں اکڑا ہوا ہے۔

سر سے غرورِ مسندِ مخمل نہیں گیا
رسّی تمام جل گئی، پر بل نہیں گیا

ناصر: عزّتوں والے مصیبت سے کہیں ڈرتے ہیں
دن کو بھی رات کے کچھ تارے نکل پڑتے ہیں
عطر کی مٹی میں بھی مل کر مہک جاتی نہیں
توڑ بھی ڈالو تو ہیرے کی چمک جاتی نہیں

چنگیز: تُو نے بادشاہی اس لیے چاہی کہ مجھ سے کرے بُرائی، میں تیرا کون تھا؟

ناصر: کون تھا؟

چنگیز: چچازاد بھائی۔

ناصر: بھائی؟ اُف بھائی کا نام لے کر تُو نے میرے مرحوم چچا کی رُوح کو تڑپا دیا۔ قبر میں سوتے ہوئے کو خواب راحت سے جگا دیا۔ مجھ کو کہتا ہے بھائی! اور بھائی کے ساتھ یہ کج ادائی۔ لعنت ہے۔

چنگیز: دیکھ، اب بھی اگر تُو اپنی بے ہودگی سے باز نہ آئے گا تو صبح آفتاب نکلنے سے پہلے تیرا دم نکل جائے گا۔

ناصر: اُف۔ جہاں تجھ سا کور باطن ہے، وہاں آفتاب کا نکلنا ناممکن ہے۔

چنگیز: خیر میں نے مانا کہ میں تیری نظر میں خار ہوں، مکّار ہوں، بدکار ہوں، عیار ہوں۔

مگر یہ دیکھ تو کیسا اسیرِ رنج و آفت ہے

خلاف اس کے یہاں عشرت ہے، راحت ہے، مسرت ہے

ناصر: اور مغرور، یہ کیا بڑی بات ہے۔ عزّت اور ذلّت دینا تو خدا کے ہاتھ ہے۔

چنگیز: وہ شرافت کس کام کی جو وقت پر کام نہ آئے۔

جوہر اگر دِکھاتے، مشکل بڑی نہ ہوتی

ہاتھوں میں آج کے دن یوں ہتھکڑی نہ ہوتی

ناصر: جن بہادروں کو اپنی عزّت عزیز ہوتی ہے اُن کے ہاتھوں میں ہمیشہ دو چیز ہوتی ہے۔ تیغ و شمشیر یا ہتھکڑی و زنجیر۔ البتہ جو طبیعت کا عورت ہے اس کے ہاتھوں کو چوڑیوں کی ضرورت ہے۔

چنگیز: بدزباں، کم نہیں ہوتی ہے حماقت تیری

خیر معلوم ہوا آگئی شامت تیری

ارے کوئی حاضر ہے۔

(جلّاد آتا ہے)

آ کے لے جاؤ اسے قید رکھو آج کی رات

خون پی لوں گا سحر ناشتہ کے ساتھ

سین۔۴۹ مثنوی

(ایک عاشق آبدیدہ بیٹھا ہے، اس کی محبوب اس آخری ملاقات کے لیے آتی ہے۔ رورو کر لڑکی سمجھا رہی ہے۔ عاشق بے قابو ہوتا ہے۔ لڑکی تسلّی دیتی ہے۔) مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنوی زہرِ عشق میں معشوقہ اس طرح گویا ہوتی ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں
موت عینِ حیات ہے اس میں
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کے ستم
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
رو کے رہنا بہت طبیعت کو
یاد رکھنا میری وصیّت کو
میرے مرنے کی جب خبر پانا
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں
آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا
ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے
سب میں رُسوا نہ کیجیے گا مجھے
آنسو چپکے سے دو بہا لینا
قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر

پڑھنا قرآن میری تربت پر
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے
مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے
عمر بھر کون کس کو روتا ہے
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے
مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

سین۔۵۰ اودھ پنچ اخبار

(ایک آدمی لوگوں کو میرٹھ کے اخبار سُنا رہا ہے۔)

گویا حاکم کہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت سرسبز ہے۔ ہندوستان کے گدھے کی پیٹھ کا گوشت نوچو جہاں تک ناخنوں میں طاقت ہو۔ یہ گوشت اصلی گوشت نہیں بلکہ بدگوشت ہے۔ اس کا نوچنا مضر نہیں بلکہ انجام کار راحت رساں ہوگا۔ گدھا فربہ ہے۔ اس پر بھار لادا جائے۔ منزل پر پہنچو اور اس کا گوشت نوچو۔ اسی کی لید جلا کر اسی کی دال کی ہانڈی بنا کر دودھ بھی پیو اور صبح کو بھار بھی لادو اور آپ بھی سوار ہو جاؤ۔ تیز نہ چلے تو ہنٹر سے خبر لو۔ لطف یہ ہے کہ کاٹھ کا گدھا ہے، نہ کھانے کی حاجت، نہ پینے کی ضرورت۔ اس پر نہ مٹھانہ منجور۔

سین۔۵۱ لالہ لاجپت رائے

(ایک آدمی اخبار پڑھ کے سُنا رہا ہے۔)

دوسرا: اجی حضرت یہ اکبرالہ آبادی کے اشعار تو پڑھے ہی نہیں:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانوں میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

(ہنسی)

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

سین ۔۵۲ نول کشور

کمنٹری: لکھنؤ ہی میں منشی نول کشور نے اُردو کا پریس قائم کیا۔

(پریس کی آواز)

(ایک کتاب کی دُوکان ۔ دُوکان دار اور خریدار کی بات چیت ۔)

ایک آدمی: قبلہ، نول کشور پریس کی طرف سے کون کون سی نئی کتابیں چھپی ہیں؟ عنایت فرمائیں۔

دُوکاندار: غالبؔ کا دیوان، انیسؔ کا مرثیہ، طلسمِ ہوش ربا، نظیر اکبر آبادی کا کلیات، پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، فرمایئے کیا حاضر کروں۔

سین ۔۵۳ اخبار بیچنے والے لڑکے

(کئی لڑکے اخبار بیچ رہے ہیں۔

۱۔ مولانا محمد علی کا اخبار 'ہمدرد' ضبط

۲۔ لالہ لاجپت رائے پر لاٹھیوں کی بوچھار

۳۔ مولانا حسرت موہانی گرفتار

۴۔ ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' پر پابندی

۵۔ مولانا آزاد کراچی کی عدالت کے کٹہرے میں

سین ۔۵۴ کراچی کا مقدمہ

(ابوالکلام آزاد پہ مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ وہ اپنی پیروی خود کرتے ہیں۔)

جج: آپ کے اُوپر دفعہ.........تعزیراتِ ہند کی رُو سے مقدمہ عائد کیا گیا ہے، سرکار

برطانیہ کے خلاف بغاوت کا الزام ہے۔ کیا آپ کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟

ابوالکلام: تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اُٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ منصف سرکار کے ہاتھ میں عدالت عدل وحق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، لیکن جابر اور مُستبِد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔ تاریخِ عالم کی سب سی بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہی ہوئی ہیں۔ دنیا کے قدیم مذہب سے لے کر سائنس کے محققانہ دور تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ یقیناً میں نے کہا موجودہ سرکار ظالم ہے، لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے کیوں یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پُکاروں۔ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔

مسٹر مجسٹریٹ، اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے۔ جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے اور تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کُرسی۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہیں اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد از جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دِنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

سین۔ ۵۵ چکبست

(ایک لڑکی مشعل لیے ہے)

کمنٹری: قومی رہنماؤں نے سارے ملک میں بیداری کی رُوح پھونک دی جس سے انقلاب کی

آگ بھڑک اُٹھی۔ (لڑائی کے ڈھول) میں چکبست، اقبالؔ اور جوشؔ کے انقلابی نظموں
کی مشعل لے کر میدانِ کارزار میں آ گئی۔
(ایک شاعر کشمیری لباس میں نظم پڑھ رہا ہے)

اے صورِ حُبِّ قومی، اس خواب سے جگا دے
بُھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دِکھا دے

سین۔۵۶ اقبال

(ایک طرف اقبالؔ اپنی نظم سُنا رہے ہیں اور مشعل والی لڑکی غائب ہو جاتی ہے)

اُٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کنجشک فرومایا کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اُٹھو اُٹھو!

سین۔۵۷ جلیاں والا باغ (جوشؔ)

(اس نظم کی آواز آ رہی ہے۔ ایک مجمع جمع ہونے کی آواز ساتھ ساتھ)

(بہت بڑا ہجوم جلیاں والا باغ میں اکٹھا ہو رہا ہے۔ اُن پہ گولی چلائی جاتی ہے اور
ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے جاتے ہیں۔)

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے؟
گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی

اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر
یہ جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم، بجلی سا
آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

(اس نظم کے اُوپر لوگوں کے جمع ہونے کی آوازیں۔ سیکڑوں لوگوں کی مِلی جُلی آوازیں، تھوڑے وقفے کے بعد فوجی بوٹوں کی آواز)

(دوسری آواز میں)

سُنو، اے ساکنانِ بزم گیتی
صدا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

(بندوق کی گولی کی آواز اور فائرنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ چیخ وپکار کی آوازیں، بھگدڑ کی آوازیں، کنوؤں میں گرنے کی آوازیں)۔

(سائیڈ میوزک کے ساتھ فیڈ)

سین۔ ۵۸ بھگت سنگھ

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(تین قیدی، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے، ایک عمارت کی طرف لے جائے جاتے نظر آتے ہیں۔ سین میں پھانسی کے پھندے نظر آتے ہیں۔)

ایک آواز — انقلاب زندہ باد، شہید بھگت سنگھ زندہ باد۔

سین۔۵۹ مخدوم

(ایک ٹولی جوش میں گاتی جارہی ہے۔)

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
لو سُرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا، آزادی کا
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
لو وہ پرچم لہراتا ہے

سین۔۶۰ بھارت چھوڑو

چھوڑو چھوڑو بھارت چھوڑو + انگریز و تم بھارت چھوڑو

(بم کے پھٹنے کی آوازیں، ٹرین کے اُلٹنے کی آوازیں)

سین۔۶۱ جھنڈا

ایک گانا۔ جھنڈا اُونچا رہے ہمارا

(یونین جیک نیچے آرہا ہے، ہمارا ترنگا جھنڈا اُوپر جارہا ہے۔)

(ایک آدمی جھنڈے کو سلامی دیتا ہے)

دوسرا گانا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بُلبُلیں ہیں اس کی، وہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سِکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سین۔۶۲ آزادی کے بعد

میرا ملک انگریزی حکومت کے ظالم پنجے سے آزاد ہو چکا تھا اور میں ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سارے ہندوستان کے ساٹھ کروڑ انسانوں کے دِلوں میں جاگزیں ہوگئی تھی۔

(پان کی دُوکان پر کچھ لوگ ریڈیو سُنتے نظر آرہے ہیں۔)

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔

ابھی آپ نے اُردو میں خبریں سُنیں۔ لیجیے اب ملکہ پکھراج کی آواز میں غالبؔ کا کلام سماعت فرمایئے۔

(دلیپ صاحب اور پرتھوی راج کی آواز میں مغلِ اعظم کے ڈائیلاگ سنائی دیتے ہیں۔)

سہگل: غم دیئے مستقل.........

طلعت: پھر وہی شام۔ وہی غم.........

محمد رفیع: تمہاری زُلف کے سائے میں شام کرلوں گا

لتاؔ: آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے

سین۔۶۳ صلیب

اب میں ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر دُور ودراز ملک تک پہنچ چکی تھی۔ حکومت ہند کی طرف سے امیر خسروؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ کے سوسالہ جشن منائے گئے جس میں کنیڈا، امریکہ، انگلینڈ، اٹلی، فرانس، فن لینڈ، جرمنی، روس، ایران، افغانستان اور دوسرے ملکوں کے وفد نے شرکت کی۔

(رونا لیلیٰ کا ایک گانا)

اُبھرتے ہوئے ہوائی جہازوں کی آواز، آندھی۔

سین۔۶۴ آندھی اور ڈراؤنی آوازیں

(ایک صلیب جس کے بال بکھرے ہوئے، پریشان دو طرف سے سیاہ کپڑے پہنے، بھوت کی سی شکل والے اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔)

میری روشنی ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ مگر ایک خواب میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک لاش

(ڈراؤنی آوازیں)

میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں
راہِ وردِ شوق میں ہم کو کیسے کیسے یار ملے
ابرِ بہاراں، عکس نگاراں خالِ رُخِ دلدار ملے
کچھ منجھدار میں، کچھ ساحل پر، کچھ دنیا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یوں ہی ہاتھ پسار ملے
ہم نے اُن کی خوبی پہ نظر کی اِس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

(آواز ختم)

☆☆☆

عمر خیام

(اسٹیج ڈراما)

کردار

۱۔ لائے خور
۲۔ نظام الملک
۳۔ حسن
۴۔ عمر
۵۔ کامران
۶۔ تاج الملک
۷۔ حنا
۸۔ ترکان خاتون
۹۔ شاہ ملک
۱۰۔ بیگم
چند سپاہی
تین شرابی
رقاصائیں
ایلچی وغیرہ

زمانہ: گیارہویں صدی کا ایران

مقام: نیشاپور

سیٹ: ڈرامے میں تین سیٹ ہیں اور تینوں دو منزلہ ہیں۔ ایک پرانی سرائے کا، جس کے نیچے والے حصے میں شراب خانہ ہے۔ دوسرا قصر شاہی کا، جس کے اوپری حصے میں ملکہ کا ایوان ہے اور نیچے شاہی دربار کا ایوان۔
تیسرا عمر خیام کا مکان ہے جس کے اوپری حصے میں دوربین لگی ہے اور نیچے والے حصے میں رہائش گاہ ہے۔

(بنیادی خیال یہ ہے کہ تینوں دوستوں کا عہد تین طبقے والے نوجوان کا عہد تھا اور جب تک حالات، استحصال کے شکار عوام کے لیے سازگار نہ ہو۔ درمیانی طبقہ اسے اپنے لیے طاقت حاصل کرنے کے واسطے استعمال کرتا ہے اور عوام سے ہمدردی رکھنے والوں کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے اور اہل اقتدار سے کنارہ کشی کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا، شراب اسی کی علامت ہے)

نظام الملک: کس قدر اندھیرا ہے۔ کوئی روشنی، مشعل، کوئی چاندنی، جگنو، کچھ نہیں، ظلمتوں کی زنجیریں چاروں سمت پھیلی ہیں، کچھ نظر نہیں آتا۔

خیام: یہ کون مسخرا تھا، جس نے اس اندھیری کارواں سرائے میں ہمیں بلا کے یوں اُداس کردیا۔

نظام: یہ کیا مذاق ہے بھلا، یہ کوئی بات ہے کہ اس طرح ہر ایک کو بلا کے جھوٹے وعدے اُلٹی سیدھی باتیں کر کے یوں ہنسی اڑائی جائے؟

خیام: یہ ہم ہی بے وقوف ہیں کہ زندگی کی اس شرارتوں کو دوستوں کی گھات میں کچھ اس طرح آگئے کہ بس فریب کھا گئے۔ بھلا یہ کارواں سرائے بھی کوئی جگہ ہے. جس جگہ ہمیں کوئی بلائے گا۔

نظام: ابھی تو کچھ گیا نہیں، چلو کہ گھر کو لوٹ جائیں۔

خیام: مگر یہ لوٹنا، یہ واپسی۔ کچھ ایسی سہل تو نہیں۔ اب آئے ہیں تو دیکھیں کون ہے یہ مسخرا۔

حسن: (قہقہے کی آواز ابھرتی ہے) بس اتنی دیر میں اُداس ہو گئے؟ یہ لو، یہ مشعلیں، یہ رنگ، نور، دوستو!

اندھیرے اور زندگی کا ساتھ ہے
اسی سفر میں ہمرہی کی بات ہے

خیام: حسن، یہ تم ہو؟

نظام: ارے، یہ تم ہو اے حسن؟

خیام: مگر یہ کیا مذاق تھا کہ ہم کو اس اندھیری کارواں سرائے میں بلا کے چھپ گئے۔

اور ہم میں سے ہر ایک خود کو تنہا جان کر اُداس ہو گیا
خود اپنے خوف اپنے دکھ نہیں اکیلے پن میں کھو گیا

حسن: یہ بات دور کی ہے تم سمجھ نہ پاؤ گے۔
یہ دوستوں کی بزم ہے
ہم ایسے دوست ہیں جو زندگی میں آج تک جہاں بھی ہو

ہمیشہ ساتھ ساتھ تھے

وہ گھر ہو کھیل کود ہو کہ مکتب اور مدرسہ — ہمیشہ ساتھ ساتھ تھے

اب آج ہم اک ایسے مرحلے پہ زندگی کے ہیں

کہ راستے الگ ہوئے

نہ جانے مدرسے کے بعد ہم کدھر کا رخ کریں، کہاں کی راہ لیں، نہ جانے کون سی جگہ ہو۔ کون جانے فتح کون پائے، کس کے سر شکست ہو۔

یہ کون جانے کس کے سر پر عظمتوں کا تاج ہو۔

کس کے دل میں حسرتوں کا راج ہو۔

نظام: درست ہے! درست ہے!!

خیام: مگر بھلا یہ کیا مذاق ہے؟

حسن: ذرا تو بیٹھ جاؤ — سامنے ہے شمع روبرو ہے روشنی (سب بیٹھ جاتے ہیں) (آواز دیتا ہے) ساقیا، پیالہ ایک دے شراب ناب سے بھرا (پیالہ بھر کے دیا جاتا ہے) اس پیالے سے پئیں گے آج ہم۔

خیام: پہلے لاؤ ہم پئیں گے، پھر حسن۔ (تینوں ایک ایک گھونٹ لیتے ہیں)

حسن: میں چاہتا ہوں آج ہم۔

کہ اپنے ملک کے سپوت ہیں یہ عہد لیں کہ

چاہے ہم کہیں بھی ہوں، حال کچھ بھی ہو، مگر ہر ایک حال میں

ہم ایک دوسرے کی یاد

نظام: صرف یاد!

خیام: یاد کیوں، ہر ایک کو اسی طرح عزیز اور قریب ہی رکھیں گے ہم۔

حسن: تو پھر یہ عہد ہے۔

نظام: ہماری راہیں مختلف بھی ہوں تو کیا؟

خیام: ہماری قسمتیں جدا جدا بھی ہوں تو کیا؟

حسن: اندھیرے ہم کو گھیر لیں کہ روشنی نصیب ہو۔ ہم ہر ایک حال میں۔

خیام: تینوں دوست، دوست ہیں دوست تھے دوست ہی رہیں گے ہم سدا۔

نظام: یہ دوستی سدا کی ہے۔

خیام: یہ ہمرہی سدا کی ہے۔

حسن: یہ ہمدمی سدا کی ہے۔

خیام: چلو اٹھاؤ جام، پیو کہ عہد جاوداں ہو (تینوں پیتے ہیں)

حسن: ہم اب بلند ہو گئے جہان کی گزند سے۔

زمانے اور وقت کی ہر ایک اونچ نیچ سے۔

وہ تلخیوں کے زخم ہوں یا کامیابیوں کا سستا نشہ ہو۔

کوئی بھی اب ہمارے اور دوستوں کے درمیاں نہ آئے گا۔

گواہ ہے اندھیری کارواں سرائے میں یہ دوستوں کے قہقہے کہ

روشنی اگر کہیں پہ ہے تو یہ دوستی۔

اگر ہے زندگی کہیں تو دوستی (تینوں خوش دلی سے قہقہہ لگاتے ہیں)

تو اب یہ بھید کچھ سمجھ میں آ گیا تمھاری دوستو!

نظام: کہ تم بہت شریر ہو

خیام: یہ دوست بے نظیر ہو

حسن: اندھیرا کچھ تو کم ہوا

خیام: اندھیری کارواں سرائے ہی تو ہے یہ زندگی

کہ جس کی ظلمتوں میں ہم، ہم ایسے سادہ دل

روشنی کے منتظر ہیں پیار کی

دوستی کے منتظر ہیں یار کی

اور اس اندھیری رات میں

اگر کہیں ہے صبح نو تو دوستی

اگر کہیں ہے روشنی تو ہمدمی

حسن: یہ زندگی نہیں کسی کی خواب گاہ ہے کہ روشنی کے ہمدمی کے خواب سے بجی ہے (ایک خوفناک قہقہہ)

خیام: یہ کون ہنس رہا ہے؟

نظام: کوئی راہ گیر ہے

حسن: نہیں، یہ لائے خور ہے۔ یہ پگلا کارواں سرائے کے شراب خانے میں یوں ہی مست اینڈتا ہے، کبھی گدھے ہنکاتا ہے، کبھی خودان پر بیٹھ کر اپنی رَو میں گاتا گنگناتا ہے، کام کاج ہے نہیں، پہ ہر شراب خانے سے شراب کی تلچھٹیں ہی مانگ تانگ لیتا ہے اور انٹ سنٹ بکتا رہتا ہے۔

لائے خور: سنا یہ تم نے قہقہہ؟

ہاں یہ میں ہوں، لائے خور کہتے ہیں مجھے۔

کہ میں شراب خانوں سے چُرائی مانگی تلچھٹوں پر جی رہا ہوں

میں نے زندگی سے، شادیانیوں سے، راحتوں سے

اپنے آپ کو فروخت ہی نہیں کیا (ہنستا ہے) میں ایسا ''مال'' ہوں جسے کوئی خریدتا نہیں۔

چلو میں بے وقوف ہی سہی

مگر یہ تینوں دوست کتنے بے وقوف ہیں کہ

ایک کچے عہد پر قدم جمائے

آنے والے کل پر ہنس رہے ہیں

کیسے بھولے لوگ ہیں

کیسے بے مثال ہیں

دیکھتے ہیں کون بے وقوف ہے

نہ میں کہ یہ؟

(تینوں آتے ہیں اور گدھوں پر سوار ہوتے ہیں)

دوسرا اسین

راوی: گزر گئے کئی برس
اسی طرح خزاں کے اور بہار کے
گلاب نیشاپور کے کھلے مہک کے رہ گئے
وہ سوکھ کر زمیں پہ ڈھیر ہو گئے
ہر ایک رہ گزار پر
اداس پتیاں بکھر کے گزرے قافلوں کی داستاں سنا گئیں

(اسٹیج پر روشنی بڑھتی ہے اور عمر خیام کے مکان کا سیٹ سامنے آتا ہے، پشت پر زنان خانے کی محراب ہے جو زینے کے اوپر ہے، زینے کے اوپر عمر خیام دوربین سے آنکھیں لگائے ستاروں کو تک رہا ہے۔)

ستارے کتنی دور ہیں

بیوی: عمر! عمر! کہاں ہو تم
بھلا کہاں کہاں میں تم کو ڈھونڈھ آئی ہوں۔

عمر: ستارے کتنی دور ہیں
ہر اک ستارہ، دوسرے سے کتنی دور، پھر بھی ایک ڈور میں بندھا ہوا
اک کشش کا ایک مدار کا شکار
کوئی بھی اپنے آپ ایک پل اِدھر اُدھر نہ جائے گا
کہ ان کی گردشیں اسیر ہیں

بیوی: یہ کیا ہوا آپ کو؟
یہ کس جہاں میں کھو گئے

کہاں ہیں آپ
زمانے بھر کے لوگ سونے چاندی جھولیوں میں بھر رہے ہیں
کام کاج میں لگے ہیں
کوئی خان، کوئی شاہ، کوئی میر — اور آپ
صرف تاروں پر نظر جمائے کو بکو
تک رہے ہیں

عمر: یہ کیا ہوا، بتاؤ تو۔ مری تلاش کس کو ہے؟

بیوی: نیچے سہ دری میں بھی تو راہ تک رہے ہیں آپ کی
نہ جانے کتنے دکھ بھرے مریض ہیں جو زخم، روگ لے کے آئے ہیں
نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو مشورے کو آئے ہیں
مگر بھی غریب ہیں بھی دعائیں خالی جیب لے کے آئے ہیں
بھلا ہماری گاڑی کس طرح چلے گی؟

عمر: ہمارا بھی فرض ہے کہ ان کا درد بانٹ لیں

بیوی: نہیں، نہیں، بہت ہوا۔ اب آپ مفت خوروں مفلسوں کا رخ نہ کیجیے
میں چاہتی ہوں آپ بھی تو ایک بار صرف ایک بار اپنا بھاگ آزمانے قلعہ جائیے
آپ تو حکیم ہیں شعر آپ لکھتے ہیں، نجومی اور مفکر ہیں
لکھئے ایک قصیدہ اور کسی کے واسطے سے بادشاہ کو سنائیے کہ
وہ جواہرات دیں سونے چاندی موتی مونگے دیں
مرتبہ ملے تو دکھ کٹے
یہ مفلسی کا بوجھ اپنے شانوں سے ہٹے

عمر: مگر یہ علم اپنے آپ، دوسروں کو جاننے کی راہ ہے۔ یہ کھوٹا سکہ تو نہیں لیے پھروں، بادشاہوں سے بھنا کے دام اور درم بناؤں۔ اور اپنے جیسے دوسروں سے منہ چھپا کے مجرموں کی طرح محلوں اور دو محلوں میں میں زندگی کروں۔ یہ علم اس لیے نہیں۔ اگر اس

کا کوئی مول کوئی کام بس تو صرف یہ ہے بوجھ بانٹنا، یہ ہے صرف دوسروں کے دکھ کو جھیلنا اور اس کو دور کرنا، ہو سکے تو۔

بیوی: میں تم سے بحث اور مباحثہ تو کر نہ پاؤں
مگر میں اور کتنی دیر تک
یہ مفلسی غریبی جھیل پاؤں گی؟
تمھیں بتاؤ خالی ہاتھ کیسے زندگی کٹے؟

(اچانک ایک جوان دوشیزہ ایک نوجوان کو پکڑے داخل ہوتی ہے۔ جس کے سینے سے خون بہہ رہا ہے)

حنا: خدا کے واسطے میری مدد کریں
یہ نوجوان میری زندگی ہے
ظالموں نے اس کو ایسا زخمی کر دیا کہ اس کا بچنا اب محال ہے
خدا کے واسطے میری مدد کریں
یہ دیکھتے ہیں کیسا خون رس رہا ہے اس کے گھاؤ سے
یہ دیکھتے ہیں کیسا یہ نڈھال ہے
خدا کے واسطے اسے بچایئے

عمر: وہ جانور کون تھے؟

حنا: جانور نہیں، سپاہی تھے وہ فوج کے سپاہی تھے۔

بیوی: فوج کے سپاہی؟

حنا: وہ ایک امیر کے سپاہی تھے جو اس کو قید کرنے آئے تھے۔

عمر: مگر یہ جرم کیا تھا؟

حنا: جرم بے گناہی تھا۔

عمر: لٹاؤ اس کو (لٹا کر معائنہ کرتا ہے، ہاتھ سے بیوی مرہم پٹی کا سامان لانے کو کہتا ہے دونوں اسے پکڑ کر لٹاتے ہیں) پہلے اس کا زخم ٹھیک ہو تو خون تھمے۔ یہ کافی گہرا زخم ہے

وہ بھی ٹھیک سینے پر۔ (مرہم پٹی کرتا ہے)

کامران: جرم پوچھتے ہو کامران کا؟

ہمارا جرم ہے غریبی، مفلسی، ہمارا جرم ہے تو بے بسی و بے کسی۔

ہمارے خالی ہاتھ ہی ہمارے سارے پاپ ہیں

ہماری خالی جیب ہے ہمارا یہ گناہ ہے

عمر: خموش نوجوان خموش۔

حنا: خموش۔ کامران، خموش، کا جو کچھ تو خون اور بھی بہے گا کامران، خدا کے واسطے خموش۔

کامران: مرا گناہ یہ ہے اے حکیم

کہ میں نے اس دیار کے گداگروں کو، مفلسوں کو، کھیت ہاروں کو، کسانوں کو بتایا وہ بھی آدمی ہیں، ان کو زندگی گزارنے کا حق ہے، وہ زمین سے بندھے ہوئے نہیں

کہ ڈھور ڈنگروں کی طرح سے امیر زادے ان کو بیچتے خریدتے رہیں

وہ کہتے ہیں یہ کفر ہے

وہ کہتے ہیں میں مزدکی ہوں

وہ کہتے ہیں میں پھر گیا ہوں دین سے، میں باغی ہو گیا ہوں سلطنت کے اس نظام سے

(تھک جاتا ہے، سانس لیتا ہے)

تمھیں کہو یہ جرم ہے؟

تمھیں بتاؤ زندگی کا نام لینا پاپ ہے؟ میں مزدکی ہوں تو بتاؤ کون مزدکی نہیں۔

(بیوی دوا لے کر آتی ہے)

حنا: یہ بچ تو جائیں گے؟ خدا کے واسطے بتایئے

میں ان کی ہو چکی ہوں دل سے جان سے

یہی میرا جہان ہے یہی ہے میری زندگی

میں ان کو قول دے چکی ہوں

مرا سہاگ ہوں گے تو یہی

خدا کے واسطے انھیں بچائیے۔

عمر: (بیگم سے) اسے بتاؤ آدمی کا اختیار کچھ نہیں، اگر کچھ اختیار ہے تو صرف اتنا زندگی سے چند لمحے چھین لے، انھیں کچھ اپنے طور پر گزار لے۔

بیوی: نہ رو میری بہن، نہ رو۔

خدا رحیم ہے، جو ہم سے ہو سکے گا ہم کریں گے

تیرے گھاؤ، تیرے زخم، تیرے درد تیرا دُکھ ہمارا سب کا ہے

عمر: یہ دُکھ ہے کائنات کا، یہ دکھ ہے ذات ذات کا۔

(دروازے پر دستک)

بیوی: کون ہے

حنا: (چونک کر) یہ کون ہے

(فوجی سپاہی تاج الملک کی سرکردگی میں اندر داخل ہوتے ہیں)

پہلا سپاہی: ٹیپ امیر زادے کے سپاہی ہیں! امیر زادہ تاج الملک۔

تاج الملک: ٹیپ ہاں، یہی ہے مزدکی۔

یہ ملک وقوم کا گناہ گار ہے

باغی بادشاہ کا

اسے پناہ جو بھی دے وہ خود گناہ گار ہے

عمر: مگر یہ زخمی ہے۔

تاج الملک: اسے حوالے کر دو تم۔

ہم اس کو لے کے جائیں گے۔

حنا: مگر لہولہو ہے یہ،

یہ راستے میں مر گیا تو کون ذمہ دار ہے؟

تاج الملک: ٹیپ خموش، بدزبان لڑکی۔

جانتی ہے تو سزا، ہمارے کام میں رکاوٹوں کی موت ہے؟

یہ کارِ سلطنت ہے
فوجیو! اٹھاؤ نوجوان کو!

عمر: نہیں نہیں، کہ یہ میرا مریض ہے۔

تاج الملک: ٹیب یہ جانتے ہو مزدکی ہے یہ؟
یہ کہتا ہے کہ آدمی چھوٹا ہو بڑا ہو، بادشاہ ہو گدا ہو
سبھی برابری کے دعوے دار ہیں، زمین ان میں بانٹ دو
امیر زادوں کو گداگروں کے ساتھ حصہ دو، کسی کے پاس دھن نہ جائیداد ہو
سبھی کو روٹی روزی سے نجات ہو، ہر ایک شخص روزگار پائے، صحت و ثبات پائے۔
علم اور حیات پائے — سنتے ہو یہ باغی ہے خدا کا بادشاہ کا۔
یہ مزدکی گناہ گار ہے نظام کائنات کا

عمر: کوئی بھی ہو یہ آدمی مریض ہے۔
حکیم ہوں تو اس کی جان اپنی جان کی طرح مجھے عزیز ہے۔

تاج الملک: ٹیب خلاف ورزی ہے ہمارے حکم کی۔
حکیم راستے کو چھوڑ دو، ہمارے فوجیوں کے راستے کو چھوڑ دو۔
یہی ہمارا حکم ہے۔

حنا: ذرا تو رحم کیجیے، خدا کے واسطے اسے بچائیے۔

تاج الملک: خموش، بدزبان، حسین لڑکیاں اور ایسی بدتمیز۔ اسے بھی ساتھ لے چلو کہ قلعے میں کنیز بھی تو چاہیے۔
(فوجی آگے بڑھتے ہیں)

عمر: اور اس کا جرم؟
یہ بھی مزدکی ہے کیا؟

تاج الملک: حکیم! تم نے کب سے یہ طریقہ اختیار کرلیا؟
گناہ گاروں کے گناہ میں شریک ہو تو پھر سزا میں بھی شریک ہو گے؟

کیوں؟

تمھارا کیا خیال ہے؟

عمر: اگر یہ جرم ہے کہ بے گناہ دکھ نہ پائیں۔

اگر یہ جرم ہے کہ گھائلوں کے خون سے زمین لالہ گوں نہ ہو

اگر یہ جرم ہے کہ نوجوان دل دھڑک دھڑک کے چپ نہ ہوں

اگر یہ جرم ہے کہ ظالموں کے ظلم سے بچائیں مفلس اپنی آبرو

تو میرے جرم کی سزا دو، میں گناہ گار ہوں۔

تاج الملک: (فوجیوں سے) بہادرو! سپاہیو!

بڑھو اور اپنے قیدیوں کے ہاتھ پاؤں باندھ لو۔

ہمیں یہ حکم ہے کہ مزدکی جہاں بھی ہوں انھیں پکڑ کے لائیں شاہ کے حضور میں۔

اٹھاؤ، ہاں اٹھاؤ۔

زخمی نوجوان کو

پکڑ کے لے چلو، ذرا اس حسین طوفان کو، کہ ایک دن یہ شاہ کی کنیز ہوگی۔

حنا: (سپاہیوں کی حراست میں آنے کی مزاحمت کرتی ہے) عذاب ٹوٹے، قہر ٹوٹے ظالمو!

تمھاری ماؤ بہنو پر بھی ایسا ہی عذاب ہو (ہاتھ باندھ کر سپاہی حنا کو قبضے میں کر لیتے ہیں)

تاج الملک: حکیم کو بھی ساتھ لے چلو۔

انھیں یہ مزدکی مریض بھی عزیز ہیں (ہنستا ہے)

حکیم جی! یہ سن رکھو ہمارا نام تاج الملک ہے

سنو گے جلد ہی کہ ہم وزیر مملکت ہوئے

اور ہمارا پہلا فیصلہ تمھارے شانوں سے ہمارا سر جدا کرے گا، یہ درست ہے۔

سن رہے ہو!

عمر: درست ہے جو ہو سکے تو وقت کے بھی ہاتھ باندھ لو، ہوا جو چل رہی ہے اس کو قید کر لو،

لے چلو، یہ روشنی بھی چھین لو، جو سورج اور چاند سے بکھر کے ہر امیر، ہر غریب تک پہنچتی

ہے۔ مگر نہیں، یہ وقت یہ زمانہ کس کے ساتھ ہے؟ ستارے کس کے ساتھ ہیں؟ یہ وقت ہی بتائے گا۔

تاج الملک: بس اب ایک لفظ، ایک حرف بھی نہیں! خموش کردو فوجیو! ان سبھوں کو لے چلو، حضور شاہ میں انھیں کو پیش کر کے ہم وزیر ہوں گے۔ خلعت مراد پائیں گے۔

(فوجی تینوں کو گرفتار کر کے لے چلتے ہیں۔ تھوڑی دور تک، بیگم کی آہ و زاری سنائی دیتی ہے اور پھر گھوڑوں کی ٹاپوں میں کھو جاتی ہے۔)

تیسرا اسین

(شاہی محل سرا — رات کا وقت، مشعلیں روشن ہیں، رقص جاری ہے)

(ترکان خاتون کے سامنے کنیز بیٹھی بربط چھیڑ رہی ہے۔ رقص ہو رہا ہے۔ غزل گائی جا رہی ہے کہ اچانک ایک چھناکے کے ساتھ کنیز داخل ہوتی ہے ترکان ہاتھ سے رقص کو روکے جانے کا اشارہ کرتی ہے اور تخلیے کا حکم دیتی ہے، سبھی کنیزیں رخصت ہوتی ہیں۔)

ترکان خاتون: (گردن سے اشارہ کرتی ہے، تاج الملک داخل ہوتا ہے اور تسلیمات بجالاتا ہے)

نہیں، نہیں، تمھیں کبھی نہ عقل آئے گی
اب آئے ہو کہ ساری بازی ہو چکی
زمانہ چال چل چکا
بساط تہہ بھی ہو چکی
نظام ملک پھر وزیر بن چکا
تم نے ایک بار پھر سے سارے موقعے کھو دیے۔

تاج الملک: مگر ملکۂ عالم۔

غلام مزد کی مہم پر تھا تو حکم شاہ سے

ترکان: ہمیں خبر ہے

تمھارا کیا خیال ہے؟

شاہ کیا گدا ہے کیا بھکاری ہے؟

تمھاری اس مہم پر منحصر ہے جس کی زندگی

کیا سمجھتے ہو کہ تم نے سلطنت پہ ملکہ، بادشاہ پر بڑا کرم کیا؟

تاج الملک: نہیں، میں آپ کا غلام ہوں۔

ترکان: غلام ہی رہو گے تم

یہ جانتے ہو تم کہ ہم تمھارے قدر دان ہیں

یہ چاہتے ہیں ہم، کہ تم وزیر سلطنت ہو

ہمیں نظام ملک سے ہے نفرتِ شدید

اسے نکال کر وزارت

ہم تمھیں کو سونپتے

پہ تم نے اتنی دیر کی کہ سارے فیصلے تمام ہو چکے

اب آئے ہو تو کیا؟

سدا کی طرح تم سپاہیوں کے بیچ ہی رہر گے

بے وقوف ہو

تاج الملک: غلام کو سدا قلق رہے گا۔

حکم ہو تو میں بھی کچھ کہوں؟

ترکان: فضول ہے۔

کہنا سننا اب محض فضول ہے

تاج الملک: وقت ابھی گیا نہیں۔

ابھی تو ہار ماننے

نظام ملک کو وزیر ماننے کی بات دور ہے
مجھے تو آپ کی مدد پر آپ کے کرم پر اعتماد ہے
غلام سازشوں کا جال یوں بچھائے گا
کوئی سمجھ نہ پائے گا۔

ترکان: سدا کے بے وقوف ہو۔
تمھیں خبر نہیں تمھاری غیر حاضری میں وقت تم کو چھوڑ کر کہاں نکل گیا۔ نظام ملک اب
وزیر ہے اور اس کے دوست اور رفیق اب مشیر ہیں
حکومت ان کے ہاتھ میں ہے
شاہ ان کے ساتھ ہے
ہم بھی کچھ نہ کر سکے

تاج الملک: یہ کون سے مشیر ہیں؟

ترکان: وہی حسن صباح اور عمر کہ تینوں دوست ہم سبق تھے ساتھ تھے۔

تاج الملک: حضور ملکہ ان کا کیا مقام ہے؟
جو حکم ہو تو سب کا کام
ایک دم تمام ہے، بس ایک اشارہ چاہیے
عمر ہے میرے دام میں
اس کا جرم ہے کہ مزدکی جوان کو پناہ دے کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا
یہ تینوں بدنصیب — حسن، عمر، نظام منحرف
خدا کی راہ سے ہٹے ہیں، ملحد اور بے دین ہیں

ملکہ: تمھارا فیصلہ ہے یہ

تاج: یقین مانیے کہ اسی پر کل کو مہر بھی لے گی قاضی، مفتی اور امام کی
یقین جانیے کہ وقت انتقام
جلد آئے گا

ملکہ: ہم اس کے منتظر ہیں تاج ملک

یہ جانتے نہیں ہمارے دل کی آگ ریشم اور پرنیاں کو راکھ

دھڑکنے والے دل کو داغ

ہر ایک نغمہ کو کراہ، گیت کو ایک آہ کرتی ہے اک آن میں

زمانہ یہ بھی دیکھے گا کہ

آج کے تنے ہوئے، غرور سے بھرے ہوئے یہ سر جھکیں گے کل ہمارے سامنے

ہمارا غیظ اور غضب ہمارا غصہ

جگمگاتے سورجوں کی کھال کھینچ لے گا، چاندنی کو سوگوار، تاروں کو یتیم کر کے ہی

سکون پائے گا۔

جاؤ— تاج! ہم آنے والے وقت کی ہر ایک چاپ غور سے سنیں گے

وہ دیکھو سامنے

(مشعل برداروں کا جلوس سامنے سے گزرنے لگتا ہے)

محل میں اب جہاں پناہ جلوس کرنے والے ہیں۔

(مخملیں پردے کھینچ دیے جاتے ہیں)

نقیب: نگاہ روبرو نگہدار

جہاں پناہ کا جلوس ہے

کہ جن کی سلطنت ہے چار سو

ادب! ادب!!

نگاہ روبرو ہو سرو قد کھڑے رہو

شاہ: (دائیں بائیں نگاہ ڈالتا ہے۔ سبھی امیر وزیر سلامی دیتے ہیں)

خوشی ہوئی ہمیں کہ تاج ملک نے مہم کو سر کیا

ہماری فوج سرخرو ہوئی

ہماری سلطنت کے باغیوں کے قلم سر ہوئے

تاج ملک! کتنے قیدی لائے ہو؟

(تاج ملک آگے بڑھ کر سلام بجا لاتا ہے، اس کے
اشارے سے قیدی آگے لائے جاتے ہیں جن کے چہروں پر نقاب
ہیں)

شاہ: صرف تین!

تاج الملک: جہاں پناہ! باقی قید خانوں میں سزا بھگت رہے ہیں۔
قاضی کی عدالتوں میں پیش ہوں گے آج ہی، مگر یہ تینوں
منتظر ہیں فیصلوں کے آپ کے!

شاہ: نقاب ہٹاؤ، یہ نوجوان کون ہے جو اس طرح لہولہو ہوا؟

تاج الملک: یہ کامران ہے حضور، باغی نوجوان مزدکی جو سلطنت کے لوگوں کو برابری کا درس دے
کے شاہی کے خلاف کام کر رہا تھا، تخت کے خلاف سازشوں کا سرگردہ تھا۔

شاہ: (طنز سے) یہ مجال! ایک نوجوان اور پوری فوج سے مقابلہ!

تاج الملک: جہاں پناہ سزا ہے اس کی موت۔

شاہ: ٹھہرو تاج ملک، یہ زخمی نوجوان ہے۔
ابھی تو اس کا سینہ زخم زخم ہے۔ ہم ایسے زخمیوں کو موت کے سپرد کر کے کیا کریں گے،
اسے شفا ملے تو بات ہو۔
ہم اس کی بات بھی سنیں تو منصفی کریں۔ بلاؤ قیدی دوسرا!

تاج الملک: (نقاب الٹ دی جاتی ہے) یہ ایک حسینہ حنا، کامران سے بہت قریب ہے۔

حنا: (سپاہیوں کے ہاتھ سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) جہاں پناہ! یہ بے قصور
ہے۔ یہ میرا ہے میں اس کی ہوں۔
میں اس کو جانتی ہوں۔

تاج الملک: اس نے شاہی فوج پر بھی ہاتھ اٹھایا تھا۔

شاہ: سننے دو (حنا سے) تو لڑکی، وہ تو بے قصور ہے پہ تم؟

ہمیں بتاؤ

تمھارا کیا قصور ہے؟

حنا: حضور، بے قصور ہوں۔

میں اپنے مرد کو بچانا چاہتی تھی

کون ہے جو اپنے پیار کے لیے تڑپ نہیں اٹھے گا

کون ہے جو اپنی جان اپنے پیاروں سے بھی زیادہ چاہے گا

شاہ: اسے حرم میں بھیج دو

حنا: مجھے جہاں بھی چاہیں بھیج دیں حضور، پہ

کامران کی جان بخش دیجیے۔

میں اس سے دور زندہ نہ رہ پاؤں گی

شاہ: یہ فیصلہ بھی ہو رہے گا!

پہلے کامران کے زخم بھر چکیں

وہ تندرست ہو

تو اس کا فیصلہ بھی ہو رہے گا

تاج الملک! تمھارا تیسرا اسیر؟

تاج الملک: یہ نیشاپور کا حکیم ہے۔

حکیم ہی نہیں فلسفی ہے، ماہر نجوم ہے ستاروں پر نظر ہے اور زمین سے دور ہے۔

شاہ: اور قصور!

تاج الملک: باغی کامران کے واسطے شاہی فوج کا مقابلہ۔

ہمارے کام میں رکاوٹیں

مزاحمت!

یہ باغیوں کے ساتھ ہے، یہ کہتا ہے کہ سارے لوگ ایک سے ہیں، سب کا درجہ ایک

ہے۔

بادشاہ اور وزیر کچھ نہیں

گدا ہو یا فقیر کچھ نہیں

وہ راہ بر ہو، راہزن

وہ عورتیں ہوں مرد ہوں

وہ عالم اور مولوی ہوں یا مجوسی، مزدکی

ہر ایک اپنا شاہ ہے ہر ایک ہی وزیر ہے

(نقاب اٹھایا جاتا ہے)

نظام الملک: (اچانک آگے بڑھتے ہوئے) جہاں پناہ!

شاہ: وزیر مملکت!

نظام الملک: جہاں پنہ کا حکم ہو تو میری ایک عرض ہے۔

یہی وہ حق شناس ہے

یہی عمر ہے، جو تھا میرا اہم سبق

جو وقت کا عظیم فلسفی، ہمارے دور کا حکیم اور طبیب ہے

ماہر نجوم ہے، ستاروں کی ہر چال پر نظر ہے

جانتا ہے بھید ایک جہان کے

تاج الملک: مگر حضور، یہ تو ـــــ

شاہ: جانتے ہیں مملکت کو خطرہ ہے۔ یہ فلسفی، حکیم، یہ ستاروں کی ہر ایک چال پر نگاہ رکھنے والا، مگر یہ جان لو کہ خطرے مول لینا زندگی سے شاہ کو یہ زندگی عزیز ہے۔ ہمیں یہ آرزو نہیں کہ لمبی چوڑی سلطنت کی سرحدیں وسیع ہوں اور ان وسیع سرحدوں میں گونجیں بھیڑیوں کی چیخ

کتے بھونکتے ہوں، گیدڑوں کی ہاؤ ہو سے گاؤں جاگتے رہیں

عمر کو اگر سزا ملی تو ہم بھی گناہ گار ہوں گے کل کے سامنے

مورخوں کے ہاتھ کون روکے گا

جو دیکھیں گے آپ کے نظام میں علم قید ہو گیا
فکر پا بگل ہوئی، زبان کٹ گئی تھی شعر کی
حکیم یوں زبوں ہوئے کہ آبرو گئی تمام شہر کی
عمر! تم آج سے ہماری سلطنت کے ایک رکن ہو
ستارے دیکھتے رہے، ستاروں کی ہر ایک چال پر نگہ رکھو
ہمارے دور کے لیے بناؤ ایک زیچ ایسی جس کو دیکھ کر زمانے والے یاد کر سکیں ہمیں
ہم ان کو دے سکیں دن کا رات کا حساب
ماہ و سال کا حساب!
حکیم ہو تو قیدی کامران مرے سپرد ہے اسے شفا ملے کہ کوئی بھی نہ یہ کہے کہ
زخمیوں کو بے زبان بنا کے ہم نے قتل کر دیا۔ یہ منصفی نہیں
نجومی ہو تو یہ بتاؤ اگلی جنگ میں ہماری فتح یا شکست ہے؟

عمر: جہاں پناہ کا فیض ہے وگرنہ میں تو کچھ نہیں
میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کچھ بھی جانتا نہیں
وہ لوگ بھی جو دانا اور بینا خود جانتے ہیں کل کا حال جانتے نہیں
صرف اپنے ہی اپنے ہی خیال کے اسیر ہیں، خود اپنی ذات کے کنویں میں قید ہیں
حادثات کے کنویں میں قید ہیں
اگر کسی کو کچھ بھی اختیار ہے تو صرف آج پر
جو قابو ہے تو آج پر ابھی پر اور حال پر — اور اس میں سب شریک ہیں
فقیر ہو کہ بادشاہ، کہ کل سبھی کے سر سبھوں کی شان سب کا حسن
سب کا طنطنہ، گل رخوں کے قافلے
عاشقوں کے زمزمے، امیر اور غریب مرد و عورتوں کے کارواں
زمین کا رزق بن کے گرد دھول ہو رہیں گے اور
ان کی مٹی سے کوئی بنائے گا سبو، کوئی صراحی ڈھالے گا

کوئی گلاب اُگائے گا کوئی لحد بنائے گا

شاہ: نظام ملک، کامراں سپرد ہو حکیم کے!

عمر: حضور، حکم ہو تو ایک عرض ہے

یہ زخمی نوجوان کامران شفا جو پائے اگلی جنگ میں شریک ہو تو اس کے ہاتھ فتح ہو

فوج شاہی سربلند ہو

شاہ: حکیم کی یہ شرط بھی درست ہے۔

چلو ہم اپنی اگلی جنگ میں اسے شریک بھی کریں گے

اور اس کو ایک مورچے کا سرغنہ بنائیں گے

گواہ رہنا اہل عدل

شہ ملک کو آرزو نہیں ہوس نہیں کوئی نہ ملک و مال کی نہ فوج اور نہ جاہ کی ہمیں ہے آرزو

کوئی تو صرف اس قدر کہ آج سے ہزاروں سال بعد آنے والا کوئی شخص مڑ کے دیکھے

گر ہمارے دور کو تو اس کو روشنی خیال کی دکھائی دے

اسے نئی نظر ملے اسے ماہ و سال کا نیا حساب رات دن

کیا زیچ اور علم کی نئی پرکھ ملے

کوئی تو یہ کہے کہ شہ نے علم و فضل کے لیے خود اپنی مملکت کو

اپنے راج کے لیے بھی خطرہ مول لے لیا

(حکم دیتا ہے)

نقیب: ہوشیار، نگہدار

ختم ہوا دربار!

چوتھا سین

راوی: اسی طرح گزر گئے
نہ جانے کتنے فاصلے
خزاں کے اور بہار کے
جو سینے زخم زخم تھے وہ پھر سے گلستاں ہوئے
لہولہو جو پھول تھے وہ کھِل کر پھر مہک اُٹھے
جو آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں یاس سے
پھر ایک دم چمک اٹھیں
ہوا نے پھر سے گیت چھیڑا
زندگی چہک اٹھی

(خیام کے دیوان خانے میں زریں پٹکا باندھے ہوئے کامران کھڑا خیام کی بیگم کو آداب بجالاتا ہے)

کامران: مجھے جو زندگی ملی وہ آپ سے
دوا بھی آپ ہی نے دی علاج آپ نے کیا
مجھے تو ماں کا پیار آپ نے دیا

بیگم: خدا کرے تجھے تمام راحتیں ملیں
ہر ایک جگہ فتح ساتھ ہووے
مسرتیں ملیں
اور جلد ہی حنا کا ہاتھ ہاتھ ہو تیرے

(جنگ کا طبل بجنے لگتا ہے، عمر خیام داخل ہوتا ہے)

عمر: ابھی گئے نہیں ہو کامران
سن رہے ہو طبلِ جنگ

انتظار ہے کہ تم چلو تو دستہ فوج کا چلے

کامران: (قدموں میں جھک جاتا ہے) بابا! آپ کی دعا کا انتظار ہے
یہ جنگ میری زندگی کی جنگ ہے
بڑا ہی سخت مورچہ ہے اس کو فتح کر لیا تو میں حنا کو پاؤں گا
حیات اور زندگی کو پاؤں پیار اور روشنی کو پاؤں گا

عمر: جاؤ کامران جاؤ۔
وقت تیرے ساتھ ہے کہ فتح تیرے ہاتھ ہے

کامران: بابا! میرے دل میں خوف ہے۔
یہ خوف فوج کا نہیں، یہ خوف جنگ کا نہیں
یہ خوف ہے کہیں حنا مری نہ ہو سکے
وہ اپنے وعدے بھول تو نہ جائیں گے

عمر: وہ طبل سن رہے ہو
جنگ کی صدا پر جانے والے کو ہمیشہ ہمت اور حوصلہ ہی چاہیے
کہ خوف اور ہراس اس کی موت ہے
بس ایک بار ہے یہ زندگی
جیؤ تو شان سے جیؤ

(عمر خیام کامران کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے ماتھا چومتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اس کی کمر میں تلوار لگاتا ہے۔ طبل زور زور سے بجنے لگتا ہے اور کامران رخصت ہوتا ہے)

بیگم: بدن کے زخم بھر گئے
خدا کرے کہ دل کا زخم بھی بھرے۔
وہ جنگ جیتے فتح یاب ہو، حنا کا ہاتھ ہاتھ میں ہو اور سرفراز ہو

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

(عمر سے، جو دوربین سے پھر نظر لگائے ہوئے ہے)

لو پھر ستارے دیکھنے لگے

نگوڑے ان ستاروں میں دھرا ہی کیا ہے؟

عمر: انھیں میں رات دن ہیں

ماہ و سال ہیں

ہزار موسموں کے راگ رنگ دھوپ چھاؤں ہے

اسی میں گردشیں ہیں، گیت ہیں، نشاط ہے

انھیں ستاروں سے تو زیچ شاہ کے لیے بنائیں گے

وقت کم ہے فرصتِ حیات کم

یہ میری آرزو ہے جس سحر کو کامران آئے فتح کی خبر لیے

اسی کے ساتھ میں بھی زیچ لے کر شاہ کی نذر کروں

وہ اپنی زندگی کا یادگار لمحہ ہوگا میری جاں

ستارے، چاند، آسماں یہ زمیں — کائنات کا ہر ایک موڑ

میری دسترس میں آئے گا!

(نقاب پوش حسن داخل ہوتا ہے)

حسن: (داخل ہوتے ہوئے) ہماری دسترس میں آئے گا

عمر: یہ کون ہے، اچانک! اس طرح!! یہاں!!!

حسن: یہ میں ہوں تم معاف کرنا دوست، پھر ستارے کھینچ لائے ہیں

وہ کارواں سرائے کی اندھیری رات یاد ہے

کہ شمع رکھ کے سامنے قسم یہ ہم نے کھائی تھی کہ زندگی کے موڑ پر رہیں گے ساتھ ہم

یہ جانتے ہوا ے حسن، نظام نے قسم وہ توڑ دی

عمر: نہیں حسن، نظام اپنا دوست ہے وہی تو تم کو شاہ کے قریب لایا

اسی نے مجھ کو عزت اور مرتبہ دیا

حسن: نہیں عمر، یہ سب فریب ہے۔ وہ دولت اور عزت اور مرتبے تو دیتے ہیں
یہ طاقت اقتدار بانٹتے نہیں
یہ سب وزیر اور امیر ایک سے ہیں ان کا عہد ان کے وعدے، ان کی دوستی بھی حسین دھوکے ہیں، جو ان کے پاس آئے گا خود اپنی جاں سے جائے گا

عمر: نہیں، نہیں حسن، یہ بھول ہے۔
نظام نے تمھیں بلایا، بادشاہ کے حضور لا بٹھایا
سنا ہے بادشاہ نے تمام مملکت کے محاصلوں کا کھاتے کو بنانے کو کہا تو تم نے تھوڑے وقت میں بنانے کا بھی ذمہ لے لیا۔ اور جب یہ کھاتہ تم بنا کے لائے
تو بھی بادشاہ کو مطمئن نہ کر سکے۔

حسن: اور نظام نے کہا کہ ایسے کام جلد بازی سے نہیں سکون ہی سے ہوں گے

عمر: ہاں، تو کیا بُرا کہا۔

حسن: نہیں، تمھیں خبر نہیں۔
یہ اہلِ اقتدار ہیں، یہ بات کیسی ہی کریں، یہ کب کسی کے ہو سکے ہیں کب کسی کے ہو سکیں گے، میرے دوست؟
وہ ہم کو لالچی کہیں گے بے وفا کہیں گے
مگر میں جانتا ہوں ان کی زندگی، ان کا سارا رعب اور جلال
طاقت اور شان
میرے بائیں ہاتھ میں ہے میرے بند مُٹھی میں اسیر ہے
میں کہنے آیا ہوں عمر
بتانا یہ نظام کو — کہ اب پرانا دور ختم ہے
ہمارا اور اس کا جو بھی عہد تھا شکست ہو گیا
میں اس نظام کے پرخچے اڑاؤں گا
جو طاقت آزمائے گا وہ درد و غم اٹھائے گا

مرے فدائی ہر جگہ ہیں

فوج میں وزارتوں میں عملے میں محل میں ہر جگہ ہیں

جو بھی سر اٹھائے گا انھیں کے ہاتھ اپنی جان گنوائے گا

عمر! سلام ہو تمھیں

نظام کو پیام دو کہ دوستی کا خاتمہ ہوا

حسن کے ہاتھ میں ہے سلطنت کی دھوپ چھاؤں

پتہ نہیں کہ کب ملیں، کہاں ملیں

(اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

عمر: سنو، حسن! سنو

میری بات تو سنو

حسن: کچھ اور سننے کو رہا نہیں

جو اہل اقتدار ہیں

وہ صرف ایک زبان سمجھتے ہیں

زبان خنجروں کی جانتے ہیں

ان سے اور کوئی بات کرنا ہی فضول ہے

الوداع اے عمر!

پھر کبھی کسی پرانی کارواں سرائے ہیں

دوبارہ پھر ملیں گے

(نقاب چہرے پر ڈال لیتا ہے اور جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

بیگم: یہ کون تھا؟

عمر: کوئی نہیں۔

بیگم: دوست تھا پرانا یا کہ خوں کا پیاسا تھا کوئی

عمر: بھلا یہاں پہ کون کس کو جانتا ہے

دوست کون ہے عدو ہے کون

مگر وہ ایک موڑ تھا ہماری اور تمھاری زندگی کا

وہ دوستی، مروت اور محبتوں کے لاکھوں بھید کھول کر گزر گیا

یہاں نہ کوئی دوست ہے

یہاں نہ کوئی وعدہ ہے

یہاں نہ کوئی ریت ہے نہ میت ہے

بس ایک آندھی ہے جو چل رہی ہے وقت کی

ہزاروں تودے ریت کے ہماری اور تمھاری صورتوں کو گرد کرتے جارہے ہیں

سارے چہرے دھندلے ہیں

نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی میت ہے یہاں

وزیر ہے نہ بادشاہ، نہ علم ہے نہ دین ہے

اگر ہے کچھ تو مصلحت

اسی کے سر پہ تاج ہے وہی تو شہ نشیں ہے

تمھاری اس زمین سے میرے ستارے اچھے ہیں

(دوربین سے ستارے دیکھنے لگتا ہے، بیگم سر کو ہلا کر حیرت کا اظہار کرتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

پانچواں سین

(ترکان خاتون کا محل)

(ترکان تخت پر براجمان ہے سامنے رقاصاؤں اور کنیزوں کے پرے ہیں مقابل حنا ہے جو دلہنوں کی طرح سجی ہوئی ہے)

ترکان: ہے آج فیصلے کا دن

گئے وہ لمحے انتظار کے
بہت دنوں سے جس کی راہ دیکھتے تھے ہم
وہ لمحہ آ گیا
تمھیں بھی کچھ خبر ہے اے حنا؟
کہ ہم نے کیوں طلب کیا تمھیں؟

حنا: (جھک کر تسلیم بجالاتے ہوئے) حضور کے کرم کے اور
ملکہ جہاں کی مہربانی کے سوا
مجھے کوئی خبر نہیں!

ترکان: یہ شاہی ایلچی تمھارے سامنے کھڑا ہے (شاہی ایلچی تسلیم بجالاتا ہے)
یہ سیدھا مورچے سے آ رہا ہے
ہم نے جنگ جیت لی!
تمھارے کامران نے جنگ جیت لی

حنا: سچ!
حضور کیا یہ سچ ہے!!

ترکان: ہاں، یہ سچ ہے۔
اور ہمیں خوشی ہے کہ کامران کی امانت
آج ہم اور شاہ دونوں اس کے ہاتھ سونپ دیں گے
تم آج سے اسی کی ہو
کہ سلطنت نے تم کو کامران کو بخشا ہے

حنا: مرے خدا!
مرے خدا!!
تیری عنایتوں کا شکر کیسے ہو ادا
ملکہ اور شاہ نے جو بخشی زندگی مجھے

آپ نے کرم کیا کہ ہم کو اس طرح نوازا ہے

کہ مُردہ تن میں جان پھونک دی

بڑی کریم ہیں حضور

زمیں پہ سایہ ہے خدا کا گر کوئی تو آپ ہیں

کسی کو ہوگا سجدہ گر روا تو آپ ہیں

ترکان: سنو حنا

اسی لیے تمھیں دُلہن کی طرح سے سجا کے اور بنا کے یوں بلایا ہے۔

ہمارا حکم ہے کہ جب بھی کامران آئے محفل نشاط ہی کے درمیان

ہم تمھارا ہاتھ اس کے ہاتھ دیں

دُلہن بنا کے ہم وداع کریں

کامران ابھی کسی بھی وقت اپنے فوجی دستے ساتھ لے کے

شادیانے فتح کے بجاتا

پایہ تخت آتا ہوگا

ہم بھی دیکھتے ہیں تم بھی منتظر رہو!

حنا: حضور! سچ یہ ہے کہ آپ نے

کامران ہی نہیں مجھے بھی موت سے بچالیا

(سامنے جا کر اپنی گردن میں لٹکے ہوئے تعویذ کو دکھاتی ہے)

کہ میرا عہد تھا یہی کہ کامران نہ پا سکی تو زہر کھا کے سو رہوں گی

اسی لیے یہ زہر ہر گھڑی سوتے جاگتے ہمارے ساتھ تھا

ترکان: (زہر دیکھ کر آنکھیں چمک اٹھتی ہیں مگر مکاری سے کہتی ہے) مگر اب کا ذکر کیا؟

ہنسو کہ اب حیات مہربان ہے

کہ موت کی نہیں ہے زندگی کی بات ہے

نشاط و کیف، شادمانیوں کا دن ہے

یہ آج شاہی حکم ہے کہ شہر کو دلہن کی طرح سے سجاؤ
گل فروش آئیں، پھول والے آئیں، سارے شہر کو سجائیں
قصر کو دلہن بنائیں
مطرب اور مغنی اپنی زندگی کا سب سے مست اور رنگیلا گیت گائیں
اس طرح سجے ہمارا یہ محل یہ بارگہ
کہ آسماں پہ چاند تارے ماند ہوں
ہر ایک طاق ہر دریچہ ایسا دل نشیں ہو کہ زندگی بھی جھوم اٹھے
بلاؤ تو کہاں ہیں
راگ رنگ والی ٹولیاں
وہ رقص کرنے والیاں

(ناچنے والی کنیزوں کی ٹولی ناچتی ہوئی آتی ہے)

شمع کو جلوۂ پروانہ مبارک ہووے | عشق کو مرگ جوانانہ مبارک ہووے
ساقی و شیشہ و پیمانہ مبارک ہووے | جھومنا مستی میں لہرانا مبارک ہووے
زلف کو دل کا یہ آئینہ مبارک ہووے | زینت وزیب عروسانہ مبارک ہووے
نشہ یہ عشق کا اے درد کی دولت والو | ہوش سے کرتا ہے بیگانہ مبارک ہووے

(ہر ایک رقاصہ کنیز ناچتی ہوئی آتی ہے اور حنا کو ہار پہناتی ہے)

ترکان خاتون: (اپنے تخت سے ہار اٹھاتی ہے اور حنا کو اشارے سے بلاتی ہے۔ اپنی کرسی سے کھڑی ہو کر ہار پہنانے والی ہی ہے کہ دہل بجتا ہے) یہ کون ہے۔
(ایلچی آتا ہے) ایلچی، دوبارہ؟
دوبارہ کیوں!!

ایلچی: (تسلیمات بجالاتا ہے)

ترکان: کہو (ایلچی پیغام احترام کے ساتھ پیش کرتا ہے)

(پڑھتی ہے چہرے پر غم والم کے اثرات کے ساتھ ایک دم چیختی ہے) یہ جھوٹ ہے! کہو
یہ جھوٹ ہے!

ایلچی: (نظر جھکائے کھڑا رہتا ہے)

ترکان: یہ کیسے ہوگیا؟ یہ کیا ہوا؟ یہ ظلم ہے، ستم ہے، ہم حنا کو کیسے منہ دکھائیں گے؟
خوشی کے جشن کو کیا کریں گے
خوشی مسرتوں کے سارے پھول پاؤں کے تلے کچل کے رکھ دیے۔
یہ کون تھا!
(حنا ہکا بکا کھڑی ہے۔ ایک دم ملکہ اسے سینے سے لگا لیتی ہے پھر
اس کے چہرے کو ہاتھ میں لے کر اس سے مخاطب ہوتی ہے)
میں تم سے کیا کہوں حنا
کس زبان سے یہ کہوں تمہارا کامران
شہر پناہ میں آرہا تھا
فتح یاب فوجی دستہ ساتھ تھا
غنیم کے سپاہی نے جو دھوکے سے چھپا ہوا تھا
کامران کو قتل کر دیا اور اس کی لاش (بناوٹی آنسوؤں سے)
گھوڑوں کے سموں سے پاش پاش ہوگئی
ہمارا کامران!
تمہارا کامران!! (حنا کو بناوٹی محبت سے لپٹا لیتی ہے)
تمہاری زندگی کا خواب
میری زندگی کا خواب
سب ادھورے رہ گئے ــــ!!

حنا: یہ آسمان کیوں نہ پھٹ پڑا
زمین کیوں نہ شق ہوئی

سمندروں نے کیوں نہ ساری کائنات کو ڈبو دیا

میں کیوں نہ مر گئی

میں جیتی کیوں بچی (رونے لگتی ہے)

کامران! تم کہاں ہو کامران!!

(تعویذ سے زہر نکال کر کھالیتی ہے اور فرش پر ڈھیر ہو جاتی ہے)

ہمارا انتقام ہو چکا

چلو یہ کام بھی تمام ہو چکا!

ترکان: اب ایلچی کا کام ہے تو صرف اس قدر

کہ لاش کو اٹھاؤ، راستے کے سب نشانوں کو مٹاؤ

اپنی راہ لو۔ (ایلچی دوسروں کی مدد سے لاش ہٹاتا ہے)

ہاں تو رقص، راگ، رنگ ہو اسی طرح

کہ جب تلک ہے زندگی ترنگ ہو اسی طرح

(رقاصہ کنیزوں کی ٹولی پھر اسی طرح مبارک بادیاں گاتی ہوئی آتی ہے)

شمع کو جلوۂ پروانہ مبارک ہووے — عشق کو مرگ جوانا نہ مبارک ہووے

نشہ یہ عشق کا ہے درد کی دولت والو — ہوش سے کرتا ہے بیگانہ مبارک ہووے

(طبل پر چوٹ پڑتی ہے، دربار کا وقت ہو گیا ہے، محل سرا کے پردے کھینچ دیے جاتے ہیں اور پچھلے سین کی طرح دربار کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں)

نقیب: نگاہ روبرو نگہدار

جہاں پناہ کا جلوس ہے

کہ جن کی سلطنت ہے شرق و غرب میں

ادب! ادب!!

نگاہ روبرو رہے

سروقد کھڑے رہو

(ملک شاہ داخل ہوتا ہے دائیں بائیں نظر ڈالتا ہے، امیر اور وزیر سلامی دیتے ہیں)

شاہ: ہمارے سارے خواب پورے ہو گئے

نظام ملک!

آج ہم بہت ہی خوش! واقعی بہت ہی خوش!!

تمھیں خبر ہے فوج نے ہمارے دشمنوں پر فتح پائی ہے

نظام: حضور کے غلام سرخرو ہوئے۔

جاں نثار آپ کے طفیل

کامراں ہوئے

شاہ: فتح کامراں کی ہے

وہ باغی نوجوان جس کو کل ہمارے سب امیر (تاج الملک کی طرف دیکھتا ہے)

قتل کی سزا دلانے پر تلے تھے

آج اس نے ہم کو سرخرو کیا

نظام: حضور نے اسے یہ موقع دے کے سرخرو کیا

شاہ: ہمارے دو ہی خواب تھے

دشمنوں پر فتح پائیں

اپنے ملک کے ہر ایک خاص و عام کو

علم دیں نگاہ دیں

سارے بھید ان کے سامنے بکھیر دیں

تمھارا مدرسہ ہماری آبرو ہے جہاں کے علم کی کرن کرن سے پورا دور جگمگا رہا ہے

اور اب عمر نے ایک عمر کی ہماری آرزو کو پورا کر دیا

زیچ اس طرح سے پوری کی
کہ پہلی بار مملکت
ہر ایک دن کا رات کا
ہر ایک ماہ و سال کا حساب پائے گی
آنے والے لوگ کل ہمارا نام
زیچ، جنتری سے، ماہ و سال سے، خزاں اور بہار سے
کبھی کبھی تو یاد کر لیا کریں گے
سلام ہو عمر پہ، حکم ہے کہ باریاب ہو

عمر: (آگے بڑھ کر تسلیم بجالاتا ہے) ستارہ شاہ کا بلند ہو
تخت و تاج پر اسی طرح سے علم و آگہی بہم رہیں
حضور کے کرم سے زیچ اب تمام ہوگئی
ہزار بار آسمان کے ہر ستارے پر نگاہ کی
سورج اور چاند راستوں میں ڈگمگائے
کہکشاں کی رہ گزر نے اپنے ریشمین فرش جگمگائے
یہ دیکھا میں نے یہ زمیں بھی اک کرہ ہے
اور آدمی ہزاروں، لاکھوں اربوں ذروں کی طرح ایک ذرہ ہے جو سینکڑوں صدی کی رہ گزر میں اپنی چھوٹی موٹی زندگی لیے کسی عجیب موڑ پر عجیب تر سے واقعات سے بندھا ہوا کھڑا ہوا اور راہ دیکھتا ہے۔

تاج الملک: مگر حضور، شیخ وقت کہتے ہیں یہ کفر ہے۔
خدا نے آدمی کو اپنے سانچے میں اتارا، اپنی شکل ہی میں ڈھالا ہے
کہ آدمی تو سارے عالموں کا تاج ہے
اسی کے ہاتھ میں تو باگ ڈور سلطنت کی ہے، اسی کا راج ہے

عمر خیام: یہ کیسا دین ہے بھلا جو علم سے ڈرے، جو سچ سے خوف کھائے، روشنی سے جب دو چار

ہو پرانے دور کے پھٹے پرانے پتّے اور ورق میں منہ چھپائے

شاہ: تو پیش ہو عمر کی زیچ پیش ہو

اور جب وہ زیچ پیش ہو تو قصر کے ہر ایک کھڑکی سے ہر ایک چپے چپے سے

منجم اور فلسفی یہ پھول برسیں

کہ یہ گھڑی بھی یادگار ہو

(عمر خیام زیچ کے لمبے لمبے کاغذوں کے انبار کو لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور ہر قدم پر پھولوں کی بارش ہوتی جاتی ہے۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کر پاتا ہے کہ طبل بجتا ہے اور نقیب فوجی دستے کے کمان دار کامران کی آمد کا اعلان کرتا ہے)

نقیب: فتح یاب کامران

حضور شاہ باریابی چاہتا ہے

(شاہ اشارے سے اجازت دیتا ہے عمر زیچ لیے شاہ کے بائیں طرف کھڑا ہو جاتا ہے)

شاہ: خوش آمدید، کامران

تمھارے سامنے ہے پوری سلطنت، جو چاہے آج مانگ لے

ہمیں قسم ہے تخت و تاج کی کہ آج تو جو ہم سے مانگے گا ملے گا

جو چاہے ملک کے خزانے لے لے، چاہے عہدے، چاہے سلطنت ہی مانگ لے، آج تیرا شاہ اپنے قول سے نہیں پھرے گا جان لے۔

کامران: عالی جاہ، شکریہ!

مجھے حیاب چاہیے تھی، مل چکی

جو آرزو تھی، آبرو کی، فتح کی، نکل چکی

کچھ اور چاہتا نہیں کہ میری زندگی ہزاروں لاکھوں میرے ایسوں کے لیے ہی وقف ہے، انھیں کے ساتھ میں جیوں گا ان کے ساتھ ہی انہی کے واسطے مروں گا میرا عہد ہے۔

مجھے اگر طلب کسی کی ہے تو ہے حنا!

مجھے تڑپ اگر کسی کی ہے تو حنا!

بس آرزو جو ہے تو اتنی ہے اس کا ہاتھ ہاتھ میں ہو اور اپنے جیسے دوسروں کے واسطے

خوشی کی، اطمینان کی، سکون کی برابری کی جنگ جیت لوں

اب نہ دیر کیجیے

حنا کو سونپ دیجیے

تاج الملک: مگر حضور، حنا نے آج زہر کھا کے جان دی

وہ اس جہاں کو چھوڑ کر چلی گئی (بناوٹی صدمے کے ساتھ)

کامران: تو تم نے اس کو مار ڈالا

جان لے لی

یہ سن لو موم کے بتو

میں انتقام لوں گا

نقاب پوش نے بجا کہا تھا

تخت و تاج جھوٹے ہیں دغا کے پتلے ہیں

(غصے میں تلوار نکال کر آگے بڑھتا ہے اور تخت کا رخ کرتا ہے)

یہ خونی ہیں، یہ قتل اور لوٹ کے پجاری ہیں

نظام: (راہ روکتے ہوئے) کامران! نہ ایسے بے ادب بنو۔

عمر خیام: (آگے بڑھتا ہے) تمھارا غم بڑا ہے پھر بھی اک ذرا سا صبر اک ذرا سکون!

کامران: (ان دونوں کو ہٹاتا ہوا تلوار چلاتا ہوا آگے بڑھتا ہے)

تمام جھوٹ، سب فریب

صبر کیا سکون کیا

یہ ہوش کیا جنون کیا

ڈھکوسلے ہیں تخت کے بھلاوے ہیں یہ تاج کے

کہ جن سے ظالموں نے میری الفتوں، محبتوں کو، طاقتوں کو راحتوں کو

مول لے لیا ہے

آج سارے قرض میں چکاؤں گا

ظلم کی کلائی، آج توڑ کر دکھاؤں گا!!

(بھگدڑ مچ جاتی ہے تاج الملک کامران پر وار کرتا ہے گر پڑتا ہے۔)

پردہ گرتا ہے۔

چھٹا سین

(وہی کہنہ سرائے۔ میخانے کا دروازہ، رات کا وقت)

لامے خور: آج اپنا نام کھو گیا ہے، یارو کیا کریں۔

پہلا شرابی: مجھے تو نام یاد ہے تیرا

لامے خور: تو اس سے کیا ہوا؟ وہ تیرا نام ہو گا، میرا نام مجھ کو یاد ہو تو کام ہو۔

دوسرا شرابی: تو تو ہی لے لے نام میرا، میں تو یوں بھی جی ہی لوں گا نام کے بغیر۔

لامے خور: نہیں، نہیں، یہ چوری ہو گی

تیسرا شرابی: یہ یار کوئی نام تو ضرور ہو گا تیرا؟

چوتھا شرابی: کیا ضرور ہے، میں پیدا تو بغیر نام کے ہوا تھا اتنا جانتا ہوں۔

لامے خور: تھوڑے دن کے بعد یوں بھی سارے لوگ نام بھول جائیں گے۔

پہلا شرابی: یارو، بات تو درست ہے پہ نام ہی نہ ہو تو قرض خواہ کیا کریں گے۔ ہم کو کس طرح بلائیں گے۔

دوسرا شرابی: جو شہر اور بستیوں کا نام ہی نہ ہو تو پھر کہاں سے آئیں گے۔

کہاں کو جائیں گے

کوئی بتا نہ پائے گا

چلو ہم اپنے دور کے سب سے قابل، سب سے عقلمند ہی سے چل کے پوچھیں
اپنا نام
مگر کبھی وہ مدرسے گیا نہیں
میں ایک بار اس کو لے گیا تھا مدرسے کے سامنے
بہت کہا سنا مگر اس نے مدرسے میں پاؤں بھی نہ رکھا

عمر خیام: تم نے غور ہی کیا نہیں
کہ یہ کبھی پڑھاتا تھا اسی جگہ
ناخن اس کے جمع ہو کے سُم ہوئے
داڑھی پیچھے سے نکل کے دُم بنی
اب اس کا نام کیا نشان کیا
کبھی تو یہ بھی آدمی تھا
اور یہ بھی جھوٹ کا شکار تھا

لامے خور: تو یارو، نام لازمی ہے۔

عمر: (شراب پیتے ہوئے)
کہ دوستی ہے ایک جھوٹ
وعدہ دوسرا فریب
اگر کسی کا نام ہے تو نام گرد راہ کا
کہ کیسے کیسے بادشہ، کیا حسین، کیسے کیسے سرخ لب، مہکتے ہونٹ، کالی کالی زلفیں،
جگمگاتے چہرے خاک میں ملے ہیں اور ذرّے بن کے گرد میں بکھر گئے ہیں۔
کوئی پھول بن گیا
کوئی شاخ بن گیا
کسی کی مٹی سے ڈھلا پیالہ شراب
حسین جسم خاک میں ملے تو کھِل اُٹھے گلاب

لاے خور: عمر! عمر!

عمر: خموش! اب عمر کہا، وہ کب کا گرد ہو چکا شراب اس کو پی چکی وہ رہ نورد ہو چکا۔

لاے خور: مجھے نہ جانے کب سے انتظار تھا۔

تمھارا علم، فکر، فلسفہ، گیان دھیان

تم کو ایک دن یہاں پہ لائے گا

مجھے یقین تھا، مجھے یقین تھا

عمر: سبھی برہنہ ہو گئے علم، فلسفہ، نظر، گیان دھیان

کسی کو کچھ خبر نہیں

کہاں سے آئے ہیں کہاں کو جائیں گے

تو یارو، اٹکلوں سے فائدہ!

پیؤ، پیؤ، جیؤ جیؤ

(عمر خیام کا تخیل جاگ اٹھتا ہے اور فرش میخانہ سے رقاصاؤں کی ایک ٹولی گاتی ہوئی گزرتی ہے ہاتھوں میں صراحیاں ہیں، چاروں شرابیوں کے جام بھرتی جاتی ہیں)

اک صبح صدا آئی یہ میخانے سے — اے مست شراب، او دیوانے سے

اُٹھ اور پیالہ مے سے بھرلے — ایسا نہ ہو اٹھ جائے تو میخانے سے

(ٹولی گزرنے ہی والی ہے کہ خیام آخری رقاصہ کا دامن پکڑ کر اسے روک لیتا ہے)

ہم لیتے ہیں مے پُرانی ہو کہ نئی — اور اس کے عوض میں ساری دنیا بیچی

ہے تجھ کو یہ فکر مر کے جانا ہے کہاں — دے دے مجھے پیالہ، جا جہاں چاہے جی

(رقاصہ پیالہ بھرتی ہے اور سب لوگ شراب پیتے ہیں)

عمر: بھیدوں سے جہاں کے رو برو تو ہے نہ میں

بوجھے انھیں کون سرخرو تو ہے نہ میں
پردہ تھا تو گفتگو تھی میں تھا، تو تھا
جب پردہ ہی اٹھ گیا تو پھر تو ہے نہ میں

مے خور کہ بر سر گل بسے خواہی خفت — بے مونس و بے حریف و بے ہمدم و جفت
زنہار بکس مگو تو ایں راز نہفت — ہر لالۂ پژمردہ نخواہد بشگفت

یہ پرانی سرائے جس کا عالم نام ہے — آرام گاہِ اسپ صبح و شام ہے
یا بزم ہے جہاں ہزاروں جمشید ہیں دفن — یا قصر ہے کہ تکیہ گاہ بہرام ہے

ایں کوزہ چو من عاشق زادے بودست — در بند سر زلف نگارے بودست
ایں دستہ کہ در گردن او می بینی — دستیت کہ در گردن یارے بودست

مے خوردن وشاد بودن آئین من ست — گفتم فارغ بودن، کفر ودیں دینِ من ست
گفتم بعروس دہر کا میں تو چیست — گفتا دل خرم تو کا ئین من است

(ایک دوسرا قافلہ پھول برساتا گزرتا ہے)

لے پی لے شراب پی سونا ہے بہت — ملنا ہے اسی خاک میں بونا ہے بہت
ساتھی نہ مددگار نہ کوئی دوست نہ یار — گر جا ہنسے نہ پھول رونا ہے بہت

(سب لوگ شراب پینے لگتے ہیں، اور مستی میں ناچنے لگتے ہیں۔ عمر بیچ میں بیٹھا ہے کہ کسی کے ہاتھ سے صراحی کو ٹھیس لگتی ہے۔ صراحی گر کر ٹوٹ جاتی ہے، صراحی سے خاک پر بہتی شراب کو عمر دیکھتا رہتا ہے پھر آسمان کی طرف غصے سے دیکھتا ہے)

ابریق مے مرا شکستی ربی — کیوں مے کی صراحی تو نے توڑی مرے رب
برمن در عیش را بدبستی ربی — یہ راہ بھی بند کر کے چھوڑی مرے رب
برخاک بریختی مئے لعل مرا — مٹی میں ملائی کیوں مری سرخ شراب
خاکم بدہن، تو سخت مستی ربی — نشے میں تھا تو بھی پی کے تھوڑی مرے رب

(خیام کا منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے، تینوں شرابی غور سے دیکھتے ہیں)

لامے خور: یہ کیا ہوا؟

پہلا شرابی: گستاخی کی اللہ سے پائی یہ سزا۔

لاحول ولا

عمر: (دوسری رباعی پڑھتا ہے)

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو — ایسا بھی کوئی ہے جو گنہ گار نہیں
وانکس کہ گناہ نکرد چوں زیست بگو — جس نے نہ کیا گنہ وہ جی دار نہیں
من بدکنم و تو بد مکافات دہی — میں نے جو برا کیا تو نے بدتر دی سزا
پس فرق میانٔ من و تو چیست بگو — سو مجھ میں تجھ میں فرق زنہار نہیں

(ناچتی گاتی ایک اور ٹولی گزرتی ہے)

اجزائے پیالہ چو در ہم پیوست — ٹکڑوں کو ملا کے پیالے کیوں جوڑے
بشکستن آں روا نمی دارد دست — بے جا ہے انھیں جو کوئی توڑے پھوڑے
چندیں سرو پائے نازنین وسر دوست — گل فاموں کے ہاتھ اور پیاروں کے سر
از بہر چہ ساخت واز برائے چہ شکست — کیوں تو نے بنائے اور پھر کیوں توڑے

لامے خور: پیئو بھی اور پینے دو
جیئو بھی اور جینے دو

(سبھی شرابی کورس میں شریک ہو جاتے ہیں)

لامے خور: آج ہم کو نام مل گیا

آج ہم کو تم کو سب کو نام مل گیا

عمر کا نام کامران ہے

یہی تو میرا تیرا سب کا نام ہے

عمر، شراب، کامران

حنا، شراب، یہ جہان

گزرتی زندگی کی باگ تھام لو

یہ وقت انتقام ہے، تو انتقام لو

پیؤ، پیؤ بھی پینے دو

جیؤ، جیؤ بھی جینے دو

یہ نام جاوداں رہے

یہ بزم کامراں رہے

☆☆☆

دنیائے ادب وثقافت میں ایسی شخصیتیں خال خال ہی ملتی ہیں جن کی ذات میں مختلف النوع صفات بیک وقت یکجا ہوں اور اُن میں سے بیشتر صفات میں انھیں درجۂ کمال بھی حاصل ہو۔ پروفیسر محمد حسن کا شمار ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جن کی ذات انجمن کی شکل میں ڈھل کر بیک وقت کئی حیثیتوں سے امتیازی شان کی حامل بن گئی تھی۔ پروفیسر محمد حسن کا نام آتے ہی ذہن میں ایک بیدار مغز دانشور، بلند پایہ ناقد، ممتاز ڈرامہ نگار، ادبی مؤرخ، ماہر لسانیات، ناول نگار، شاعر اور صحافی کے علاوہ اردو زبان وادب کے فروغ اور سیکولر و جمہوری اقدار کی بقا کے لیے ہمہ تن سرگرم انسان کا تصور کوند جاتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی وقعت واہمیت سے روگردانی ہی ممکن ہے۔

پروفیسر محمد حسن عام طور سے ادبی دنیا میں ایک منفرد و ممتاز ناقد کی حیثیت سے زیادہ معروف ومشہور ہیں لیکن اُن کے تخلیقی جوہر اور خلاقانہ صلاحیتوں کے تعلق سے خاص کر بطور ڈراما نگار ان کی خدمات اور قدر ومنزلت کچھ کم نہیں۔ یہ لازم نہیں کہ بڑا ناقد بطور تخلیق کار بھی یکساں مقام ومرتبے کا حامل ہو، لیکن پروفیسر محمد حسن کی ذاتِ گرامی اس ضمن میں استثنا کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے تنقید نگاری کے ساتھ ساتھ بطور تخلیق کار ڈرامہ نگاری کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے نہ صرف ڈراما نگاری کی تاریخ میں ممتاز مقام حاصل کیا بلکہ اردو ڈرامے کو بھی اعتبار و معیار عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(اسی کتاب سے ماخوذ)

Mohammad Hasan ke Dramen

Edited by Anwar Pasha

ISBN 93-87635-28-7

9789387635289

+91 9971-77-5969

arshiapublicationspvt@gmail.com